Hasnain Sialvi
COURAGE TO KNOW
اولڈ راوئینز کی جانب سے اسیرانِ علم و ادب کے لئے توشۂ خاص
سہ ماہی
لوح
مدیر
ممتاز احمد شیخ

آغاز اُس ذاتِ بابرکات کے نام سے کہ تمام تعریفیں اُسی کے لیے مختص ہیں
جو رحمان بھی ہے رحیم بھی اور ہم سب اُسی کے جُود وسخا کے محتاج ہیں
اور وہی ذاتِ والہ صفات ہے جو قوتِ کار کی ارزانی عطا فرماتی ہے

کتابی سلسلہ سہ ماہی "لوح" راولپنڈی

شمارہ ۳، اپریل ۲۰۱۶ء

مدیر: ممتاز احمد شیخ

سہ ماہی کتابی سلسلہ "لوح"

شمارہ سوم: اپریل ۲۰۱۶ء

برقی کتابت وتزئین: ندیم صدیقی

قانونی مشیر: عمران صفدر ملک ایڈووکیٹ

پبلشرز: رہبر پبلشرز، اُردو بازار، کراچی، 021-32628383

رابطہ مدیر: 71-051-4493270 / 0300-8564654

قیمت : ۶۷۵ روپے

بیرون ملک : ۴۰ ڈالر

email:
toraisb@yahoo.com

"لوح" ملنے کے پتے

کراچی: رہبر پبلشرز، اُردو بازار، کراچی

حیدرآباد: رہبر پبلشرز، رسالہ روڈ، حیدرآباد 0222-781838

ملتان: رہبر پبلشرز، گلگشت کالونی، ملتان، 061-6511738

لاہور: رہبر پبلشرز، میاں مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور 0423-7232278

راولپنڈی/اسلام آباد: رہبر پبلشرز، شہزاد پلازہ، گارڈن کالج روڈ، راولپنڈی 051-5773251

اشرف بک ایجنسی، کمیٹی چوک، راولپنڈی۔ 051-5531610

نگارشات بھیجنے کا پتہ: E-27، لین نمبر 2، نیشنل پارک روڈ، گلستان کالونی، راولپنڈی

حُسنِ ترتیب

• محبت جو امر ہو گئی

• تکریمِ رفتگاں اُجالتی ہے کوچہ وقریہ

• یاد آتے ہیں زمانے کیا کیا

• ہزار طرح کے قصّے سفر میں ہوتے ہیں

• نظم لکھے تجھے ایسے کہ زمانے وا ہوں

• نہیں منّت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری

• لگا رہا ہوں مضامینِ نَو کے پھر انبار

● چاہیے ہے جگر، داد و تحسین کے لیے

● غزل، شاعری ہے، عشق ہے، کیا ہے؟

• قرطاس پہ ہیں جہانِ دگر

• اب دو عالم سے صدائے ساز آتی ہے مجھے

خامہ انگشتِ بدنداں ہے اسے کیا کہیے

(اداریہ)

حرفِ لوح

کہتے ہیں کہ اداریہ اگر عشق و عاشقی کے جذبوں سے لبریز ہو اور اس میں تھوڑی سی ''مَیں'' کی تکرار بھی آ جائے تو تعلّی کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ کئی بار سوچا کہ اگر اپنے دو لفظ جذباتِ خفی کے مانند ہی رہیں تو کیا اچھا ہو مگر یہ ایسا مرض ہے کہ جسے بیان کیے بغیر کوئی چارہ نہیں اور قصۂ دروں کے اظہاریے کے بغیر جی کو قرار نہیں۔ چین و قرار کی تصدیق تو دل سے اُس وقت پھوٹتی ہے جب کچھ اچھا ہو جائے اور مسلسل اچھا ہونے کی اُمید بھی بندھی رہے۔ لوح کو ''لوح'' بنانے کا عزم جس طرح مضطرب رکھتا ہے وہ کبھی ادبِ عالیہ کے رُوپ میں ڈھلا اور اُس کے مندرجات و مشمولات خوشبو کی طرح روح میں تحلیل ہوئے تو شاید چین اور قرار کے معانی سمجھ میں آنے لگیں۔ ابھی تو محض ابتداء ہے۔ ایک مسلسل عمل کا آغاز ہے۔ ایڑیاں رگڑتے ہوئے کبھی زمینِ ادب سے شفاف اور میٹھے پانی کے چشمے نکل آئیں تو شاید تشفی ہو۔ ابھی تو اس بے ادب کو دنیائے ادب کے درخشاں ستاروں سے اُن کے روشن الفاظ میں پروئی ہوئی تحریریں حاصل کرنے کا ہُنر بھی نہیں آتا۔ ادب کے قرینوں اور سلیقوں کو برتنے کا مکمل یارا ہے نہ آشنائی۔ یہ تو محض الہامی محبتوں کا کارِ حیات ہے کہ ان حضرات کی محبتوں کے پھول اُن کی نگارشات کی صورت میں 'لوح' کی زینت بنتے چلے جارہے ہیں۔

''لوح'' کو ایک پرچے کی بجائے ایک منور ادارہ بنانے کی دھن اپنے حصار میں لیے رکھتی ہے کہ جس سے حرف و لفظ کی کرنیں پھوٹتی رہیں اور اس کے ہالے بجائے خود روشنی میں ڈھلے مصرعِ مَن و تُو کا سامان بنتے رہیں۔ پہلے بھی عرض کیا تھا کہ ''لوح'' کا آغاز بہت جان لیوا تھا اور خود پر اعتماد بھی کسی حد تک لرزاں تھا۔ اپنی دنیا میں مگن ایک شخص کی عزت داؤ پر لگنے جا رہی تھی۔ ادب سے برس ہا برس کی دُوری کے باوجود بھی کہیں نہ کہیں کوئی وضعِ ادب موجود تھی کہ ہمت جمع کر کے اس شہرِ ناپرساں میں ادب سے تعلقِ خاطر کے احیاء کے لیے اولڈ راوینز کے پلیٹ فارم سے منظم اور شاندار مشاعروں کا آغاز کیا تو ہمت بندھی کہ کچھ ہو سکتا ہے۔ نتیجتاً یہی مشاعرے دنیا کے طول و عرض میں اپنا وجود منوانے کے ساتھ ساتھ دنیائے ادب میں میری واپسی کا سبب بنے اور میں اپنی فطری برادری کی طرف لوٹ آیا۔ ڈرتا ہوں کہ کسی دعوے یا تعلّی کا کوئی پہلو نہ نکل آئے مگر سچ یہی ہے کہ ایسے مشاعرے ماضی بعید میں ہوئے ہوں تو میرے علم میں نہیں اور یہ وہ وقت تھا جب اولڈ راوینز کے مشاعروں کے سامعین اپنی ہی وضع اور خُو کے مالک تھے کہ جن کے منہ نے داد اور ہاتھوں نے تالی بجانا کبھی سیکھا ہی نہ تھا مگر اس عاجز کی محنت رنگ لائی اور لوگ ہمارے مشاعروں کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ مجھے یقین

ہے کہ وہ وقت بھی آئے گا کہ اولڈ راویز کے مشاعرے میں شرکت کیے بغیر شاید کوئی سندِ امتیاز حاصل نہ کر سکے۔ یہی مقام میں ''لوح'' کے لیے دیکھ رہا ہوں اور اس کے لیے مسلسل کوشاں بھی ہوں۔ معیار اور مقدار پر سمجھوتہ کیے بغیر کوئی سند افتخار و شرف حاصل نہیں ہو سکتی۔ ناراضیاں اور شکر رنجیاں گرچہ جی کو جلائے رکھتی ہیں۔ برسوں کے تعلق بھی ''لوح'' کے معیار کی راہ میں حائل ہونے کا خطرہ لیے ہر وقت سر پر منڈلاتے رہتے ہیں مگر کیا کیجیے سفر دشوار تر ہے۔ راستے میں کانٹے اور شُول بچھے ہوئے ہیں اور منزل پر پہنچنے کے لیے کوئی سہل راستہ بھی دستیاب نہیں۔

''لوح'' کے دو شمارے آپ دیکھ چکے ہیں اور تیسرا آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ فیصلہ مجھے نہیں آپ کو کرنا ہے۔ نقاد حضرات اور اخبارات نے اس کے بارے میں جو لکھا وہ میرے لیے باعث عزّ وشرف ہے۔ الحمدللہ میرا سر فخر سے بلند ہے۔ شرمندگی یا ندامت سے جھکا ہوا نہیں۔ بہت سے محترم حضرات نے اس دوران اپنے قیمتی مشوروں سے بھی نوازا اور بعض امور پر تنقید کے انداز میں رہنمائی بھی فرمائی۔ جناب ظفر اقبال نے اپنے کالم میں مشورہ دیا کہ ''لوح'' کی ضخامت بہت زیادہ ہے اور اس کی ترسیل وتقسیم میں اسے پڑھنے کے لیے رحل بھی مہیا کی جانی چاہیے۔ ایسے مشورے اور دوستوں نے بھی دیئے کہ ضخامت کو کم کر کے اسے بروقت اور سہ ماہی کے طور پر نکالنے کا بہرصورت اہتمام کیا جانا چاہیے کہ ''لوح'' کا ذائقہ اور نشہ سر چڑھ کر بولنے لگا ہے۔ تو عرض کیا کہ میں ہمہ وقتی مدیر نہیں۔ لوح میرا عشق تو ہے مگر یہ میرے رزق کا ذریعہ ہے نہ میرے نان ونفقے کا باعث۔ مجھے اپنی معاشی سرگرمیاں بہر طور زیادہ عزیز ہیں کہ وہی ''لوح'' کا سبب ہیں۔ ضخامت کم کرنا سرِ دست میرے لیے ممکن نہیں کہ سینکڑوں چیزوں سے بہتر سے بہترین کا انتخاب بار بار پڑھے بنا نہیں ہو سکتا۔ اور یہ کارِ دارد راتوں کی نیند کی قربانیوں کے باعث ممکن ہو پاتا ہے۔ ان تین شماروں کے انضباط کے لیے جانے کتنی ہی راتیں قربان ہوئیں اور بار بار یاددہانیوں کے بعد عمدہ ترین چیزیں کیسے حاصل کی گئیں یہ ایک الگ قصہ ہے مگر یہ بتانا یا محض درج کرنا ہرگز مطلوب نہیں کہ یہ تو میرے اپنے کتھارسس کا حصہ ہے۔ ہاں مگر اتنا ارمان اور خواہش ضرور ہے کہ ''لوح'' ایک حوالہ جاتی دستاویز بن سکے۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنے والے نوجوان، طالب علموں اور اساتذہ کے لیے ''لوح'' کے مندرجات اور مشمولات ایک سند کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جائیں۔ لمحہء موجود کی تمام ادبی اصناف کا احاطہ کرنے کی مقدور بھر کوشش کی گئی ہے۔ تاکہ آنے والا مؤرخ جب تاریخ ادب مرتب کرے تو ''لوح'' کو مرقع ادب کے طور پر یاد کیے اور سراہے بغیر نہ رہ سکے۔ تقدیم وتاخیر اور حفظ مراتب مجھے ہمیشہ ہی الجھائے رکھتے ہیں مگر بعض اوقات صفحات کی ترتیب اور ضرورت کے مطابق کچھ تبدیلیاں ناگزیر ہو جاتی ہیں اس سے کسی کی دل شکنی ہرگز مطلوب ومقصود نہیں تاہم کسی ممکنہ دل شکنی پر انتہائی معذرت خواہ ہوں۔

وما علینا الا البلاغ

ممتاز احمد شیخ

عفی عنہ

شامِ شہرِ ہول میں شمعیں جلا دیتا ہے تُو

(حمدِ باری تعالیٰ)

حمدِ باری تعالیٰ

پانی سے بھرے ابر کے ٹکڑوں میں وہی ہے
بارش کے برستے ہوئے قطروں میں وہی ہے
وہ علم کی خوشبو کو جگاتا ہے دلوں میں
اور مدرسے جاتے ہوئے بچوں میں وہی ہے
تختی، یہ دوات اور قلم اس کے ہیں سارے
کاندھوں سے لٹکتے ہوئے بستوں میں وہی ہے
یہ حرف یہ احساس و خیالات اسی کے
لب پر وہی دل میں وہی سوچوں میں وہی ہے
تاریخ میں ڈھلتے ہوئے ادوار ہیں اس کے
تاریخ بدلتے ہوئے لمحوں میں وہی ہے
منزل پہ پہنچ کر بھی تمہیں وہ ہی ملے گا
ہر گام پر پھیلے ہوئے رستوں میں وہی ہے

سلیم کوثر

کوئی نہیں ہے رستہ، اب انحراف والا
دِل میں سما چکا ہے کالے غلاف والا
خامہ ہے اُس کی عظمت کا اعتراف والا!
اِک بھی سخن نہ لکھے اُس کے خلاف والا
اللہ کی رضا پر راضی جو ہو چکا ہو
کیسے زباں پہ لائے لفظ اختلاف والا؟
وہ گردشِ زمانہ سے اِک الگ سی گردِش
یاد آ رہا ہے ہر دم، منظر مطاف والا
ہر شوط میں ہی جس پر جنّت کے وا ہوں منظر
ہے کتنا خوش مقدر ایسے طواف والا
اے کاش مُجھ پہ اس کی چشمِ کرم ہو ایسی
ہر لمحہ مُجھ پہ اُترے اِک انکشاف والا
پھر زندگی اُسی میں رہ کر گزار دوں مَیں
مل جائے ایسا لمحہ اِک اعتکاف والا
یا رب نسیمِ عاصی، خود ہو گیا ہے حاضر
اس سے سلوک ہو اب وعدہ معاف والا

نسیمِ سحر

موسمِ بہار کی آہٹوں سے سجی صبح میں ایک حمد

نقابِ صبح جب بھی چاک ہوتا ہے
چمکتے سنگریزوں، جھومتے پیڑوں
زمیں کی کوکھ سے پھوٹے ہوئے بیجوں پہ
کوئی حمد لکھتا ہے
کوئی لکھتا ہے
جلوہ گاہِ دنیا میں
کسی اقرار کی ساعت کا جادو ہے
جو طاری ہے
ازل سے تا ابد اک نور جاری ہے

مرے مالک!
یہی تو حمد ہے تیری
جو روز و شب کی اس تقسیم پر
اپنی نمو کی اوّلیں ساعت میں
برتِ گل پہ بکھرے
شبنمی قطروں نے لکھی ہے
یہی ہے تذکرہ تیرا
جسے ہر ڈوبتا سورج
کہیں لوحِ اُفق پر
آتشیں رنگوں سے خود تحریر کرتا ہے
یہی تکبیر ہے تیری
جو اس موجِ نفس کے آنے جانے میں
ترے ہر اسم کی گردان کرتی ہے
کسی ذی روح لمحے سے
کسی ایک دوسرے ذی روح لمحے میں
بہت آہستگی سے ذی روح لمحے میں
بہت آہستگی سے منتقل ہو کر
ترا اعلان کرتی ہے
میرے مالک
یہی تہلیل ہے تیری
کہ جو ہر ابتدا و انتہا سے ماورا
گزرے زمانوں، آنے والے سارے لمحوں کے لیے
محکم ہے
آب و خاک میں
ان برستے پانیوں میں
اور تہِ آبِ رواں
موجود سانسوں میں بھی جاری
بہتی ہواؤں، بادلوں میں
کہ جب
تنہائی کی وحشت سے دل صحرا نما ہو جائیں
جب تاریکیاں گھیرے ہوئے دل کو
اور دل تجھ کو پکارے
چاہے جس پیرایۂ حرف و بیاں میں نام لے تیرا
تری آواز آ جائے
کہ ہاں، اے میرے بندے
میں تیرے نزدیک ہوں
تیرے بہت نزدیک
ان بہتے ہوئے اشکوں سے بالکل متصل
دم توڑتی آہوں
تیرے سینے میں گونجے لفظ کے بے حد قریں
دل کو ترے تھامے ہوئے
میں ہوں
مسلسل ہوں

شاہدہ حسن

حمدِ باری تعالیٰ

قوتِ نطق و کلام اور قلم اس کی عطا
حسن اسی کا لیے پھرتی ہے ہر اک صوت و صدا
خلقتِ ارض و سماوات ہے اِک اس کی ادا
اس کی تخلیق کا دم بھرتے ہیں سب خاک و خلاء
روح و ذی روح و رگ و ریزہ و رائی میں وہی
بحر و بر شمس و قمر سنگ و شجر حمد سرا
موج و منجدھار میں وہ مطر و مطیر اس کا عمل
ساحل و سیل و سحاب و صبا اس کی ثنا
حیطۂ فہم و خرد میں ہے کہاں اس کا نشاں
ممکن و ہست و عدم عمد و امر اس کے بجا
ہر کہیں اہل زمیں ڈھونڈتے پھرتے تھے یقیں
اس کے ہونے کا پتہ طائرِ سدرہ نے دیا
تا ابد تابع تکمیل ہے اس کی تعمیل
اس نے آغازِ ازل میں جو لیا عہدِ وفا

جاوید احمد

خسارہ......

قسم ہے وقت کی انسان ہے خسارے میں
قسم یہ میں نے نہیں، رب نے دی ہے اے لوگو۔۔
ذرا تو غور کرو۔۔
قسم ہے عصر کی کہ جب دن ہوا زوال پذیر
یہ دن کہ حسن میں جسکی نہیں کوئی بھی نظیر
یہ وقت لمحہ بہ لمحہ یونہی گزر جائے
یہ وقت جا کے پلٹ کر کبھی نہیں آئے
یہ مثلِ خاک ہے، مٹھی سے کب نکل جائے
یہ وقت برف کی مانند ہے، پگھل جائے
گزرتے وقت کو سمجھو کہ کتنا ارزاں ہے
کہ اُسکی راہ میں اپنی اجل کا ساماں ہے
گنوا دیا جو اُسے ہاتھ مل کے رہ جانا
پھر اُسکے بعد تو آساں نہیں سنبھل جانا۔۔۔
ہے خوش نصیب وہی جس نے وقت کو جانا
اور اپنے رب کی حقیقت کو خوب پہچانا
عمل بھی نیک کئے، حق کا بھی گواہ بنا
نشیبِ راہِ طلب میں جری سپاہی بنا
مقامِ صبر و تحمل پہ جو رہا قائم
کتابِ عشق میں اُس کا مقام ہو دائم

رضیہ سبحان

کرم اے شہِ عرب و عجم

(نعتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم)

نعتِ نبیؐ

جو زباں پہ ذکرِ نبی چلا تو چلے ہیں آنکھ سے اشک بھی
فنِ نعت خالی ہنر نہیں یہ ہے قلب و چشم کی حاضری
ہمیں آپ کے درِ خاص سے وہ نعیم عطا ہوئے ہیں کہ بس
رہا دامن اپنا لدا لدا ' رہی جیب اپنی بھری بھری
یہ نصیب ذکرِ حبیب کا ہے مقام کتنے قریب کا
کہ درود آپؐ پہ پڑھ لیا تو خدا کی سنت ادا کری
اسی در پہ آنکھ بھری گئی یہیں آ کے دربدری گئی
مری ساری دردسری گئی ملی جب سے آپ کی رہبری
جو ہیں حضرت آج کے اُمتی ہوئے اہلِ غرب کے تابعی
کوئی ذکرِ غیر کا اُجرتی ' کہیں فکرِ غیر کی چاکری
یہاں عام جس کا قبول ہو وہی بے نصیبِ اصول ہو
کسے یاد رنگِ رسول ہو بسی جب نظر میں سکندری
کوئی بھی نہیں ہے جو ہاتھ روک سکے ستم گر وقت کا
فقط ایک ظلم محیط ہے فقط ایک کفر کی برتری
شب تار' روز سیاہ سے بری ہو یہ جان گناہ سے
کبھی فیض خاص کی راہ سے مری جان عذاب سے ہو بری
مرا مختصر سا سوال ہے جو اگرچہ کارِ محال ہے
جہاں سوز وفن کا جمال ہے مری آئے ذکر میں شاعری

احسان اکبر

نعتِ نبیؐ

بہت حیران ہوہو کر زمانہ دیکھتا ہے
محمدؐ سے محبت کا یہ کیسا سلسلہ ہے
کسی مجہول محور کے طواف اندر نہیں دل
خدا جو مصطفےٰ کا ہے وہی اپنا خدا ہے
خدائے دوجہاں کے بعد کس کی باشاہی
سرِ کون و مکاں اِک اسمِ احمد گونجتا ہے
کٹے ہاتھوں رقم ہوتی ہوئی تاریخ دیکھو
ہمارا حوصلہ باطل کی طاقت سے بڑا ہے
طلب کرتے ہیں اُس چشمِ کرم سے نورِ رحمت
کہ اپنا چاند تارا ان دنوں گہنا رہا ہے
تمیزِ خیر و شر کیسے مٹاؤ گے دلوں سے
کہ وہؐ آئینۂ سیرت ہمارا رہنما ہے
ہم اُس کوچے سے نسبت کی خوشی کیسے سنبھالیں
ہمارا نام اُس کے خار وخس میں آ گیا ہے

جلیل عالی

نعتِ نبیؐ

ہجرت کی تاریخ میں اک ہم سفری باقی رہ گئی
دوسرے آپؐ کے بستر پر شب بسری باقی رہ گئی
آپؐ کی یاد نہ ہو جس دل میں اور دنیا بستی ہو
اس کے لیے ذلت اور بس ناقدری باقی رہ گئی
آپؐ کے دشمن اک اک کر کے ختم ہوئے ہیں سارے
عشق سلامت رہ گیا اس کی سمری باقی رہ گئی
آپؐ جہاں سے بھی گزرے اور جہاں پہ قیام کیا
وہ بستی وہ وادی ' شہر وہ نگری باقی رہ گئی
وہ جو ساتھ چلے تھے آپؐ کے' آپؐ کے ساتھ رہے تھے
ان کے رستے اور ان کی ہمسفری باقی رہ گئی
پچھلے صحیفوں میں کتنی تحریف ہوئی ہے لیکن
آقاؐ آپ کی آمد کی خوشخبری باقی رہ گئی

سلیم کوثر

نعتِ نبیؐ

گلہ زباں پہ کہاں عمرِ مختصر کا ہے
یہ شوق دل میں مدینے کے ہی سفر کا ہے
حضورﷺ آپ کی رحمت سے بگڑی بن جائے
کہ حالِ خستہ بہت آج اپنے گھر کا ہے
خدا نے چاہا تو حق کامران ٹھہرے گا
مقابلہ ابھی جاری جو خیر و شر کا ہے
یہ کائنات ہماری ہے جس کا فیض لیے
یہ بدنصیب بھی طالب اُسی نظر کا ہے
فرشتے ہاشمی کی نعت سن کے کہنے لگیں
کہ مدح خوان یہی سید البشرؐ کا ہے

سید انور جاوید ہاشمی

نعتِ نبیؐ

منزلِ شوق مجھ کو تری رہگزر ...... اے شہِ بحروبر
اذن ہو تو کروں تیری جانب سفر...... اے شہِ بحرو بر
تیرے قدموں کی گرد ھول ہو جاتا میں، پھول ہو جاتا میں
پھر مہکتا میں تہذیب کی شاخ پر......اے شہِ بحروبر
وہ زمانے جو ادراک میں بھی نہیں، خاک میں بھی نہیں
ہاتھ باندھے کھڑے تیری دہلیز پر...... اے شہِ بحروبر
جب جہاں سے مرا آب و دانہ اٹھے اور ٹھکانہ اٹھے
تب بھی رکھیۓ گا مجھ پہ کرم کی نظر......اے شہِ بحروبر
ایک پل کو ٹھہر خیمۂ خواب میں، چشمِ ایجاب میں
کر لوں میں اپنی بینائیاں معتبر ...... اے شہِ بحروبر
میں غمِ ہجر سے ایسا گھائل ہوا، تیرا سائل ہوا
اک جھلک سے مرا کاسۂ دید بھر......اے شہِ بحروبر
جب کبھی عہد سے پھرنے لگتا ہوں میں، گرنے لگتا ہوں میں
تیری رحمت کی آغوش میں رکھوں سر......اے شہِ بحروبر
ناز کرتا ہوں میں ایسی قسمت ملی، تیری نسبت ملی
دو جہاں میرے ایسے گئے ہیں سنور......اے شہِ بحروبر
پاس میرے تو فردِ عمل کچھ نہیں، اور حل کچھ نہیں
ہوں ندامت سے میں سرتا پا تر بہ تر......اے شہِ بحروبر
خواہشِ نفس میں زندہ در گور ہوں، کتنا کمزور ہوں
دل سے جاتا نہیں میرے دنیا کا ڈر، اے شہِ بحرو بر
عہدِ تیرہ کی جتنی تھی رسمیں گئیں، ساری قسمیں گئیں
تیری آمد ہے تہذیبِ نو کا گجر......اے شہِ بحروبر
نور آنگن میں ہے جشنِ میلاد کا، آپ کی یاد کا
وردِ صلی علی میں ہیں دیوار و در......اے شہِ بحروبر

جنید آزر

نعتِ نبیؐ

حضورﷺ نعت کا مطلع سجا دیا جائے
حضورﷺ عرض ہے چہرہ دکھا دیا جائے
حضورﷺ سائیں حسن اور حسین کا ہوں مرید
حضورﷺ مولا علی سے ملا دیا جائے
حضورﷺ مجھ کو محبت ہے سائیں حمزہ سے
حضورﷺ آپ کا نوکر بنا دیا جائے
حضورﷺ سین کی آواز میں سرور بہت
حضورﷺ شین کا مخرج بھلا دیا جائے
حضورﷺ حضرتِ ایوب کا چلے لنگر
حضورﷺ ہم کو بھی کھانا کھلا دیا جائے
حضورﷺ حسن پہ مغرور ہیں یہاں کے حسین
حضورﷺ عرض ہے پردہ اُٹھا دیا جائے
حضورﷺ آپ کی صحبت کو ہم ترستے ہیں
حضورﷺ وقت کو پیچھے ہٹا دیا جائے
حضورﷺ تنگ بہت ہیں فقیر دنیا میں
حضورﷺ تختِ حکومت گرا دیا جائے
حضورﷺ عشق پہ لوگوں کا اعتراض ہوا
حضورﷺ اب تو انہیں بھی جلا دیا جائے
حضورﷺ شہر بسائے ہیں حاکموں نے یہاں
حضورﷺ ان کو مدینہ دکھا دیا جائے

محمد ندیم بھابھہ

محبت جو امر ہو گئی

(مادرِ علمی کے لیے)

گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیمی قیام

ڈاکٹر وزیر آغا

ایف اے کا نتیجہ نکلا تو میں آرٹس میں اوّل تھا۔ میری والدہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اور میرے والد بھی زیرِلب مُسکرا رہے تھے۔ مگر اس کے بعد جب مجھے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل کرایا گیا تو میں اوجِ ثریا سے تحت الثریٰ میں تو نہ اُترا البتہ کہیں درمیان میں ضرور معلق ہو گیا یہ 1939ء کی بات ہے۔ اُن دنوں گورنمنٹ کالج لاہور کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ نہر سویز کے مشرق میں واقع ساری دنیا کا بہترین تعلیمی ادارہ ہے ہندوستان بھر کے منتخب طلبا ہر سال اس ادارے میں جمع ہو جاتے تھے۔ راجوں مہاراجوں کے سپوت نیز بڑے بڑے صنعت کاروں، جاگیرداروں، افسروں اور سیاسی لیڈروں کے صاحبزادے اس تعلیمی ادارے کی طرف رجوع کرتے مگر انھیں کسی کی سفارش کی بنا پر نہیں بلکہ تعلیم میں اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر داخل کیا جاتا۔ سو گورنمنٹ کالج لاہور میں ان دنوں لیاقت اور امارت کا سنجوگ بالعموم دیکھنے میں آتا۔ میں اس کالج میں داخل ہوا تو ان دونوں سے محروم تھا۔ محروم ان معنوں میں کہ معاشی اعتبار سے تو میں کالج کے آخری بیس تیس لڑکوں میں شامل تھا۔ جب کہ تعلیمی اعتبار سے بھی میں "قابلِ ذکر" نہیں تھا۔ تھرڈ ایئر میں تقریباً ڈیڑھ سو طالب علم تھے۔ میرا رول نمبر 56 تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ گورنمنٹ کالج جھنگ سے گورنمنٹ کالج لاہور تک پہنچتے پہنچتے میں 56 قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ چنانچہ احساسِ کمتری نے مجھے دبوچ لیا اور پھر چار برس تک مجھے اپنے پنجوں سے آزاد نہ کیا۔ میں باقی تمام طلبا سے الگ تھلگ رہنے لگا۔ کسی تقریری مقابلے یا کھیل میں بھی حصہ نہ لیا۔ کوئی دوست نہ بنایا۔ سارا وقت اپنی معیت میں گزارنے لگا۔ میرے لئے تنہائی کا یہ تجربہ انوکھا تھا۔ میں جب سلانوالی میں بیمار پڑا اور تنہائی کی دیوی سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو مجھے محسوس ہوا تھا کہ میں بے آباد جزیرے میں قید کر دیا گیا ہوں۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں آ کر محسوس ہوا کہ میں انبوہ میں تنہا ہوں گویا تنہائی کی دیوی ایک قدم اور میری طرف بڑھ آئی تھی۔ اپنی معیت میں رہنے کا یہ تجربہ اُس فارسی مصرع کے بمصداق تھا کہ

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ای

چنانچہ مجھے قعرِ دریا ہمہ وقت اپنے سامنے دکھائی دیتا۔ اب میری عمر تقریباً اٹھارہ برس کی تھی۔ مجھ پر جوانی تو آ گئی تھی تاہم جوانی نے کسی جگری دوست کی طرح مجھ سے اچانک معانقہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ دبے پاؤں آ کر آہستہ سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ معاً میں اپنے اردگرد کے ماحول کو ایک نئی نظر سے دیکھنے لگا۔ معاشرتی سطح کے کئی سوال میرے ذہن میں کلبلانے لگے۔ مگر میرے لئے ان میں سے ہر سوال ریاضی کا کوئی سوال نہیں تھا جسے میں باہر سے حل کرنے کی کوشش کرتا بلکہ ہر سوال میرے داخلی کرب سے پھوٹا تھا لہٰذا جذبات میں ملفوف تھا۔

مگر نہ تو میں اپنے کسی ہم جماعت کو اپنے ان نئے نویلے سوالات میں شریک کر سکتا تھا۔ نہ ابھی اس قابل تھا کہ

کتابوں کے مطالعہ سے کسی نتیجے پر پہنچتا۔ لہٰذا میں نے خود کو سامنے بٹھا کر سوال وجواب کا سلسلہ شروع کر دیا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ خود پر اپنے اندر کے اس انسان کو منکشف کرنے کی کوشش کرنے لگا جو احساسِ تنہائی میں لپٹا ہوا تھا اور عجیب بات یہ ہے کہ جب میں اظہار کے شدید دباؤ میں آ کر اس داخلی کرب سے دوچار ہوا تو شاعری کی دیوی میری مدد کو پہنچ گئی۔ شاعری کی دیوی سے یہ میری دوسری ملاقات تھی۔ اس زمانے کے لکھے ہوئے اشعار اب مجھے یاد نہیں ہیں۔ (میں اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھ رہا تھا۔) البتہ ایک انگریزی نظم کی یہ چند لائنیں آج بھی یاد ہیں:

DARKNESS FALLS

BRUSHING LIGHT AWAY, SWEEPING DAY ASIDE I STAND FOR LORN NEAR A SILENT TREE

WITH MIND SUBDUED AT LAST

THE WOUND OF MY SOUL IS STILL AJAR AND THE STARS ARE SHINING GINGERLY!

اُردو اشعار بھی اسی وضع کے تھے۔ البتہ بعض میں اُن صوفیانہ ضرب الامثال کا عکس بھی تھا جو میں نے اپنے گھر میں اکثر سُنی تھیں۔ مجھے اپنے یہ اشعار اس قدر عزیز تھے کہ ان کی اشاعت بھی مجھے گوارا نہیں تھی۔ کیونکہ یہ مبہم سا خدشہ میرے دل میں موجود تھا کہ اگر یہ اشعار شائع ہو گئے تو پھر صرف میرے نہیں رہیں گے بلکہ پبلک پراپرٹی بن جائیں گے اور میں بلا شرکتِ غیرے ان کی معیت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کا آرزومند تھا۔ البتہ ایم۔ اے کے آخری سال تک پہنچتے پہنچتے میں ایک حد تک اپنی اس ''خود غرضی'' پر غالب آ گیا تھا۔ چنانچہ ایک روز میں نے ایک کشمیری پنڈت جی کو جو میرے ہم جماعت تھے اپنے چند اشعار سنائے۔ خدا جانے پنڈت جی نے ان اشعار میں معانی کی کون سی نئی پرتیں دریافت کر لی تھیں کہ انھوں نے اچھل اچھل کر ایسے جذباتی انداز میں مجھے داد دی کہ میں شرمسار ہو گیا۔ اس کے دو برس بعد وہ مجھے ایک روز سرینگر میں مل گئے۔ چھوٹتے ہی کہنے لگے: ''وہی اشعار پھر سناؤ!'' میں نے سنا دیئے۔ دیر تک جھومتے رہے مگر اب میں خود شعر کو پہچاننے لگا تھا۔ چنانچہ میں نے ایک روز کالج کے ایام کا یہ سارا شعری سرمایہ چولہے میں جلا دیا اور خود شعلے کی طرح آزاد ہو گیا۔ مگر ذکر کالج کے ایام کا تھا۔ ان دنوں میں ''راوی'' التزام کے ساتھ پڑھتا تھا۔ محمد اجمل (بعد ازاں ڈاکٹر محمد اجمل) اس کے مدیر تھے مگر میرا ان سے کوئی تعارف نہیں تھا۔ راوی میں لکھنے والے دوسرے طلبا سے بھی میری کوئی واقفیت نہیں تھی۔ ان حضرات میں سے کسی کو اس بات کا علم تک نہ تھا کہ ایک ''سایہ'' سا ہمہ وقت ان کا ہم رکاب ہے۔ اُن دنوں مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں نے ایک طلسمی ٹوپی پہن رکھی ہے۔ یعنی میں تو سب کو دیکھ سکتا ہوں مگر کوئی مجھے نہیں دیکھ سکتا۔

سلیم کو گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ ملا تو مجھے محسوس ہوا کہ خود میں نے ایک بار پھر گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا ہے۔ چنانچہ میں تقریباً ہر روز گورنمنٹ کالج جاتا۔ میرزا ریاض کے کمرے میں سب لوگ جمع ہو جاتے۔ چائے کا دور چلتا۔ مگر ادب کی کم، ملازمتوں اور سکنڈلز کی باتیں زیادہ ہوتیں۔ مشکور حسین یاد ہمہ وقت مرکزِ گفتگو بلکہ مرکزِ جاہ تھے۔ سب کو

ہنساتے، ہر روز اپنے بارے میں ایسے ایسے ''انکشافات'' کرتے کہ ہم سب ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتے ...... کالج میں مرزا منور، غلام الثقلین نقوی، صابر لودھی، سلیم اختر، اصغر سلیم، ملک بشیر الرحمٰن اور مشرف انصاری...... ان سب سے خوب باتیں ہوتیں۔ غلام الثقلین نقوی تو خیر لاہوری ادبا میں شامل ہی نہیں تھے۔ ملازمت کی مجبوری تھی ورنہ وہ شاید لاہور میں رہنا بھی پسند نہ کرتے۔ صابر لودھی سے ملاقاتوں کا سلسلہ تو اسی روز شروع ہو گیا تھا جب اوراق کے اجرا کے فوراً بعد میں نے ان کی بیگم فرخندہ لودھی کا افسانہ ''پارہی'' شائع کیا تھا اور جو شائع ہوتے ہی مشہور ہو گیا تھا۔ فرخندہ لودھی اور غلام الثقلین نقوی...... دونوں اپنے اپنے میدان میں بہت اچھے افسانہ نگار تھے۔ اگر زمانہ ساز ہوتے تو مفادات کی فصل کاٹتے جیسا کہ ان کے معاصرین کاٹ رہے تھے۔ مگر اصلاً دیہاتی ہونے کے باعث دونوں نے اپنے اپنے گھروں میں پناہ لے لی تھی اور کارواں آگے بڑھ گیا تھا۔ میرزا ریاض کے لیے ادب زندگی اور موت کا مسئلہ نہیں تھا۔ ان کی زیادہ تر مصروفیات غیر ادبی تھیں۔ سلیم اختر بہت AMBITIOUS تھے اور جلد از جلد اپنے لیے ادب کے میدان میں کوئی ''مقام'' بنانے کے لیے کوشاں تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ''اوراق'' کو بطورِ زینہ استعمال کیا۔ اور مدیرانِ اوراق نے اس سلسلے میں ان کی بھرپور معاونت کی۔ مرزا منور سرگودھا کے رہنے والے ہیں۔ لہٰذا لاہور میں رہنے کے باوجود جذباتی طور پر ''سرگودھا'' ہی میں مقیم تھے۔ ان سے زیادہ تر سرگودھا کی شخصیتوں کے بارے میں ہی گفتگو ہوتی۔ میں گورنمنٹ کالج جاتا تو ان سب کرم فرماؤں سے ملتا۔ مگر میری اصل ملاقات گورنمنٹ کالج سے ہوتی۔ میں پورے کالج میں گھومتا۔ ان کمروں کو جا کر دیکھتا، جن میں میں بطورِ طالب علم بیٹھا کرتا تھا۔ ایک روز میں نے اپنا مخصوص ڈیسک DESK بھی تلاش کر لیا (یا کم از کم اس وہم میں مبتلا ہوا کہ یہ میرا ہی ڈیسک تھا) اس پر کھدے ہوئے حروف مدھم پڑ گئے تھے مگر میں کسی نہ کسی طرح ان میں اپنے نام کی پرچھائیں دیکھنے لگا تھا۔ گورنمنٹ کالج میں گھومتے ہوئے تیس سال پہلے کی یادیں مجھے اپنے گھیرے میں لے لیتیں، یوں محسوس ہوتا جیسے ایچ جی ویلز کی ٹائم مشین میں بیٹھ کر میں دوبارہ اُس زمانے میں چلا گیا ہوں جب میں ایک سائے کی طرح گورنمنٹ کالج میں پھرا کرتا تھا۔ کئی چہرے میرے ذہن کی سکرین پر اُبھر آئے۔ مجھے ان کے نام بُھول گئے تھے، مگر ان کے خدوخال پوری طرح یاد تھے۔ البتہ اُستادوں کے چہرے دل پر اس طور نقش تھے کہ ان کے ناموں کے بھلانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پرنسپل سوندھی، پروفیسر سراج، صوفی تبسم ...... کوئی طالب علم ان کے ناموں کو کیسے بُھلا سکتا ہے؟

صابر لودھی کے خاکے

ڈاکٹر انور سدید

گورنمنٹ کالج لاہور میں ۱۹۶۱ء سے ۱۹۹۴ء تک تعلیمی خدمات انجام دے کر ریٹائر ہو جانے والے پروفیسر صابر لودھی کو مبدائے فیاض نے فنون لطیفہ کے اعلیٰ ذوق سے نوازا تھا۔ وہ فطری ادیب تھے۔ ابتدا شاعری سے کی اور ایسی اچھی نظمیں تخلیق کیں کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے ممتاز ادبی رسالہ نقوش کے لیے ایک سال کی شاعری کا جائزہ لکھا تو صابر لودھی کی نظموں کا ذکر بھی کیا جو اس حقیقت کا غماز ہے کہ صابر لودھی اگر شاعری کے تخلیقی سلسلے کو برقرار رکھتے تو اپنے معاصرین میں نمایاں مقام حاصل کر لیتے لیکن طالب علمی کے زمانے میں ہی انہوں نے شاعری ترک کر دی۔ ان کے ایک دوست بتاتے ہیں کہ انہوں نے یہ فیصلہ ایک جذباتی سانحے کے بعد کیا تھا۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ممتاز افسانہ نگار فرخندہ لودھی کے ساتھ شادی ہو گئی تو صابر لودھی نے اردو افسانے میں ان کی امتیازی حیثیت کو قائم رکھنے میں' اس مفروضے کو ثبات عطا کیا کہ ''ایک گھر میں صرف ایک ادیب ہی سما سکتا ہے۔'' چنانچہ فرخندہ افسانہ لکھ لیتیں تو پھول صابر لودھی صاحب کے دل میں مہکتے کہ یہ منفرد قسم کا افسانہ ان کی شریک حیات نے تخلیق کیا تھا۔ تاہم اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ اپنے باطن میں موجود فطری ادیب کو زندہ رکھا۔ اردو اور انگریزی ادب کے مطالعے کو وسعت دی اور معاشرے کو ادیب کی آنکھ سے دیکھا تو کئی معروف شخصیات کو موضوعات کی حیثیت دی اور ان کے خاکے لکھے اور اپنی زندگی میں ادب کا جتنا ریاض کیا تھا لاشعوری طور پر اسے خاکہ نگاری میں سمو دیا۔ ان کی بیگم فرخندہ لودھی نے شہادت دی ہے کہ ''صابر لودھی خاکہ اڑانے سے احتراز کرتے ہیں۔ قلم کو ایسا کنٹرول میں رکھ کر چلاتے ہیں کہ خاکہ لکھوانے والا باغ باغ ہو جاتا ہے اور اپنے حلقۂ احباب میں دکھاتا' سناتا پھرتا ہے اور اب تو ان کی خاکہ نگاری کی دھوم کچھ اس انداز سے مچی ہے کہ دور دور سے خاکہ لکھوانے کی فرمائش اور سفارشیں آنے لگی ہیں

''میرا خاکہ لکھ دو۔''

''میرا بھی۔''

''اور میرا بھی۔۔۔۔''

موڈ بن جائے تو لکھ دیتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ صابر لودھی نے اپنے خاکوں کی طباعت و اشاعت میں کبھی دلچسپی نہیں لی۔ ان کے لکھے ہوئے جو خاکے ڈاکٹر وزیر آغا کے رسالہ ''اوراق'' اور گورنمنٹ کالج لاہور کے رسالہ ''راوی'' میں چھپے' وہ ان لوگوں نے خود بھیجے تھے۔ جنہیں صابر لودھی نے موضوع بنایا تھا۔ انہوں نے اپنی خاکہ نگاری کو اہم نہیں سمجھا تو اس کی ایک وجہ تو یہ بتائی۔ ''ہمارے گھر میں فرخندہ لودھی افسانے اور ناول تخلیق کرتی تھیں اور فکشن لکھنے والا اپنے کرداروں کے ذریعے شخصیت کی تخلیق کرتا ہے۔'' اس کے برعکس خاکہ نگار کے بارے میں ان کا نظریہ یہ تھا کہ وہ شخصیت کے وجود سے تخلیقی عمل کو بروئے کار لانے کی بھی سعی ہے وہ شخصیت کے طلسم کدے سے اپنے فن میں نکھار لاتا ہے۔ اس محکم دلیل کی اساس پر صابر لودھی کا

قول فیصل یہ تھا کہ ''خاکے کی تخلیق ثانوی درجے پر آتی ہے۔'' اس فیصلے کے تحت ہی انہوں نے اپنے خاکوں کو کتاب کی صورت میں محفوظ کرنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی اور اس ضمن میں دوستوں کے علاوہ اپنی بیگم فرخندہ لودھی کے اصرار کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ لیکن جب فرخندہ کو بیماریوں نے صاحب فراش کر دیا اور صابر لودھی ان کی تیمارداری کے لیے گھر کی چار دیواری تک محدود ہو گئے تو ان کے دل میں یہ خیال ملال پیدا کرنے لگا کہ فرخندہ کی تمام تر تمنائیں حسرتوں میں بدلتی رہیں اور اس کی ایک خواہش یہ بھی تھی کہ صابر لودھی صاحب بھی کچھ لکھیں۔ چنانچہ ان کی کم از کم ایک خواہش کو حسرت میں تبدیل ہونے سے بچانے کے لیے پرانے رسائل سے اپنے لکھے ہوئے گم شدہ خاکے بازیافت کئے اور ایک کتاب مرتب کر ڈالی جس کا عنوان ان کی اور اورنٹیل کالج لاہور میں شریک کار عارفہ شہزاد نے میر تقی میر کے اس شعر

''یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ''
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

سے ''بھلایا نہ جائے گا'' تجویز کیا۔ جبکہ فرخندہ نے کتاب کا نام ''اکثر یاد آتے ہیں'' پیش کیا تھا لیکن خبر ملی کہ اس نام سے ایک کتاب پہلے بھی چھپ چکی ہے۔ چنانچہ صابر لودھی صاحب نے اول الذکر نام قبول کر لیا اور یہ کتاب شائع ہوئی تو اسے لاہور کی چند نامور شخصیات کے تہذیبی، علمی، ادبی اور معاشرتی نقوش کا مرقع تسلیم کیا گیا۔

صابر لودھی کا خاندان ریاست پٹیالہ کی بستی پٹھاناں سے آزادی کے بعد ہجرت کر کے پاکستان میں آ گیا تھا۔ انہوں نے ایم۔ اے اردو کا امتحان اورنٹیل کالج لاہور سے پاس کیا اور عملی زندگی کا آغاز ایچی سن کالج لاہور سے کیا۔ پھر اوکاڑا اور مظفر گڑھ کے ڈگری کالجوں میں اردو کے لیکچرار کی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۶۱ء میں لاہور آ گئے اور ۱۹۹۴ء میں اس کالج سے ریٹائر ہوئے تو ''پروفیسر آف اردو'' کے عہدے پر پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی زندگی کے ۳۳ برس راوین کی حیثیت میں گزارے اور ہزاروں طالب علموں کی تربیت گورنمنٹ کالج کی تابندہ روایات کے مطابق کی۔ صابر لودھی خاکہ نگاری کی طرف آئے تو انہوں نے ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر محمد اجمل، قیوم نظر، عبدالمجید اعوان، فرخندہ لودھی، ڈاکٹر محمد حمید الدین، مرزا محمد منور، غلام الثقلین نقوی، میرزا ریاض اور جعفر بلوچ کو اہمیت دی جو گورنمنٹ کالج کے ساتھ مختلف حیثیتوں میں انتظامی اور تعلیمی امور انجام دینے کے لیے وابستہ تھے اور نہ صرف سابقہ روایات کی آبیاری کر رہے تھے۔ بلکہ نئی اور صحت مند روایات کو بھی جنم دے رہے تھے۔ صابر لودھی کی خاکہ نگاری میں جو تنظیم و تہذیب نظر آتی ہے۔ وہ گورنمنٹ کالج کی عطا ہے۔ انہوں نے پرنسپل نذیر احمد اور ڈاکٹر محمد اجمل کی شخصیت کا نقش ان کے کردار کی پختگی سے مصور کیا ہے اور ہمیں باور کرایا ہے۔ ''ڈاکٹر سید نذیر احمد نے دلوں کا موم بن کر زندگی کے دن گزارے۔ اس لیے وہ آج بھی ہمارے درمیان موجود ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ ان کا خیال آتا ہے تو صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کا یہ شعر ذہن میں اُبھرتا ہے۔

بکھری ہیں فضاؤں میں اس طرح تری یادیں
جس طرف نظر اٹھی، آواز تری آئی

ڈاکٹر محمد اجمل کے بارے میں ان کا مشاہدہ تھا کہ وہ اپنی علمی اور تہذیبی راویت کی سر سبز و شاداب بیل سے پیوستہ تھے۔ وطن کی سرزمین کا کلچر، ان کے وجود کو پختگی، مٹھاس اور ٹھنڈک عطا کرتا تھا۔ مذہبی اور دینی عقائد اور روحانی عرفان کی سبز رداان کا حصار تھا اور محشر بپا کرنے والے انقلابی تصورات ان کے اندر کے اجمل کو ہلاتے رہتے تھے۔''

ڈاکٹر محمد اجمل نے گورنمنٹ کالج میں طالب علمی کا طویل دور گزارا تھا اور راوین روایت اساتذہ کے سامنے زانوئے

تلمذ تہہ کیا تھا اور اس کالج کے پرنسپل کی حیثیت میں ان روایات کو استحکام عطا کیا۔ ڈاکٹر نذیر احمد راوین نہیں تھے۔ صابر لودھی نے لکھا ہے۔

''ڈاکٹر نذیر احمد کی نیک نامی کے کئی روپ ہیں۔ علم دوست' دانش ور' سائنس دان' دلدادہ ادب' شعر و سخن کے متوالے' موسیقی کے رسیا' یاروں کے یار' مگر انہوں نے زیادہ شہرت گورنمنٹ کالج اور لاہور کے پرنسپل کی حیثیت سے حاصل کی اور یہ شہرت ان کا حق تھا کہ انہوں نے اپنی تمام صلاحیتیں اس کالج کو بنانے اور سنوارنے پر صرف کر دیں۔ جتنا پیار اپنے دو حقیقی بیٹوں سے کیا' اتنا ہی پیار اپنی درسگاہ کے ہزاروں بیٹوں اور بیٹیوں سے کیا۔''

گورنمنٹ کالج لاہور کے ایک اور پرنسپل جنہیں صابر لودھی نے خاکہ نگار کی آنکھ سے دیکھا ڈاکٹر عبدالمجید اعوان ہیں جو بطور پرنسپل تشریف لائے تو عام سے آدمی تھے۔ یہاں سے فارغ ہوئے تو بھی عام سے آدمی تھے۔ لیکن اپنی آمد و رفت کے درمیانی وقفے میں آپ نے عام لوگوں کو خاص آدمی بنا دیا۔ صابر لودھی نے لکھا ہے۔

''ڈاکٹر عبدالمجید اعوان نے عجز اور نیاز مندی کا انداز دلبرانہ اختیار کیا اور دلوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ ڈاکٹر نذیر احمد کے مسلک کو آگے بڑھانے آئے تھے۔ اپریل ۱۹۸۱ء سے جنوری ۱۹۹۳ء تک قریباً تیرہ برس آپ نے کالج پر نہیں' دلوں پر حکومت کی۔ گورنمنٹ کالج کی ۱۲۵ سالہ تاریخ میں ڈاکٹر جی' ڈبلیو لائنز اور پروفیسر ڈبلیو بیل کے بعد گورنمنٹ کالج میں بطور پرنسپل' طویل قیام کی مدت آپ کے حصے میں آئی اور آپ نے اپنے عمل سے اپنے ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔ نام مطلوب تھا' رخشِ عمر رو میں تھا' باگ پر ہاتھ اور پاؤں رکاب میں۔ حواس مجتمع کیے اور فیض کے اسباب بناتے چلے گئے۔''

ڈاکٹر نذیر احمد' ڈاکٹر محمد اجمل اور ڈاکٹر عبدالمجید اعوان کے خاکوں میں صابر لودھی کی چشم حقیقت نگار عمودی سمت میں اٹھتی ہے اور ان چہروں کو روشن کرتی چلی جاتی ہے جن کے معمول سے عظیم روایات کا تصور گاتھک طرز کی عمارت سے وابستہ ہوتا چلا گیا۔ ایسی ہی ایک شخصیت ڈاکٹر محمد حمید الدین کی تھی جو فلسفے کے استاد اور اپنے شعبے کے صدر تھے۔ ان کی نگرانی میں ''مجلس اقبال'' ایک دلبستان کی صورت اختیار کر گئی اور جو طلباء اول اول شوقیہ شاعر یا افسانہ نگار بن کر مجلس میں شریک ہوئے وہ بعد میں پیشہ ور نقاد اور مشاعرہ لوٹنے والے شاعر بنے۔ بے مقصد جوش نے اعتدال کا راستہ اختیار کیا۔ ڈاکٹر محمد حمید الدین کی تربیت سے وہ سوچنے پر مائل ہوئے۔ اس خاکے میں ڈاکٹر محمد حمید الدین کی فلسفے کی محفلوں میں نکتہ آفرینیاں' اور تنقیدی محفلوں میں نوجوانوں کے جوش و جذبے کو حد اعتدال میں رکھنے کے واقعات بڑے دلچسپ ہیں اور یہ مماثلت ڈاکٹر صاحب کے مجلسی سلیقے کے آئینہ دار ہیں۔ صابر لودھی صاحب نے ایک واقعہ یوں لکھا ہے۔

''مجلس اقبال'' کے ایک اجلاس میں اعجاز بٹالوی نے ایک جنسی افسانہ ''تخت نہیں مانگتی'' پڑھا۔ ان پر خاصی گرما گرم بحث ہوئی' جیلانی کامران نے ذرا کھل کر اور میں نے دبی زبان میں افسانے کے خلاف رائے دی۔ چند جوشیلے نوجوانوں نے افسانے کی تنقیص کی۔ صاحب افسانہ (اعجاز بٹالوی) بھی بحث میں کود پڑے۔ ڈاکٹر محمد حمید الدین نے بڑے سلیقے سے بحث کو سمیٹا۔ نرمی سے

نوجوانوں کے جوش کو ٹھنڈا کیا۔ افسانے کے فن کی تعریف کی مگر اعجاز بٹالوی کو یہ احساس بھی دلایا کہ انہوں نے اپنے افسانے کے لیے سامعین کے انتخاب میں غلطی کی ہے۔ تندی صہبا آبگینے کی برداشت کے مطابق ہونی چاہیے۔"

صابر لودھی نے ڈاکٹر محمد حمید الدین کی کرکٹ اور موسیقی سے محبت کے علاوہ ان کی خوش لباسی کا تذکرہ بھی خوبصورت الفاظ میں کیا۔ لیکن یہ بھی لکھا ہے کہ وہ نماز کے بعد طویل وظیفہ پڑھتے تھے اس نے بھی بڑے رنگ دکھائے اور آخر میں ان سے محبت اور عقیدت کا زاویہ ابھارا تو لکھا۔

"ڈاکٹر حمید الدین کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ فلسفہ کی کتابوں کو وہ گھول کر پی گئے تھے لیکن سمندر کی طرح ٹھہرے ہوئے تھے۔ سکوت اور وظیفہ' ان کی شخصیت کے یہی دو پہلو انہیں محبوب ہستی بنا گئے۔ مجلس اقبال' گینڈرز کی دکان' کرکٹ اور ملک تاج دین کے کمرے کی پرسکون خاموشی ان کے فرار کی راہیں تھیں۔۔۔۔ان کی اصلی منزل علم کا حصول تھا۔"

گورنمنٹ کالج کے اساتذہ کے معروضی مطالعے کی مثالیں قیوم نظر' مرزا محمد منور' اور غلام الثقلین نقوی کے خاکوں سے دی جا سکتی ہیں۔ ان خاکوں میں صابر لودھی کی نظر افقی سمت میں دیکھتی ہے اور ان کی پوری شخصیت کو اجاگر کرتی چلی جاتی ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد' ڈاکٹر محمد اجمل اور ڈاکٹر محمد حمید الدین کو صابر لودھی نے فاصلے سے دیکھا ہے لیکن قیوم نظر' مرزا احمد منور اور غلام الثقلین نقوی ہی نہیں میرزا ریاض اور جعفر بلوچ کے خاکوں میں مشاہدات بہت قریب کے ہیں اور وہ ان سے گورنمنٹ کالج کی کشادہ فضا میں روز ملتے ہیں تو صرف ان کے چہرے نہیں دیکھتے بلکہ ان کے احساسات کا مطالعہ بھی کرتے ہیں اور اپنے اظہار میں حق گوئی اور بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ قیوم نظر پر خاکے کا آغاز دیکھیے کتنا دلکش ہے لیکن اس میں درد کی لہر بھی موجزن ہے۔

"قیوم نظر کے قہقہے کو ان کی شاعری سے زیادہ شہرت ملی۔ ان کی اداسی کو کسی نے محسوس نہیں کیا۔ عبدالقیوم بٹ کرکٹ کھیلتا اور قہقہے لگاتا رہتا' ان کا ہمزاد قیوم نظر کے غم کی کسک محسوس کرتا اور شعر کہتا رہا۔ قیوم نظر کا یہی اسلوب زندگی تھا۔ وہ پانچ بھائیوں اور دو بہنوں میں سب سے بڑے اور سعادت مند بچے تھے۔ اس لیے بچپن ہی سے سرپرستی کے رتبے پر فائز ہو گئے۔ والد بزرگوار نے مختصر عمر پائی تھی۔"

قیوم نظر کے خاکے میں دکھ کی رو زیر سطح رہتی ہے۔ پیش منظر میں جو قیوم نظر آتا ہے وہ حقیقت کے باطن سے لطیفے کو ابھار رہا ہے اور خوش ہو رہا ہے۔ صابر لودھی نے اس خاکے میں قیوم نظر کی لطیفہ سازی کو بطور خاص اجاگر کیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

"آئیڈیل بک ہاؤس میں چند دوست بیٹھے تھے۔ قیوم نظیر میر محفل تھے۔ مشکور حسین یاد اپنے دولت مند ہونے کا خواب سنا رہے تھے۔" بس جی شیخوپورہ والی میری زمین پر کاغذ کا بڑا کارخانہ لگنے والا ہے۔ بھٹو صاحب کے پاس ہم دس لاکھ کا منصوبہ لے کر گئے تھے۔ انہوں نے کہا۔" ایک کروڑ کیوں نہیں؟" ہمارے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ بھئی واہ! زمین میری دوسروں کا۔ روپے

میں آٹھ آنے میری شراکت ہے۔ بس جی! سال کے اندر اندر کروڑوں میں کھیلنے لگوں گا۔'' قیوم نظر نے مشکور حسین یاد کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔ ''ٹھہرو ٹھہرو۔۔۔ کروڑوں میں آپ نے ''ک'' زائد لگا دیا ہے۔ بس اسے درست کرلیں۔''

قہقہہ بلند ہوا اور مشکور حسین یاد کا خواب چھناکے سے ٹوٹ گیا۔

☆......☆......☆

قیوم نظر کے لفظوں کے کھیل سے ایک اور لطیفہ یوں برآمد ہوا ہے۔

''پروفیسر صدیق کلیم کی کتاب ''دم نیم سوز'' چھپ کر آئی۔ کچھ ہی عرصہ بعد صدیق کلیم نے انٹر کے طلباء کے لیے انگریزی نصاب کی ایک کتاب songs of tales کے نام سے مرتب کی۔ یہ کتاب قیوم نظر کے سامنے آئی تو ان کی رگ ظرافت پھڑک اٹھی۔ اس وقت ان کے پاس پروفیسر رؤف انجم بیٹھے تھے۔ ان سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

''پروفیسر صاحب کو دم کیوں پسند ہے۔'' پہلے انہوں نے دم نیم سوز (دم نیم سوز) کے نام سے اپنا مجموعہ چھپوایا اور اب۔'' ڈموں tales کے گیت کے عنوان سے یہ کتاب مرتب کردی۔''

اس خاکے میں صابر لودھی نے قیوم نظر کی شخصیت کی دردمندانہ عکاسی کی ہے اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قیوم نظر سکھ میں بے قابو نہیں ہوئے۔ دکھوں کو خندہ پیشانی سے جھیلا۔ کسی سے شکوہ نہیں کیا۔ فقیرانہ آئے صدا کر چلے۔ پھر بھی زندگی کی چال چل گئی شاید۔'' راوین قیوم نظر کو اپنی عمر کی آخری حصے میں چار بیٹوں کی موت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا اور انہوں نے اپنی کلیات'' قلب ونظر کے سلسلے'' کا'' سیاہ حاشیہ'' خود ہی لکھ دیا۔

مرزا محمد منور کے خاکے میں صابر لودھی نے اپنے علاج کو مغلوں کے مخصوص خصائل اور گورنمنٹ کالج کی روایات سے بازیافت کیا ہے۔ اور طنز لطیف سے منور صاحب کی انفرادیت کا نقش ابھارا ہے۔

''مغلوں کو علم کی زیادہ ضرورت نہیں ہوتی۔ خدا نے انہیں ایسا ذہن رسا عطا کیا ہے کہ بے علم رہ کر بھی'' دین الٰہی'' کی بنیاد رکھتے ہیں اور معمولی مطالعے سے نبوت کا دعویٰ بھی کر سکتے ہیں لیکن مرزا منور نے اس روایت کو توڑا اور اپنے مطالعے اور ہمت سے کام لے کر گل دوستی کے رنگ اور خوشبو کو اپنایا۔ وہ منتخب کتابوں کے عمیق مطالعہ کرتے ہیں اور دوستی کے رشتے کا ہر صورت میں احترام کرتے ہیں جس طرح وہ اپنی زیر مطالعہ کتابوں کا تذکرہ کرتے ہیں اسی طرح جوش اور جذبے کے ساتھ وہ اپنے احباب کی باتیں سناتے ہیں۔ جس طرح ان کے مطالعے کے بہت سے دائرے ہیں اسی طرح ان کے احباب کے بھی بہت سے دائرے ہیں۔''

صابر لودھی نے مرزا محمد منور کی عادات کا مطالعہ کیا تو ان کے مشاہدے میں ان کے بزرگوں کی تہذیب کے دو خارجی آثار آئے۔

''ایک تو یہ کہ مرزا صاحب ہاتھ میں گلاب کی ٹہنی پکڑے باغ جناح کی بارہ دری کی سیڑھیوں پر جا بیٹھتے ہیں اور دوسرے یہ کہ کبھی کبھار اپنے کمرے میں دربار لگاتے ہیں۔ دربار خاص میں اقبالیات کے ماہرین اور نقاد شریک ہوتے ہیں اور دربار عام میں مجھ جیسے نیاز مند سلام شوق ادا کرتے

ہیں۔''

ایک شائستہ مزاج انسان کا یہ خاکہ ہمیں مرزا محمد منور کے نہاں خانوں کی سیر کراتا ہے تو گورنمنٹ کالج سے ان کی محبت کو بھی اجاگر کرتا ہے اور وہ گورنمنٹ کالج میں تعلیم نہ پانے کے باوجود سچے راوین محسوس ہوتے ہیں۔

معروف افسانہ نگار غلام الثقلین نقوی سینٹرل ٹریننگ کالج کی عزلت نشینی چھوڑ کر گورنمنٹ کالج کی مخصوص تہذیبی فضا میں آئے تھے اور صابر لودھی کے شریک کار بنے تھے۔ لیکن ان کے افسانوں کی خوشبو اس کالج میں پہلے پہنچ چکی تھی۔ صابر لودھی نے اپنی طالب علمی کے زمانے کا یہ واقعہ ان کے خاکے میں درج کیا ہے کہ

''ایک دن پروفیسر قیوم نظر نے اورینٹل کالج میں ممتاز مفتی کی نفسیاتی کہانیوں اور غلام عباس کی کاری گری پر بلند آہنگ لیکچر دے ڈالا۔ اچانک پوچھا'' ایسے افسانہ نگار کا نام بتاؤ جس کی لطیف زبان میں ہمارے اپنے پنجاب کا لہجہ اور مقامی الفاظ کی آمیزش ہے'' ہم خاموش رہے تو انہوں نے قہقہہ لگایا اور کہا'' غلام الثقلین نقوی ہم قہقہے اور نام کے بوجھ تلے دب گئے۔''

انہیں نقوی صاحب کے بارے میں ڈاکٹر سہیل بخاری نے لکھا تھا کہ ان کے افسانوں میں شیطانوں کا کال ہے اور ان کے ایک مہربان نے کہا تھا'' نقوی صاحب'' باوضو ہو کر افسانہ لکھتے ہیں۔

نقوی صاحب گورنمنٹ کالج آ گئے تو صابر لودھی کو انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع مل گیا اور ۱۹۸۳ء میں گورنمنٹ کالج سے ریٹائرڈ ہوئے تو لودھی صاحب کو ان کی الوداعی تقریب میں ان کا خاکہ پڑھنے کا موقع مل گیا۔ یہ خاکہ اگرچہ ایک تقریب کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے لکھا گیا ہے لیکن صابر لودھی نے ان کی فطرت کا سادہ اور سچا نقش اُجاگر کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ان کی درویش طبعی کا ذکر کیا تو لکھا۔

''غلام الثقلین نقوی کو اپنے آپ کو مقبول بنانے کا گر نہیں آتا۔ وہ پبلک ریلیشنگ کی ماڈرن ٹیکنیک سے واقف ہیں لیکن اس پر عمل کرنے کا ان میں حوصلہ نہیں۔ وہ کالم نویسوں کے پیچھے نہیں بھاگتے۔ ریڈیو اور ٹی وی کے پروڈیوسروں سے مراسم قائم نہیں کرتے۔ اصلی تے وڈے راویئنز کی طرح اپنے کمرہ نمبرے میں بیٹھے رہتے ہیں کہ جس کو ضرورت ہوگی خود چل کر آئے گا۔ انٹرویو لے گا۔ تصویریں بنائے گا۔

ان کے فن کی عظمت کے تذکرے میں شہادت ڈاکٹر محمد اجمل کو فراہم کی جو کالج کے پرنسپل تھے۔ صابر لکھتے ہیں

''ایک بار ڈاکٹر محمد اجمل انہیں ڈھونڈتے ہوئے آئے تھے۔ نقوی صاحب کمرے میں موجود نہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے میری عزت افزائی کی' بہت دیر تک بیٹھے رہے اور نقوی صاحب کے اوراق میں شائع ہونے والے ایک مضمون کی تعریف کرتے رہے۔ اس مضمون میں نقوی صاحب نے جدید افسانے پر بحث کی تھی۔ اس عرصے میں نقوی صاحب بھی پہنچ گئے۔ ڈاکٹر صاحب فرما رہے تھے۔

''بھئی کمال ہے۔ آپ کے فن اور علم کا معترف ہوا ہوں۔''

نقوی صاحب کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔''

صابر لودھی نے نقوی صاحب کا خاکہ ایک مخلص دوست کی سچی محبت میں ڈوب کر لکھا ہے اور ان کی طبعی شرافت کا خوبصورت نقش تراشا ہے۔

مرزا ریاض کے بارے میں انہوں نے بلند بانگ انداز میں لکھ دیا کہ وہ میرے دوست نہیں تھے اور وہ صدر شعبہ بن کر ہم پر مسلط ہوئے تھے اور صدر کی کرسی سنبھالی تو چائے کا خانہ خالی کر دیا کہ پلانا ان کے مسلک میں شامل نہیں تھا۔ ان کی باتوں سے کبھی ناامیدی نہ جھلکی لیکن کبھی کبھار ایک ادھ بات اپنے دل میں گانٹھ کی طرح بٹھا لیتے اور دیکھتے' دوستی' دشمنی میں تبدیل ہو جاتی ڈاکٹر وحید قریشی' ڈاکٹر وزیر آغا اور محمد طفیل کی وہ دل سے عزت کرتے تھے۔ لیکن وفات سے چند سال قبل وہ ان سے ناراض ہو گئے۔ ناراضی کی وجوہ بے حد معمولی تھیں البتہ ان کے نیاز مندوں نے محض تماش بینی کے لیے اختلافات کو ہوا دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔"

مرزا ریاض گورنمنٹ کالج کی روایت کو توڑ کر اپنے زور پر شعبہ اردو میں آئے تھے۔ اور ملک بشیر الرحمٰن کے ریٹائرڈ ہونے کے بعد انہوں نے صدر کی کرسی بھی سنبھالی تھی لیکن مرزا ریاض کو کسی نے صدر شعبہ نہ سمجھا اور انہوں نے ایک کہانی کار اور شریک کار کے طور پر ہی وقت گزارا اور بے زبانی کی منزل پر پہنچ گئے۔ صابر لودھی کا یہ خاکہ گورنمنٹ کالج کی روایت شکنی سے ابھرا ہے۔ اس لیے اس کا ذائقہ مختلف ہے اور اس ذیلی عنوان میں یہ مصرع درج ہے۔ "سکھائیں تم نے ہمیں کج ادائیاں کیا کیا۔"

جعفر بلوچ کا خاکہ پڑھ کر ان کی سیرت کے ایسے خطوط سامنے آتے ہیں جو صاحب نظر فرقہ پوشوں کی مجالس میں پروان چڑھتے ہیں اور جعفر بلوچ دردمند دوست معلوم ہوتے ہیں' خود اپنی بڑائی ظاہر نہیں کرتے۔ دوسروں کو بڑا ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ لودھی صاحب کی ایک دلچسپ دریافت یہ ہے کہ جعفر بلوچ کو غیر شعوری طور پر چھوڑی گئی (یائے نسبتی) سے بڑا لگاؤ ہے۔ ان کے دوستوں اور بزرگوں کی طویل فہرست میں چند قابل ذکر نام یہ ہیں۔

حکیم سید عبدالمجید راحی' آغا صادق حسین نقوی' ساقی الحسینی' خیال امروہوی' پرویز جالندھری' عاصی کرنالی' ارشد ملتانی' ایاز صدیقی' غافل کرنالی' غفور ستاری وغیرہ۔

لاہور میں ورود کے بعد جن اصحاب کو انہوں نے اپنا بزرگ اور دوست سمجھا ان میں انجم رومانی' نعیم صدیقی' نظیر لدھیانوی' طاہر شادانی' مشرف انصاری' غلام الثقلین نقوی' تحسین فاقی' عطاء الحق قاسمی' اسلم کولسری' منیر قصوری' اور منیر لاہوری شامل ہیں۔ لیکن وہ مجھ پر نگاہ غلط انداز ڈالتے ہیں کہ میرے نام کے ساتھ "لودھی" کا لاحقہ لگا ہوا ہے۔ علامہ اقبال سے انہیں بڑی عقیدت ہے کہ شاعر مشرق اور عظیم مفکر ہونے کے ساتھ وہ سیالکوٹی بھی ہیں۔" صابر لودھی نے جعفر بلوچ کی شخصیت کا مطالعہ گہری نظروں سے کیا اور اس سادہ مزاج' درویش طبع کی سیرت کے نقوش اپنے خوبصورت اسلوب میں پیش کر دیئے۔

فرخندہ لودھی نے اپنی ملازمت کے آخری پانچ سال گورنمنٹ کالج لاہور کی لائبریری کو سنوارنے میں گزارے اور اس نسبت سے وہ بھی "راوین" موسوم ہونے کا حق رکھتی ہیں۔ تاہم ان کی بنیادی حیثیت یہ ہے کہ وہ لودھی صاحب کی بیگم تھیں۔ ہمارے ادیبوں نے اپنی بیگمات کے خاکے لکھنے سے بالعموم دانستہ گریز کیا ہے کہ اس نوع کی کاوش میں کئی مشکل مقامات آتے ہیں' جن کا احساس صابر لودھی کو بھی تھا۔ چنانچہ انہوں نے جرأت مندی سے فرخندہ کا خاکہ لکھا اور اپنی غیر جانبداری قائم رکھنے کی کوشش کی لیکن اس خاکے کو اپنے نام سے چھپنے کی اجازت نہیں دی۔ چنانچہ فرخندہ لودھی کا یہ خاکہ جس کا ذیلی عنوان "میں ہوں اپنی شکست کی آواز" ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے رسالہ "راوی" میں طارق عزیز سندھو کے نام سے چھپا۔ صابر لودھی بالعموم مختصر خاکہ لکھتے ہیں لیکن فرخندہ لودھی کے خاکے میں وہ گھر کے بھیدی کی صورت میں سامنے

آ ئے اور شوق بات بڑھاتا اور خاکے کو طویل کرتا چلا گیا۔ اسے ہم بآسانی فرخندہ کی سوانح عمری بھی قرار دے سکتے ہیں لیکن صابر لودھی کے جذباتی اسلوب اور نفسیاتی مطالعے نے اسے ''چیزے دیگر'' بنا دیا ہے اور ہمارے سامنے ایک ایسی عورت کا سراپا مجسم صورت میں آ جاتا ہے جو مرد معاشرے میں مجبور و محکوم ہے۔ شدید ترین احساس کمتری کا شکار ہے اور پے در پے شکستوں کا سامنا کر رہی ہے۔

تنہائی اور اداسی اس کا مقدر ہے۔ کوئی انجانا خوف اس کی نفسیات کا حصہ بن گیا ہے۔ عملی زندگی میں بھی اسے اپنی مرضی کی ملازمت نہ ملی اور وہ طمانیت سے محروم چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ طاری کیے زندگی بسر کرتی رہی۔ صابر لودھی نے مشاہدہ کیا کہ

> ''فرخندہ لودھی کو لائبریرین کا پیشہ تضحیک آمیز لگا۔ وہ کامل اختیار کی طلب گار تھی لیکن اس کا واسطہ نا اہل پرنسپلوں سے پڑا۔ اسے محنت کی عادت تھی۔ اپنی کارکردگی کے اظہار کی اس میں جرأت نہ تھی چنانچہ انتظامیہ سے اس کے تعلقات ویسے ہی رہے جیسے فرنگی دور حکومت میں گورے اور کالے کے درمیان رہا کرتے تھے۔۔۔۔ شادی ہوئی تو ایک قید خانے سے دوسرے قید خانے میں منتقل ہو گئی۔ میکے میں جبر تھا اور سسرال میں صبر۔ نتیجہ ایک ہی تھا۔۔۔ اگر پاکستانی معاشرے میں سوئمبر کی رسم ہوتی تو فرخندہ اپنی ورمالا کسی ایسے سیلانی فاریسٹ آفیسر قسم کے مرد کے گلے میں ڈالتی جو شب و روز اسے سفر میں رکھتا۔ سرسوں کے کھیتوں کی خوشبو اور پہاڑی جھرنوں کے نغمے اس کا حاصل حیات بنتے۔ لیکن اس کے گھر میں جو پہلا برسر روزگار رشتہ آیا فرخندہ نے قبول کر لیا اور اسے اپنا مقدر بنا لیا۔ اس کے اور اس کے میاں صابر لودھی کے مزاج میں بعد المشرقین ہے۔۔۔ اصل میں فرخندہ یونانی مفکر زینو کی شاگرد اور صابر لودھی یونانی فلسفی اپی غورس کا پیرو ہے۔ دونوں کی اپنی اپنی سوچ ہے۔ اپنے اپنے دائرے ہیں تاہم فرخندہ پرسکون زندگی گزار رہی ہے۔ اضطراب' محرومی اور شکست کے باوجود پرسکون۔۔۔ اس اطمینان میں اس کے اپنے فلسفے کا دخل ہے۔ میاں بیوی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ ساتھ ساتھ چلو' دور دور رہو۔ سو دونوں دور دور رہ کر ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔''

اقتباس طویل ہو گیا ہے لیکن مجھے اب بھی مختصر محسوس ہوتا ہے۔ یہ خاکہ فنی اعتبار سے اتنا پختہ اور مکمل ہے کہ پورے کا پورا اقتباس کیا جا سکتا ہے۔ اہل ادب اسے بلا تردد کلاسیک کا درجہ دے سکتے ہیں ایک اور خاکہ صابر لودھی نے فرخندہ کی وفات کے بعد اس وقت لکھا جب فرخندہ ان کے لیے محرم سے نامحرم ہو گئی تھی۔ اس خاکے کے آخری پیراگراف میں صابر لودھی نے اپنے دل کا حال لکھا ہے۔

> ''۔۔۔ میں تنہا رہ گیا۔ پہلے روز جب دن ڈھلا اور سائے لمبے ہو گئے تو اداسی کا احساس ہوا۔ جب فرخندہ زندہ تھی تو ہم دونوں اچھے وقت کا انتظار کرتے تھے۔ اب احساس ہوتا ہے کہ اچھے دن' خوبصورت لمحے وہی ہوتے ہیں جو ہم بسر کرتے ہیں۔ جن لمحوں کا خواب دیکھا جاتا ہے وہ خواب

ہی رہتے ہیں۔''

یہ خاکہ ایک وفا شعار شوہر کی پلکوں پر اٹکا ہوا آنسو ہے اور پڑھنے والوں کو غم زدہ کر دیتا ہے۔

خاکوں کی اس کتاب (بھلایا نہ جائے گا) کے آخری روا ین ڈاکٹر وزیر آغا ہیں جن سے صابر لودھی کا عقیدت کا رشتہ تھا اور عقیدت کی وجہ یہ بتائی ہے کہ وزیر آغا کی کتابوں نے ان کی سوچ کی راہیں متعین کی تھیں۔ انہوں نے اردو شاعری کا مزاج ''تخلیقی عمل'' اور ''شام کی منڈیرسے'' کا مطالعہ کیا تو وزیر آغا انہیں نظیرا کبرآبادی کے ''راج ہنس'' نظر آئے جسے آخر کے تئیس برس اکیلے ہی سفر کرنا پڑتا ہے۔'' صابر لودھی نے اس خاکے میں واقعات اور معاملات پر انحصار کرنے کی بجائے اپنے تاثرات کو منکشف کرنے کی کاوش کی تو لکھا۔

''وزیر آغا کا رویہ تہارہ جانے والے بلند پرواز انسان کا رویہ ہے۔ وہ کسی ادبی گروہ سے وابستہ نہیں۔ حالانکہ ان کے نکتہ چینوں نے ان کے ادبی جریدہ ''اوراق'' میں لکھنے والوں کو (دبستانِ سرگودھا) کے ارکان کہا ہے اور وزیر آغا کو اس دبستان کا بانی قرار دیا ہے۔ دراصل دانشوروں کا حلقہ ہی ان کا دبستان ہے۔ دانشوروں کی محفل جم جائے تو وزیر آغا چہک اٹھتے ہیں ورنہ تنہائی میں خود کلامی کرتے ہیں (ان کی کتاب) ''دستک اس دروازے پہ'' اس خود کلامی کا ثبوت ہے۔ وزیر آغا مزاجاً تنہائی پسند ہیں۔ وہ اپنے وجود کی مٹی کو اپنے آنسوؤں سے نرم کر کے فطرت کے گل بوٹے تیار کرتے ہیں۔ کاشت کار ہیں۔ زرعی نظام سے وابستہ ہیں۔ فطرت سے ہمکلام ہونے کا موقع انہیں بار بار ملتا ہے۔ اس لیے ان کے اندر کا شاعر یا فن کار ہجوم سے دور بھگا لے جاتا ہے۔''

کاشتکاری کے فعال عمل نے وزیر آغا کو زمین اور اس کے اتحاد سے والہانہ محبت کرنا سکھایا۔ چنانچہ زمین ان کی فکر کا مرکزی نشان بن گئی۔ جس کا تخلیقی، تنقیدی اظہار متعدد زاویوں اور انوکھے طریقوں سے ان کی تحریروں میں در آیا لیکن اسے سراہا نہ گیا۔ صابر لودھی نے وزیر آغا کے خاکے میں اس نکتے کو بھی اہمیت دی اور لکھا۔

''زمیں سے والہانہ محبت کے تذکرے کو وزیر آغا کے مخالفین نے ایک منفی صورت عطا کی اور کہا کہ وزیر آغا ''دھرتی پوجا'' کا قائل ہے۔ وزیر آغا نے ایک زمانے میں میرا جی کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے دھرتی پوجا کو اصطلاح وضع کی تھی اور یاروں نے اس ہتھیار کا استعمال وزیر آغا ہی کے خلاف کیا۔ وزیر آغا نے اپنی دھرتی سے محبت کا جو نظریہ پیش کیا تھا وہ تو ارضِ وطن کے حوالے سے تھا اور دوسرا اس حوالے سے تھا کہ زمین اور اس کے اثمار ہی سے کلچر اور تہذیب جنم لیتے ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں جب پاک سرزمین پر دشمنوں کی یلغار کا احساس ہوا تو وزیر آغا کے عام مخالفین کو اچانک دھرتی سے محبت ہوگئی۔''

جھنگ سے ایف۔ اے کرنے کے بعد وزیر آغا نے چار سال گورنمنٹ کالج لاہور میں گزارے اور یہاں سے معاشیات میں ایم اے کیا۔ صابر لودھی نے لکھا ہے۔

''وزیر آغا کو اپنے راوین ہونے پر فخر ہے لیکن وہ راوین ہونے کے کھوکھلے نعرے نہیں لگاتے۔ ان کی خود نوشت سوانح عمری (شام کی منڈیر سے) میں گورنمنٹ کالج کی محبت کا اظہار اس طرح کیا گیا ہے۔

''سلیم (آغا) کو گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ ملا تو مجھے محسوس ہوا کہ خود میں نے ایک بار پھر گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ چنانچہ میں تقریباً ہر روز کالج جاتا۔۔۔۔ میں پورے کالج میں گھومتا۔ ان کمروں کو جا کر دیکھتا جن میں بطور طالب علم میں بیٹھا کرتا تھا۔''

صابر لودھی نے اس خاکے میں وزیر آغا کو ''نظریہ ساز راوین'' قرار دیا ہے اور ان کی شخصیت کا نقش اپنے تاثرات کی وضعداری سے مرتب کیا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ اور سید وقار عظیم کے خاکے صابر لودھی کے اس زمانے کی یادگار ہیں جب وہ اورینٹل کالج لاہور میں ایم۔اے اردو کے طالب علم تھے اور دوسرے لڑکوں کے ساتھ ان اساتذہ کو شوخ نظروں سے دیکھ رہے تھے اور کالج میں رونما ہونے والی سیاست کے واقعات بھی بیان کر رہے تھے جن سے ان اساتذہ کا کردار بھی مرتب کیا جا سکتا ہے۔

سید عبداللہ صاحب کے خاکے سے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔ صابر لودھی لکھتے ہیں۔

''ڈاکٹر محمد باقر اور پروفیسر وزیر الحسن عابدی ایک ہی شعبے میں تھے۔ بلڈ پریشر کے مریض تھے۔ ذرا سی بات پر دونوں جلال میں آ جاتے۔ ایک دن نائب قاصد (عبداللہ) سراسیمگی کے عالم میں سید صاحب کے کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔ ''ڈاکٹر باقر صاحب اور عابدی صاحب ساتھ والے کمرے میں گتھم گتھا ہو رہے ہیں۔۔۔ جلدی سے آیئے۔''

سید صاحب نے بڑے سکون سے جواب دیا۔'' کچھ نہیں ہوتا۔ دو سانڈ سینگ پھنسائے کھڑے ہیں۔ تنگ آ کر اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ جائیں گے۔ ہم تو کمزور دنبے ہیں۔ خواہ مخواہ ان میں پھنس کر قربان ہو جائیں گے۔''

اور ایسا ہی ہوا۔ دونوں بزرگ ایک دوسرے سے الجھے۔ بلند آواز میں گرجے، برسے پھر کانپنے لگے اور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ عبداللہ قاصد انہیں ٹھنڈا پانی پلانے لگا۔

☆......☆......☆

ایک دن میں نے سید عبداللہ صاحب سے خواہ مخواہ ایک سوال کیا۔ وحید قریشی صاحب کو کالج میں لے آیئے۔ تحقیق کے آدمی ہیں۔'' سید صاحب مسکرائے اور کہنے لگے۔ ''ہاں انہیں یہاں ہونا چاہیے۔ لیکن میں پہلے یہاں سے جانے کا بندوبست کر لوں۔''

☆......☆......☆

جس اسامی پر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا تقرر ہوا۔ اس کا اشتہار بڑا دلچسپ تھا۔ ایک ایسے استاد کی ضرورت ہے جو (ایم۔اے اردو) فرسٹ کلاس ہو۔ فاضل اردو ہو۔ کم سے کم چھ ماہ یونیورسٹی کے کسی شعبے میں ریسرچ سکالر رہا ہو۔ ''اور عمر کی مخصوص قید بھی تھی) سٹاف روم میں سب کے سامنے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اشتہار پڑھا اور طنزاً تبصرہ کیا۔ ''اتنے طویل اشتہار کی کیا ضرورت تھی۔ غلام حسین ذوالفقار کی چھوٹی سی تصویر چھپواتے اور نیچے لکھتے۔ ''اس امیدوار کی ضرورت ہے۔''

☆......☆......☆

اس خاکے میں صابر لودھی نے اپنا ایک ذاتی واقعہ بھی لکھا ہے کہ وہ اورینٹل کالج میں جذباتی دور سے گزر رہے تھے۔

انہیں معلوم ہی نہ ہوا کہ ایک لڑکی کے احترام میں کب چاہت پیدا ہو گئی اور ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ لطیف جذبات اگر دائمی رشتے میں تبدیل ہو جائیں تو کیسا رہے؟ لڑکی نے بتایا۔ ''سید صاحب کو ہمارے خاندان میں سرپرست کی سی حیثیت حاصل ہے۔ وہ آپ کے حق میں رائے دے دیں۔ تو معاملہ منٹوں میں طے ہو سکتا ہے۔ صابر لودھی نے سید صاحب کو اعتماد میں لے لیا۔ وہ انہیں جناح گارڈن کے ریستوران میں لے گئے ۔ چائے کی میز پر اچانک سید صاحب نے کہا۔ ''دعا کے لیے ہاتھ اٹھاؤ۔ اللہ تمہارے لیے وہ کرے جو تمہارے حق میں بہترین ہو۔ آج رات میں تمہارے بارے میں رائے دینے جا رہا ہوں۔''

صابر لودھی بہت خوش ہوئے۔ اگلے دن اس لڑکی سے ملاقات ہوئی تو وہ بولی۔ ''سید صاحب ہماری طرف آئے تھے۔ تمہارا قصیدہ پڑھ رہے تھے۔ تمہاری ترقی کے لیے دعا گو تھے لیکن اپنا فیصلہ انہوں نے ان الفاظ میں سنایا۔ ''وہ بڑا ہی متلون مزاج ہے۔ شادی کی حماقت نہ کیجیے۔''

صابر لودھی لکھتے ہیں۔ ''اس دن معلوم ہوا کہ رشتے آسمان پر طے ہوتے ہیں۔ ہم بے وجہ جذباتی ہو کر اپنی زندگی بربادی کے راستے پر ڈال دیتے ہیں۔''

یہ خاکہ ظاہر کرتا ہے کہ صابر لودھی اپنی طالب علمی کے زمانے میں ہی شخصیات کو اور زبانی واقعات کو کتنی زیرک نگہی سے دیکھتے تھے اور بعد میں کتنی چابک دستی سے انہیں کاغذ پر اتارتے تھے۔ خاکوں کی اس کتاب کی ایک اور خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں ایمرسن کالج ملتان اور گورنمنٹ کالج ساہیوال۔۔۔ دونوں تعلیمی اداروں پر صابر لودھی نے اپنے محبوب کرداروں جیسی نظر ڈالی ہے اور مستعد اساتذہ اور طلباء کو جو خواب و خیال ہو چکے ہیں اپنی یادوں سے بازیافت کر کے انہیں حیات نو دے دی۔ وہ یونیورسٹی اورینٹل کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور کا خاکہ بھی لکھنا چاہتے تھے۔'' لیکن فرشتۂ اجل نے انہیں یہ قرض ادا کرنے کی مہلت نہ دی۔ تاہم غنیمت ہے کہ صابر لودھی نے خاکوں پر عمدہ کتاب فرخندہ کی زندگی میں چھاپ دی تھی۔ ادبی دنیا میں اس کی پذیرائی وسیع پیمانے پر ہوئی اور صابر لودھی کو اردو خاکہ نگاروں کی صف اول میں جگہ دے دی گئی۔

تکریمِ رفتگاں اُجالتی ہے کوچہ و قریہ

(رفتگاں)

کاش میں انتظار حسین کی طرح لکھ سکتی

کشور ناہید

انتظار حسین کے جانے سے برصغیر کی بزم ادب پر ماتم کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ وہ ایک ایسا شخص، ایسا ادیب تھا کہ دنیا کے کونے کونے میں ان کی تحریر کی بازگشت تھی۔ کبھی سی ایم نعیم تو کبھی محمد عمر میمن تو کبھی فرانس پریچیڈ ان کی تحریروں کا ترجمہ کر کے خود کو خوش نصیب سمجھتے تھے۔ اردو ادب میں گنگا جمنی تہذیب، اسلوب اور تذکروں کو زندہ رکھنے والا وہ ایک شخص تھا۔ گیتا کی کہانیوں کو آج کے معاشرے کے منظرنامے میں زندہ رکھنے یا مہا بھارت ہو کہ خطبات علیؓ کے حوالے سے بیان کرنے کا وصف کسی اور میں نہیں تھا۔ ناول لکھے تو برصغیر کی تقسیم کو دل میں اُترنے والے اسلوب میں پیش کیا۔ کراچی کے خراب حالات کو ''آگے سمندر ہے'' میں ملبوس کیا۔ ضیاء الحق کے زمانے میں سڑک کنارے پھانسیاں دینے کے ظالمانہ رویے کا تذکرہ ناول میں سمو دیا۔ اپنے سارے دوستوں کے بارے میں لکھے ہوئے کالموں کو کتابی شکل میں مرتب کیا۔ میں نے اور نیاز صاحب نے ضد کر کے بچوں کے لیے کہانیاں لکھوائیں۔ مختار صدیقی نے ضد کر کے ٹی وی کے لیے ڈرامے لکھوائے۔ ضیا محی الدین نے اسٹیج پر پیش کئے۔ یہ وہ نیک شخص تھا جو صبح اُٹھ کر چڑیوں کے لیے روٹیوں کے ٹکڑے اکٹھے کر کے باہر لان میں ڈالتا۔ چڑیاں بھی اتنی مانوس ہو چکی تھیں کہ ان کے کندھوں پر آ کر بیٹھ جاتی تھیں۔ سمندر کنارے ایک ہوٹل میں جب روٹیوں کے ٹکڑے سمندر میں پھینکتے تو سارے بگلے اُڑ کر چاروں طرف بیٹھ جاتے۔ انتظار صاحب نے بیمار ہوتے ہوئے کسی سے کچھ بھی تو نہیں کہا۔ بس ایرج انہیں اُٹھا کر اسپتال لے گیا۔ پتہ نہیں اس سے ناراض ہو گئے تھے کہ پھر کسی بھی دوست کے آواز دینے پر نہ آنکھ کھولی نہ بات کی۔ آٹھ دن تک سارے ڈاکٹر سوچتے رہے اس بندے کے دماغ میں کتنی قوت ہے کہ سارے اعضاء کام کرنا چھوڑ چکے ہیں مگر دماغ ہے کہ سارے ڈاکٹروں کو چیلنج کر رہا تھا۔ گردے فیل ہو رہے تھے۔ پاؤں سوج گئے تھے مگر وہ شخص جسے انتظار حسین کہتے ہیں وہ نہیں مل رہا تھا۔ ان کے بھانجے استقبال مہدی نے مجھ تسلی دیتے ہوئے کہا: ''ارے روتی کیوں ہو ماموں ٹھیک ہو جائیں گے۔'' مجھ پتہ تھا عشرت آفریں روز امریکہ سے فون کر کے روتے ہوئے جھوٹ بولتی تھی: ''کشور آپا، انتظار صاحب ٹھیک ہو جائیں گے؟''

تعلقات میں ایسے پکے کہ چاہے حمید علوی ہو کہ حمید شاہد یا پھر ہماری نسل کے سارے ادیب، اتنی محبت سے ملنے والے کہ آج سب چھوٹے بڑے ادیبوں کو معلوم ہوتا گیا، سب لوگ آہوں اور سسکیوں کے ساتھ بول بھی نہیں سکتے تھے۔ جیسے جیسے عمر میں بڑھتے جا رہے تھے گفتگو اور تحریر میں اور بھی شگفتہ ہوتے جا رہے تھے۔ بار بار مجھے کہتے تم جب سے لاہور سے گئی ہو ہماری محفلیں ہی اُجڑ گئی ہیں۔ پھر جب بھی میں کسی فنکشن کے لیے اسلام آباد بلاتی، خوش ہو کر آتے۔ پہلے وہ منیر شیخ اور حمید علوی کے یہاں یا کبھی اپنے بھانجے استقبال مہدی یا حسن ظہیر کے یہاں رات کو رونق بخشتے، پھر میں اسلام آباد

آ گئی تو سارے چھوٹے بڑے ادیب' ضد کر کے خود آ جاتے کہ انتظار صاحب سے ملنا ہے۔ وہ اکثر خاموش رہتے مگر جب بولتے تو ایسا پٹاخہ فقرہ پھینکتے کہ سارا کمرہ قہقہوں سے گونجنے لگتا اور کبھی واہ واہ سے۔ جب انہیں فرانس کا عظیم ایوارڈ دینے کے لیے اسٹیج پہ بلایا جا رہا تھا تو وہ شرمائے سے بیٹھے رہے۔ ایرج نے انہیں اٹھایا' فرانسیسی سفیر نے ان کی توصیف میں گفتگو کی۔ دعوت تو اس دن بھی بڑی پُر تکلف تھی مگر انہیں تو میرے بھائی جان کے گھر کی نہاری' اصغر ندیم سید کے گھر کے قیمہ کریلے اور میرے گھر کی ماش کی دال ہمیشہ ہی یاد رہتی۔ حمید علوی ان کے پرانے ساتھی تھے۔ ان کے گھر جانا ایک اہم روایت تھی اور مریم مہدی جب بلاتی پوچھ لیتی: ''ماموں آپ آج کیا کھانا پسند کریں گے؟''

پبلشر نیاز صاحب ان کے لیے دوپہر کا خاص کھانا بنوا کر لاتے تھے۔ ہر چھ ماہ بعد نئی کتاب مرتب کرنے کی ضد کرتے۔ انتظار صاحب اپنے پرانے کالموں اور لاہور کی جلوہ گری پر کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے۔ کبھی اس کا نام ہوتا چراغوں کا دُھواں' کبھی جستجو کیا ہے' کبھی دلّی کی سیر کراتے کہ دلّی میں ہوں بیمار بھی ہوں پھر چار فلور چڑھ کر بالکل عینی آپا کی طرح شمیم حنفی اور صبا سے ملنے جاتے' چنے کی دال کا حلوہ فرمائش کر کے بنواتے۔ جب ڈاکٹر نارنگ ساہتیا اکیڈمی کے چیئرمین بنے تو انہوں نے پریم چند ایوارڈ جاری کیا۔ سب سے پہلا انعام انتظار حسین کو ملا۔ پھر ڈاکٹر نارنگ نے انہیں پورے ہندوستان کا دورہ کرنے اور مختلف زبانوں کے ادیبوں سے ملنے کی دعوت دی۔ اس دورے کی روئیداد بھی انتظار حسین نے ایسی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھی کہ مستنصر کی تحریریں بھی بھول گئیں۔ کسی دوسرے ملک جانا ہوتا تو آصف فرخی کو ساتھ لے کر جاتے۔ بس ایک ادیب تھا ظفر اقبال جس کے ساتھ ان کی چونچیں چلتی تھیں۔ کبھی وہ فقرہ مارتا' جواباً انتظار صاحب کمال کا کالم ہی لکھ دیتے۔ ان کے جانے کے بعد آبدیدہ ہو کر ظفر بھی مجھ سے کہہ رہا تھا۔ اب میں کس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کیا کروں گا۔ یوں تو وہ خود حسن عسکری کے تتبع میں رجعت پسند کہتے تھے مگر ساری پاکستان کی تاریخ کو کھنگال کر دیکھیں تو ان سے زیادہ ترقی پسند کوئی اور نظر نہیں آئے گا۔ نہ نعرے مارتے تھے نہ تحریر کے نشتر چلاتے تھے۔ وہ تو ماضی یاد کرتے ہوئے' مستقبل کے خوابوں کی کیاری سجاتے جاتے تھے۔ کاش مجھے بھی ایسا لکھنا آ جاتا۔

انتظار حسین کی افسانہ نگاری کا جوہر

سعادت سعید

ثقافت، ادب اور فن کے میدانوں میں جدید وقدیم کے صدیوں پرانے نزاع کو زمانہ حاضر یا عہد جاریہ میں موجود صورت حال کے تناظر ہی میں معنویت ملتی ہے۔ بہت سے ادیب اور فنکار باہمی نزاع کی اس صورت حال کی بنیاد پر اپنے کاروبار کو چلانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ یوں وہ ذاتی مفاد کی دنیا میں سانس لیتے ہوئے تاریخ کے باطن سے مغائرت آشنا ہو کر فراموشی کے گہرے غاروں میں گم ہو جاتے ہیں۔ اردو شعر و ادب سے تعلق رکھنے والی بہت سے عامیانہ شعور کے حامل افراد اسی نوع کے سانحے کا شکار ہوئے ہیں۔

ہمارے عہد کی اردو افسانوی کائنات میں چند ناموں کے سوا اکثر اسی حوالے سے اپنے انجام کو پہنچے ہیں۔ کسی افسانہ نگار کا اسلوب نیا تھا تو موضوع دقیانوسی، کسی کا موضوع نیا تھا تو اسلوب پیش پا افتادہ۔ ایسے میں ان کو عہد نو کے شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں قدم رکھنے کی جگہ بھی نہ مل سکی۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ انتظار حسین اردو افسانے کی منفرد اور بلند پایہ شخصیت کے بطور ادبی دنیا میں اپنا سفر مستانہ طے کر چکے ہیں اور باوجود اس کے کہ ان کا مدعائے قلبی انہیں بازگشت کی وادی کی راہ دکھا تا رہا اور ان پر ناسٹیلجک ہونے کے الزامات لگائے گئے، ان کے اسلوب کی علامتی سیماب کاری نے ان کی عصری اہمیت کو تسلیم کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔ علامت کی پارہ صفت معنویت اس داستان گو کی تو تا کہانیوں کو بیک وقت ازمنہ قدیم کے حویلی باغوں کے رسیا اور عصر حاضر کے ڈرائنگ روموں کے گپ شپ آشنا قارئین سے سند قبولیت دلوا چکی ہے۔ علامت کی صورت حال کے اسیر جس آئینہ خانے میں ہوتے ہیں اس میں شش جہتی معنویت کے ان دیکھے یعنی تاریک توانائی سے معمور خیالات ان کی حیرتوں کو منجمد نہیں ہونے دیتے۔ اسی نسبت سے انتظار حسین کے علامتی افسانوں کو اردو افسانے کے نئے جہان میں دانشور قارئین کی مکمل حمایت حاصل رہی ہے۔

انتظار حسین نے جان ڈیوی کی فلسفے کی ایک کتاب کا ترجمہ فلسفے کی نئی تشکیل کے نام سے کیا۔ اس سے ان کے فکری ذہن کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے کئی ناولوں کے ترجمے بھی کیے۔ نئی پود کے نام سے ترگنیف کے ناول کا ترجمہ بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اس ناول کا ایک اور ترجمہ باپ بیٹے کے نام سے بھی ہوا تھا۔ اس حوالے سے روسی زندگی، کلچر اور سیاست سے بھی ان کی واقفیت کا اندازہ لگ سکتا ہے۔ انتظار حسین کے ناولوں میں، آگے سمندر ہے،، بستی، سنگھاسن بتیسی (ناول)، تذکرہ، سعید کی پر اسرار زندگی (ناول)، شکستہ ستون پہ دھوپ (ناول)، چاند گہن، دن (ناولٹ) وغیرہ کو بھی پذیرائی ملی۔ اپنی دانست میں، اور علامتوں کا زوال ان کے نثری مضامین پر مشتمل مجموعے ہیں۔ جستجو کیا ہے اور چراغوں کا دھواں ان کی آپ بیتیاں ہیں۔ جل گرجے ان کی داستان ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انتظار حسین نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ ادب کی خدمت کرتے گزارا۔ ان کے انگریزی اور اردو کالم ان کے ادبی اور ثقافتی نظریات کے مرقعے ہیں علاوہ ازیں ان میں ان کے کاٹ دار جملے اور مستقل فکری زاویے جا بجا بکھرے نظر آتے ہیں۔ حلقہ ارباب ذوق میں تنقید سے گریز اور ٹی ہاؤس میں ادبی گفتگو سے اجتناب سے ان کے

بارے میں یہ اندازہ نہیں لگانا چاہیئے کہ وہ نظری اعتبار سے کچھ کہنا نہیں چاہتے تھے انہوں نے یہ کسر اپنے کالموں، مضمونوں، ناولوں، افسانوں اور آپ بیتیوں میں پوری کی۔اور اپنے نظریات کے مخالفوں کو اپنے مخصوص انداز سے ہدف تنقید بنایا۔حلقہ ارباب ذوق میں جن لوگوں نے انتظار حسین کے افسانوں اور دیگر تحریروں پر کھلی تنقید کی ان میں صفدر میر، عزیز الحق اور ان کے معتقدین کا خصوصی کردار ہے۔اس اجمال کی تفصیل آئندہ سطروں میں موجود ہے۔

انتظار حسین کے افسانوی مجموعوں آخری آدمی، شہر افسوس، کچھوے اور خالی پنجرہ، جنم کہانیاں، خیمے سے دور اور چند دوسرے کے حوالوں سے ان کی اس نادر تخلیقیت کو سراہا گیا ہے کہ جو ان کے فکری نقطہ نظر کی گہرائیوں سے نمودار ہوئی ہے۔ان کی علامتی کہانیوں میں آخری آدمی، پرچھائیں، زرد کتا، ہڈیوں کا ڈھانچہ، سوت کے تار، ہمسفر، بندر کہانی، کایا کلپ، سوئیاں، شہادت، وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے، پچھتاوا، ٹانگیں، وہ جو کھوئے گئے، دہلیز، کانا دجال، اپنی آگ کی طرف، سیڑھیاں اور'' شہر افسوس اہمیت کی حامل ہیں۔ پتے، کشتی، کچھوے، شور، اسیر، چکر اور صبح کے خوش نصیب وغیرہ'' آخری آدمی'' اور'' شہرافسوس'' کی طباعت کے بعد کے افسانے ہیں۔انتظار حسین کے افسانے قارئین کو افسانہ نویسی کے نئی جہتوں اور نئے ذائقوں سے آشنا کر چکے ہیں۔ان میں منتخب کردہ واقعات کے بیان میں تخلیقی زبان کے استعمال کو فوقیت ملی ہے۔

انتظار حسین نے اپنے افسانوں میں عصر حاضر کے پیچیدہ رزمیے کو اپنے متحیر کن مرصع لسانی اسلوب کی خوشبو سے مزین کیا ہے۔اس حقیقت کو تسلیم کیا جا چکا ہے کہ انتظار حسین ادب کے اس مکتب سے مسلک تھے کہ جس کا بنیادی نقطہ نظر یہ تھا کہ ادیب کو نہ تو مصلح اخلاق ہونا چاہیئے اور نہ ہی اس کا سروکار نعرہ بازی سے ہوتا ہے۔ان کے لیے ادب سیاست کی کتاب نہیں تھی اور وہ اس بات کے پرچارک تھے کہ ادیب کو ماہر اخلاقیات ہونے سے گریز کرنا چاہیئے۔انتظار حسین نے اپنے افسانوں میں اپنے عصر کی زوال پذیر اخلاقیات کا افسردہ دلی سے تذکرہ ضرور کیا ہے۔

یہ سامنے کی بات ہے کہ انتظار حسین اپنے مخصوص تصورات کو فنکارانہ حسن کاری سے پیش کرنے پر قادر تھے ۔اگر چہ بسا اوقات وہ اپنے ان تصورات کو کہ جو جبر کے دباؤ تلے پسنے والی جبلتوں کی کشاد اور انسانی آزادی کی ضرورت و حمایت سے متعلق تھے اپنے افسانوں میں نمایاں طور پر پیش کرتے تھے تاہم وہ معاشرے میں افراد کی بگٹٹ آزادی کے قائل نہیں تھے۔اس حوالے سے ان کے اندر ایک محتسب بھی موجود تھا جو انہیں اپنے افسانوں میں کھل کھیلنے سے مستقل بنیادوں پر روکتا تھا۔اس حوالے سے ایسپ کی کہانیوں اور کلیلہ و دمنہ میں موجود انسانی اخلاقیات کے وہ نہ صرف قائل تھے بلکہ ایسے طرز زندگی کی حمایت بھی کرتے تھے کہ جو صدیوں پرانے ثقافتی سانچوں میں ڈھلا ہوا تھا۔

ہمیں اس سچائی، مکمل طور پر ہم آہنگ ہو کر کہ کسی قوم کے زوال میں ''لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو'' کا منفی کردار ہوتا ہے، اس امر کا اظہار کرنا چاہیئے کہ ادب کو ماضی کے نگار خانوں سے باہر نہ نکالنا عہد حاضر کے مسائل سے آنکھیں بند کرنے کے مترادف ہے۔اس حوالے سے روایت پرستوں نے جس نوع کی زوال پرستی کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے اس کے نتیجے میں بہت سے مشرقی سماج ترقی کے زینوں تک آنے سے قاصر رہے ہیں۔وہ ادیب کہ جن کا ادب سماج کے زمینی حوالے سے زندہ فرد اور اس کے اجتماعی مسائل کے اظہار پر محیط ہوتا ہے اور وہ اپنے کشفی تصورات کا ایک عالم اصغر تخلیق کرتے ہیں، وہ صورت حال کا ادب لکھنے پر قادر ہوتے ہیں۔اس تناظر میں انتظار حسین ایک مفید مطلب یا حسب حال افسانہ نگار کی صورت دکھائی دیتے ہیں۔انہوں نے اپنے دور کی ہوا بستہ یا محبوس صورت حال اور اس کے متنوع

پہلوؤں کا تفتیشی جائزہ لیا ہے۔

بین الاقوامی سامراج اور ہندو پاک جنگوں کے حوالے سے انتظار حسین کے افسانوں میں مقامی رشتوں کے پس منظر کا باریک بینی سے جائزہ لیا گیا ہے۔انتظار حسین انور سجاد کی مانند جدید ادبی تحریکوں سے متعلقہ کئی موضوعات کو چھوتے ہیں لیکن ان کے دل میں کبھی یہ تمنا نہیں جاگی تھی کہ وہ وہ کسی سے جدید ہونے کی سند لیں یا کوئی انہیں ترقی پسند افسانہ نگار قرار دے۔

انتظار حسین کے افسانوں میں مرد اور عورت کے کردار فرسٹریشن کا سامنا کرتے ہیں، بے جائی کا شکار ہوتے ہیں، خبطی نظر آتے ہیں، تنہائی کے قیدی ہیں، جبر کو برداشتے ہیں، جبر کو چیلنجتے ہیں، مزاحمت منتخب کرتے ہیں، تنہائی سے لڑتے ہیں، دہشت سے گزرتے ہیں، خوف کا مقابلہ کرتے ہیں، انتشار میں زندہ رہتے ہیں اور ان اعمال کا سامنا کرتے ہوئے اپنی از سرِ نو بازیافت کے دروازے پر دستک دیتے ہیں۔

ان قیمتی موضوعات کے استعمال کے ساتھ ساتھ انتظار حسین نے انسانی نفسیات پر اثر ڈالنے والے نئے علم کا احاطہ بھی کیا ہے۔ان کے افسانوں میں جاگیردارانہ اخلاقیات کے اسیروں کی سرمایہ دارانہ سیٹ اپ میں بیگانگی اور گمشدہ چیزوں کی تلاش کا ناسٹیلجیا جیسے معاملات کو بھی جگہ ملی ہے۔یہ اور ان سے ملتے جلتے دیگر معاملے ان کے پسندیدہ موضوعات میں شامل ہیں۔علامتی اور استعاراتی اظہاریوں کی تلاش میں انہوں نے کایا کلپ کی مختلف النوع صورتوں میں منقلب ہوتے انسانوں اور جانوروں پر توجہ مرکوز کی۔ یہاں ہم اس حوالے سے کافکا، آئینیسکو اور آرول کا تذکرہ بھی کر سکتے ہیں کہ جن کے ہاں جانوروں سے متعلقہ قدیم اخلاقی کہانیوں کے سحر تلے رہتے ہوئے جو ادبی تجربات نظر آتے ہیں وہ انتظار حسین کی مطمعِ نظر کی جہت نمائی میں شامل ہیں۔ نئے نقادوں میں سے چند کہ جو انتظار حسین کو فیبلز اور لیجنڈز کا متلاشی ادیب سمجھتے ہیں، وہ انہیں ایسے جدید فکشن رائٹر کا مرتبہ دینے کے منکر ہیں کہ جنہوں نے زندہ وقوعات اور موضوعات کو از سرِ نو تخلیق کرنے کے رجحانات پر ارتکاز کیا ہے۔اس طرح کی خفیف آرا کا تخلیق کی عظیم مہارتوں سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔اگر کوئی مصنف فیبل کو اپنے معموں کے بیانِ نو کے لیے استعمال کرتا ہے تو اسے باسانی صاحبِ اسلوب قرار دیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک پرانی تکنیک کے تخلیقی استعمال سے اسے از سرِ نو زندہ کرنے کے درپے ہے۔

انتظار حسین نے کئی نئی تکنیکوں کا عمدہ استعمال کیا ہے۔وہ اپنے فکشن میں عربی، فارسی اور ہندی ادبوں، ثقافتوں اور مذہبوں میں موجود رنگا رنگ اسطوروں کے مہارت انگیز بیانیہ استعمال سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔لیکن ان کی علامتی اور خوش آہنگ تکنیک کے اپنی مختلف پرچھائیاں ہیں۔اگر وہ حقیقت پسندی کے مختلف اسالیب سے متعلقہ تکنیکیں استعمال بھی کرتے ہیں تو یہ کوئی سربستہ راز نہیں ہے کہ وہ اپنے تخیلاتی اسلوب کی مدد سے وہ ان کے جوہر کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ان کے ارتکازی دوہرے اسلوب نے اردو میں نئی تمازتی (پرومیتھیائی) افسانہ نگاری کی تشکیل میں ایک مرکزی کردار ادا کیا ہے۔لیکن ہمارا یہ پرومیتھیس اپنے ساتھ بجھی آگ لے کر آیا ہے۔یہ آگ وہ دیوتاؤں کی اجازت سے لایا ہے۔اس پس منظر میں وہ آزاد ہے اس لیے وہ اس دلسوز سائیکی پر حملہ آور بھی ہو سکتا ہے کہ جو آتش بجاں اخلاص کی طالب ہے۔

انتظار حسین نے ترقی پسند تحریک اور اس کے پرستاروں کی بلا تکلف مخالفت کی، صفدر میر خاص طور پر ان کی تنقید کا ہدف رہے کہ جن کے نام انہوں نے اپنی کتاب خالی پنجرہ معنون کی ہے۔خالی پنجرہ میں دیگر افسانوں کے ساتھ ساتھ ہمیں وہم وسواس کے رنگ میں رنگا تذکرہ رستاخیز بے جا المعروف بہ فسانہ عبرت بھی ملتا ہے۔اسے پریشانی کی فینٹسی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔اس میں افسانہ نگار نے حال کے لمحوں کو مستقبل کے دریچے میں سے جھانکا ہے۔یہ ایک علاقے کی

طنزیہ سرگزشت ہے جسے ہماری تاریخ کا عجوبہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے بیانیے سے واضح ہوتا ہے کہ ایک آفت زدہ زمانہ کہ جس میں ہم بس رہے ہیں تاریخ میں اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ اس اقلیم کے وسنیک تباہی کے رسیا ہیں۔ آفت زدہ زمانے میں ڈکیت اور ٹھگ بینک اور دوسرے خزانوں پر پل پڑے ہیں۔ ہر وہ چیز جسے پہلے قومی قرار دیا گیا اسے پہلے بدنام کیا گیا اور بعد ازاں اسے گہری فراموشی کے غاروں میں دھکیل دیا گیا۔ یوں مصنف نے اپنے زمانے کے ادبی، ثقافتی اور سماجی۔ سیاسی رویوں کو نشانہ تنقید بنانے کا کام بھی کیا ہے۔ انتظار حسین کے خیال میں۔ یہ عہد عجیب ہے فرقے، صوبے، بھائی اور شاعر ایک دوسرے سے متحارب ہیں۔ ایسے میں انہیں نپولین یاد آتا ہے جو دغا بازی اور انتقام بازی میں یکتا تھا۔ انتظار حسین نے اس تناظر میں اس علاقے کے ان فسطائی حاکموں کی بھی مذمت کی ہے جنھوں اس علاقے کے بانیوں کی جمہوریت اور ثقافت پر مبنی قراردادوں کو ماننے سے انکار کیا اور اپنی طرز نو کی بنیاد پرستی بدقسمت شہریوں پر مسلط کی۔ انتظار حسین وضاحت کرتے ہیں کہ اس عہد میں سزائی جزائی عناصر کی عمومی بہتات تھی۔ یہاں اگرچہ عریانی پر قدغنیں لگائی گئی تھیں لیکن گینگ ریپ پر وہ پرسکون رہا کرتے تھے۔

انتظار حسین کے پاس بے رحم انفرا سٹرکچر کی تہوں میں موجود صورت حال کا تجزیہ کرنے کا اپنا خاص وتیرہ تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے افسانے ان کی زندگی ہیں بلکہ زندگی سے بھی بڑھ کر کوئی شے۔

مسائل و معاملات پر ان کی نظریاتی منطق مربوط تھی۔ ان کا زندگی کو دیکھنے کا مہارت بھرا انداز اس قدر فکری ہے کہ انہیں ایک مفکر افسانہ نگار بھی کہا جا سکتا ہے۔ ان کے خیالات خود تنظیمی کے حامل غیر منقسم اور ترسیلی ہیں۔ اپنی مشہور تنقیدی کتاب علامتوں کا زوال کے ایک مضمون میں وہ کہتے ہیں عہد قدیم کی حکمرانی میں اشیا کے مابین ٹھوس رابطے ہوا کرتے تھے۔ زندگی خانوں میں منقسم نہیں تھی۔ روزگار کا حصول مشکل نہیں تھا اور تخلیق مکرر اور کام کے لیے وقت قطبین میں تقسیم نہیں تھا۔ ہمیں اس بات کا خیال رہنا چاہیئے کہ وہ معاشرے متحد الوجود تھی۔ مشین نے اس سماج کے حصوں کو مربوط نہیں رہنے دیا اور نئی تعلیم نے اس سماجی کل کے اندر اس طور دراڑیں پیدا کیں کہ ہر چیز ایک دوسرے سے پرے ہو چکی ہے۔ اب سماجی عمل تخلیقی سے زیادہ میکانگی ہو چکا ہے۔ ثقافتی زوال کا آغاز ایسے ہی ہوا۔ جب روزمرہ زندگی میں تخلیقی عمل رک جاتا ہے یا بے معنی ہو جاتا ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ ثقافت زوال آمادہ ہے۔

انتظار حسین کی قدیم اخلاقیات کا میکانگی اظہار، ماضی پرستی اور روایتی اعتقادات کم و بیش ان کی تمام اہم اور مشہور کتب کے سرنامے ہیں۔ لیکن بطور ادیب ان کی سلامتی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ انہوں نے کاروباری تحریروں سے گریز کیا۔ ان کی ادبی منزل ہمیشہ ان کے سامنے رہی، جس کی بدولت بطور ادیب ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ تاریخ سے منفک ہونے والا ادب کہ جو کاروباری منطق، عقیدہ جاتی عمومیت اور غیر مادی احساسات کا حامل ہو کم حیثیت ہوتا ہے۔

وہ ادب کہ جو انسانی، تشکیلی، تحیری اور احساساتی بنیادوں پر وجود پذیر ہوتا ہے نیا کہلاتا ہے۔ وہ ادیب کہ جو اپنی رکاوٹوں کے جبر کے دائرے میں رہتے ہیں روایت اور قدامت کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔ انیس ناگی سے معذرت کے ساتھ ایک اعلان کیا جا سکتا ہے کہ اپنی روایتی حسیت کے باوجود انتظار حسین تاریخ ادب میں زندہ رہنے کے امکانات کے حامل ہیں۔ اپنے زمانے کے مسئلے کی باریک بیں جانچ کے باوجود وہ اپنے انقلابی مخالفوں کو ہمیشہ یہ جواب دیتے رہے کہ "میں رجعت پسند ہوں"۔

کیا انتظار حسین نے اپنے زمانے کے مطالبات کو پورا کیا ہے؟ کیا وہ فی الحقیقت رجعت پسند ہیں؟ ان سوالات کا تعلق مستقبل کے قارئین اور نقادوں پر چھوڑتے ہیں۔

وارد ہونا داستان گو کا شہر ہجرت میں اور خائف ہونا الیاسف کے قبیلے کے بندروں سے

—مشرف عالم ذوقی

''جزیرے میں سمندر کا پانی امنڈا چلا آ رہا تھا—الیاسف نے درد سے صدا کی۔ کہ اے بنت الاخضر، اے وہ جس کے لیے میرا جی چاہتا ہے، تجھے میں اونچی چھت پر، بچھے ہوئے چھپر کھٹ پر اور بڑے درختوں کی گھنی شاخوں میں اور بلند برجیوں میں ڈھونڈھوں گا۔ تجھے سرپٹ دوڑتی دودھیا گھوڑیوں کی قسم ہے۔ قسم ہے کبوتروں کی جب وہ بلندیوں پر پرواز کرے۔ قسم ہے تجھے رات کی، جب وہ بھیگ جائے۔ قسم ہے تجھے رات کے اندھیروں کی جب وہ جسم میں اترنے لگے۔ قسم ہے تجھے اندھیرے اور نیند کی اور پلکوں کی، جب وہ نیند سے بوجھل ہو جائیں۔ تو مجھے آن مل۔ کہ تیرے لیے میرا جی چاہتا ہے۔ اور جب اس نے صدا کی تو بہت سے لفظ آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ جیسے زنجیر الجھ گئی ہو۔ جیسے لفظ مٹ رہے ہوں۔ الیاسف نے اپنی بدلتی ہوئی آواز پر غور کیا، کاش وہ اپنا چہرہ دیکھ سکتا۔''—آخری آدمی

الیاسف، قبیلے کا آخری آدمی تھا جو آدمی کی جون میں پیدا ہوا، اور جس نے آدمی کی جون میں ہی مرنے کی قسم کھائی تھی— مگر ایسی قسموں کا حاصل ہی کیا کہ جب قریہ میں خوف پھیلا ہو، صورتیں گم ہو رہی ہوں۔ خدوخال مسخ ہو رہے ہوں۔ بازار ویران اور ڈیوڑھیاں سونی ہو رہی ہوں۔ عالی شان چھتوں اور اونچے اونچے برجوں پر بندر چھائے ہوں۔ نفرت کی شدت نے آدمی کی کایا پلٹ دی ہو—ایسے میں الیاسف سڑکوں، دروں اور صنوبر کی کڑیوں والے مکان سے ہوتا ہوا ماضی کا رخ کرتا ہے— جب نیم شب کے 'چھید' کیے ہوئے جسم سے قطرہ قطرہ لہو ٹپک رہا تھا۔ جب میرٹھ، بلند شہر سے لے کر سارے ہندوستان میں حکومت برطانیہ نے توپوں کے منہ کھول دیے تھے۔ سونے کی چڑیا کہے جانے والے ملک کا الف لیلوی حسن غارت ہو چکا تھا— آزادی اپنے ساتھ تقسیم کی سوغات اور ہجرتوں کا زخم لے کر آئی تھی۔ ہزار برسوں کا ماضی اساطیری اور دیو مالائی قصے، کہانیوں سے کم نہ تھا۔

۷ دسمبر ۱۹۲۳ کو بلند شہر، میرٹھ میں پیدا ہونے والے انتظار حسین نے خوفناک بندروں کے اس میلے کو اتنے قریب سے دیکھا کہ ہجرت کے بعد بھی ماضی کی گٹھری اور پوٹلی سے خود کو آزاد نہ کر سکے۔ وہ ایک ایسے داستان گو تھے جس کا مکمل اثاثہ ماضی کی وہ داستانیں تھیں، جسے عمر کے آخری دور میں بھی، آخری ناول 'سنگھاسن بتیسی' کی تخلیق تک وہ خود سے الگ نہیں کر سکے— برسوں پہلے دوردرشن ٹی وی چینل پر گلزار کا ایک سیریل آتا تھا، 'پوٹلی بابا کی کہانی'—انتظار حسین کی داستانی شخصیت اس پوٹلی بابا سے مشابہت رکھتی تھی جو ماضی پرستی، ماضی پر نوحہ خوانی اور ماضی سے وابستہ داستانوں کی تلاش

میں، عمر کے آخری حصے تک بھٹکتا رہا۔ کبھی جاتک کتھاؤں کا سہارا، کبھی پنچ تنتر، دیو مالائی اور اساطیری، قصے کہانیوں میں پناہ تلاش کرنا — خارج سے باطن کے سفر تک حقیقت سے فرار اور تاریخ کے بے رحم زمانوں اور ماضی کی بھول بھلیاں میں خود کو گم کرنا — یہ راستے آسان نہیں تھے۔ لیکن شاعری سے فکشن کی دنیا میں قدم رکھنے تک انتظار حسین نے اسی راستہ کو اپنایا۔ اور فکشن کے موجودہ فارمیٹ اور Conditioning کو توڑتے ہوئے اس اجنبی راستے کو اپنایا، جس پر چلنے والے پہلے مسافر وہ خود تھے۔ بقول انتظار حسین۔

''حقیقت نگاری کا اسلوب اپنی آخری عمر پوری کر چکا تھا۔ یکا یک میں نے ایک افسانہ لکھا۔ آخری آدمی۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ میں جو افسانہ لکھ رہا ہوں، وہ ان افسانوں سے مختلف ہے، جو میں دس سال سے لکھ رہا تھا۔ یہ میں نے اُنسٹھ میں لکھا تھا۔''

منٹو بھی پاکستان جا کر ہندوستان اور بالخصوص ممبئی کو نہیں بھول سکے۔ لیکن منٹو کا رنگ و آہنگ، طرز بیان اور اسلوب مختلف تھا۔ وہ ماضی سے زیادہ حال اور مستقبل سے قریب تھا۔ اس کے یہاں حقیقت نگاری اور کہیں کہیں خود فریبی کے رنگ نمایاں ہیں۔ خود فریبی یہ کہ واقعات وحادثات کے خوفناک بہاؤ میں بھی وہ زندگی اور تسلی کا سامان کر لیتا ہے۔ انتظار حسین نے ماضی کی سرنگوں کے علاوہ کچھ بھی دیکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ 'آخری آدمی' میں، جزیرے میں سمندر کے پانی کا امنڈا چلا آنا تاریخ کے خطرناک پڑاؤ، دوقومی نظریہ، تقسیم اور ہجرت کے المیہ کو سامنے رکھتا ہے۔ الیاسف کی درد سے بھیگی ہوئی آواز بھی مصنف کی ہے، جہاں وہ اونچی چھت، چھپر کھٹ کا مکان، گھنے درختوں کی شاخوں، اور بلند برجوں میں اپنے گمشدہ ماضی کی تلاش کر رہا ہے۔ ایک ایسا ماضی جہاں خونخوار بندروں کی زد میں ایک ملک آ گیا تھا، جہاں زنجیریں الجھ گئی تھیں۔ لفظ مٹ گئے تھے — اپنا چہرہ بھی گم ہو گیا تھا۔

'خالی پنجرہ' میں اسی درد کی چیخ صاف صاف سنائی دیتی ہے —

'یا رامان اللہ، طوطا کہاں گیا؟'

'اڑ گیا۔'

'کیسے؟'

'کھڑکی کھلی رہ گئی، اڑ گیا۔'

'کوئی دوسرا طوطا مٹھو کی جگہ نہیں لے سکتا۔'

'نہیں یار۔'

'کیوں؟'

'میں نے بتایا، قریب والے امرود کے پیڑ میں طوطے کی ڈاریں بہت اتری ہیں۔ کیا پتہ کسی دن ڈار کے ساتھ وہ بھی چلا آئے۔ پنجرے کو دیکھے تو شاید اسے اپنا چھوڑا ہوا گھر یاد آ جائے۔'

— خالی پنجرہ۔

ماضی کے دریچوں سے پرکھوں کی داستان گوئی کی بازیافت کا راستہ کوئی آسان راستہ نہ تھا۔ پریم چند سے اب تک کے افسانوں میں اس داستان گوئی کا فقدان تھا، جس کا دامن مضبوطی سے انتظار حسین نے تھام لیا تھا — اس فن پر

انہیں ملکہ حاصل تھا۔ یہ رنگ جب سامنے آیا تو اردو فکشن کی دنیا ایک نئے ذائقہ سے مانوس ہوئی۔ یہ لہجہ نیا تھا، اسلوب منفرد، اس میں پرکھوں کے سنے سنائے قصوں، جاتک کتھاؤں، داستانوں، اساطیر، دیومالا، بوڑھی نانی اماں اور دادی اماں کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے قصوں، کہانیوں کی مہک شامل تھی۔ ترقی پسندی اور جدیدیت سے الگ یہ منفرد رنگ تھا جو داستانوں کی واپسی کا اعلان کر رہا تھا— یہ رنگ ان کے افسانوی مجموعے گلی کوچے، کنکری، آخری آدمی، شہر افسوس، کچھوے، خیمے سے دور، خالی پنجرہ، شہزاد کے نام، نئی پرانی کہانیاں، سمندر اجنبی ہے، ہندوستان سے آخری خط، جاتک کہانیاں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کے ناول آگے سمندر ہے، بستی، چاند گہن میں بھی شکستہ اور تاریخی عمارتوں کے حوالے سے، سمندر کی گھن گرج، بستی سے بلند ہونے والی مبہم چیخیں، تاریخ کے نقوش، ہجرت کے زخم اور ماضی کی گپھاؤں میں قید شب و روز کا سراغ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ ایک اقتباس دیکھیے۔

> ''ہمارا خاندان ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں بٹ کر بکھر گیا ہے اور میں اب لب گور بیٹھا ہوں سوچتا ہوں کہ میرے پاس جو امانت ہے اسے تم تک منتقل کر دوں کہ اب تم ہی خاندان کے بڑے ہو، مگر اب حافظے کے واسطے ہی سے منتقل کی جاسکتی ہے— خاندان کی یادیں مع شجرہ نسب قبیلہ بھائی صاحب اپنے ہمراہ ڈھاکہ لے گئے تھے— جہاں افراد خانہ ضائع ہوئے وہاں وہ یادگاریں بھی ضائع ہوگئیں۔''
>
> —ہندوستان سے ایک خط— انتظار حسین

وہ ایک ایسے وقائع نگار ہیں جس کی نگاہوں سے کچھ بھی اوجھل نہیں۔ جو یادگاریں ضائع ہوگئیں، ان کے نقوش ان کی کتابوں میں زندہ ہیں— چراغوں کا دھواں، لکھا تو گزرے شب و روز کا نگارخانہ سجا دیا۔ انتظار حسین کی پہلی تحریر بھی تقسیم اور ہجرت سے متعلق تھی اور اس کا موضوع لسانیات تھا۔ ابتدائی دنوں میں محمد حسن عسکری کا ساتھ ملا اور ان کے بلاوے پر انہوں نے پاکستان جانا قبول کیا۔ لیکن قیاس ہے کہ وہ ارادہ پہلے ہی کر چکے تھے۔ اس لیے کہ ان کی کہانیوں میں ہجرت، تقسیم اور ماضی کے بوسیدہ اوراق سے جو کولاژ بنتا نظر آتا ہے وہ کہیں نہ کہیں قاری کو ایک ایسا شاک دیتا ہے جس سے باہر نکلنا مشکل ہو جاتا ہے— آخری آدمی سے شہر افسوس، زرد کتا، نرناری کے علامتی اور استعاراتی نظام میں اس چیخ کی گونج پوشیدہ ہے، جسے سینے سے لگائے ہوئے انتظار حسین نے زندگی کے ۹۳ سال کا عرصہ گزار دیا۔ آخری آدمی میں بندروں میں تبدیل ہوتے انسانوں میں الیاسف اکیلا تھا جو اپنا چہرہ، بچانے میں آخر تک کامیاب رہا تھا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس افسانے کے بارے میں لکھا— 'اخلاقی اقدار کی شکست اور اجتماعی اطمینان کے فقدان کے نتیجے میں ایسا نفسی انتشار ہے کہ انسان بحیثیت انسان اپنی جون کو بھی برقرار نہیں رکھ پا رہا۔ انتظار حسین کی ایک اور کہانی 'وارد ہونا شہزادہ تورج کا شہر کاغذ آباد میں اور عاشق ہونا ملکہ قرطاس جادو' پر اسی فکر کو آگے بڑھاتی ہے۔ شہزادہ تورج نے بستی میں قدم رکھا تو نئی حیرت سے دوچار ہوا۔

> ''وہ چند قدم چلا تھا کہ کئی لوگ کھڑ بڑ، کھڑ بڑ کے شور کے ساتھ چلتے نظر آئے۔ اس نے غور کیا تو اسے لگا، یہ آدمی تو سب کاغذ کے پتلے ہیں۔ وہ حیرت سے ارد گرد نظر ڈالتا ہوا بڑھا چلا جا رہا تھا کہ ایک نانبائی کی دکان نظر آئی۔ دیکھا کہ ایک چٹائی پر بیٹھ کر کچھ لوگ کھانا کھا رہے ہیں۔ اسے بھی

بھوک لگی — بڑھ کر وہ بھی کھانے والوں میں شامل ہوگیا۔ مگر جب نان ہاتھ میں آیا اور اس نے نوالہ توڑا تو وہ سخت پریشان ہوا کہ یہ تو کاغذ کا نان تھا۔ اس نے غصے سے نانبائی کو دیکھا اور کہا، اے شعبدہ باز! تو نے روٹیوں کا یہ جعلی کاروبار کیوں شروع کیا؟

سب نے چیخ کر کہا۔ یہ گندم کی روٹیاں ہیں۔ تو غریب نانبائی پر کاغذ کی ملاوٹ کی تہمت لگاتا ہے۔ تورج کی ملکہ سے ملاقات ہوتی ہے۔ وصل کا لمحہ آتا ہے تو جیسے کورے کاغذ کا تھان کھلتا چلا جاتا ہے۔ تورج غصہ ہوکر کہتا ہے۔ اب میں سمجھا۔ یہ سیلے ہونٹ...... سب دھوکہ۔ تو بھی کاغذ کی نکلی۔ یہ تیرا کاغذی سحر ہے کہ اس شہر میں آدمی اب آدمی نہیں رہے۔ کاغذ کے پتلے بن گئے ہیں۔ اس نے گھوڑا دوڑایا ہے۔ مگر گمان ہوا کہ کاغذی سحر ہنوز اس کے تعاقب میں ہے۔'

آخری آدمی کے بندر سے کاغذی سحر تک جدید عہد کی مادیت پرستی کی ایسی مثالیں سامنے آتی ہیں جسے قبول کرنے کے لیے انتظار حسین تیار نہیں تھے۔ آدمی کی جون کا تبدیل ہونا انہیں گوارہ نہیں تھا۔ اعلیٰ اخلاقی قدروں سے محرومی کی فضا انہیں راس نہیں آئی۔ معاشرتی رشتوں کی شکست، منافقت، ریاکاری، تہذیبوں کے زوال نے ان کے اندر ایک ایسے افسانہ نگار کو بیدار کیا تھا جو حال سے مایوس اور مستقبل سے خوفزدہ تھا۔ اور اس لیے ماضی کے برجوں، فصیلوں، شاخوں، درختوں اور ان پر بیٹھنے والے پرندوں کی کہانیاں سناتے ہوئے انہیں اس بات کا اطمینان تھا کہ پرندے ڈار سے بچھڑتے کہاں ہیں۔ وہ لوٹ آتے ہیں۔ اسی تلاش میں وہ ہندوستان بار بار آیا کرتے تھے۔ اور ایسے آیا کرتے تھے جیسے وہ یہاں سے کبھی گئے ہی نہ ہوں۔ وہ یہاں کے تمام راستوں، گلی کوچوں، ندیوں، پہاڑوں اور طلسم سے آگاہ ہوں۔ اور لاہور جانے کے بعد بھی علی بابا کی طرح طلسم کی چابی ان کے پاس رہ گئی ہو۔ اور اس چابی سے جب بھی انہیں وقت ملتا، وہ چالیس چوروں کے خزانہ والا، طلسمی دروازہ کھول لیا کرتے تھے — وہ پاکستان بس گئے تھے لیکن ان کے دل کی دھڑکنوں میں ہندوستان ہمیشہ آباد رہا۔ شہزادہ تورج سے الیاسف تک اپنے ہر کردار اور واقعات کے پس پردہ انہیں ہجرت کا درد ستاتا رہا۔ وہ Loud کبھی نہیں ہوئے۔ انہوں نے اپنے ہم عصروں سے مختلف راستہ اپنایا۔ قیاس ہے کہ یہ راستہ بہت حد تک جلال الدین رومی، رسول حمزہ توف اور خلیل جبران کا راستہ تھا۔ عشق کے اپنے پڑاؤ اور اپنے مقام ہیں۔ سب سے بہتر مقام وہ کہ جہاں صحرا کی ویرانی اور سناٹے میں بھی اپنے محبوب کو یاد کیا جاسکے۔ ایک مقام یہ کہ کسی نے اپنے باطن کو ترک کیا اور محبوب کی لازوال سلطنت حاصل ہوگئی۔ حضرت سلطان ابو بن ادھم کو ترک سلطنت کے بعد جو دولت ملی، وہ محلوں میں حاصل نہ ہوسکی۔

ہندوستان کو عشق کہا جائے تو ترک وطن نے انتظار حسین کی تحریروں کو آتش محبت کی نذر کردیا۔ اپنی کہانی 'آخری موم بتی' میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں۔ 'اگر میں نے ماضی کا صیغہ استعمال کیا ہے تو اس سے کسی کو کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے۔ مجھے یہ پورا محلہ ہی ماضی کا صیغہ نظر آتا ہے۔'' محلّہ کی جگہ پاکستان رکھ دیجئے تو پاکستان میں زندگی بسر کرنے کے باوجود وہ کبھی ماضی کی گپھاؤں سے باہر نکلے ہی نہیں۔ 'آخری موم بتی' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''سڑک سے لگی ہوئی مٹھن لال کی بغیچی تھی۔ جہاں بیلا چنبیلی کے درخت سفید سفید پھولوں سے لدے کھڑے تھے۔ ان سے دور نیم کے نیچے رہٹ چل رہی تھی۔ چبوترے پر لالہ مٹھن کھڑے

تھے، ننگے پیر، ننگے سر، بدن پر لباس کے نام ایک بدرنگ دھوتی۔ گلے میں سفید ڈورا۔ایک ہاتھ میں پتیلی کی گڑ ہنتھ۔ دوسرے میں نیم کی دتون۔ لالہ کے طور طریقوں میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ سویرے منہ اندھیرٹے اوراشنان کو گھر سے نکل بغچی پہنچتے ہیں جنگل سے واپسی پر رہٹ پر بیٹھ کر پیلی مٹی سے گڑئی مانجھتے ہیں۔ نیم کی دتون کرتے ہیں۔ جتنی دتون کرتے ہیں، اتنا ہی تھوکتے ہیں۔ بازار ابھی بند تھا۔ موتی حلوائی کی دکان کھل گئی تھی۔ چولہا ابھی گرم نہیں ہوا تھا...... میرا عقیدہ ہے کہ جسے علی گڑھ نہیں بگاڑ سکتا، اسے دنیا کی کوئی برائی نہیں بگاڑ سکتی۔"

— آخری موم بتی

یہاں علی گڑھ کی یادیں ہیں۔ لالہ مٹھن لال اور موتی حلوائی کا ذکر ہے۔ اور ان کا مشاہدہ اس قدر گہرا تھا کہ پرانی، چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ان کے حافظہ کا حصہ بن گئی تھیں انتظار حسین کے انتقال کے دوسرے دن پاکستان کے روزنامہ ایکسپریس نے ان کا آخری کالم 'بندگی نامہ' شائع کیا۔ عربی زبان کا شناور خورشید رضوی — یہ کالم پاکستان کے مشہور ادیب خورشید رضوی پر ہے لیکن اس آخری کالم میں بھی انتظار حسین کے مخصوص رنگ وآہنگ کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ اقتباس دیکھیے۔

"جب صحن میں داخل ہوا تو میری نگاہوں کو گولا بیری کی تلاش تھی — لیکن گولا بیری ہی کیوں؟ اس صحن میں تین بیریاں تھیں۔ جن کے بیروں کی شکل وصورت اور ہر ایک کا الگ الگ ذائقہ اب تک یاد تھا۔ دو کے بیچ جو تیسری بیری تھی وہ گولا بیری تھی۔ اس کی جڑ میں سیڑھیوں سے لگی ہوئی ایک کیاری تھی۔ جس میں ۶ برس کی عمر میں، میں نے گندم کے کچھ دانے بوئے تھے۔ اور ان کے انکھوئے پھوٹنے کا مجھے انتظار تھا۔ مگر اب نہ صحن میں بیری تھی، نہ کھٹی بیری نہ گولا بیری۔ نہ اس کے برابر دیوار سے لگی ہوئی مہکار بکھیرتی جوہی — لیکن مٹی کے انبار کے نیچے وہ کیاری اب بھی وہیں تھی، وہ انکھوئے بھی جو ساٹھ برس بعد بھی مرجھائے نہیں تھے۔"

•••

'آج گزشتہ کی راکھ میں انگلیاں پھیرتے ہوئے جس چنگاری کی تپش میں میری پوریں جل اٹھی ہیں۔ وہ ان زبانوں، روایتوں، تلمیحوں اور علامتوں کا افسوسناک زوال ہے جو ہمارے ادب کو ماضی سے مربوط رکھتے ہوئے اسے آئندہ کے سفر پر روانہ ہونے کا حوصلہ بخشتی تھیں......"

یہ انتظار حسین کی آخری تحریر ہے۔ غور کیجیے تو ایسا لگتا ہے، جیسے انہیں اپنی موت کی مہک لگ چکی تھی۔ خورشید رضوی کے بہانے سے انہوں نے اپنے دل کی بات رکھ دی۔ داستان گو رخصت ہوا۔ لیکن رخصتی سے قبل بھی، اس کی خواہش تھی کہ سیدھے سادے الفاظ میں دل کی بات بتا دی جائے۔ 'انکھوئے ساٹھ سال بعد بھی مرجھائے نہیں۔ کیاریوں میں دبے رہے، ماضی کی شدت اور مہک کیسے گم ہو سکتی ہے؟ یہ اشارہ کافی ہے کہ وہ ماضی کے صیغہ سے باہر نہیں آ سکے۔ پرانی داستانوں کی آمیزش سے حقیقت کے پتھریلے راستوں پر چلتے ہوئے بھی ان کی نگاہیں کھٹی میٹھی گولا بیری، اور مہکار بکھیرتی

جو ہی کو تلاش کر رہی تھیں۔ یہ ماضی انتظار حسین نے اپنی کہانیوں میں اس طرح بکھیر دیا کہ پرانی داستانوں کا رس بھی باقی رہا، اور ایک ایسا داستانی رنگ اختیار کیا جہاں ماضی کے ساتھ ساتھ حقیقت کے افسانوں کے رنگ بھی شامل ہو گئے تھے۔ لیکن جاتے جاتے ہمارے اس آخری داستان گو کو اس بات کا ملال رہا کہ روایتوں، تلمیحوں اور علامتوں کا افسوسناک زوال شروع ہو چکا ہے۔ یہ حقیقت ہے— اور اس سے انکار ممکن نہیں، ادب کو ماضی سے مربوط رکھنے والے سفر پر روانہ ہو گئے۔ اب خاموشی ہے، سناٹا ہے، اور یادیں ہیں۔ وہ اپنے پیچھے بہت سے سوالات چھوڑ گئے ہیں۔ ان سوالوں کا جواب دینا ابھی آسان نہیں۔ کیا ہمارا ادب مردہ ہو چکا ہے؟ کیا ماضی کی روایتوں کو گلے لگائے بغیر عمدہ ادب تحریر نہیں کیا جا سکتا— ؟ کیا حال اور مستقبل کو نظر انداز کرنا ضروری ہے؟ کیا اردو فکشن کا زوال شروع ہو چکا ہے؟

'چونکہ گل رفت و گلستاں شد خراب
بوئے گل را از کہ جوئیم از گلاب'

جب پھولوں کا موسم گزر گیا۔ گلستاں تباہ ہو گیا تو ہم پھول کی خوشبو کس سے تلاش کریں۔ عرق گلاب سے؟ داستانوں کا موسم گزر گیا۔ کچھ باتیں یاد آتی ہیں۔ جن کا تذکرہ یہاں ضروری سمجھتا ہوں۔ ۱۹۸۰ کا زمانہ تھا۔ اردو افسانے میں انتظار حسین کی گونج کچھ اتنی زیادہ تھی کہ میں ان کے تمام افسانوں کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔ علی گڑھ سے اطہر پرویز کی ادارت میں ایک رسالہ نکلتا تھا 'الفاظ'— الفاظ نے انتظار حسین پر گوشہ شائع کیا۔ پہلی بار ان کہانیوں کو پڑھنے کا اتفاق ہوا تو سر چکرا کر رہ گیا۔ کیا کہانیاں اس طرح بھی لکھی جا سکتی ہیں۔ 'الفاظ' میں انتظار حسین کے حوالہ سے جو مضامین تھے، ان میں خوب خوب قصیدے پڑھے گئے تھے۔ میں متاثر تو ہوا لیکن دل اس وقت یہ ماننے کے لیے قطعی طور پر تیار نہیں تھا کہ ان افسانوں کی ضرورت کیا ہے؟ جب ہمارے پاس پہلے سے ہی جاتک کتھائیں، پنچ تنتر اور داستانیں موجود ہیں، تو ان افسانوں کے مطالعہ کا حاصل کیا ہے۔؟ انکار و اختلاف کا رویہ ایک عمر گزر جانے تک میرے ساتھ رہا۔ اب غور کرتا ہوں تو احساس ہوتا ہے انتظار حسین وہ کر گئے، جو کوئی دوسرا نہ کر سکا۔ داستان ہمارا قیمتی سرمایہ ہے۔ وہ اس راز سے واقف تھے۔ اور اسی لیے قصے کہانیوں کے راستہ سے وہ گمشدہ داستانوں کی پوٹلی لے کر ہمارے سامنے آ گئے۔ یہ بات بھی قابل رشک ہے کہ جب جدیدیت کا آغاز ہوا تو اس وقت کے بیشتر ادیبوں نے انتظار حسین کے رنگ و آہنگ اور اسلوب کو اپنانے کی کوشش شروع کی۔ یہ سلسلہ ہنوز قائم ہے۔ مگر انتظار حسین کے معیار تک پہنچنا آسان نہ تھا۔ ایسے کئی افسانہ نگار گمنامی کی آغوش میں چلے گئے۔ جبکہ انتظار حسین کا جلوہ آج بھی برقرار ہے۔

فکشن کے منظر نامہ سے گلزار کا پوٹلی بابا اب بہت دور جا چکا ہے۔ چالیس چوروں کی کہانی ابھی بھی زندہ ہے اور علی بابا کا خزانہ بھی۔ انتظار حسین نے داستان گوئی کی جو روایت شروع کی، وہ کسی انمول خزانہ سے کم نہیں۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ داستانیں گم کہاں ہوتی ہیں...... گزشتہ کی راکھ میں انگلیاں پھیرتے ہوئے، چنگاری کی تپش سے ہم انہیں ہر بار زندہ کر لیتے ہیں۔

اب سنا ہے کہانی کار گیا......

صدف مرزا

منتظر رہ گئے فسانے سب　　اب سنا ہے کہانی کار گیا
رہ گئیں خالی آنکھ کی گلیاں　　چھوڑ کر ان کو انتظار گیا

سنا ہے انتظار حسین چلے گئے۔ کہتے ہیں وہ ہم میں نہیں، سرخیاں شور مچاتی ہیں کہ رخصت ہوا ایک عہد۔ دوست پرسے دے رہے ہیں کہ کہانی گئی کہانی کار گیا

کردار رہ گئے... کردار ساز گیا...

لیکن مجھے وہ سارے دن یاد آ رہے ہیں.. جب پاکستان کے مختلف شہروں میں ان سے ملاقاتیں رہیں......

اور ابھی چند ہفتے پہلے کراچی میں آرٹس کونسل کی اردو کانفرنس میں وہ پیرانہ سالی کے باوجود شریک تھے۔ نقاہت ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ تھکن لہجے میں بول رہی تھی اور کہانیاں اوڑھے بدن نحیف و نزار تھا۔

لیکن ان کی کہانیوں کی متلاشی آنکھوں کو ایک عزم روشن کیے ہوئے تھا۔ مجھے ان سے پہلی ملاقات یاد آ گئی۔" بھئی سالہا سال یورپ میں رہ کر بھی تمہارا لب ولہجہ اچھا ہے... اچھا بولیں تم"

محترم انتظار حسین جیسی شخصیت کی زبان سے یہ چند الفاظ ہی میرے لیے کافی تھے۔ میں تو جیسے ساتویں آسمان کی سیر پر تھی۔ مختصراً عرض کیا کہ کوشش کرتے ہیں اپنی زبان وادب کے ساتھ جڑے رہیں۔

ڈینش زبان وادب کے بارے میں بات ہوئی۔ ان کا ذہن بہت متجسس تھا۔" کمال ہے... ڈینش زبان بول لیتی ہو تم ؟؟

ڈینش ناول افسانے.. ڈینش ہی میں پڑھے؟؟" بہت اچھا کیا کہ ڈینش ادب پر کام کیا"

اس مرتبہ آرٹس کونسل میں مجھے شمیم حنفی اور انتظار حسین دونوں سے بیک وقت بات چیت کا موقع ملا. تصاویر بنوانے کی کوششوں میں میری تصویر نہیں بن پا رہی تھی۔ میں نے جھنجھلا کر کہا میں سب کی تصویریں اتنی اچھی بناتی ہوں... میری کوئی بھی ٹھیک نہیں لیتا"

" تمہارا موبائل ہاتھ پہچانتا ہے" انور سن بولے۔ انتظار حسین خاموشی اور سکون سے ساری کاروائی دیکھتے رہے۔ ایک خفیف سا تبسم ان کے چہرے پر بکھرا رہا۔

ہاتھوں میں تھامے عصا پر ان کی گرفت شاید لاشعوری طور پر مضبوط تھی۔ عمر رواں کے ترانوے ادوار دیکھنے کے باوجود بلند حوصلے سے بزم یاراں میں جمے بیٹھے. ڈاکٹر سعادت سعید، انور سن رائے، شمیم حنفی، محمد حمید شاہد، انور شعور اور ڈاکٹر ضیاء الحسن ان کے گرد بقول فیض،

حلقہ کیے بیٹھے رہو اک شمع کو یارو　　کچھ روشنی باقی تو ہے ہر چند کہ کم ہے

اب خیال آتا ہے.. شاید ان کو خبر ہو کہ اگلے برس یہاں یہ محفل تو آراستہ ہو گی اور تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے۔ سو دنیا میں ہنگامہ برپا ہے کہ انتظار حسین اس نگر کو چل دیے جہاں کوئی اور بھی ان کا منتظر تھا. دنیائے اردو کے لیے یہ عظیم نقصان ہے اب پھر یہ کسی ایسی ہی کثیر الجہات ہستی کی منتظر رہے گی جو علم وادب کو اپنی زندگی کا محور و مرکز سمجھے. فیض کی

ایک دلکش غزل جیسے انتظار حسین کے لیے ہی کہی گئی.

لو تم بھی گئے ہم نے تو سمجھا تھا کہ تم نے — باندھا تھا کوئی یاروں سے پیمانِ وفا اور
یہ عہد کہ تا عمرِ رواں ساتھ رہو گے — رستے میں بچھڑ جائیں گے جب اہلِ صفا اور
ہم سمجھے تھے صیّاد کا ترکش ہوا خالی — باقی تھا مگر اس میں ابھی تیرِ قضا اور
ہر خار رہِ دشتِ وطن کا ہے سوالی — کب دیکھیے آتا ہے کوئی آبلہ پا اور
آنے میں تامّل تھا اگر روزِ جزا کو — اچھا تھا ٹھہر جاتے اگر تم بھی ذرا اور

Letters'andArtsofOrdertheof'Officer

یہ اعزاز 1960ء سے مصنفین شعراء اور موسیقاروں کو دیا جاتا ہے. فرانس کی وزارتِ ثقافت نے پہلی مرتبہ کسی پاکستانی کی لسانی وادبی خدمات کو سراہتے ہوئے یہ اعزاز عطا کیا.

فرانسیسی سفیر Thiebaud تھی۔ ائیبوڈ نے انتظار حسین کی ادبی وعلمی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا" اردو ادب کے سفر میں آپ کی خدمات کو سنگِ میل کی حیثیت حاصل رہے گی

انتظار
حسین
انگریزی میں نیویارک ریویو بکس

فرانسس ڈبلیو پریچٹ

FrancesbyUrduthetranslatedfrom.(1979)HusainIntizarbyI.TSAB

(1995)PritchettW.

عمر میمن کا تعارفی نوٹ.

دوسرا ایڈیشن

2000

میں ایا..

پر

2005

PritchettFran

2005March

کے تعارفی

نوٹ

اور

2012

آصف فرخی

nowJust·Reply·Like

انتظار حسین ایک منتظر خاندان میں چار بیٹیوں کے بعد پیدا ہوئے خواہشوں اور ارمانوں کا اظہار انہیں انتظار نام دے کر گیا۔

قدیم زمانے سے لے کر نانی کی انگیٹھی تک کہانیاں سننے، دیکھنے اور بننے کے خوگر اپنے بچپن کی طلسماتی فضاؤں کو ذہن کی زنبیل میں سموئے، شاعری کے کوچے کو چھوڑ افسانوں کی سلطنت میں قدم رکھنے والے انتظار حسین جنہیں اپنے کرداروں کا خالق اور کاتب تقدیر ہونے کا اختیار حاصل تھا اس دیومالائی نگری میں وہ اپنے جہانوں میں دمادم کن فیکون کہنے پر قادر تھے

انتظار حسین سے چند ملاقاتیں اور مختصر ترین باتیں رہیں لیکن ان کی شخصیت میں سادگی' وقار اور ایک بے نیاز سا عجز جھلکتا رہا

چائے کے وقفے میں نشست کے بعد دوستوں کے درمیان

دھیمے دھیمے لہجے میں ضروری بات کرنے کا تاثر دیتے انتظار حسین کو جاننے اور پڑھنے کا تجسس بیدار رہا 2013 کی ملاقات کے بعد میں نے ان کے ناول ڈھونڈے' افسانے پڑھے' تنقیدی مضامین دیکھے

انٹرنیٹ کی دنیا میں جو کتب کا ایک خزانہ ہے وہ مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں والا معاملہ ہے میں نے سوچ رکھا تھا کہ جب بھی اگلی ملاقات ہوگی ان کی کتب کے مطالعے کے بعد کروں گی تاکہ بات چیت ریشم کے ٹوٹے تاروں جیسی نہ ہو

انتظار حسین کے ناول پڑھتے پڑھتے "بستی" ناول تک پہنچ کر میرے قدم منجمد ہو گئے یورپی ماحول اور یہاں کے ادب کے مطالعے اور مصنفین کی پذیرائی دیکھتے ہوئے میرا ہمیشہ سے یہ جی چاہتا کہ اردو زبان اور اس کے جادو بیاں اہل قلم کا علمی سرمایہ یہاں تک کیوں نہیں پہنچتا۔ برصغیر کے سماجی وجغرافیائی پس منظر میں لکھنے والے یورپین مصنفین کو لازوال شہرت مل چکی moughalwhite وغیرہ

لیکن خود یہاں کے باسیوں کو اس ماحول میں سانس لینے اذہان اور زبانوں پر علمی ادبی عبور رکھنے والے یورپی دنیا میں اجنبی کیوں ہیں کیا ہماری تمام تر تگ ودو چند اشعار پیش کر کے پانچ سولائق لینے تک ہے

کیا یہ دن رات اولوں کی طرح برستے ہولناک حادثے قلم میں وہ سحر بیانی اور اثر آفرینی پیدا نہیں کر سکتے جو ایک اردو لکھنے والے کو یورپ میں مثال بنا دے اور اس کے قلم کی جادوگری جغرافیائی ولسانی حدود کو تاراج کر دے؟ یقیناً ایسا ممکن ہے اور صرف اسی صورت ممکن ہے کہ ان تراجم کے ذریعے ان شہ پاروں کو آفاقی سطح پر دوسری زبانوں کے مصنفین اور قارئین تک پہنچایا جائے۔ فرانسیسی ڈبلیو پرچیٹ نے "بستی" ناول کا انگریزی ترجمہ کر کے وہ گراں بار اپنے کندھوں پر اٹھالیا تھا۔ 1979 میں "بستی" ناول کے مطالعے کے دوران انٹرنیٹ پر ہی آصف فرخی کے ایک انٹرویو کا تراشا نظر سے گزرا ملاحظہ فرمائے

فیض: انہیں دنوں انتظار حسین کا "بستی" شائع ہوا ہے یہ نہایت خوب ناول ہے

سوال: بعض نقاد کہتے ہیں کہ "بستی" نوسٹالجیا کا ناول ہے

فیض: ہے تو پھر؟ نوسٹالجیا ایک انسانی اور فطری کیفیت ہے اس میں خرابی کیا ہے اور یہ ناول محض ماضی کی آہ و بکا

تو نہیں ہے آج کے زمانے کو بھی پیش کیا گیا ہے

سوال: بعض ترقی پسند نقادوں کو شکایت ہے کہ انتظار حسین جس طرح ماضی کو استعمال کرتا ہے وہ ایک مریضانہ صورت ہے

فیض: اس ناول میں تو ایسا نہیں ہے مجھے یہ ناول پسند آیا بہت دل آویز لگا۔

(ہیرآلڈ۔ کراچی۔ دسمبر 1982)

اس ناول کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے محمد عمر میمن کے تعارفی دیباچے کے ساتھ اور پھر 2012 میں آصف فرخی کے تعارفی دیباچے کے ہمراہ۔ یہ وہ ناول ہے جس میں ہندو، مسلم اور بدھ مت کے پیروکار اپنی اپنی منفرد صداوں کے ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ انتظار حسین نے اس میں ماضی اور حال کو شیر و شکر کر دیا ہے۔ جو لوگ تراجم کے خارزار میں قدم رکھتے ہیں انہیں بخوبی علم ہے کہ ایک مترجم کے لیے محض ذولسانی ہی نہیں ذو ثقافتی ہونا بھی ضروری ہے کسی بھی زبان کو اس کے تمام تر حسن بیاں کے ساتھ دوسری زبان میں یوں منتقل کرنا کہ قارئین اس کی شریعت یا محاسن سے حظ اٹھا سکیں۔

تقریبا ناممکن ہے جیسے کہ روسی شاعر ''یوگنی یفتوشنکو'' (Yevgeny yevtushenko) بیان کرتا ہے

(ترجمہ ایک عورت کی مانند ہے اگر وہ حسین ہے تو باوفا نہیں ہے اور اگر وفادار ہو تو دلکش نہیں ہے)

لیکن ان تمام مسائل، مشکلات کے باوجود ترجمے کے ذریعے یورپی اور امریکی سخن وروں کی صف میں شامل ہونے والے انتظار حسین نے آگ کے الاؤ کے گرد بیٹھے سحر پھونکتے قصہ گو کی حیثیت سے خود کو منوایا ہے انکے ناولوں کے کرداروں کے پاؤں میں ایک تو کیلے اور خاردار ماضی کی ٹیسیں لپٹی ہوئی ہیں مکالمے ایک خوبصورت زبان کے تحفظ کی گواہی دیتے ہیں ماحول میں اساطیری رنگ گھلا ہے اسلوب میں ایک فطری چاشنی ہے اور وسیع و عمیق مطالعہ موضوعات انتخاب اور ان سے انسان کے لیے ان کی رہنمائی کرتا ہے

مجھے انتظار حسین کے شفقت بھرے حلیم انداز نے نہ صرف ان کی تخلیقات کے مفصل مطالعے کے لیے اکسایا بلکہ بطور ایک مبتدی اور مترجم کے ان کی کارکردگی، محنت اور اعزازات پر سربلند بھی کیا عمر کی آخری سیڑھی پر کھڑے ہونے کے باوجود وہ اردو کے فروغ کے لیے منعقد کی گئی تقاریب میں شامل ہوتے رہے عالم پیری کی تھکن کو اپنا عصا بنائے متبسم چہرے کے ساتھ میرے سوالوں کا جواب دیتے رہے ان کی وسیع نظر تراجم تقابل کے ذریعے اردو زبان کی وسعت کے نئے امکانات دیکھ رہی تھی اس ندی کو دریا اور دریا کو عالمی ادبی سمندر میں ضم ہونے کے لیے اب نئے انتظار حسین کا انتظار رہے گا۔

اساطیری دنیا سے بہترین رنگوں کا انتخاب کر کے ان سے اپنی تحریریں مزین کرنا اور ان ہی دیومالائی کرداروں، استعارات، تشبیہات اور تلمیحات سے اپنی کہانیوں کا تانا بانا کا م فن سے بن لینا انھیں جیسے ودیعت کیا گیا تھا۔ پاکستان میں مقیم مصنفین کی طرح ظاہر ہے ہمیں وہ مواقع میسر نہیں کہ ایسے فعال، متحرک اور متجسس انسانوں سے ملنے، ان سے بات کرنے اور ان کی صحبت سے فیض اٹھانے کا شرف حاصل ہو۔ میں نے ان کے ناول اور افسانوی مجموعے تو پڑھے سو پڑھے لیکن ان کی شخصیت اور افکار سے واقف ہونے کے لیے ضروری تھا کہ ان کے انٹرویوز اور مختلف مواقع پر ان کی گفتگو کو سنا جائے۔

عالمی عصری ادب، اس کے تقاضے اور اس کی توسیع اور تشہیر کی طرح اردو زبان کو کبھی یہ مواقع نہ مل سکے کہ ایک محدود جغرافیائی حد سے باہر نکل کر آفاقی سطح پر ایسے قارئین کی نظر سے گزرے جو بین الاقوامی ادب کے نہ صرف شائقین

ہیں بلکہ کثیر الثقافتی ماحول اور زبانوں کے ادب میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

گبرئیل گارشیا مارکیز اور بورخیس کی کہانیوں پر آفرین و مرحبا کے نعرے لگانے والے اگر اسی ذوق وشوق سے انتظار حسین کی تخلیقات کا مطالعہ کریں تو ان کو وہ سب مماثلتیں دکھائی دیں گی جو انتظار حسین کے معائب میں گنی جاتی۔ ماضی سے محبت، نوسٹلجیا، نانی سے سنی کہانیوں کی افسانوی تجسیم، انسانوں کی دنیا میں بندروں کا راج اور ان کی تقلیب کا حال لکھنے پر انتظار حسین کو انسان عظیم ہے خدایا کا نعرہ لگا کر اپنے افکار پر شرمندہ کرنے کی کوشش کی جاتی جب وہی بات عالمی شہرت یافتہ گبرئل گارشیا مارکیز (Gabriel Garci-a Márquez, One Hundred Years of Solitude) کرتا ہے تو اس کی تصنیف شاہکار کا درجہ پاتی ہے۔ اس نکتے کو بیشمار ناقدین نے انتہائی مثبت انداز میں بیان کیا۔ ہیرالڈ بلوم)

انتظار حسین کی نانی کی سنائی کہانیاں اس وقت تک معتبر نہ ہوئیں جب تک مارکیز نے اپنی نانی سے سنی کہانیوں کا تذکرہ نہ کر دیا۔

''اردو ادب کے ناقدین کے لیے ایک لمحۂ فکریہ ہے کہ اب اردو زبان کی تخلیقات پر نظرِ ثانی کی جائے۔ مغربی ادب سے درآمد ہونے والی اصناف اور انھیں غسلِ تعمید دے کر ایک قابلِ تقلید نمونہ بنا دینے سے زبان وادب صرف شرمندۂ ساحل رہیں گے اچھل کر بیکراں کبھی نہیں ہو سکتے۔ محققین کا بھی فریضہ ہے کہ اب محض قدماء کی اردو شاعری کی نئی جہات کی فکر میں غلطاں ہونے کی بجائے اردو شعر وادب کا تقابل عالمی عصری ادب کے ساتھ کیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر صرف انتظار حسین ہی کی اساطیر کی رنگ آمیزی، گزرتی اور مٹتی زندگی، تہذیبوں کے انہدام اور بچے کھچے تہذیبی ملبے کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالتے اور اپنی تخلیق کے عجائب گھروں میں سجا دینے کی کاوش کا موازنہ بین الاقوامی شہرت یافتہ اہلِ قلم سے کیا جائے تو یقیناً ہم اردو کے ادیبوں کو ان سے مماثل قرار دینے کی مغربی، یورپی اور عالمی ادیبوں کی تخلیقات میں اردو کا رنگ دیکھنے پر قادر ہو جائیں گے۔ انتظار حسین نے ایک انٹرویو میں کہا کہ ان پر مسلسل ماضی پرستی کا اعتراض داغا جاتا ہے۔ ان کی ایک تخلیق کو کسی فرانسیسی ادیب کی تحریر کا پرتو کہا گیا جس پر انتظار حسین کو وضاحت دینی پڑی۔ اپنے آبائی شہر سے محبت اور اس کے محبوبانہ تذکرے پر تنقید کرنے والوں کو جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ وہ پچاس اور ساٹھ کی دہائی کا لاہور بھی اسی شدت سے یاد کرتے ہیں۔ لاہور کی پرانی تہذیب بھی بتدریج نزع ہی کے عالم میں ہے۔ ''نوسٹلجیا صرف ہندوستان کا ہی نہیں، میں پچاس اور ساٹھ کی دہائی کا لاہور بھی دریافت کرنا چاہتا ہوں''

ان کے گھر کی منڈیر پر جلتے دیوالی کے چراغوں کی روشنی ان کے آنگن میں اترنے سے کون روک سکتا تھا۔ گلی سے گزرتے جلوسوں، مندر کی بجتی گھنٹیوں اور بھجن کی آوازوں کے پیروں میں زنجیر نہیں پہنائی جا سکتی تھی وہ بھی مسجد سے بلند ہوتی اذان کی طرح آزادی سے سماعتوں تک پہنچتی تھیں۔ میں نے انتظار حسین کو ان کے انٹرویوز کے آئینے میں دیکھا جو بے محابا خود کو پچھلی صدی کا آدمی کہتے۔ ''میں بیسویں صدی کا آدمی ہوں اکیسویں صدی میرے تخلیقی شعور کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے''، لیکن دوسری زبانیں سیکھنے، علاقائی زبان یعنی پنجابی سیکھنے کے حق میں بھی تھے۔ لسانی تعصّبات سے بلند ہو کر ادب اور ادبی رجحانات کو پنپنے کا موقع دینے کے قائل تھے۔ ان کی زندگی اپنے آخری ایام تک علم وادب کی خدمت اور تحریر وتقریر میں گزری۔ انھیں اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ اس عالمی دیہات میں عالمی ادب کی تفہیم ضروری

ہونے کے ساتھ ساتھ اردو ادب کا تعارف عالمی ادب کے ساتھ ضرور ہونا چاہیے۔

زرد کتا، کتا، مکھی، بندر

''شہر افسوس'' اور ''وہ جو دیوار چاٹ نہ سکے''

''شہر افسوس''

''نئی پرانی کہانیاں''، ''آخری آدمی''، ''زرد کتا'' اور ''شہر افسوس''

بستی، ناول کہ پہلوداری کئی جہات میں غور و فکر کرنے کی دعوت دیتی ہے اسے محض یہ کہہ کر کہ اس کہانی میں انتظار حسین خود سانس لے رہے ہیں، یا ایک مخفی سرگزشت ناول کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے، گزر جانا کسی بھی طور سے انصاف نہیں۔

میں نے یہ مضمون تحریر کرنے سے قبل دوبارہ انتظار حسین سے ملاقات کی، وہ اپنی کہانیوں میں اپنے استعارات و علامات، اسلوب کی متنوع دلکشی، کرداروں کے محتاط چناؤ، ماحول اور مقام کے سادہ سے اشاریے اور انتہائی مشاقی سے اپنے ماحول کو ہندی، عربی دیو مالائی استعارات سے پیوست کرتے ہیں۔ یورپی ادب کی ایک طالبہ ہونے کے ناطے اور ڈینش زبان کے ادب تک براہِ راست رسائی سے میں ان کے طرزِ فکر اور اسالیبی انداز کو کئی رنگوں میں کئی تخلیقات سے مماثل دیکھتی ہوں۔ کبھی متحیر ہو کر ان کا ''آگے سمندر ہے'' کبھی مسحور ہو کر، ''آخری آدمی، زرد کتا، ۔۔۔۔ پڑھتی ہوں

وہ بچہ ان بھول بھلیوں میں بھٹکا نہیں، بلکہ وہ اپنے ہاتھ میں تھامے اپنی یادداشت اور حافظے کے سوت سے ان راستوں سے کہانیوں کا خزانہ چھپائے بحفاظت باہر نکل آیا۔

وہ کہانیوں کو کھینچ کر دورِ حاضر تک نہیں لایا بلکہ ان کو وہیں جا کر ملا۔ میرے محدود مطالعے کو ابھی یہ خبر نہیں کہ انتظار حسین سے پہلے کس نے اساطیر اور اس کی جمالیات سے اردو ادب کو مزین کیا لیکن جتنا میں اس محنت کش ادیب کو پڑھ پائی اس نے مجھے بخوبی یہ فخر دیا کہ اردو ادب کسی بھی طور عالمی عصری ادب کے شانہ بشانہ کھڑا ہو سکتا ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ اردو زبان کے اربابِ اقتدار اپنا قبلہ درست کریں۔ انگریزی دان مصنفین، صحافی اور اساتذہ سے اردو ادب کے شہ پاروں کے تراجم کروائے جائیں۔ یورپی ممالک میں رہنے والے مصنفین اور شعراء سے براہِ راست غیر ملکی ادب کے تراجم کروائے جائیں اور اردو ادب کو ان زبانوں میں منتقل کیا جائے۔ ہمارے عظیم ادب کا ہم پر یہ حق ہے کہ برق رفتاری سے دمادم کن فیکون کے نعرے لگاتی اس اکیسویں صدی کی ترقی و تکنیک کے فیوض کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اردو زبان و ادب کو اس کا حصہ بنا دیا جائے۔ آج یورپی ادب تانیثیت اور نسائی لہجوں کو کھوجتا اور اس کی داد دیتا پھر رہا ہے۔ اگر صرف عصمت چغتائی کی شخصیت، حالاتِ زندگی، اس کا بے باک اور دبنگ لہجہ عالمی ادب تک پہنچ جائے تو شاید کل کو نسائی ادب کے یورپی حوالوں میں ایک نیا اضافہ ہو جائے۔

دو ہجرتوں کا دلگداز ذکر، 1947ء ہی نہیں 1971ء بھی شامل ہے۔ رنگوں کی آمیزش سے نئے رنگوں کی تخلیق کرتا انتظار حسین کا قلم اس بات کا مستحق ہے کہ ان پر قلم اٹھاتے ہوئے صرف ان کے گاؤں، بہنوں کی تعداد، کتابوں کی فہرست، ذاتی زندگی کی تنہائی، بے اولادی کا گھاؤ ہی منظرِ عام پر نہ لایا جائے بلکہ ان کے ان تھک قلم کی موضوعاتی، فکری، ہیئتی اور اسالیبی بوقلمونی کا مطالعہ کیا جائے۔

اس ادب کی ایک مختلف ثقافتی پہچان ہو، معنیاتی سحر کو تخلیقی نزاکتوں کی خیال انگیزی سمیت عصری آگہی، کیفیت و جذبے کی ہم آہنگی، اپنی مٹی کی وارفتہ کر دینے والی لازوال خوشبو، دیومالائی اساطیری عنصر کی سحر آفرینی اور تلمیحات کی معنی خیزی ایسے انداز سے عالمی عصری ادب کی دنیا میں پھونکا جائے کہ اورینٹلزم کے ماہرین، تحقیق و مطالعہ کرنے والے اس نظر

اندازکی گئی سمت بھی سفر اختیار کریں۔
معنیاتی نظام، محاکات، تلازمے اور اسلوب کی نیرنگی کو بعینہ تراجم میں منتقل اور منعکس کرنا سہل نہیں۔ اس کے لیے مترجم کا ذولسانی ہی نہیں ذوثقافتی پس منظر رکھنا ضروری ہے۔ بیرون ملک مقیم ادباء اور شعراء کا یہ فرض ہے کہ وہ محض شعری مجموعوں کی تخلیق، مشاعروں کے انعقاد اور شعروسخن کی شامیں اور جشن منانے پر ہی اپنی تمام تر توانائیاں صرف نہ کریں بلکہ مقامی زبان کے مصنفین اور اہلِ قلم کے ساتھ اپنے روابط مضبوط بنائیں اور ان کے تعاون اور اشتراک سے ترجمے کے عمل میں تخلیقی وفور شامل کر دیں۔ مجھے مسرت کے احساس کے ساتھ ایک یاسیت بھی گھیر لیتی ہے کہ آرٹس کونسل میں میرے اس مقالے کے نکتے کو انتظار حسین نے سراہا لیکن مجھے کبھی اتنا وقت میسر نہ ہو سکا کہ ان سے تفصیلی ملاقات کا امکان نکلتا اور ایسے نکات پر مزید پیش رفت ہوتی۔
انتظار حسین نے اپنے ایک افسانوی مجموعے ''شہرِ افسوس'' کے فلیپ پر 13 جنوری 1973ء کو لکھا۔
مَیں کہانی کیا لکھتا ہوں اپنی بکھری ہوئی مٹی کے ذرے چنتا ہوں مگر مٹی بہت بکھر گئی ہے اور مَیں مجتہد نہیں، کہانی لکھنے والا ہوں، مٹی جمع کرنا اور کہانی لکھنا، ایک لا حاصل عمل ہے، حاصل کی پروا کرنے والے کہتے ہیں کہ صرف وہ عمل بامعنی ہے، جس کا کچھ حاصل ہو اور کہانی کا کوئی مقصد ہونا چاہئے، لیکن مَیں اپنی بکھری ہوئی مٹی کا اسیر ہوں، مجھے اس سے مفر نہیں ہے''
انتظار حسین کی تصانیف میں آخری آدمی، شہرِ افسوس، آگے سمندر ہے، بستی، شہرزاد کے نام، چاند گہن، گلی کوچے، کچھوے، خالی پنجرہ،، دن اور داستان، علامتوں کا زوال، بوند بوند، زمیں اور فلک اور، دلی تھا جس کا نام، جنم کہانیاں، قصے کہانیاں، شکستہ ستون پر دھوپ، مقبولیتِ عام حاصل کر چکی ہیں۔
حافظے کا گم ہو جانا بھی عذاب کی صورت میں سے ایک عذاب ہے اور وہ اکثر قوموں پر نازل ہوا ہے اس وقت فنکار یاوری کرتا ہے اور وہ اپنے سماج کو بھولی ہوئی کہانیاں یاد کرواتا ہے اور گم گشتہ جنت کی یاد دلاتا ہے۔ کیا ہمارا ادب اتنا تاریک کہ فنکار بھی یہ فرض ادا نہیں کرے گا''
ڈبائی کی چھوٹی سی زمین پورا برِاعظم تھی
ایک افسانوی مجموعے ''کچھوے'' کا ''انتساب'' ملاحظہ ہو
''پھر ناردنے پوچھا
''اچھا روشنی سے بھی بڑھ کر کوئی چیز ہے؟''
''ہاں ہے'' سنت کمار نے کہا
ہَوا روشنی سے بڑھ کر ہے کہ آدمی ہَوا میں پیدا ہُوا۔ ہَوا ہی میں پلا بڑھا، ہَوا ہی میں جیتا ہے، ہَوا ہی کے کارن ہم بولتے ہیں، سنتے ہیں''۔۔۔
''اچھا ہَوا سے بھی بڑھ کر کوئی چیز ہے؟'' ہاں ہے، یاد ہَوا سے بڑھ کر ہے کہ آدمی سے اُس کی یاد چھین لو۔ پھر نہ وہ سنے گا، نہ سوچے گا نہ سمجھے گا''۔ اس کی یاد اُسے لُوٹا دو، وہ سُنے گا، سوچے گا، سمجھے گا''
جاتک کہانیوں کو اردو زبان سے متعارف کروانے کا سہرا بھی انتظار حسین ہی کے سر باندھا جاتا ہے اور وہ انتہائی انکسار سے فرماتے ہیں کہ
جاتک کہانیوں تک میری اپنی رسائی بھی ایسے ہی ہوئی جیسے اندھے کے پیر کے نیچے بٹیر آ جائے۔

جاتک ٹیلز، ڈینش مستشرقین کے ذریعےلوگ بچوں کی طرح ہیں اور کہانی سننا چاہتے ہیں

جاتک کہانیوں کے دیباچے میں انتظار حسین رقمطراز ہیں۔

"کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے کہ ہمارے ناول نگار، افسانہ نگار، مغرب میں ہونے والی نت نئی تراکیب اور تکنیک پر سردھنتے رہے مگر کسی نے مڑ کر مشرق کے اتھاہ اثاثے کی طرف نہیں دیکھا کہ اس میں کیا ہے اپنی روایت سے بے خبر دور پار کی روایات میں معانی ومطالب تلاش کرتے رہے اور کسی کو بھی یہ خیال نہیں آیا کہ پرانے زمانے کا ایک گیانی پدیش دیتے دیتے کہانی سنانے پر کیوں اتر آیا"

یہاں میں یہ تذکرہ کرتی چلوں کہ اگرچہ اردو زبان کا ماخذ وہی سرزمین رہی لیکن جاتک کہانیوں تک ڈینش ادب ان سے بہت پہلے پہنچ گیا۔ڈینش مستشرقین نے عربی، فارسی، پالی، سنسکرت اور دیگر کئی زبانوں کا علم حاصل کرکے سولہویں صدی سے ہی ڈینش زبان کی توسیع اور ترویج کا آغاز کر رکھا تھا۔معروف اور ممتاز ڈینش مستشرق "مائکل وِگو فوس بول"

(Michael Viggo Fausbøll-1821-1908)

فوس بول کو یورپ میں پالی زبان کی بنیاد رکھنے والے مستشرق کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔اس نے بدھ مت کی مذہبی دستاویزات کا بغور مطالعہ کیا اور اپنی مسلسل اور انتھک کاوشوں سے اس زبان پر نہ صرف عبور حاصل کیا بلکہ تراجم کے ذریعے یورپ اور بالخصوص ڈینش زبان کے ذخیرے میں گراں قدر اضافہ کیا۔فوس بول کا نام امریکہ اور ہندوستان میں بھی یورپ ہی کی طرح معروف ہے۔

1855ء میں اس نے ڈھماپڈا (Dhammapada) جو پالی زبان میں بدھ مت کی اہم ترین دستاویزات میں سے ہے، پیش کی۔ایسا مواد جمع کرنے کے لیے اس نے 60-1858 لندن میں قیام کیا۔اگرچہ مالی لحاظ سے اسے بہت مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا اس کے باوجود اس نے اپنی لگن اور جذبے میں کمی نہیں آنے دی۔

اسے کوپن ہیگن یونیورسٹی میں ہندوستانی اور مشرقی ممالک کی زبانوں کی فیلولوجی میں پروفیسر کا عہدہ بھی ملا۔ تراجم اور اجنبی زبان پر عبور حاصل کرنے کا شوق اور عزم کے اس طویل سفر میں اس نے ڈینش زبان کو کئی شاہپارے دیے۔ اس نے بدھ مت سے کہانیاں (Jataka-bogen) پیش کیں جس پر اسے یورپ بھر میں سراہا گیا۔اس نے پالی زبان سے گوتم بدھ کی تقاریر اور مکالموں کے مجموعے سُتانیپاتا (Sutta-Nipata 1881) کا ترجمہ بھی کیا۔"جاتاکا کتاب" (Jataka-Bogen) مہابھارت، ہندوستانی اساطیر کے مطالعے اور ڈینش دنیا میں ان کو متعارف کروایا۔ ان خدمات کے صلے میں اسے کئی اعزازات سے نوازا گیا۔

نور عنایت خان کی کتاب بھی ڈینش زبان میں 1996ء میں پیش کی جا چکی تھی ۔ڈینش مصنفہ ماریا ڈیمس ہولٹ (Maria Damsholt) میں پیش کر چکی ہیں۔نور عنایت خان جو تیس برس کی عمر میں اپنی زندگی کی آخری قندیل جرمنی کی اذیت گاہ کے اندھیرے میں جلا کر لازوال روشنی کی بنیاد رکھ گئی ایک الگ داستان ہے۔نور کو فرانس، برطانیہ اور روس میں جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ بھی شاید اردو زبان کے وارثین نہیں لگا سکتے۔جاتک کہانیوں کو انگریزی زبان میں پہنچانے کا سہرا ٹیپو سلطان کی وارث نور کے سر تھا۔

یاد آتے ہیں زمانے کیا کیا

(خودنوشت/ یادداشتیں)

گل زمینوں کے خنک رمنوں میں

محمد اظہار الحق

ڈھاکہ یونیورسٹی کی سٹوڈنٹس پالیٹکس کا دنیا بھر میں شہرہ تھا۔ یہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔
یونیورسٹی سیاست کی بنیادی سرگرمی ہال (ہوسٹل) کے انتخابات تھے۔ ہر ہال کے رہائشی طلبہ نے ایک کابینہ کا انتخاب کرنا ہوتا تھا۔ جس کے تیرہ چودہ ممبر ہوتے تھے۔ وائس پریزیڈنٹ' جنرل سیکرٹری' اسسٹنٹ سیکرٹری' ان کے علاوہ ریڈنگ روم' ان ڈور گیمز' سوشل ورک' ڈراما اور ادبی سرگرمیوں کے لیے الگ الگ سیکرٹری چننے ہوتے تھے۔

این۔ ایس۔ ایف (نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن) حکومت کی حامی تھی۔

EPSL ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹس لیگ' عوامی لیگ سے وابستہ تھی۔

EPSU ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹس یونین' نیشنل عوامی پارٹی کی پیروکار تھی۔

اسلامی شاتروشنگو جماعت اسلامی کی نمائندگی کرتی تھی۔ اکثر ہوسٹلوں میں لیگ اور یونین والے متحد ہو کر سرکاری پارٹی (این ایس ایف) کا مقابلہ کرتے تھے۔

رات کے گیارہ بجے ہیں۔ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ میں تیسری منزل پر اپنے کمرے میں ہوں۔ این ایس ایف کا جتھہ پہلی منزل پر ہے۔ فلک شگاف نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ ووٹ فار' ووٹ فار این ایس ایف' این ایس ایف۔ ڈھول پیٹے جا رہے ہیں۔ بگل بجائے جا رہے ہیں زمین کانپ رہی ہے۔ ہال کی چھ منزلہ عمارت لرز رہی ہے۔ ٹھک ٹھک دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ میں کتاب چھوڑ کر اٹھتا ہوں اور دروازہ کھولتا ہوں۔ سامنے پندرہ سولہ لڑکوں کا گروہ کھڑا ہے۔ سب کمرے میں داخل ہوتے ہیں میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ ہر لڑکا ہاتھ مارتا ہے اور اپنا تعارف کراتا ہے۔ میں فلاں پوسٹ کا امیدوار ہوں' میں فلاں کا اور میں فلاں کا' پھر ان میں ایک شستہ انگریزی میں کہتا۔ ''آپ مغربی پاکستان سے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ این ایس ایف ہی کی حمایت کریں گے۔ براہ کرم ووٹ ہمیں دیجئے گا۔'' میں کہتا ہوں فکر نہ کیجئے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ وہ چلے جاتے ہیں۔ میرے کمرے میں آدم صفی اللہ آتا ہے۔ وہ معتصم باللہ کا پڑوسی ہے اور معتصم باللہ میرا پڑوسی ہے۔ وہ مجھے بنگالی پڑھایا کرتا ہے۔ میں اس سے پوچھتا ہوں: ''تم کس پارٹی کے ساتھ ہو؟''

''کیا کہوں؟'' کبھی یونین EPSU کا حامی تھا لیکن نزدیک سے دیکھا تو ان کے نعرے کھوکھلے اور سلوگن بیکار لگے۔

اچانک دروازہ کھلتا ہے اور ایک اور گروہ اندر آتا ہے۔ کچھ نے داڑھیاں رکھی ہوئی ہیں۔ دو کو میں جانتا ہوں۔ ظہیر الحق جو اسلامی شاتروشنگو محسن ہال کا ناظم ہے اور باقر جو میرا دوست ہے۔ جو مجھے اور آفتاب کو اپنے گاؤں جگنی مورا لے گیا تھا۔ گروہ کے ارکان اپنا اپنا تعارف کراتے ہیں۔ پمفلٹ دیتے ہیں اور اپنے امیدواروں کی فہرست تھماتے ہیں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ فکر نہ کریں۔ تھوڑی دیر بعد آدم چلا جاتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد پھر دستک ہوتی ہے۔ تین طالب علم کھڑے ہیں۔ ان میں سہیل بھی ہے جو میرا دوست ہے اور جسے میں نے پنڈی سے کے کے ڈیوٹ کی اکنامکس کی کتاب منگوا کر دی تھی۔ وہ اپنے ساتھی کا تعارف کراتا ہے کہ یہ یونین کے امیدوار ہیں۔ امیدوار مجھ سے پوچھتا ہے۔

''آپ راولپنڈی میں کہاں پڑھتے رہے ہیں؟''

''گورنمنٹ کالج میں۔''

''میں بھی وہاں پڑھتا تھا۔''

''وہ کیسے؟''

سہیل بتاتا ہے کہ یہ قومی اسمبلی کے سپیکر جبار خان کے صاحبزادے ہیں۔ اس کے بارے میں سنا تھا کہ لڑکے اس سے پوچھتے ہیں تمہارے باپ سپیکر ہیں۔ تم حکومت کی مخالفت کیوں کرتے ہو۔ اس کا جواب یہ ہوتا تھا کہ میں جبار خان کا بیٹا ہوں سپیکر کا نہیں۔

یونیورسٹی میں ہر طرف جلوس نکل رہے ہیں۔ لڑکے ناچ ناچ کر اچھل اچھل کر کود کود کر اڑ اڑ کر نعرے لگا رہے ہیں۔

ہم آرٹس بلڈنگ کی تیسری منزل پر کھڑے ہیں۔ نیچے دوسری منزل پر این ایس ایف کا گروپ جا رہا ہے۔ ووٹ فار ووٹ فار این ایس ایف این ایس ایف۔

پہلی منزل پر سٹوڈنٹس یونین EPSU والے چیخ رہے ہیں۔ این ایس ایف والے اوپر پہنچ چکے ہیں۔ اب وہ ہمارے سامنے سے گزر رہے ہیں۔ خدا کی پناہ! جسم بجلیوں کی طرح کوندر ہے ہیں۔ دہانوں سے جھاگ بہہ رہی ہے۔ گلے رندھ گئے لیکن پھر بھی پوری قوت سے چیخ رہے ہیں' چیختے جا رہے ہیں۔ لڑکیاں اور لڑکے راستے سے ہٹ جاتے ہیں۔ ٹیچر کمروں سے جھانک کر دیکھ رہے ہیں۔

پروفیسر نور جاپان کی اکنامکس ہسٹری پڑھا رہے ہیں۔ باہر EPSU والے چیخ رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے ابھی یونیورسٹی کی عمارت گر پڑے گی نعرے سنائی دے رہے ہیں

پنجابی راج ختم کرو۔ ختم کرو
پنجابی راج ختم کرو۔ ختم کرو
ایوب شاہی ختم کرو۔ ختم کرو
ایوب شاہی ختم کرو۔ ختم کرو

آج سولہ جنوری ہے۔ کل الیکشن ہونے ہیں۔ آج کی رات بھاری ہے۔ این ایس ایف کا رکن میرے پڑوسی ''ذلیل'' (جلیل) ساجد کو تنبیہ کرتا ہے کہ تمہارے بلاک میں تمام لڑکے سٹوڈنٹس لیگ کے ہیں' ان کی آج دھنائی ہونی ہے۔

ہمارے بلاک میں آخری کمرہ سرور کا تھا۔ چھوٹے سے قد کا یہ لڑکا لیگ کا زبردست حامی تھا۔ اسے ہم افلاطون کہتے تھے۔ اور ''زہریلا لڑکا'' بھی۔ مصدر اور جعفر بھی لیگ کے ہم خیال تھے۔ میرا پڑوسی معتصم یونین کے ساتھ تھا عبدالحق نیوٹرل تھا۔

یہ کیا! سب لوگ سامان باندھ رہے ہیں۔ جس کے جہاں سینگ سماتے ہیں چلا جاتا ہے۔ سرور، مصدر، جعفر سب غائب ہیں۔ آج آدم صفی اللہ بھی دکھائی نہیں دے رہا۔ سجاد کریم پہلے ہی گھر جا چکا ہے۔ اب پورے بلاک میں میں ہوں۔ معتصم ہے، عبدالحق ہے اور ذلیل ساجد صاحب ہیں! پار کے بلاک سے حسین اور منان اپنے اپنے صندوق ذلیل صاحب کے کمرے میں رکھ کر جارہے ہیں۔ رات کے دس بج رہے ہیں۔ باقر میرے کمرے میں آجاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کے بلاک میں خطرہ زیادہ ہے۔ وہ بارہ بجے تک سوتا ہے پھر چلا جاتا ہے۔

یہ سترہ جنوری کی صبح ہے۔ ہر طرف سنسنی پھیلی ہوئی ہے۔ پولنگ ساڑھے آٹھ بجے شروع ہوجاتی ہے۔ میں ناشتہ کرتا ہوں۔ پھر میرا ہندو دوست سوشیل ہیلڈر آجاتا ہے۔ ہم چائے پیتے ہیں۔ مصدر اور سرور آتے ہیں اور لیگ کو ووٹ دینے کی تاکید کرتے ہیں۔ ہم مغربی پاکستانی طے کرتے ہیں کہ ایک بجے کے بعد ووٹ ڈالنے جائیں گے لیکن پھر اس خدشے سے کہ اس وقت تک لڑائی جھگڑا نہ شروع ہوچکا ہو پہلے ہی چلے جاتے ہیں۔ دروازے پر ہی این ایس ایف کے لڑکے ہمیں گھیر لیتے ہیں۔

وہ ہمارے گلوں میں بانہیں ڈال کر چیختے ہیں این ایس ایف زندہ باد۔ پھر ایک نعرہ لگتا ہے۔ قومی یکجہتی زندہ باد، وسیع آڈی ٹوریم میں میزوں کے ساتھ پنسلیں بندھی ہوئی ہیں۔ سامنے سٹیج پر ڈاکٹر کے ٹی حسین اور دوسرے پروفیسر بیٹھے ہیں۔ ہم سیریل نمبر لے کر فارم لیتے ہیں۔ ووٹ ڈال کر باہر آجاتے ہیں۔

مغرب کی نماز مسجد میں پڑھ رہا ہوں۔ تنویر سرا ہانپتا ہوا آتا ہے۔

"اظہار صاحب نماز جلدی ختم کیجیے اور چلیں۔"

"کیوں؟ کیا بات ہے؟"

"کینٹین کے سامنے میں نے ایک لڑکے کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی تلوار دیکھی ہے۔ پولنگ کا نتیجہ نکلنے والا ہے۔ دست بدست لڑائی کا خطرہ ہے۔"

لیکن کمرے میں کون بیٹھے؟ ہم ہال کے گیٹ پر آجاتے ہیں۔ لڑکوں نے گیٹ کو گھیرا ہوا ہے۔ جناح ہال کی طرف سے ایک گروہ بھاگتا آرہا ہے اور نعرہ زن ہے۔ لیجیے۔ جناح ہال میں این ایس ایف نے تمام نشستیں جیت لی ہیں۔

ہمارے ہال میں معاملہ برابر رہتا ہے۔ آٹھ نشستیں این ایس ایف کو چھ شنگھاتی (متحدہ لیگ اور یونین) کو ملتی ہیں۔ نائب صدر شنگھاتی کا، جنرل سیکرٹری این ایس ایف کا ہے۔ این ایس ایف کا پروگرام تین دن تک جشن منانے کا ہے۔ گراموفون بج رہا ہے۔ گولے پھٹ رہے ہیں۔

رقیہ ہال میں این ایس ایف ہار گئی ہے۔ رقیہ ہال لڑکیوں کا ہے۔ جگن ناتھ ہال میں بھی یہی ہوا ہے۔ جگن ناتھ ہال میں ہندو طلبہ ہیں۔ اقبال ہال میں این ایس ایف کا وجود ہی نہیں۔ وہاں یونین کا زور ہے۔ فضل الحق ہال اور ڈھاکے ہال میں این ایس ایف جیت جاتی ہے۔ میڈیکل کالج میں ایک طالب علم کو چھرا گھونپ دیا جاتا ہے۔

دور۔۔۔ دریا کے گھاٹ سے، ناریل سپاری اور آم کے درختوں کے جھنڈ سے، آواز آتی ہے۔ پہلے آہستہ، پھر بلند ہوتی ہے۔ بنگال۔ جاگو۔ بنگال

پنجابی راج ختم کرو۔

☆......☆......☆

پلٹ کر دیکھتا ہوں تو ڈھاکہ یونیورسٹی میں گزرا ہوا عرصہ زندگی کے دلکش ترین ٹکڑوں میں ایک نمایاں ٹکڑا لگتا ہے۔ بے فکری تھی اور آسودگی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کا ماحول مجموعی طور پر افتادِ طبع کے عین مطابق تھا۔ ذہین اور طباع لوگ جو بات کو فوراً سمجھ جاتے تھے۔ ادب اور سیاست' بین الاقوامی تاریخ (آئی۔آر) برصغیر کی تاریخ۔ غرض اردو اور فارسی' شاعری کو چھوڑ کر ان سارے موضوعات پر جن سے دلچسپی تھی بات کرنے اور بات سمجھنے والے وہاں اردگرد تھے۔ میں گورنمنٹ ڈگری کالج راولپنڈی سے گیا تھا۔ ڈھاکہ میں پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج لاہور کے طلبہ بھی آن ملے تھے۔ علم و دانش کا جو ماحول ڈھاکہ یونیورسٹی میں تھا۔ وہ مغربی پاکستان کے اکثر و بیشتر تعلیمی اداروں میں عنقا تھا۔ جب مغربی پاکستان کے تعلیمی اداروں میں پڑھنے والے طلبہ کوٹ پتلون اور ٹائی میں ملبوس ہو کر کلاس روموں میں تشریف لاتے تھے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے طالب علموں کی اکثریت کرتا پاجامہ اور چپل پہن کر یونیورسٹی آتی تھی۔ یہ لوگ روکھا سوکھا کھاتے تھے۔ والدین سے اتنی ہی رقم منگواتے تھے جو قوت لایموت کے لیے ناگزیر تھی۔ بہت سے اخبارات میں مضامین لکھ کر اپنا خرچ پورا کرتے تھے۔ پوری پوری رات یونیورسٹی لائبریری میں بسر کر دیتے تھے۔

دو چیزیں ڈھاکہ یونیورسٹی میں بالکل نئی دیکھیں۔ لائبریری کا چوبیس گھنٹے کھلا رہنا اور امتحانی پرچوں کا وقت تین گھنٹے کے بجائے چار گھنٹے ہونا۔

ایک سو پچھتر روپے ماہانہ مرکزی وزارت اطلاعات (پاکستانی کونسل برائے قومی یک جہتی) سے سکالرشپ ملتا تھا۔ ہوسٹل کے کمرے کا کرایہ سو روپے ماہانہ اور یونیورسٹی کی فیس اس کے علاوہ ملتی تھی۔ تیس روپے ماہانہ صبح کے ناشتے پر خرچ ہوتے تھے۔ یعنی روز کا ایک روپیہ جس میں دودھ کا گلاس' کیلا' انڈا' ڈبل روٹی یا دلیا آجاتے تھے۔ دو وقت کے کھانے کا میس کا بل ستر روپے کے لگ بھگ ہوتا تھا۔ باقی پچھتر روپوں میں ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔ یہ ایک خطیر رقم تھی۔ ویکلی ٹائم یا نیوز ویک خرید کر پڑھتے تھے جس کی قیمت دو روپے فی پرچہ تھی۔ فلم گراں ترین درجے میں بیٹھ کر دیکھتے تھے۔ پھل وافر خریدتے تھے۔ شام کو ہر روز نیو مارکیٹ جاتے اور ڈاب (سبز ناریل کا پانی) پیتے۔ عصر کے وقت مٹھائی فروش آتا اور ہوسٹل کے برآمدوں میں ''چم چم'' کی آواز لگاتا۔ شام کی مٹھائی اور چائے کو وہاں ناشتہ کہا جاتا تھا۔ بہت کم ایسا ہوتا کہ ''چم چم'' کی آواز ہمارے التفات سے محروم رہے۔ آم وہاں کے شیریں اور خوشبودار تھے۔ ایک روپے میں چھ آ جاتے تھے۔ کمرے کے سامنے برآمدے کے کنارے سے رسی نیچے لٹکاتے۔ آم فروش کپڑے یا لفافے میں آم ڈال کر رسی سے باندھتا۔ رسی اوپر کھینچ لی جاتی اور آم نکال کر اس میں پیسے ڈال کر رسی دوبارہ لٹکا دی جاتی۔

سال اول کے اختتام پر رفیق اللہ سے دوستی ہوگئی جو اس کی زندگی کے آخری دنوں تک رہی۔ وہ چوموہانی (ضلع نواکھلی) کے قصبے سے تھا۔ اور محسن ہال ہی میں قیام پذیر تھا۔ انگریزی ادبیات میں ایم اے کر رہا تھا۔ انگریزی ادب ہی اس کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ وہ اپنے بنگالی دوستوں سے سیاست پر اور مجھ سے ادب پر بات چیت کرتا۔ ہم دونوں کی دلچسپیاں مشترک تھیں۔ ہوتے ہوتے روٹین یہ سیٹ ہوگئی کہ وہ میرے کمرے میں آ جاتا۔ ہم بحث و مباحثہ کرتے اور اپنا اپنا مطالعہ بھی۔ رات گئے چائے کا دور چلتا۔ سحری کے وقت وہ چلا جاتا۔ رمضان آیا تو اس کا سب دوستوں کو ایک ایک دن نیو مارکیٹ لے جا کر افطاری کرانے کا پروگرام بنا۔ ابتداء مجھ سے ہوئی۔

رفیق اللہ کے زیر اثر میں نے بھی انگریزی ادب میں ایم اے کرنے کا ارادہ کر لیا۔ فروری ۱۹۷۰ء میں اسلام آباد واپس آ کر کتابیں جمع کیں اور پڑھائی شروع کر دی۔ سفوکولیز Sophocles' کیٹیلس Catalus اور کئی

دوسرے کلاسیکی مصنفین پہلے ہی پڑھ چکا تھا لیکن پھر یہ سب چھوڑ کر مقابلے کے امتحان میں بیٹھ گیا۔ پاکستان مراجعت کے بعد طویل عرصہ تک رفیق اللہ سے خط و کتابت رہی۔ ڈھاکہ کے انگریزی اخبار پاکستان آبزرور سے ایم اے اکنامکس کے ریزلٹ کی کٹنگ رفیق اللہ نے ہی بھیجی۔ میں نے ایم اے اکنامکس کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کر لیا تھا۔

اس نے کچھ عرصہ کالج میں پڑھایا۔ پھر مقابلے کا امتحان پاس کر کے صوبائی سول سروس میں آ گیا۔ خط و کتابت کے سلسلے میں ہمارے درمیان ہمیشہ آنکھ مچولی رہی۔ جب بھی رابطہ منقطع ہوتا' کچھ عرصہ بعد رفیق اللہ مجھے ڈھونڈ نکالتا اور خط و کتابت دوبارہ شروع ہو جاتی۔ پھر ایک طویل عرصہ ایسا گزرا جب ہم دونوں کھو گئے۔ یوں لگتا تھا۔ اب کبھی رابطہ نہ ہوگا۔ لیکن اس نے مجھے پھر ڈھونڈ نکالا۔ اب وہ امریکہ میں تھا۔ اوماہا میں پڑھ رہا تھا۔ اور کوئی کاروبار بھی کرتا تھا۔ ایک دن اچانک ایک ٹیلی فون آیا۔ یہ رفیق اللہ کے بیٹے کا تھا۔ وہ راولپنڈی کی ذکریا مسجد سے' جو تبلیغی جماعت کا مرکز تھا بول رہا تھا۔ میں اور میرا بیٹا گئے۔ عشرت کے ساتھ اس کا بھائی بھی تھا۔ ہم انہیں گھر لے آئے۔ کچھ دیر وہ ہمارے ساتھ رہے۔ ان کے طرز گفتگو سے ان کے باپ کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ پھر ایک دن ایک نوجوان گھر آیا۔ دراز قامت' دراز ریش' دستار پوش' بظاہر کٹر مولوی' یہ نوجوان ۔۔۔ ڈاکٹر تھا۔ اس کے والدین چک لالہ میں رہتے تھے۔ اس نے ایک بیگ دیا جو رفیق اللہ نے بھیجا تھا۔ اس میں تحائف تھے۔ میرے لیے۔ میری بیگم اور بچوں کے لیے۔ ایسے بیگ یہ نوجوان ڈاکٹر کئی بار لایا۔ کچھ نہ کچھ میں بھی اس کے ہاتھ بھیجتا رہا۔ ۲۰۰۵ء میں منی سوٹا کے قصبے راچسٹر میں جہاں مشہور زمانہ میو کلینک تھا' ہماری نواسی زینب عالم ارواح سے عالم وجود میں آئی تو میں اور بیگم وہیں تھے۔ رفیق اللہ سے رابطہ ہوا تو وہ مچل گیا کہ تم نے اوماہا ضرور آنا ہے۔ اسے بتایا کہ نواسی کی پیدائش کی وجہ سے ہماری بیٹی کا سفر کرنا مشکل ہوگا۔ اس نے کہا یہ امریکہ ہے پاکستان یا بنگلہ دیش نہیں، چھ سات دن بعد سفر ممکن ہو جاتا ہے۔ بس تم نے ضرور آنا ہے۔ ہم نے راچسٹر سے وینکوور (کینیڈا) جانا تھا۔ جس کی تاریخ طے تھی۔ اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا کہ ہم زینب کی پیدائش کے آٹھویں دن رفیق اللہ کے ہاں جائیں۔ یہ ایک لمبا سفر تھا۔ ڈاکٹر عمار گاڑی چلا رہے تھے۔ سات دن کی زینب کا یہ دنیا میں پہلا سفر تھا۔ ہمیں سات آٹھ گھنٹے لگ گئے۔ شام ڈھل رہی تھی۔ جب ہم اوماہا پہنچے۔ رفیق اللہ اپنے بیٹوں اور پوتے کے ساتھ گھر سے باہر کھڑا منتظر تھا۔ ہم تقریباً پینتیس برس بعد مل رہے تھے۔ اس کی خوشی دیدنی تھی۔ بھاری بھر کم بھابھی بھی خوش تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ رفیق اللہ سے میرا بہت زیادہ ذکر سن چکی تھیں۔ وسیع و عریض گھر میں ہم تین دن رہے۔ اوماہا کی سیر کی۔ فلم دیکھی' پارکوں اور باغوں میں گھومے۔ جس دن واپسی تھی رفیق اللہ کا ننھا پوتا رو رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم اس کے پاس ہی رہیں۔

میں اور زاہدہ راچسٹر سے وینکوور چلے گئے۔ جہاں ایک ہفتہ گردیو ڈھلن اور بھابھی بھوپندر کے مہمان رہے۔ پاکستان واپس آئے۔ زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ دل دہلا دینے والی وہ خبر ملی جس کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ رفیق اللہ نے بتایا کہ اسے کینسر ہے اور اب وہ کچھ ہی دن کا مہمان ہے۔ اس کی وفات کے بعد میں نے دی بنگلہ دیش ٹوڈے میں اس کے بارے میں تفصیلی مضمون لکھا جو ویکلی ہالیڈے انٹرنیشنل میں بھی شائع ہوا۔ رفیق اللہ کی بیٹی فرحانہ کی ای میل آئی۔ وہ یہ مضمون پڑھ کر روتی رہی تھی۔

(زیر تالیف خودنوشت سے)

امرتا پریتم سے ایک ملاقات

حسن عباس رضا

میں نے ان کے ہاتھوں پر بوسہ دیا اور رخصت کی اجازت لینے کے لیے اٹھا' مگر انہوں نے دونوں ہاتھوں سے میرا بازو پکڑ لیا۔ ''نہیں بیٹا' ابھی نہیں' کچھ دیر اور رک جاؤ ابھی میں نے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں' اپنے دیس کی باتیں' اپنی جنم بھومی کی باتیں' اپنے پنجاب کی باتیں۔۔۔ ابھی تو میرا دل یادوں کے خزانوں سے بھرا پڑا ہے۔۔۔ ابھی نہیں۔ بیٹھ جاؤ' تم دونوں نے مجھے ماضی میں لا کھڑا کر دیا ہے۔''

ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ میں نے کہا' دل تو نہیں چاہتا مگر ایک کمٹمنٹ ہے جو جانے کے لیے مجبور کر رہی ہے۔ احمد داؤد نے آگے بڑھ کر انہیں گلے لگایا اور گلوگیر لہجے میں کہنے لگا۔ ''امرتا جی آپ نے ہمارے دامن میں اتنی محبت' شفقت اور خلوص بھر دیا ہے کہ آنے والے دنوں تک یہ ہمیں سرشار کرتا رہے گا۔ امرتا جی نے ایک بار پھر ہم دونوں کے ہاتھوں پر بوسہ دیا' سر جھکا کر کہنے لگیں۔ ''اچھا بیٹا' رب راکھا۔'' اس سارے الوداعی منظر کے دوران امروز خاموشی سے ہم تینوں کی باتیں سنتے اور آنکھوں سے گرتے آنسوؤں کو گنتے رہے اور پھر سر جھکائے وہ ہمیں دروازے تک چھوڑنے آئے۔

امرتا پریتم کے ساتھ یہ ہماری پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ دوسری بار میں دلی گیا تو وقت کی کمی کے باعث صرف فون پر بات ہو سکی۔ ملاقات نہ ہونے پائی۔ پہلی بار احمد داؤد مرحوم اور میں اردو کانفرنس میں شرکت کے لیے دہلی اور ممبئی گئے تھے۔ دہلی میں قیام کے دوسرے دن سے ہی ہم نے کوششیں شروع کر دی تھیں کہ امرتا پریتم سے ضرور ملنا ہے۔ امروز کے ذریعے ان سے ہماری خط و کتابت پہلے سے تھی وہ ہمارے نام اور کام سے واقف تھیں کیونکہ ان کے میگزین ''ناگ منی'' میں احمد داؤد کے افسانے اور میری نظمیں شائع ہو چکی تھیں۔ یہ تخلیقات امروز نے پاکستانی رسائل سے لی تھیں۔

جس دن ہماری ملاقات طے ہوئی' اس شام کو کانفرنس میں احمد داؤد نے مضمون پڑھنا تھا جب کہ مجھے اختتامی مشاعرے میں شرکت کرنا تھی۔ ناواقفیت کی وجہ سے کافی دیر ٹیکسی ڈرائیور ہمیں گھماتا رہا بالآخر ہم حوض خاص کے علاقے میں ان کی رہائش پر پہنچنے میں کامیاب ہوئے' امروز نے ہمارا استقبال کیا اور لاؤنج میں لے گئے۔ امرتا جی نے کتاب ماضی کھولی اور پھر ورق الٹتے گئے۔ چند ایک قہقہوں کے سوا' بقیہ وقت آہوں اور آنسوؤں کے جلو میں گزرا' بیچ بیچ میں وہ نظموں کی کچھ لائنیں بھی سناتی رہیں۔ میری فرمائش پر انہوں نے ''اَج آکھاں وارث شاہ نوں'' سنائی۔ امروز چائے لے کر آئے تو امرتا جی نے خود اپنے ہاتھوں سے ہمیں چائے بنا کر دی۔ اس دوران ہم نے امروز کی پینٹنگز بھی دیکھیں۔ پاکستان واپس آنے کے بعد میں نے انہیں دو تین خط لکھے مگر ایک خط کا جواب آیا' جس میں انہوں نے اپنی خیریت سے آگاہ کیا تھا۔ ان کی تمام خط و کتابت امروز کیا کرتے تھے۔ کیونکہ میرے خیال میں امرتا جی اردو نہیں لکھ سکتی تھیں' بعد ازاں ان سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا' لیکن پہلی ملاقات ہمیشہ دل کے آنگن میں تازہ بہ تازہ پھول کھلاتی رہی۔ بقول میر۔

عمر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے

امرتا جی سے میرا پہلا تعارف ان کی مقبول و معروف سوانح ''رسیدی ٹکٹ'' سے ہوا تھا۔ اس کے بعد ان کی شاید ہی کوئی تحریر ہو جو میرے مطالعے سے بچ گئی ہو۔ ان کی کئی نظمیں مجھے زبانی یاد تھیں۔ جو میں اکثر تنہائی میں خود کو اور محفل میں احباب کو سناتا۔ یوں تو امرتا جی کی لاتعداد ایسی نظمیں ہیں جو جدید پنجابی نظم میں سب سے منفرد دکھائی دیتی ہیں۔ تاہم کچھ نظموں کی سطریں ایسی ہیں کہ وہ دل اور روح تک اتر جاتی ہیں' ان کے نظموں کے استعارے' علامتیں' اور تشبیہات قاری کو

ایک نئے ذائقے سے روشناس کراتی ہیں۔

۱۔ سفنے دا اک تھان بنایا
گز کوں کپڑا پاڑ لیا
تے عمر دی جھولی سیتی

۲۔ عرض کرے دھرتی دی دائی
رات کدے دی بانجھ نہ ہووے

۳۔ اک وارا چانک تو آیا
تے وقت ازلوں حیران
میرے کمرے وچ کھلوتا رہ گیا

۴۔ ست رنگ پانی وچ گھلدے
اٹھواں دل وچ کھلدا
سب رنگاں وچ بھیس رنگاواں
اٹھویں رنگ وچ سفنا

۵۔ نجی اکھ زمیں دی پھڑکی
موت دے کورے کاغذ اتے
زندگی نے انگوٹھا لایا

چند ماہ پہلے گلزار جی نے مجھے ممبئی سے ایک بہت خوبصورت اور ہمیشہ یاد رہنے والا تحفہ بھیجا۔ وہ قیمتی تحفہ ہر رات مجھے گلزار اور امرتا سے ملاقات کراتا ہے۔ یہ ایک سی ڈی ہے امرتا جی کی نظموں کو گلزار نے اپنی منفرد آواز میں ریکارڈ کیا اور ہر نظم سے پہلے امرتا جی کے بارے میں نظم کے حوالے سے بہت خوبصورت تبصرہ کیا ہے۔ جن احباب تک یہ سی ڈی نہیں پہنچی ان کے لیے چند اقتباسات۔

''امرتا جی نے پنجابی شاعری کے صفحوں پر تقریباً پوری بیسوی صدی چل کے اکیسویں صدی کی دہلیز پار کی تو جسم تھکنے لگا۔ روح مگر تازہ دم تھی' شاید چلنے کو اٹھیں' تو امروز نے ہاتھ تھام لیا جو ایک صدی سے ان کا ہم قدم تھا' مڑ کے دیکھا'' ہاتھ پہ نہیں تھا' انگلیاں ابھی چھوٹی نہیں تھیں۔ بولیں ''میں تینوں فیر ملاں گی۔''

میں تینوں فیر ملاں گی
کتھے' کس طراں' پتہ نہیں
شاید تیرے تخیل دی چنگ بن کے
تیرے کینوس تے اتراں گی
یا خورے تیرے کینوس دے اتے
اک رہس نئی لکیر بن کے
خاموش تینوں تکدی رہواں گی
میں تینوں فیر ملاں گی ۔۔۔۔
یا خورے سورج دی لو بن کے
تیرے رنگاں وچ گھلاں گی

یا رنگاں دیاں بانہواں وچ بیٹھ کے
تیرے کینوس نوں وَلاں گی
پر تینوں ضرور ملاں گی
یا خورے اک چشمہ بنی ہوواں گی
تے جیویں جھرنیاں دا پانی اڈدا
میں پانی دیاں بونداں تیرے پنڈے تے ملاں گی
تے اک ٹھنڈک جئی بن کے
تیری چھاتی دے نال لگاں گی
میں ہور کجھ نہیں جاندی
پر ایناں جاندی آں کہ وقت جو وی کرے گا
ایہہ جنم میرے نال ٹرے گا
ایہہ جسم مکدا اے تے سب کجھ مک جاندا اے
پر چیتیاں دے دھاگے
کائناتی کناں دے ہوندے نیں
میں کناں نوں
چناں گی
دھاگیاں نوں ولاں گی
تے تینوں فیر ملاں گی

بقول گلزار امرتا جی کی نجی نظموں میں بھی زمانہ نظر آتا ہے۔ ان کا دور دکھائی دیتا ہے۔ بات کرتے کرتے ایک کائنات کھول کے رکھ دیتی ہے۔ لیکن جب کائنات کو سمیٹ کر نجی بات پر آتی ہیں تو کچھ دوستوں کے چہرے نظر آنے لگتے ہیں اور وہاں گوڑھے گہرے دنیاوی رشتے بھی دکھائی دینے لگتے ہیں جہاں سماج کے گھاٹ پار کرنے کے لیے بہت سے پل جلا دینے پڑتے ہیں۔

کل اساں دوہنواں نیں
اک پل جلایا سی
تے اک دریا دے کنڈھیاں وانگوں
نصیب ونڈے
تاں اک پنڈے دی ویرانی ایس کنڈھے سی
تے اک پنڈے دی ویرانی اوس کنڈھے
تے فیر رتاں نے جدوں وی کجھ پھل دتے
تاں توں وی اوہ پنڈے توں توڑ دتے
تے میں وی اوہ رتاں نوں موڑ دتے
تے جھڑے پتیاں وانگوں
کنے ای ورھے اساں پانی وچ روڑھ دتے
ورھے ملے نیں پر پانی نہیں سکے

تے وگدے پانیاں وچوں پر چھانیوں تاں ویکھے
پر منہ نہیں تکے
تے ایس تو پہلاں
کجھ وتھ تے کھلوتے' اسی تک جائیے
چل کھنگراں جئے پنڈے پانی تے وچھائیے
ٹوں آپنے پنڈے تے پیر رکھیں
تے اودھے دیانوں لنگھ آویں
میں آپنے پنڈے تے پیر رکھاں گی
تینوں اگودی ملاں گی
چل کھنگراں جئے پنڈے پانی تے وچھائیے

گلزار کہتے ہیں۔ ''چند ملاقاتیں یاد ہیں امرتا' اور امروز سے انہیں سوچ میں اکثر دیکھا تھا۔ تھاٹ فل نظر آتی تھیں۔ لیکن اداس کبھی نہیں دیکھا۔ ہمیشہ بھری ہوئی' دودھ سے بھرے کٹورے کی طرح چھلکتی ہوئی۔۔۔ لیکن شاعر اپنی اداسی چہرے پر کہاں لکھتا ہے۔ وہ تو اپنی نظموں میں بھر دیتا ہے۔ جیسے پانی میں مٹھی بھر ریت انڈیل دے۔ وہیں کہیں تہہ میں بیٹھ جاتی ہے وہ اداسی' نظم کی سطح پر بھی نظر نہیں آتی۔ نظم گھڑونچی پر پڑی رہتی ہے۔ رستے گھڑے کی طرح

وے میں تڑکے گھڑے دا پانی
کل تک نئیں رہنا
ایس پانی دے کن ترھیائے
تریہہ دے ہونٹھاں وانگوں
او میرے ٹھنڈے گھٹ دیا مترا
کہہ دیا جو کجھ کہنا
میں تڑکے گھڑے دا پانی' کل تک نئیں رہنا
اج دا پانی کیکن لا ہوے
کل دی تریہہ دا قرضہ
نہ پانی نے کنیں بھجنا
نہ پلّے وچ رہنا' وے میں تڑکے گھڑے دا پانی' کل تک نئیں رہنا

امرتا جی کو ہم سے بچھڑے کئی موسم بیت گئے مگر ان کی کہانیاں' ان کی نظمیں آج بھی ادب عالیہ کے صفحات پر جگمگا رہی ہیں۔ پہلے ان سے ملاقات آج بھی یادوں کے بام پر چلتے چراغوں کی طرح جگمگا رہی ہے اور تصور کے منظروں میں آج بھی یوں لگتا ہے کہ وہ ایک بار پھر ہاتھ پکڑ کر کہیں گی' بیٹا' کچھ دیر اور رک جاؤ نا' وہی آواز' وہی ممتا بھرا میٹھا لہجہ میرے کانوں میں رس گھول رہا ہے۔

امرتا جی' میں تو رک جاؤں' مگر آپ۔۔۔۔
زیادہ سے زیادہ دل بچھا دیتے ہیں رستے میں
مگر جس نے بچھڑنا ہو' اسے روکا نہیں کرتے

کمالیہ

(خودنوشت ''ناسٹیلجیا'' سے ایک باب)

سلمان باسط

کمالیہ کا سکول ہر لحاظ سے ایک روایتی اردو میڈیم سکول تھا۔ کمروں میں تو کرسیاں اور میز موجود تھے مگر سردیوں میں کلاسز دھوپ میں لگتی تھیں اور ان کلاسوں کی نشست کے لیے ٹاٹ کو ہی کافی سمجھا جاتا تھا بصورت ِ دیگر کمالیہ کی گرد کپڑوں کی خاطر خواہ دھلائی کے باوجود رخصت ہونے کا نام نہ لیتی۔ سکول ایک وسیع رقبے پر مشتمل تھا۔ وسیع اور کشادہ کھیل کے میدان اور غیر استعمال شدہ زمین کے بڑے بڑے قطعات جن پر خودرو جھاڑیاں کثیر تعداد میں اگی ہوئی تھیں، چاروں اطراف میں موجود تھے۔ بریک میں بچے ان میدانوں میں فٹ بال، والی بال، کبڈی اور باڈی کھیلتے۔ "باڈی" ایک دلچسپ کھیل تھا جس میں زمین پر لکیریں کھینچ کر خانے بنا لیے جاتے اور دو ٹیمیں بن جاتیں۔ دونوں ٹیموں کے کھلاڑی باری باری دوسرے علاقے میں اس طرح گھسنے کی کوشش کرتے کہ مخالف ٹیم کے کسی کھلاڑی کا ہاتھ ان کے جسم کے کسی بھی حصے پر نہ لگنے پائے، یہ انتہائی مستعد، چست اور لچکدار جسم رکھنے والوں کا کھیل تھا جو دوسروں کو آسانی سے باڈی ڈاج دے سکیں۔ کبھی کبھار مخالف کھلاڑی کا ہاتھ زور سے لگ جانے پر قوتِ برداشت جواب بھی دے جاتی اور نوبت ہاتھا پائی تک جا پہنچتی مگر کھیل پھر بھی جاری رہتا۔ ایسے کھیل قدرتی طور سے بچوں کی جسمانی نشوونما کرتے اور انہیں صحت مند اور چاق و چوبند رہنے کے لیے کسی مزید سرگرمی کی ضرورت نہ پڑتی۔ آج ایسے جسمانی ورزش والے کھیل کمپیوٹر اور سمارٹ فون کی سکرینز میں کہیں گم ہو گئے ہیں اور بچوں کو فٹ رہنے کے لیے جم جانا پڑتا ہے۔

سکول میں بچوں کو جی بھر کے جسمانی سزائیں دی جاتیں۔ اساتذہ ایذا رسانی کے مختلف طریقوں کے موجد تھے۔ ہر کلاس روم میں یہ مناظر عام ہوتے۔ کوئی نہ کوئی بچہ تکلیف سے بلبلا رہا ہوتا اور اساتذہ اسے بزورِ بازو تحصیلِ علم کی طرف راغب کر رہے ہوتے۔ بچے اپنے دفاع میں ہاتھ پاؤں بڑھاتے اور اساتذہ ان کے ہاتھوں کو جُل دے کر ان کے اجسام کے مختلف حصوں کو اپنے تھپڑوں اور چھڑیوں کا نشانہ بناتے۔ میں غالباً تب تک چوتھی یا پانچویں جماعت تک پہنچ چکا تھا۔ ہماری کلاس کے نگران ایک استادِ محترم تھے جن کا نام اسلم جاوید صاحب تھا۔ اب وہ جہاں بھی ہیں، اللہ انہیں خوش رکھے مگر وہ بچوں کو نت نئی سزائیں دے کر بظاہر طمانیت محسوس کرتے تھے۔ میں حساب کے مضمون میں کمزور تھا اور ہمارے استاد مجھے حساب سکھانے کے لیے کتاب سے زیادہ اپنے ہاتھوں اور چھڑی سے کام لیتے۔ ان کی اس "محنت" کے نتیجے میں حساب میرے لیے عمر بھر کے لیے ایک ناپسندیدہ مضمون بن گیا۔ جب میں کوئی سوال حل نہ کر پاتا تو میرے ہاتھوں کی انگلیوں کے درمیان سے پنسل گزار کر اس طرح زور سے دباتے کہ میری چیخیں نکل جاتیں۔ اس پر بھی جی نہ بھرتا تو مرغا بننے کو کہتے۔ جب میں مرغا بن کر کانوں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑتا تو ہاتھوں پر زور سے چھڑی مارتے اور ہاتھ بھی چھوڑنے کی اجازت نہ دیتے۔ تمام دن وہی استاد ہمیں تمام مضامین پڑھاتے اور یہ کھیل سارا دن مجھ سمیت بہت سے بچوں کے ساتھ جاری رہتا۔

حساب کے علاوہ دیگر تمام مضامین مجھے اچھے لگتے تھے مگر اسلم جاوید صاحب کے طرز تدریس کی بدولت میں ہر مضمون سے متنفر ہوتا جا رہا تھا۔ آغاز میں جب بھی انگلش یا اردو کا پیریڈ آتا تو میں بہت خوش ہوتا، تمام اساتذہ مجھ سے ہی ان مضامین میں کتاب پڑھنے کی فرمائش کیا کرتے مگر اب میں اس کی اہلیت سے بھی محروم ہو چکا تھا۔ اسلم جاوید صاحب اردو کے پیریڈ میں اسماعیل میرٹھی کی انتہائی پر لطف نظموں کو بھی انتہائی غیر دلچسپ انداز میں پڑھاتے۔ ان نظموں کی تشریح کا آغاز کرتے ہوئے جالندھر کے روایتی لہجے میں بولتے، "شاعر کہندا" اور پھر جانے وہ کون سی تشریح ہوتی جس کا نظم کے ساتھ کم از کم کوئی تعلق نہ ہوتا۔ اردو کی تدریس کا معیار ایسا تھا تو حساب تو پھر میرے لیے ایک ڈراؤنے خواب کی مانند تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ان کی مار کے خوف سے انتہائی آسان سوال بھی مجھے بھول جاتے۔ ایک بار انہوں نے سوال حل کرواتے ہوئے بچوں سے پہاڑے پوچھنے شروع کیے۔ میری "استعداد" کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انہوں نے مجھے دو کو دو سے ضرب دے کر جواب بتانے کو کہا۔ میں اس منحوس لمحے میں اس قدر خوف زدہ ہو چکا تھا کہ جواب میں پانچ کہہ دیا۔ ماسٹر صاحب نے حیرت سے "ہیں؟؟" کہا اور ساتھ ایک زوردار تھپڑ میرے گالوں پر رسید کیا۔ وہ تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ میں دور جا گرا۔ میری آنکھوں سے آنسو جھرنوں کی طرح پھوٹ نکلے۔ میں ابھی زمین سے اٹھا ہی تھا کہ انہوں نے ایک اور تھپڑ جڑ دیا۔ اب کی بار میں دوسری طرف جا گرا۔ بچے میری ہیئتِ کذائی پر ہنسنے لگے۔ میں خوف، شرمندگی اور گھبراہٹ کا شدید شکار ہو چکا تھا کہ ماسٹر صاحب نے پھر وہی جواب مانگ لیا۔ مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کیا پوچھ رہے ہیں اور اس کا جواب کیا ہے۔ میں نے ایک میکانکی انداز میں دوبارہ "پانچ" کہہ ڈالا۔ ماسٹر صاحب غصّے سے پاگل ہو رہے تھے کہ میں انتہائی آسان سوال کا بھی جواب نہ دے پایا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا جو شاید اسرائیلیوں نے فلسطینیوں کے ساتھ بھی نہ کیا ہوگا۔ بریک ہوئی تو میں روتا ہوا کلاس روم سے باہر ایک کونے میں جا بیٹھا۔ کئی بار بچوں کے سکول سے بھاگنے کی خبریں سنتا رہتا تھا۔ اس وقت زندگی میں پہلی بار میں نے بھی سکول سے بھاگنے کے بارے میں پوری سنجیدگی سے سوچا۔ اب میں سکول سے بھاگنے کے ممکنہ نتائج پر غور کرنے لگا۔ سکول سے بھاگنے کے بعد گھر والوں کی ناراضی اور متوقع پٹائی کا خوف بھی اپنی جگہ موجود تھا مگر میں ماسٹر صاحب سے مزید مار کھانے پر کسی صورت تیار نہیں تھا۔ میں نے اپنے مستقبل کے بارے میں بھی سوچا اور بسوں میں کنڈکٹری سے لے کر چائے خانوں میں بیراگیری تک کو آئندہ پیشوں کے طور پر اختیار کرنے کے بارے میں غور کیا۔ جانے کون سے لمحے میری آنکھوں میں امی جی کا شفیق اور مہربان چہرہ آ گیا۔ مجھے ایسے لگا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو ہیں اور وہ منّت بھرے انداز میں کہہ رہی ہیں، "ناں میرے لعل ایسے نہ کرنا، میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی"۔ میں تصور میں ابا جی کو دیوانہ وار اپنی تلاش میں مارے مارے گھومتے دیکھنے لگا۔ بھائی جان کی آوازیں میرے کانوں میں گونجنے لگیں، "میرا ویر۔۔۔ میرا ویر"۔ میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں نے سکول سے بھاگنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اسی لمحے شفقت کہیں سے مجھے ڈھونڈتا ہوا آ نکلا اور خاموشی سے میرے آنسو اپنے ہاتھوں سے پونچھنے لگا۔ اس نے صرف ایک جملہ کہا،

"ماسٹر صاحب بہت گندے ہیں"۔ میرا رونا بتدریج تھمنا شروع ہو گیا۔

بریک کا وقت ختم ہوا تو ہم دونوں کلاس روم کی جانب چل پڑے لیکن میری ٹانگوں میں جان ہی محسوس نہ ہو رہی تھی۔ کسی طرح گھسٹتے ہوئے میں کلاس روم تک پہنچ ہی گیا مگر باقی کے اوقات میں مزید مار کا خوف سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ قدرت مجھ پر مہربان ہو گئی تھی یا شاید ماسٹر صاحب میرے لیے مختص اس دن کے لیے اپنی مار کا کوٹا مکمل کر چکے تھے، باقی دن انہوں نے میری جانب مزید نظرِ التفات نہ ڈالی۔

بھائی جان کا آئیڈئیل ازم اب گورنمنٹ نارمل سکول سے گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل ہو چکا تھا۔ آخر کار انہیں اس میں کامیابی اس وقت نصیب ہوئی جب انہوں نے آٹھویں جماعت پاس کر لی۔ نارمل سکول چونکہ آٹھویں جماعت تک تھا سو انہوں نے ہائی سکول میں داخلہ لے لیا۔ میں اس سکول میں خود کو مزید بے یار و مددگار محسوس کرنے لگا۔ مجھے نارمل سکول کے کلاس رومز، کھیل کے میدان اور وسیع و عریض عمارت سے خوف آنے لگا تھا۔ میں جی ہی جی میں دعا مانگتا کہ کوئی معجزہ ہو جائے اور میں اس سکول سے رخصت ہو جاؤں۔ میں اب پہلے کی نسبت زیادہ خاموش رہنے لگا تھا۔ پڑھائی سے جی اچاٹ ہو رہا تھا۔ ماسٹر صاحب کی مار میرے لیے ایک بھیانک خواب کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ صبح اٹھتے ہی خوف میری رگوں میں اترنے لگتا۔ میں روزانہ سکول نہ جانے کے بہانے تراشنے لگا۔ کبھی پیٹ درد، کبھی سر درد اور کبھی کوئی اور بہانہ بناتا۔ میرا ذہن اب نت نئے بہانے تراشنے میں مصروف رہتا۔ انہی دنوں ابا جی نے مجھے سکول کے لیے نئے جوتے دلوائے۔ میرے دونوں پاؤں کی پیدائشی طور پر چھ انگلیاں تھیں اور دونوں طرف آخری انگلی کے ساتھ ایک اور انگلی جڑی ہوئی تھی جس کے باعث مجھے اکثر جوتے تنگ ہوتے اور چوڑے پنجوں والے جوتے بھی تکلیف کا باعث بنتے۔ فیشن بدلتے رہتے مگر میں ہمیشہ چوڑے پنجوں والے جوتے ہی پہنتا۔ میری یہ مشکل طویل عرصہ برقرار رہی اور اس وقت دور ہوئی جب میں نے انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد ائرفورس میں جی ڈی پائلٹ بننے کا پروگرام بنایا اور میری فالتو انگلیوں کو ایک آپریشن کے ذریعے الگ کر دیا گیا۔ میں پائلٹ تو نہ بن سکا مگر اس کے بعد فیشن کے مطابق جوتے پہننے کے قابل ہو گیا۔

جب نئے جوتے ملے اور حسبِ معمول میرے لیے تکلیف کا باعث بننے لگے تو میرے پاس ایک بہت ہی معقول اور زبردست بہانہ آ گیا۔ میں روز تیار ہو کر چند قدم سکول کی جانب چلتا اور پھر شدید درد کی کامیاب ایکٹنگ کرتا۔ بھائی جان اس اندیشے سے کہ انہیں سکول سے دیر ہو جائے گی مجھے واپس چھوڑ تے اور میں امی جی کو ایسی شکل بنا کر دکھاتا کہ انہیں سکول بھول جاتا اور صرف میرا درد یاد رہتا۔ فورا" میرے جوتوں کے تسمے کھولتیں، جرابیں اتارتیں اور میرے پاؤں پر تیل لگاتیں۔ ابا جی چونکہ ہمارے سکول کے وقت سے پہلے ہی کالج جا چکے ہوتے اس لیے انہیں تین چار دن تک تو میری اس حرکت کا علم ہی نہ ہو سکا۔ تیسرے یا چوتھے دن ابا جی کو علم ہوا تو انہوں نے گرجدار آواز میں مجھے پرانے جوتے پہن کر اگلے دن سے سکول جانے کا حکم دیا جو اتنے پرانے بھی نہیں تھے۔ جب میرا منصوبہ الٹتا ہوا دکھائی دیا تو میں نے امی جی سے روتے ہوئے احتجاج کیا کہ بھائی جان نئے جوتے پہن کر جائیں تو میں کیوں پرانے پہنوں۔ بھائی جان نے یہ کہہ کر میرا یہ منصوبہ بھی چوپٹ کر دیا کہ وہ بھی پرانے جوتے پہن کر سکول چلے جائیں گے۔ مجھے اس وقت بھائی جان پر بہت غصہ آیا۔ ابا جی نے مجھے پاس بلایا اور میری توقع کے برعکس مجھ سے بہت نرم اور ملائم انداز میں پوچھا کہ سکول نہ جانے کی اصل وجہ کیا ہے۔ کچھ دیر تو میں کچھ نہ کہہ سکا مگر ابا جی کے پیار بھرے انداز نے مجھے حوصلہ دیا اور میں نے وہ ساری کتھا سنا ڈالی جسے اپنے والدین سے کہنے کی ہمت آج تک نہ ہوئی تھی۔ میری بات سن کر پہلے تو مجھے ابا جی نے استاد کے احترام کے بارے میں سمجھایا اور ان کی مار کے پیچھے چھپی تدریس کی خواہش میرے ذہن میں ڈالنے کی کوشش کی لیکن میں نے جب ابا جی کو ماسٹر صاحب کے "مظالم" کی داستانیں سنائیں تو ابا جی خاموش ہو گئے۔ انہوں نے مجھے اگلے دن گھر میں ہی رہنے کی ہدایت کی۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ مجھے تمام کائنات محوِ رقص دکھائی دینے لگی اور خود بھی جھومنے کو جی چاہنے لگا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اپنی خوشی کا اظہار کیسے کروں۔ میرا خیال تھا کہ ابا جی نے مجھے سکول سے مستقلا" اٹھا لیا ہے اور اب میں گھر میں ہی رہا کروں گا۔ میری یہ خوشی اگلے ہی دن اس وقت کافور ہو گئی جب ابا جی نے کالج سے واپسی پر یہ ہوش ربا خبر سنائی کہ میرا داخلہ ایک اور سکول میں کروا دیا گیا ہے اور مجھے اگلے روز وہاں لے جایا جائے گا۔

میری آزادی کے دن زیادہ نہ رہے اور مجھے اسلامیہ سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ اس سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب اباجی کے دوست تھے سو مجھے اس بے رحمانہ سلوک سے نجات مل گئی جو نارمل سکول میں ایک عرصہ میرا مقدر رہا۔ یہاں صرف ایک مسئلہ تھا۔ اس سکول میں جمعہ کے روز چھٹی ہوا کرتی تھی اور اتوار کو سکول جانا پڑتا۔ اتوار کو جب اباجی اور بھائی جان گھر میں پرسکون طریقے سے بیٹھے ہوتے تو مجھے سکول جانا بہت ناگوار گزرتا۔ میں یہ بھول جاتا کہ جمعہ کو جب میں خواب خرگوش کے مزے لے رہا ہوتا تھا تو بھائی جان کوئی بہانہ بنائے بغیر سکول چلے جاتے تھے۔ بھائی جان کی ہر معاملے میں فرض شناسی مجھے ہرگز نہیں بھاتی تھی۔ روزانہ باقاعدگی سے سکول جانا، وقت پر سکول کام کرنا، گھر کے کاموں میں امی جی کا ہاتھ بٹانا اور اباجی کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم پر چلنا۔ یہ تھی بھائی جان کی زندگی۔ مجھے یہ زندگی بہت بور محسوس ہوتی۔ بھائی جان کو کھیلوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور میری جان کھیلوں میں تھی۔

ہم دونوں بھائیوں کی دلچسپیوں میں بُعد کا باعث ہم دونوں کی عمروں کا فرق بھی تھا۔ میں سکول سے واپس گھر آتا تو مجھے کھیلنے کے لیے جو ہمجولی درکار ہوتا وہ مجھے گھر میں میسر نہ ہوتا۔ ہمارے ہمسائے میں ایک بہت نفیس خاندان رہائش پذیر تھا۔ تمام مرد و خواتین بہت شائستہ اور مہذب تھے۔ یہ تہذیب ان کے رویوں، گفتگو اور ہر طرح کے آداب سے جھلکتی تھی۔ ہمارے ساتھ ان کی خاصی قربت تھی۔ دونوں گھرانوں کے باہمی ربط کی اساس کچھ ایسی ہی روایات تھیں۔ اس خاندان کے سربراہ نذیر صاحب بہت نرم خو اور شفقت بھری شخصیت تھے۔ میں جب بھی ان کے ہاں جاتا، وہ پیار سے پاس بلاتے، بٹھاتے اور حلاوت بھرے لہجے میں حال پوچھتے۔ اپنی اہلیہ کو میرے لیے کچھ کھانے کو لانے کے لیے کہتے۔ اپنی گھریلو تربیت کے باعث میں کچھ نہ لینے پر اڑا رہتا مگر جانے ان کے انداز میں ایسی کون سی شیرینی تھی کہ انہیں زیادہ انکار کرنا مجھے بھی اچھا نہ لگتا اور میں بالآخر امی جی کی سرزنش کے خوف کو کچھ دیر کے لیے بھلا دیتا۔ آنٹی جن کا نام اب مجھے یاد نہیں۔ ان کا یقیناً" کوئی نام ہوگا مگر ان دنوں خواتین کے نام احتراماً" سب کے سامنے نہیں لیے جاتے تھے اور ہمارے گھر میں بھی امی جی ان کا ذکر صرف کنیز کی امی کے نام سے کیا کرتی تھیں۔ اسی لیے میرے حافظے میں ان کا نام محفوظ نہیں۔ مجھے یوں بھی ان کے نام سے غرض نہ تھی کیونکہ میری عمر کے بچوں کے لیے اس عمر کی تمام خواتین آنٹیاں ہی ہوا کرتی تھیں۔ سو میں انہیں صرف آنٹی کہہ کر ہی پکارا کرتا۔

آنٹی اتنی خاموشی سے گھر میں چلتی پھرتی اپنے کام کرتیں کہ اگر غور نہ کیا جاتا تو ان کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہوتا۔ ان کے دو بچے تھے۔ ایک میری ہم عمر لڑکی کنیز اور ایک شیر خوار بچہ جسے کنیز اکثر اٹھائے رکھتی۔ میں سکول سے واپس آتا تو یا کنیز ہمارے ہاں آ پہنچتی یا میں کنیز کے گھر جا دھمکتا۔ اگرچہ مختلف اصناف سے تعلق رکھنے کے باعث ہماری دلچسپیاں بھی کھیل کے لحاظ سے مختلف تھیں مگر ایک دوسرے کے ساتھ کھیلنے کے لیے ہم اکثر اوقات ایک دوسرے کی دلچسپی کا کھیل بھی کھیل لیتے۔ کبھی وہ میرے ساتھ فٹ بال اور ہاکی کھیل رہی ہوتی اور کبھی میں اس کے ساتھ شٹاپو اور گیند کے ساتھ کنکریاں اٹھانے والے کھیل میں مگن ہوتا۔ ہمارا معصوم بچپن انہی کھیلوں سے بہل جاتا اور ہمیں اپنی کھیلوں میں صرف تب وقفہ دینا پڑتا جب ہمارے گھر سے ہم میں سے کسی کو بلایا جاتا یا کسی کو اچانک بھوک محسوس ہوتی۔ ہماری کھیلوں میں ایک وقتی تعطل کی ایک تیسری صورت بھی تھی کہ جب کسی بات پر ہماری لڑائی ہو جاتی تو کنیز مجھ سے تلخ لہجے میں کوئی بات کرتی اور فوراً" اپنے چھوٹے بھائی کو اٹھا کر گھر کی طرف بھاگ جاتی۔ میں بھی اپنے غصے کا اظہار اسے کمینی کہہ کر کرتا اور اس کی شٹاپو کے لیے بنائی گئی لکیروں کو مٹا ڈالتا۔ جب بھی لڑائی ہوتی ہمارا اولین ردِ عمل یہی ہوتا کہ ہم اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے۔ جب بھی میں بغیر کسی وجہ کے کھیل کے دوران گھر جاتا تو امی جی ہمیشہ مجھ سے پوچھتیں، " کیا ہوا، کنیز سے پھر لڑائی ہوگئی؟" امی جی کی میری ہر بات بوجھ لینے والی عادت مجھے کبھی کبھی عجیب الجھن میں ڈال دیتی۔ میں جواب

"ہاں" میں دینے کی بجائے کنیز کی شکایتیں لگانا شروع کر دیتا، "دیکھیں اس کمینی نے یہ کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔" اور امی جی مجھے وہیں ٹوک دیتیں، "بری بات بیٹا کسی کو گالی نہیں دیتے۔ اور وہ تو لڑکی ہے، لڑکیوں کو ایسا نہیں کہتے" میں احتجاج کرنا چاہتا تو میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی میرے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہی امی جی پھر بول پڑتیں، "کہا نا ایسے نہیں کہتے"۔ اور میرا احتجاج دم گھٹنے سے وہیں مر جاتا۔ یہ ہمیشہ ہوتا۔ خاندان میں بھی جب کسی لڑکی کے بارے میں مذاق سے بھی کوئی جملہ کہتا تو امی جی اور ابا جی کی فہمائش میرا حوصلہ کبھی بڑھنے نہ دیتی۔ ہمیشہ یہی بتایا جاتا کہ لڑکیوں کو اس طرح نہیں کہتے، ان کا احترام کرتے ہیں۔ مجھے کبھی کبھی غصہ بھی آتا کہ لڑکیاں چاہے کچھ بھی کہ لیں انہیں کوئی کیوں نہیں ٹوکتا۔ جواب میں بہت سے جواز دیے جاتے جن سے شاید میں کبھی مطمئن تو نہ ہوتا مگر یہ ضرور ہوا کہ اپنی کوئی بہن نہ ہونے کے باوجود ہر لڑکی کا احترام دل میں بیٹھ گیا۔

لڑائی ہوئے ابھی کچھ دیر ہی گزرتی کہ میں اور کنیز اپنے اپنے گھروں سے باہر نکلتے۔ کچھ دیر ایک دوسرے سے ناگزیر فاصلے پر بظاہر کسی اور سرگرمی میں مشغول رہتے اور کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ بھی لیتے۔ پھر اکثر کنیز کوئی چیز دکھانے کے بہانے مجھ سے مخاطب ہوتی اور ذرا سی دیر میں ہم گزشتہ "معرکے" کو بھول کر نئے سرے سے کسی نہ کسی کھیل میں یوں کھو جاتے کہ احساس بھی نہ رہتا ہم کبھی لڑے بھی تھے۔ کنیز ایک دھان پان سی لڑکی تھی۔ اپنی ملیح رنگت اور لبوں پر ہمیشہ کھلی رہنے والی مسکان کے ساتھ وہ عام لڑکیوں سے مختلف نظر آتی۔ گھریلو تربیت اس کی زبان کو کسی غیر مہذب گفتگو سے ہمیشہ دور رکھتی اور جب کبھی لڑائی کے نقطۂ عروج پر پہنچ جانے کے باعث میری زبان سے مقدور بھر دی جا سکنے والی میری محبوب گالی" کمینی" نکلتی تو وہ فوراً "میری امی جی کی جگہ لے لیتی اور اسی انداز میں مجھے ٹوک دیتی۔ صرف سرزنش کا انداز اس کا اپنا ہوتا، " گالی دی نا؟؟؟ اب کانٹے اُگ آئیں گے تمہاری زبان پر۔ اب چکھو مزا گالی کا"۔ اور میں بے ساختہ اپنی انگلیاں ایک میکانکی انداز میں اپنی زبان تک لے جاتا اور چھو کر اطمینان کر لیتا کہ ابھی تک کوئی کانٹا نہیں اگا۔ پھر ذرا سی پسپائی اختیار کرتے ہوئے اور قدرے غیر یقینی سے اسے کہتا، " کوئی نہیں جی۔۔۔۔۔ تم ایسے ہی کہتی ہو، کوئی کانٹا نہیں اگا" وہ سر پیچھے پھینک کر ایک بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنستی اور میں جانے کیوں عجیب سی بے کلی محسوس کرنے لگتا۔ اس بے نام کیفیت سے فرار کا میرے پاس ایک ہی طریقہ ہوتا۔ میں اس کے سامنے سے ہٹ جاتا۔

بھائی جان ہائی سکول پہنچے تو ان کے اندر ایک عجیب تبدیلی آئی۔ اچانک ہی انہیں گورنمنٹ ہائی سکول کے گراؤنڈز اچھے لگنے لگے۔ اب وہ وہاں شام کو فٹ بال کھیلنے کے لیے جانے لگے۔ میں بھی ساتھ جانے کو مچلنے لگتا مگر وہ یہ کہ کر مجھے گھر چھوڑ جاتے کہ تم چھوٹے ہو، بڑے لڑکوں میں کھیلو گے تو چوٹ لگ جائے گی۔ میں منہ بسورتا، ضد کرتا مگر شاید میں ان کی آزادی کی راہ میں حائل تھا۔ ان کی طبیعت میں احساسِ ذمہ داری کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ مجھے ساتھ لے جانے سے ان کا دھیان کھیل کی طرف نہ رہ پاتا سو وہ میرے بغیر زیادہ آسانی محسوس کرتے۔ امی جی اور ابا جی بھی مجھے کسی طرح بہلا لیتے اور میرے پاس کنیز کے من پسند کھیلوں کی غلامی کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ جاتا۔ ایک سہ پہر میں نے خوب ضد کی کہ مجھے ہر حال میں بھائی جان کے ساتھ جانا ہے۔ میرے تیور دیکھ کر ابا جی نے بھائی جان کو مجھے ساتھ لے جانے پر راضی کر لیا۔ طے یہ پایا کہ میں کھیل کے دوران ایک طرف بیٹھا رہوں گا اور آرام سے سب کو کھیلتے دیکھتا رہوں گا۔ بھائی جان نے انتہائی مجبوری کے عالم میں مجھے ساتھ لیا اور راستے بھر مجھے میرا وعدہ یاد دلاتے رہے اور میں جی جی کہ کر انہیں یقین دہانی کرواتا رہا۔ ہم سکول گراؤنڈ پہنچے اور میں پوری ایمانداری سے وعدے کی پاسداری کرتے ہوئے ایک طرف بیٹھ گیا۔ کھیل شروع ہوئے کچھ دیر ہی گزری تھی کہ اچانک کوئی زور سے چیخا، "آندھی"۔ میں نے اوپر نظر اٹھائی تو

فضا میں ایک طرف سے گردوغبار کا ایک سرخ رنگ کا طوفان تیزی سے ہماری طرف بڑھتا ہوا دکھائی دیا۔ میں گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ساری فضا تاریک ہوگئی۔ آنکھوں میں مٹی پڑنے لگی اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں لاچاری کے عالم میں رونے لگا۔ اسی اثنا میں بھائی جان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ "سلمان، سلمان" پکار رہے تھے اور میں جواب میں فقط مزید بلند آواز سے رو کر انہیں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔ پتہ نہیں کیسے بھائی جان نے کہیں سے آکر میرا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے اپنے ساتھ لپٹائے اس طرف چل پڑے جدھر باقی سب لڑکے جا رہے تھے۔ آندھی کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ ہمیں قدم زمین پر جمانا مشکل ہو رہا تھا۔ آندھی کے ساتھ زور آزمائی کرتے ہوئے بالآخر ہم سکول کے ہاسٹل کے کسی کمرے میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ وہاں پہلے سے کچھ اور لڑکے بھی موجود تھے۔ کبھی کوئی آفت زدہ دروازہ کھٹکھٹاتا تو کمرے کے مکین اسے اندر کھینچ لیتے مگر پھر آندھی کے ساتھ دروازہ بند کرنے کے لیے ایک معرکہ شروع ہو جاتا۔ میں اس صورتِ حال سے خاصا خوف زدہ تھا اور گھٹی گھٹی چیخوں کے ساتھ وقفوں وقفوں سے رو رہا تھا۔ جانے کیوں میرے دل میں یہ خوف بیٹھ گیا تھا کہ ہم اب کبھی گھر نہیں پہنچ سکیں گے۔ باہر اب تیز بارش بھی شروع ہو چکی تھی۔

کچھ دیر میں کمرے کا دروازہ زور زور سے بجا۔ دروازہ کھلنے پر بھائی جان اجمل اندر داخل ہوئے۔ میں لپک کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ انہوں نے اپنے ساتھ لپٹایا، پیار کیا، دلاسہ دیا تو میں خود کو کچھ محفوظ سمجھنے لگا۔ آندھی کا زور کچھ ٹوٹ چکا تھا مگر بارش مسلسل جاری تھی۔ بھائی جان اجمل نے ہم دونوں بھائیوں کو اپنی دونوں اطراف میں ساتھ لپٹایا اور کمرے سے نکل پڑے۔ سکول سے گھر تک کا راستہ زیادہ نہ تھا مگر مخالف سمت سے برسنے والی تیز بارش سے زور آزمائی کرتے ہوئے کافی وقت صرف ہوگیا۔ راستے میں کئی ہیبت ناک مناظر بھی دیکھے۔ کچھ بوسیدہ مکانوں کی چھتیں اڑ چکی تھیں اور جابجا درخت گرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ان میں میرا محبوب برگد کا وہ گھنا اور بہت بڑا درخت بھی شامل تھا جس کی چھاؤں میں سکول سے واپسی پر ہم اکثر رکا کرتے۔ مجھے اس درخت کے انہدام کا بہت دکھ ہوا۔ میں آندھی کا خوف بھول چکا تھا اور اب درخت کے گرنے کی کسک دل میں جاگزیں ہوگئی تھی۔ اسی کیفیت میں گھر پہنچ گیا تو دروازے پر امی جی کو اپنا منتظر پایا۔ امی جی نے ہم دونوں بھائیوں کو اپنی آغوش میں بھر لیا اور ٹپ ٹپ گرتے آنسوؤں کے ساتھ کہتی جاتیں "اللہ جی آپ کا شکر ہے میرے بچے زندہ سلامت مجھے واپس مل گئے"۔ اس رات امی جی نے مجھے اپنے ساتھ سلایا۔ رات کو سونے سے قبل جب انہوں نے مجھے اپنی آغوش میں لیا تو مجھے جانے کیوں وہ برگد کا درخت یاد آ گیا جسے آندھی نے زمیں بوس کر دیا تھا۔ میرے ہونٹوں سے ایک سسکی نکلی اور امی جی نے مجھے اور زور سے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔

کمالیہ میں ہمارے دن گنے جا چکے تھے۔ ابا جی کی نئی تعیناتی کھاریاں کینٹ کے کالج میں ہوگئی۔ میں اور بھائی جان نئی جگہ جانے کے شوق میں بہت خوش تھے اور سامان کی پیکنگ دیکھ کر نئے خوابوں میں مگن تھے۔ میری خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ہم جہاں بھی جائیں گے وہاں کا سکول یہاں سے بہتر ہوگا۔ آخرکار کمالیہ سے جدائی کا دن آ پہنچا۔ جب ہمارا سامان ٹرک پر لادا جا چکا اور ہم سب بھی رخصت ہونے لگے تو میری نظر کنیز پر پڑی جو اپنے بھائی کو اٹھائے کھڑی تھی اور مجھے تکے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی اور چہرے پر ملال کے گہرے سائے تھے۔ میں اس کی ان نظروں کی تاب نہ لا سکا اور چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔ ہم کمالیہ سے رخصت ہو چکے تھے۔

ہزار طرح کے قصّے سفر میں ہوتے ہیں

(سفرنامہ)

دریچہ..................روم کا ایک یادگار سفر

شاہین کاظمی

انسان سیماب صفت واقع ہوا ہے، زندگی بھی سیدھی سپاٹ لکیر نہیں ہے اور نہ ہی اسے اسطرح گذارا جا سکتا ہے، یہ انسانی جبلت ہے وہ یک رنگی سے بہت جلد اُکتا جاتا ہے، یکسانیت اِس کے لئے موت ہے، کہ یہ اِس کی فطرت میں شامل ہے اور فطرت سے اِنحراف ممکن نہیں ہے، جہاں وہ بہت جلد اپنے آپ کو نئے ماحول میں ڈھال لیتا ہے وہیں جلد اُوبھ بھی جاتا ہے، اُس کی اِسی سیماب فطرت نے اُسے غاروں سے نکال کر چاند کو چھونے پر مجبور کیا، ہماری پارہ صفت طبیعت بھی ہمیں کہاں چین لینے دیتی ہے، گھر کے در و دیوار سے اُکتا دینے کی حد تک بیزاری ٹپکنے لگی تو سوئس فارمولا پر عمل کرتے ہوئے یہی سوچا کہ گھر سے باہر نکلا جائے، لیکن کہاں؟ پانسہ اٹلی کے نام کا نکلا، روم، روما، اٹلی کا دارالحکومت، دنیا کے چند گنجان شہروں میں سے ایک، دریائے آنینے اور دریائے تیبر کے سنگم پر واقع خوبصورت شہر، سلطنتِ روم عہدِ قدیم میں اپنے عروج پر تھی اس کی بنیاد اور عروج کی داستان اساطیری قصے کہانیوں میں ملتی ہے، اس کے رنگا رنگ دیوتاؤں اور ان کے عشق و حسد اور دشمنی کی داستانیں آج بھی پر کشش ہیں۔

زیورخ انٹرنیشنل ائیر پورٹ سے روما تک کی فلائٹ محض ایک گھنٹہ بیس منٹس کی تھی، فروری میں پورا سوئس برف کی سفید چادر میں لپٹا ہوا تھا، سو معمول کے مطابق وہی موٹے کوٹس جیکٹس اور جوتے چڑھانے پڑے دبیز بادلوں اور برف سے ڈھکے مشہورِ زمانہ آلپس کو اتنی بلندی سے دیکھنا اپنے آپ میں ایک ناقابلِ بیان منظر تھا، ر عجیب سی کیفیت تھی تا حدِ نظر گھرے بادلوں سے جھانکتی برف پوش چوٹیاں، خاموشی اور بے کنار تنہائی، مجھے بے اختیار "Neandertaler" نینڈر تال ریاد آ گئے ہو اس برفانی جہنم میں صدیوں تک زندگی کو برقرار رکھنے کی جنگ لڑتے رہے تھے، ایک وقت کے کھانے کے لئے گھنٹوں برف پر مارا مارا پھرنا، شدید سردی اور ناکافی لباس، لیکن قدرت نے اتنا حوصلہ فراہم کیا تھا کہ وہ زندگی کو برقرار رکھ سکیں، سائنسدان ان کو اب تک موجودہ انسانوں کے ارتقائی مراحل کے قریبی رشتہ دار سمجھتے تھے لیکن ڈی این اے سے ثابت ہوا کہ "Neandertaler" ہمارے قریبی رشتہ دار اور یورپی اقوام کے جدِ امجد ہیں۔

پھر اٹلی اور آسٹریا کے درمیان بلند پہاڑی سلسلوں سے ملنے والی پانچ ہزار سال پرانی لاش "Ötzi" کا خیال آیا، جسم پر محض بکری کی کھال کا بنا ہوا لباس اور عام چمڑے کے، گھاس کی تہہ لگے جوتے پہن پر وہ اس انتہائی بلندی پر جہاں درجہ حرارت منفی 30 ڈگری تک ہوتا ہے، جانے کیسے پہنچا ہوگا؟ کون لوگ تھے جو اس کی جان کے درپے تھے؟ آخر ایسا کیا ہوا تھا؟ اتنی بلندی پر پہنچ کر وہ چند لمحوں کے لیے ستانے کو کیا بیٹھا موت نے اُسے ہمیشہ کے لئے سلا دیا، یہی برف سے ڈھکے آلپس صدیوں تک اس کی قبر بنے رہے، یہاں تک کہ موسمیاتی تغیرات کی وجہ سے گلیشیئر پگھلنا شروع ہوا تو ایک سیاح جوڑے نے اس کی لاش دریافت کی۔

اُسے نکالنے کے لیے بھاری مشینری کو اس بلندی تک لے جانا بھی کارِ محال تھا گلیشیئر کاٹ کر نکالتے ہوئے اس کی ایک ٹانگ بھی جسم سے الگ ہوگئی، اسے محض اس زمانے کا کوئی بدقسمت شخص تصور کیا گیا تھا لیکن بعد میں ہونے والی

تحقیق اور تجربات نے تہلکہ مچا دیا، ایک عرصے تک اٹلی اور آسٹرین حکومت کے درمیان اس لاش پر مالکانہ حقوق کا تنازعہ بنا رہا، بعد میں اس کے معدے میں نیم ہضم خوراک کے اجزا کے کیمیائی تجزیئے کے بعد اسے اٹلی کی حکومت کے سپرد کر دیا گیا کہ وہ اجزا جو اس کی خوراک میں شامل تھے وہ صرف اٹلی کے علاقوں میں پائے جاتے تھے۔ اس کی کہانی پڑھ کر بیشمار سوال ذہن میں آئے، وہ کون تھا؟ اس کی گمشدگی اس کے پیاروں پر کس قدر گراں گزری؟ اس کی کلہاڑی اور چمڑے کا تھیلا جسمیں کچھ خوراک باقی تھی وہیں ایک برفانی چٹان کے ساتھ پڑے پائے گئے شاید یہی زندگی ہے۔

جہاز جیسے جیسے سوئس سے دور ہوتا جا رہا تھا سفیدی سبزے میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی، دور تک پھیلا ہوا بحیرہ روم، ماہی گیروں کے جہاز اور کشتیاں، سبزے سے ڈھکے خوبصورت پہاڑ جو اس لئے اچھے لگ رہے تھے کہ کم از کم فروری میں سوئٹزرلینڈ میں کسی ایسے نظارے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

بحیرہ روم کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے روم کی آب و ہوا بہت معتدل ہے، اپریل سے جون کے وسط تک موسم خوشگوار ہوتا ہے، ایسا ہی وسط ستمبر سے اکتوبر تک، فروری کو سردی کا مہینہ گنا جاتا ہے لیکن موسم انتہائی خوشگوار ہوتا ہے، ایئرپورٹ پر اترے تو سورج پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا، سب سے پہلی جس چیز ہماری توجہ اپنی جانب مبذول کرائی وہ è la capitale della Repubblica Italiana کی سڑکیں تھیں، ایئرپورٹ سے چند کلومیٹرز تک تو تمام دنیا کی عام سڑکوں کی طرح تھیں لیکن جیسے ہی شہر شروع ہوا سڑکوں کی ہیئت بدل گئی، یورپ میں پرانے زمانے میں سڑکوں پر پتھر لگائے جاتے تھے روم کی تمام سڑکیں اُسی دور کی یادگار ہیں ابھی پتھریلے راستوں پر کہیں کہیں کولتار ڈال کر ہموار کر لیا گیا ہے، کثرتِ استعمال سے پتھر گھس کر ملائم اور چمکدار ہو گئے ہیں، ان پر چلتے ہوئے انسان خواہ مخواہ ہی خود کو قرونِ اولیٰ کے دور میں پاتا ہے، کھڑکھڑاتی اور گھسی ہوئی بسوں نے پاکستان کی یاد تازہ کر دی ہم لوگوں نے اپنے بھاری کوٹوں اور جوتوں سے نجات حاصل کی اور مزے سے ہلکے سویٹرز میں گھومتے رہے جبکہ باقی اٹالین وہی بھاری جیکٹس چڑھائے "سردیاں" انجوائے کر رہے تھے۔

اگلی صبح کلوزیم جانا تھا، ناشتے سے فارغ ہو کر کلوزیم کا رخ کیا، مشہور زمانہ اکھاڑا جہاں انسانوں کا خون محض تفریح طبع کے لئے اس بیدردی سے بہایا گیا کہ اس کی مثال ملنا مشکل ہے، کہتے ہیں "روم جل رہا تھا اور نیرو بانسری بجا رہا تھا" اس خوفناک آگ نے کلوزیم کو بہت نقصان پہنچایا، آج بھی دھوئیں سے سیاہ دیواریں اس بات کی گواہ ہیں، اکھاڑا ابھی خوبصورت رہا ہوگا، لیکن اب یہ تصور کرنا بھی مشکل تھا، اوپر دو منزلیں تھیں جہاں کبھی سیڑھیاں ہوا کرتی تھیں جن پر بیٹھ کر لوگ بہتے خون اور شیروں سے نچتے بدن دیکھ کر خوشی سے چلایا کرتے تھے، تیسری منزل پر اعلیٰ شخصیات کے لیے "وی آئی پی انکلوژرز" بنائے تھے، زیرِ زمین بنی ہوئی منزل میں بہت ساری راہداریاں اور رہائشی کوٹھڑیاں تھیں راہداریوں میں بوقت ضرورت پانی چھوڑ کر راستہ مسدود کر دیا جاتا تھا۔ کلوزیم کے باہر داخلہ ٹکٹ کے لئے دنیا بھر سے آئے ہوئے سیاحوں کی لمبی قطاریں دیکھ کر ہول اٹھنے لگا، دن تو اسی قطار میں گزر جائے اندر جا کر خاک دیکھیں گے، لیکن جلد ہی ایک انگلش گائیڈ نے بلیک میں ٹکٹ کی آفر کی اور یوں تھوڑی دیر میں کچھ زیادہ پیسے دے کر ہم کلوزیم کے اندر تھے، گائیڈ کے ساتھ طے ہوا تھا کہ وہ ہر حصے کی تفصیل بتائے گا لیکن پچاس لوگوں کے ساتھ گلہ پھاڑ کر بولنا وہ بھی اس حالت میں کہ آس پڑوس میں بھی کئی گائیڈ بھانت بھانت کی بولیوں کے ساتھ چلا رہے ہوں کافی مشکل کام ہے مگر اس سے بھی مشکل کام اس چلا چلی کو سمجھنے کا ہے سو ہم نے جلد ہی گائیڈ جیسے دم چھلے سے چھٹکارا پایا اور ہر سُو آزادانہ دندنانے لگے۔

حساس لوگ ہر جگہ اپنی حساسیت کے ہاتھوں نہ صرف خود تنگ ہوتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی کانٹوں پر گھسیٹ لیتے ہیں، اب ہم کیا کرتے کہ دیواروں سے ٹپکتی اداسی اور کھنکی نے ہم سے باتیں شروع کر دیں ساری ان کہی کہانیاں، جواں اور تنومند جسموں میں اترتیں تیز دھار تلواروں کی سرسراہٹیں اور دم توڑتے جنگجوؤں کی سسکیاں اور ہچکیاں، ہمیں ضبط کرنا مشکل ہو گیا اور وہیں کسی کی بھی پروا کیے بغیر قلم اور ڈائری نکالی اور اپنی کیفیات کو قلم بند کرنا شروع کر دیا۔

اٹلی میں ہم نے پہلی بار بنا "چیز" کے پیزا کھایا عجیب بدمزہ اور بدذائقہ، جیسے موٹی تندوری روٹی پر ٹماٹر کی نمک مرچ کے بغیر چٹنی اور اس پر تارے میرے کا ساگ ڈال کر اوپر زیتون کا تیل اور کالی مرچ چھڑک دو، لقمے حلق سے اتارنا مشکل ہو گئے، جب دوسری بار بھی ایسا ہی ہوا تو پتا چلا کہ آپ کو کہنا پڑتا ہے کہ "چیز" ڈالنی ہے،، سوئس والوں نے بھلے پیزا ایڈاوپٹ کیا ہو لیکن ان کے ذائقے اور یہاں کے ذائقے میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ لیکن یہ ٹھہرے اٹالین پیزے کے باوا آدم سو جو بھی ہو کم ہے۔ کھانے میں جس چیز نے بہت مزہ دیا وہ "جیلاٹو" یا آئس کریم تھی، بے شمار اقسام ورذائقے اور بہترین کوالٹی کی آئس کریم ہر گلی میں دستیاب تھی۔

Castel Sant'Angelo ,St. Peter's Basilic,Trevi Fountain,The Pantheon.Spanish Steps & Trinita dei Monti سب قابلِ دید جگہیں ہیں،

"Trevi Fountain"

تریوی فونٹانا یا تریوی فونٹین بہت خوبصورت اور رومان پرور جگہ ہے دن رات میں کوئی وقت ایسا نہیں ہوتا کہ یہاں بے تحاشا رش نہ ہو، ذرا تصور کریں ہلکی ہلکی خنکی، دنیا کی مختلف زبانوں میں ہونے والی سرگوشیاں، فضا میں گھلی پرفیومز کی مہک، رنگ برنگی روشنیوں کے پس منظر میں گرتا شفاف پانی، اٹالین لوک دھنوں میں بجتے نغمے، جی چاہتا ہے بس وقت یہیں تھم جائے، ذہن ہر فکر سے آزاد ہو کر پوری طرح منظر کی دلکشی میں کھو جاتا ہے، ایسے میں اگر فریش کریم کے ساتھ گرما گرم کافی میں پگھلتی آئس کریم مل جائے تو کیا ہی کہنے۔ کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں چند فوجی پیاس سے نڈھال ہو رہے تھے بہت تلاش کے بعد بھی پانی نہ ملا تو تھک ہار کر بیٹھ گئے انھیں لگتا تھا پیاس ان کی جان لے لے گی، کہ اچانک کہیں سے ایک نازک اندام حسینہ نمودار ہوئی اور انھیں ایک چشمے تک لے آئی، بعد میں آگسٹس نے اس چشمے کے پانی کو شہر میں لانے کا انتظام کیا، اور اسے "Aqua Virgo" یا "شفاف پانی" کا نام دیا (ورگو کنواری کے معنوں میں مستعمل ہے) 1732 میں اس چشمے کو پھر سے دریافت کیا گیا اور اس کی تعمیر شروع ہوئی جو 30 سال جاری رہی، 1762 میں اسے عوام کے لیے کھول دیا گیا، تین شاہراہوں کے سنگم پر ہونے کی وجہ سے اسے فونٹانا دی تریوی کہا جاتا ہے، یہاں لوگ دائیں ہاتھ کو بائیں کندھے سے گھما کر تالاب میں سکے پھینکتے ہوئے منتیں مانتے ہیں، دنیا میں سرپھروں، عاشق مزاجوں اور قسمت پر اندھا دھند یقین رکھنے والوں کی کمی نہیں ہے اسی لیے ہر روز تین ہزار یورو کے سکے اس تالاب کی نذر کیے جاتے ہیں اور سالانہ صفائی کے موقع پر برآمد ہونے والے سکوں کا وزن ٹنوں میں ہوتا ہے یوں صرف اس فونٹین سے ہونے والی آمدنی لاکھوں یورو سالانہ تک جا پہنچتی ہے، جسے فلاحی کاموں پر خرچ کیا جاتا ہے اس نازک اندام حسینہ نے روم کے لیے مستقل آمدنی کا ذریعہ پیدا کیا اور خود مر کر تاریخ سے بھی محو ہو گئی۔

Spanish Steps

بہت مشہور ہیں سنگ مرمر کی بنیں یہ ایک سو پینتیس وسیع وعریض سیڑھیاں Bourbon Spanish

Embassy, اور Trinità dei Monti church کو ملاتی ہیں، ٹاپ پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو شہر کا بہت خوبصورت منظر دکھائی دیتا ہے اس کے عقب میں بہت قدیم عمارات اور ان پر بنے نقش ونگار اور مورتیاں قابلِ دید ہیں۔

Roman Forum

روم کے وسط میں واقع ہے صدیوں پہلے یہ سیاسی اور تجارتی سرگرمیوں کا مرکز تھا تقریباً سارے دیوی دیوتاؤں کے مندروں سے گھرے اس علاقے کے فقط آثار باقی ہیں جس میں سنگ مرمر سے تراشے ہوئے بلند اور سڈول ستون جا بجا نمایاں ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ رومن بہت تخلیقی ذہن کے مالک تھے، ان کے ہاں گولائیاں اور قوسیں خاص طور پر دیکھنے کو ملتی ہیں، Roman Forum ایک خوبصورت اور متاثر کن جگہ ہے، لگتا ہے ابھی حریری لبادوں میں ملبوس پجارنیں ہاتھوں میں پھول لئے مندر میں ایستادہ بتوں کے چرنوں میں نچھاور کرنے آتی ہوں گی، وہیں ایک پرانے مندر کے دو بلند ستونوں پر ٹکی ڈیڑھ فٹ چوڑی اور بیس فٹ لمبی "بیم" پر آج بھی لوگ سکے پھینک کر قسمت آزماتے ہیں نیچے جانے کا کوئی راستہ نہیں اور شاید حفاظتی نقطہ نظر سے جانے کی اجازت بھی نہیں، دو میٹر دور لگے جنگلے کے اُس طرف کھڑے ہو کر آپ سکوں سے جتنی چاہیں چاند ماری کر سکتے ہیں اُس بیم پر سکوں کا ٹکنا انتہائی مشکل ہے، کافی نیچے ہونے کی وجہ سے سکے اچھل کر نیچے گر جاتے ہیں، اس کے باوجود وہاں بہت سارے سکے پڑے نظر آئے پھینکنے والے شاید بہت خوش قسمت تھے یا بہت اچھے نشانے باز، ہم بھی بہت سارے سکے لٹا کر واپس آئے حسرت ہی کہ کوئی ایک تو بیم پر نہ سہی بام پر ٹک جاتا مگر اپنی ایسی قسمت کہاں ختم ہوتے سکوں نے وہاں سے ہٹنے پر مجبور کر دیا............ مگر آنکھوں کی تشنگی کو کون سمجھائے دل سکہ نہ جمنے او سکہ نہ ٹکنے کی صورت میں ہونے والے نقصان سے بہت رنجیدہ تھا مجبوراً کوئی دسویں بار جیلاٹو کا سہارا لینا پڑا۔

وہاں پر غیر قانونی چھوٹا موٹا کام کرنے والے پاکستانی، بھارتی اور بنگلہ دیشیوں کی بہتات ہے، سارا دن انتہائی معمولی اشیاء کاندھوں پر اٹھائے بیچ رہے ہوتے ہیں، بہت ہوا تو کہیں چادر بچھا کر "دوکان" لگا لی، جیسے ہی پولیس کا سنا تیزی سے مال سمیت چادر سمیٹی اور یہ جا وہ جا، یہ دن میں کئی کئی بار ہوتا ہے کبھی تو پولیس کو جل دینے میں کامیابی ہو جاتی ہے اور کبھی سرکاری مہمان بنا لیے جاتے ہیں سارا دن مشقت کے بعد ایک چھوٹے سے کمرے میں پندرہ بیس لوگ گھسے اور جیسے تیسے نیند پوری کی اور اگلے دن پھر سے وہی مشقت، اور وہاں ان کے گھروں میں سب کا تفاخر سے کہنا کہ بیٹا اٹلی ہوتا ہے اور "اٹلی ہونے" کا بھرم رکھنے کے لئے بے دریغ خرچ کرنا کاش وہ ایک نظر دیکھ لیتے کہ بیٹا کس اذیت سے اپنی نیند بھوک قربان کر کے چار پیسے بچا پاتا ہے۔

The Pantheon یا دیوتاؤں کا گھر، جسے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی پیدائش سے قبل تعمیر کروایا گیا تھا بعد میں ہیڈرین نے 126 عیسوی کے لگ بھگ اسکی دوبارہ تعمیر کروائی، یہ بہت بڑے گنبد کے ساتھ ایک قدیم عمارت ہے گنبد میں عین درمیان میں ایک بڑا سوراخ ہے جب کہ گنبد کے اندرونی حصے میں بہت خوبصورت نقش ونگار بنے ہوئے ہیں، اس کا بیرونی برآمدہ نما حصہ بڑے بڑے ستونوں پر قائم ہے ہر ستون تقریباً بیس فٹ اونچا اور گولائی میں دو فٹ کے قریب ہے، اوپر جا کر موٹائی بتدریج کم ہوتی جاتی ہے سرمئی اور گلابی گرینائیٹ سے تراشے گئے ان ستونوں میں کوئی جوڑ نہیں ہے، گرینائیٹ کو ہزاروں میل دور "ایلبا" کے جزیرے سے سمندری راستے کے ذریعے روم لایا جاتا تھا، ٹنوں وزنی اور لمبی چوڑی پہاڑ نما چٹانوں کو لانا اور پھر کسی جدید مشینری کے بغیر ایک سی لمبائی اور موٹائی میں تراشنا کسی معجزے سے کم نہیں

ہے یہ سارے ستون سنگِ مرمر سے تراشی گئی پھول نما بنیاد پر ایستادہ ہیں عرصے بعد اسے کیتھولک چرچ میں بدل دیا گیا، اسے آج بھی مقدس مقام مانا جاتا ہے یہاں جگہ جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کو مجسموں میں دکھایا گیا ہے۔

St. Peter's Basilic ویٹیکن سٹی، جسے دنیا کا سب سے چھوٹا ملک ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے میں واقع ایک قدیم چرچ ہے، یہ وہی جگہ ہے جہاں مسیحی دنیا کا ہر نیا بننے والا پوپ اپنے مقتدین سے پہلا خطاب کرتا ہے ایک بات جو شدت سے نوٹ کی گئی وہ یہ تھی کہ چرچ بہت خوبصورت بنا ہوا تھا وسیع و عریض اور انتہائی صاف ستھرا لیکن روحانیت سے مفقود..... کسی بھی زاویے سے وہ کوئی عبادت خانہ نہیں لگتا تھا، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کوئی عام سی عمارت ہو جسے بہت سلیقے سے سنوارا گیا ہے جبکہ مجھے ایک بار تھائی لینڈ میں ایک بدھ مندر میں جانے کا اتفاق ہوا تھا، مجھے کہنے میں کوئی عار نہیں کہ وہ جگہ آپ کی روح کو متاثر کرتی ہے اور مجھے خود کو مرعوب سے ہونے سے بچانے کے لیے کافی تگ و دو کرنی پڑی تھی، لیکن یہاں ایسا کچھ محسوس نہیں ہوا بلکہ ایک عجیب سی گھٹن کا احساس تھا۔

اٹلی کے لوگ ملنسار، بہت کھلے ڈھلے اور خوش مزاج ہوتے ہیں لیکن یہی لوگ جب سوئس میں آ کر اپنا کاروبار جماتے ہیں تو ان سے زیادہ بدمزاج اور کوئی نہیں ہوتا، شاید پیسہ انسان کو بدل دیتا ہے، بڑے بڑے شاپنگ مالز میں ہر چیز دستیاب ہے مہنگائی کا تناسب سوئٹزر لینڈ کے مقابلے میں کم ہے سب سے مزے کی بات یہ کہ آپ ہر چیز کا "بھاؤ" چکا سکتے ہیں مول تول کرنے کا بھی اپنا ہی مزہ ہے۔

چلتے چلتے ایک چھوٹی سی ٹپ اگر اٹلی جا کر پیزا کھانے کا موڈ ہو تو "ود چیز" کہنا مت بھولیے گا۔

نظم لکھّے تجھے ایسے کہ زمانے واہوں

(نظمیں/نثری نظمیں)

آفتاب اقبال شمیم

یہ ایک پل

مطمئن ہوں کہ نا مطمئن!
سوچتا ہوں......
مگر یہ میرا سوچنا معتبر بھی نہیں
ہاں مگر اصل احوال کیا ہے
بتاتا ہوں (اگر میں بتا بھی سکوں)
اِک سفر میرا مقدور ہے
اور میں اپنے مقدور کی
آخری حد سے واقف نہیں
یہ گزرگاہیں، اُن سے نکالے ہوئے راستے
جن پہ چلتے ہوئے
نسل در نسل، میرے قدم
کیا خبر مجھ کو کس سمت لے جائیں گے
کیا پتا حالتِ ہست ایسی ہی ہو
میں ارادے کو مربوط رکھتا ہوں
حالات سے
اور حالات دشمن زمانے کی ترکیب ہیں
سامنے سے تصادم میں آتے ہیں
گاہے کمیں گاہ سے یوں جھپٹتے ہیں
جیسے ازل کے اشارے کی تعمیل کرتے ہوں
لگتا ہے
یہ ایک پل، آنکھ کی اک جھپک میں
میرے ساتھ بھی چھپ کے چلتا ہے،
میرے مقابل بھی ہے
کیا کہوں
میں نے اس ایک پل کو مسخر کیا ہے
کہ میں اس کی/تسخیر میں آ گیا ہوں

خالی جگہیں

خیال آئیں
تو آتے ہی چلے جاتے ہیں
جیسے نصف جولائی کے بادل ہوں
مگر بادِ خیالاں جب نہیں چلتی
تو دل کا باغ بے منظر سا ہو جاتا ہے
آنکھیں چاہ سے خالی
ٹھٹھرتے ہاتھ میں انگشت چاندی کی
ذرا بوجھل سی لگتی ہے
یہ سرما ہے......گزر جائے تو شاید/فروری آئے
ابھی تو سرد مہری کے پڑے کہرے میں
آنکھوں کی سفیدی کے سوا
کچھ بھی نہیں ہے جو نظر آئے/ میں کیسے مان لوں
وہ غیب اس موجود کے رشتے میں ہے
اپنی پرانی آشنائی کے اشارے میں
کہے گا تو زمانہ ہے/ تجھے چلنا ہے/ یعنی عصر بعدِ عصر اپنی عمر کا
چولا بدلنا ہے
یہ ساری گنتیاں اِک فرض کردہ
اوّل وآخر کے تخمینے میں رہتی ہیں
جواب اپنے سوالوں کے/ تقاضا کرتے رہتے ہیں
ہمیں یہ خالی جگہیں پُر تو کرنی ہیں
وہ کوئی متھ ہو یا منطق ہو
ہر اک عصر کے اپنے تقاضے ہیں
بیانِ ذہن ودل کی یہ ضرورت
لفظیے پوری نہیں کرتے/ ابھی ایجاد اپنے مرحلوں میں ہے
یہ آدھا وہ نہیں شاید/حقیقت میں جو آدھا ہے

نثار ناسک

میں چوتھی سمت آ نکلا

میں چوتھی سمت آ نکلا
مرے اندر تجسّس کا تڑپتا کیکڑا
پرانی سازشی سرگوشیوں کی
سرسراہٹ ہے
میں سپنے میں ڈرے بچے کی صورت
چارسُو دہشت زدہ آنکھوں سے تکتا ہوں
مری گردن سے لپٹی خوف کی بیلوں کے حلقے
لمحہ لمحہ تنگ ہوتے جا رہے ہیں
اور ہر ٹہنی پہ میرے دشمنوں کی اَن گنت آنکھیں
مری سانسوں کو گنتی ہیں
محافظ فوج کے سارے سپاہی
ڈر کے پیچھے رہ گئے ہیں
اور مجھ کو کہہ گئے ہیں
جا! تُو اپنے باپ کے فرمان سے
منہ موڑنے والا عذابوں کا مسافر ہے
تھکے ہارے ہوئے گھوڑے کی ننگی پیٹھ
میری بے بسی کا تخت
کالی بیتوں کا پیڑ ہے
جس پر کھڑے ہو کر
اُسے آواز دیتا ہوں
سوائے جس کے ہر اک چیز کی پہچان ہے مجھ کو

مری آواز میرا جرم!!!
جیسے تین سو برسوں سے زائد
غار میں سوئے ہوئے لوگوں کے سکّے تھے
مری آواز جیسے پاگلوں کا سچ
جسے حُرمت نہیں ملتی
جسے کوئی نہیں سنتا
مَیں اس جنگل کی تاریکی میں
ایسی روشنی ہوں
جو اندھیرے پھونکنے آئی
اندھیروں ہی کی ہو بیٹھی!

نثار ناسک

آج میں اکیلا ہوں

دلِ گریزاں!
چلو کہیں پر
کھلی ہواؤں میں
روئیں جا کر......دلِ گریزاں
یہاں گھٹن ہے منافقت کی
یہاں دُھواں ہے کدورتوں کا
دُکھوں کی توقیر کیا یہاں ہو؟
کہ یہ جہاں ہے ضرورتوں کا
کدورتوں کی گھٹن سے باہر
دلِ گریزاں
چلو کہیں پر
کھلی ہواؤں میں
روئیں جا کر......دلِ گریزاں

یہ ریستورانوں کی کیبنوں میں
جو چوڑیاں سی چھنک رہی ہیں
یہ گرم چائے کی پیالیوں میں
جو سرد آہیں مہک رہی ہیں
فریب چہرے فریب منظر!
دلِ گریزاں
چلو کہیں پر
کھلی ہواؤں میں
روئیں جا کر......دلِ گریزاں
کھلی ہوا کی اُداسیوں میں
ہمارے رونے کی خوشبوئیں ہیں
کھلی ہوا کی اُداسیوں میں
تمہارے ہونے کی خوشبوئیں ہیں
یہاں تو اک سانس بھی ہے دوبھر
دلِ گریزاں
چلو کہیں پر
کھلی ہواؤں میں
روئیں جا کر......دلِ گریزاں

امجد اسلام امجد

کوئی اُمید ہے نہ پچھتاوا

دھیان میں آ بسی ہے تنہائی
کوئی مطلب رہا نہ شہرت سے
نہ ندامت، نہ خوفِ رُسوائی!

ہر تعلق سے ہو چکے آزاد
کوئی اُمید ہے نہ پچھتاوا
نہ تو برباد ہیں نہ ہیں آباد!

نیند سے ہے نہ صبحِ فردا سے
خواب کا رابطہ کسی سے بھی
مختصر یہ کہ اب نہیں ملتا
درد کا راستہ، کسی سے بھی
دل کے جھگڑوں سے اور نہ دنیا سے
اب نہیں واسطہ کسی سے بھی!

جلیل عالی

کوئی حدیثِ بصیرت

نظر کی راہ میں
سوالتباس رقص کناں
ہزار ابرِ تحیر طراز برق فشاں
قدم قدم
سرِ احساس ڈولتی سوچیں
شعور بے سروساماں
گمان تیرہ جبیں
کوئی حدیثِ بصیرت
بہ گوشِ زخمِ جگر
کوئی چراغِ سعادت
بہ طاقِ قلبِ حزیں

سیف الملوک

دیواروں سے رِستی رِستی
رُوں رُوں رستے
تنہائی جب
میرے اندر
دور دور تک
اپنا بُور جما لیتی ہے
اور وجود
کسی انجانی
نامطلوب سی شخصیت کے
پتھر بت میں ڈھل جاتا ہے
میں گھر کے
زنداں سے نکل کر
شہر کے شور یلے سناٹے کی
جاں سوز حدوں سے باہر
گھنے درختوں،
بھلے پرندوں
اور کئی بے نام نداؤں بیچ بسی
اس جھیل کنارے
خود سے ملنے آ جاتا ہوں

نصیر احمد ناصر

ایک وقت آتا ہے......

ایک وقت آتا ہے
جب سب دروازے بند ہو جاتے ہیں
پاؤں چلنا چاہتے ہیں
لیکن راستہ نہیں ہوتا

میوزک سنتے ہوئے
آرٹ فلمیں دیکھتے ہوئے
پرانی کتابیں سمیٹتے ہوئے
آبائی گھر کو یاد کرتے ہوئے
یا کسی کو الوداع کہتے ہوئے
آنکھیں بھیگنے لگتی ہیں

دھوپ بھرے چبوتروں میں
خالی کرسیوں پر اداسی آ کر بیٹھ جاتی ہے
اور ذرا ذرا سی بات پر
دھند اور بارش کا موسم چھا جاتا ہے

دروازوں میں اور سیڑھیوں پر
بچے اونچا بولنے لگ جاتے ہیں
اور کمروں میں بوڑھی خاموشی کی
آواز سنائی نہیں دیتی

ایک وقت آتا ہے
جب آدمی
سب کے ہوتے ہوئے بھی تنہا رہ جاتا ہے!

مَشی فی النوم

زندگی دیواروں پر لکھا ہوا اشتہار ہے
جسے بارشیں پڑھے بغیر
مٹا دیتی ہیں
اندھیرے کی ابد میں
غروب ہوتا ہُوا دن ہے
رُکا ہوا راستہ ہے
جسے ایک دن چلنا ہے
نامعلوم انتہاؤں کی جانب
زمانوں کی بوسیدہ تنہائی میں
لاوجود محبت کی سرگوشی ہے
ہوا کا ازبر کیا ہُوا گیت ہے
کبھی نہ دکھائی دینے والے
پرندوں کی چہکار ہے
ماں کے ہاتھوں کا لگایا ہُوا پودا ہے
جو ایک دن پھولوں سے بھر جاتا ہے
آسمان کے رُخ پر کھلنے والی کھڑکی ہے
دائمی خواب گاہ کا دروازہ ہے
نیند میں چلنے کا
آخری دورانیہ ہے!

نصیر احمد ناصر

پسپائی اور محبت کی آخری نظم

جب کشتیاں دریاؤں سے
اور کنارے پانیوں سے اُوب جائیں
اور راستے بستیوں کے نواح سے گزرتے ہوئے
اچانک کسی ہائی وے کی زد میں آ کر کچلے جائیں
تو سمجھ لینا
زمین پر میرے اور محبت کے دن پورے ہو چکے ہیں
اور میں آخری معرکہ بھی ہار چکا ہوں
اور تمہاری بھیجی ہوئی دعاؤں کی کمک
اور محافظ تعویذوں سمیت مارے جانے سے پہلے
کسی تنگ نشیبی راستے میں
زخموں کی تاب لانے
اور تاب کار شعاعوں سے آکسیجن کشید کرنے کی
بے سود کوشش کر رہا ہوں
اور عین جنگاہ میں
تمھارے لیے لکھی ہوئی نظمیں
اور امن خوابوں سے بھری ہوئی ڈائریاں
ان درختوں کے ساتھ ہی کوئلہ بن چکی ہیں
جو شعاعی حملے سے پہلے
پھولوں سے لدے ہوئے تھے
اور جن کے نیچے میں آخری بار بیٹھا تھا
اور سُوکھی روٹی کے ٹکڑے بمشکل حلق سے اتارے تھے
اور پانی کے بچے کھچے چند قطروں سے ہونٹ تر کیے تھے

اور جب تم دیکھو
کہ وقت اچانک رُک گیا ہے
اور شام کی اذانیں بلند ہونے سے پہلے دن طویل ہو گیا ہے
اور کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے
تمھیں ہر چیز بدلی ہوئی لگے
تو بے چین ہو کر مجھے یاد نہ کرنا
ورنہ وہ آسانی سے
تمھارے دل کے راستے سے مجھ تک پہنچ جائیں گے
اور میری موت کو
فتح کی نشانی کے طور پر حنوط کر لیں گے

اور جب میرے بجائے
قنطوریا جانور نما کوئی مخلوق
تمھارے فارم ہاؤس پر پہنچے
تو حیران مت ہونا
اور چپکے سے دروازہ کھول دینا
اور وہ استقبالی بوسے
جو تم نے میرے لیے پس انداز کر رکھے ہیں
کسی خلائی بھیڑیے کے برقی ہونٹوں سے مَس کرتے ہوئے
رو مت پڑنا
ورنہ زمین پر ہمیشہ کے لیے دھویں کے بادل چھا جائیں گے

اور جب ہوا کا آخری جھونکا
پورٹیکو میں سے گزرتے ہوئے
سرگوشیوں میں میرا پیغام ڈی کوڈ کرنے کی کوشش کرے
تو اُس کی طرف مُڑ کر مت دیکھنا
ورنہ وہ تمھاری روح کے کمزور ترین حصے سے واقف ہو جائیں گے
اور وہیں اپنے مشینی دانت گاڑ دیں گے
اور سنو!
مکمل سپردگی سے پہلے
کسی اور نشانی کا انتظار مت کرنا
انسانی ادوار میں
محبت کا مرنا آخری نشانی ہے!!

نصیر احمد ناصر

میں تمہارے لیے نظم نہیں لکھ سکتا

اگر میں تمہارا انتظار کر سکتا
تو زمین پر روزِ شمار
کبھی نہ آتا!

اگر میں تمہاری آنکھوں کے جنگل میں
درخت جیسا اگ سکتا
تو میری جڑیں
کائنات کے دل تک پھیل جاتیں
اور خدا میری شاخوں پر
بادل بن کر برستا
اور پھول بن کر کھلتا!

اگر میں تمہاری راتوں کی نیندیں اوڑھ سکتا
تو کسی پارینہ خواب کی بارگاہ میں
دیا بتی کرتا
تمہاری مقدس تاریکیوں سے
روشنی کی بشارت لیتا
اور دنیا کو
اپنی آنکھوں سے طلوع ہوتے ہوئے دیکھتا!

اگر میں تمہارے ساتھ چل سکتا
تو راستہ کبھی ختم نہ ہوتا
یہاں تک کہ
وقت اپنے پھٹے پرانے جاگرز پہنے
کسی زنگ آلود فولادی بینچ پر
تھک کر بیٹھ جاتا!

اگر میں تمہارا ہاتھ تھام سکتا
تو سرمئی بادلوں کی سیڑھیوں پر پاؤں رکھتا
افق تا افق
قوسِ قزح کے پُل سے گزرتا
اور بچوں کی طرح
عمروں کے بوڑھے ساحلوں پر
کاسنی شاموں کا ڈھیر لگا دیتا
آسمان فرشتوں کے الوہی پروں
اور گلابی پرندوں کی اڑانوں سے بھر جاتا!

اگر میں تمہارا لفظ بن سکتا
تو متن سے حاشیے تک
معانی جیسا پھیل جاتا
نظم اگر میں لکھ سکتا
تو تمہارے لیے ایک نظم ضرور لکھتا!!

نصیر احمد ناصر

آخری لفظ کے بے کار ہونے تک لکھتے رہو!

کبھی کبھی یوں لگتا ہے
جیسے دکھ اور بدی کے مقابلے میں
خوشی ناقابلِ حصول ہے
یہ سچ ہے کہ چاند اور ستارے اب روشنی کی امید نہیں رہے
بلکہ شب کی علامتیں ہیں
جو کثرتِ استعمال سے کلیشے ہو چکی ہیں
وقت کے تاریک سمندر میں
سورج کے ابھرنے اور ڈوبنے سے بھی اب کوئی فرق نہیں پڑتا
لیکن آخری حرف کے طلوع ہونے کا انتظار تو کیا جا سکتا ہے
یہ زمین کائنات کا قبائلی علاقہ ہے،
ازلی گنہ گاروں کی آماجگاہ
جہاں جنت سے نکالے گئے مرد و زن رہتے ہیں
یہ ابھی آسمان کے مقابلے میں بہت پس ماندہ ہے
یہاں ہم اپنی مرضی سے
جینے یا مرنے کے حق میں ووٹ نہیں دے سکتے!

کتنی عجیب بات ہے
کہ زیادہ تر نظمیں اور کہانیاں
دلوں اور سرحدوں کے آس پاس
کسی قومیت، کسی توطن کے بغیر جنم لیتی ہیں
اور سرحدیں پار کرتے ہوئے
غیر قانونی داخلے یا جاسوسی کے الزام میں دھر لی جاتی ہیں
بعض ملکوں میں
بارش اور ہوا کو بھی ویزے سے استثنا حاصل نہیں
جنگل کے پھول بھی
پرمٹ کے بغیر اپنی خوشبو برآمد نہیں کر سکتے
پہاڑوں کی چوٹیاں
آمنے سامنے ہونے کے باوجود
ایک دوسری سے گلے نہیں مل سکتیں
سرحدوں کے طرفین
اجازت ناموں کے لیے
بادل لمبی لمبی قطاروں میں کھڑے رہتے ہیں
یہاں تک کہ پسینے میں شرابور ہو جاتے ہیں!

کسی دور کے ستارے پر رہنے والوں کے لیے
یہ دنیا پیدا ابھی نہیں ہوئی ہوگی
لیکن ہم اسے تباہ ہوتے ہوئے بے بسی سے دیکھ رہے ہیں
اور لکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے
سچ ہے کہ شاعری دنیا کا نظام نہیں بدل سکتی
وہ تو داس کیپٹل بھی نہیں بدل سکی
کیونکہ مارکس بھی
شاعری کے راستے سے اشتراکیت میں داخل ہوا تھا
تو پھر یہ کیا ہے جو ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آتا ہے؟
یہ کون سی ترقی پسندی، کون سی سرمایہ داری ہے؟
کون سی جمہوریت، کون سی خلافت، کون سی ملوکیت ہے؟
کیسی دہشت گردی ہے اور کیسی جنگ ہے؟
بم کہیں اور گرتے ہیں

اور دھمک ہمارے دلوں تک آتی ہے
دیواریں کہیں اور ہلتی ہیں
اور شیشے ہماری کھڑکیوں کے ٹوٹتے ہیں
کہیں دور کسی قلم سے خون بہتا ہے
اور یہاں ہماری نظمیں رونے لگتی ہیں!

تاریخ کے راستوں پر پسپا ہوتے ہوئے
زندگی کو کتابوں کی جلی ہوئی لاشوں کے پاس افسردہ دیکھ کر
ہم اس کو دلاسا دینے بھی نہیں رک سکتے
پتا نہیں وہ کس لفظ کی محبوبہ تھی
جو راکھ اور دھوئیں کی لامتناہی ضخامت میں
جانے کون سا معنی' کون سا تناظر ڈھونڈ رہی تھی
آہوں' کراہوں اور سسکیوں کے انبار میں
نظموں کے پیکر اور کہانیوں کے کردار کہیں نیچے دب جاتے ہیں

مسودوں اور عبارتوں کے جنک یارڈ میں
پھٹے پرانے کاغذوں
اور سیل میں خریدے ہوئے کپڑوں اور جوتوں میں
کوئی فرق نہیں ہوتا
ڈھیر ہوتی ہوئی بے خلیہ شاعری
وقت کا غیر نامیاتی سلسلہ ہے
شاعرو! آخری لفظ کے بے کار ہونے تک لکھتے رہو
یہاں تک کہ سیاہی کا سارا محلول ختم ہو جائے
شاید روشنی
ہمارے ضیاترس پہاڑ جیسے جسموں
اور جنگل جیسی گنجان روحوں کے آر پار جانے لگے!!

منی باکس

گولک بھرنے والی ہے
بھر جائے گی جب تو ہم
سینٹورس گھومنے جائیں گے
خواہش، خواب اور مرضی کی
ہر چیز خریدیں گے
تازہ جوس اور شیک پئیں گے
آئس کریم اور برگر کھائیں گے

اپنے دل کی گولک میں
جتنے سکے ہیں، لگتا ہے
بل گیٹس کی ساری دولت بھی
ان سے کم ہے
ہم کو بس یہ غم ہے
گنتے گنتے تھک جائیں گے
اتنے پیسوں کو ہم
خرچ کہاں کر پائیں گے!!

نصیر احمد ناصر

وِنڈو شاپنگ

کبھی کبھی جب میرا دل
تنہائی سے بھر جاتا ہے
تو میں دنیا، تیری جانب
کچھ بھی لینے چل پڑتا ہوں
تیرے بازار میں دنیا
ریستوران ہیں، اُونچے اُونچے ہیبت ناک پلازے ہیں
سہ جہتی فلموں والے سنیما گھر ہیں
شاپنگ مال ہیں، جن میں
ایک ہی چھت کے نیچے
شیلفوں، ریکوں میں ہر چیز قرینے سے رکھی ہے
ہاتھ بڑھاؤ، لے لو
جو چاہو، جتنا چاہو
رکھ لو مال ٹرالی میں
جتنا جیب اجازت دیتی ہو

تیرے ظرفاب میں دنیا
نیلی، پیلی، سرخ، سنہری
کتنے رنگوں کی اسماک بجی ہیں
کتنے سورج زیرِ آب رکھے ہیں
کچھ چیزوں پر سیل لگی ہے
کچھ کی قیمت پوری ہے
لیکن ہر خواہش کی تکمیل ادھوری ہے

تیری "سٹاپ اینڈ شاپ" میں دنیا
میرے مطلب کی ایک بھی چیز نہیں
مجھ کو تو یہ بھی معلوم نہیں، کیا لینے آتا ہوں
دنیا، تجھ کو دیکھ کے
واپس آ جاتا ہوں!

دنیا، تیرے دل میں پتھر کی آنکھیں ہیں
جوان شیشوں سے، شوکیسوں سے جھانکتی رہتی ہیں
جن میں مجھ جیسوں کے خواب رکھے ہیں
جینے مرنے کے اسباب رکھے ہیں
مُلکوں اور زمینوں کی ہر جنس پڑی ہے
افلاک، ستارے اور مہتاب رکھے ہیں

ستیہ پال آنند

''خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ''

تہہ در تہہ پیچاک تھے مضمر اس ایمائی گہرائی میں
اور میں اک پیَراک کھلنڈرا، ہنس مکھ، چنچل، خوش، خنداں
ڈُبکی پیتا، غوطے کھاتا، لہروں سے ہم آغوشی میں شاداں فرحاں
کچھ بھی سمجھ نہ پایا اپنی کچی بلوغت کے برسوں میں
کیا گہرائی، کتنا عمق ہے اس پانی کی تہہ داری میں
جان نہ پایا سمک تلک جانے کا بھید بھرا رستہ!

آٹھ دہائیاں اک اک ساعت قاش قاش کر کے کاٹیں
بیت گئی جو اوّلون تھی عمر تو اک دن یہ سوچا
سابقون سے آگے آج کے اس لمحے تک پہنچ گیا ہوں
پیچھے مُڑ کر دیکھوں تو کیا کچھ کھویا، کیا پایا ہے

آگے شاید سمک تلک جانے کا بھید بھرا رستہ مل جائے
پرسوں نرسوں، چندے بعد مقدّر امکانی ہو شاید
ہو سکتا ہے مستقبل کے انت کال میں پاؤں رکھوں تو
دیر سویر، معاد، پس فردا میں ڈھل
کر آنے والا کل بن جائیں
ورتمان کے 'غیر حال' کو 'حال' بنا کر
میری کھوج کا حل بن جائیں

آٹھ دہائیاں جی چکنے کے بعد
چلو یہ بھی سوچیں
کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے
قدر و قضا کے ہاتھوں میں یہ ارتفاق بھی
پرسوں نرسوں میں بدلے
ماضی، حال اور مستقبل... یعنی یہ تینوں
اپنے آپ میں کوزہ بھی اور کوزہ گر بھی
اپنے ہی پانی مٹی سے اک ساعت ایسی گھڑ لیں
جو حیات میں عین موت ہو
اور موت میں عین حیات!

ستیہ پال آنند

دن پھلیلوں کے ہوئے ہیں رُخصت

آج تو بالوں کا ہی سوگ مناؤں دن بھر!
بال تو جھڑ ہی گئے ہیں مرے اک اک کر کے
اب کہاں آئے گی ان سے کوئی سوندھی خوشبو
عطر آگیں کوئی نافہ نہیں، اگیاری نہیں
اب تو اک جھاڑی ہے ہلکی پھلکی
سر پہ رکھی ہوئی مسکین سی، میلی سی دھوپ
بال ہیں یا کوئی کھدر کی پرانی ٹوپی!

وہ بھی کیا دن تھے کہ میں شستہ و رفتہ، بے داغ
بنا سنورا ہوا، نکھرا ہوا، اجلا، طاہر
گھر سے باہر جو نکلتا تھا تو ہلکے بھورے
کچھ ذرا الجھے ہوئے گچھوں کو
ایسے رکھتا تھا کہ سبھی کو یہ لگیں
ظاہراً منتشر بد نظمی سے ماتھے پہ.... مگر
ہوتے تھے سارے قرینے سے سنوارے ہوئے بال
منتظر رہتے تھے ان کی طرف دیکھے کوئی
پیار سے، چاہ سے، وارفتگی و حسرت سے!

وائے، واحسرتا، افسوس۔ مرے بالوں کے
دن پھلیلوں کے ہوئے ہیں رخصت!

اقبال فہیم جوزی

جھیل کے قریب

جھیل کے قریب اِک زیتون کا پتا ہے!
میں نے اس پر اپنا بوسہ ثبت کیا ہے،
تم اسے بالوں میں اُلجھالینا!

بہت ہی قریب ہیں وہ گھڑیاں جہاں ابد کا چشمہ ہے؛
میں وہاں تمہیں پیاسا ملوں گا!

آؤ دے دو میرے ہاتھ میں ہاتھ!
اے بادِ صبا، چلو سنگ سنگ!
ہم اس کا انتظار نیلے جزیرے پر کریں گے؛
جہاں دن ہے نہ رات!
بس خیال کی اِک دُھند ہے، یہاں سے وہاں تک،
جہاں اس کے پھیلتے بازوؤں کے گرافکس ہیں،
رقص کرتی ہے ہوا،
ناچتی ہے گھٹا!
زعفران کے کھیتوں سے گزرنا، تو دیکھنا؛
میری مسکراہٹ کا لاکٹ،
کسی سرو پہ سجا دینا!

بس چند کوس دُور حیات کی خوشبو ہے
میں تمہیں وہاں تنہا ملوں گا!

آؤ چلو نا میرے ساتھ،
زرد گلابوں کے قافلو
ہم اس کا انتظار قوسِ قزح کے ساتویں رنگ پر کریں گے؛
جہاں ماضی ہے، نہ مستقبل!
بس گیان کا اک سُر ہے، یہاں سے وہاں تک
جہاں اس کے ابروؤں کے زاویوں سے،
جھومتی ہے کرن،
دیکھتی ہے نگاہ!

اقبال فہیم جوزی

امر جیون

جب بھیڑیے اُس کے گوشت کو
نوچ نوچ کر کھا رہے تھے
تو اُس کی محبوبہ بھی اُسے چھوڑ کر بھاگ گئی

لیکن مرنے سے پہلے اُس نے
اپنا ایک سانس دھرتی کی کوکھ میں رکھ دیا
برکھا برستی رہی
اور جاتی بہار کے موسم میں دھرتی سے اِک نیلی کونپل اُبھری
جو بڑھتے بڑھتے اِک تناور درخت بن گئی
قافلے گزرتے
اور اُس درخت کے تنے میں اِک زخم لگاتے،
جہاں سے دودھ بہتا
اور وہ اپنی پیاس بجھاتے!

ایک دن
اُس کی محبوبہ کا قافلہ بھی
وہیں سے گزرا
اُس نے بھی اِک کاری زخم لگایا
تو لہو کے اِک دھارے نے اُسے رنگین کر دیا
اور شاخوں سے دو موتی گرے
جو اُس کے بالوں میں الجھ گئے!

آخری کنارہ

جب کوئی اُس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کرتا،
وہ راستہ بدل جاتا
جب کوئی اُس کے دل کا کانٹا نکالنے کی کوشش کرتا،
وہ راستہ بدل جاتا
جب کوئی چوڑی اُس کے لیے کھنکتی،
وہ راستہ بدل جاتا
وہ راستے بدلتا گیا، بدلتا گیا، بدلتا گیا!

لیکن اِک روز اُس کا دِل خاموش ہو گیا،
سنّاٹے کی چادر نے اُسے اپنی لپیٹ میں لے لیا
اور وہ غائب ہو گیا!

دھرتی کا آخری کنارہ آ گیا تھا!!

ابرار احمد

ایلان کردی کی خود کلامی......

کوئی ہلچل سی تھی
شور تھا چار سو
جیسے چھت گر رہی ہو
مجھے کیا پتا
کیا ہوا تھا کہیں
جب مجھے ساتھ لے کر چلے تھے
مری ماں نے سینے سے بھینچا ہوا
باپ کا ہاتھ بازو پہ تھا
اور ہم چل رہے تھے
نہ جانے کدھر کو---
سمندر کبھی میں نے دیکھا نہیں تھا
مگر کیسا منظر تھا
جی چاہتا تھا
اسی ڈولتی، ڈوبتی ناؤ سے کود جاؤں
نکل جاؤں لہروں پہ اڑتا ہوا
پرندوں کی صورت چہکتا ہوا
مگر.. ماں نے سختی سے چمٹا کے
پانی کے اندر
مجھے کچھ کہا.. میں بھی بولا
مگر سانس.. جانے اسے کیا ہوا
کوئی بڑھتی ہوئی پھانس تھی
اور گھیرے میں لیتی ہوئی
کوئی سیال ظلمت---

تو پھر... میں ادھر
اپنے آنگن میں، اپنے کھلونوں سے
اور دوستوں سے
لہکتے ہوئے باتیں کرتا ہوا
محوِ پرواز تھا
اور نیند آ رہی تھی
گھنی، گہری، تاریک
ماں، جانے کس خواب کو جا چکی تھی

بہت دیر تک
پانیوں نے تھپک کر سلایا مجھے
اسی ریت پر...
جس پہ اب میں پڑا
اپنی پھیلی ہوئی پتلیوں میں
خدا دیکھتا ہوں

خدا---جس نے بھیجا مجھے
اس زمیں پر
اسی ایک دن کے لیے!

ابرار احمد

گردِ بے نیازی میں……

کرو، جو جی میں آئے
توڑ کر رکھ دو
ہے جو کچھ بھی مرے
دل میں یا گھر میں
جس سے بھی
نسبت ہے کچھ میری
اسے کوڑے میں پھینکو
بارشوں میں
گندگی کے ڈھیر پر ڈالو

مجھے کرنا بھی کیا ہے اب
کہ اپنی ہی کسی آواز میں گم ہوں

یہ رشتے بھی کبھی
خوش رنگ کپڑے تھے
سجا کرتے تھے ہم پر
اور انھیں میلا بھی ہونا تھا
ادھڑ جانا تھا آخر کو

یہاں جو ہم دمی کا واہمہ ہے
اصل میں زنجیر ہے
جبر مشیت کی، معیشت کی
کہ کب کوئی بھی دل
جا کر کبھی دھڑکا کیا ہے، اور سینے میں
کہ کب اکڑی ہوئی گردن کو
سجدے نرم کرتے ہیں
رعونت.. تلملاہٹ ہے
ہنسی آتی ہے
ایسی بے ٹھکانا تمکنت پر
رحم آتا ہے..

تو بس یہ التفات دائمی
کچھ بھی نہیں
ماتھے پہ
گہرائی تلک جاتے
نشاں کی ٹیس سے بڑھ کر
مدارِ وقت میں
تنہا ہی چکر کاٹتا
آخر نکل جاتا ہے انساں
اور کھو جاتا ہے
گردِ بے نیازی میں

ابرار احمد

فنا کا اشارہ نہیں...

(معاصرین کے نام)

اب کسے یاد ہے
کب چلے تھے کہاں سے
مگر--خاک اوڑھے ہوئے
بادلوں کے تلے
نیند میں یوں رواں تھے
کہ جیسے کہیں ہم کو جانا نہ تھا
اور پھر-----
ہم نے سڑکوں کو روندا
پرندوں کی آواز میں سُر ملائے
یہاں سے وہاں تک
اسی خاک پر
عمر بھر اپنے آنسو گرائے
اور اب--
پھول ہی پھول ہیں چار سو
سبز پتوں میں گرتی ہوا میں
لچکتی ہوئی اپنی شاخوں پہ
رنگوں کو سہتے ہوئے......

کس کو معلوم ہے
کل کو اس باغِ دنیا میں پھرتے ہوئے
زندگی کی روش پر ٹہلتے ہوئے
کون، کس پھول کے پاس رُک کر
کہے گا
"یہ کیا رنگ ہے، پھیکا پڑتا نہیں
کیا بہاریں ہیں
جن تک، خزاں کی رسائی نہیں
کس طرح سے سمیٹے ہو مہکار
جس کو فنا کا اشارہ نہیں!"

ابراراحمد

ایسا بھی کیا

نہیں کچھ نہیں، خیر ہے
ایسا ہوتا ہے
آنکھیں مناظر سے ہٹتی ہیں
مرکز بدلتی ہیں
اور، رات دن جاگتی جو رہی ہیں
انھیں نیند گھیرے میں لیتی ہے
معدوم ہوتی ہوئی روشنی
پھر کسے کھینچتی ہے
کسی کو بھی دکھتا نہیں
کیا ہوا تھا کبھی
کیا رہا تھا کبھی --
مناظر کا کیا ہے
ابھی سامنے ہیں
ابھی اوٹ میں ---
تسلسل ہے، جس کی کڑی ٹوٹتی ہے
تو ہم چوٹ کھا کر، پلٹتے ہیں
اپنی طرف
اور مٹی کی تاریکیوں میں بھٹکتے ہیں
جب.. اور آنکھیں چمکتی
نئی زندگی سے نمی جوڑتی
آگے بڑھتی ہیں----
جن میں دبی مضطرب آگ ہو
منزلوں کے ہیولے ہوں چاروں طرف
ان کو بڑھنا تو ہے
آگے جانا تو ہے...

تو پھر یوں کرو
اپنی گزری مسافت کے رستے گنو
یاد کر کے انھیں
جو درختوں کی صورت، تمھارے لیے
راستوں میں رہے
اور ڈھونڈو وہ آنکھیں
کہ تم جن کے خوابوں کی انگلی پکڑ کر
یہاں تک چلے
خواب ہونے لگے...
بیتی راتوں کا اک بے نہایت قرینہ ہے
اندر ہی اندر
بہت دور تک ......
نیند میں خوش خرامی کرو
خود کلامی کرو
خیر ہے، ایسا ہوتا ہے
ہوتا رہے گا
تو پھر یار، ایسا بھی کیا!

علی محمد فرشی

ونگیاری

(مجید امجد کے لیے)

گاؤں کی ہر ناری کو پیاری
اس کی کھاری
جس میں کانچ خزانہ بھرا ہوا ہے
کچی، کانچ کی عمروں والی
الہڑ گڑیاں
اُس کی چاروں جانب
گھیرا ڈالے
اپنی کلائیوں کا یہ زیور
چنتے چنتے
ہنستی ہیں تو
چاروں سمتوں
کانچ کا شور بکھرتا ہے
دل ڈرتا ہے

کچی عمروں والے
کانچ کے ٹکڑے
بکھرے پڑے ہیں
جن کو وقت کا جھاڑو
روز
سمیٹ کے لے جاتا ہے

اپریل کی پہلی کرن

(نصیر احمد ناصر کے لیے)

زندگی کے باغ میں
اپریل کی پہلی کرن نے آنکھ کھولی
نظم کو خوشبو ملی
الفاظ کو وہ تازگی جو دائمی ہے!

زندگی
اپریل کی پہلی کرن کو
چوم کر آتی رہے
جنگلوں میں گیت اُس کے ہی ہوا گاتی رہے!
زندگی دائم دعا میں مسکراتی ہی رہے!!

علی محمد فرشی

زخمی پھول

(ڈاکٹر منیر احمد سلیچ کے لیے)

منیر احمد!
مجھے معلوم ہے
پھولوں میں کلیوں کی طرح رہنا
کوئی مشکل نہیں ہوتا
مگر کانٹوں میں جیون کو پرونا
دل کے زخمی پھول کو سب سے چھپانا
اور سب کے سامنے ہنسنا، ہنسانا
اس قدر آساں نہیں ہوتا
کہ جیسے تم بتاتے ہو
تمھاری داستاں سچی ہے
تم سچے ہو
لیکن کیوں یقیں مجھ کو نہیں آتا
کہ تم اس عہد کے انساں نہیں ہو
داستانوں کے زمانے سے بھٹک کر آ گئے ہو
ایسی دنیا میں
جہاں روبوٹ رہتے ہیں
نگل جاتے ہیں سچائی
مشینیں بھاگتی پھرتی ہیں سڑکوں پر منیر احمد!
کچل دیتی ہیں جو صدیوں کی دانائی

وصیت

جیون کی
اس گری پڑی دیوار کے نیچے
کوئی دفینہ مل جائے تو
میرے لفظوں کی مٹی سے
اس کی پردہ پوشی کر دینا
یہ اثاثہ اس کا ہے
جس نے
برسوں بعد
مری طرح اکیلے آنا ہے
اور اس مدفون خزانے سے
اپنا محل بنانا ہے!

علی محمد فرشی

زمینی صحیفہ

سرخ بتی بجھ چکی تھی
گاڑیاں کالی سڑک کو روندتی
آگے گزرتی جا رہی تھیں
اور میں اب تک وہیں پر
ہارنوں کے شور میں

جامد
کھڑا تھا

جیسے میرے پاؤں پر
فالج کا حملہ ہو گیا ہو

آسمانی شرٹ پہنے
ایک لڑکا
پنسلیں ہاتھوں میں تھامے
یوں کھڑا تھا
جیسے اس کی پنسلیں
تقدیرِ آدم لکھ چکی ہوں
اور اس کا نام لکھنا رہ گیا ہو

میں نے اپنی جیب سے بٹوا نکالا
اور اس میں سینت کر رکھی کرنسی
اس کے سر پر وار دی
لیکن ابھی تک پاؤں میرے
اور اب تو انگلیاں بھی۔۔۔۔

خوشی کس موڑ پر بچھڑی

دو پیسے میں چار بتاشے
کھوکھے والے بابے سے لے کر
ہم دونوں بھائی کتنا خوش ہوتے تھے
میٹھی لہریں ننھے دلوں کو شہد سمندر کر دیتی تھیں

اور اب.....
دو سو کے دو جوس کے پیکٹ
اپنے بچوں کو لے کر دیتا ہوں تو
اُن کی آنکھیں پھیکی پھیکی سی لگتی ہیں
اور جوس فروش مشینی لڑکا
لوہے کا بت لگتا ہے

علی محمد فرشی

اُٹھ رنگی خواہش

اور جب
بچپن کی شیریں بوندیاں، خوشنودیاں
جیبوں میں بھر کر
دوڑتے لمحوں کی گلیوں میں
پتنگیں لوٹتے دن سے گزرتے تھے
تو تیری آخری منزل کی
ساری کھڑکیاں
حیرت سے ہم کو دیکھتیں
کن شوخیوں، سرشاریوں کے
پر لگے تھے کم سنی کو
ان دنوں ہفتوں، مہینوں اور برسوں میں
کہاں اس لامساوی وقت کو تقسیم کر سکتے تھے ہم
جب شادمانی کی ہوا میں تیرتے بادل کی صورت
ہم گزر جاتے تھے چھو کر ریشمی چنری تری!

اے زندگی تُو!
یوں نہ ہم کو بھول کر آگے نکل
اُس خواب کی دیوار سے آگے کا منظر
جس کو چھو لینے کی خاطر
بجلیوں بے تاب ہے تو
ہم کو پیچھے چھوڑنے کا
غم نہیں کوئی بھی تجھ کو
ہم اُسی منظر سے آئے لوگ ہیں جو
کل نہیں تو

چار دن کے بعد
تجھ سے آملیں گے
چاک تیری بے وفائی کے
مگر کیسے سلیں گے
دائمی دکھ!
ہم کو سینے سے لگا لے
آٹھ رنگے پھول کے
دیدار کی حسرت میں کب تک
زیست کے پیچھے چلیں گے
ہجر کی بے ساکھیاں تھامے ہوئے

اے دائمی سکھ!
آرزو کے پھول کو رنگین کر دے
کائناتوں کے لہو سے
آخری قطرہ ہمارے ریتلے حلقوم میں
اپنے سبو سے!

سولیاں اور اہداف

یوں بھی ہوتا ہے
کہ ہم اپنے چاروں طرف
اپنے ہی اہداف کی سولیاں
گاڑ دیتے ہیں
ان پر ٹنگے ہوئے اہداف
پانے کو، زندگی بتانے کو
آرزوؤں اور اُمنگوں کے خاکے بناتے رہتے ہیں
جیسے کچھ ہونے والا ہے
جیسے کوئی آنے والا ہے
پھر یوں ہوتا ہے
محبتیں، دوستیاں دشمنیاں
سب انہی حوالوں سے پروان چڑھتی ہیں
زندگی کا سفر انہی راستوں کے
فسوں میں کھو جاتا ہے
ایسی کیفیت میں
سراب حقیقتیں لگتی ہیں
کوئی بتلائے بھی تو ہم مانتے نہیں
کہ حقیقت کچھ اور ہے
وہ نہیں جو ہم جانتے ہیں

ہم تو بس سولیوں پر ٹنگے اہداف کو
تکتے رہتے ہیں
ان سے دور بیٹھے
انہی کی آس میں کھوئے رہتے ہیں
زندگی کے سفر کی
انہی حسین غفلتوں میں
مضمحل جسم و جان کو کھینچتے ہوئے
جب اہداف اور سولیوں کے
قریب آتے ہیں
تو دیکھتے ہیں جن مقتدر نشانوں
ہمیں پاگل کیا تھا
وہ تو خود ہی
سیلِ زمانہ کی نذر ہو گئے ہیں

سعادت سعید

زندگی کا بوجھ

زندگی کا بوجھ کم ہوا
ایک اور وقفہ، نور اندھیرے میں جا پڑا
سوچ نے وہم فصیلیں محاصریں
غیر مرئیت نافہم تھی
کمر واپسی کسی
محرمِ نظر اُمنگوں، خواہشوں،
تمناؤں کے بے مہر سیل ساتھ بہنن خاطر
سمت تلاشی سفر شروعاً
منزل پانا؟
بعد قصہ ہے
بار بج پانچ پر دن آغازا
کتا بھونکی ارادہ بازی نہ کر سکی
احباب معانقتے، چائے، مالٹے، نمک پارے، لطفے
فقرے بازیوں، چوٹوں، چشمکوں، گرمی
ماحول بدل گئی
ہر پل عجائب پیداتے ہیں
شعوری درک محفل اختتامی پر ہوتا ہے
بدن تھرتھراتی جماتی سردی لہر بھی
ارادہ نقصانی نہ کر سکی
گدگدی پیداتے عمل سے کراہیت ہوئی
نیند بوجھل آنکھیں ماضی وقوعے
اِک پل میں دکھا گئیں
ٹاور کلاک ٹک ٹ دل بے حسی میں شاملی

نیم خفتہ ماحول، بلبوں کی ٹھٹھرتی روشنی،
اکا دکی کھلی دکانوں کی روشنیاں
سگرٹ خریدے
دھوئیں می خود کو عاداتی طور تلاشتی علت
نقارے پیٹتے گیت گاتے فقیر
سالِ نو کے ابتدائی وقوعے ہیں
کس قدر ریچ گا نقی ہے
چھتوں پر سال کے آخری سورج کو لطفانا!
اخباروں میں اس کی تصویر چھاپنا!
ہر لمحہ ڈوبتا اُبھرتا سورج ایسی کیفیت پیداتا ہے
حساس دل، باریک بیں دماغ درکارئیے

سعادت سعید

تنویمی عمل

تنویمی عمل اثر انگیزی بے سدھارتی بے حالتی ہے
اچھی موسیقی روح پروراتی ہے
سامعینی خصلت فطرت مانع ہوسکتی ہے
یہ بھی موضوع سخن تھا
قسم قسم باتیں بھی جن میں
کتا قسمیں
سگریٹ ذائقے
پائپ اوقاتی
جانور فطرتی
زیر بحث!
وقت پڑنے پر
ہر بات نبھتی ہے
بے سوچے سمجھے نہیں
مطالعہ وسعتی
زندگی بارے بنیادی اصول وضعی درکار ہے!
شہر ہنڈت پھرت ذوق نہیں رخصتا
یوں پیداتی خواری باوجود
اُڑی اُڑی طبیعت خوراک فراہمن لیے
شہر گلیوں، گراؤنڈوں، کمروں، سڑکوں گھوما
شعروں میں کھورنگ تلاشنا
مزاح کوشش مصروفتے کلمیتی مکروہ چہرے
سگرٹ دھویں سے کمرہ تعفنا
وقت ضیاعی فکر
تفریح فراہمتی یادیں
ذہن بوجھ بن ماضائیں
نصب العین تعینی کی نصیحت
اسے ہینڈ رائٹنگ تک محدودنے سے
ذہنیت سراغی!
شام گھر لوٹتے کسی سے
اس شخص بارے مزاحیہ تنقیصی باتیں سن فرحتا
وہ مری ذہن اُڑانوں میں دخلا تھا
ہینڈ رائٹنگ ٹیڑھ کو جہالت پر محمولا تھا
وہ حروف بھی نہیں بھولتے
جو ایک دوست نے سنجیدگی اور وقار سے کہے تھے
کہ خرابی دراصل فردی نفسیات میں ہے
میری ہینڈ رائٹنگ بھدی ہے
مجھے انتظامنا چاہیے
لیکن!!

سعادت سعید

افسانہ نگاری

افسانہ نگاری لیے زندگی اندر رچنا
گھاٹوں پانی چکھنا
اتنی ہی ضروری ہے جتنا جینے کے لیے خوراک!
آوارہ مزاجی مفید ہے
مزاج یا تخلیقی ہو تو نقصان آنچ پہنچانا گزیر ہے
غیر فطری تلقین ذہن بگاڑتی ہے
آوارہ گردی سے بازنے کی بجائے
اسے شعوری دماغنا ہوں
اس الٹی ذہنی سمت کو نفسیاتی اصول تحت نہیں بیان سکتے
کیا یہ بھی انسانی فطرت ہے
وہ اہم باتوں پر روٹھتا اور غیر اہم پر خوش ہوتا ہے
ایسی باتوں پر غصتا ہے
جن سے خوشنا چاہیے
جن کو دادنا چاہیے
وہ ان باتوں پر خوشتا ہے
جو آگ بھڑکاتی ہیں
خواب سرور سے بوجھل آنکھیں
بیداری دشمن
شعور میں ترازو
تیتے، جھلسے فقرے
بستر سے اُٹھنے کی راہ میں حائلے
خاموش طبع کا خود مگنا اس کی ذات نہیں

چھپ چھپا
شجر ممنوعہ کا پھل توڑنا
اس کی ذات کا اہم عنصر ہے
یہ تشنہ اظہار اور تشنہ تعبیر ہے
ہسپتال، کچہریاں، کالج، سڑکیں، بزم فکر و ادب،
فوڈ گرین آفس
سائیکلوں کی گدیوں کی چبھن
دن بھر کا حاصل تھی
بے چینی اتنی کہ گھر بیٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا
احباب کی رفاقت میں اساتذہ سے ملاقات کا پروگرام بنا
اور پھر جھجکتی بڑی آنکھوں
اور سفید کپڑوں میں ملبوس جسم کی شوخی سے
پیداتی حقارت نے دن بھر کی تھکن اتاردی
قابلِ نفرت بھی بعض اعمال سے جی خوشاتا
اور من موہاتا ہے
یہ محرک اچانک ملاقات میں
بے نوشتہ کہانی بن گیا

سعادت سعید

ڈھوپ

دھوپ میں بکھرے رونق بھرے آثار
سوچا لوگ ویسے ہی ہیں جیسا انہیں ہونا ہے
اداس یا خوش؟
میرے تاثرات
جن کی زد میں ذات تھی!
ریشمی حدت جس پر نظر نہ ٹھہری
مستقبل کی تابندگی تعینا رہی تھی
سر پر طوفان منڈلیں
اجلی گیتوں بھری فضا مجھے
خوشبو سنگ نغمگی کی اتھاہ وسعتوں میں لے آتی ہے
روح پر یہ لمحے ثبتا چکے ہیں
کج مج غمناکی کا راگ الاپنا نہ مناسبا
بعض خول چڑھا رکھنا اساسی فریضہ خیا لتے ہیں
زرنگار لمحوں کی دل نوازی نہ جانے کیسے ترتیبی
ایسے لمحے مجھ سے گریزاں رہے ہیں
سب کچھ غیر محسوس وجودا
میں ابد گیر طرب انگیزیوں کا قائل نہیں
نہ ہی ایسا ممکن ہے
میسر لمحوں کو فائدنا ہوگا
کام دل جمعی عادتیں
شیشموں پر لٹکے خوش رنگ جالے
جن میں نفیس مکڑیاں تنتنا رہی تھیں

شہتوت دیکھ ریشم کیڑے یاد ے
مرعوب کن نگاہوں پر ترس کھانا
اپنے عہد کا رونا رونا کس قدر غمناک ہے
یہ مجھ پر نہیں بیتی
لذت تھپکی اپنی کمر پر محسوستا رہا
اپنے حساس ذہن کو بہت کچلا ہے
اچانک زلزلہ جھٹکا گیا
لڑکیوں طرف ہوسنا کی سے گھورتے لڑکے
چوری چھپے الجھنے والا تھا
خود قابو نا فرحت ناک لمحہ تھا
کار سیری لذتنا
گردن اکڑانا!
گیتوں میں کھویا
سڑک چھاپ نے کیا خوابا؟
گزرے منظر کی غیر انسانی لہروں پر شدید شرمندنا پڑا
ذات ارمانوں کا لہو
سب نے بہتا دیکھا تھا
آہ فطرت! انسانی فطرت!!

سعادت سعید

فکری سمت

فکری سمت معینا معجزاتی ہے
کرتبوں اور بازیگریوں سے فارغ ہونے،
گھاٹ گھاٹ پانی چکھنے،
خاک میں مل اٹھنے سے
اس کی پیدائش ہے
دق زدہ ذہن میں زندگی
قدر و قیمت کی حامل ہو بھی تو
جبلی بہشت سے ناوابستگی نوحہ ہے
اس نوحے کے بھاری پتھروں کو گرایا جائے تو
ناتراشیدگی سانچوں میں ڈھل کر کیف و طرب پیداتی ہے
اعلیٰ فنی بے کرانی موجیں مارتی ہے
سڑکوں پر مینہ کی پھوار
دھوپ میں نہائے مینار
کروٹیں لیتے انفاس کی بین کرتی سروریت کا پس منظر
چارکھونٹی خلد رستوں تک پہنچنے کا سفر
اور تخریب میں تعمیر کے پہلو دیکھنا
تخلیقی تازگی کی حدت ملنے سے ممکن ہے
اپنے فسونی فن کی داد پانا کشادہ ادراکی ہے
حسد انگیز رویوں پر آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے
فضول کج بحثیوں سے پالا پڑنا،
سال خوردہ قلم کرشمے، مشق اور فنکارانہ موجودگی پر یقین کامل

کینہ توز نگاہیں! بر چشم قلندر!!
مسکرا کر سر سے گزار دو
ریشمی نرماہٹوں میں کھو اپنے تضادات کی دیرینہ تپش دیکھنا
لڑکھتے قلب کو سنبھالنے میں معاون ہیں
گوشت کے پھڑکتے لوتھڑوں کو بھنتا دیکھیے
تاریخ کی نہ جھپکنے والی آنکھ کی گواہی مل جائے گی!
بھوک کے سوگوار آئینے
شکم سیری کی سنگین بیستونی سے خائف
سوگ نالوں سے مفر کس کو ہے؟
اداس ہونے کے ہیں سامان!
سدا ساتھ رہیں گے کیسے؟
زندگی مسلسل داغے جارہی ہے
ہر وجود ختم ہوتا نظر آرہا ہے
اپنی اصل کی طرف لوٹاؤ!
ترقی کی انتہا مال پذیری اور جہالت ہے
کیا یہ جبلی ہے؟

نعمان شوق

سڑک کے دونوں طرف خیریت ہے

آسمان کے ایک کنارے سے
دوسرے کنارے تک اُڑ رہی ہے
رنگ برنگی موت
پتنگوں کی طرح بل کھاتی ہوئی
جس کی ڈور
گلی کے منچلے لڑکوں کے ہاتھوں میں ہے
بکھرے چاندکی
ادھ جلی پرچھائیں سے بنے رتھ پر سوار
جھومتے ہوئے آتے ہیں آوارہ کتے
جو بھونکتے ہیں
کبھی دھیمی اور کبھی تیز آواز میں

سمجھدار لوگ
کھڑے ہو جاتے ہیں سڑک کے دونوں طرف
سر جھکا کر!

جب لڑکیاں نہیں ہوں گی

ہماری رات کے ٹوٹے ہوئے چاک پر
گڑا جا رہا ہے
ایک بے حد ڈراؤنا خواب
بُنا جا رہا ہے ایک ایسا آسمان
جو پرندوں سے خالی
اور دُھوئیں سے بھرا ہے

کل جب لڑکیاں نہیں ہوں گی
اوزون کی پرت میں بنے کسی سوراخ سے
پیدا ہوں گے بچے

ہمارے لہُو سے
سینچے گئے پیڑ کی سُوکھی شاخ پر
گائے گی کوئی چڑیا ایک اُداس گیت
اور لوگ سمجھیں گے
صبح ہو گئی!

نعمان شوق

پیش لفظ ایک محبت نامے کا

کمرے کی سیلن سے اُکتا کر
کہیں چلی گئی ہے
میرے حصے کی دُھوپ
بندھن سے ڈرنے والی چڑیا
اُڑ رہی ہے کھُو کھلے آکاش میں

اور میں!
میں تو استقبال بھی نہیں کر سکتا
کسی نئی آہٹ کا
کیونکہ ڈر گیا ہوں میں
آتے ہوئے قدموں کی
لوٹتی ہوئی بازگشت سے

میری آنکھوں میں جم گئی ہے
اُداس، لُو بھری دوپہر
ہمالہ کی چوٹی پر جمنے والی برف کی طرح
میں بھول چکا ہوں
املتاس کے پھول سے اپنا پہلا مکالمہ
کمرے کے کس دروازے سے
کھڑکی سے یا روزن سے
داخل ہوئی تھی سورج کی پہلی کرن
مجھے کچھ یاد نہیں

ایک بے حد مصروف لمحے کے لیے
سنبھال رکھا تھا میں نے
بہت سارا خالی وقت
اپنے آنکھوں میں
اپنے ہونٹوں پر
اپنی بانہوں کے ٹوٹتے ہوئے گھیرے میں
بے ہنگم خوابوں کے بکھرتے دائرے میں

کسی بسنتی جسم کے پہلے تہوار میں
ادھورا چھوڑ آیا میں اپنا رقص!
میرے عشق سے کہیں زیادہ لمبی تھی
میرے پریم پتر کی بھومیکا!

نعمان شوق

گراؤنڈ زیرو

وہاں بھی ہوتا ہے
ایک ریگستان
جہاں کسی کو دکھائی نہیں دیتی
اُڑتی ہوئی ریت

وہاں بھی ہوتا ہے
ایک درد
جہاں تلاش نہیں کیے جا سکتے
چوٹ کے نشان

وہاں بھی ہوتی ہے
ایک رات
جہاں جرم ہوتا ہے
چاند کی طرف دیکھنا بھی

وہاں بھی ہوتی ہے
ایک روشنی
جہاں پابندی ہوتی ہے
پتنگوں کی خودسوزی پر
وہاں بھی ہوتی ہے

ایک دہشت
جہاں ادب کے ساتھ
قاتلوں سے اجازت مانگنی ہوتی ہے
چیخنے سے پہلے

وہاں بھی ہوتا ہے
ایک سوگ
جہاں موم بتیاں تک نہیں ہوتیں
مرنے والوں کی یاد میں جلنے
یا جلانے کے لیے

وہاں بھی ہوتا ہے
ایک 'شونیہ'
جہاں نہیں پہنچ پاتے
ٹی وی کے کیمرے!

فاطمہ حسن

ان کہی بات کا دکھ

جب بات نہیں ہوتی
کیا صبح نہیں ہوتی؟
یا رات نہیں ہوتی؟
اک دن جو گذرنا تھا
وہ کل بھی تو گذرا تھا
جو آج گذرنی ہے
جو آج گذر جائے
ساکت ہیں کہاں گھڑیاں؟
جامد ہے کہاں ساعت؟
بجھ جائیں گے سب تارے
اُبھرے تو ذرا سوچ
تب ہوگی اسے فرصت
کچھ حال سُنانے کی
اک ریت نبھانے کی
رسمی ہی سہی اس دم
کیا بات نہیں ہوگی؟
اور بات نہ ہونے سے
کیا رات نہیں ہوگی؟
چُھپ جائے گا یہ سورج
نکلیں گے سبھی تارے
آنکھوں کو کتابوں کے
صفحات پہ رکھ دوں گی!
اک سادہ سے کاغذ پر
اس بات کو رکھ دوں گی!

بدلتے موسم کے فاصلے سے

سرما کی اک شام
مجھ کو خواہش چائے کی
سڑک کنارے
اک رستوراں میں لے آئی
چھوٹا سادہ چائے خانہ
جس میں بیٹھے سارے گاہک
باتوں میں مصروف
اک ٹیبل پر تنہا عورت
ٹھنڈی کافی سامنے رکھے
جیسے خلا میں گھور رہی تھی
میں نے سوچا
اپنی کرسی سے میں اُٹھ کر
بیٹھوں اس کے پاس
پوچھوں
کافی پینے آئی ہو
یا لمبی رات کی تنہائی
اندھیارے کمرے کی ٹھنڈک
اس گوشے کی گرمی سے
اپنے آپ کو بہلانے
یادوں میں کھو جانے کی خواہش
اس سردی میں
گھر سے باہر
کس حیلے سے آئی ہو؟
اس کی جانب بڑھی مگر میں
ٹھہر گئی
سامنے ایک آئینہ تھا
جس نے مجھ کو روکا تھا

فاطمہ حسن

فلسطینی ماں

زخم میرے ہرے ہیں ابھی
دیکھو میرے بدن پر لگے گھاؤ سب
رس رہے ہیں ابھی
غور سے ان کو دیکھو گے تو
ان کی تکلیف تم کو نظر آئے گی

یہ وہ گھاؤ ہیں جن کو مری آنکھ نے
اپنی پلکوں سے
بچوں کے تن سے چنا
اور سمویا ہے اپنے بدن کے ہراک عضو میں
ان کا مرہم نہیں۔۔۔ہائے، کوئی بھی مرہم نہیں!
کیسے ہتھیار تھے، جن سے حملہ ہوا
تن پہ بچوں کے گویا برستی تھی اک آگ سی
ان کے نازک بدن کو جھلستی ہوئی!

کتنی شدت کی تکلیف تھی
درد کی چیخ تھی
جو مرے دل میں خنجر سی پیوست تھی
اور مسیحا کوئی دسترس میں نہ تھا
کوئی مرہم، نہ کوئی دوا
میں تڑپتے ہوئے ان کے جسموں پہ کچھ بھی لگاتی تو کیا؟
کوئی چارہ نہ تھا
اس لیے میں نے مانگی دعا۔۔۔
اے خدا، اے خدا، ان کو آرام دے

ان کی تکلیف سب مجھ کو ہی بخش دے
اے خدا میں ہوں موجود، حاضر ہوں میں
ان کی تکلیف مجھ کو عطا کر، خدا
جو بھی آزار ہے میرے بچوں کو
اس سے وہ آزاد ہوں
ان کے سب دکھ مجھے بخش، میرے خدا
میں تو ماں ہوں، سبھی زخم سہہ لوں گی میں

کوئی ساعت قبول دعا کی تھی وہ!
ایک لمحے میں ساکت ہوئے سب بدن
موت کی نیند ایسی ملی
سو گئے جیسے آرام سے اس گھڑی
کوئی ہتھیار اب ان کو بیدار کرتا نہیں
کوئی آزار ان کو ستاتا نہیں!

ہاں، مگر
ان کے جسموں کے سب گھاؤ اب
میرے اپنے بدن میں اتر آئے ہیں
اتنے گہرے کہ اب عمر بھر
یہ ہرے ہی رہیں گے، بھریں گے نہیں!!!

ایوب خاور

زمیں اپنا پانی اُگل دے

زمیں
تو نے کیوں باندھ رکھے ہیں پلکوں کی نازک جڑوں سے یہ دکھ کے سمندر
اگل دے
زمیں اپنی آنکھوں کا پانی اگل دے
تری گود میں یہ جو ہم جیسے دہشت زدوں کا لہو جم رہا ہے
اسے اپنے پانی کی لہروں میں اچھی طرح گھول کر
ان کہی آرزوؤں کو
ان دیکھے خوابوں کو
بے شاخ پھولوں کی خوشبو کو اپنی رگوں میں اتار
انہیں پھر تو اپنے الوہی تبسم کے ممتا بھرے لمس میں سے گزار
کھلا پھر کسی صبحِ فردا کے دامن میں رنگِ بہار
بے حد و بے کنار
اے زمیں اپنی آنکھوں کا پانی اگل دے
یہی وقت ہے
ان مقفل دلوں والے کوفہ نژادوں کو
اپنے ابلتے ہوئے آنسوؤں کے تلاووں میں بھر بھر کے
حدِ افق سے اُدھر
وادیٔ آخرت کے کنارے الٹ دے
ورنہ یہ دشت صفت
تیرے سوکھے ہوئے ادھ کھلے ہونٹوں جیسے مساموں میں
معصوم جسموں کے اڑتے ہوئے لوتھڑوں کو اڑستے رہیں گے
ترے سبز موسم
تری کوکھ میں ہی ہمکتے رہیں گے

ایوب خاور

مون سونی رقص کے کچھ منظر

ہوا پائل بہ پا اتری ہے شاخوں میں
درختوں کی گھنی شاخوں میں
جن کے چھوٹے چھوٹے بازوؤں کو چلچلاتی
دھوپ کے ٹکڑوں نے گہری خاموشی اور
حبس کی گرہوں میں کس کر باندھ رکھا تھا
ہرے پتے جو سر نیوڑھائے اپنے ڈنٹھلوں پر
ایک دوجے کی سلگتی گود میں سر دے کے
بیٹھے تھے، ہوا کے پاؤں میں جھن جھن
جھنکتی پائلوں کی سرگمیں سن کر اچانک
کھل کھلا اٹھے
شکستہ ٹہنیوں نے ایک انگڑائی سی لی
پتوں نے پھر تالی بجا کر داد دی
یک دم ہوا کی ایڑیاں اٹھیں تو کیا
دیکھا کہ شاخوں، ڈنٹھلوں اور دھوپ
کھائے سبز پتوں نے کتھک کی چال چلتے
مون سونی رقص کا آغاز کر ڈالا
(کچھ دیر بعد)
ہوا کے بھاؤ تاؤ دیکھ کر بادل ٹھٹھکتے ہیں
اور اس کے انگبیں آنچل کی لہروں پر ذرا
جھکتے ہیں، اس کو داد دیتے ہیں، ہوا ایڑی
کے بل پر گھوم جاتی ہے
درختوں کے سبھی ہمسائے اس کے رقص میں
ہم تال بنتے ہیں اور ان جیسے کئی بچے سب
اپنے اپنے گھر کے آنگنوں میں رقص
کرتے ہیں

ہوا جب سم دکھاتی ہے تو پتے کھل کھلاتے
اور بوندوں کی سبک پائل کی جھن جھن پر
ادا سے لوٹ جاتے ہیں، درختوں میں ہوا
کے رقص پر سب رقص کرتے ہیں
(اور کچھ دیر بعد)
یہ رقصِ مون سونی تیز ہوتا ہے
ذرا دیکھیں کہ بادل کس تلاطم سے گمک کے ساتھ
مشکیزہ بکف نیچے اترتا اور تہائی پر تہائی
مارتا ہے اور ہوا سم سے نکل کر ماتروں
کی گنتیوں اور ایڑیوں کی سپتکوں میں ایک
ایسی چال سے لے دیکھتی ہے جس میں کھو
کر گرد، مٹی، پانی پانی ہوتے جاتے ہیں
(مزید کچھ دیر بعد)
درختوں اور ہوا کے مون سونی رقص میں
بارش کی ممتا، کھیت، کھلیانوں، پہاڑوں، وادیوں
آبادیوں کے اونچے نیچے سارے دیوار و در و بام
آنگنوں اور آنگنوں میں کھلنے والے پھول، کلیاں
اور سب سے بڑھ کے جانِ جاں تمہارے ہجر سے
لیپے ہوئے اس دل کا چہرہ دھو رہی ہے
کیا ہوا بھی رو رہی ہے؟

ایوب خاور

اے میرے رشکِ گلِ آتش فام

ایک آواز کی تصویر بنانی ہے مجھے
ایک آواز
کہ جس کی پرواز
رنگ در رنگ نواحِ دلِ صد خواب کے گرد
یوں خطِ لمس ادا کھینچتی ہے
اپنی انگڑائی کو آفاق کے بھیگے ہوئے کینوس پہ کہیں
جس طرح قوس قزح کھینچتی ہے
اے میری قوس قزح!
ایک آواز کی تصویر بنانی ہے مجھے
ایک دیوار گرانی ہے مجھے
ایک دیوار اٹھانی ہے مجھے
آئینے جوڑ کے ایک آئینہ خانے کو مجھے
ان لبوں کو کوئی تمثیل دکھانی ہے
جنہیں
جب صبا چومنے والی ہو تو اس سے پہلے
وہ کچھ اس طرح سے وا ہو جائیں
جیسے
غنچۂ لب اظہار کو وا کرتا ہے
اے مرے غنچہ دہن
ایک آواز کی تصویر بنانی ہے مجھے
جس کے لہجے میں فسوں بولتا ہو
جو رگِ جاں میں اتر کر مری جاں
سینۂ دل کے انا گیر مضافات میں
اک دورِ جنوں ساز کے در کھولتا ہو

ہجر اور وصال کے مابین کہیں
رقص ماہ شب پر پیچ کے پر کھولتا ہو
اے مرے رشکِ رُخِ ماہِ تمام
ایک آواز کی تصویر بنانی ہے مجھے
جس کے رخساروں کی لَو
زُلف شب زاد کی پرتوں سے مجھے جھانکتی ہو
مجھ سے اکثر جو مرا حسنِ نظر مانگتی ہو
دل کی تختی پہ اسی لو کے خطوط
ناخنِ گل سے بہ اندازِ دگر کھینچتی ہو
اے مرے رشکِ گلِ آتش فام
ایک آواز کے چہرے پہ غزال آنکھیں بنانی ہیں مجھے
اور یہ بات بتانی ہے تجھے
بات کرتے ہوئے جب پلکیں جھپکتی ہوں وہ آنکھیں
اس وقت
شام اور صبح کے رنگ
دونوں رنگ اس کی سخن ساز نگاہوں میں گلے ملتے ہوں
اے مرے رشکِ غزالِ رم ساز
میں نے دیکھے ہیں وہ رنگ اور وہ ڈھنگ
جب وہ آواز مرے کانوں میں رس گھولتی ہے
حالتِ رقص میں اکثر مرے دل کی تہہ میں
جب وہ سانسوں کے بھنور کھولتی ہے
اس کی ایک ایک ادا بولتی ہے

ممتاز اطہر

زمیں کا قرض بڑھتا جا رہا ہے

زمیں کا قرض بڑھتا جا رہا ہے
زمیں، جس میں
ہم اپنے خواب کی قلمیں لگاتے ہیں
بہت زرخیز ہے اور مہرباں ہے
زمیں اپنے سبھی موسم
نمو کی وسعتوں کے ساتھ
ہم کو دان کرتی ہے

زمیں کتنی دیالو ہے
ہمارے حوصلوں کو
اپنی چھاتی کھول کر خوراک دیتی ہے
ہمارے خواب کو تعبیر کی پوشاک دیتی ہے
اور اپنی ذات میں پوشیدہ سارے ہی خزینے
(جس قدر ہم چاہتے ہیں)
سونپ دیتی ہے

زمیں بارش کی خواہاں ہے
مگر اس پر کوئی آنسو گرے
اس کو بڑی تکلیف ہوتی ہے
زمیں اس دُکھ پہ کتنی دیر روتی ہے
فقط یہ آسماں ہی جانتا ہے
زمیں اکثر
ہوا سے، بادلوں سے، دُھوپ سے
اور آسماں سے بات کرتی ہے
ہمارے واسطے اکثر دُعا کو ہاتھ اُٹھاتی ہے

زمیں خواہش بھی کرتی ہے
اسے چاہت بھی ہوتی ہے
پرندے، پانیوں کے آئینے اور سبز منظر،
اس کی چاہت میں

زمیں پُر امن رہنا چاہتی ہے
زمیں کو پھول، بچے اور ستارے اچھے لگتے ہیں
لہو اچھا نہیں ملتا
زمیں نفرت نہیں کرتی
اسے کوئی ستم اچھا نہیں لگتا
زمیں زندہ حوالہ ہے
ہم اس کی چاہتیں اور خواہشیں
منسوخ کر کے کس طرح خوش رہ سکیں گے
زمیں کا قرض بڑھتا جا رہا ہے

ممتاز اطہر

خوابوں کی بے ترتیبی

بچپن میں اِک گیند
کسی دیوار سے لگ کر لوٹ آتی تھی
ٹوٹے ہوئے کتنے ہی تارے
روز، ذرا سی دُوری پر
پھر...... چَھم چَھم کرتے آ جاتے تھے
اور ہم اُن کی رنگ بہ رنگی روشنیوں میں
بکھرے ہوئے خوابوں کو
اِک ترتیب میں رکھتے
تب ہم اتنا ہی سمجھے تھے
موسم جیسے لوٹ آتے ہیں
سب کچھ ویسے لوٹ آتا ہے

پھر جب ساون مٹی کے ذرّوں سے
میل کی خواہش کرتا
اپنی آنکھوں کے سب موتی
اُس کے پاؤں دھرتا
مٹی اپنی ست رنگی انگڑائی لیتی
اور پلکوں سے اُس کے سارے موتی چنتی
تپتے ہوئے جسموں کی خوشبو
چاروں اور بکھرتی
اور زمانے،
خوشبو کے نشے میں ڈولتے پھرتے
ہم بھی اپنے سینوں اندر مدرا گھولتے پھرتے
تب ہم کو معلوم نہیں تھا

مٹی سے مٹی کا میل ہی دیواروں کو
گربھوتی کرتا رہتا ہے
اِس کارن ہی اندر، باہر
اور خوابوں کے ملبے اُوپر
دیواروں نے دیواروں کو جنم دیا ہے
چاروں جانب حدِ نظر تک
دیواریں ہی دیواریں ہیں
جیون کے جتنے رستے تھے
سب کے سب مسدُود ہوئے ہیں

اب اِس عمر کے یخ بستہ سنّاٹے اندر
خواب اور خواہش کے ریشم سے
لمحوں کی اِک گیند بنا کر،
دیواروں پر مار رہے ہیں
اتنا تو ہم جان چکے ہیں،
بیتی عمر کے سندر لمحے، شیتل موسم
بچپن کی دیوار سے لگ کر لَوٹنے والی گیند نہیں ہیں
پھر بھی اکثر
دیواروں میں دَر کی خواہش
تھکے ہوئے ہاتھوں کی شریانوں اندر
تاابن کر چَھم چَھم کرتی جاتی ہے
یخ بستہ جسموں میں کوئی آگ سی بھرتی جاتی ہے
اور خوابوں کی بے ترتیبی

شاید تُو نے ٹھیک کہا ہے

شاید تُو نے ٹھیک کہا ہے
آج نہیں تو کل ہم سب کو بالآخر مر جانا ہے......
ہستی کا وردان بھی کیا ہے؟
یگ یگ جلتے خواب گھروندے
نرگسی آنکھیں، شبنمی گال اور رُوپ سنہرا؟......
ہنستے ہوئے گالوں میں پڑنے والے گڑھے پر
اُڑتے اُڑتے کوئی تتلی آ بیٹھے تو
ایک ہی پل میں
صندل کے برفاب جزیرے میں وہ آگ بھڑک اُٹھتی ہے
جس کو بجھانا ناممکن ہو جاتا ہے......
لیکن تُو نے ٹھیک کہا ہے
آج نہیں تو کل ہم سب کو بالآخر مر جانا ہے......

شبِ رفتہ کے پہلو میں

شبِ رفتہ کے پہلو میں
سلگتی تھی کوئی خوشبو
مرے چاروں طرف بے نام ہالہ تھا
رُخِ مہتاب پر تیرے محبت کا اُجالا تھا
کسی گُم گشتہ جنت کی طرف تُو جانے والا تھا
طلسمِ روز و شب سے بھی فزوں تر تھا ترا جادو
شبِ رفتہ کے پہلو میں
سلگتی تھی کوئی خوشبو......

رنگ، خوشبو، ذائقہ، آواز کیا ہے؟

رنگ، خوشبو، ذائقہ، آواز کیا ہیں؟
اور ہمارے لمس کے اسرار کیا ہیں؟
یہ معمہ اس جنم میں تو
ہماری سرحدِ ادراک سے باہر رہے گا
اب تمہیں جو خوبصورت کہہ رہا ہوں میں
تو یہ شاید کسی آسودہ/ ناآسودہ خواہش کا ہی پرتو ہے
ہمارے تجربے میں
وقت، خوشبو، خوبصورت عورتیں
سب کچھ اضافی ہیں
مگر پھر بھی، اُلوہی خامشی میں نغمۂ نایاب سنتے ہیں
چلو اِک خواب بُنتے ہیں
چلو کچھ روشنی کے پھول چُنتے ہیں

وحید احمد

Master key

(محمود احمد قاضی کے افسانے بند گلی سے ماخوذ)

نیا گھر جب کرائے پر لیا
تو وہ بہت ہی گونجتا تھا
اور دیواروں سے اٹھتی نرم سیلن میں ٹھٹھرتا تھا
اچانک میں نے کیا دیکھا
کہ پچھلے صحن کی دیوار میں اک بند دروازہ ہے
جس کے ایک پٹ پر
کج لکھائی سے کسی کے ہاتھ نے اتوار لکھا ہے
بڑی مشکل سے میں نے شاہ کنجی زنگ خودہ قفل
میں ڈالی
تو وہ اک آہ بھر کے کھل گیا
اندر ذرا سا گھومتا کمرہ تھا
میں داخل ہوا
تو سامنے اک پیر دروازہ تھا
وہ بھی بند تھا
پھر شاہ کنجی قفل میں ڈالی
تو وہ سسکی سنا کے کھل گیا
اندر ذرا سا گھومتا کمرہ تھا......
میں نے اس طرح قوسوں میں چلتے
آہ، سسکی، بے خودی
مستی، تباہی، کھلکھلاہٹ
اور پتھرائی ہوئی یکسانیت کے سات دروازوں کو کھولا
اور مجھ کو دیکھ کر حیرت ہوئی
میں پورا چکر کاٹنے کے بعد
پھر سے پہلے دروازے کے آگے ساکت و جامد کھڑا تھا
اور اس پر زنگ خوردہ قفل تھا!

وحید احمد

کہانی آئینہ پرداز آتی ہے

یہاں جب چاند چڑھتا ہے
تو ٹھہری جھیل کے سیماب میں پریاں اترتی ہیں،
پہاڑی راستے پر
میں کہانی کے سہارے چڑھ رہا تھا
چیت کے چکنے مہینے کی پھسلتی شام تھی
اور لاجوردی آسماں نیلوفری پھیلائے چھدرے بادلوں سے کھیلتا تھا
ٹپکتے برف کے تودے کے پہلو سے گزرتے وقت
اک گرتے ہوئے قطرے نے مجھ کو راستہ سمجھایا
"بس پہنچے کہ پہنچے
اب تو اک بالشت بھر کا فاصلہ باقی ہے
اور سیف الملوک آگے پڑی ہے
راہ تکتی ہے۔"
مگر پتھر کی یہ بالشت تو میلوں پہ حاوی تھی
ہتھیلی پر چُنے سنگِ سلیمانی کے آگے
سنگِ لرزاں کی سرابی انگلیاں پھیلی ہوئی تھیں
ڈھلانوں میں کہیں افتاں
چڑھائی میں کہیں خیزاں
میں آخر جھیل پر پہنچا
تو پریوں کے پرے پھیلے ہوئے تھے
اک پری
جھلتے پروں سے عین میرے سامنے آ کر معلق ہو گئی
جب جھیل ٹھہری تھی
مگر پتھر بدن سے میری مٹی اڑ رہی تھی

"پری!
تُو خیر، نیکی، روشنی، الہام اور وجدان کا اڑتا مرقع ہے
فرشتوں اور انسانوں کا باہم رابطہ ہے
مری سوچوں میں گانٹھیں پڑ گئیں ہیں
پری!
تُو ریشمی پوروں سے ان کو کھول دے۔"
وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی مانوس لرزش سے
تو میں بولا
"بہت خوب!! آپ تو اردو میں ہنستی ہیں"
تو اس نے مدھ آواز میں پوچھا
"وہ آخر کون سی گانٹھیں ہیں؟
آخر ہم بھی تو دیکھیں۔"
تو میں نے اپنی گرہوں کا پلندا اس کے آگے رکھ دیا۔

....

بولا
"اگر دن چمچماتا ہے
تو شب تاریک اٹھتی ہے
اگر ایمان سلگاؤں
ہوا جھونکے لگاتی ہے
دھواں آنکھوں میں چبھتا ہے
اور اس کے بعد بھک سے آتشِ تشکیک اٹھتی ہے
اگر پاؤں اٹھاؤں
راستہ مسدود ہوتا ہے
زمیں پھٹتی ہے

اک دیوار گاہے دور اٹھتی ہے
گہے نزدیک اٹھتی ہے
اگر رشتے بناتا ہوں
تو لفظوں سے بساند آتی ہے
اور تارِ نظر سے کاٹتی تضحیک اٹھتی ہے
اگر بوتا ہوں دنیادار بیجوں کو
تو میری پھولتی پھلتی زراعت خشک سالی میں چلی جاتی ہے
اور شاخِ جہاں داری بہت باریک اٹھتی ہے
مرے سکے پگھلتے ہیں
مرے کشکول میں اتنی دراڑیں ہیں
کہ وہ ناسور بن کے رستا رہتا ہے
مرے پاپوش گیلے ہیں
مرے پاؤں سے گہری کہر بن کے سنسناتی بھیک اٹھتی ہے۔

وحید احمد

یہ لرزیدہ سراب اوڑھے ہوئے تشکیک کا برزخ
یہ میٹھی نہر کی جنت
یہ شعلوں سے بھرا دوزخ
یہ یومِ حشر، جلتی تار سے لٹکا سوا نیزے پہ آیا ہانپتا سورج
یہ دو دُنیاؤں کی چیخ چیخ
یہ سب انسان کے اندر ہوا کرتے ہیں
اور تم
ان کو باہر ڈھونڈتے رہتے ہو
خوابوں کے سرابوں سے بنی مبہم شبیہوں میں
کتابوں میں کھنچی اور کھینچتی آڑی لکیروں میں

وحید احمد

تمہارا مسئلہ یہ ہے
کہ تم کو آئنے میں جھانکنا اب تک نہیں آیا

تمہیں معلوم ہے
کہ آئنہ اک روزنامہ ہے
بہت کم لوگ ہیں
جو رات کو سونے سے پہلے
آئنے کے سامنے آ کر کھڑے ہو جائیں
اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھیں:
'بتا!
زنگار کے اوپر چمکتی سچی سچائی
ترے سیمیں کٹہرے میں کھڑا ہوں
پاؤں دھرتی پر جما کر
اور خود کو منعکس کر کے میں تجھ سے پوچھتا ہوں
بول اے ہمزاد!
''میرے آج کے گزرے ہوئے دن کا مکمل زائچہ کیا ہے؟؟'
بولی:
تمہارا عکس بولے گا
کہ چہرہ آگ میں جھلسا ہوا ہے
یا
روپہلی روشنی سے تمتماتا ہے
تسلی سے رہا کیجے.....!
مری جاں! آئنہ اک روزنامہ ہے
اسے ہر شب پڑھا کیجے''

مری سوچوں کی گانٹھیں کھل رہی تھیں
میں ہر لمحے سنورتا جا رہا تھا
پہاڑی راستے پر
میں کہانی کے سہارے
چاند وادی میں اترتا جا رہا تھا

تنویر انجم

جب بارش نہیں ہوتی

سوکھ جاتی ہیں فصلیں
پڑ جاتا ہے قحط
جب بارش نہیں ہوتی

چھا جاتی ہے دھول
میلا لگتا ہے جنگل
جب بارش نہیں ہوتی

لگ جاتی ہے آگ
جل جاتی ہیں جھاڑیاں
جب بارش نہیں ہوتی

بجلی نہیں بنتی
چھا جاتے ہیں اندھیرے
جب بارش نہیں ہوتی

بجھ جاتی ہیں امیدیں
پانی سے محروم
محصور قلعے کی
جب بارش نہیں ہوتی

دوڑتے ہیں سپاہی
جنگ کے میدان میں
خون بہتا ہے
جب بارش نہیں ہوتی

اڑ جاتا ہے قافلہ
گر جاتا ہے تخت
جب بارش نہیں ہوتی

اپنے وقت پر

تنویر انجم

ہماری اور تمھاری زبانیں

کیوں نہیں رکھے ہماری زبان میں تم نے
وہ سارے الفاظ
جو موجود ہیں تمھاری زبان میں
کیوں نہیں بناتے
ہماری زبان کے لیے
نئے نئے الفاظ
اپنی زبان سے لے کر
یا سکھادو ہمیں اپنی زبان، بہترین زبان
اور اس کے الفاظ، بہت زیادہ الفاظ
تاکہ ہم بیان کرسکیں
اپنے سارے جذبات
محبت، نفرت، نرم دلی، غصہ وغیرہ وغیرہ
ایسے ہی سکون کے ساتھ
جیسے تم کرتے ہو

بہت ڈرتے ہو
کہیں ہم تمھیں تمھارے پیچھے گالیاں دینے کے بجائے
تم سے سکون سے
تمھارے بالکل سامنے
تمھارے انداز میں
بیان نہ کردیں
وہ سب کچھ
جو تمھارے خیال میں ہم جانتے ہی نہیں

مگر ڈھونڈ لو ہمارے لیے الفاظ
اپنی زبان سے
یا سکھادو ہمیں اپنی زبان
تمھیں ڈرنا چاہیے
کہیں ہمارے ہاتھ نہ آ جائے
گالیوں کی جگہ
تمھارا اسلحہ

تنویر انجم

وہ کہیں نہیں بھاگ سکے

وہ کہیں نہیں جا سکے
اس ملک کو چھوڑ کر
یا اس شہر کو
یا اس محلے کو
یا اس گلی کو
یا ان مکانوں کو

وہ کہیں نہیں بھاگ سکے
اور انھیں ان کے مکانوں سے نکال کر
دس دس کی تعداد میں
دیوار کی طرف منھ کر کے کھڑا کیا گیا
اور گولیاں چلا دی گئیں

اس نظارے کے گواہ
اذیت اور خوف سے نیم مردہ
نیم بے ہوش گر پڑے
اور وہ جنھوں نے یہ کہانی صرف سنی
وحشت سے ایک پوری رات سو نہ سکے
اور کچھ دوسرے
بے یقینی سے سر کو جھٹکتے ہوئے
ضروری کام کو اختتام تک پہنچانے میں
مصروف رہے

نیلما درانی

وادیٔ کیلاش

میں کافر ہوں
مجھے خوشبو بھری وادی بلاتی ہے

جہاں کرنیں اُترتی ہیں
تو دھرتی رقص کرتی ہے
جہاں جھرنے مچلتے ہیں
فضائیں گنگناتی ہیں

جہاں نفرت نہیں ہوتی
جہاں قاتل نہیں ہوتے
جہاں غربت تو ہوتی ہے
مگر مجرم نہیں ہوتے

وہ وادی ہی تو جنت ہے
محبت ہی عبادت ہے
جہاں سب لوگ رقصاں ہیں
خوشی کے رنگ میں ڈوبے
سراپا نور سب چہرے
بس اپنی دُھن میں رقصاں ہیں

خوشی بھی رقص ہے ان کا
غمی بھی رقص ہے ان کا
وہ اُلفت بھی مناتے ہیں
وہ فرقت بھی مناتے ہیں
وہ کافر ہیں
مگر اب بھی حسیں جنت میں رہتے ہیں
میں کافر ہوں
مجھے خوشبو بھری وادی بلاتی ہے

اقتدار جاوید

روپوش ہونے کا دن

اُفق والے تہہ خانے سے
وہ برآمد ہوا دن
جو قرنوں پہ بھاری ہے
آنکھوں کے آگے
اندھیرے کا غلبہ
گراتا ہے
جو ہر طرف گھیرا بناتا ہے
ہیبت بڑھاتا ہے
مخبر
بڑے آتشی شیشے سے
راستوں کا گھنا جال
تکتا ہے
سکتہ ہے
بھر
تغار کے نیچے
قدم کے نشاں کو
چھپایا ہوا ہے
لحد کی ذرا سی جگہ پر
فلک زار گنبد
بنایا ہوا ہے
گھروں کی چھتیں
اڑنے
بجلی کڑکنے
معاً قرص خورشید چھپنے

سفید بھرے آسمانی کنارے کے
تاریک ہونے کا دن
آ گیا ہے
شرارت سے سرشار
بہنوں کے خاموش ہونے کا
اور
ماں کے بے ہوش ہونے کا دن
آ گیا ہے
مری ماں
مری ان کہی باتیں
ایسے سمجھتی تھی
داؤدؑ
جیسے پرندوں کی باتیں سمجھتا تھا
ماں کی محبت بھری گود
آٹے کا پیڑا تھی
جب میں ہمکتا
تو
ماں کی محبت بھری گود
ایسے پگھلتی تھی
داؤدؑ کے ہاتھ میں
جیسے لوہا پگھلتا تھا
میں ٹوٹتا
تو حرارت بھری گود میں
ایسے جڑتا تھا
سارہ کے خاوند کی آواز پر

جس طرح
مرغ جڑتا تھا
اور
دل تشکر سے بھرتا تھا
سارہ کے خاوند کا دل
ان پہاڑوں کے پیچھے
کہیں پر
صفا اور مروہ نہیں تھی
جہاں
ماں مری دوڑ سکتی
پھٹے ناخنوں اور
رعشہ زدہ جسم سے
وہ محبت بھرے گرم پانی'
چمکتے ہوئے آنسوؤں جیسے پانی کی
خواہش میں
کیسے کنواں کھود لیتی
جہاں پر
نہ پانی کی روشن جبیں تھی
نہ پانی تھا
میں نے کہا تھا
کہ ماں
میرے لوہے کی صوررت پگھلنے
مرے
مرغ کی طرح
ٹکڑوں میں تقسیم ہونے کا دن
آ گیا ہے
زمانوں تلک
تیرے رونے کا
بہنوں کے خاموش ہونے کا
اور
مرے روپوش ہونے کا دن
آ گیا ہے!!!
اچانک
مجھے اک سپنا جگاتا ہے
آرام سے
دستبردار کرتا ہے
وحشت بڑھاتا ہے
میں
رات کے سارے کھونٹوں کی جانب
نکلتا ہوں
اور
آخری گھونٹ میں
بیٹھ جاتا ہوں
کہتا ہے مجھ سے کوئی
تیرے کپڑے اتاروں گا
سیال آتش سے
تجھ کو گزاروں گا
یک دم
مرے بال بڑھتے ہیں
ٹخنوں کو چھوتے ہیں
میں خود سے کہتا ہوں
مہکار اڑاتے ہوئے
ریشمیں بال
کتنے اچھوتے ہیں
اعضاء مرے
جھڑنے لگتے ہیں
نیچے سے
عورت ابھرتی ہے

مستی میں ڈوبی ہوئی
ایک عورت
میں بٹتا ہوں
دو ٹکڑوں میں
تھوڑا بڑھتا ہوں آگے
ذرا پیچھے
ہٹتا ہوں
اس سے لپٹتا ہوں
میں ہانپ جاتا ہوں
اور ہانپتے ہانپتے
کانپ جاتا ہوں
سانسوں کا محشر اٹھاتا ہوا زیر و بم
جیسے
زیر و زبر ہوتا ہے
اور
کوئی ساتھ میرے
بڑی دیر تک سوتا ہے
آخر
اٹھتا ہوں
اٹھ کر
اٹھاتا ہوں
مستی میں ڈوبی ہوئی کا جنازہ
وہیں اس کی
تجہیز و تکفین کرتا ہوں
تجہیز و تکفین کرتے ہوئے
اس کی توہین کرتا ہوں
گہری گھنی نیند میں
اس کی تدفین کرتا ہوں
مٹی اٹھاتا ہوں

اس کی لحد پر گراتا ہوں اور جاگ جاتا ہوں
صدیوں کی لمبی مسافت سے
ہٹتا ہوں واپس
میں لہروں کی صورت
سمندر کی جانب
پلٹتا ہوں واپس
سنبھلتا ہوں
تھوڑا سا چلتا ہوں
اعضاء کو تکتا ہوں
اعضاء
کہ جن سے
مری نسل چلتی ہے
بانسوں کے جنگل میں
بانسوں کو
اک راکھ کی مٹھی
کرتی ہوئی
آگ جلتی ہے
میں
سانس کو کھینچتا
ناف تک
لے کے جاتا ہوں
سارے خیالات سے
جیسے آزاد ہوتا ہوں
اور چین کی نیند سوتا ہوں
اور جان جاتا ہوں
نر اور مادہ کے اوصاف سے متصف
میرے کھونٹوں میں پھیلی ہوئی رات ہے
رات سے کھیلتی
میری دو جنیا ذات ہے!!!

اقتدار جاوید

بارش برستی ہے

دریا کنارے پہ
پھولوں کی بستی ہے
پھولوں کی بستی ہے
بارش برستی ہے
دن سرمئی ہونے لگتا ہے
نیلے افق والی
نیلا افق گھیر لیتی ہے

جب
اپنے کمرے سے باہر نکلتی ہے
اک آگ جلتی ہے
آنگن میں
لیموں کے پودے کی شاخیں
ہلاتی ہے
کیسی وہ قوت کا منبع ہے
کیسی وہ جادوئی ہستی ہے
لیموں کے پودے پہ
بارش برستی ہے
بارش میں گاتی ہے
چھینٹے اڑاتی ہے
دفتر پہنچتی ہے
سردی کی صبحوں میں
شیشے کے کیبن میں
کافی بناتی ہے
کافی بناتے ہوئے
تھوڑا ہنستی ہے
شیشے کے کیبن پہ
بارش برستی ہے
جب رات ہوتی ہے

لفظوں کے جھرمٹ میں
نظموں کی شکلیں بناتی ہے
نیندوں کی نرمی میں
سپنے جگاتی ہے
سپنوں میں جنگل
اگاتی ہے
جنگل میں

گہرا اندھیرا ہے
موروں کی مستی ہے
موروں پہ بارش برستی ہے
جب صبح ہوتی ہے
سپنوں کے جنگل سے
واپس پلٹتی ہے
بارش کی رسیا پہ
چمکیلے رستوں پہ
چمکیلی اشیاء پہ

تادیر
بارش برستی ہے

جب
صبح ہوتی ہے
سپنوں کے جنگل سے
نیلے افق والی
واپس پلٹتی ہے
بارش کی رسیا پہ
چمکیلے رستوں پہ
چمکیلی اشیاء پہ
تادیر بارش برستی ہے

سعود عثمانی

حلیف

اور پھر میرے اس دوست بچھو نے مجھ سے کہا
تم مرے دوست ہو
انتہائی محبت ہے تم سے مجھے
یہ محبت تھی اور میری اپنائیت تھی تمہارے لیے
اور تمہاری مری دوستی کی قسم
یہ ہمیشہ ہمیشہ پہنچتی رہے گی تمہیں
چند مفسد تعصب بھرے لوگ اس پیار کو ڈنک کہتے بھی ہیں
اور انتہائے جہالت تو دیکھو کہ ایسا سمجھتے بھی ہیں
ایسے شدت پسندوں درندوں سے نفرت مجھے بھی ہے اور
چونکہ تم دوست ہو
تم پہ لازم ہے ان کی شقاوت کا اعلان کرتے رہو

میں نے بازو سے اٹھتی ہوئی ٹیس کو
انتہائی اذیت میں برداشت کرتے ہوئے
اپنے محبوب بچھو سے ہنس کر کہا
کیوں نہیں، کیوں نہیں
یہ محبت بھری دوستی
دونوں مل کر نبھاتے رہیں
خواہ کتنی ہی تکلیف اٹھاتے رہیں
پوری انسانیت کی بقا کے لیے
میرا یہ کرب تو مجھ کو مہمیز ہے
امن اور آشتی کی فضا کے لیے
میں تو بچے بھی قربان کرنے کو تیار ہوں
درد کیا چیز ہے

تعارف کرانا پڑے گا

تعارف کرانا پڑے گا؟
مجھے بیس پچیس برس دور ماضی میں جا کر
یہاں پھر سے آنا پڑے گا
تعارف کرانا پڑے گا
گزشتہ خدوخال اور حال کو جوڑ تا پل بنانا پڑے گا
میں اس راستے سے گزرنا نہیں چاہتا ہوں
جو دل میں نے برسوں چھپا کر رکھا تھا
وہ پھر سے دکھانا پڑے گا
زمانہ کسی کو بھلا بخشتا ہی کہاں ہے
اور اس راستے میں زمانہ پڑے گا

سعید احمد

طلسمی صبح کی چڑیا

(۱)

یہاں باغوں میں پھیلی سرمئی سی انتظاری دھند میں
اوجھل ہے پیاسے پانیوں کا ایک چشمہ جو درختوں میں
ہوا کی سرسراہٹ کے بجھے نغمے کی بابت پوچھتا ہے، دیکھتا
ہے ایک لڑکی سر پہ گاگر لے کے اٹھلاتی ہوئی آتی ہے تیری
ہم قدم، جس کے بدن کی لہر کے احساس ہی سے منجمد دریا پگھلتے تھے
اور اب تم ہو نہ وہ لڑکی نہ پیڑوں میں ہوا کی
سرسراہٹ کے وہ دیپک راگ جو اک آگ، ٹھنڈی
آگ کی سلگاہٹوں سے زندگی کی بھیک دیتے تھے
تمہاری یہ جلا وطنی کی رت خود ساختہ ہے یا کہ جبری
سرمئی سی دھند میں واضح نہیں کچھ بھی، تمھارا گھونسلہ
اب کونسی نیلاہٹوں کی وسعتوں میں ہے وضاحت
کون دیتا ہے یہاں باغوں میں اک بے رنگ ساعت
کا اجارہ ہے کہاں پر گھونسلہ آخر تمہارا ہے
نہ جانے تم جلا وطنی کے کس موسم کی شاخوں پر
چہکتی ہو خبر ملتی نہیں سب نشریاتی رابطے منقطع ہیں

(۲)

زمانوں کی مشقت توشہ دانوں میں سنبھالے میں وہاں
پہنچا جہاں کے آسمانوں کی قدیم آرائشی چھت کے تلے
وہ منتظر تھی جس کے آنکھوں کے گلابوں کی کھلی
کلیوں میں اگتی تھیں ہزاروں تتلیاں، ست رنگ
طائر جسم کی پاگل مہک میں سانس لیتے زندگی کرتے
ہوائیں حیرتوں کی سنسناتی تھیں مرے چاروں طرف
جب جادوئی آواز میں اس نے کہا گاؤں کے
سارے لوگ میرے آئنے کے عکس سارے
ہو بہو میرے ہی جیسے ہیں، طلسمی دھند کے
گہرے سمندر میں کھڑے وہ پیڑ سارے روشنی کے
استعارے جن کی سرشاری ہری فصلوں
میں بہتے نقرئی پانی پہ لہریں سی بناتی تھی
ہوا میں جھومتے دل منظروں کی پیاس کے
نشے میں ڈوبے دل جنہیں کلہاڑیوں، تیشوں
کے واروں کی عجب تاریخ کے بارے میں
اک نکتہ برابر علم بھی کچھ خوش نہ آتا تھا
نہیں معلوم کیسے وقت کا دریا وہاں بہتا
تھا گاؤں وہ کہاں آباد تھا باسی وہاں کے
کون تھے اور کون تھا میں گمشدہ چڑیا
وہاں کیوں کر چہکتی تھی

جواز جعفری

قسم اُس آگ کی

قسم ہے اس خونی صحرا کی
جہاں فصلوں کی جگہ سر اگتے ہیں
قسم ہے اس جنگجو قبیلے کی
جہاں قانون کی بجائے سردار کا حکم چلتا ہے
قسم ہے اس سرزمیں کی
جہاں انسانوں سے ہندسوں کا کام لیا جاتا ہے
قسم ہے اس دشت کی
جہاں بادیہ نشیں اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں
قسم ہے گتھم گتھا لشکروں کی
جو ایک ہی باپ کی اولاد ہیں
قسم ہے جنگ کی صفیں الٹتے نجیب الطرفین گھوڑوں کی
جن کا سلسلہ نسب ان کے سواروں کی انگلیوں پر رقم ہے
لشکر کی پشت پر ہانپتے سفید اونٹوں کی
جن کی خمیدہ کمر پر بیٹھی دف بدست عورتیں
میدان میں پیٹھ دکھانے والوں کو جنگ پر اکساتی ہیں
قسم ہے گردن کے پیچھے باندھی گئی گلابی ہتھیلیوں کی
جن کے حصے کی مہندی اپنی شاخوں پر مرجھا رہی ہے
قسم ہے پہاڑ پر جلائی گئی آگ کی
جو انتقام کی آگ کو سرد نہیں ہونے دیتی
قسم ہے اس آگ کی
جو جنگ کا نقارہ بجاتی ہے

قسم ہے اس آگ کی
جس کی زباں صرف حلیف قبیلہ سمجھتا ہے
قسم ہے اس آگ کی
جو محاذ جنگ سے آنے والے زخمیوں میں شفا بانٹتی ہے
قسم ہے اس آگ کی
جو مار گزیدہ کو زہر سے نبھا کرنا سکھاتی ہے
قسم ہے اس آگ کی
جس کے کچھ کوئلے
مجرم کو مارے گئے تازیانوں میں دہکتے ہیں
قسم ہے اس آگ کی
جسے سگ گزیدہ کے روبرو روشن کیا گیا
قسم ہے اس آگ کی
جسے پردیس جانے والوں کے فراق میں جلایا گیا
قسم ہے اس آگ کی
جو سفر سے لوٹنے والوں کا استقبال کرتی ہے
قسم ہے اس آگ کی
جسے شیر کے خوف سے دہلتے ہاتھوں نے جلایا
قسم ہے اس آگ کی
جس پر وفاداری کی قسمیں کھائی گئیں
قسم ہے اس آگ کی
جو بارش کا سندیسہ لاتی ہے

قسم ہے اس آگ کی
جو ہر قسم کی آگ سے زیادہ عزت والی ہے
قسم ہے خیمے کی جلتی چوب کی
جو میزبانی کی نئی تاریخ رقم کرتی ہے
قسم ہے اس خوشبودار آگ کی
جو بھٹکے ہوئے اندھے مسافر کو
دسترخوان کا سراغ دیتی ہے
قسم ہے اس پانی کی
جو زمین و آسمان کے درمیان بہتا ہے
قسم ہے زیرِ زمین پانی کی
جو زمین پر پرورش پانے والی زندگی کی ماں ہے
قسم ہے ابلتے چشمے کی
جس کے کنارے سرِ شام داستانیں جنم لیتی ہیں
قسم ہے شفاف تالابوں کی
جو اجنبی قافلوں کی میزبانی کرتے ہیں
قسم ہے بارش کے پانی کی
جو بنجر زمینوں کو پھر سے حاملہ کرتا ہے
قسم ہے آنکھوں سے بہتے پانی کی
جو بربادِ محبت کی داستاں کا دیباچہ لکھتا ہے
قسم ہے نالی میں بہتے پانی کی
جو کمزور زندگی کی پرورش کرتا ہے
قسم ہے ٹھٹھرتے ہوئے دن کی
جو اپنے سورج سے بچھڑنے والا ہے
قسم ہے ستاروں سے خالی رات کی
جس کے دم توڑتے ستارے کہکشاؤں سے جھڑ جھڑ کر
کائنات کے ابدی خطوں میں گر رہے ہیں
قسم ہے ان بلند پرواز پرندوں کی
جو بلند پایہ شاعروں کے تخیل میں اڑتے ہیں
قسم ہے ان سرپھرے چراغوں کی
جو تاریخ کی راہداریوں میں روشن ہیں
قسم ہے گنبدِ آسماں کی
جو ایک روز خاک پر آ گرے گا
قسم ہے راستہ تکتی چراہ گاہوں کی
جن کے چرواہے صبح کی غارت گری کا رزق ہوئے
قسم ہے ایڑی سے پھوٹتے چشموں کی
جن کے کنارے پنہاریوں کے وعدے پڑے ہیں
قسم ہے لمس کو ترستی ان اداس عورتوں کی
جس کے محبوب مردوں نے (قسم کی پاسداری میں)
انہیں خود پر حرام ٹھہرالیا
قسم ہے ان سرخ اونٹنیوں کی
جو تاوان کی خاطر دشمن قبیلے کی طرف ہانکی جارہی ہیں
قسم ہے خوشبو سے بھرے اس پیالے کی
جس پر ایک ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی گئیں
قسم ہے اس میلے کی
جہاں سرخ خیمے کے روبرو شاعری ترازو میں تلتی ہے
قسم ہے اس میلے کی
جہاں اعلیٰ نسبی سرخرو ٹھہرتی ہے
قسم ہے اس بازار کی
جہاں بدترین دشمن ہتھیاروں کے بغیر گھومتے ہیں
قسم ہے سنہرے قلم سے لکھے حرف کی

جسے مقدس دیوار پر آویزاں ہونے کا شرف ملا
قسم ہے تازہ کھودے گئے اس گڑھے کی
جس کے کنارے جنم دی گئی بیٹیاں
صرف ایک سانس کی روادار ٹھہریں
قسم ہے اس تشبیب کی
جو ایک اور جنگ کا پیش خیمہ بنی
قسم ہے اس شاعر کی
جو اپنی ماں کے حسن کی تشبیب کرتا ہے
قسم ہے اس شہر کی
جہاں ہر کسی کے لیے امان ہے
قسم ہے اس پہاڑ کی
جس کے غار روشنی بانٹتے ہیں
قسم ہے ان ستارہ گر آنکھوں کی
جو پناہ گزیں کیمپوں میں پڑی آنسو بہا رہی ہیں
قسم ہے ان چاند جیسی پیشانیوں کی
صبح جن پر خون سے تلک لگاتی ہے
قسم ہے ان کنول جیسے پاؤں کی
جو اجنبی سرزمینوں پر مہاجرت کے دکھ سہہ رہے ہیں
قسم ہے اس ریاست کی
جس کی گلیوں کو شورشوں کا سامنا ہے
قسم ہے اس ملک کی
جو زمین کے سینے کا ناسور ہے
قسم ہے ان مغرور بادشاہوں کی
جلاوطنی جن کا تعاقب کر رہی ہے
قسم ہے اس سرزمین کی
جو غارت گری سے نیا جنم لے رہی ہے
قسم ہے اس خاک کی
جس پر تیل کے سوداگر اترتے ہیں
قسم ہے ان شیر خواروں کی
جن کی مائیں
اکیسویں صدی کے بازار میں
باندیاں بنا کر فروخت کی گئیں
قسم ہے ان قبروں کی
جن کے گنبد از سرِ نو تعمیر ہونے جا رہے ہیں
قسم ہے تبدیلی کی
جو ساری دنیا کا مقدر ہے
قسم ہے امن کی
جو انسان کی آخری امید ہے!

ڈاکٹر جواز جعفری

پاک ٹی ہاؤس کا نوحہ

رینگتے ہوئے ٹائروں کی دو دکانوں کے درمیاں
نیا ٹی ہاؤس جنم لے رہا ہے
ان دکانوں کو توسیع کا عارضہ لاحق ہے
نئے ٹی ہاؤس میں
نئے کاروباری رویے غالب ہیں
اب اس کی شناخت دل نہیں معدہ ہے
میری آنکھیں برسوں سے جس فرنیچر کو دیکھنے کی عادی
تھیں
وہ چوبر جی کے ایک مکار کباڑی کی دکان میں پڑا
اپنی دربدری پر آنسو بہا رہا ہے
نئے ٹی ہاؤس میں
مجھے اس کرسی کی تلاش ہے
جس کے دیمک زدہ وجود میں
ناصر کاظمی کا لمس رینگتا ہے
یہیں وہ میز رکھی تھی جس کے ایک کنارے پر
سہیل احمد خان کی قیمتی سگار
بجھے دنوں کے ڈھیر میں پڑا سلگتا ہے
اور اس کے دوسرے کونے میں
مظفر علی سید کی انگلیوں کے نشاں ہیں
میں اس سنہری میز کے فراق میں گریہ کرتا ہوں
اس میز کے برابر وہ بوسیدہ ٹیبل رکھی تھی
جس کے کرم خوردہ پائے کے ساتھ بندھا ژاہد ڈار
اپنی ریزہ ریزہ محبت سے وفاداری کا عدہ نبھا رہا ہے
اسی میز کے عین وسط میں
انتظار حسین کے ماتھے کی تیوریاں رکھی ہیں
میں اس اجنبی جزیرے کے کنارے کھڑا
شناسائی کی لو سے دمکتے
کسی مہربان چہرے کی تلاش میں ہوں
نئے ٹی ہاؤس میں ادیبوں کی جگہ
محبت کرنے والے جوڑے لے رہے ہیں
ادیب، چھپکلیوں کی طرح دیواروں میں رینگتے ہیں
اور نئی نسل کی خوابوں سے خالی آنکھیں
ان تصویروں کو اجنبیت کی اوٹ سے دیکھتی ہیں
دیوار پر آویزاں جاوید شاہین کی تصویر کو دیکھ کر
میری آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگتے ہیں
وہ آدھا میرے دل میں
اور باقی میانی صاحب میں دفن ہے
نئے ٹی ہاؤس کے خوش پوش ویٹرز کو دیکھ کر
مجھے الٰہی بخش کی یاد آتی ہے
جس کے میلے ایپرن سے
اپنائیت کی بو آتی تھی
یہیں کہیں وہ ستون تھا

جس کے سائے میں امانت علی خان کے سُر جاگتے تھے
اور بل کھاتے زینے کے قریب
اسرار زیدی کی قبر تھی
جس کا بجھتا ہوا چراغ ہر جمعرات کو
میرا جی کی راہ دیکھتا ہے
ٹی ہاؤس کی بالائی منزل میں
حلقۂ ارباب ذوق بسترِ مرگ پر پڑا
عاقر شہزاد کا منتظر ہے
اتوار کے روز سرِ شام
چند ڈرے سہمے ادیب
دم توڑتے حلقے کو
خون کا عطیہ دینے آتے ہیں!

نجیبہ عارف

کشور ناہید کو زندہ رہنا چاہیے!

کشور ناہید ایک گھنا پیڑ ہے
جو سرِ راہ خود بخود، اپنے زور پر اگ آتا ہے
اور اپنا سایہ رستے پر پھیلا دیتا ہے
اس کی چھاؤں میں تھکے ہارے مسافر آرام کرتے ہیں
اس کی ٹہنیوں سے پرندوں کے گھونسلے لٹکتے ہیں
جن میں ان کے انڈے اور بچے محفوظ رہتے ہیں
اس کے پتوں سے ہوا گزرتی ہے تو نغمے گونجتے ہیں
اس کی شاخیں خاموشی میں سرسراتی ہیں
اور سرگوشیوں میں کہتی ہیں
دیکھو، ہم نے چاند کو تھام لیا ہے
تم چاہو تو چاندنی میں دور تک جا سکتے ہو
اس کا تنا مٹی میں گڑا ہے
اور ڈٹ کے کھڑا ہے
اس کی جڑیں دھرتی سے پھوٹی ہیں
اور گہرے پانیوں تک جاتی ہیں
کشور ناہید کی کوئی بیٹی نہیں
لیکن اسے بیٹی کی ماں بننا آتا ہے
کشور ناہید اکیلی ہے
لیکن ساتھ دینا جانتی ہے
کشور ناہید عورت ہے
اور سچ بول سکتی ہے
زہر پی سکتی ہے
دار پہ سج سکتی ہے
کشور ناہید وہ حوصلہ ہے جسے زندہ رہنا چاہیے

نجیبہ عارف

کوئی ہے

کوئی ہے جو بارش سے کہے
میری کھڑکی نہ بجائے
مجھے آواز نہ دے
بہانوں سے اپنی طرف نہ بلائے
میری توجہ کھینچنے کو بجلی کے کوندے نہ لہرائے

کوئی ہے جو بادلوں سے کہے
چپ ہو جائیں
رات کتنی گہری ہے
اس میں ڈوب جائیں
اڑ کر کہیں دور نکل جائیں
آہستہ آہستہ بکھر جائیں

کوئی ہے جو خاموشی سے کہے
بولنا بند کرے
میری روح پر اس کے قدموں کی دھمک پڑتی ہے
میں اس کی آواز سن کر پاگل نہ ہو جاؤں
کہیں خود اپنے ہاتھ سے نہ نکل جاؤں

روہی

اترو میرے صحراؤں میں
لیکن اتنا دھیان رہے
ریت میں پاؤں دھنس جائیں تو
چلنا مشکل ہو جاتا ہے
ریت حلق میں پھنس جاتی ہے
ریت نظر دھندلا دیتی ہے
ریت پہ کوئی ڈھے جائے تو
ریت اسے اپنا لیتی ہے
اپنا انگ بنا لیتی ہے

کوثر جمال

کرن

بات یوں ہے کہ یہ کارزارِ حیات
رقصِ پیہم ہے اضداد باہمی
کشمکش کا
یہ بھی سچ ہے کہ ہر مظہرِ کائنات
اپنی ہی ضد سے
مغلوب ہونے پہ مجبور ہے
انکار اس سے بھی ممکن نہیں
کہ یہ کھیل ہے جاوداں
ہست اور بود کے شب و روز کا
ہر جگہ ہر کہیں
موجودات کی گھات میں موت ہے
کارخانۂ قدرت کے یہ ضابطے
اتنے اٹل ہیں
تو اے میرے غمناک دل یاد رکھ!
قانونِ فطرت کے ہاتھوں میں میزان ہے
اک عدل کی

وہ دیکھ!!!!! آج کا شہنشاہِ زماں
اپنی ہی ضد کے نشانے پہ ہے فرشتہ اجل کا
سورج کا نیزہ اٹھائے
اماوس کی لمبی سیاہ رات کے
سرہانے کھڑا ہے

یہ دیکھنے کو تو آنکھوں میں صدیاں اتار
خود میں زمانے سمیٹ
اے میرے غمناک دل!

کہانی کا مابین

مہیب طوفان تھا
ساری بستیاں اجڑ گئیں
زیست کے سب اہتمام
عظیم منصوبے، کروفر، احتشام
محلات اور حرم سرائیں اور جھونپڑیاں
اور قلعے اور فصیلیں
تخت اور کتبے اور خزانے
اور چیونٹیوں کے جمع کردہ
سب ذخیرے
مقدس صحیفے، ساری کتابیں
عقیدے اور انائیں اور تفاخر
شطرنج کے کھلاڑی اور مہرے
اور بساطیں
گئے وقتوں کی ایک ہزار ایک کہانیاں
سبھی کچھ
آن کی آن میں
مانندِ خس و خاشاک
بہہ گیا

اب سارے پر گھمبیر چپ کا راج تھا
نئی کہانی کا پہلا شبد اترنے تک

کوثر جمال

گھاؤ

زخموں کی اپنی عمریں ہوتی ہیں
کبھی کبھی عمرِ خضر سے بھی طویل
یہ زخم کسی آلے کسی ہتھیار سے نہیں لگتے
نہ ہی کوئی زمینی یا آسمانی آفت
ایسے گھاؤ دیتی ہے
عجیب ہوتے ہیں یہ زخم
یہ کسی ایک بدن پر
یا دل پر نہیں لگتے
یہ وہ گھاؤ ہیں
جو تنگ نگاہی کے زہر میں بجھے
ظلم و نفرت کے بھالے
انسانی نسلوں کے سانجھے دل پر
لگاتے ہیں
پھر چاہے مصلوب ہوتا ہوا عیسیٰ
اپنے قاتلوں کو معاف بھی کر دے
چاہے کربلا کی زمین میں رچا ہوا
مظلوموں کا خون
خشک بھی ہو جائے
یہ زخم نہیں بھرتے
یہ عفریت بن کر
انسانی نسلوں کے دلوں میں
نفرتوں، جنگوں اور دکھوں کی
کھیتیاں اگاتے رہتے ہیں

جینے کے لیے

پچھلی صدی میں
یا اس سے پہلے کے تمام قرنوں میں
یا پھر اس وقت سے
جب ہم وقت شمار کرنے کے قابل ہوئے
اور عرصہء حیات کو ماہ و سال سے ناپنے لگے
تو جب سے اب تک
کس کے حصے میں کتنا وقت آیا، ہم نہیں جانتے
کس کس نے کیا کیا کچھ کیا، کتنا اچھا، کتنا برا
اور کون کتنا نامور ہوا، یہ بھی ہم نہیں جانتے
ماسوا ان خال خال مثالوں کے
جو حوالوں کے لیے چنی گئیں

گزرے وقتوں کے
یا ہم سے کچھ ذرا قبل کے
چھوٹے بڑے لوگ
جو کبھی زندہ تھے
ان کی عظیم خوشیاں اور غم
کامرانیاں، ناکامیاں، عظمتیں، شہرتیں،
بیت چکے سب زمانے
سہل اور کٹھن ماہ و سال
مٹی میں مل کر مٹی ہوئے

نیست کی اتھاہ سے جب شور اٹھا
عبث ہے، عبث ہے کارِ حیات
تو میں نے، اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے!

احمد حسین مجاہد

میں

برس دو برس تک
مرا نام ایلان کردی رہا ہے
مگر اب مرے سینکڑوں نام ہیں
میں فلسطین کا مصطفٰی ہوں
پشاور کا گل شیر ہوں
میں نے بڈگام میں جان دی تھی
مری قبر بغداد میں ہے
کہیں میں روہنگیا، کہیں میں ہزارہ
کہیں پنڈتوں میں گھرا محض اک آدمی ہوں
پشاور کے اسکول میں
جو عبارت مرے خوں سے لکھی گئی
اُس کے معنی کسی پر نہیں کھل سکے
مجھ پہ کابل کی مسجد میں اُس وقت حملہ ہوا
جب میں سجدے میں تھا
شام کی سرحدوں پر مرا قافلہ لٹ گیا
دیکھنے والے بس دیکھتے رہ گئے
راستے بند ہیں
کوئی دروازہ کھلتا نہیں
جس کا اپنا ہی گھر اُس کا مقتل ہو
ظالم زمانے سے بچ کر
زمانے میں آخر کہاں جائے گا
جانتا ہوں
کہ میرا لہو رائیگاں جائے گا۔

ناہید قمر

آئندگاں کے نام

ہم کسی دائرے کا مرکز ہیں
اور اس آرزو کی وُسعت میں
اوک بھر آسماں ہی تھا شاید

رات کے ادھ جلے کناروں پر
ہم نے بارش کا انتظار کیا
گردِ منظر کی جس سے دُھل جائے

کوئی آواز دل تک آتی تھی
دودھیا بادلوں پہ چلتی ہوئی
جانے کن گم شدہ زمانوں سے
دُور اک بادباں چمکتا ہے
بجھ چکے ہیں چراغ سب لیکن
اِک ستارہ فلک پہ باقی ہے

تم وہی صبح ہو
کہ جس کے لیے
رات کی منجمد سیاہی سے
ہم نے کچھ روشنی بچالی ہے

خواب کا خاکداں
بہار کی دُھوپ
فاختہ کی ہنسی بچالی ہے

ناہید قمر

''ہوا جانتی ہے''

نارکو نور
تعصب کو مساوات لکھو
عہدِ ابلیس کو آدم کی فتوحات لکھو
خودکشی قتل کو
چیخوں کو مناجات لکھو
لبِ گویا کی جزا سلسلہء طوق لکھو
جھوٹ لکھنا ہے مؤرخ
تو بصد شوق لکھو
گرگِ شب زاد کے حیلوں کو یہ پہچانتی ہے
حاشیہ متن میں کتنا ہے
''ہوا جانتی ہے''
وقت اقلیم تھا جن کی
وہ سبکسار ہوئے
جانے کس نیند کے ہنگام سے دوچار ہوئے
اب جو کروٹ پہ زمانے کی
پڑے جلتے ہیں
حرمتِ درد کے رشتے میں پروئے ہوئے لوگ
زخمِ ادراک کا سرمایہ لیے چلتے ہیں
جن کا منصب، نہ ٹھکانہ، نہ نسب ہے کوئی
جن کے چہرے ہیں تواریخ کے گم گشتہ ورق
سدرۃ العشق کی پرپیچ مسافت میں جنھیں
یاد بھی ایک سی تہمت ہے
فراموشی بھی

(زندگی اہلِ تاسف پہ ہی موقوف نہیں)
مرگ بر شاہ
پرِ کاہ سے بدتر ہیں ترے جاہ وحشم
شہر پانی پہ کھڑا ہے
سو بہے جاتا ہے
چشمِ خوناب کا گریہ جو کہیں پر ٹھہرے
دُھوپ دیوار پہ
دیوار زمیں پر ٹھہرے
بابِ احسان کھلے
بیعتِ رضوان کھلے
چشمہء خضر عبث
تختِ سلیماں بے سود
کعبہء دل کی روایات میں 'تحویل' بھی ہے
مسلکِ صبر کی میزان پہ ٹکنے والو
فتنہء یاس فروشاں سے نہ ہارو، کہ ابھی
آتش وفیل کے قصے میں
ابابیل بھی ہے

فہیم شناس کاظمی

ہمارے شجرے بکھر گئے ہیں

گماں کی بے رنگ ساعتوں میں
نواحِ کرب و بلا سے دربارِ شام تک ہم
لہو کی اک ایک بوند کا سب خراج دے کر
تمام قرضے چکاتے آئے
شکستہ دہلیز
لہو کی محراب
سناں کا منبر
ہماری عزت بڑھاتے آئے
وہ ہم ہی تھے جو قیام کرتے
رکوع میں جھکتے
زکوٰۃ دے کر

خود اپنے حصے کا طعام دے کر
درود و صلوات پڑھتے آئے
وہ ہم تھے جو گھروں سے نکلے
تو پھر ابد تک......
پلٹ کے گھر کی طرف نہ دیکھا
ستارہ، سحری گواہ ہے
کہ ہم نے انساں کو
چھاؤں دیتے
گھنیرے پیڑوں پہ خون چھڑکا
جھلستے صحرا کو تازگی دی
دہکتی دھرتی کو زندگی دی
مگر وہ تسکیں کا پل کہاں ہے
بھنور بھنور ہے زمانہ سارا
وجود اپنے کدھر گئے ہیں
ہمارے شجرے بکھر گئے ہیں

فہیم شناس کاظمی

سارباں

سارباں نکلے تھے جس وقت گھروں سے اپنے
آشیانوں کو پرندے بھی نہیں چھوڑتے جب
راستے
رستوں کی آغوش ہی میں سوئے تھے
اور ہوا
سبز پہاڑوں سے نہیں اتری تھی
آسماں پر ابھی تاروں کی سجی تھی محفل
سارباں نکلے تھے جس وقت گھروں سے اپنے
رنگ خوابوں میں ابھی گھلتے تھے
جسم میں وصل کی لذت کا نشہ باقی تھا
گرم بستر میں
''گلِ خوبی'' پریشاں تھی ابھی
دودھ سے خوب بھرا
ایک کٹورا تھا تپائی پہ دھرا
سارباں نکلے تھے جس وقت سفر پر اپنے
چارسُو گہری خموشی تھی
چاندنی ریت کے سینے پہ ابھی سوئی تھی
اور دھیرے سے
صبا خوشبوئیں بکھراتی تھیں
اوس سے بھیگی ہوئی
گھاس کی ہر پتی جھکی جاتی تھی
رات کے نیل میں کچھ نُور گھلا جاتا تھا
یہ جہاں آئینہ خانہ سا نظر آتا تھا

سارباں گہری خموشی میں گھروں سے نکلے
لَو چراغوں کی انھیں جھانکتی تھی
دھول قدموں سے لپٹتے ہوئے یہ کہتی تھی
تم کہیں جاؤ نہ ابھی
سائے اشجار سے رستوں پہ اتر آئے تھے
درودیوار خموشی سے تھے فریاد کُناں
تھیں جگالی میں مگن اونٹنیاں
گھنٹیاں جاگتی تھیں
لذتِ وصل سے مدہوش ہوا جاگتی تھی
پنکھڑی ہونٹوں پہ خاموش دعا جاگتی تھی
چارسُو گہری خموشی تھی
فضا جاگتی تھی
سارباں نکلے تھے جس وقت سفر پر اپنے!

فہیم شناس کاظمی

صدائیں گُم نہیں ہوتیں

چپاتی پھر سفر میں ہے
چپاتی زندگی کی اک علامت ہے
تحرک ہے
تحرک ہے بغاوت کا
چپاتی، خوف اور دہشت کا اندیشہ
محبت، فرض اور ہمت کا سندیسہ
حماقت اور شجاعت میں ذرا سا فرق ہوتا ہے
مگر یہ کس پہ کھلتا ہے
ابھی وہ آگ زندہ ہے
ابھی اُس آگ کے شعلے دہکتے ہیں
ابھی توے کے نیچے جگمگاتے تاروں کی بارات جاتی ہے
چپاتی کو بناتے گرم ہاتھوں کی تپش ہے آج بھی قائم
محبت قائم اور دائم
مگر اک مسئلہ یہ ہے
عزیزن اب کہاں ہوگی
کہاں اب اُس کی آنکھوں میں کجل دھارے
کہاں پازیب اور گھنگرو
کہاں کمخواب اور مخمل
کہاں یہ کھردری وردی..... ہے جس کا نام آزادی
کہ اس کی جستجو میں مول لی ہے..... اس نے بربادی
اجل ہی سے بغاوت کی ہمیشہ ہوتی ہے شادی
ہوائیں چومتی ہیں اُن کے کومل نرم تلووں کو
جو پتھریلی زمینوں پر
وفا کے گیت گاتے ہیں
لہو میں ڈوب جاتے ہیں
صدائیں گم نہیں ہوتیں

فضاؤں کی ہتھیلی پر دھنک کھلتی ہی رہتی ہے
زمیں کی مانگ کی سُرخی ہمیشہ بڑھتی رہتی ہے
ندی جوشِ بغاوت کی ہمیشہ چڑھتی رہتی ہے
ندی تھمتی نہیں جوشِ بغاوت کی
کمی ہوتی نہیں کارِ شہادت کی
زمیں زندہ وہی رہتی ہے
جس پر موت ہنستی ہے
''عزیزن''، ''رانی جھانسی'' جیسی شخصیت
جہاں پر خواب بُنتی ہے
جہاں ہر روز مرتی ہے..... جنمتی ہے
اُسی دھرتی پہ سجدہ آسماں ہر روز کرتا ہے!

چپاتی..... اٹھارہ سو ستاون کی جنگِ آزادی کی ایک خفیہ انقلابی تحریک
عزیزن بائی..... اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی کی ایک طوائف سر فروش
رانی جھانسی..... جنگِ آزادی کی مجاہدہ

فہیم شناس کاظمی

امیر علی ٹھگ کی خدمت میں

بابِ رسوائی کھلا
قصے کا آغاز ہوا
اور تاریخ نگوں سار کٹہرے میں کھڑی
کھل کے تہذیب کی پگڑی اپنی گردن میں پڑی
''پان'' لاؤ یا'' تمباکو'' لاؤ
کوئی ''راماس'' سمجھتا ہی نہیں
اور اشارے پہ اشارہ ہے کہ تقریب کرو
ٹھوٹ اور ٹھگ تو ہیں چاق و چوبند
بیلوں کی گھنٹیاں آواز دیئے جاتی ہیں
اور رہوار ٹھہرتے ہی نہیں
گردنیں تھوڑی نظر آتی ہیں
جسم بھی مٹی فرقت میں گلے جاتے ہیں
کھال چہروں سے اُڑی جاتی ہے
قبریں تنہائی کی وحشت سے ہیں اُکتائی ہوئی
زندگی گھبرائی ہوئی
''بھیلیا'' گم ہے کہاں
کوئی ''سوتھانی'' نہیں
یعنی اب کچھ بھی ہو حیرانی نہیں
اب یہاں دُور تلک سایہ نہیں پانی نہیں
دل کی دھڑکن میں ہے کہرام بپا
ایسی وحشت کبھی دیکھی نہ سنی
دُھوپ بارش کی طرح برسی ہے
آنکھ سائے کے لیے ترسی ہے

دُور تک کوئی نہیں کوئی نہیں
گدھ ہی گدھ چار طرف اُترے ہیں
اک بعد ایک فسانے کا وہ کردار بنے
یعنی ٹھگ اپنے شہریار بنے
کل کے دلاّل ہوئے آج اُولی الامر اپنے
ان کی تہذیب پہ تضحیک بھی شرمندہ ہے
ان کی باچھوں سے ٹپکتا ہے لہو.......... تازہ لہو
پہلے پوشیدہ تھے اب صاف نظر آتے ہیں
ٹھگ ہی ٹھگ .... منبر ایواں میں نظر آتے ہیں
''کرنل میڈوز'' نہیں ...... کوئی نہیں
خوابِ غفلت میں گھرے قافلے والے سارے
بندرستے کو بڑھے جاتے ہیں
اپنے ہی ہاتھ سے خود اپنے گلے کاٹتے ہیں
اور ٹھگ سارے ہنسے جاتے ہیں
زندگی ڈھونڈے سے اب ملتی نہیں لوگوں میں
دلکشی ڈھونڈے سے اب ملتی نہیں راہوں میں
اب نہیں کوئی نہیں ....
درد کا درماں جو کرے
یارا میر ....
اب ہر اک سمت حکومت ہے تری
اور تو جیسا بھی انصاف کرے
ہم ذلیل ابنِ ذلیل ابنِ ذلیل
علم کیا چیز ...... شرافت کیا ہے

اور تو اعلیٰ نسب...... اعلیٰ ترین
ٹھگ سہی.......... حکم ترا چلتا ہے
گدھ ہی گدھ چار طرف اُترے ہیں
اور سب لوگ ہیں زندہ اب بھی......؟
واقعہ ہے کہ ہمیں حیرت ہے
کہ ترے ہوتے بھی سب زندہ ہیں
اور گدھ بھوک سے بے حال ہوئے جاتے ہیں
یار امیر...... اب کوئی حیلہ وسیلہ کوئی.................!

راماس.................. ٹھگوں کی زبان
پان یا تمبا کو کھانا........... موت کے گھاٹ اتارنا
ٹھوٹ................ ہلاک کرنیوالا ٹھگ
بھیلیا............... اجتماعی قبریں کھودنے والا ٹھگ
سوتھانی.............. مخبر
کرنل میڈوز.............. ٹھگوں کو پکڑنے والا افسر

جاوید احمد

مٹیالہ چاند

گندم کے اک ادھ کچے کھیت کی اوٹ سے
چاند نکل آیا
بدلی نے کہا مجھ سے نہ ڈرو،
تم کیا جانو
مجھ میں کیا کیا ہے تمہارے لئے
کیسی دنیا ہے تمہارے لیے
کبھی تم نے بھیگا لمس نہیں محسوس کیا
کبھی تم نے مجھ میں چھپی ہوئی بجلی کی چھب کو
نہیں دیکھا
مرے سینے میں ارمانوں کا کہسار
نہیں دیکھا تم نے
کبھی مجھ میں تڑپتے آئنوں کے اس پار
نہیں دیکھا تم نے
جو مجھ میں بھیگتے رنگ ہوئے بے تاب
نہیں دیکھے تم نے
کبھی مجھ میں بہتے دریا کے گرداب
نہیں دیکھے تم نے
کبھی میرے کناروں سے تم نے
موجوں کو اچھلتے دیکھا نہیں
تم مجھ سے پھوٹتے ساون میں
کبھی بھیگے نہیں
کبھی تم نے میری بارش کی
پہلی بوندوں کو نہیں دیکھا
تم کیا جانو ابھی تم تو بس
گندم کے اک ادھ کچے کھیت سے نکلے ہو

مصطفیٰ ارباب

پنجرہ

میں
چڑیا گھر کے
ایک پنجرے میں بند ہوں
مجھے نہیں معلوم
میں یہاں پیدا ہوا تھا
یا کہیں سے پکڑ کے لایا گیا ہوں
لوگ
ہر روز
مجھے دیکھنے آتے ہیں
مجھے دیکھ کر
اُنھیں
حیوانی خوشی ملتی ہے
میں نہیں جانتا
ایک پنجرے میں
انسان کیسا دکھتا ہے
ایک لڑکی
مجھے ماں جیسی لگتی ہے
وہ
میرے پنجرے میں آنے کے لیے
سلاخوں سے اپنا سر ٹکرا رہی ہے
وہ لڑکی
اپنے پنجرے کے بعد
میرے دکھ کا پنجرہ
توڑ رہی ہے

فیصلہ

میں
اب کبھی اُس سے بات نہیں کر پاؤں گا
میری خود کلامی سے
اُس کی سماعت آشنا نہ ہو سکی
میری آنکھیں
اُسے کبھی نہیں دیکھ پائیں گی
ہمارے بیچ
اُس نے
ایک آہنی دیوار تعمیر کر دی ہے
اب میں
اُسے دوسروں کے ساتھ
ہنستے ہوئے دیکھنے کی مسرت سے بھی محروم ہو چکا ہوں
اس بار
فیصلہ اُس نے خود کیا ہے
میں اُس کے فیصلوں کو
رد کرنے کا اختیار کھو چکا ہوں
اُس نے
مجھے آخری بات کہنے کا حق بھی نہیں دیا
ہم نے
ایک دوسرے کو سمجھنے میں غلطی کی
میری محبت کو
وہ بوجھ سمجھنے لگی
اُس کی نفرت کو میں محبت کی طرح چاہتا رہا
میں خوش ہوں
میرا شمار
نفرت کرنے والوں میں نہیں
محبت کرنے والوں میں ہوگا

مصطفیٰ ارباب

محبت میں

اُس نے جو کہا
میں تسلیم کرتا چلا گیا
میں چاہتا تو
اُس کی منطق کو
اُسی کی باتوں سے رد کر سکتا تھا
وہ لڑکی ہمیشہ
تیزی سے تبدیل ہوتی رہتی ہے
میں اُس کی ایک بات سے
غوطے کھاتے ہوئے نکلتا ہوں
وہ مجھے
دوسری بات میں دھکیل دیتی ہے
میں
ڈبکیاں کھاتے اور اُبھرتے ہوئے
اُس کی لہروں پر رواں دواں رہتا ہوں
ندی جیسی لڑکی نے
مجھے
اپنے سمندر میں لا کے چھوڑ دیا ہے
سمندر ہمیشہ
تحلیل ہو کر بادلوں میں تبدیل ہوتا رہتا ہے
بادل برس کر
ندی میں تبدیل ہو جاتے ہیں
ندی
سمندر تک پہنچ کر
دائرہ مکمل کر دیتی ہے

میں
لڑکی کے سمندر میں
ڈوب کر مرتے ہوئے
اُس کی گہرائی کو محسوس کرتا ہوں
جس کی کوئی انتہا نہیں ہے
وہ لڑکی
پھر سے ہوا میں تحلیل ہو رہی ہے
مجھے دوبارہ سمندر میں ڈبونے کے لیے
میرے پاس جینے کا جواز
محبت اور موت ہے
میں بار بار مرتا رہوں گا
کیوں کہ محبت میں
بحث بے معنی ہوتی ہے

مصطفیٰ ارباب

آدمی

میں نے
پیدا ہوتے ہی نقالی کی
اور بولنا شروع کر دیا
چلنے میں
مجھے زیادہ وقت نہیں لگا
میں نقل کرتے ہوئے بڑا ہو گیا
ہر امتحان میں مجھے کامیابی ملی
آج کل
میں آنسو بہانے کی نقل کر رہا ہوں
اِس سے پہلے
میں نے ہنسنے والوں کی نقل اُتاری تھی
مجھے یقین ہے
میں ایک نقلی آدمی ہوں
تُم یقین سے کہہ سکتے ہو
اصلی آدمی کون ہے

ذرا سی غلطی

خواب
خوب صورت ہوتے ہیں
جب وہ سانس لیتے ہیں
ایک خواب کو
دوسرے خواب سے الرجی ہو سکتی ہے
خواب کو ہمیشہ
اپنے ساتھ رکھنا چاہیے
دیکھ بھال کے لانا چاہیے
کسی بھی فرد کو اپنے خواب میں
ذرا سی غلطی
خواب کو غلط جگہ پہنچا سکتی ہے
ایک غلطی کے باوجود
میں ابھی تک
اپنے خواب میں ہوں
میں
آخری سانس تک
خواب ہی میں رہوں گا
میرا خواب
ایک بھیڑیے کے جبڑوں میں دبا ہوا ہے

سید کاشف رضا

میرے پاس کبھی اتنے ہاتھ نہیں آ سکے ان کڑی دو پہروں میں

میرے پاس کبھی اتنے ہاتھ نہیں آ سکے
کہ میں ایک عورت کے حسن کو محسوس کر سکتا
اور نہ کوئی عورت میرے لیے اتنی وافر ہو سکی

میرے پاس کبھی اتنی آنکھیں نہیں آ سکیں
کہ میں ایک عورت کو اچھی طرح دیکھ سکتا
اور نہ کوئی عورت میرے لیے اتنی فراہم ہو سکی

میرے پاس کبھی اتنا وقت نہیں آ سکا
جسے میں ایک عورت کی محبت پر صرف کر سکتا
اور کبھی اتنا خوب صورت نہیں ہو سکا
کہ کوئی عورت اپنی تمام محبت مجھے سونپ سکتی

مجھ سے اپنا
اور عورتوں کا دل کئی بار ٹوٹا
بہت سی محبتوں کے درمیان
میں سرکس کا بازی گر نہیں بن سکا
میرے پاس کبھی اتنے ہاتھ نہیں آ سکے

ان کڑی دو پہروں میں
جب آسمان پر چیل بھی دکھائی نہیں دیتی
اور درخت اگر کوئی ہوں تو
ان پر پتے ہلنا بند کر دیتے ہیں
اور جب سڑکوں پر تارکول پگھلنا شروع کر دیتا ہے
ان کڑی دو پہروں میں
جب کمرے میں غیر آرام دہ بستر پر لیٹے ہوئے
دو پہر گزارنے کے علاوہ کوئی مصروفیت نہیں ہوتی
اور کان
پنکھے کو ہوا دینے کی بے کار مشقت کرتے سنتے رہتے ہیں
ان کڑی دو پہروں میں
جب کوئی کہانی اپنے لوبھ میں نہیں لیتی
اور ٹی وی پر کوئی کرکٹ میچ نہیں آ رہا ہوتا
ان کڑی دو پہروں میں
بے کار بیٹھا ہوا دل کوئی کہانی بنانے لگتا ہے
جس میں کوئی عورت
اس سے مختلف کردار ادا کرتی ہے
جو وہ میری زندگی میں ادا کر رہی ہوتی ہے
ان کڑی دو پہروں میں
کہانی چاہتی ہے
کہ میں کسی عورت کی بانہوں میں جا گھسوں
ان کڑی دو پہروں میں
میں کسی کہانی کا دل توڑ کر
خود کو اور اسے مزید بور نہیں کرتا

سید کاشف رضا

اگر میں تمھارے حسن کی موسیقی بنا سکا

اگر میں تمھارے حسن کی موسیقی بنا سکا
تو تمھاری باہیں
وائلن پر بناؤں گا
اور تمھاری گردن
ستار پر

عود کی موسیقی کے لیے
تمھارے بال مناسب رہیں گے
اور ہارمونیم پر ہلکورے دینے کے لیے
تمھاری کہنیاں

جن گیتوں سے میری نظمیں بن سکتی ہیں
وہ میں تمھارے
ان لمحوں سے دریافت کرلوں گا
جب تمھاری میکانیات
سست رو ہو جاتی ہے
اور ان لمحوں سے
جب میں تمھاری میکانیات کو
اپنی انگلیوں سے حرکت دینے لگتا ہوں

تمھاری انگلیوں سے میں
کمانیاں بناؤں گا
جن سے نستور بجایا جا سکے
اور تمھارے زانوؤں پر قانون جاری کروں گا

جب تک تمھارے ساتھ
پیار بنانا
لازمی نہ ہو جائے
میں اپنے ہونٹوں سے
بناؤں گا
اگر میں تمھارے حسن کی موسیقی بنا سکا

اقبال نوید

مچھلی پتھر چاٹ رہی ہے

دھڑکن دھڑکن
خواب ادھورے
دیواروں سے گریہ زاری
مٹی آنسو پونچھ رہی ہے
دور کہیں آواز کا سورج
رفتہ رفتہ ڈوب رہا ہے
اپنے اپنے پیارے مل کر
اپنے پیارے ڈھونڈ رہے ہیں
یادوں کی طغیانی میں سب تنکا تنکا
ہاتھ چھڑا کر صحرا صحرا بھٹک رہے ہیں
خوشبو، خواہش کے موسم میں
اب صدیوں کی خاک کے نیچے
اپنا رستہ ڈھونڈ رہے ہیں
کون کہاں ہے،
خوش فہمی یا خوش بختی ہے
اپنے اپنے ان دیکھے کو چھو لینے کی خواہش میں اب
جسموں کی آتش بازی سے، تاریکی میں کھیل رہے ہیں
اور سمندر جاگ رہا ہے
موجوں کی مستی کی لے میں ایک زمانہ بھاگ رہا ہے
ساحل، ساحل ہنگامہ ہے
خوشحالی کا وحشی، دوزخ کے آنگن میں
کرنوں کو آغوش میں لے کر ناچ رہا ہے
بے کس، بے بس لاچاری میں
مچھلی پتھر چاٹ رہی ہے

تبسم فاطمہ

وہ انسانوں کو کھانے آ رہے ہیں

(دادری حادثہ کے نام)

وہ جانوروں کی موت کا ماتم کرتے ہیں
اور انسانوں کو گولیوں سے چھلنی کرنا ان کا محبوب مشغلہ
وہ گھر سے نکل چکے ہیں
گجراتی وردیوں میں
مظفر نگر کے سرخ لباس میں
دادری کی خاموش بستیوں سے گھومتے ہوئے
وہ انسانوں کو کھانے آ رہے ہیں

جانوروں کے گوشت کا ذائقہ انہیں پسند نہیں
اب انہیں انسانی گوشت پسند ہے
وہ نکل چکے ہیں
اپنے اپنے گھروں سے

ان کی آنکھوں میں اژدہے جیسی چمک ہے
لپلپاتی زبان انسانی خون کا ذائقہ چکھنے کے لئے بیتاب
وہ افواہوں سے شکار کرتے ہیں
اور اقلیتوں کے بھونے ہوئے گوشت کھاتے ہیں
وہ ہر جگہ، ہر شکل، ہر چہرا ہے، ہر شہر، ہر گاؤں میں موجود ہیں
وہ انتخابی موسم کا انتظار کرتے ہیں
اور جشن مناتے ہوئے شکار کے لئے نکل پڑتے ہیں

تبسم فاطمہ

نئے سال کے لئے کچھ نظمیں

(1)

نیا سال
تم ایک خوفزدہ کرنے والے کے چہرے کے ساتھ آئے ہو
افسوس، میں تمہارا استقبال نہیں کرسکتی
تمہارے ہاتھ میں گزشتہ سال کا ایک پالنا ہے
جس میں پشاور کے معصوم بچوں کے خون کے داغ
اب بھی دکھائی دے رہے ہیں
تم نے مذہب کو سیاست سے جوڑا
اور وقت کو ایسے دوراہے پر لے آئے
جہاں انسانیت، تر شول اور شمشیر کا فرق ہی مٹ گیا
تم فلک شگاف چیخ اور کراہوں کے ساتھ آئے
افسوس،
ان دردناک چیخوں کی زد میں
میں تمہارا استقبال نہیں کرسکتی

(2)

ایک بے ہنگم وقت کے صدمے
درد اور الاپ کے گھنے کہروں کے درمیان
میں ابھی
رومانیت کے بوسیدہ لحاف میں
کچھ تلاش کرنے کی کوشش میں خالی ہاتھ ہوں
ماضی کے کہروں میں بورسی پر ہاتھ تاپتے ہوئے صفحات تو ہیں
مگر وقت کے آتشدان پر رومانیت جل رہی ہے
ایک بے حس سیاست، مذہب کو فرقہ واریت سے جوڑ کر
جلتے ہوئے انسانی لاشوں کی کراہیں سنا رہی ہے

نیا سال
ایک انتہائی المناک اور افسردہ ماحول میں
ہم تیار نہیں ہیں تمہارا جشن منانے کے لئے

(3)

نیا سال! گھبراؤ مت
ہم جئیں گے اس ایک محبت کے لئے
جو لامتناہی چیخوں اور کراہوں کی راکھ میں کہیں باقی ہے
جو ڈری ہوئی، روح کے سات پردوں کے اندر کہیں
بے جان پڑی ہے
ادب کے صفحات پر عرصہ پہلے جس کی موت کا
اعلان کردیا گیا
مگر گھبراؤ مت
ہم ڈھونڈ لائیں گے اسے
راکھ سے، روح سے، سات پردوں کے اندر سے
اور دل سے
ہم رکھ دیں گے اسے صفر سے سونامی
اور تاریخ کے بوسیدہ صفحات تک
گھبراؤ مت
ابھی ایک جشن کا وعدہ ہے
نئی تاریخ کی تیاری تک
ہم محبت کو زندہ کردیں گے

ڈاکٹر شائستہ نزہت

محبت

تمہیں کس نے بتایا ہے
محبت کوئی کوشش ہے
محبت کوئی خواہش ہے
تمہیں کس نے یہ سمجھایا
محبت کرنا ہوتی ہے
جو سوچیں کلبلاتی ہیں
جو باتیں جگمگاتی ہیں
انہیں کر کے اکٹھا جھولی اپنی بھرنا ہوتی ہے
محبت جانِ جاں، اِک معجزہ ہے، اِک کرشمہ ہے
محبت ایک شعلہ ہے
محبت ایک جذبہ ہے
محبت ایک آندھی ہے
محبت اک بگولا ہے
محبت ایک طوفاں ہے
محبت ایک نغمہ ہے، محبت جس کا عنواں ہے
محبت سرمدی احساس ہے، جس کی تجلّی سے
ہر اک لمحہ فروزاں ہے
محبت ہے کوئی سوغات، یہ تحفہ ہستی ہے
محبت ایک دھڑکن ہے، جو ہر سینے میں بستی ہے
محبت جان بھی ہے، جسم بھی، جسموں کی رغبت بھی
محبت سے مُکرنا، ہے گویا انکارِ فطرت بھی
محبت ایک نعمت ہے
محبت ایک رحمت ہے
محبت روحِ یزداں ہے
محبت خود ہی یزداں ہے

تمہیں کیسے خیال آیا
محبت کرنا ہوتی ہے
محبت خود ہی چپکے سے
وفا کا بیج بوتی ہے
محبت یہ نہیں کہتی، کہ ہم نے کیسے مرنا ہے
محبت یہ نہیں کہتی، کہ کیسے جینا مرنا ہے
وہ بس اتنا بتاتی ہے
محبت لوح ہے، تم اس کو کوئی سوچ مت دینا
محبت نو دمیدہ پھول ہے، تم نوچ مت دینا
محبت تو محبت ہے، محبت اس کو رہنے دو
یہ طغیانی ہے، اِس کو اپنی رَو میں آپ بہنے دو
محبت ایک بندھن ہے، اسے شرطوں میں مت جکڑو
محبت ایک تتلی ہے، نزاکت سے اسے پکڑو
محبت کھو بھی جاتی ہے
کہ قسمت سو بھی جاتی ہے
محبت جب ملے اس کو حفاظت سے سنبھالو تم
بھلا کر اپنے ماضی کو، مقدر کو اُجالو تم
یہ پھر دستک نہیں دے گی
یہ پھر کروٹ نہیں لے گی
سنو، جانِ محبت، یہ تو اِک دستورِ قدرت ہے
محبت کون کرتا ہے
محبت ہو ہی جاتی ہے
دلوں کی بے ثباتی پر
یہ برکت ہو ہی جاتی ہے

شکیلہ شام

ایک مقتول نظم

اک نظم ہے
مجھ میں گھومتی
چیختی، گونجتی
ایک مچ مچائے ہوئے
کوئی بھید رچائے ہوئے
کراہتی، ہانپتی
مرا اپتلا اٹھائے ہوئے
منتر ہے جاپتی
سوئیاں گذارتی
زمیں پھونکتی
آسمانوں پہ دھاڑتی
بھالے اتارتی
اک نظم ہے
میرے دل کی پناہ میں
کوری، کنواری، سہمی ہوئی
بیٹھی ہے مجھ میں، چھپی ہوئی
کسی اندھے لمحے کی گھات میں
جیسے بدلے میں خوں بہا کے
اسے کوئی اذن ملا ہے
اُسی نظم کے ہاتھ پر
قتل میرا لکھا ہے
اُسی نظم کے ہاتھ پر
قتل میرا لکھا ہے

میں تیری سرائے نہیں

او میرے سخن ساز! او میرے سحر طراز!
تو نے گھاس کے فرش پہ جب آس کا بستر رکھا
میں نے تیرے رستے ہوئے پاؤں پہ رکھے
تاروں کے پھاہے، چاند کا مرہم
تو نے گال پہ رکھا جب ہاتھ کا مسطر
میں نے ہتھیلی کے باٹ میں ہفت آسماں رکھے
اور گھمایا___ ایڑھی کے چکر پہ زمیں کا چکر
کراں___ تا بے کراں
مکاں___ تا لامکاں
سب تجھ پہ وار دیا
میں نے ان گنت زمانوں سے یوں تجھے پیار کیا
اور تو نے اک جھٹکے سے؟
ہتھیلی کا قفس توڑ دیا___ مجھے چھوڑ دیا___
او میرے رنگ ریز! او میرے رنگ ساز!
میں تیری سرائے نہ تھی،
میں تو تھی___ اک متروک زباں کی بھید بھری کتھا
میری روح تھی___
قدیم صحیفوں کی زباں میں لکھی ہوئی
اور تجھے آتی تھی صرف زباں رنگوں کی
جا___ تجھ پہ تیرے رنگوں کا رنگ کھلے
جا___ تجھ پہ کبھی نہ میرا ابجد کھلے

☆ وحید احمد کی نظم "مہر" سے مستفاد

زاہد امروز

توہین ہمارا قومی پھول ہے

کیکر ہمارا قومی درخت ہے

(افضال احمد سیّد)

توہین ہمارا قومی پھول ہے
جو ہر چورا ہے پر کھلتا ہے
اِس کی خوشبو کپڑوں، جوتوں اور کمروں سے آتی ہے
اِس خوشبو کے تعاقب میں
ہم دفتر دفتر پھرتے ہیں
اور افسر افسر بکتے ہیں

توہین ہمارا قومی پھول ہے
جس کا رَس جسموں کو نیلا کر دیتا ہے
رنگ رنگ کے خوف ہیں جن کے سائے
نیندوں کو گہنا دیتے ہیں
ہم میں کتنے سانپوں کی نسلیں ہیں
اِن نیشوں میں زہر نہیں ہے
پھر بھی سب کو ڈستے ہیں
ہم جو اپنے پاکیزہ دل کے بھی دلاّل ہیں
اپنی نفرت میں بھی پاک نہیں
جس نے کبھی ہمارے سامنے
اپنے دکھڑے دل کی دہلیز پہ رکھے
اُس کے لیے ہم تھپکی میں بھی کھارے نکلے

توہین ہمارا قومی پھول ہے
جس کے باغ اس دھرتی کی رونق ہیں
ہم ان باغوں کی چھپکلیاں ہیں
اور لوگوں کے دِل پھولوں کے زِکرم ہیں
جو ان چپکیلی جیبوں پر ایک معمولی لقمہ ہیں

اس سے پہلے باغ میں اِتنے پھول نہیں تھے
لیکن چہروں پر شادابی تھی
ہم نے رفتہ رفتہ ہریالی کو زہر کیا
اور لمحوں کی ویرانی پر
توہین کے پھولوں کی چادر چڑھا دی

زاہد امروز

لاڑیو ساحل پر رات

جسموں کے ساحل پر پانی پتھر سے ٹکرایا
اور لذت کے چھینٹے گیلی ریت پہ پھیل گئے
لہروں کی سرحد پہ پنچھی مچھلی چننے آئے
اور ساحل سے پلٹ گئے

میں نے تجھ کو وہاں پر دیکھا
جہاں اُفق پر بادل کے مینار فلک تک اُٹھتے تھے
اُس کے اُوپر گہری گھٹا کا پھیلا کپڑا
گدلے پانی جیسا تھا
کوکونٹ کے پیڑوں میں عریانی کی خوشبو تھی
تیرے نیم برہنہ پہلو میں لمس کی لہر رواں تھی

ہم نے دیکھا
آتی لہریں سب کچھ بھر جاتی ہیں
اور جاتی ہوئی خالی کر جاتی ہیں
جہاں سمندر گہرا ہو
سیپوں اور انسانوں میں فرق نہیں کرتا
اور جہاں سمندر شُوکتا ہے
ساری آوازیں تھم جاتی ہیں
ان ٹھہری آوازوں میں رات ڈھلی
تو نے مہکی سانسوں کا جال مرے سینے میں پھینکا
اور خواہش کی مچھلی پکڑی
جسموں کے ساحل پر ساری رات
ایک سانولے کیڑے نے
ریت میں گیلے چھید کیے!

علی زیرک

میں نظموں کا دیوتا ہوں

کون کہے گا؟
نیند کے کھارے پانی میں بہہ جانے والی آنکھیں جی اُٹھیں گی
لکھنے والے اپنے اپنے جُثوں میں جب آگ بھریں گے
رات کا پاگل پن جاگے گا
اور میرے مفلوج بدن سے گندھک جیسی باس آئے گی
دیکھنے والے دیکھ سکیں گے؟
پارے کی تقویم سے پہلے کا نظارہ
ممکن کی ناممکن سے آمیزش
مٹی اور پانی کا ٹھنڈا سیارہ
تم بس مجھ کو سنتی رہنا
نظموں کے انبار سے ایسی نظم نکال کے لے آؤں گا
جس کے سبھی بھاؤ، بالکل تم جیسے ہوں
یعنی میرے جیسے......

سعید احمد

کھنڈر

چھت گری ہوئی تھی
دیواریں ٹوٹی ہوئیں اور
رسوئی کے ساتھ
وہ پناہ گاہ، وہ ایک کونا
وہیں تھا
جہاں ہم ملتے تھے
میں تمہارے سایوں سے
لپٹ کر
تمہاری یادوں سے چمٹ کر
زمان ومکان سے پرے
کہیں لامکان کی سرحد پر
یقین وگمان کی آخری
حد تک
اس دیوار کو جس کے ساتھ
لگ کر تم مجھے اپنے
پھولوں سے لگاتی تھی
میں گیلی اینٹوں کو
چومتا ہوں
تمہارا پتہ پوچھتا ہوں
ماسی برکتے، تندور والی مائی
اور تانگے والا اللہ رکھا
مجھے بتاتا ہے کہ تم
کسی تیل والے ملک میں ہو
اور بڑی خوش ہو
بڑے بڑے بال بچے ہیں
گاؤں سے واپس آتے ہوئے
گاؤں کی سب سے
سوہنی کڑی
میں نے سوچا
اب میں کبھی گاؤں آیا تو
اس کھنڈر کی
زیارت نہیں کروں گا......

سعید حمد

لمس

اب وہ رات نہیں ہوتی
جس کی صبح ہو
اب وہ صبح نہیں ہوتی
جس کی شام ہو
اب شام سے
رات تک کے سفر میں
راستوں پر
بکھری ہوئی لاشیں
ہوتی ہیں
کٹے ہوئے انسانی اعضاء
وہ سامنے آگ میں
جلی ہوئی جو عورت
پڑی ہے، اس کے
نزدیک جو ہاتھ ہے
اس پر ایک لمس ہے
لمس ایک پھول ہے
آگ میں اگتا ہے
لمس لافانی ہے...

آسناتھ کنول

الاؤ

میرے اندر بھوک کا الاؤ
دہک رہا ہے
اپنے نام کی روٹی
تلاش کرتے کرتے
وہاں تک آ پہنچی ہوں
جہاں چھلنی وجود
اور زخمی یادوں نے
مرا ساتھ دینے سے انکار کر دیا ہے
دفعتاً میرے سامنے
روٹیوں کا ڈھیر آ گیا ہے
اور میں اپنے حصے کی
روٹی تلاش کرتے کرتے
موت کی بانہوں میں جھول گئی ہوں
لنگر خانے کے باہر
ڈھول بج رہے ہیں

فریحہ نقوی

قائداعظم لائبریری کے باہر

آج پھر سے نومبر کی بے حد اُداسی بھری سرمئی شام ہے
اور یہاں لائبریری کے بالکل مقابل پُراسرار پیڑوں کی
خوش قامتی......!!!
شام کے اس اندھیرے کو نیچا دکھانے کی
بے سود کوشش میں بجھتی ہوئی نیلگوں روشنی......!!
آج پھر سے مرے ساتھ چلتے ہوئے،
تم اُسی پیڑ کے سائے میں رُک گئے
(جس کے سائے میں جیسے کوئی سحر ہے)
میں نے گھبرا کے پھر سے نگاہیں چرا لی ہیں
اور تم مجھے کہہ رہے ہو، تم کو معلوم ہے؟ سنو!
شام، پہلے تمہاری نگاہوں سے یہ سرمگیں چاندنی
اپنے دامانِ حیرت میں بھرتی ہے
تب جا کے اس میں اُداسی کی یہ راگنی جاگتی ہے،
اور اس راگنی کے سُروں میں کوئی سُر محبت سے خالی نہیں!!!
زندگی کی حرارت سے خالی نہیں......!
''خواب زاروں کی حیرت میں لپٹی ہوئی...... یہ نگاہیں ہیں
یا سرمئی راگنی؟
تم ابھی بات کر ہی رہے تھے تمہارے یہ جملے مجھے زندگی کی
طرف لا رہے تھے،
فلک سے گزرتے ہوئے ایک طیارے کے شور سے چونک
اُٹھی ہوں میں! اچانک
اور حقیقت کی دنیا میں واپس دھکیلی گئی ہوں......
یہاں تم نہیں ہو! کہیں بھی نہیں ہو!
کہاں کھو گئے ہو؟ ابھی تو یہیں تھے،
میں جتنا بھی چیخوں،
میں جتنا بُلاؤں
مگر خواب ٹوٹیں تو کب بولتے ہیں!
وہ سب خواب تھا؟
کتنی پاگل ہوں میں......!

فریحہ نقوی

ایک پُرانا خواب

بہت قدیم سا وہ گھر
بہت بہت قدیم سا......!
وہ پتھروں کا گھر کوئی
وہ کون تھی؟ اسی کے ایک تنگ سے کواڑ میں کھڑی
ہوئی
وہ کون تھی؟
جو خواب میں علیل تھی
وہ جس کے زرد جسم کا تمہیں بہت خیال تھا
رقیب تھی مری؟
مگر بھلی بھلی لگی مجھے......!!
تھی اُس کے زرد رنگ پر گھنی اُداسیوں کی رُت
پگھل پگھل کے گر رہا تھا اُس کی آستیں پہ دُکھ......
مری تو رُوح خوف سے لرز گئی
"یہ کون ہے، یہ کون ہے؟؟" نگاہ چیخنے لگی
تمہاری اِک نگاہ نے جھکے جھکے یہ کہہ دیا، اسی گھڑی
کہ "یہ علیل ہے بہت
اسے مرا ذرا سا دھیان چاہیے
یہ جب بھی تن دُرست ہو گئی، مَیں لوٹ آؤں گا
اے زرد رُو......!
تُو کون تھی؟ میں جانتی نہیں تجھے
نہیں پتا!!
مگر تری حیات کی دُعا مری حیات ہے
تُو تن درست ہو کے کب دِکھائے گی؟

فریحہ نقوی

ہمارے کمرے میں پتیوں کی مہک نے

ہمارے کمرے میں پتیوں کی مہک نے
سگریٹ کے رقص کرتے دھوئیں سے مل کر
عجیب ماحول کر دیا ہے
اور اس پہ یہ گھڑی کی ٹک ٹک نے،
دل اداسی سے بھر دیا ہے
کسی زمانے میں ہم نے،
ناصر،فراز،محسن،جمال،ثروت کے شعر
اپنی چھکتی ہوئی دیوار پر لکھے تھے
اب اس میں سیلن کیوں آ گئی ہے۔۔۔؟
ہمارا بستر کہ جس میں کوئی شکن نہیں ہے
اس پہ کب سے،
نہ جانے کب سے دراز ہیں ہم
(وہ دائیں جانب، میں بائیں جانب)
میں اس سے شاید خفا نہیں ہوں
اسے بھی کوئی گلہ نہیں ہے
مگر ہماری خمیدہ پشتیں
جو پچھلی کتنی ہی ساعتوں سے
بس ایک دوجے کو تک رہی ہیں
وہ تھک گئی ہیں

شہاب صفدر

دریا

چمکتی ہوئی ریت
اور ریت پر دور تک یہ کھجوروں کے جھنڈ
ان کھجوروں کے لال اور پیلے
بھری گودیوں جیسے خوشے
وہ پیپل وہ برگد
پرانے دنوں کی کہانی کے کردار
یادوں کی اجرک میں سمٹے
ببول اور کیکر
اسے یاد کرتے ہیں
جب وہ یہاں سے گزرتا تھا
دھومیں مچاتا
کناروں پر اُمڈی ہوئی زندگی
اس کو دیتی سلامی
ہوا چھیڑتی تو بدن کف اڑاتا
کبھی موج میں
میٹھے نغمے سناتا
مگر وقت کے پھیر نے
کر دیا دور ایسے
یہاں اس کے ساتھی پرانے
سناتے ہیں اس کے فسانے

کہیں اجنبی دیس میں
وہ بھی دھند اوڑھے لیٹا ہے
کھویا ہوا ہے
سہانے دنوں کی کتھا میں
روانی کے ان موسموں کا خیال
ایک خواب
اک عجب کیفیت کی طرح
نیند سے بھاری پلکوں کو
آپس میں جوڑے ہوئے ہے
اگر کھل گئیں بندِ مژگاں
تو سیلاب بستی کو کر دے گا ویراں

سرمد سروش

شہرِ معتوب میں ہم نے مرنا نہیں

ہمیں بھی اجل آ دبوچے گی اک دن!
مگر ہم کسی اجنبی راستے پر مریں گے
کہیں بے کلی کے سبک گام گھوڑوں کی پتلی کمر سے
ڈھلک کر گریں گے
ہمیں شہر کے تنگ و تاریک گوشوں میں،
بستر کی راحت میں، عورت کی صحبت سے سرشار،
کھانے کی ٹیبل پر، ٹی وی کے آگے،
دفاتر میں کرسی میں بیٹھے ہوئے،
جان سے ہاتھ دھونے نہیں ہیں
چلو یاں سے آگے بڑھو
ہم کبھی شہرِ معتوب کی عیش و عشرت میں شامل نہیں تھے،
مبادہ، ہمیں کل کوئی ان میں گنتی کرے!!
برف کے ان جلیدوں کو دیکھو
یہ کیسے بتاشے کے مانند گھلنے لگے
کتنی صدیوں کا پانی،
دقیقہ دقیقہ سمندر کے پاتال میں گر رہا ہے
یہ جاروب آبی انہیں بھی کسی دن بہا لائے گا
یاں ابھرنے کی ہم کو اجازت نہیں تھی
یہاں ڈوب کر ہم نے مرنا نہیں ہے
چلو یاں سے آگے بڑھو
ہم کسی اجنبی راہ پر،
بے کلی کے سبک گام گھوڑوں پہ
بیٹھے ہوئے جان دیں گے۔

رائگانی

رات آدھی ادھر اور آدھی اُدھر ہے
مگر میں ابھی سے وہ سب نعمتیں چکھ چکا ہوں
کہ جو موت کا جام پینے سے پہلے،
اسیروں کو شب بھر میسر رہیں
زیست کا جام اوندھا پڑا ہے
تو خالی صراحی میں اب ہُو کے عالم سوا کچھ نہیں
بے کلی! صبحِ سقراطِ محبوس آنے میں کیا دیر ہے؟
جب خساروں کی حالت میں مرنا مراحلے شدہ ہے
تو پھر یہ کوئی دن، کئی دن کا جھگڑا ہی کیا ہے
بظاہر یہ دریا کے جیسی رواں زندگی ہے
حقیقت میں حرکت میں ٹھہرا ہوا کارواں زندگی ہے
اسی انجمادی روانی میں ہم غل غپاڑا مچاتے بہے جاتے ہیں
تیری فطرت کی ترکیب کی استواری میں کام آتے ہیں
میں کام آ رہا ہوں
جو رد کر چکا تھا وہ اپنا رہا ہوں
پھر اک بار امکانِ تردید کے کارِ صیقل گری میں پڑا ہوں

ارشد ملک

مِری چاہت امر کر دو

مجھے آئینہ کہتا ہے
زمیں پر حُسن کی زندہ روایت تم سے ملتی ہے
فضا صدیوں سے بوجھل اور شادابی سے عاری تھی
ہوا کے رَتھ پہ بس اِک حبس اور لُو کی سواری تھی
گھٹن تھی بے قراری تھی
اور ایسے میں تمہاری سانس مہکی اور خوشبو کا جنم ٹھہرا

کسی زریاب جھونکے سے تمہاری زُلف لہرائی
تو کہساروں سے جھرنوں اور دریاؤں نے بہنے کا ہُنر سیکھا
تمہاری آنکھ سے آنسو ٹپک کر خاک پر گرنے کی دیری تھی
کہ تاحدِ نظر سبزے نے آنکھوں کو جلا بخشی اور ہریالی نے اپنی آنکھ کھولی

تمہارے حُسن کے کچھ رنگ فطرت نے چُرائے اور یہ منظر بنائے
تمہارے خال و خد کو سامنے رکھ کر
مصور نے دُکاں اور شاعر نے زباں کھولی
تمہارے شوخ لہجے سے
نہ جانے کتنے موسم آ کے رعنائی چُراتے ہیں
تمہاری نیلگوں آنکھوں سے کتنے ہی سمندر ساحری کا درس پاتے ہیں
تمہارے مَرمَریں ہونٹوں کو چھو کر پھول اپنے حُسن کے
خاکے میں اُجلے رنگ بھرتے ہیں
تمہیں معلوم ہے تم اس زمیں پر زندگی، خوشبو، محبت اور رنگوں
کی علامت ہو

مگر یہ سب حوالے ایک جانب اور اُجالے ایک جانب اور
تمہاری مسکراہٹ ایک جانب
تو پھر اے مُسکراہٹ کی حسیں دیوی
یہ لازم ہے کہ تم بس خواب دیکھو، مسکراؤ، مُسکراتی اچھی لگتی ہو
مجھے تم مُسکراتی اچھی لگتی ہو

نازبٹ

مِرا مسیحا!

مِرا مسیحا کسی صحیفے کی طرح دِل کی زمیں پہ اُترا.........
میں اس صحیفے کی آیتوں کو بڑے تقدس سے اپنی آنکھوں سے
چھو رہی ہوں......
فضا میں وَجد اور سکون دِل میں.......
مِرے مسیحا کا نرم لہجہ مری سماعت کی ہر روش پر بہار بن کے
اتر رہا ہے.....
میں رنگ و خوشبو کے ذائقوں سے ہی بے خبر تھی......
مِرے مسیحا کا معجزہ ہے
کہ اُس کی نظروں کی سات رنگی دھنک کو اوڑھے میں روح
تک جگمگا رہی ہوں......
اور اس کی پوروں سے بہتی ہلکی گلابی خوشبو سے میری پوریں
مہک رہی ہیں.....
مِرے مسیحا نے کس لگن سے گلاب کی پتیوں سے مرہم کشید کر کے...
مِرے جھلستے وجود کے گھاؤ اتنی نرمی سے ڈھک دیئے ہیں
کہ جلتے صحرا کی ہر نشانی ہی مِٹ رہی ہے......
مِرا مسیحا اگر نہ ہوتا.........!!
مِرا مسیحا اگر نہ ہوتا تو یہ جو میرا وجود خا کی.....
جو روز آبِ بقا کے امرت کا قطرہ قطرہ رگوں میں اپنی سمو رہا ہے
وہ سوکھے ہونٹوں پہ پیاس لے کر
کچھ اور جینے کی آس لے کر
زمیں کی تہہ میں اُتر چلا تھا.......
میں جاں بہ لب تھی مرے مسیحا......!
میں جی اُٹھی ہوں.........!!!

سیمیں درانی

مجھے خود سے مِلنا ہے

سنو مجھے خود سے ملنا ہے
کہ ہجوم کی بے پناہ آواز کی تنہائی
کاٹ کھاتی ہے
روز اگتا سورج
ایک نیا سندیس جو لاتا ہے
وہیں میرے دل کی اماوس
سسک کے
دم توڑ جاتی ہے
رات کی چاندنی تاروں سے مل کر
کہکشاں کی سنگت میں
جب وار کرتی ہے
میرا بوجھل وجود اپنی ہی سعی میں
تاروں کی جھلمل سے
تہ تیغ ہوتا ہے
جب اشکوں کی رم جھم
یادوں کے تابوت پہ دن رات گرتی ہے
کفن تازہ جو ہوتا ہے
تو میں کھوسی جاتی ہوں
وہ معطر حصار
جو محبت کے لوبان کی دھونی سے
میرے اوسانوں کو خطا
ہر پل جو کرتا ہے
میں پھر سے کھوجتی ہوں
خود کو
کہ
خود سے جو ملنا ہے
کریدتی ہوں
کتبہ
اپنی ہمزاد کے مرقد کا
مگر اس کو سسکتا چھوڑ کر
میں جو الٹے قدموں لوٹ جاتی ہوں
بلک کر وہ لپٹ کے
مجھ سے جو بین کرتی ہے
کلیجہ ٹھنڈ پا کر
چیر کے سینہ
اس سے لپٹتا ہے
اتصال کی تپش کے لاوے میں بہہ کر
میں لوٹ آتی ہوں
دنیا کے دھندوں میں
منافقت کی سرخی سجائی
میری اندھی مسکراہٹ پہ
فریفتہ
حیوانوں کے جنگل میں
از سرِ نو
ایک اور تجسیم کی زچگی کا درد
جنم لیتا ہے

قرۃ العین فاطمہ

سفید بالوں والا بُڈھا

(نصیر احمد ناصر کو پڑھتے ہوئے)

تم سفید بالوں والے
بوڑھے بچے ہو
اور میں جیسے ایک ننھی بچی
جسے تمھاری نظمیں
آنے والے زمانوں کی
بھیانک تصویریں دکھاتی ہیں
ڈراتی ہیں
تم سفید بالوں والے خبطی
مجھے اپنے قدرتی مناظر جیسے لفظوں کے
حسن میں گم ہوتے دیکھ کر
اچانک صفحہ پلٹ دینے پر اُکساتے ہو
اور میں دیکھتی ہوں پرت در پرت منظروں کے نیچے
گرم سیال مادے ہیں
صدیوں کا لاوا ہے
سرزمینِ قرطاس پر چلتی ہوں
تو کہتے ہو
پسِ اوراق، زیرِ سطور کی دنیائیں دیکھو
جہاں چٹانیں سُوکھتی ہوئی نمی کو چاٹ رہی ہیں
آبی بخارات
جو آسمانوں کی طرف لے گئے تھے
واپس نہیں آئیں گے
میں ابھی بچی ہوں
لیکن میری نسلیں
ایک بوند پانی پر
عالمی جنگوں میں لڑتے لڑتے مریں گی!

تم سفید بالوں والے
دیوتائی بچے ہو
جو اتنی ''کم عمری'' میں
مستقبل کو تاریخ بنتے ہوئے دیکھ سکتا ہے
کتابیں لکھتے ہو
لیکن مجھے ان سے احتیاطاً دُور رہنے کا مشورہ دیتے ہو
کہیں میری نظریں
لفظوں سے رِستے ہوئے انسانی خون پر نہ پڑ جائیں
کہیں مجھے ان میں دفن
سوختہ روحوں کی چیخیں نہ سنائی دینے لگیں
کہیں میری آنکھیں دُھوئیں سے نہ بھر جائیں
اور میں تمھاری طرح
''ملبے سے ملی چیزیں'' دیکھ کر
اور ہڈیوں کے سوراخوں سے برآمد ہوتی
قدیم زمانوں کی موسیقی سُن کر
آنکھوں میں پانی آنے کا بہانہ نہ کرنے لگوں
وائلن اور پیانو کی دھنوں پر
آنسو چھپاتے ہوئے کوئی تم کو دیکھے
تو ہنستے ہنستے رونے لگ جائے
دنیا کی چالاکیوں میں
سادگی کی روحانیت تلاش کرتے ہو
دوستوں پر لکھتے ہو
تو انھیں عظیم بناتے بناتے
خود چھوٹے بن جاتے ہو
سچ کہوں! بے فیضوں پر نظمیں ضائع کرتے ہو!!

کبھی کبھی لگتا ہے
تم سفید بالوں والے بُدھا ہو
جو برگد اوڑھے بیٹھا ہے
تمہاری دانش بھری گمبھیرتا
تمہاری مونچھوں کے جنگل جیسی گھنی ہے
تمہاری دُھوپ اور چھاؤں
تمہاری شاعری کی طرح خالص ہے
اور تمہارے سر پر
سفید بادلوں کے ڈھیر ہیں
''سفید بادل'' اور ''ابد کے پرندے''
تمھیں اچھے بھی تو بہت لگتے ہیں
تمھیں معلوم تو ہوگا
کائنات کب واپس ایک نقطے میں سمٹ جائے گی؟

گر چہ تم بھی اسی زمین کے باسی ہو
جو دو قدموں کے فاصلے پر ختم ہو جاتی ہے
لیکن وسعتِ ہفت افلاک رکھتے ہو
اور ''تیسرے قدم کا خمیازہ'' بھگتنے
حالت تنہائی میں
نادیدہ ستاروں پر پھرتے رہتے ہو
واک کرتے ہوئے
وقت بھی پھٹے پرانے جاگرز پہنے
ننھے فوزان کی طرح تمہارے ساتھ چلتا ہے
راستہ تھک کر کسی ٹوٹے پرانے بنچ پر بیٹھ جاتا ہے
اور کہیں دُور سے آتی ہوا
تمہارے کانوں میں محبت کی سرگوشیاں کرتی ہے
اور تمہارا ٹیرس، جہاں تم سرما کی دُھوپ میں بیٹھے
خدا سے چیٹنگ کرتے ہو،
اردگرد کے مکانوں، کھڑکیوں سے دکھائی دیتی
چھتوں پر کپڑے ڈالتی
عورتوں کی طرح پھیلا ہوا ہے
اور تمہارے سامنے پڑی کرسیاں
خالی ہوتے ہوئے بھی خالی نہیں ہوتیں
ضرور کوئی خلائی مخلوق جو بظاہر نظر نہیں آتی
یا تمہاری کوئی اَن دیکھی محبوبہ وہاں بیٹھی ہوتی ہے
اور تم اس سے بے نیاز
اپنے ہاتھوں سے تیار کیے ہوئے گملوں، پودوں
تازہ کھلے پھولوں، معدوم ہوتے پرندوں، کیڑوں، مکوڑوں
اور چیونٹیوں کی قطاروں کو دیکھنے میں مگن رہتے ہو
بارش، دھند، بادل اور درخت تمہارے بیسٹ فرینڈ ہیں
اور ایک ہوا جیسی بیسٹی ہے
جسے میرے علاوہ کوئی نہیں جانتا
جو تم سے، تمہاری طرح
اداسیوں میں خوش رہنے کا ہنر سیکھنا چاہتی ہے
اور تمہاری خوبصورت نظموں جیسی نظمیں لکھنا چاہتی ہے
پتا نہیں ایسی کتنی ''بیسٹیاں'' اور ''بیسٹے'' ہوں گے
جو تمہاری ذات کے سمندر سے
اپنے اپنے کنوئیں بھر کر
تمھیں ''کھوہ کھاتے'' ڈال دیتے ہوں گے
تم ہو کہ پھر بھی لبالب ہوتے ہو
اور اپنا خالی پن نظم کے سوا کسی پر عیاں نہیں کرتے
تمہارا دکھ سمجھنے کے لیے
کئی نظموں اور زمانوں کا سفر درکار ہے!

موت تمہاری سہیلی ہے
مگر مجھے وہ اچھی نہیں لگتی
میں تتلیوں کے پیچھے بھاگنا،
تمہارے لگائے ہوئے درختوں کی چھاؤں میں بیٹھنا
اور تمہارے بنائے ہوئے راستوں پر چل کر
دریاؤں، جھیلوں، پہاڑوں

اور دُور پار کی بستیوں کو دیکھنا چاہتی ہوں
اور تم کہتے ہو
''عرابچی سو گیا ہے''
سمندر جوہڑ بن جائیں گے
تتلیاں اور پرندے معدوم ہو جائیں گے
پلیز ڈراؤ مت!
''مجھے ''پانی میں گم خواب'' اچھے لگتے ہیں
لیکن تمہیں پڑھتے ہوئے
میری نیند اُڑ جاتی ہے
اور مجھ میں سوئی ہوئی نظمیں جاگ پڑتی ہیں
اور میں لکھنے لگتی ہوں!

قرۃ العین فاطمہ

زندگی معدوم ہے

کیمپس کا پُل کراس کرتے ہوئے
اُس نے کہا تھا
جب زندگی معدوم ہو جائے گی
تو کہر میں لپٹے جاڑے بھی مر جائیں گے
دسمبر بھی نہیں آئے گا
زندگی معدوم ہو جائے گی تو
سارے موسم بھی مر جائیں گے
نہر کنارے......
میں نے ہنستے ہوئے کہا تھا
زندگی معدوم ہو جائے گی
تو ہم تم بھی مر جائیں گے
جاڑے زندہ رہیں گے
موسم آتے جاتے رہیں گے
آج کیمپس کے پُل سے گزرتے ہوئے دیکھا
نہر کے کنارے خالی تھے
کہر میں لپٹا جاڑا زندہ ہے
پر زندگی معدوم ہے......

رقص کرتا ہوا اِک عالمِ گویائی ہے

(ہائیکو)

ڈاکٹر نزہت عباسی

ہائیکو

بہنے دو آنسو
من دھرتی سے اُٹھتی ہے
یادوں کی خوشبو

موسم کے یہ رنگ
کتنے روپ بدلتے ہیں
عقل ہے میری دنگ

بجتا ہے اک ساز
دل کے بجتے ساگر کی
دلکش ہے آواز

غم کے کالے ناگ
تنہائی میں ڈستے ہیں
پُروائی ہے آگ

پُرنم ہیں پلکیں
بھیگے بھیگے ساون میں
جلتی ہیں آنکھیں

کہیں نہیں ہے چھاؤں
دھوپ میں ہر سُو جلتے ہیں
ہم سر سے تا پاؤں

صحرا کی یہ ریت
کانٹوں کے چھالوں کے اب
اُگنے لگے ہیں کھیت

لہجے کی یہ آنچ
لمحہ لمحہ پگھلا جائے
ٹوٹے دل کا کانچ

سن تو سہی جہاں میں ہے ترا فسانہ کیا

(افسانے)

سٹیج سے اُترا ہوا شخص

رشید امجد

اپنا کردار ادا کر کے جب سٹیج سے اترا تو کردار ادا کرنے کے لئے چڑھایا ہوا مکھوٹا اتارے نہیں اتر رہا تھا۔ میک اپ روم میں جا کر دونوں ہاتھوں سے مکھوٹا اتارنے کی ساری کوششیں رائیگاں گئیں۔ خیال آیا کہ شاید دیر تک چڑھا رہنے سے جم گیا ہے اس لئے کچھ انتظار کر لینا چاہئے۔ چنانچہ ٹی روم میں آ کر بیٹھ گیا اور روم بوائے سے کہا کہ چائے لے آئے۔ چائے پیتے کافی دیر ہوگئی اور اس دوران کئی جاننے والے آئے اور دو چار باتیں بھی سب سے ہوئیں لیکن کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ اس نے ابھی تک مکھوٹا کیوں نہیں اتارا۔

دفعتاً احساس ہوا کہ شاید کسی کو احساس ہی نہیں ہوا کہ اس نے مکھوٹا پہن رکھا ہے، بس یہیں سے مخمصہ شروع ہوا۔

''تو کسی کو بھی معلوم نہیں ہوا کہ یہ میں نہیں کوئی اور ہے؟'' اس کا شریک کردار بھی اپنا رول ادا کر کے ٹی روم میں آ گیا تھا۔

''رول بہت اچھا کیا'' وہ اس کے قریب بیٹھتا ہوا بولا۔

''لیکن یہ مکھوٹا''......اس نے کچھ کہنا چاہا۔

''کون سا مکھوٹا'' اس نے چائے میں چینی ملاتے ہوئے بے دھیانی سے پوچھا۔ وہ کچھ نہ بولا......'' کیا اسے نظر نہیں آ رہا ہے کہ میرے چہرے پر......''

چند لمحے خاموشی رہی، پھر اس نے پوچھا......''تم مجھے دیکھ رہے ہو۔''

''ہاں'' اس نے حیرت سے کہا......''کیا بات ہے؟''

''یہ میں ہوں......'' وہ اتنی آہستہ آواز میں کہ بمشکل خود سن سکا بڑبڑایا۔

وہ ہنس پڑا......''لگتا ہے تم ابھی تک سٹیج پر ہی ہو''

''لو بھئی میں چلا، میرا رول شروع ہونے والا ہے۔'' وہ چائے کا آخری گھونٹ لے کر کھڑا ہو گیا۔

اب ٹی روم میں وہ اور بیرا رہ گئے تھے۔ بیرا برتن اٹھانے آیا تو اس نے پوچھا......''مجھے پہچانتے ہو۔''

بیرے کو کچھ دیر سمجھ نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

''مجھے پہچانتے ہو'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

بیرا ہنس پڑا......''صاحب لگتا ہے آپ اگلے رول کے ڈائیلاگ یاد کر رہے ہیں۔''

''کمال ہے کسی کو احساس ہی نہیں رہا کہ میرے وجود پر چہرہ کسی اور کا ہے؟ گھر پہنچا تو خیال تھا کہ بیوی بچے پوچھیں گے......''کون ہو تم؟'' لیکن کسی نے کوئی سوال نہ کیا، الٹا بیوی بولی......''بہت دیر لگا دی ہم تو فکر مند ہو رہے تھے۔''

اس نے مکھوٹے کو ٹٹولنے کی کوشش کی......''میں، یہ میں ہوں نا۔''

بیوی پہلے تو حیران ہوئی۔ پھر ہنستے ہوئے بولی...... ''تو اور کون ہے، میرا خیال ہے تم ابھی تک سٹیج پر ہی ہو۔''
''شاید......'' وہ بڑبڑایا۔ پھر خود سے پوچھا...... ''عجیب بات ہے کسی کو میرا چہرہ اجنبی نہیں لگ رہا۔''
کپڑے بدلتے ہوئے سوچا...... ''کیا معلوم یہی اصلی چہرہ ہو، میں نے مکھوٹا پہنا ہی نہ ہو۔
مگر یاد آیا سٹیج پر جانے سے پہلے اس نے خود مکھوٹا پہنا تھا، بلکہ دونوں ہاتھوں سے فٹ کر کے اچھی طرح ہلا جلا کر دیکھا تھا کہ کہیں ڈھیلا تو نہیں اور جب سٹیج سے اترا تھا تو دونوں ہاتھوں سے زور لگا کر اسے اتارنے کی کوشش کی تھی تو پھر......
اس نے آئینہ میں دیکھا...... یہ چہرہ اس کا نہیں تھا اور چہرے پر دباؤ کا احساس بھی ہو رہا تھا۔
''کچھ میرے چہرے پر چپکا ہوا ہے......''
''کیا......'' خود سے پوچھا، مکھوٹے کو پہلے آہستگی سے، پھر زور سے چھوا، اتارنے کی کوشش کی۔
''میرا اصل چہرہ کدھر گیا......اور یہ سب مجھے اجنبی کیوں نہیں سمجھ رہے؟'' اگلے دن جہاں جہاں وہ جاتا تھا، جس جس سے ملتا تھا، گیا اور ملا لیکن کسی نے اسے اجنبی نہ جانا۔
''یہ کیا گڑبڑ ہے؟'' اُس نے سوچا...... ''میں خود کو اجنبی لگ رہا ہوں لیکن کوئی مجھے اجنبی نہیں جانتا۔''
سوچ میں پڑ گیا...... ''کون مجھے بتائے گا اور میں کیسے جانوں گا؟''
خیال آیا جس سکول میں پڑھا تھا وہاں جانا چاہئے کہ ابھی وہاں بہت سے لوگ ایسے تھے جو اسے اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے۔ پہلا شخص تو گارڈ تھا جو اسی انداز میں کھڑا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی لپکا...... ''صاحب کیسے ہیں، بہت دنوں بعد آنا ہوا۔''
وہ مرجھا گیا...... ''تو یہاں بھی......''
کمپاؤنڈ میں دو تین پرانے اساتذہ تھے۔ اسے دیکھتے ہی بولے...... ''آؤ بھئی بہت دنوں بعد چکر لگایا۔''
''تو یہ سب بھی......'' بے دلی سے سرسری سے باتیں کر کے وہ باہر آ گیا۔ دو تین سڑکیں چھوڑ کر اس کا ایک کلاس فیلو رہتا تھا۔ دونوں میاں بیوی کے ساتھ پرانے مراسم تھے۔ بے دھیانی میں ان کی طرف چل پڑا۔ اس کی بیل کے جواب میں بھابھی نے دروازہ کھولا...... ''ارے آپ، آج کدھر بھول پڑے۔''
اس کے پیچھے سے دوست نے سر نکالا...... ''تم، خیر تو ہے نا، صبح صبح۔'' وہ کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔
''اندر آؤ نا۔'' دوست ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا۔
''ہم تو ناشتہ کر چکے، آپ کے لئے لاؤں۔''
''نہیں...... کچھ نہیں۔''
''اچھا چائے لاتی ہوں......''
وہ اور دوست ایک ہی صوفے میں بیٹھ گئے۔ اس کی خاموشی دیکھ کر دوست بولا...... ''خیر تو ہے نا۔''
وہ چند لمحے چپ رہا، پھر رک کر بولا...... ''میں کون ہوں؟'' دوست کو شائد اس کی بات سمجھ نہ آئی۔ حیرت اور تجسس سے اسے دیکھتے ہوئے بولا...... ''تم...... ہو۔''
''میں واقعی میں ہوں۔'' وہ بڑبڑایا۔

''تو اور کون ہو'' دوست کو کچھ سمجھ نہ آیا۔ اتنے میں بھابھی چائے لے آئی۔ گہری خاموشی دیکھ کر بولی......''سب ٹھیک ہے نا، بھائی کیا بات ہے؟''

دوست ہنس پڑا......''اس کے مذاق کی عادت نہیں گئی۔ پوچھ رہا ہے میں کون ہوں؟''

بھابھی کے پلے کچھ نہ پڑا۔ حیرانی سے بولی......''یہ بھائی......ہیں۔''

''کیا میں واقعی میں ہوں۔'' اس نے اپنے آپ سے پوچھا......''ان سب کو یہ مکھوٹا کیوں دکھائی نہیں دیتا۔

''تم ٹھیک تو ہونا!''

''شاید......شاید نہیں'' وہ اٹھا اور تقریباً دوڑتا ہوا باہر نکل آیا۔ وہ آوازیں ہی دیتے رہ گئے۔

اب کیا کیا جائے......کس سے پوچھا جائے۔ خیال آیا پرانے محلے کا ایک بوڑھا ابھی زندہ ہے۔ اسے بچپن سے جانتا ہے۔ وہ اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ بوڑھے کی آنکھوں میں جالے پڑ گئے تھے، بولا......''بھائی کون ہو؟''

ڈرتے ڈرتے، جھجکتے بولا......''میں......!''

اچھا تو تم ہو، کیسے ہو، بیٹا مجھے تو اب کچھ صاف دکھائی نہیں دیتا۔''

ست رنگے پرندے نے پر پھیلا کر چھوٹی سی اڑان بھری۔

''تو انہوں نے مجھے پہچان لیا، میری آواز سے......لیکن یہ کون بتائے کہ چہرہ اجنبی ہے، یہ مکھوٹا'' اس نے آہستگی سے چہرے پر ہاتھ پھیرا......''میرا اصلی چہرہ کہاں ہے؟''

باغوں سے پرندے اور پھولوں سے ان کی خوشبو اڑ جائے تو ان کی پہچان باقی نہیں رہتی۔ وہ بددعائے جاتے ہیں۔

''میں بھی بددعایا ہوا شخص ہوں۔'' اس نے سوچا......''لیکن مجھے کس کی بددعا لگی ہے؟''

پھر خیال آیا......''پہچان ہی نہیں تو شخص کیسا......میں تو ایک اجنبی ہوں، دوسروں کے لئے نہیں اپنے لئے، میں تو سٹیج سے اترا ہوا ہوں۔''

☆......☆......☆

مجیٹھے پت جھاڑ، بسنت رُت کھڑی دوار

سمیع آہوجا

شہر ملتان ہے اور۔؟

اور حسین آگاہی کا چڑھائی چڑھتا بازار میری پشت پر اور سڑک پار زیر تعمیر بنک کی گولیوں سے بنا پلاسٹر زخمی دیوار، پانی پت کے دلیر جنگجو مذہبی انتہا پسندوں کا اتحادی گروپ حسین آگاہی کی رہائشی عمارتوں کی چھتوں اور بنک پر چڑھے سرکاری سپاہ کے مابین مورچہ بندی اور خونی تصادم کہ جس کا سبب قومی الیکشن کے نتائج شفاف نہ ہونے سے انکاری۔

امن وامان پائمال کرنے کے بموجب نتیجہ، مورچہ بندی، خون ریزی، لیکن دونوں جانب تحمل پائمال کیے جانے کا سبب۔؟

ساری وجوہات اور الجھنوں کا سبب کیسا۔؟

تصور اور دماغی کشمکش کی زنجیروں میں پھنسی، کھچی تصاویر۔؟

مٹی مٹی سی بوسیدہ، بدبو کی شرانگیزی کو تانے بے خبری ترشح کرتیں اور تصویروں کے دھندلائے ہوئے عکس آئینوں کی پشت زنگ بھری ہونے کے سبب کچھ واضح نہیں تھا، مگر جب چند سالوں کے دوڑتے، دھول اُڑاتے رخش ٹاپوں نے آئنے کا زنگ صاف کیا تو بات وضاحت سے کھلنے لگی کہ واویلا نہ کیا جاتا تو جاگیردار اور مُلّا کی حاکمیت ہاتھ سے نکل جاتی، اور ان کے پلے کیا رہ جاتا، امریکہ کی ساری ترکیب، مذہبی فرعونیت کے پیچواں اپنی ہی مسلط کردہ اندھیر نگری میں وقت کی روشنی کے بل عیاں ہو جاتا اور ان کا سب کیا دھرا، ٹائیں ٹائیں فش۔ مگر اُسی زمان میں فوج کی حاکمیت قائم کرنے کی انتہا پرستی کیسی۔؟

اسی ٹھونسی گئی حاکمیت سے سارا ہی امن وامان تحس نحس ہو گیا۔؟

یہ مسئلہ اُسی زمانے کا پیرہن تن زیب کیے کھڑا تھا۔!

جب مَیں ڈیرے اڈے سے رکشے پر جائے ٹھیکے پر پہنچا تو بنک کے بیرونی حصے پر پاڑ بندھی ہوئی تھی۔ جسے دیکھتے ہی انشا خان انشا ذہن میں مچل گئے۔ سب اس کو سر و باندھے ہیں تو اس کو تاڑ باندھ، بوسے کی گر طلب ہو تو گرد اس کے پاڑ باندھ۔ اور سول کنٹریکٹر کو ایسے کسی بوسے کی تمنا تھی یا نہیں، مگر اُس کے معمار بندھی پاڑ پر بیٹھے بیرونی حصے کی فنش کو تکمیل پر پہنچا رہے تھے۔ اوڈ عورتیں پاڑ پر چڑھتی پلاسٹر کا مٹیریل معماروں تک پہنچاتی اور زخمی عمارت پر چڑھتا پلاسٹر اوپر سے پاڑ کے بل پر نیچے کی جانب رواں۔

اُسی عمارت میں ہمیں کام شروع کیے کوئی پندرہ سولہ ایام گذرے تھے۔ میں دوپہر، کھانے کے وقفہ سے کوئی گھنٹہ بھر پہلے ورکنگ ڈرائنگ کا سیٹ سٹور میں رکھنے پہنچا تو ورکشاپ اور سٹور کی دیوار کے ساتھ پانچ چولہوں پر اوڈ عورتیں روٹیاں پکا رہی تھیں اور ساتھ بیٹھی عورتیں پیڑے بنا کر توے پر روٹی ڈالنے والی کے تھال میں رکھتی جا رہی تھیں۔ میں ایک

اچٹتی ہوئی نظر سے اُن کا جائزہ لیتے سٹور میں کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ ورکشاپ کا سنچری کے ایام میں لپٹا بوڑھا فورمین میری جانب لپک کر آیا، اور بڑی بیتاب لجلجاتی آواز میں کُھلا۔!

صاحب بات ہے تو بہت پرانی، مگر یہ درد میرے گاؤں اور میرے اپنے گھر کو اب تک تڑپاتا ہے۔ میرے سوالیہ کھوجتے ہلتے چہرے پر وہ یک دم بھرائی ہوئی آواز میں بولا، باہر روٹی پکاتی عورتوں میں سے ایک لڑکی کے نقش ونگار گاؤں سے اغوا ہونے والی لڑکیوں میں سے ایک لڑکی توشی سے ملتے ہیں، جو میری پھوپھی زاد تھی اور میری منگ بھی۔ اُسے بُلا کر آپ ہی پوچھ سکتے ہیں کہ وہ کون ہے۔!

لڑکی سے جب پوچھا کہ اُس کا توشی نامی عورت سے کیا رشتہ ہے، تو پہلے تو تجسس سے اُس کی آنکھیں پھٹ پڑیں، پھر ہلکی سی مُسکراہٹ میں کُھلی۔ وہ میری ماں ہے اور پھر استفسار پر بولی، وہ یہاں ہی ہے۔ بلانے کی خواہش پر وہ ایک بوڑھی مگر مضبوط ہتھ جوڑ کی اپنے نقوش سے ملتی عورت کو لے آئی۔ اُسی کی زبانی ساری بات کُھل گئی۔!

فصل کی کٹائی پر وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ رفع حاجت کے لیے سات آٹھ پرے کھیتوں میں اُتری ہی تھی مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں چھ کی چھ لڑکیوں کے منہ بستہ، چہرے کنٹوپ ڈھکے، شکنجوں میں کسی ہوئیں، وہ انہیں اونٹوں پر لادے کٹتے کھیتوں اور پٹتے ڈھولوں سے مخالف سمت میں نکلتے چلے گئے۔ پتہ تو اُسے چل ہی گیا کہ اُن کا اغوا گاؤں کے بڑے زمیندار کی بیٹی کے سبب ہوا، اور باقی کی لڑکیاں بھی اُسی خاندانی دشمنی میں باندھ لی گئیں، اُن کے اغوا میں دور پار کے اُن ہی کے خاندان کے زمیندار کے کارندوں کی ساری جُرت چالاکی تھی۔ اور پھر وہ تین ہاتھوں میں بکے بعد دیگرے بکتے، لُٹتے تڑپ رہی تھی کہ۔؟

کہ ایک رات میرا ماہی مرد آیا اور مجھے وہاں سے نکال لایا اور بس۔!

لیکن جیسے ہی اُس نے لڑکیوں کے اغوا کے الزام میں ڈھول کے تھانے میں مارے جانے کی بات سُنی تو وہ بے ساختہ چلاّ اُٹھی۔؟

لعنت ایک نہیں ہزار بار بھیجوں گورے پر۔!

میرا ڈھول تو کالا، سورج کرنوں کی لشک بکھیرے، جہاں تک۔؟

جہاں تک جائے نظر، روشنی ہی روشنی۔!

مگر اب وہ ظالم گورا کہاں ہے، اُس کی تو بوٹی بوٹی کر کے کتوں کو کھلاؤں، اتنی ہمت ہے ابھی مجھ میں۔؟

بس اسی بات پر خیالوں کی اُڑتی پتنگ کی ڈور بوڑھے فورمین کی دماغی سکرین پر پھیلتی چلی گئی۔

اُن اطراف کی لڑکیوں کی اتنی ہمت کہاں کہ وہ جا گھستیں بندی گھر میں، بس گھر کے مردوں کی گھسر پُھسر، اور پھر رات کی منڈلی میں عورتوں کی آہ وزاری میں ساری بات پلے پڑی، سرکار اور اُس کے الزام تراش کارندوں پر نفرین پھنکاریں اور اُس کے لیے پژمردنی کا ہول، ذہنی پردے پر کھنچی تصویر۔ سلاخوں کے پیچھے ملگجی روشنی میں وہ ادھڑا ہوا، فرش پر بچھا خون میں لت پت۔ مگر اُس کے ڈوبتے سانسوں کا حساب، کس گھڑی میں کُھلے۔ اب دُرگا مئیا ہی جانے کہ وہ پلٹے گا کہ اُلٹے گا۔؟

بس سب کے ساتھ یاس میں لپٹا رہ گیا۔!

اب اس درد کا حساب تو نہیں رکھا جا سکتا، جو سارے وجود میں رڑکتا ہے۔!

جب بھی رات کا پہلا پڑاؤ ڈھلتے ہی بوجھ شکم سے ہلکی ہوتی لڑکیوں کے ٹولے میں وہ اپنی مست کرتی نئے تانوں سنگ ایسا اُترتا کہ ساری منڈلی چہکاروں سے چھلکنے لگتی۔ جھوپڑ پٹی کی ساری ہم جولیوں کی چھوٹی بڑی ٹولیاں اپنے مَن مندر میں اُس کی مورتی سجائے آرتی اُتارتے تھکتی نہ تھیں۔ لیکن کسی پر اُس کے بند دریچے کے کواڑ نہ کھلتے کہ دستک دوار بیچ نجانے کون کھڑی رادھا یا گدھا ڈالتی سنگت میں سے کوئی سہیلی یا میرا یا کوئی اور۔؟

مگر لڑکیوں کی ہر مچلتی گرت پر بولوں کے پت جھڑ موسم میں رنگی ادھیڑ عمر تا بڑی بوڑھیوں کے تیز و تُند چون زناٹوں میں پھنکارتے بول جھپٹیں کہ ڈھول نہ گورا نہ کالا، ساری ڈولتی، کنارے سے دُور، کھیتے کھیتے ہلکان بنیا، جاڑ کے اُس دوار جہاں سنگیت میں نقش گھڑتا چتر کارنیوں میں رَس ٹپکاتے مست کرتے، اتھا پریم کتھا کا نگار خانہ سجائے، نئے رنگوں میں نہال، لہر در لہر بدلتی اُٹھتی بیٹھتی، سُر بدلتی رقصاں موقلم انگلیوں سے کھیلے۔!

خیر یہ تو نہری موکھے جیسے بڑی گہرائی سے اُٹھے کنویں سے نہر کا پانی ذخیرے کے لیے کھینچتے رہٹ کے آس پاس پھیلی جھوپڑ پٹی کی بات تھی۔ جو نہر کے جنوب مغرب والے تیز رواں پانیوں کی جڑ سے نکلی پتھروں کی ترچھی اُٹھی دیوار کی گتھی گرفت میں جکڑا پندرہ سولہ فٹ اونچا مٹی بھرا بند، جس پر بنی پندرہ فٹ چوڑی کچی سڑک، اور جب اسی چوڑی سڑک سے دوجی طرف، آہنی جنگلہ لگی بیس فٹ گہرائی میں اُترتی، گھنے چھتارا، مختلف اقسام کے درختوں کے ذخیرے کے تنوں سنگ چپکتی بیٹھتی ترچھی دیوار اور جس میں کافی اونچے ٹیلے پر بنی، سیلابی یا تند موسمی بارش کے پانی سے، مکینوں کو بچاتی، پوشیدہ جھوپڑ پٹی۔ محکمہ انہار کے ہندو ملازمین، جن کی بڑی تعداد بیلدار، رسویا، مالی، گھوسی، مانجھی اور پٹے والے، اور سرکار کی چلتر کارگزاری میں شریک منشی اور محرر گودام و جانور اور درختوں کے کٹے تنوں سے لگی جلنے والی لکڑ کی پالوں کے اور لکڑ کے خریدار اور ٹھیکے داروں پر سرکاری نظر رکھنے والے دیگر دفتری، روزنامچے کے بہی کھاتے کا حساب رکھتے منشی اور چوکیدار اور لکڑ منڈی میں دریا سے آنے والے قیمتی لکڑ کے شہتیروں اور پھر منڈی سے اُٹھنے والی عماراتی لکڑ کے حساب کتاب کا اندراج اور قیمت کا بل بنانے پر متعین چار سینئر منشی اور چور بازاری پر نگاہ رکھنے کے لیے محکمے کے ہی مسلح سپاہی۔ ان سب کی مئے خوری کے لیے کیکر کی چھال، گلے سڑے منڈی کے پھلوں اور سونف کی ملی جلی شراب بنانے کے لیے ایک پوشیدہ بھٹی، جس کی خبر بڑے صاحب سمیت تمام افسران کو تھی، لیکن صاحب کی مست آنکھوں کی پلکوں پر بیٹھی ڈولی ابھی اُٹھنے کے لمحے، لپک جھپک سے درگذر بالکل ساکت، مگر اطلاع ملنے پر اک مسکراہٹ کی آنکھ مچولی تلاش جاری رکھنے کے لیے مخبر کو ضرور بھٹکاتی۔ اس شراب کے بنیادی جز، منڈی کے گلے سڑے ہر نوع پھل، اور اسی کی تیاری کے لیے مخفی نسخہ جات کی بازاری خریداری اور پھر بڑی بڑی پیتل کی ولٹویوں میں کشید سے پہلے کی تیاری اور پھر کشید کے بعد بڑے بڑے افسروں کے گھروں کے بیروں سے سستی خرید کی جاتی شراب کی خالی بوتلوں کی خریداری، اور کشید شدہ شراب کی اُن مانجھی ہوئی بوتلوں میں بھرائی کے لیے ایک پاسی خاندان جو کل تک تاڑی بیچتے تھے اور اب کارِ سرکار کے ورکروں کے لیے کشید کرنے میں ماہر بن چکے تھے۔ مالیوں کی چڑھی فہرست میں اُن ہی کے چھ افراد سرکار کے پکے ملازم۔

دوجے کنارے پر کوئی پانچ میل پرے شمال کی جانب، شیر شاہی سڑک کے کنارے ایک قصبہ جو میلوں پھیلے کھیتوں اور مختلف دیہاتوں سے گھرا ہوا، جس کی شہرت اجناس گنا گڑ شکر گندم اور چاولوں کی منڈی پھر دریا سے آنے والی عماراتی لکڑ کی بھی منڈی، ذخیرے کے عقب میں پھیلے شہروں کی لڑی کی ضروریات اجناس پوری کرنے کے لیے محکمۂ انہار کا گھاٹ، جس میں کھڑی سرکاری اور عمومی استعمال کی چھوٹی بڑی کشتیاں۔ اور پھر پہاڑی کی بُلندی پر منتوں کو منزل پر

پہچانے والی دُرگا ماں کا مندر اور ساتھ ہی ایک کشمیری بزرگ کی سمادھی کے سبب بے پناہ شہرت۔ سمادھی اور مندر پر آنے والوں کا تو ہمیشہ سے شب و روز جمگھٹا لگا رہتا تھا، نجانے کہاں کہاں سے آتے، کلیجے میں مونڈھے چڑھائی جانے والی آس کی دہی جمائے۔ ہر منگل کو ہر اک مصیبت کو سنگل پڑنے کی بات دل میں درشن کا لبو روشن، خشک اجناس کا چڑھاوا چڑھانے والوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے۔ اور چھوٹے بڑے پنڈت چڑھاوے کو قبول کرتے مشکلوں کو جھاڑتے تھکتے تو تازہ دم پنڈت اُسی گدی پر براجمان ہو کر مشکلات جھاڑنے لگتا۔ اور پھر ہر سال درگا میا کی کشمیر کی پرانی پہاڑی کھو میں بنے مندر پر جاتے ہوئے پہلے اسی مندر سے چڑھائی چڑھنے کی قبولیت کا اشارہ لینے جمع ہوتے تو میلوں لمبا پچیس یوم تک میلہ لگا رہتا تھا۔ اور اسی میلے اور مندر پر آنے والی کنواریوں کے نینوں میں اُس کا بھی خواب بسا ہوتا کہ شاید اک جھلکِ دیدنی کا میل ملاپ ہو سکے۔ جھوپڑپٹی کی تو بات ہی جُدا تھی۔ مگر قصبہ میں بھی اُس پر آنکھ رکھنے والیاں تو تھی ہی، وہاں تو وہ ہر لڑکی کے آنکھوں میں ملاپ کی آس پر دل میں اُترتے ہی استھان پر جما مُرلی منوہر اپنی نَے سے سحر انگیز شہر بسا دیتا۔ اور یہ دیدار کا موج میلہ سجے نہ سجے، اُس کی نَے کے جادو میں مست الست لڑکیاں املی میں بھیگے لڈو پیٹھیوں کا چسکا لینا بھول جاتیں۔ لیکن نہر پار، پانچ سات کوس پرے متوالے کی نَے سے سارے قصبے کو اپنی درد بھری رسیلی تانوں سے بٹا ہوا رنگین پھندا تو ضرور ڈالتا مگر بے خبری کا نہیں بلکہ اُن کے وجود پر لگے زخموں پر مرہم رکھنے کو بیدار کرتے، سارے خنجر بدستوں سے نبرد آزمائی، مجادلہ کرتے قصابوں سے روشناسی کا درس سونپتا۔ مجیٹھے کی جڑوں کے پکے لہو رنگ سے وہ یوں آشنا تھا کہ خاندانی وصف نہ صرف رگوں میں پیرتا بلکہ وجود کا رواں رواں تک اس میں رچا بسا ہوا تھا۔ خاندانی طور پر تو وہ صدیوں سے رنگوں میں رنگتے، بدن سے ہم کنار ہوتے پیرہن کی رنگین چمن آرائی کو چھکاروں سے بھرتے آئے تھے۔ مگر فرنگی ستم ظریفی نے اُس کی زندگی کے راہوار کا منہ موڑ دیا۔ شہید خاکی شاہ اور کنار جہلم ان دونوں سے رشتہ تو باندھے اک زائر نے جو دُرگا میا کے درشن کا بھوکا ہر بار ہر موسم میں پہاڑ چڑھ کر کوہ میں اپنے بھجن سے آرتی اُتارتے لوٹتے، موسیقی بندھن میں بندھا آ ڈیرہ جماتا، شُدیٔ جہلم کنار خاکی شاہ کے اور اَن گنت موسیقی کے چھینٹوں میں سازوں اور آوازوں کا زیر و بم بانٹتا۔ اور جب ڈھول رنگوں کے رَنت بھاؤ سے آشنا ہو ہی رہا تھا کہ اک تند گرما کی بھری دوپہر میں وہ بچوں سنگ آنکھ مچولی کھیلتے دُرگا مائی کے عشق میں ڈوبے کلاکار کی آنکھوں میں آ پھنسا تھا۔ پہلے تو وہ اُس سلونے روپ کی معصومیت میں الکائی نَے کے رس میں غرق اُترتا جا رہا تھا، جانب دریائی لہروں کے، کہ درمیان میں ڈھول حائل۔ بس اُس نے اُسے اُس کے رنگ ساز ماں باپ سے موسیقی کی بند گردشوں کو اُس پر کھولنے کے لیے درگا ماں کے نام پر مانگ لیا، مانگنا بھی کیسا، رہنا تو اُسے ماں باپ کی گود میں ہی تھا مگر موسیقی کے درس سنگ اُس کا ٹانکا لگ گیا۔ اور سر نکالنے تک اُس کا حال اور مال سب سازوں اور آوازوں میں ہی اُتر گیا اور جوانی چڑھتے ہی وہ سب کنوار، جوان ادھیڑ اور بوڑھی عورتوں کا سلونا منوہر۔

نہر پر سیلابی بند بنے اونچے کنارے، دوجی جانب بند کی ترچھی ڈھلوان پندرہ فٹ گہرائی میں۔ اونچی شیر شاہی جرنیلی سڑک کے دس فٹ چوڑے کچے سے نیچے اُترتی ترچھی ڈھلوان جو کھیتوں کے کنارے لگے ٹالی اور پام درختوں میں پھیلے درد بھری نَے کی تانوں کی خوابیدہ گہرائی، جولانی اور مستی سے رچی بھری لہکتی جھومتی ہوائیں خوشبوؤں اور نشے سے بھرے میلے کی رنگ بکھیرتی چہکتی لڑکیوں کو سرشار کرتی، جو من ہی من میں ملاپ کی آرزو مند مگر ملاپ کیسا؟ وہ تو اٹھارہ سو ستاون والے سولی چڑھے خاکی شاہ کا پیروکار، اُن ہی کی آتش و خار دار راہِ آزادی کا چناؤ کرنے والا موسیقی کی درس گاہ میں آواز و ساز کے مست الست کرتے جہان کے ہر کونے کھدرے کو دکھاتے، سمجھاتے، اُتار چڑھاؤ کے بہاؤ میں نیا اُتارنے

کی صلاحیت کو بیدار تو کر ہی رہا تھا، مگر اچانک ہی دل میں اک چنگاری سی بھڑک اُٹھی کہ فرنگی سکول میں انسانی صلاحیتیں بیدار کرنے کی بجائے بچوں کو دفتر کا منشی بننے کا گمراہ کُن درس دیا جا رہا ہے، بس اسی لگن پر گرد و پیش کے بچوں کے لیے اپنی چھوٹی سی جھونپڑپٹی میں سکول کھول ڈالا اور چند ہی دنوں میں بچوں کی ریل پیل سے اُس کی بسائی جھونپڑپٹی ہمہما اُٹھی۔

چالیس پچاس فٹ چوڑی نہر۔!

اس کی چڑھائی چڑھتے، شانت ندی کی روانی پر نظر پڑتے ہی اُس کی گنگناہٹ میں، یہی کتھا اپنے دھیمے سروں میں کھولتی ہے کہ۔؟

دیکھو۔!

ذرا دھیان اور غور سے دیکھو اور سننے کا جگر اپیدا کرو۔!

اسی اونچے کنارے سے اُٹھتی نگاہ، جو کھیتوں پر دوڑتی ہوئی پہنچتی ہے کہاں۔؟

پانچ میل کی دُوری پر پڑتی کمند میں فرنگی تنافر اور تشدد میں تڑپتا ترسیدہ خوف و ہراس میں لپٹا، اپنے دانش کو بسرام کرتا قصبہ، جس میں بسائی پانچ چھوٹی سی جھونپڑیوں میں درگا ماتا کے متولیوں اور زائروں کو سناتے اور سکھاتے بھجنوں، اور تال اور لے کے سازوں کی تربیت دیتے اور موسیقی کے علاوہ بچوں کی ابتدائی تعلیم میں پکتی ایسی لگن کہ غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کا بے خوف ولولہ، کس کی اور کہاں تک ماری جاتی کمند کو روشن کرتی آنکھیں اور بیراگ میں پھنسے بے حس لوگوں میں سمٹی جھونپڑپٹی میں ہی مٹی لپے کچے مکانوں میں مقید اور سوچوں میں کھال پھاڑتی، درد سے اُمنڈتی چیخیں حلق اٹکیں اور زمین پر پڑتی ضربیں، بلبلاہٹوں سنگ اُڑائے دھول، گُم کرے محنت کی کشید، اونچے کناروں بیچ پھنسا تیز رو پانی، اور ڈولتی گھاٹ لگی کشتیوں سے ٹکراتا چھپاک، اسی میں لپٹی باتیں اور عمروں کی کھلکھلاہٹ میں بے سود ہم کلامی۔

کنارے کچی دریائی رگڑوں سے مدّ ور ہوئے پتھروں کے بنے روڑوں سے کُٹی پکی سڑک محکمہ انہار کے استعمال کے لیے ہر دو جانب سے پھاٹک لگے، اسی پر اک گورا گھوڑے پر سوار، گاہے کوڑے لہراتا، اور بیلداروں اور مسلح پہرے داروں کا پیدل لشکر، یہ ہی کچی پکی سڑک شارع عام نہیں تھی اسی کی دوجی ڈھلوان پر کیکر بکائین، یوکلپٹس اور دھریک کے چھوٹے بڑے درختوں کے علاوہ چھوٹی سی جھیل کنارے درختوں کے جھڑے جمع کیے پتوں کو دفن کرنے والی چار سے پانچ فٹ گہری خندقیں۔ مجیٹھیے درختوں کے خزاں زدہ پتوں سے اٹا ذخیرہ، جس کی گھنی چھاؤں تلے چند پاسی جھونپڑیاں۔ جو اپنی بھٹی کو بھی اپنی سُوجھ بوجھ سنگ اپنی ذہنی قدرت و کمال کو ہر اک آشوب سے بالا سمجھتے ہیں پے ہی نین سکھ سُکھ۔ مجیٹھے درخت جب بھی کٹیں، تو یہی کٹے درخت بن جائیں، پاسی کی بھٹی کا ایندھن۔ اور جڑیں۔؟

اور جڑیں رنگنے والوں کے لیے کسب و کمال۔!

اور یہیں، اسی قصبے کے چند گھرانوں میں سمٹے ہوئے رنگریز جو اپنے مشتریوں کے کپڑوں کو سرخ رنگت بخشنے کے لیے اس کی جڑوں کی سُرخی سے مُفت استفادہ حاصل کرتے ہیں، اور موچی۔؟

وہی جو علاقے کے کاسبی کمی کمین اسی علاقے کے جاگیرداروں کی کٹی فصلوں سے ملنے والے چھ ماہی اناج کے محتاج، مجیٹھے کے کٹاؤ کے ہمیشہ سے منتظر رہتے کہ کب بیساکھی کا ڈھول بجے، مجیٹھے کے سُوکھتے پیڑوں کے لاشے گریں، سُرخ جڑوں کی رنگت مقدر کو رچاتے نچائے اور کب علاقے کے جاگیرداروں کی آنکھوں کا منظور نظر ٹھہرائے جانے کے لیے اُن کی جوتیوں کے لیے چمڑا رنگ سکیں، اور اسی میں سے میلوں ٹھیلوں کا بکاؤ مال بھی بن سکے۔

اسی امید سے بھیگی خواہشوں کو پھیلاتے، آنکھوں کو آنے والے دنوں میں کٹائی کے دانوں کا چھپر پھٹنے اور بھرے غلّے کے توڑوں کی اُمید سے روشن کرتے، کہ زمین بھی اسی میں رنگی جاتی اور فرنگی کے نفرت انگیز قتال لمحے میں اُس کے خلاف بغاوت پر اُکساتی پسی مخلوق کو بیدار کرتی نئے کی سُر یلی لے زخموں پر پھایا رکھتی، تو انہیں ان ہی ہونٹوں سے اُبلتی ہوا، ذبح کرنے کی تمام تر قوت جگا جاتی۔ مگر کمی کمینوں کی ساری اُبھرتی قوت، بھوک اور بلا سبب قتال کی رسموں کے خوف کے پردے میں سمٹے مجبُھٹے کی جڑوں کی لہو رنگ سُرخی کو چھوڑے میں نچوڑ دیتے، مگر کسان پوری طرح بیدار کبھی زمین کھیت کھلیان سُرخ ہونے سے ہی چین آتا کہ اُن کی لُوٹ کی ساری راہیں بلا تصادم کُھل جاتیں اور کبھی بلا تصدیق سولیوں پر ٹنگے لُٹ جاتے۔ کیونکہ اک رسمِ قتال لکھی اور اُن لکھی اسی مٹی کی تھی۔ اسی زمین کے افراد نے دوبدو ہوتے ہی فرنگی سپاہ کا لمبا ڈھیر لگا دیا، گورے قبرستان کے قبرستان اسی زمین پر بن گئے اور پھر فرنگی واویلا کہ سارے ہندوستان کے جدال میں مقتول ہونے والے نامی سپاہ کی تعداد بہت ہی معمولی تھی اور یہ سب کچھ رنجیت سنگھ کے بعد ہی رونما ہوا۔ اور اپنے ہی صُلب کی صلیب پر چڑھنے والے کیا کچھ اَن لکھا چھوڑ گئے۔ فرنگی تو اپنوں کی قبریں ہی گنتے رہ گئے اور اس کا انتقام مغلوب ہوتی دھرتی سپوتوں کے اندر ہی سالوں چُھپا رہا اور جب کُھلا تو۔؟

تختِ لہور کے باسیوں نے رنجیت سنگھ کی پُر ملال موت کے بعد پندرہ بیس سال کیسے گزارے۔ یہ سالوں کے ایامِ تفصیلی میں بند، بے رحمی سے کِھلتا سوالنامہ کسی انجانے ساحر کے جادوئی کشٹ اور اُس کے بھیانک منتروں کی لپیٹ میں نظروں سے اوجھل نہیں ہوا۔۔!

جو کچھ بھی ہوا خفیہ ہاتھ تھے جن کی بدولت آنکھوں پر پٹی بندھ گئی۔۔!

آپ سب اور ہم اسی وچار میں شامل ہیں۔؟

کنارِ آگاہی پر کھڑے اس سوچ وبچار میں بند ہیں کہ کیا کچھ ہم پر بیتی۔؟

گاؤں کے دارے میں سَرِ شام دائرے میں گھومتی حقّے کی نال سے دم لگاتے اور کان دھرے سوچتے بھی جاتے ہیں کہ ہمارے سروں پر بیٹھا امن کا ہما کیسے کب اور کہاں اُڑ کر چلا گیا۔؟

ہزار ہا اندیشوں سے بھرا سوالنامہ۔؟

اور جواب کھوجنے کے منتظر۔؟

جب سوچ وفکر میں ظالم اور مظلوم کا فرق ہی مٹ جائے تو کیسی صلیب۔۔؟

ابھی تو بس دیکھنے کی توفیق باقی ہے جو زور آور کو تکتے ہی احترام میں سمٹتے، اُس کی جوتیوں تلے فرش بنے بچھ جاتے ہیں۔ یہ ہی کسب تو ہماری صُلب کے ساتھ ہوا، جہاں مال دولت کے بُرج پر بیٹھنے اور خریدار کو دیدبانی میں باندھنے کا موقعہ ملا وہ صاحب تخت کے پائے کے ساتھ منسلک، کہ ایک کے چار بنیں اور چار کے سولہ، اور سولہ کے چونسٹھ۔ اُن کی بلا سے، بوم بسے یا مفقود ہو۔ سوداگری کا وقت کھوٹا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ جو کچھ آپ کو نظر آتا ہے دیکھیے! اور میرے ہی ساتھ مِل کر دیکھیے تا کہ صُلب کو بھٹکاتی بھول بھلیوں میں سے ہماری پژمردنی سے چھوٹنے کی کوئی نئی راہ تو نکلے۔ اور ڈھول یار اپنی کھوجی گئی راہ پر ہی ان بھٹکے ہوؤں کو ڈالنے کو بیتاب۔!

ایک ہم ہیں کہ دساوری مال کی پہلے خریداری اور پھر نکاسی کے لیے خالی راہداری پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں کہ پڑاؤ کا رُخ پلٹے اور بنے شہر جو فوجوں کے پڑاؤ سے شروع ہو تو؟ اس پر اس کے پھیلاؤ کی گرفت اور زمین پر اختیار رکھنے والا

فرعون !اور اسی فرعونیت کے ہاتھ میں غیظ و غصے سے مالش کیا، ہڑبونگ مچاتا اک چابک بھی تھا۔ چمڑے کا، پٹ سن ،بھات، پھٹی اور گیہوں کی فراوانی کو کوستا ہوا۔۔!

جواب یہاں دوجی جانب کے انبوہ پر رگبار برسے۔۔؟

سڑاک ،سڑاک۔۔!

سبزہ بھری زمین تو برداشت کرگئی۔لیکن اس بے جا ضرب پر بیرکوں کی تعمیر پر لگا ہر مزدور اور کاریگر، بڑبڑاتے نفرت کے اظہار کے لیے زیرلب گالیوں کے اُپلے اپنی سمجھ وفراست اور کمزوری کے سبب اُس کے منہ پر تھوپنے کی آرزو رکھتا ہے۔مگر آواز اونچی کرنے کا سارا جوش و جذبہ تو کب کا خوف میں مفقود،اور خوف بھی صرف بھوکے شکم کا، کہ ستونِ فقرات سے جا لگے، محنت سے کمائی جاتی روٹی کی بدولت، بےبسی اور لاچاری کے ہاتھوں بھوک برداشت کرنے کا حوصلہ ،کب کا سرد ہو چکا۔مگر سب کی آنکھوں سے اُبلتی نفرت اور بےبسی کی جکڑ بندی آنکھوں سے پھوٹتی ہے۔نفرت میں پروان چڑھتے بولتے ،عروضی تالوں میں لکھتے شاعر نے اپنا دکھ تو کیا لپیٹنا تھا وہ تو مذہبی گوٹا کناری اور کشیدہ کاری میں لپیٹا۔اپنا پہلو بچاتے گا کر بھیک مانگنے والوں تک کے دماغ میں لفظ تال سُر اور طرز کے ساتھ اُتار،آپ کنارے لگا تماشہ دیکھنے کو تیار۔!مگر ہمارے ڈھول کو یہی جبر قبول نہیں تھا وہ تو اس چیرادستی کے خنجر کو توڑنے کی خواہش کو پانی لگاتا تھا۔

مگر ہم اسی پھیلی خاموش ظلمت کا کیا کریں۔؟

بس ایک ہی واویلہ ذہنوں میں رواں، کبھی کبھار اُبلنے کو تیار کہ، زردار کا سودا ہے، بےزر کا خدا حافظ۔۔!

مگر سمجھنے والے کیا سمجھے۔۔؟

وہ تو مراعات یافتہ طبقے کی بندر بانٹ میں وہی سبزہ بھری شلاک کھاتی زمین۔۔؟

جو معمولی زرِ خرید پر بِک گئی،اور۔۔؟

وہ۔۔!

وہ کون۔۔؟

وہی،شلا کی برسات برساتے، بر جس پر چڑھے لانگ بوٹوں کے آگے بچھا۔۔؟

خریدار۔۔؟

جو نجانے کہاں سے نمودار ہو،اور پھر اُس کی ذخیرہ اندوزی کا وقت۔۔؟

گھڑی کی سوئیوں پر ٹِلا۔۔؟

اسی مدت میں کار کا بوجھ اپنے کندھوں پر دھرے وہ سارے۔۔؟

اُسی مراعات یافتہ طبقے کی غلاظت لبریز زُبان سے اگلتے لفظوں کی تیز دھاروں سے تراشے گئے کی کمین۔۔!

اور وہ ہیں کہ اپنے خون پسینے کی محنت سے اک جھنکار ہتھیلی پر رکھے جانے کے لیے، بےبس، مجبور منتظر، مگر سکہ شاہی کے گرنے کا کوئی وقت۔۔؟

اس وقت کا کوئی تعین نہیں اور سکہ شاہی۔؟

اس کے گرنے کا بھی کوئی تعین نہیں کیا جا سکتا۔!

وہ تو طلائی سکہ شاہی کی جھنکار سُننے کو ہمیش سے منتظر۔!

،اور پھر اُسی میں کھیلتے، اپنی پیاس بجھاتے۔۔!
کہ کوئی اور نہیں، زمان دروازے پر اُن ہی کے دستک دے رہا ہے۔۔!
لیکن اپنے خون پسینے سے نہال کرتے، اُن کی زمینی زرخیزی کو اُجالنے والے، کس کھیت کی مولی۔۔؟
کہ طلائی جھنکار میں مست، مراعات یافتہ فوج کا گھوڑا پال اور فرنگی کو فراوانی سے سینہ سپر ہونے والے سپاہ کی لمبی قطاریں سجی کھڑی ہیں۔۔!
لیجیے جنگ اعظم کا پہلا معرکہ فتوحات اور زبردست مفتوح علاقوں سے جنگی اخراجات سمیٹنے کی بات نہیں۔
مجیٹھے تیری جڑوں کی سُرخی کیا ہوئی۔؟
بس مخبروں میں خاکی شاہ کے ان مِٹ پیروں کے نشانوں پر چلنے والوں کا پرچہ مسلسل لگتا رہتا۔ اور تھانے میں پانچ سات بار سکول اور سنگیت سکول کو بیچ میں رکھ کر لمبی کھینچاتانی بھی ہوئی، مگر کوئی ظاہری ہتھیار نہ مل پایا۔ پھر بھی روزنوں پر جمی کھوجی آنکھیں ٹکی رہیں کہ وہ کب چُوکے اور اُن کے پرچے کی سچائی کا گُل کِھلے۔
بس مجیٹھے بس کر، دیکھ لی تیری مجیٹھی، رت تیری اور رت میری جُدا آرزوؤں اور رنگوں کی تو نہ تھی۔ اب تو۔؟
اب تو تُو کھول ہی ڈال پکتے لہو رنگت کی کتھا۔؟
پیارے ڈھول کی لہولہان، بے سدھ، سلاخوں کے پیچھے ننگے فرش پر پڑے، وجود کا سبب۔؟
درگا مندر میں چڑھاوے کا ہی زمان تو تھا نا۔ اور عورتوں کے انبوہ میں پھنسی لاچاری اور بے بسی اور اندر ر تک دِل وجگر میں دہکتی، ہر نوع وچھوڑے کی آگ کو کسی کے ہاں چھیلتی اور کسی کے گوشے میں دہکتا لاوا بنے پھٹنے کو بیتاب۔ مگر نئے سے پھوٹتاو شال آہنگ ساز کہاں۔؟ اُس کی غیر حاضری چھوٹے بڑے پروہتوں کو بھی کھُلی، اک دوجے کی آنکھوں میں سوال سجاتے رہے مگر بوجھے جانے کی آواز مکمل مہر بستہ، بے آواز، بس لبوں کو سیے ہی رہے۔ مگر زائر، فرنگی سرکار کے مراعات یافتہ زمینداروں پر تو کسی قسم کی بھی کوئی قدغن نہیں تھی، اُن کے ترسے کان بھجن اندر اُتارنے کو بیتاب، بڑی شدھ آوازوں میں یکے بعد دیگرے چڑھاوا چڑھاتے، اُس کی غیر حاضری کا سبب جاننے کو بیتاب۔ اور جب تھانے میں بھید کُھلا، تو پہلے دو چار لمحے تو انتہائی ششدر و گم صم۔ پھر حواس پر گرفت مضبوط ہوئی تو سوال دوبارہ دہرایا گیا اور جواب سُنتے ہی اُس کے حق میں اغوا اور قتل کی واردات کو ماننے سے انکاری، اور ضمانت پر رہائی کے خواہش گزار۔!
اب تو تندنہ تاندنی، فقط تانا نا نایاہُو!
خزاں زدہ زرد پتے ہی جھاڑ ڈال کہ بسنت رُت دوار کھڑی دستک دے رہی۔ مگر؟
مگر دعاؤں کے لیے اُٹھے ہاتھ تمام ترپت جھڑ کے شکار۔!
دعاؤں نے بندھوایا ہاتھوں کا پیالہ جو پھیلا تو دونوں باہوں پر پھیلے پلُو تلے ڈھکا، نمازیں پڑھ پڑھ مسجد محراب ماتھے کی بنی مُہر، مگر پلٹ کر کوئی کرن روشن ہوئی اور نہ ہی دل کو سکون و راحت کی کوئی خبر اُن کے اوپر استراحت کی چادر تان سکی۔ ہر دُکھ درد اندر تک پیوست ہوتے ببول کی نوکِ خار، اور اندھیرے سویرے، ہچکیوں آہوں اور آوازوں کا اندر ہی گلا گھونٹتے، نیروں میں ڈبڈبائی آنکھیں، ہر اک جھپک پر پرنالہ کھولتے، دونوں کونوں سے ٹپکاتے، پونچھتے پلُو کو بھگوتے۔ مگر غائب ہونے والیوں کی کوئی خبر ہی پلٹ کر نہ آئی۔۔؟
نہ صرف بیٹی بلکہ اُس کی سہیلیوں کے چہرے کے خدوخال بھی خواب کی مانند اُجڑ گئے۔۔!

وہ تو نجانے پانچ سہیلیوں سنگ کہاں اُڑن چھو ہوگئی۔۔؟

وہ بڑی آسوں اور دعاؤں میں لپٹی بچی، نجانے کتنی درگاہوں اور مندروں کی مٹی کو چومتے اور مسافرت کے مصائب جھیلنے کے بعد ملی، اُن کے لیے نایاب، قیمتی، انمول، کتنی سلامیوں کے بعد جھولی بھر بھر منتوں کے سنگ پیدا ہوئی، اور دنیا جہان کا رنگ روپ سمیٹے، پری وش، ابھی جوانی میں قدم رکھنے والی ہی تھی کہ۔۔؟

وہ بیساکھ کی پندھرویں تھی شاید۔۔!

پکی گندم کی بالیاں، کٹائی کے لمحوں کی خبر دے رہیں تھیں۔ پورا کنبہ ڈھول کی تھاپ سے پہلے ہی، گاؤں کی عورتوں اور مردوں کے ساتھ کھیتوں میں اُتر چکا تھا۔ اور وہ کھیت کنارے پر ہم عمر ہم جولیوں اور نو عمر لڑکوں کے ساتھ بیٹھی چہکتی کٹائی شروع ہونے کی منتظر، کہ کٹائی کے پیچھے چُر مُر، کھیتوں میں گری بکھری بالیوں کے چناؤ کی آرزومند۔ مگر دھوپ کا کڑا کا ابھی اک پندھواڑے کے فاصلے کی دُوری پر کھڑا، اپنی آمد کی خبر بھی اسی بیساکھ میں دھیرے دھیرے گھولتے اپنی کڑاکے کی دھوپ کی نشانیاں، کٹائی کے بعد کھیتوں میں سیاہ ہوتے مُدھ کے نموداری سے قبل ہی گیہوں کی پکی بھری بالیوں سے جُدا ہوتی گندم کے بھوسی چھلکوں میں چُھپے دانے چگلیں اور اپنی جھولی بھر لیں۔۔!

چیتر کی ڈھلتی خبر تو پُروا نے دی۔۔؟

اپنی تندی میں خس و خاشاک اڑاتے، اور جب بھی رُخ بدلا خراماں خراماں، کھیتوں میں اُگی، سنہرا روپ دھارے، فصل کی مُڈھ کو چھوڑتے، عورتوں مردوں کی درانتیوں کی تیز دندانے دار دھار سے کٹتی، اور گُٹھ کے گٹھ، جُدا جُدا، اُٹھاتے، اور لپے فرش پر پڑی درخت کے تنے کی مُڈھی پر چھڑتے، گندم کے دانوں کا بنتا ڈھیر اور بھوسہ جدا۔ اُسی چیتر کی آخری ڈھلوان میں ہی تو نو عمر، لڑکے لڑکیوں کے رنگ روپ میں رچی مُسکراہٹوں کے کِھلے گلابوں سے سارے کے سارے کھیت مہک رہے تھے۔ خوشی سے شرابور دونوں میاں بیوی کے چہرے بھی دیگر چہروں پر پھوٹتے پسینے کے قطروں سے دمک رہے تھے کہ اچھی فصل اور پھر محنتانہ بھی اتنا کہ سال کے آٹھ دس ماہ تسلی سے گزر جائیں۔ وہ ہر پچاس، ساٹھ مٹھیں کاٹ لینے کے بعد چہرہ گھما کر اُس کی کھلکھلاتے قہقہوں میں صورت دیکھتی، چنائی سے اُس کا پلو بوجھ سے لٹکا ہوا دیکھتی اور پھر جُت جاتی۔ کہ اچانک جب سارے پہلا کھیت ختم کرتے دوجے میں اُترنے لگے تو اُس نے معمول کی اُنگلی تھامے پلٹ کر دیکھا تو وہ آنکھوں میں اپنی چھب سمیت اُس سے نہ لپٹی تو اُس نے وہیں سے چلا کر بچوں سے پوچھا تو جواب میں مطمئن، وہ اپنے گروہ کے پیچھے دوجے کھیت میں اُتر گئی۔ شوہر نے استفساراً جب سر کو جنبش دی تو وہ مُسکرائی، سہیلیوں سنگ واہن ہرا کرنے گئی ہے۔ دوجے سے تیسرے کھیت میں اُترتے وسوسوں نے گھیر لیا۔ مگر اطمینان کا جھونکا پُروا کے خراماں خمار بھری لہک کے ساتھ تسلی دے گیا کہ ساری سکھیاں سہیلیاں بھی تو ساتھ ہی ہیں۔

اور پھر اک عمر کے لمبے لمبوؤں میں جلتے روئیں روئیں میں بھامبڑ، اور اکیلی ہشناک باہمنی سنیڈھ دا تڑکا، شوہر کے گریبان کو پکڑے گاہے گاہے جھنجھوڑتی۔۔؟

توشی دے باپو اس کا کچھ پتہ چلاؤ۔۔!

اور اُس سمیت چھ سکھی سہیلیاں اُٹھائی گئیں۔ اُن کے لگتے ساک سگے والوں سنگ اُس کا باپو پینڈے مارتے آس پاس کے بیس تیس کوس کے دیہاتوں کو کُھنتے، گردن جھکائے لوٹتے۔ مگر آواز اور کُرلاہٹ اور واویلوں پر منہ پر کسے گئے پرنوں کی بندش اور سر منہ اور وجود چادروں میں بند گٹھڑی، جب بدن مزاحمت کے جوش سے پھڑکے تو بل جُل کی قوت

بھی سلب کر لی جاتی ہے۔اور پھر اک لمبی بے ہوشی ۔۔!

کل تک تو پاسی صرف تاڑی بیچتے تھے، مگر اب تو کشید پر بھی ان کا قابو آ چکا ہے۔مگر یاری اب بھی اُن کی سانہسیوں سے تھی چھوٹا اور بڑا جیسا بھی وہ شکار کرتے شراب کی کشید کے بدلے، شکار کے گوشت کا بہتر حصہ جو اُن کی پسند کا ہوتا وہ لُکا چُھپا کر لے لیتے تھے۔مگر سب سے دِل پسند گوشت نیل گائے کا ہوتا، جو جنگلوں سے آتی جاتی رُت کی شدت میں دریا کو پار کر کے نمودار ہوتیں تو سانہسیوں کی تو عید ہو جاتی، اُن کے گوشت کے بدلے میں دِل پسند تیز شراب کی بوتلیں ہتھے چڑھتیں جو صرف اُن ہی کے لیے فرمائش پر بنا کر زمین کھود کر چُھپا دی جاتیں تھیں۔شکاروں سے نکلنے والی کھالیں تو خیر سے موچیوں کو تر نت کمیانے کے لیے اور اپنے قبیلے کے پاؤں جنگل کی سخت او بڑ کھو بڑ زمین پر ننگے پڑنے کی بجائے کھسا، چپلی جوتے کے سودے پر دے دی جاتیں۔مگر نیل گائے یا اُس کے آٹھ دس ماہ بچے کی کھال بڑے منشی کے حکم نامہ کے مطابق، گھڑ سوار فرنگی گورا کوڑے سے ہر اک شے کو کوٹتا گالیاں دیتا، لانگ بوٹ یا دیگر جوتے، گھریلو چپلوں کے علاوہ اُن ہی کی میم یا آنے جانے والے گورے مہمانوں کے لیے اُن کی پسند کے لیدر بیگ، ہینڈ بیگوں کے لیے نیل گائے کٹتے ہی کھال نکال کر موچیوں کے حوالے کر دی جاتی جس سے اُس کی اور جھونپڑی بسر قبیلے والوں کی سال بھر کی اضافی روٹیوں کے علاوہ، تندوروں اور چولہے کا ایندھن بھی وافر مقدار میں پلّے پڑ جاتا۔لیکن۔؟

لیکن اُس سال نجانے کیا ہوا۔؟

صرف ایک ہی نیل گائے کا سال سوا سال کا بچھڑا ہاتھ لگا جس کی کھال کمیانے، رنگنے کے بعد ایک لمبے سیاہ داغ کو نہ نکالا جا سکا، بڑے منشی نے دیکھنے کے بعد تفکر بھری تفتیشی نگاہوں سے تولا بھی بڑے صاحب کی اجازت کے اشارے پر آنکھ بھی تائید میں فرش کی، پھر بڑے صاحب کی منظوری تک انتظار کرنے کا مارشل حکم سنا دیا۔اب یہ تو پتہ نہیں چل سکا کہ منظوری کی فرنگی درگاہ سے قبولیت ہوئی یا نہیں، یا منشی کی آنکھوں میں دو سال پرانا لانگ بوٹ آشوبِ چشم بن گیا تھا، صاحب کی خشنودگی حاصل کرنے کا اک نادر موقع ہاتھ آیا تھا۔بس تیجے روز ہی بوڑھے ہڈی ڈھانچ کو بلوایا اور لانگ بوٹ بنانے کے حکم کا بھاری بوجھ موچیوں کے بوڑھے سردار کی گردن پر سوار کر ڈالا کیونکہ فرنگی حاکم کی زُبان اپنے پچھلے لانگ بوٹ اور انگلینڈ سے سرکاری دورے پر آئے دو فوجی کرنیلوں کے لانگ بوٹوں کی آرام دہی مضبوطی پر ایک مدت تک معترف رہی، کہ اس عمر میں بھی اُس کی نگاہ میں یہاں سے ولایت تک ہڈی ڈھانچ کے پاسنگ کا کوئی کاریگر نہیں تھا، اور پھر لمبے نقد نرائن کی بخشیش نے نہ صرف سردار، بلکہ سارے موچی قبیلے کے دماغ میں انتظار منجمد کر دیا تھا کہ کب حاکم اعلیٰ اپنا یا اپنے ویلائتی فوجی مہمانوں کے لانگ بوٹ بنوائے گا۔منشی کا جب حکم نامہ دوبارہ بنانے کا ملا تو اُن کی جھونپڑیوں میں درگا میّا کے دیدار کا دیا روشن ہو گیا۔مندر جانے کو تو کمیوں کے لیے تو پنڈتوں کے حکم سے قدغن کی سد کھڑی تھی کہ مندر کی چوکھٹ تو دور کی بات تھی وہ تو سیڑھیوں پر قدم بھی نہیں رکھ سکتے تھے اور جہاں کسی سے کبھی ایسی غلطی ہو جائے تو وہ واجب القتل۔۔!

منشی کو تیار جوتے پہنچانے کی مقررہ تاریخ بھی نزدیک آ گئی، لیکن بوڑھے سردار نے اس کی تیاری بند دروازوں کے پیچھے کی تھی۔جس کا سبب وہی لمبا داغ تھا۔جسے نکالنے کے لیے بوڑھے نے ہر کسی کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر تیاری کی تھی۔اور بوڑھے سردار نے بڑی مہارت سے اُس لمبے کالے داغ کو نکال کر لانگ بُوٹ مقررہ تاریخ کو تیار کر کے پہنچا دیا بڑے منشی کو۔اور وہ بڑے شوق و جوش سے بھرا بڑے صاحب کے پاس جا پہنچا۔لیکن وہ غیظ سے بھرا بیٹھا تھا۔؟

کیونکہ۔؟

مقامی فوجی ہیڈکوارٹر میں وائرلس رپورٹ آئی کہ کشمیر کے بارڈر پر چھولے کی فرنگیوں کی چوکی کو باغیوں نے بالکل تباہ کرنے کے بعد نذرِ آتش کرڈالا اور دو چار سپاہ جو زندہ یا زخمی حالت میں بھاگ نکلے تھے باقی سب کو ہلاک کرڈالا گیا بس اسی پر جہلم دریا کے دونوں کناروں پر پھیلے جنگلوں میں باغیوں کی تلاش میں فوجی دو گھڑسوار دستے، اُس کی جنگلوں سے آشنائی کے سبب اُسی کی سرکردگی میں دو سو مربع میل پھیلے جنگلوں میں باغیوں کی تلاش میں بھٹکتے پھرے، ایک جگہ تصادم بھی ہوا، وہ آناً فاناً پہاڑی کی اوٹ سے نکلے اور فرنگی دستوں میں سے نیٹو سپاہ کی بیس لاشیں اور ایک فرنگی کپتان کو شدید زخمی حالت میں چھوڑ کر اسی پھرتی سے غائب ہوگئے، اور پھر اُن کی تلاش میں تین دن خوار ہوتے رہے مگر کچھ بھی ہاتھ نہ لگا سوائے باغیوں کے ساتھیوں کی دو لاشیں اور ندامت۔ اور لاشوں سے پتہ چلا کہ وہ شمال مغربی قبائل کے علاقہ آزاد کے انتہا پسند مذہبی افراد ہیں، وہی رنجیت سنگھ کے ہی زمان کے بالاکوٹ پر شکست خُردہ لشکریوں کی اولادیں، دِلّی کے چاندنی چوک کے پُرانے غیر مقلدوں کے مدرسے کے مقلد۔!

کل شام ہی وہ جنگلوں کے محاذ سے انتہائی پژمردہ اور ناکامی پر پشیمان لوٹا تھا، کہ منشی لانگ بوٹ لیے بنگلے پر جا پہنچا۔ اُس کے مزاج کی نبض پر عقلی اُنگلیاں رکھے بنا، منشی نے لانگ بوٹ کے پہنانے کا شدید اصرار اور لجاتے غلامانہ الفاظ اور پاؤں پکڑنے کی گرفت پر وہ بوُٹ پہننے پر مجبور ہوگیا، منشی کے بوٹ پہنانے اور تسمے کسے جانے پر تو وہ ذرا سا پُرسکون تو ضرور ہوا کہ گرمائش اور کھچاؤ سے درد کرتے پاؤں کچھ دباؤ میں آگئے تھے لیکن جیسے ہی وہ کھڑا ہو کر چند قدم ہی چلا تو پیروں کے انگوٹھے اور تلوے کے بیچ کے اُبھار پر بنے چھالے پھٹے اور نئے بوٹوں کی کڑی گرفت میں چھلتے چلے گئے۔ وہ چند لمحے تو صبر کیے آہستہ آہستہ چلتا رہا مگر درد کی شدت اتنی بے قابو ہوئی کہ اُس کا دہانہ چیخیں اُگلنے لگا اور وہ بے دم ہو کر کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔ منشی نے بڑی پھرتی سے بوٹوں کے تسمے کھولے اور دونوں پاؤں کھینچ کر باہر نکالے۔ دونوں ہی پیروں میں اُس نے انگوٹھوں کے نیچے اُبھار پر زخم دیکھے تو اُس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، جلدی سے اُس نے خانسامہ کو فسٹ ایڈ بکس لانے کا کہا اور ساتھ ہی ڈاکٹر کو بلوانے کے لیے بھی اشارہ کیا۔ اور جب تک ڈاکٹر نے تسلی کے بول نہیں بولے وہ اُس جگہ سے نہیں ہلا۔ مگر۔؟

مگر سرِ شام ہی قتل کی واردات سُنتے ہی اُس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی، پولیس کی آمد سے پہلے ہی وہ پُر ہیجان نہر پار کے گاؤں پہنچا تو بیشمار زائرین کے پُر شور اور غیظ بھرے ہجوم پر نظر پڑی اُس کے ساتھ والے مسلح گھڑسواروں کی للکار پر پہلے سناٹا چھا گیا اور پھر ہجوم پھٹا تو بیچ پڑی تین لاشوں کو تکتے ہی وہ سب گھوڑوں سے اُترتے ہی لاشوں کی جانب لپکے تو سارا ہجوم تتر بتر ہوگیا، صرف رنگریزوں کے ایک مُٹھ بوڑھے مرد اور عورتیں خاموشی سے آنسوؤں بہاتے بیٹھے تھے اور تھوڑے سے فاصلے پر ساکت سہمے ہوئے موچی مرد اور اُن کے گھرانے کی تمام عورتیں اور بچے۔

تین لاشیں کٹی پھٹی۔؟

جنگلات وانہار کا اُس کا اپنا فرنگی آقا۔!

اُس کی لاش تکتے ہی جسم کے سارے خون سے دماغ زن زنا اُٹھا۔!

پھر دوجے دو کمی کمینوں کی لاشوں سے کیا کام۔!

ایک ڈھول کے بوڑھے رنگریز باپ کی اور۔!

اور تیسری لاش بوڑھے ہڈی ڈھانچ موچی سردار کی۔!

منشی کے پوچھنے پر پتہ چلا کہ گھڑ سوار گورا غیظ و غضب میں بھرا اکیلا ہی آیا اور گرجتے برستے گھوڑے سے اُترتے سجدہ ریز بوڑھے سردار کو نئے لانگ بوٹ سے پاؤں زخمی کرنے کے لیے دیدہ دانستہ ایسا زہری بُوٹ بنایا، بس یہ ہی گردان کرتے، چلاتے، گالیاں دیتے کوڑے برساتا چلا گیا۔ اور۔؟

زخموں سے زمین پر رُبڑتے بوڑھا موچی بس ناکردہ گناہ کی معافیاں مانگتا دم توڑ گیا۔ اور بیچ میں کود پڑا رنگریز جس نے اُس کا کوڑا پکڑ لیا تھا مارا گیا۔ موچیوں یا رنگریزوں میں سے تو کسی کو چوں کرنے کی بھی جرأت نہ ہوئی مگر۔؟

مگر بوڑھے موچی کی چیخ و پکار پر بے انت زائر لپک پڑے اور بوڑھے ہڈی ڈھانچ کی آواز بند ہونے تک برستے کوڑے کی جسم پر پڑتی ضرب کے ساتھ پھوٹتی شوکر سے دہشت زدہ بے حس ساکت، مگر ہر ایک فرد ہر ضرب پر سر سے پاؤں تک لرزیدہ، کہ مردے پر پڑتی دوسری تیسری ضرب پر ہی رنگریز نے کود کر کوڑا مضبوطی سے پکڑا، بس بس آقا اب مُردہ تو خراب نہ کرو، مگر کوڑا پکڑنے کو گستاخی گردانتے گالیوں کی بوچھاڑ مارتے، کوڑا چھڑانے کی پوری زور آزمائی کر ڈالی۔ کہ ایکا یکی اُس نے کوڑا چھوڑا اور رنگریز کھچائی کے سبب دو قدم پیچھے دھکیلا گیا کہ فرنگی آقا نے تمنچا نکال کر لگاتار سینے پر ساری گولیاں ایک ہی سانس میں خالی کر ڈالیں۔ بس اسی پر وہی زائر جو شاید حالیہ پولیس لاٹھی چارج میں مرنے والے لالہ لاجپت رائے کی خبر سُن کر لوگوں کا بھنایا ہوا اجتماع، سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر سیتا پٹیل کی گرفتاری سے آگ بگولہ۔ وہ سارے کے سارے یلغار کیے، فرنگی آقا پر پل پڑے۔ مگر کوئی زائر وہاں ٹکا ہوتا تو منشی کے آدمی پکڑتے بھی، پولیس آئی اور پھر فوجی دستے کا گھراؤ۔ پولیس نے بچوں اور سب مردوں عورتوں سمیت دونوں گھرانوں کو لاک اَپ میں ڈال دیا اور ہفتہ بھر کا بیان سب کا ہی ایک سا تھا، بس الفاظ اور بیان کی ترتیب جدا تھی۔

مگر پولیس اور حساس ادارہ ڈھول کو نہ پا کر ہاتھ ملتا رہ گیا، ورنہ سارا گند بلا اُسی کے سرمنڈ کر اُن کا پچھلا انتقام پورا ہو جاتا۔ ترائی کے اِسی ہنگام سے بنسی بجیا پر بندش لگ گئی۔ اوپر کے پہاڑی کھوہی دُرگا مندر کے پروہتوں نے اُسے وہاں سے نکلنے کی اجازت ہی نہ دی۔ لیکن جب سال بھر کے بعد اُترا تو فل فوراً اُسے چھ سہیلیوں کے اغوا میں بند کر لیا گیا اور دورانِ تفتیش فرنگی کا قاتل بھی ٹھہرایا گیا، اپنے باپ کے انتقامی سلسلے میں۔

☆......☆......☆

خطِ استواء پر محبت

نجم الحسن رضوی

جی ہاں یہ بھی یتیم خانہ تھا مگر اور قسم کا...... یہاں بچے تو تھے مگر آدمیوں کے نہیں، شتر مرغ کے۔ انہیں وادی کے ایک ہرے بھرے حصے میں پناہ دی گئی تھی۔ خاردار تاروں سے گھرے ہوئے ایک وسیع وعریض قطعۂ زمین پر شتر مرغ کا یہ فارم سیاحوں کی جنت میں واقع تھا۔

میں اکیلا ہی آدھے ہنی مون پر سیاحوں کی جنت میں گیا تھا۔ آدھا ہنی موت اس لئے کہ فریدہ نے جسے میرے ساتھ ہنی مون پر جانا تھا عین وقت پر ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ وجہ؟ بچے!

آپ حیران ہوں گے کہ یہ بچوں کا کیا قصہ ہے۔ بتاتا ہوں۔ فریدہ کے تین بچے پہلے شوہر سے تھے۔ دو بیٹیاں تھیں اور ایک بیٹا۔ مگر تین بچوں کے باوجود فریدہ اتنی تروتازہ اور زندگی سے بھرپور تھی کہ مجھے یقین نہ تھا کہ اس کے ساتھ ازدواجی راحتوں کے بند دروازے پر پھر سے دستک دی جاسکے گی۔ میری پہلی بیوی بے اولاد مری تھی اور مجھے بے ماں کے بچوں کی پرورش کا عذاب نہیں جھیلنا پڑا تھا۔

فریدہ خوش شکل، خوش اطوار اور خوش مزاج تھی۔ ہم دونوں ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے اور ایک دوسرے کے مزاج سے آشنا بھی، اس لئے کسی گڑبڑ کا امکان نہ تھا مگر شادی کے پہلے مہینے کے بعد ہی مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی بڑی بیٹی کے بائیں گال پر جو زخم ہے وہ مجھے بہت ہی بدنما لگنے لگا ہے۔ اگلے مہینے چھوٹی بیٹی کی بات بے بات ہنسنے کی عادت سے کوفت ہونے لگی اور پھر اس کا بیٹا بھی بدشکل اور بدتمیز لگنے لگا۔ بظاہر فریدہ کو بچوں کے ساتھ میری بے التفاتی اور بے رُخی کی شکایت نہیں تھی۔ میں نے ویسے بھی اسے پہلے سے خبردار کر دیا تھا کہ میں پیار کی فضول خرچی کا قائل نہیں اور میرا خیال ہے کہ جب تک خود سے پیار کرنے کو جی نہ چاہے کسی کو اپنا پیار ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ فریدہ میری الجھن سمجھتی تھی لہٰذا کافی دنوں تک وہ بس خاموشی سے صورتحال کا جائزہ لیتی رہی اس کے بعد اس نے ناراض اور خوش ہونے کے درمیان پنڈولم کی طرح میرے مزاج کی بدلتی کیفیتوں پر قابو پانے کے لئے ایک انوکھی ترکیب سوچی اور ایک دن اچانک میرے گلے میں بانہیں ڈال کے بولی...... ''چلو ہنی مون پر چلتے ہیں!''

''کیا ہنی مون اور اتنے دنوں بعد؟''

''ہاں تو کیا ہوا، ہماری مرضی، جب چاہیں اپنی یکجائی کا جشن منائیں!'' اس نے کہا۔ پہلے تو مجھے اس کی خواہش کچھ عجیب سی لگی مگر جب اس کا اصرار جاری رہا تو مجھے ماننا ہی پڑا۔

کہنے لگی...... ''ہنی مون کے لئے ہم سیاحوں کی جنت میں جائیں گے جو عین خطِ استواء پر واقع ہے!''

''خطِ استواء، اس کا کیا مطلب؟'' میں نے حیران ہو کے پوچھا۔

''کمال ہے، خطِ استواء پر محبت کا خیال تمہارے دل میں کوئی سنسنی نہیں پیدا کرتا؟'' وہ بولی۔

''واقعی مجھے خطِ استواء پر محبت کا رمز بالکل سمجھ میں نہیں آیا!'' میں نے اپنی بات دہرائی۔ ''اور پھر اجتماعی ہنی

مون! بچوں سمیت؟''

''اچھے خاصے کوڑھ مغز ہو تم بھی'' فریدہ ہنسی۔ ''ارے بھئی ہم دونوں دو مختلف کرّوں کے باسی تھے شادی سے پہلے، محبت نے ہمیں ملا دیا ہے، یہی تو ہماری زندگی کا خطِ استواء ہے جہاں دو کرّے ملتے ہیں، دو دنیائیں ایک ہو جاتی ہیں، چلو اس کا جشن مناتے ہیں!''

میں نے دل میں سوچا۔ دو دنیائیں تو بے شک مل گئیں مگر ایک نہیں ہو پائیں۔ ہنی مون کا بھی یہی حشر ہوا، آدھا ہی رہا کیونکہ فریدہ اس شرط پر کہ بچوں کے بغیر چلا جائے راضی نہیں ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ انہیں اپنی بہن کے گھر چھوڑ آئے مگر وہ کسی صورت اس کے لئے تیار نہیں ہوئی۔ اس کا کہنا تھا کہ بچے ہمیشہ ساتھ رہنے چاہئیں۔ وہ تو انہیں بورڈنگ اسکول بھیجنے کی قائل نہ تھی۔ یہ اس وجہ سے کہ اسے پتہ تھا کہ میری آدھی زندگی بورڈنگ اسکول میں گزری ہے، ماں باپ کی الجھنوں میں الجھے بغیر اور شاید اسی وجہ سے مجھے محبتوں کی پہچان نہیں رہی۔''

اس نے بچوں سمیت گھر پر رہنے کا فیصلہ کیا، مگر میں چلا آیا۔ آدھا ہنی مون بھی اچھا ہوتا ہے۔ سیاحوں کی جنت میں ایسے بہت لوگ تھے جو اکیلے ہی آئے تھے۔

صبح کے وقت جب سورج کی سنہری کرنیں سرمئی پہاڑ کی چوٹی پر نئے دن کا اعلان نامہ لکھ رہی تھیں۔ منتظمین نے ناشتے کی میز پر سیاحوں کو بند لفافوں میں کوہسار بزرگ کا تہنیتی پیغام پہنچایا۔ ''خوش آمدید آپ سب کو جو خطِ استواء پر اپنی محبت کو تازہ کرنے آئے ہیں۔ آپ کے لئے سب راستے اور سب دروازے کھلے ہیں!''

''پھر خطِ استواء؟'' میں بڑبڑایا۔ سنہری رقعے پر انگریزی میں ٹائپ کیا ہوا پیغام ہر میز پر موجود تھا۔ ''آخر یہ ہے کیا بلا؟''

لفافے میں بہت سے سرمئی سنگریزے بھی تھے۔ ''اب اس کا مطلب؟'' میں نے جیسے خود سے سوال کیا۔

''یہ اس متبرک پہاڑ کے ٹکڑے ہیں!'' اچانک گابو نے پلٹ کے کہا۔ ''انہیں چھو کر کوئی بھی دعا مانگی جائے تو وہ پوری ہو جاتی ہے!''

گابو سولہ سترہ سال کا ایک سیاہ فام لڑکا تھا جو اس قیام گاہ میں سیاحوں کی خدمت پر مامور تھا۔

''مگر وہ خطِ استواء؟'' میں نے پوچھا۔

''میں دکھاؤں گا آپ کو، ذرا آپ قیام گاہ سے باہر تو نکلئے!'' اس نے جواب دیا۔

پھر گابو میرا گائیڈ، میرا رہنما اور میرا دوست بن گیا۔ قیام گاہ کے باہر پتھریلی سرمئی پگڈنڈی پر ایک سائن بورڈ نصب تھا اور بہت سارے سیاح اس کے ساتھ کھڑے تصویریں کھنچوا رہے تھے۔

میں نے گابو سے پوچھا...... ''یہ سب کیا ہے؟''

اس نے جواب دیا...... ''اسے کہتے ہیں خطِ استواء کی زیارت گاہ، جہاں یہ بورڈ لگا ہے وہیں سے خطِ استواء گزرتا ہے۔ آپ وہاں کھڑے ہو کے خطِ استواء کو سر کرنے کا دعویٰ کر سکتے ہیں!'' میں نے کہا...... ''یار میں نے تو پہلے ہی خطِ استواء پر قدم رکھ دیا ہے اور دو کرّوں کو آپس میں ملانے کی کوشش میں ہلکان ہوا جا رہا ہوں!''

گابو نے میرا ہاتھ پکڑا...... ''چلئے تصویر تو کھنچوا لیں، یہ بڑی یادگار ہوتی ہے!''

ابھی میں خطِ استواء کے سائن بورڈ کے ساتھ کھڑا تصویر کھنچوا رہا تھا کہ میری نظر سامنے سرمئی پہاڑ کی چوٹی پر

پڑی جو صبح کے سنہری غبار میں چھپی ہوئی تھی۔
گابو بولا۔ ''جناب وہ سرمئی سنگریزے بھی تو آپ کی جیب میں ہوں گے ذرا انہیں ہاتھ میں لیکر اس پہاڑ کی طرف منہ کریں اور دل ہی دل میں دعا مانگیں، بہت جلد قبول ہو گی!''
میں نے پوچھا...... ''کبھی تمہاری بھی کوئی دعا اس طرح قبول ہوئی ہے یا تم بس یوں ہی ہر سیاح کو سبز باغ کے بجائے سرمئی باغ دکھاتے ہو؟''
گابو نے جواب دیا...... ''کیوں نہیں ہوئی میری دعا بھی قبول ہوئی ہے اور میری ممی کی بھی!''
''ممی؟ ارے تو تمہاری ممی بھی ہیں یہاں، مگر وہ ہیں کہاں؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔
''یہیں ہیں، میں آپ کو لے چلوں گا ان کے پاس!'' اس نے کہا۔
میں نے سوال کیا...... ''تم کب سے یہاں رہتے ہو اور اس سیر گاہ میں کام کرتے ہو؟''
گابو بولا...... ''جب سے میں نے آنکھ کھولی، ممی تو چاہتی تھیں کہ ان کے ساتھ ہی کام کروں اور چڑیوں، خرگوشوں اور شتر مرغوں کے ساتھ مست رہوں مگر مجھے ہر طرح کے لوگوں سے ملنے کا شوق تھا۔ یہاں طرح طرح کے لوگ آتے ہیں اور اس سرمئی پہاڑ کی زیارت کرتے ہیں۔ ان کی دعائیں پوری ہو جاتی ہیں۔ آپ نے بھی کوئی دعا مانگی کہ نہیں؟''
میں نے کہا...... ''کیا دعا مانگوں، اس سے کیا ملے گا؟''
گابو بولا...... ''کیا نہیں ملے گا۔ لوگ تو اسی لئے یہاں آتے ہیں۔ انہیں اس سے سکون ملتا ہے، سیر کا لطف اور خطِ استواء کو چھونے کی خوشی بھی! ممی نے مجھے سیر گاہ میں نوکری کی اجازت دیتے ہوئے کہا تھا، ٹھیک ہے آدمی کو وہیں جانا چاہئے جہاں خوشی ملتی ہے!''
میں نے کہا...... ''یہی تو میں بھی چاہتا تھا!'' میرے دل میں خیال آیا اگر فریدہ ساتھ ہوتی تو کتنا مزا آتا جب ہم خط استواء پر قدم رکھ کے دنیا بھر کی خوشیاں اپنی جھولی میں بھر لیتے۔ اسی وقت کسی کے کھلکھلا کے ہنسنے کی آواز آئی۔ میں نے چونک کے دیکھا سیاحوں کا ایک جوڑا ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے خط استواء کے بورڈ کے پاس کھڑا سرمئی پہاڑ کی چوٹی کو دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ خوشی سے ان کے چہرے گلنار ہو رہے تھے۔
فریدہ تم کتنی بڑی خوشی سے محروم رہیں، میں نے دل ہی دل میں فریدہ کو کوسا۔ یہاں آنے کا پروگرام خود اس کا بنایا ہوا تھا مگر اسے ترک کر دینے کا سبب بھی وہ خود تھی۔ بچوں کو پاؤں کی بیڑیاں تو نہیں بننا چاہئے۔
میں نے کمرے میں جا کے لیپ ٹاپ روشن کیا اور ایک عدد غصیلا برقی مراسلہ فریدہ کو روانہ کیا۔ ''تمہاری ضد کے سانپ نے ہماری جنت برباد کر دی!'' تھوڑی دیر بعد اس کا جواب آیا...... ''اس برباد جنت میں کب تک رکنے کا ارادہ ہے، اپنی دنیا کو تمہاری واپسی کب ہو گی؟''
میں نے جواب دیا...... ''سنو یہاں ایک سرمئی متبرک پہاڑ ہے، لوگ یہاں آ کے اس کی چوٹی سر کرنا چاہتے ہیں، محبت کے متوالے...... میں چاہتا ہوں کہ تم بھی ساتھ ہوتیں!''
''میں نہیں آ سکتی تھی، وجہ تم جانتے ہو، تم نے مجھے مایوس کیا!'' جواب آیا۔
''میرا بھی یہی خیال تھا مگر......!''

''مگر؟''

جواب میں لمبی خاموشی۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ گابو کھڑا تھا۔ زرد جرسی اور نیلی جینز میں۔ سر پر لال ٹوپی تھی، بیس بال کے کھلاڑیوں والی۔

''آج میں نے منیجر سے آدھے دن کی چھٹی لی ہے۔ مجھے ممی کی طرف جانا ہے، کیک کاٹنے کی تقریب میں شریک ہونے!'' اس نے کہا۔

''کیک کاٹنے کی تقریب؟'' میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا...... ''کیا سالگرہ ہے کسی کی؟''

''ہاں، شاید میری!'' گابو ہنسا۔ ''میں آپ کو لینے آیا ہوں، چلیں میں آپ کو ممی سے ملواؤں گا، آپ خوش ہوں گے ان سے مل کے!'' کالے ابروؤں تلے کالی پلکوں کے اندر گابو کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں اور چہرہ کالے گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا۔

''آپ چلیں گے نا؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''کیوں نہیں'' میں نے جواب دیا۔ ''ضرور چلوں گا، تمہاری ممی کے بارے میں تمہاری باتیں سن سن کے دل میں ان سے ملنے کا اشتیاق بڑھ گیا ہے!''

گابو نے مجھے اپنی موٹر سائیکل پر بٹھایا اور کچھ ہی دیر میں ہم جنگل کے پہاڑی راستے طے کرتے سرمئی پہاڑ کے دامن میں واقع اس ہری بھری وادی میں جا پہنچے جہاں خاردار تاروں کے پیچھے یہ جگہ تھی۔ گابو کی موٹر سائیکل جب شور مچاتی مرکزی پھاٹک سے اندر داخل ہوئی تو بے شمار پرندے اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتے ہمارے سامنے سے گزرے۔ ان کے پیچھے پیچھے شتر مرغ تھے، چھوٹے بڑے، بہت سارے......

گابو نے موٹر سائیکل ایک درخت کے پاس روکی اور کہا...... ''یہ رہی شتر مرغوں کی جنت!''

''کیا مطلب؟'' میں نے سوال کیا...... ''یہاں شتر مرغ پائے جاتے ہیں کیا؟''

''پائے نہیں، لائے جاتے ہیں، پالنے پوسنے کے لئے!'' گابو نے جواب دیا۔ ''اسے ان کا یتیم خانہ کہہ لیں یا پناہ گاہ، اسے ممی چلاتی ہیں!''

''کیا؟'' میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں'' ۔ گابو بولا۔ ''ممی تو اتنی ممی ہے کہ کسی کی بھی ماں بن سکتی ہے، وہ ایک بار یہاں سیر کے لئے آئی تھی اپنے گھر والوں کے ساتھ مگر جنگل کی سیر کے دوران ایک دن اسے ایک جگہ ایک شتر مرغ نیم مردہ حالت میں پڑا نظر آیا جسے کوئی جنگلی جانور زخمی کر کے چلا گیا تھا۔ ممی نے اسے اٹھایا اور اپنے ساتھ لے آئی اور اس کے پوری طرح ٹھیک ہونے تک اس کی تیمارداری کرتی رہی!''

''ارے!'' میں نے کہا...... ''واقعی عجیب کہانی ہے تمہاری ممی کی!''

گابو نے مسکرا کے کہا...... ''بس اس دن سے ممی سارے شتر مرغوں کی ممی بن گئی اور یہاں ان کی پرورش شروع کر دی!''

''تو جب ممی نے شتر مرغوں کا یتیم خانہ یا فارم کھولا تو اس کے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوا، وہ اسے واپس

نہیں لے گئے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’بہت اعتراض ہوا سب کو مگر ممی نے کسی کی نہ سنی۔ آخر سب چلے گئے اور ممی نے یہیں اپنا گھر بنالیا اور اس کے گھر والوں نے بھی اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ ویسے بھی ممی اکیلی تھیں، ان کے خاوند تو پہلے ہی وفات پا چکے تھے!‘‘

’’بیچاری ممی!‘‘ میں نے افسوس سے کہا...... ’’وہ یہاں کرتی کیا ہے سارا دن؟‘‘

گابو نے کہا...... ’’ممی ہر روز اپنی جیپ میں جنگل کی سیر کو جاتی ہے اور جہاں کہیں اسے شتر مرغ کے انڈے یا شتر مرغ کے بچے پڑے ملتے ہیں وہ انہیں اپنے یتیم خانے میں لے آتی ہے!‘‘ پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا...... ’’آیئے اندر چلتے ہیں!‘‘

سامنے ہی سرسبز پیڑوں کے جھنڈ میں لکڑی کا بڑا سا کیبن تھا جس پر پھولدار خوش رنگ بیلوں نے غلاف چڑھا رکھا تھا۔ وہ کیبن میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ سامنے لکڑی کی لمبی میز پر چھوٹے چھوٹے آٹھ کیک سجے ہوئے تھے۔

گابو نے مسرت سے کہا...... ’’اچھا تو آج شتر مرغوں کے آٹھ بچے انڈوں سے نکلے ہیں!‘‘

’’تمہیں کیسے پتہ؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’ممی ہر بچے کی خوشی منانے کو الگ کیک بناتی ہے اور آج اس نے پورے آٹھ کیک بنائے ہیں!‘‘ گابو نے جواب دیا۔ ’’ممی اس طرح ان کی پیدائش کا جشن مناتی ہے!‘‘ پھر اس نے آگے بڑھ کے پکارا...... ’’ممی، ممی کہاں ہیں آپ، دیکھیں آج میں سیر گاہ سے ایک مہمان کو بھی اپنے ساتھ لایا ہوں!‘‘

اسی وقت باورچی خانے کا دروازہ کھلا اور ممی اندر داخل ہوئی اور میں نے دیکھا آنے والی کوئی سیاہ فام عورت نہیں ایک گوری چٹی بوڑھی خاتون تھیں۔ مجھے دیکھ کے ان کی آنکھوں میں مسرت کی کرن چمکی۔ وہ خوش دلی سے بولیں۔

’’خوش آمدید!‘‘ پھر وہ گابو کی طرف پلٹیں اور لہک کے بولیں...... ’’تم نے اچھا کیا گابو جو انہیں ساتھ لے آئے، آج ہمارے یہاں پورے آٹھ شتر مرغ انڈوں سے نکلے ہیں، جانتے ہو، میں کتنی خوش ہوں!‘‘

انہوں نے مجھے میز کے ساتھ رکھے ہوئے لکڑی کے گول اسٹول پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کیک کٹنے اور اس کے تقسیم ہونے میں کچھ دیر نہیں لگی اور میں کیک کھاتے ہوئے دیر تک یہی سوچتا رہا کہ یہ کیسی ممی ہے جس نے خود کو اس جنگل میں بس شتر مرغوں کی پرورش کے لئے وقف کر رکھا ہے۔

ممی نے میز پر سے پلیٹیں اٹھاتے ہوئے اچانک سوال کیا...... ’’تم اکیلے آئے ہو کیا، کوئی ساتھ نہیں؟‘‘ ممی کے سوال میں کچھ ایسی حیرت پوشیدہ تھی کہ میں شرمندہ سا ہو گیا۔

’’جی اصل میں......!‘‘ میں نے جواب دینے کے لئے مناسب لفظ تلاش کرنا چاہے مگر ناکام رہا۔

اب گابو میری مدد کو آیا...... ’’اصل میں ممی انہیں پتہ نہیں تھا کہ مقدس پہاڑی کی طرف دیکھ کے کوئی دعا مانگی جائے تو وہ پوری ہو جاتی ہے اور خط استواء پر......!‘‘

’’اچھا، اچھا......!‘‘ ممی نے گابو کی بات کاٹ دی...... ’’اگلی بار آؤ تو اپنی بیوی کو ساتھ لانا اور بچوں کو بھی......!‘‘

’’بچوں کو؟‘‘ ممی کا یہ فقرہ مجھے تیر کی طرح آ کے لگا۔ میں نے سوچا، فریدہ کی تو ضد یہی تھی اصل میں مجھے ہی...... پھر مجھے اپنی وہ بات یاد آئی جو میں نے ایک بار لڑائی کے دوران غصے سے فریدہ سے کہی تھی...... ’’مجھے کیا پتہ تھا کہ تم سے شادی کر کے مجھے اپنے گھر میں دوسروں کے بچوں کی پرورش کے لئے ایک یتیم خانہ کھولنا پڑے گا!‘‘

ممی نے میرے سامنے کافی کا کپ رکھا تو میرے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

''تمہیں کیسے لگا شتر مرغوں کا یہ یتیم خانہ؟'' ممی نے پوچھا۔

''حیرتناک، بہت حیرتناک!'' میں نے جواب دیا...... ''مجھے تعجب ہے کہ آپ یہاں ایک بار آئیں تو پھر واپس نہیں گئیں، کیوں؟''

ممی مسکرائیں...... ''اس لئے کہ میں نے عین خط استواء پر کھڑے ہوکر مقدس پہاڑ کے سامنے یہ دعا مانگی تھی کہ مجھے یہاں ٹھہرنے اور ان یتیموں کی سرپرستی کا موقع ملے ورنہ ان کا کیا حشر ہوتا!''

''ہاں ان شتر مرغوں کا اور...... گابو کا بھی!'' اچانک گابو بیچ میں بول پڑا...... ''اگر ممی نہ ہوتیں تو میں بھی جنگل کے کسی اندھیرے کونے میں مرکھپ گیا ہوتا!''

ممی نے گابو کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ کے کہا...... ''میں تجھے کہیں سے اٹھا کے تو نہیں لائی تھی گابو، تیری ماں نے تیرے باپ کے مرنے کے بعد تجھے میرے حوالے کر دیا تھا۔ وہ بہت غریب عورت تھی اور بیمار بھی، کچھ دنوں بعد وہ بھی چل بسی...... تو میرا بیٹا ہے گابو!''

''یعنی ایک اور شتر مرغ......!'' گابو ہنسا اور اٹھ کے ممی کے سفید بالوں والے سر کو چومنے لگا۔ سچے جذبات کے اظہار سے ماحول کچھ ایسا متبرک ہو گیا کہ مجھے پہاڑ کی سرمئی چوٹی دیکھنے کی خواہش ہونے لگی۔ میں نے ممی کو سلام کر کے ان سے رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔

''جاؤ بیٹا۔'' ممی بولیں...... ''یہاں سے جانے سے پہلے مقدس پہاڑ کے سامنے دعا کرنا مت بھولنا!''

سیاحوں کی جنت میں قاعدے سے یہ میرا آخری دن تھا۔ گابو نے مجھے سیرگاہ کے دروازے پر موٹر سائیکل سے اتارتے ہوئے پوچھا...... ''تو کل کا کیا پروگرام ہے آپ کا؟''

''کل......!'' میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا...... ''کل صبح سویرے آ جانا، سورج نکلنے پر مجھے مقدس پہاڑ کے سامنے دعا مانگنے جانا ہے!''

دوسری صبح جب میں خطِ استواء پر پاؤں رکھ کے مقدس پہاڑ کی چوٹی پر نظریں جمائے ہوئے دل ہی دل میں اپنی دعا دہرا رہا تھا مجھے فریدہ کا برقی مراسلہ یاد آیا جو اس نے میرے فون کے جواب میں کراچی سے بھیجا تھا: ''میں آ تو جاؤں مگر پہلی پرواز میں بچوں سمیت ساری سیٹیں نہیں مل رہی ہیں!''

اور اب میں مقدس پہاڑ کی طرف منہ کئے یہ دعا مانگ رہا تھا کہ اسے بغیر پریشانی کے ساری سیٹیں فوراً مل جائیں۔

میرے قدم خطِ استوا پر پوری مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔

☆......☆......☆

ہوروسکوپ

انور زاہدی

پاپا وکیل تھے۔۔شام پڑتے ہی رات کے کھانے تک اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے آنے والے مقدمات کی فائلوں اور قانون کی کتابوں میں اُلجھے رہتے۔۔علی الصبح اپنے معمول کے مطابق اٹھتے اور تیار کیس پر نظر ثانی کرنے کے بعد سفید پینٹ سفید شرٹ سفید کالر اور سیاہ کوٹ پہنے کھانے کی ٹیبل پر بیٹھ کر تازہ اخبار کا مطالعہ شروع کر دیتے۔۔یہ اُن کا روزمرہ کا معمول تھا۔۔تاوقتیکہ کسی روز ناسازی طبع کی وجہ سے وہ کورٹ نہ جا رہے ہوں یا پھر کورٹ میں سرکاری تعطیل ہو۔۔ناسازی طبع کا موقع شاذ ہی ہوتا کہ پاپا اپنی صحت کا بطور خاص خیال رکھتے تھے۔۔وقت پر کھانا۔۔تھوڑا اور مناسب مقدار میں کھانا۔گھی تیل اور زیادہ نمک کا شوق نہ رکھنا۔۔۔اور پھر اس سب پر مستزاد صبح شام باقاعدگی کے ساتھ ورزش یا واک کرنا پاپا کی زندگی کا معمول تھا۔گھر کے کسی فرد نے کبھی اُنہیں رات کو غیر معمولی طور پہ تاخیر سے سوتے یا صبح کو دیر سے اٹھتے نہیں دیکھا تھا۔۔اور وہ ہم تینوں بہن بھائیوں میں بھی اپنی ان عادات کو منتقل کرنے میں خاصی حد تک کامیاب ہو گئے تھے۔۔پابندی وقت۔۔وعدے کو پورا کرنا۔۔اور کام کی وقت پر تکمیل۔۔پاپا کے فرائض منصبی میں اولیت رکھتے تھے۔

وکیل ہوتے ہوئے بھی جدلیات اُن کا پسندیدہ مضمون تھا۔۔کارل مارکس۔۔فریڈرک اینجلز۔۔ڈارون۔۔اور فرائڈ کو وہ بیسویں صدی کا نجات دہندہ گردانتے تھے۔۔مگر ساتھ ہی اپنی تاریخی اور معاشرتی روایات پر بھی فخر کرتے تھے۔۔ابن خلدون اور ابن رشد اُن کے محبوب فلسفیوں میں سے تھے۔۔وہ عہد ماضی اور دور جدید کے منطقی امتزاج کا ایک بے مثال نمونہ تھے۔۔۔ہم سب بہن بھائیوں کی تعلیم و تربیت اُنہی کے اصولوں پر ہوئی۔۔۔جہاں وہ ہمیں عہد جدید کے سائنس دانوں کی گراں قدر خدمات کے بارے میں بچپن سے بتاتے چلے آئے تھے وہیں وہ ہمیں بوعلی سینا۔۔فارابی اور رازی کی علم طب کے حوالے سے جدید انسانیت کو فراہم کی جانے والی معلومات کے بارے میں بھی سمجھایا کرتے تھے۔۔

"جوزی بیٹے۔۔۔یہ جو بوعلی سینا تھے۔۔۔اپنے عہد کے سب سے بڑے طبیب ہی نہ تھے بلکہ طبابت کے فن کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ۔۔فلسفہ۔۔موسیقی۔۔علم الٰہیات۔۔اور فقہ پر بھی دسترس رکھتے تھے۔۔۔ان کی طب کی کتاب جسے "قانون" کے نام سے دنیا بھر میں جانا گیا۔۔اٹھارویں بلکہ انیسویں صدی کے اوائل تک سارے یورپ کی طبی دانشگاہوں میں "کینن" کے نام سے پڑھائی جاتی رہی۔۔۔یہ ایران کے شمال مغربی صوبے ہمدان میں پیدا ہوئے۔۔۔لیکن آج کا جدید یورپ انہیں فادر آف میڈیسن کے نام سے یاد کرتا ہے اور صرف یہی نہیں ان کی ایجادات اور طب کے حوالے سے ان کے فراہم کردہ علم پر فخر کرتا ہے۔۔۔میرا تمہیں یہ سب بتانے کا مطلب یہ ہے۔۔۔کہ آج کے جدید علوم حاصل کرو لیکن اپنے ماضی کی درخشاں روایات کو یاد رکھو اور ان پر فخر کرو۔۔۔"

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔۔کس طرح وہ مجھے جمی اور نازو کو جب ابھی ہم نے سکول جانا شروع کیا تھا۔۔۔روزانہ صبح کو سیر کے لئے باغ میں لے جایا کرتے۔ہم تینوں بہن بھائیوں کو اپنے سامنے پارک میں بھگایا کرتے اور خود وہیں لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے چلتے رہتے یا کبھی کبھی ایک ہی جگہ کھڑے ہو کر ہمیں کھیلتے ہوئے دیکھا کرتے

اور خود جاگنگ شروع کر دیتے ۔۔۔ یا پھر اتھلیٹس کی طرح ہمارے ساتھ ساتھ باغ کی روشوں پر ہلکے ہلکے قدموں سے بھاگتے رہتے ۔۔۔ صبح کی سیر کا یہ روٹین چھٹی کے دن یعنی اتوار کو قدرے لمبا ہو جاتا ورنہ عام دنوں میں باغ کا ایک چکر لگایا اور آدھ پونے گھنٹے میں واپس گھر ہو لئے ۔۔۔ اتوار کے روز یہ سیر ذرا طول پکڑ لیتی وہ کبھی ہمیں باغ میں سورج مکھی کے جھنڈ کی طرف لے جاتے اور ہم سب کو یہ دکھا کر حیران کر دیتے کہ سورج مکھی کے سارے پودے سورج کی طرف منہ کئے کھڑے ہیں ۔۔۔ پھر پاپا بتایا کرتے کہ سورج مکھی کا پودا اسی لئے سورج مکھی کہلاتا ہے کہ وہ اپنا منہ یعنی مکھ سورج کی گردش کے ساتھ ساتھ موڑتا رہتا ہے ۔۔۔ ہم تینوں حیرت سے پاپا کی باتیں سنا کرتے ۔۔۔ یا پھر کبھی وہ کسی پودے پر بیٹھا ہوا ٹڈی نما ایک جاندار دکھا کر ہمیں حیران کر دیتے ۔۔۔ کیونکہ جسے ہم تینوں بہن بھائی سبز درخت کا ایک حصہ سمجھ رہے ہوتے تھے وہ ہماری آنکھوں کے سامنے پھدک کر کسی اور شاخ کے اوپر جا بیٹھتا ۔۔۔ اور پاپا بتاتے ۔۔۔

''بچو ۔۔۔ اسے علم حیاتیات میں ۔۔۔ ''میمیکری'' ۔۔۔ کہتے ہیں ۔ یعنی اس طرح یہ چھوٹے حشرات خود کو اپنے ماحول کے رنگ میں ڈھال کر اپنے لئے ایک طرح کا ڈیفنس میکانزم بنا لیتے ہیں ۔۔۔ اس طرح جہاں یہ خود کو اسی ڈیفنس کے ذریعے بچاتے ہیں وہیں اسی ڈیفنس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے سے چھوٹے کیڑے مکوڑوں کو شکار کر کے اپنی خوراک کا بندوبست کرتے ہیں ۔۔۔۔۔''

یا کبھی باغ سے واپسی پر اپنی کار چلاتے ہوئے وہ مجھے ڈرائیونگ کے بارے میں سمجھایا کرتے ۔۔۔

''جوزی ۔۔۔ بیٹے ۔۔۔ جب میں کار چلاتا ہوں تو تمہیں پوری توجہ سے دیکھنا چاہیے کہ کار چلاتے ہوئے کیا کچھ کرنا ضروری ہے ۔۔۔ سب سے بڑی بات جو کار چلانے میں اہم ہے ۔۔ وہ کار چلانے والے کی مسلسل توجہ اور اُسکی حاضر دماغی ہے ۔۔۔''

عام دنوں میں ممی کو آٹھ بجے کالج پہنچنا ہوتا تھا لیکن پاپا کو کورٹ نو بجے جانا ہوتا تھا ۔۔۔ لہذا ڈرائیور ناشتے کے فوراً بعد ہی ممی اور ہم تینوں کو لے کر چلا جاتا ۔۔۔ اور جب وہ ساڑھے آٹھ بجے ممی کو اُن کے کالج اور ہمیں سکول پہنچا کر گھر واپس پہنچتا تو پاپا کے کورٹ جانے کا وقت ہو چکا ہوتا ۔ تب ممی فزکس کی لیکچرار تھیں اور کالج میں ہمہ وقت اپنے شاگردوں کے ہمراہ فزکس کی لیب میں وقت گزارتیں ۔ نیوٹن کے حرکت کے قوانین ۔۔ پر مبنی تجربات ۔ کشش ثقل ۔۔ اور جدید خلائی موضوعات پر لیکچر اور ان سے متعلق بحثوں میں وقت گذرتا ۔۔۔۔۔۔ لیکن کالج سے گھر آ جانے پر وہ بیشتر وقت کیرو کی پامسٹری ۔۔۔ علوم فلکیات ۔۔۔ اور ستاروں کے اثرات اور ہوروسکوپ سے متعلق کتابوں اور رسائل کے مطالعے میں گزار دیتیں ۔۔۔ یا پھر ان کے بارے میں مطالعے میں محو رہا کرتیں ۔۔۔ اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود وہ گھر کے کاموں کی نگرانی کرتیں ۔۔۔ ہم سب کیلئے ہر دوسرے تیسرے دن نت نئی ڈشز تیار کرتیں ۔۔۔ کبھی شاہی ٹکڑے بنا رہی ہیں تو کبھی شکر قندی کا حلوہ بنا کر ہم سب کو حیران کر دیتیں ۔۔۔۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ ممی کا ستارہ ۔۔۔ کینسر تھا ۔۔ جبکہ پاپا کا لیو ۔۔۔ یعنی ممی کا عنصر اگر پانی تھا ۔۔۔ تو پاپا کا عنصر آگ ۔ اور بظاہر آگ اور پانی کے اس قدر حیران کن ملاپ کے بارے میں سوچنا بھی عجیب سی بات لگتی تھی ۔۔۔ لیکن ہم نے آگ اور پانی کو با آسانی شیر و شکر ہوتے اپنے گھر میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ۔۔۔

ممی جس قدر اپنے گھر سے محبت کرتی تھیں ۔۔ وہ ناقابل یقین تھا ۔۔ اور دوسری طرف پاپا بھی اُن سے کچھ بڑھ کر ہی نہ صرف اُن کا خیال رکھتے بلکہ ہمہ وقت ہم تینوں بہن بھائیوں کی آہٹ نہٹ میں لگے رہتے ۔۔ جب ہم

سو جاتے تو ممی کبھی میرے کمرے میں آ کر میرے سرہانے کھڑے ہو کر دعائیں پڑھتی رہتیں۔۔تو کبھی نازو کے کمرے میں جا کر اُس پر پڑھ پڑھ کر دم کرتی اور دعائیں مانگتی نظر آتیں۔۔۔چھوٹا جمی۔۔جو ابھی سکول ہی میں تھا اکثر رات کو خواب میں ڈر جاتا تو کبھی میرے بستر میں آ گھستا۔۔۔کبھی پاپا کے پاس جا لیٹتا۔۔۔اور اگلے دن ممی کالج جانے کے بجائے سارا دن جمی کے ساتھ لگا دیتیں۔۔میں نے کئی بار اُنہیں پاپا سے بحث کرتے ہوئے سنا تھا۔۔۔۔۔

''دیکھیں میں نہ کہتی تھی۔۔۔جمی کی پیدائش کے وقت زُحل اپنے گھر سے مشتری میں داخل ہو چکا تھا۔۔۔جس کے اثرات اب تک جمی پر نظر آتے ہیں۔۔۔''

اور پاپا جو علم نجوم اور ستاروں کے علم کے بارے میں کوئی موقر رائے نہ رکھتے تھے۔۔۔ممی سے محبت کرنے کے باعث بس یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے۔۔۔۔

''روبی۔۔۔تم نے فزکس میں ماسٹرز خواہ مخواہ میں کیا۔۔۔اگر تم یہی وقت علم نجوم میں پی ایچ ڈی کرنے میں لگا تیں تو قوم و ملک کے لئے کس قدر بہتر ہوتا۔۔۔''

یا پھر کبھی ممی کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کرتے۔۔۔

''یار۔۔تمہارے ابا جان تو ڈاکٹر تھے وہ بھی سول سرجن۔۔۔۔مگر ایسا لگتا ہے کہ تمہارے ہاں کہیں دور پرے کوئی نجومی یا جوتشی ضرور رہا ہوگا۔۔۔''

اور ممی اُن سے روٹھتے ہوئے اپنی بات کو یوں ختم کر دیا کرتیں۔۔۔۔

''آپ ٹھہرے کریمینل لائر۔۔۔ہم چاہے فزکس میں ماسٹر ہوں یا علم نجوم میں پی ایچ ڈی۔۔۔ظاہر ہے آپ سے جرح کون کر سکتا ہے۔۔۔''

کچھ ہی دن بعد اتفاق سے اگر پاپا کورٹ سے کسی مقدمے کے سلسلے میں پریشان گھر لوٹتے تو ممی ہی اُن کی مشکل یہ کہتے ہوئے آسان کر دیا کرتیں۔۔۔

''آپ بالکل نہ گھبرائیں۔۔۔میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اگر آپ کا یہ کیس ہفتے کے فلاں روز کورٹ میں پیش ہوا تو آپ کے لئے اس کیس میں مشکلات ہو سکتی ہیں۔۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کی اس کیس کے سلسلے میں تیاری میں کچھ کمی ہے۔۔۔بلکہ یہ سب کچھ درحقیقت آپ کے ستاروں کے باعث ہے۔۔اب آپ اگر میری بات مانیں تو اس کیس کو اگلے ہفتے منگل کے دن پر رکھوا لیں۔۔اس کیلئے آپ کورٹ میں اپنی صحت کے حوالے سے میڈیکل سرٹیفیکیٹ بھیج دیں۔۔۔''

اور پاپا ممی سے ہنستے ہوئے کہتے۔۔۔

''یعنی میں کورٹ میں جھوٹا میڈیکل سرٹیفیکیٹ داخل کروں۔۔۔''

''بھئی جھوٹا کہاں۔۔۔اگر آپ بیمار ہیں تو بس بیمار ہیں۔۔۔اور آرام آپ کو آپ کا ڈاکٹر تجویز کر رہا ہے۔۔۔اس میں جھوٹ کہاں ہے۔۔۔''

''اور بالفرض اُس دن تمہارے علم نجوم کے مطابق جس عدالت میں ہمارا کیس ہے اُس کے جج صاحب کا ستارہ بھی گردش میں آ گیا۔۔۔تو پھر کیا ہوگا۔۔۔؟

میرا مطلب ہے کہ اُس دن اگر جج نے بھی اسی طرح کا میڈیکل سرٹیفیکیٹ کورٹ میں بھیج کے چھٹی مانگ لی تو؟''

اور ممی پاپا کی بات بیچ میں کاٹتے ہوئے مجھ سے بڑے پیار سے کہتیں۔۔۔
''جوزی بیٹے۔۔۔تم پاپا کی بات نہ سنو بلکہ ایسا کرو کہ ڈاکٹر انعام سے ابھی جا کر مل لو۔۔۔اور اُنہیں میری طرف سے کہنا کہ پاپا کی کمر میں کل سے اچانک درد ہو گیا ہے اور وہ اس قابل نہیں ہیں کہ آپ کے پاس آ سکیں۔۔۔ممی نے کہا ہے کہ آپ اُن کے لئے ایک میڈیکل۔۔۔''
تب پاپا ممی کی بات کو کاٹتے ہوئے کہتے۔۔۔
''اب یہ بچہ میرے لئے ڈاکٹر کے پاس جائے گا۔۔۔وہ بھی ایک جھوٹا میڈیکل سرٹیفیکیٹ حاصل کرنے کیلئے۔۔معاملہ اتنا بھی نہیں بگڑا۔۔ میں خود جا کر ڈاکٹر انعام سے مل لیتا ہوں۔۔بیشک وہ میرا عزیز دوست سہی لیکن۔۔اپنے سلسلے میں مجھے خود اُن سے بات کرنی چاہیے۔۔تم فکر نہ کرو۔ میں ایسا ہی کروں گا جیسا تم مشورہ دے رہی ہو۔''
بات آئی گئی ہو جاتی۔۔۔نہ پاپا انکل انعام کے پاس جاتے۔۔۔نہ میڈیکل سرٹیفیکیٹ کی نوبت آتی۔۔۔
اگلی مرتبہ پاپا اُسی کیس میں کامیاب ہو جاتے۔۔۔اور جب وہ گھر واپس آ کر ممی کو اس کے بارے میں خوش خوش بتاتے۔۔۔تو ممی یہ سوچتے ہوئے۔۔۔کہ پاپا نے اُن کے مشورے پر کام کیا ہے مسکراتے ہوئے کہا کرتیں۔۔۔
''اب تو مان لیں مجھے ماہر علم نجوم۔۔۔آپ جب بھی میرے مشورے پر کام کریں گے۔۔۔تو ان شا اللہ ایسا ہی ہوگا۔۔۔''
پاپا اکثر ممی سے پوچھا کرتے۔۔۔
''تم یہ بتاؤ کہ کیا اپنے لیکچر دینے سے پہلے اپنے علم جوتش کا سہارا لیتی ہو۔۔۔کہ کل مجھے کشش ثقل پر لیکچر دینا چاہیے یا نہیں۔۔۔یا پریکٹیکل کراتے ہوئے کبھی ایسا ہوا ہے کہ تمہارے کانوں میں اک غیبی آواز آئی ہو۔۔۔
''تم ہماری اقلیم میں کیسے داخل ہو گئیں۔۔۔تم نہیں جانتی کہ یہاں قوانین حرکت کے بجائے ہمارا قانون چلتا ہے۔۔۔؟''
ممی اس بات کا جواب ہمیشہ ٹال دیتیں۔۔۔اور ہنستے ہوئے کہا کرتیں۔۔۔
''یہ آپ کے عدالتی کام نہیں ہیں کہ پیشی اپنی مرضی سے آگے کروالی۔۔۔بیچارا موکل جانے اور اُس کا خاندان۔۔۔آپ کے موکل تو سنا ہے اسی عدالتی نظام کے ہاتھوں برسوں عدالتوں کے چکر لگاتے رہتے ہیں۔۔۔کچھ ہی خوش نصیب ہونگے جنہیں کامیابی ملتی ہو۔۔۔ورنہ بیشتر تو ان دیوانی معاملات میں سنا ہے کہ دیوانے ہو جاتے ہیں۔۔۔''
غرض پاپا ممی کی اسی نوک جھونک پر دن رات گزرتے گئے۔۔وہ ایک کامیاب وکیل اور ممی ایک اچھی پروفیسر کے طور پر کام میں مصروف کار رہے۔۔لیکن بقول پاپا کے یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت تھی کہ ممی اپنے بیشتر کاموں کو شروع کرنے سے پہلے اپنے علم جوتش کا سہارا ضرور لیا کرتی تھیں۔۔۔یا ممکن ہے یہ میرا وہم ہو۔۔کم و بیش ساری ہی عورتیں اپنے میاں گھر اور بچوں کے بارے میں بہت زیادہ پزیسو ہونے کے باعث ضعیف العتقاد ہو جاتی ہیں اور قدم قدم پر اپنی ضرورت سے زیادہ محبت کی وجہ سے بات بات پہ وہ وسوسوں کا شکار ہوتی ہیں اور خواہ مخواہ کے وہم اور ڈر میں مبتلا رہتی ہیں۔
مثلاً میرے بارے میں وہ اس لئے فکر مند رہا کرتیں۔۔۔کہ جوزی بہت سادہ بچہ ہے۔۔۔راست ہے۔۔اپنی بات پر اٹل رہتا ہے۔۔دوسروں کو نقصان پہنچانے کے بارے میں سوچنا بھی غلط سمجھتا ہے۔۔۔یہ دنیا کے چھل فریب سے بیگانہ ہے اس کا کیا ہوگا۔۔۔؟

لیکن میں اُن کے سارے فکر اور پریشانی کے باوجود ایم بی اے کرتے ہی ایک بینک میں ملازم ہوگیا۔۔ کچھ ہی سالوں میں ترقی کر کے برانچ منیجر بن گیا۔۔ خود ممی ہی نے اپنی ایک بہت عزیز دوست کی بیٹی سے میری شادی کر دی۔۔ اور شادی کے دو برس بعد ہی ہماری ممی دادی بن گئیں۔۔ میں آج بھی ممی کی تمام فکرات اور توہمات کے ہوتے ہوئے بھی اپنی فیلڈ میں خاصا کامیاب ہوں۔۔ لیکن ممی کی پریشانی اس سب کے بعد بھی میرے بارے میں ہمیشہ اُسی طرح رہی۔

چھوٹی بہن نازو کے بارے میں وہ یہ سوچ سوچ کر فکر مند رہتیں۔۔۔ کہ اُس کا ستارہ ورگو ہے۔۔ اور بقول ممی کے گو اس ستارے کے زیر اثر پیدا ہونے والے بہت عقلمند۔۔ زیرک اور عملی زندگی میں کامیاب ہوتے ہیں۔۔ لیکن اُن کی ازدواجی زندگی میں مسائل کھڑے رہتے ہیں۔۔ لہذا بقول ممی کے ورگو والے بچوں کی شادی ذرا تاخیر سے ہونی چاہیے۔۔

اب نازو کا معاملہ دیکھیں۔۔۔ ورگو ہونے کے باوجود وہ ابھی یونیورسٹی ہی میں تھی کہ وہاں اپنے ہی ڈیپارٹمینٹ کے ایک لیکچرار سے اُس کا افیئر چل پڑا۔۔ اور نازو نے ادھر ماسٹرز کیا ادھر اُس کی شادی ہوگئی۔۔۔ آجکل نازو اور اُس کا میاں امریکا کی کسی یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں اور وہیں کسی ادارے سے منسلک ملازمت میں مشغول ہیں۔ جمی چونکہ جیمنائی کے برج میں پیدا ہوا تھا۔۔۔ لاأبالی مزاج کا لڑکا تھا۔ ممی اُس کے بارے پریشان رہا کرتیں۔۔۔ کہ اُن کے علم کے مطابق یہ کسی ایک لڑکی سے نباہ نہیں کر پائے گا فلرٹیشن اس کے مزاج کا حصہ ہے۔۔۔ عملی زندگی میں کامیاب رہے گا لیکن ازدواجی زندگی میں ناکامی اس کی راہ میں روڑے اٹکائے گی۔۔۔ جمی نے ممی کے سارے وسوسوں کو اک سرے سے رد کرتے ہوئے اپنی خالہ زاد بہن یعنی ممی ہی کی چھوٹی بہن کی لڑکی سے شادی کر کے تمام کر دیا۔۔۔ وہ نہ صرف ایک اچھا بزنس مین بن گیا ہے گارمینٹس کے کاروبار میں ترقی کے ساتھ اب وہ اپنی گارمنٹ فیکٹری لگانے کے بارے میں تیاریاں کر رہا ہے۔۔۔ میں یہ بتاتا چلوں کہ جمی جس کے بارے میں ممی ساری عمر پریشان رہیں ہم تینوں بہن بھائیوں میں مالی طور پر سب سے کامیاب ہے۔ میں اب بھی اُسے تنگ کرنے کیلئے کہا کرتا ہوں۔۔۔

"جمی۔۔۔ تیری فلرٹیشن کا کیا رنگ ہے۔۔؟"

اور وہ جواب میں ہنس کر یہ کہا کرتا ہے۔۔۔

"بھائی پتہ نہیں ممی کو مجھ میں کیا نظر آتا رہا۔۔ یہاں تو جب تمہاری بھابی مجھ پر کبھی نظر التفات کرتی ہیں تو میں حیران ہو جاتا ہوں۔۔۔ زندگی میں تو کسی لڑکی نے لفٹ نہیں کرائی۔۔۔ ایک ممی ہی کی نظر میں۔۔۔ میں دنیا بھر کا سب سے بڑا فلرٹ رہا۔۔"

جب کبھی ہم تینوں بہن بھائی اکٹھے ہوا کرتے تو ممی پاپا کی باتیں ہوتیں اور اس میں ہمیشہ ممی کے ستاروں کا علم ضرور بحث میں آتا۔۔۔ کس طرح ممی ہر کام سے پہلے اپنے ستاروں کے علم سے مدد لیا کرتیں اور کس طرح وہ شدت سے اپنے فلسفے میں یقین رکھتی تھیں۔۔۔ کہ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ ستاروں کی گردش کے طابع ہے۔۔۔۔

"نازو تیری شادی کے بارے تو ممی کہا کرتی تھیں۔۔۔ پتہ نہیں میری بچی کا کیا ہوگا۔۔۔؟"

اور نازو ہنستی ہوئی کہتی۔۔۔

"کوئی شادی کرے گا بھی یا نہیں۔۔۔ جمی تمہیں ایک مزے کی بات بتاؤں یونیورسٹی میں شادی کے دو برس کے بعد ایک دن مجھ سے ملنے ایک خاتون چلی آئیں۔۔۔ اور مجھ سے والدین کے بارے میں دریافت کرنے لگیں۔۔۔ مجھے شک ہوا اور میں نے اُنہیں اپنے شوہر سے ملوانے کا کہا تو وہ اک دم بول پڑیں۔۔۔

بیٹی میں تو اپنے بیٹے کے رشتے کے لئے تمہارے پاس آئی تھی۔۔۔ مجھے علم نہ تھا کہ تم شادی شدہ ہو۔۔۔اور سخت مایوسی کی حالت میں تقریباً پیر پٹختی ہوئی واپس چلی گئیں۔۔۔۔''

کچھ بھی ہو ممی اپنے گھر شوہر اور تینوں بچوں سے بے پناہ محبت کرتی تھیں۔۔۔شاید ستاروں کا علم اُن کے لاشعور میں بسے ہوئے کسی پرانے خوف کا حصہ تھا یا پھر وہ اسے اپنے لئے بطور ڈیفنس کے استعمال کیا کرتی تھیں۔۔۔ہم سب ہی اکثر ممی اور پاپا دونوں سے پوچھتے

''اچھا ممی تو یہ بتائیے کہ اگر آپ ستاروں کے بارے میں اتنے شد و مد سے یقین رکھتیں ہیں تو اپنی شادی پر اس کا سہارا کیوں نہیں لیا۔۔۔''

اور اس کے جواب میں وہ بس مسکرا کر رہ جاتیں۔۔۔بہت ہوا تو یہ کہہ کر چپ ہو جاتیں۔۔۔

''بھئی وہ معاملہ ہمارے بزرگوں کا تھا۔۔۔اب تمہاری طرح ہم اتنے بے شرم نہیں تھے۔۔۔کہ ہر بات پر ماں باپ سے بھی جرح شروع کر دیتے ہو۔۔۔''

لیکن ہم تینوں بہن بھائیوں کے لئے ہماری ممی اور پاپا مثالی ماں باپ ثابت ہوئے تھے۔۔کیا تھا جو انہوں نے ہمیں نہیں دیا تھا۔۔اچھی تعلیم و تربیت۔۔بھرپور اور پر اعتماد زندگی گزارنے کا قرینہ۔۔اور اس قدر محبت و شفقت۔۔جس کی چھاؤں نے کبھی زندگی کی تمازت کا احساس ہی نہیں ہونے دیا۔۔یہ کمال کی بات ہے کہ ہم تینوں بہن بھائی اپنی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ممی کے سارے وسوسوں کے باوجود نہ صرف اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے تھے بلکہ تینوں ہی شادی کے بعد اپنے گھر بخیر و خوبی چلا رہے تھے۔۔ایک ممی تھیں جو اس کے باوجود ہمیشہ کی طرح اب بھی فکر مند نظر آتیں۔۔

ہر سال یونیورسٹی کی طرف سے ممی کے ڈیپارٹمنٹ کے ایک دو ٹوور ضرور ہوتے تھے۔۔۔اتفاق ہوگا کہ ممی نہ جائیں۔۔۔ہم سب مطمئن رہتے کہ ممی ہر ٹوور پہ جانے سے پہلے اپنے ستاروں کے علم سے مدد لے لیا کرتی تھیں۔۔۔مگر اس آخری ٹوور نے جس میں فزکس کے سارے ڈیپارٹمینٹ نے جانا تھا سارے گھر کو پاگل کر کے رکھ دیا تھا۔۔۔ممی ہمیشہ اپنے دئے ہوئے وقت پر واپس لوٹا کرتیں۔۔۔لیکن اس مرتبہ ٹوور سے واپسی میں تاخیر ہو گئی تھی۔۔۔ہم سب نہ صرف منتظر تھے بلکہ پریشان تھے کہ سوات کے کالج سے فون پر پاپا کو پیغام ملا کہ یونیورسٹی کی دو بسوں میں سے ایک بس بلندی سے بے قابو ہو کر گہرائی میں بہتے ہوئے دریا میں جا گری ہے۔۔۔اطلاع کے مطابق بچنے والوں میں سے پانچ طالب علم ایک لیکچرار اور ممی خوش نصیبوں میں سے تھیں۔۔۔یہ سُنتے ہی پاپا ہم سب کو لے کر سوات کی طرف چل پڑے۔۔۔جب ہسپتال جا کر ممی کی شکل دیکھی تو چین آیا۔۔۔پٹیوں اور پلاسٹر میں بندھی ہماری ممی اپنے اردگرد سے غافل تھیں۔۔۔وہ کئی دن بے ہوش رہیں۔۔۔ہوش میں آئیں تو ہم سب کو اپنے پاس دیکھ کر رونا شروع کر دیا۔۔۔پاپا کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی ہمیں چپ رہنے کو کہتے تھے اور خود سخت اعصابی تناؤ کا شکار تھے۔۔۔ممی کے سر میں چوٹوں کے علاوہ ایک بازو اور ایک ٹانگ میں پنڈلی کی ہڈی کا فریکچر تھا۔۔۔ہمیں یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ہم اتنے خوفناک حادثے کے بعد اپنی ماں کو زندہ سلامت دیکھ رہے تھے۔۔۔

اس حادثے میں بائیس افراد بشمول طالب علم ڈرائیور اور دو لیکچرار ہلاک ہوئے تھے۔۔۔لیکن جن کی لاشیں دریا سے علاقے کی پولیس اور مقامی لوگ نکالنے میں کامیاب ہو سکے وہ سترہ تھیں۔۔سلامت بچ جانے والوں میں ممی کے علاوہ ایک لیکچرار اور پانچ طلبا تھے۔۔۔بچ جانے والے زخمیوں میں سے دو کی حالت کو تشویش ناک بتایا گیا تھا۔پانچ افراد

کی لاشیں انتھک کوشش کے باوجود نہ مل سکیں۔۔۔

گھر آجانے پر بھی ممی مسلسل تین ماہ تک صاحب فراش رہیں۔۔۔خدا خدا کر کے پہلے بیساکھیوں اور پھر اسٹک کے سہارے چلنا شروع کیا۔۔۔ممی کے صحت یاب ہونے پر ہمیں معلوم ہوا کہ گھر کی اصل رونق تو ممی ہی ہیں۔۔۔جب تک وہ ٹھیک نہ ہوئیں کسی نے بھی اُن سے ستاروں کے علم کی بات نہ کی۔۔۔مکمل طور پر صحت یاب ہوجانے کے بعد ایک دن وہ کھانے کی میز پر ہم سے خود ہی مخاطب ہوئیں اور پاپا سے بات کرتے ہوئے کہنے لگیں۔۔۔

"آپ جانتے ہیں۔۔میں تو کوئی قدم بغیر اپنے علم کے باہر نہیں نکالتی۔۔۔اس بار بھی جب میں کالج کے بچوں کے ٹوور انچارج کی حیثیت سے شمالی علاقوں کا دورہ کرنے جارہی تھی تو میں پوری طرح سے مطمئن تھی کہ سب ٹھیک ہوگا۔۔۔بس ایک رات کے خواب نے مجھے پریشان کردیا تھا۔۔۔جس میں مجھے بار بار اپنے بچوں کو گنتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔۔۔اور ہر بار کی گنتی کے دوران۔۔۔کوئی ایسی بات ہوجاتی تھی۔۔۔جس کی وجہ سے مجھے از سرِنو گنتی شروع کرنی پڑ جاتی تھی۔۔۔جیسے میں گنتی کر چکنے کے باجود ذہنی طور پہ مطمئن نہ تھی۔۔۔لیکن اس غیر معمولی احتیاط کو اپنی عادت سمجھتے ہوئے میں نے آپ سے یا بچوں سے اس خواب کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا۔۔۔کہ اس وجہ سے آپ سب بلا وجہ پریشان ہوجاتے اور ممکن ہے میرا اس ٹوور پر جانا ملتوی ہوجاتا۔۔۔جب ہوش میں آئی تو آپ سب کو اپنے پاس پاکر کس قدر خدا کا شکر کیا۔۔۔بس اب میں نے ستاروں کے علم کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ زندگی موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔۔۔وہ جسے چاہتا ہے خوفناک سے خوفناک حادثے میں بھی بچالیتا ہے۔۔۔آپ بالکل صحیح کہا کرتے تھے۔۔۔اس حادثے نے مجھے بدل کے رکھ دیا ہے۔۔۔"

ہم سب اپنی ممی کو تصویرِ حیرت بنے دیکھ رہے تھے۔۔۔۔واقعی اس حادثے نے ممی کی سوچ میں نمایاں تبدیلی پیدا کردی تھی۔۔۔اب وہ ستاروں کے علم پر وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنا بیشتر وقت ہم بہن بھائیوں کے ساتھ صرف کرتیں۔۔۔پاپا سے باتیں کرنے میں خوشی محسوس کرتیں۔۔۔یا پھر اپنے کالج کے لیکچر کی تیاری میں مصروف رہا کرتیں۔۔۔ممی اس حادثے کے بعد پہلے سے کہیں زیادہ مثبت رویہ اختیار کرچکی تھیں۔۔۔اب اگر اتفاق سے کوئی اُن سے جوتش یا ستاروں کے بارے میں کوئی سوال کردیتا تو ممی نہایت خوش اسلوبی سے سوال کرنے والے کو ٹال دیا کرتیں۔۔۔ہم تینوں بہن بھائی ہی نہیں پاپا بھی ممی کے اس رویئے پر حیران ہونے کے ساتھ ساتھ خوش بھی تھے۔۔۔

اب اُن کی فکر اور سوچ کا دائرہ اپنے گھر بار اور بچوں تک مرکوز ہوگیا تھا۔۔۔یعنی اگر سادہ لفظوں میں یہ کہہ دیا جائے۔۔۔کہ ممی اب ایک مکمل طور پر پریکٹیکل انسان کے پیکر میں ڈھل گئی تھیں۔

میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ زندگی میں رونما ہونے والے بعض حادثات مختلف انسانوں پر مختلف تاثرات چھوڑ جاتے ہیں۔۔۔حادثے کے شاید ایک ہی برس بعد ممی ایک رات ایسی سوئیں کہ صبح ہم سب کو روتا چھوڑ گئیں۔۔۔قدرت نے اُن کی قسمت میں اپنے میاں اور تینوں بچوں کی موجودگی میں انتہائی سکون سے مرنا لکھا تھا۔۔۔ورنہ جس حادثے سے وہ بچ کر نکلی تھیں۔۔۔اُس میں کتنے ہلاک اور کتنے ہی بدنصیبوں کی لاشیں بھی دریا سے برآمد نہ کی جاسکیں۔۔۔لیکن ممی کے حادثے اور یوں اچانک موت نے پاپا کی زندگی کو یکسر بدل کے رکھ دیا تھا۔۔۔پہلے اُنہوں نے کورٹ جانا چھوڑ دیا۔۔۔پھر وہ اپنے کمرے تک محدود ہوکر رہ گئے۔۔۔اور آہستہ آہستہ ہم بہن بھائیوں سے بھی بولنا ختم کردیا۔۔۔دیکھتے ہی دیکھتے پاپا کی شاندار شخصیت ہر وقت خلا میں تکتے رہنے والے ایک پیکر میں بدل کے رہ گئی۔۔۔نہ اب وہ باقاعدگی سے غسل کرتے تھے۔۔۔نہ پہلے کی طرح ڈریس اپ ہوتے۔۔۔ہم اُن کے منہ سے علم و دانش کی باتیں

سُننے کو ترس گئے تھے۔۔۔لیکن ممی کی موت نے جیسے اُنہیں دنیا میں رہتے ہوئے ہی تارک الدنیا کر دیا تھا۔۔اب وہ بیشتر وقت اپنے کمرے میں بیٹھے کتابیں پڑھتے رہتے۔۔۔ایک دن گھر میں سوائے جمی اور پاپا کے کوئی اور نہ تھا۔۔۔جمی نے خاموشی سے جا کر دیکھا تو پاپا کی گود میں ممی کی ہوروسکوپ رکھی تھی۔۔۔ہم سب یہ سمجھتے رہے تھے کہ وہ مطالعے میں مصروف رہتے ہیں۔۔۔جمی کے بتانے پر معلوم ہوا کہ وہ ہر وقت اُس ہوروسکوپ کو تکتے رہتے ہیں جو در حقیقت ممی کی کتابوں کے ذخیرے میں اُنہیں مل گئی تھی۔۔۔۔جب جمی نے انتہائی پیار سے پاپا سے پوچھا

''پاپا۔۔۔آپ کیا پڑھ رہے ہیں۔۔۔؟''

تو پاپا نے سر اٹھا کر جمی کی طرف دیکھا اور ایک مدت کے بعد اُس سے بولے

''بیٹے۔۔۔میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری ممی کا ستارہ کینسر تھا۔۔۔لیکن وہ انتہائی بلندی سے بس کے دریا میں گرنے کے باوجود بچ گئیں۔۔۔اور پھر جب موت نے اُنہیں ہم سب سے جدا کیا تو وہ آرام اور سکون کے ساتھ اپنے بستر میں سو رہی تھیں۔۔۔میں اس ہوروسکوپ میں یہ دیکھتا رہتا ہوں کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔۔۔؟''

جس پر جمی نے کہا۔۔۔

''پاپا آپ تو ستاروں کے علم میں یقین ہی نہیں رکھتے تھے۔۔۔اور نہ اس طرح سوچتے تھے کیا اب آپ کی فکر بدل گئی ہے۔۔۔؟''

''بیٹے۔۔۔اب تک جس پر یقین تھا وہی نہیں رہا۔۔۔پھر کیا فکر اور کیسی سوچ۔۔۔؟''

اگلی صبح ناشتے کے لئے سب ہی پاپا کے منتظر تھے لیکن وہ نہ آئے۔۔۔جب میں اپنی بیوی کے ہمراہ اوپر اُن کے کمرے میں پہنچا تو پاپا کو بیڈ کے نزدیک فرش پر بیہوش پڑے پایا۔۔سب کچھ چھوڑ کر پاپا کو ہسپتال لے گئے۔۔۔وہ دو روز بیہوشی کی حالت میں پڑے رہے۔۔۔لگتا تھا رات کو کسی وقت سوتے ہوئے اٹھے تھے لیکن چکرا کر گر پڑے اور وہیں بیہوش ہو گئے۔۔۔ڈاکٹروں کے بقول اُن کی شوگر کم ہو گئی تھی۔۔۔ڈیپریشن کے علاج کیلئے ہسپتال میں دو ہفتے داخل رہے ۔۔۔اور جب گھر آئے تو لگتا یوں تھا کہ وہ پہلے کی نسبت خاصے بہتر ہو گئے ہیں۔۔۔۔ہسپتال میں سائیکیٹرسٹ کے علاج نے اُن کے ہاں نمایاں تبدیلی پیدا کی تھی۔۔۔

ممی کی برسی کے موقع پر ہم تینوں بہن بھائی اکھٹے ہوئے تھے۔۔۔نازو بھی اس بہانے امریکا سے اپنے بچوں کے ساتھ آ گئی تھی۔۔۔پاپا سارا دن ہم سب کے ساتھ ایک مدت کے بعد مل کر بیٹھے تھے اور ممی کے حادثے کے بعد پہلی مرتبہ میں نے اُنہیں باتیں کرتے اور نازو کے بچوں سے ہنستے اور کھیلتے دیکھا تھا۔۔۔ہم تینوں ہی ممی کی کمی کو محسوس کرنے کے باوجود پاپا کے اس مثبت رویے پر خوش تھے۔۔۔میں تو اس تبدیلی کو نازو کے اچانک آ جانے سے تعبیر کر رہا تھا۔۔کیا پتہ تھا کہ پاپا اُس چراغ سحری کی مانند لو دے رہے ہیں۔۔۔جسے ہماری زندگی سے اچانک بھڑک کر غائب ہو جانا تھا۔

اب یوں احساس ہوتا ہے۔۔۔جیسے وہ واقعی صرف نازو کے آنے کے منتظر تھے۔۔۔نازو کے آنے پر مجھے اُن کے چہرے میں جو چمک اور شگفتگی کا رنگ جھلکتا دکھائی دیا تھا۔۔۔وہ برسوں بعد رونما ہوا تھا۔۔۔جیسے وہ بس نازو سے مل لینے کے خواہاں تھے۔۔۔اور اُنہوں نے ممی کی برسی کے دن ہی اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔۔۔۔۔۔برسی کے دن چونکہ گھر میں خاصی مہمان داری رہی تھی۔۔۔اس لئے سب ہی اگلی صبح معمول کے برعکس تاخیر سے اٹھے۔۔۔ناشتہ کافی دیر سے ہو رہا تھا۔۔۔

''ارے بھئی پاپا کو ناشتہ دیا کسی نے۔۔۔۔''

میں نے باورچی سے معلوم کیا۔۔۔

''سر میں ایک بار گیا تھا لیکن وہ شاید سو رہے ہیں۔۔۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔۔۔''

میں یہ سنتے ہی اُن کے بیڈ روم کی طرف لپکا۔۔۔ باورچی کے مطابق۔۔۔ واقعی پاپا کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔۔۔ جو خلاف معمول تھا۔۔۔ جمی اور میں نے جب

دروازے کو دھکے سے کھولا۔۔۔ تو پاپا کو ایک بار پھر اپنے بستر سے نیچے فرش پر پڑے پایا۔۔۔ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھا ٹیبل لیمپ فرش پر گرا ہوا تھا۔۔۔ اُس کا بلب ٹوٹا ہوا کرچیوں کی شکل میں بکھرا ہوا تھا۔۔۔ یوں لگتا تھا جیسے پاپا کے ہاتھ لگنے سے لیمپ گرا تھا۔۔۔ یا پھر لیمپ سے اُنہیں الیکٹرک شاک لگا تھا۔۔۔ اور وہ اس حالت میں فرش پر گر پڑے تھے۔۔ کچھ پتہ نہیں چل سکا۔۔۔ معلوم نہیں وہ کس وقت اٹھے۔۔۔ اور دروازہ انہوں نے کیوں بند کیا۔۔۔؟

ہم اسی حالت میں انہیں ہسپتال لے کر دوڑے۔۔۔ لیکن سب بے معنی تھا۔۔۔ ڈاکٹروں نے مایوسی سے ہمیں دیکھا۔۔۔ اُن کے مطابق پاپا کی موت کو کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔۔

ممی کے انتقال کو سات برس ہو چکے۔۔۔ اور پاپا کو ہمیں چھوڑے چھ سال ہونے کو آرہے ہیں۔۔۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے وہ یہیں کہیں میرے اردگرد موجود ہیں۔۔ جب کبھی میں اپنے بچوں کو کچھ سمجھانے لگتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے میں نہیں میرے پاپا بول رہے ہیں۔۔ جب کبھی تاریخ کا ذکر ہوتا ہے۔۔۔ تو مجھے جانے کیوں پاپا کے محبوب کردار جلال الدین خوارزم کا نام یاد آتا ہے۔۔ جسے پاپا ہمیشہ اُس کی بے مثال جرات کی وجہ سے پسند کرتے تھے۔۔۔ کہ اُس نے چنگیز خان کی پیچھا کرتی ہوئی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بجائے پہاڑ کی بلندی سے گھوڑے سمیت نیچے گہرائی میں بہتے ہوئے دریا میں چھلانگ لگادی تھی۔۔۔ معلوم نہیں پاپا نے کیوں زندگی سے منہ موڑ کر دریائے عدم کا رخ کر لیا۔۔۔؟

ہم سب بہن بھائی مل کر بیٹھتے ہیں تو ممی پاپا کا ذکر ہوتا ہے۔۔۔ اور یہ بات شامل ذکر رہتی ہے کہ ممی ایک انتہائی خوفناک حادثے سے بچ گئیں لیکن اپنے گھر میں گہری نیند سوتی ہوئی ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔۔۔ پاپا ہسپتال میں زیر علاج رہے۔۔۔ بہتر ہو گئے تھے۔۔۔ اور یوں لگتا تھا جیسے دوبارہ نارمل کی طرف واپس آرہے ہیں۔۔۔ کہ ایک رات حادثے کی نذر ہو کر چپ چاپ چلے گئے۔۔۔ ستاروں کا علم نہ ممی کو بچا سکا۔۔۔ نہ ہوروسکوپ پاپا کے کچھ کام آئی۔۔۔۔

کل میں اپنے بینک کے آفس میں بیٹھا کچھ کلائنٹس سے ایک بزنس کے سلسلے میں بات کر رہا تھا۔۔۔ جب میرے سامنے بیٹھی ہوئی ایک خاتون نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے۔۔۔ اچانک سوال کر دیا۔۔۔

''جہانزیب صاحب۔۔۔ کیا آپ ہوروسکوپ میں یقین رکھتے ہیں۔۔۔۔؟''

اور میں اچانک اس غیر متوقع سوال کو سن کر جیسے گیارہویں منزل سے نیچے آ گرا۔۔۔

''میں سمجھا نہیں آپ کا مطلب۔۔۔''

اور خاتون کے ساتھ بیٹھے ہوئے اُن کے شوہر نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔۔۔

''جہانزیب صاحب۔۔۔ ہماری بیگم ہر کام کو شروع کرنے سے پہلے ستاروں کے علم سے ضرور مدد لیتی ہیں۔۔۔۔ آپ ٹھہرے ایک بینکر۔۔۔ آپ کو بھلا ستاروں کے علم سے کیا شغف ہو سکتا ہے۔۔۔؟''

میں مزید کچھ کہہ نہ سکا۔۔۔ اور کہتا بھی کیا۔۔۔ اُنہیں کیا بتاتا۔۔ کہ ہوروسکوپ سے ہمارا کتنا گہرا تعلق رہ چکا تھا۔۔۔

☆......☆......☆

منزل

کوثر جمال

صبح چھ بجے وہ گھڑی کے الارم پر اٹھا، مگر ہڑبڑا کے نہیں۔ اس نے آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر الارم بند کیا اور پھر ایک طویل انگڑائی لی جیسے خود کو پوری طرح بیدار کرنا چاہتا ہو۔ یہ رات اس نے سو کر نہیں گزاری تھی، لیکن شاید جاگ کر بھی نہیں۔ بس ایک عجیب سی سوتی جاگتی سیال کیفیت تھی۔ اطمینان اور سرخوشی میں کچھ ایسی بے چینی شامل تھی جس نے نیند کو ایک پل کے لئے بھی حاوی نہ ہونے دیا تھا۔ اس کیفیت کو کوئی نام دینا مشکل تھا، بس کچھ تھا، ایک دم نیا، اچھا، مگر نا قابل بیان سا حسّی جوار بھاٹا۔

زندگی کے گزشتہ ماہ و سال رات بھر اس کے آس پاس نٹ کھٹ بچوں کی طرح آنکھ مچولی کھیلتے رہے تھے۔ مفلسی کی پیوندگی چادر سے جھانکتا بچپن، دو کمروں، برآمدے اور چھوٹے سے صحن پر مشتمل عام سا گھر جس کے گلی میں کھلنے والے دروازے پر ٹاٹ کا بوسیدہ پردہ لٹکتا رہتا۔ گھر کی دیواروں کا جگہ جگہ سے اکھڑا پلستر اور رات کو ساٹھ پاور کے بلب کی بیمار روشنی میں کمروں کی سیلن زدہ دیواروں پر گھٹتے بڑھتے سائے (جنہیں وہ اکثر کسی فلم کی سکرین پر چلتی مورتیوں کی طرح دلچسپی سے دیکھا کرتا)۔ مٹی کے تیل سے چلنے والے چولہے پر پکے عام سے روکھے پھیکے کھانے اور اکثر گھسے پھٹے کپڑوں میں ملبوس ماں جو محض ایک حرکت کرتا ہوا جسم تھی۔ ایسا ہی ایک دوسرا جسم اس کے باپ کا تھا، ایک بیٹے اور چار بیٹیوں کا کلرک باپ جو اپنے مسائل میں گھرا وقت سے پہلے بوڑھا ہو رہا تھا۔ ماں اور باپ شاذ و نادر ہی ہنستے یا خوش دکھائی دیتے، البتہ دونوں میں نامعلوم باتوں پر جھگڑا ہوتا اور وہ اپنی کسی نہ کسی بیٹی پر اپنا غصہ اتارتے نظر آتے۔ کبھی کبھار اسے ایک جملہ گھر میں یا گھر سے باہر اپنے حوالے سے سنائی دے جاتا:

......"بے چارہ لڑکا، اتنی ساری بہنوں کا بوجھ اٹھائے گا" ...... یہ جملہ جو اس نے ایک سے زیادہ بار اپنی ماں کی مختلف سہیلیوں اور محلے کی خالاؤں کے منہ سے سنا تھا، اس کے اندر کہیں پنجے گاڑ کر بیٹھ گیا۔ اسے کبھی کبھی اپنی بہنوں سے ڈر لگتا، کبھی نفرت محسوس ہوتی جیسے وہ اس کی تنہائی کی ذمہ دار ہوں۔ وہ آپس میں ہنستی کھیلتی رہتیں اور اس کے اندر تنہائی کا شور بڑھتا رہتا۔ ماں اسے باہر گلی کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ کھیلنے سے روکے رکھتی مبادا اکلوتا بیٹا کسی بری صحبت میں بگڑ نہ جائے۔ رفتہ رفتہ یہ تنہائی اس کی دوست بنتی چلی گئی۔ وہ اپنی تنہائی سے جانے کیا کیا باتیں کیا کرتا، مگر زیادہ تر تو اس کے پاس پوچھنے کے لئے سوال ہی تھے۔

ایک دن اپنے باپ کے ہمراہ شہر کے خوشحال علاقے سے گزرتے ہوئے اس نے پوچھا تھا:

"ابا، امیر لوگ کیوں ہوتے ہیں؟ اور ہم غریب کیوں ہیں؟؟"

اس کے باپ نے گلے میں پھنسی بلغم سڑک کے ایک طرف تھوک کر اسے جواب دیا تھا:

"یہ لوگ قسمت کے دھنی ہیں بیٹا۔ پڑھ لکھ کر افسر بن گئے اور اب دیکھو کتنی شان سے رہتے ہیں۔ اگر تم بھی دل لگا کے پڑھو گے تو ایک دن اسی طرح بڑے افسر بھی بن جاؤ گے۔"

یوں وہ آہستہ آہستہ بڑا افسر بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ پانچویں میں اس نے وظیفہ لیا تو اسے ایک اچھے گورنمنٹ سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کچھ گورنمنٹ سکول بھی اچھے تھے۔ اس کے سکول میں ایک چھوٹی سی لائبریری تھی جہاں سے وہ پہلے کہانیوں کی کتابیں اور پھر تاریخ اور مشاہیر کی سوانح عمریاں لا لا کر پڑھنے لگا۔ ان کتابوں میں چھپے اسرار میں وہ کھو سا گیا۔ اس کے لئے کتابیں ایک بہت بڑی دنیا میں داخلے کا دروازہ ثابت ہوئیں۔ وہ تصور ہی تصور میں گھر کے بیرونی دروازے کا ٹاٹ اٹھا کر باہر نکلتا اور دوڑنے لگتا۔ بھاگتے بھاگتے اس کے پاؤں زمین سے اوپر اٹھتے اور وہ ہوا میں اڑنے لگتا۔ اڑتے اڑتے وہ اپنے آس پاس کے اندھیروں اور محرومیوں کی دنیا سے بہت دور صاف ستھرے اجلے دیسوں میں پہنچ جاتا۔ جہاں وہ خود کو کسی نہ کسی بڑے آدمی کے روپ میں دیکھا کرتا۔ بڑے آدمی جو زمانے پر چھا جاتے ہیں، جن کی قوتیں دنیا کو زیر کر لیتی ہیں، سپہ سالاروں جیسے بہادر، حکمرانوں جیسے پرشکوہ، وزیروں جیسے دانشمند...... خوابوں کی یہ دنیا اتنی بھرپور تھی کہ اس میں گھر کی غربت، والدین کی باہمی تکرار، ضرورتیں، محرومیاں، ان دیکھے مستقبل کا خوف، غرض کسی دل شکن بات کا گزر نہیں تھا۔ تصورات کے مضبوط حصار میں وہ قطعی محفوظ تھا۔

لیکن حقیقی زندگی میں وہ محفوظ نہیں تھا۔ اس کا باپ تو اس کی اعلیٰ تعلیم کا بھی متحمل نہ ہو سکا۔ میٹرک کا نتیجہ آنے سے کچھ روز پہلے اس کے باپ نے علیحدگی میں اس سے کہا تھا:

"بیٹا، میں نے اپنے بڑے افسر سے بات کی ہے، وہ تمہیں اچھا رزلٹ آنے کی صورت میں جونیئر کلرک رکھوا دے گا۔ نوکری بہت مشکل سے ملتی ہے۔ بس یہی سمجھو ہماری قسمت اچھی ہے۔"

اس کی خاموش نگاہوں نے باپ سے سوال کیا تھا: "اور وہ افسری ابا؟"

لیکن یہ سوال لبوں پر نہ آ سکا۔ وہ اپنے مقدر کو سمجھنے لگا تھا۔ چار بہنوں کا اکلوتا بھائی۔ بہنوں کی شادیوں کے لئے گھر کی آمدن میں اضافہ بہت ضروری تھا۔ وہ چپ چاپ نوکری کرنے لگا۔ وہاں خواب دیکھنے سے اسے کوئی نہ روک سکتا تھا۔ غربت نے اس کے اندر افسری کا خواب بویا تھا اور کتابوں نے بڑا آدمی بننے کا۔ اور یہ دونوں خواب رفتہ رفتہ اس کی خفیہ طاقت بن چکے تھے۔

اگلے ہی برس وہ کتابیں خرید کر پرائیویٹ ایف اے کی تیاری کرنے لگا: زندگی فقط محنت بن کر رہ گئی۔ جوانی کی ہر خواہش محنت کی چکی میں پسنے لگی...... اسی طرح چھ سال گزر گئے۔ وہ اب بی اے کر چکا تھا۔ اپنے ہی محکمے میں اس کی ترقی بھی ہو گئی تھی۔ دو بڑی بہنیں بیاہی جا چکی تھیں۔ پرانی گلی کے دو کمروں کے مکان سے نکل کر وہ کرائے کے تین کمروں کے ایک بہتر گھر میں منتقل ہو چکے تھے۔ زندگی کسی طے شدہ معمول کی طرح چل رہی تھی کہ ایک دن اس نے گھر والوں کو اپنے دو اہم فیصلے سنائے:

"شادی میں اس وقت تک نہیں کروں گا جب تک ایم اے کر کے اچھی جگہ ملازم نہیں ہو جاتا۔ اور ایم اے پرائیویٹ نہیں بلکہ باقاعدہ یونیورسٹی سے کروں گا۔"

یہ دونوں باتیں روایتی سوچ اور معیار کی چھوٹی سی دنیا میں رہنے والے اس گھرانے کے لئے کسی بھونچال سے کم نہ تھیں۔ بہنوں کو بھابی لانے کا ارمان تھا۔ اور باپ کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ اسے یونیورسٹی میں پڑھا سکتا۔ لیکن خود اس کے خوابوں کا پلڑا اب جھک چکا تھا جو اب تک کی زندگی، کلرکی اور پرائیویٹ تعلیم نے اسے دیئے تھے۔ اسے اپنی شخصیت ان لڑکوں کے مقابلے میں ادھوری معلوم ہوتی جو کالجوں اور یونیورسٹیوں سے باقاعدہ تعلیم حاصل کر کے عملی زندگی

میں داخل ہوتے تھے۔ وہ سر اٹھا کر چلنا اور زمانے کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرنا چاہتا تھا۔ اسے اب صرف ڈگری نہیں، تعلیمی ادارے کی لانڈری سے ڈھلی، نکھری پراعتماد شخصیت بھی چاہئے تھی۔ معلوم نہیں وہ اپنی شخصیت کی شکنیں اتارنا چاہتا تھا یا یونیورسٹی کے آزاد ماحول میں زندگی کی بہار کو محسوس کرنا چاہتا تھا، لیکن یہ طے ہے کہ فیصلہ اس کا اٹل تھا۔

......اور اپنے ارادے کی تکمیل کے لئے اس نے اپنی زندگی کے اگلے دو تین برس سخت ترین محنت کی۔ فائلوں اور ہندسوں میں ڈوبی ہوئی بے رنگ صبحیں اور نالائق امیرزادوں کو ٹیوشنز پڑھا کر پیسہ کمانے کی تھکن آلود شامیں......بس یہی تھی اس کی زندگی۔

''بھیا! اس کی چھوٹی بہن نیلم نے کمرے میں جھانک کر اسے زور سے پکارا......'' یہ صبح صبح بستر پر بیٹھے کیا سوچ رہے ہیں۔ تیاری کیجئے جناب لیکچرر صاحب! آج آپ کی نوکری کا پہلا دن ہے......

وہ اچھل کر بستر سے باہر آ گیا۔ آج تو اس نے خاص طور سے تیار ہونا تھا۔ اس طرح تیار ہونا تھا جیسے کالج کے ایک لیکچرر کو ہونا چاہئے۔ باتھ روم میں شیو کرتے وقت اس نے خود کو آئینے میں بغور دیکھتے ہوئے اپنا نام پکارا:

''جمشید علی''۔

پھر مسکرا کر اس نے سرنفی میں ہلایا۔ ابھی یہ نام نامکمل ہے۔ پی ایچ ڈی کے بعد مکمل ہوگا۔ ''ڈاکٹر جمشید علی۔''

شیو کر لینے کے بعد اس نے اپنے گال پر تھپکی دی: ''کرانک بیچلر، اب تیرے خاتمے کے دن قریب ہیں۔ کمال ہے یار اتنا بڑا چلہ کاٹ گئے۔ تیس کے ہونے کو ہو ایک بھی رومانس نہیں۔ خیر یہ ایسی عجیب بات بھی نہیں۔ ایشیا کے کرئیرسٹ نوجوان اب تیس کے ہوکر ہی شادی کے قابل ہوتے ہیں۔ اور جب تک شادی نہیں ہو جاتی تیس کے نہیں ہوتے۔'' ......خود کلامی کی عادت بہت پرانی تھی۔ لیکن آج خلاف معمول اس کی خوابیدہ حسِ مزاح پوری طرح بیدار تھی۔ آج شاید وہ پہلی بار جوان ہوا تھا یا شاید پہلی بار جیون امرت کو چکھ پایا تھا۔ اس نے یکبار پھر آئینے میں خود کو نظر بھر کے دیکھا:

''ایسی بری شکل بھی نہیں۔ اچھے بھلے ہو، نہایت مناسب لڑکی مل جائے گی تمہیں۔''

ٹھک ٹھک......باتھ روم کے دروازے پر زور کی دستک ہوئی۔

''بھیا آپ کو دیر ہو رہی ہے۔ سات بج چکے ہیں۔ ابھی آپ کو ناشتہ بھی کرنا ہے، پھر بس پکڑنی ہے۔ نو بجے کلاس ہے آپ کی۔'' ...... جب سے اس کی ماں کینسر کے ہاتھوں چند ماہ کے اندر دنیا سے رخصت ہوئی تھی، نیلم میں گویا ماں کی روح حلول کر گئی تھی۔ وہ جمشید کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی۔ جمشید علی نے تیار ہونے میں بہت کم وقت صرف کیا، اور اس سے بھی کم وقت ناشتہ کرنے میں۔ بھوک تو یوں بھی آج کی غائب تھی۔

بس سٹاپ پر اسے کچھ انتظار کرنا پڑا۔ وہ اپنے اپنے اداروں، دفتروں، کالجوں، یونیورسٹیوں کو جاتے والے تازہ دم صبح بیداروں سے کچھ ہٹ کر اپنے داخلی سرور میں گم ایک طرف جا کھڑا ہوا۔ صبح کے وقت بسوں اور ویگنوں کا شیڈول کچھ بہتر رہتا ہے۔ پندرہ منٹ سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ لیکن انتظار کے یہ لمحے خواب کی طرح زمان و مکان کی قید سے آزاد کئی برسوں پر پھیل گئے۔ اسے اپنا یونیورسٹی میں پہلا دن یاد آ گیا۔ وہ اس کی زندگی کا ایک اور جذباتی ہیجان سے بھرپور دن تھا۔ میٹرک کر چکنے کے پورے نو سال بعد وہ یونیورسٹی میں پڑھنے کے قابل ہو سکتا تھا۔ اپنے ہم جماعتوں کے بیچ وہ خود کو الگ تھلگ محسوس کیا کرتا، ان سے عمر میں بڑا، رویے میں سنجیدہ۔ کلاسیں چھوڑ کر کیفے ٹیریا میں گپیں اڑانا، سیاسی کھیل کھیلنا، لڑکیوں سے دوستی کے معرکے سر کرنا، فرتیح کی تلاش میں رہنا، لیکن وہ ان میں سے کسی شغل کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ وہ

باقاعدگی سے کلاسوں میں جاتا، توجہ سے لیکچر سنتا، نوٹس بناتا اور فارغ وقت لائبریری میں گزارتا۔ زندگی کے اس پرسکون معمول سے وہ بہت مطمئن تھا۔ یونیورسٹی کے دو برسوں نے اس کے خوابوں کی صورت ہی بدل دی۔ اچھا گھر، پرآسائش زندگی، سٹیٹس...... یہ خواب رفتہ رفتہ اپنے معنی کھونے لگے اور اس کے اندر چپکے چپکے ایک استاد پرورش پانے لگا۔ طلباء کے غیر سنجیدہ رویوں کو دیکھ کر اس کا دل کڑھتا رہتا۔ اس کا جی چاہتا، ان سب نادانوں کو اپنے سامنے بٹھا کر اپنی زندگی کی کہانی سنائے، تعمیر کا جذبہ جگائے، مثبت سوچ اور اعلیٰ عزائم کی لگن پیدا کرے اور یہ سب کام ایک اچھے استاد سے بڑھ کر کون کر سکتا تھا۔ استاد بننے کے لئے اس نے اپنے مضمون کا گہرا مطالعہ کیا جو بالآخر امتحان میں اس کی شاندار کامیابی پر منتج ہوا۔

کسی کا زوردار دھکا اسے یونیورسٹی کی چاردیواری سے باہر لے آیا۔ ویسے یہ اچھا ہی ہوا۔ اگر یہ بس چھوٹ جاتی تو پھر اس کا وقت مقررہ پر کالج پہنچنا مشکل ہو جاتا۔ بس میں بیٹھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر کچھ سوچ کر اسے یکایک گھبراہٹ محسوس ہوئی۔ آج اسکی تدریسی زندگی کا پہلا دن ہے اور کالج میں پڑھنے والا ہر طالب علم استاد کا منتظر نہیں ہوتا بلکہ کچھ تو اس کوشش میں ہوتے ہیں کہ نئے استاد کو کسی طرح تنگ کر کے بھگایا جائے۔ اس نے بہرحال سوچ رکھا تھا کہ سب سے پہلے وہ اپنے شاگردوں سے کیا بات کرے گا...... تعارف...... ہاں سب سے پہلے وہ اپنا مختصر تعارف کرائے گا۔ پھر ہر طالبعلم کو باری باری دو تین جملوں میں اپنے تعارف کا موقع دے گا۔

پھر......

پھر ان سے پوچھے گا کہ انہوں نے اپنے مضامین کی سلیکشن میں اس مضمون کو کس بنیاد پر پڑھنے کے لئے منتخب کیا۔ وہ خود اس مضمون کی افادیت اجاگر کرے گا تاکہ طلباء میں اسے پڑھنے کے لئے شوق اور لگن پیدا ہو۔ وہ ان کے دلوں میں علم کی جوت جگائے گا۔ انہیں مثالیں دے کر بتائے گا کہ علم کو طاقت کیوں کہا جاتا ہے۔ علم کا حقیقی حصول کس طرح معاشروں کو ترقی کی راہ پر گامزن کرتا ہے، علم انسان کو بہتر انسان بناتا ہے، علم...... اچانک وہ اپنے خیال پر جو جذباتی ہیجان کی صورت اختیار کرتا جا رہا تھا، آپ ہی آپ مسکرانے لگا...... یہ میرا پہلا دن ہے، بہتر ہوگا کہ میں خود کم بولوں اور طلباء کو زیادہ بولنے کا موقع دوں۔ میں جتنا انہیں سمجھوں گا، اتنا ہی زیادہ اچھی طرح انہیں سمجھا پاؤں گا۔ میں یکطرفہ گفتگو نہیں کروں گا، بلکہ اپنے شاگردوں کے ساتھ مکالمے کا ایسا رشتہ استوار کروں گا کہ آنے والے دنوں میں وہ شوق سے کلاس میں میرا انتظار کیا کریں گے......

بس ہلکے سے جھٹکے سے رکی۔ اس کا سٹاپ آ چکا تھا۔

☆......☆......☆

کالج کی مرکزی عمارت تک پہنچنے سے پہلے ایک ایسی سڑک سے گزرنا پڑتا ہے جس کے دونوں جانب طلباء کے ہوسٹل ہیں۔ بند اور کھلی کھڑکیوں کی قطاریں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ہر کمرے کی اپنی الگ شخصیت ہے۔ اپنے اپنے مکینوں کی طرح کچھ اندر سے بے ترتیب، بے ڈھب ہیں اور کچھ سلیقے سے سجے ہوئے۔ کچھ کی دیواروں پر فلمی ستاروں کی جاذب نظر یا نیم عریاں تصویریں ہیں اور کچھ دیواروں پر بلّے بازوں کے پوسٹر چسپاں ہیں۔ ایسے کمرے بھی ہیں جو سادگی محض کا منظر پیش کرتے ہیں۔ اور ایسے کمرے بھی ہیں جہاں آسائش و امارت کی نشانیاں چنگھاڑ رہی ہیں اور اسی دنیا میں کچھ کمرے ان کے بھی ہیں جو سچائی یا پھر کسی فریب کے ہاتھوں سروں پہ کفن باندھے پرتشدد سیاست کی راہ پر چل نکلے ہیں۔ کتابوں، سیاسی لٹریچر، پمفلٹوں، بینروں، جھنڈوں اور نعروں کے شور سے اٹے ہوئے کمرے، کچھ کمروں کا سیاسی رنگ سرخ ہے،

کچھ کا سبز لیکن یہ سرخ یا سبز رنگ اپنی اصلیت میں ویسے نہیں رہے جیسے چند عشرے پہلے ہوا کرتے تھے۔ یہ رنگ اب اس اسلحے کی زبان میں اپنا پیغام پہنچاتے ہیں جو افغان مجاہدوں کے لئے کراچی کے ساحل پر کبھی اترا تھا اور رفتہ رفتہ منافع کمانے والے بھانت بھانت کے معزز چوروں کے ہاتھوں سے ہوتا ہوا ان نوجوانوں تک پہنچ گیا۔ ان کمروں کے مکین اپنی توانائیوں پر نازاں ہیں، اپنے اپنے عقیدوں کے اندھے پجاری ہیں۔ انہی میں کچھ اپنے رہنماؤں کے کارندے ہیں اور خواب دیکھنے والوں کو بھی اسلحے کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ یہ جدا جدا راستوں کے مسافر، ان دیکھی منزلوں کی جانب رواں ہیں۔

اس روز جب خوابوں کی راہ گزر کا مسافر جمشید علی بس سے اتر کر پیدل چلتا ہوا کالج کی عمارت کی طرف جا رہا تھا تو ایسے ہی کسی ایک کمرے سے کچھ گولیاں نکلیں، دندناتی ہوئی، مقابل عمارت میں موجود کسی دشمن کا خاتمہ کرنے۔ لیکن گولیاں ہمیشہ تو ٹھیک نشانے تک نہیں پہنچتیں۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ بجلی کی تاروں پر بیٹھے پرندے شور مچاتے ہوئے ہوا میں اڑان بھر گئے۔ لیکن سڑک کے راہ گیر کہاں جاتے۔ سڑک پر مختلف منزلیں آپس میں گتھم گتھا ہوگئیں۔ گولیاں چلانے والے اس بات سے قطعی بے خبر تھے کہ ابھی ابھی جو نوجوان جان کی بازی ہار کر زمین پر گرا ہے، وہ تو انہیں زندگی دینے جا رہا تھا۔

☆......☆......☆

واٹس ایپ

مبین مرزا

آپ کیسے ہیں سرکار والا!
کیا ہم آپ کو کبھی یاد آتے ہیں؟

واٹس ایپ پر آنے والے دو سطروں کے اس میسیج نے شیخ مجیب عالم کو مخمصے میں ڈال دیا۔ دیکھا جائے تو ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی، لیکن سوچا جائے تو کچھ خاص ضرور تھا۔ ان کی چھٹی حس نے پھڑک کر اصل میں ساری مشکل پیدا کی تھی۔ وہ تو روزمرہ کے معمول کے مطابق سب کچھ کر رہے تھے جیسا کہ اب کئی برس سے اُن کی عادت بن گئی تھی، کچھ ایسے ہی انداز سے جیسے ایک مشین یا کوئی روبوٹ سب کچھ دی گئی کمانڈ کے مطابق آٹو میٹک طریقے سے کیے چلا جاتا ہے۔ کسی رُکاوٹ اور ہچکچاہٹ کے بغیر۔ روزمرہ کی یکسانیت پر انھوں نے کئی بار اپنے اندر کسی کو کلبلاتے ہوئے محسوس کیا تھا جو دھیرے سے ان سے کہتا تھا:

زندگی جیسے ٹھہری سی گئی ہے۔

شیخ مجیب عالم نے آج بھی اندر کی یہ آواز سنی، ایک لمحے کے لیے سوچا اور کو وقت محسوس کی۔ واقعی دن رات ایک ڈھرے پر آ گئے تھے۔ مخصوص وقت پر صبح ہوتی اور طے شدہ کاموں میں دن گزرتا۔ ایک خاص وقت پر شام ہو جاتی اور اس کے بعد اسی طرح رات۔ دن میں دفتر کے معمولات بھی ایک ہی انداز سے چلتے رہتے۔ رات کو گھر آ کر تھوڑا وقت بچوں اور بیوی کے ساتھ، کچھ دیر ٹی وی کے سامنے اور بس دن رات کا دائرہ پورا ہو جاتا۔ بچے اب بڑے ہو گئے تھے۔ ان کی اپنی مصروفیات تھیں اور زندگی گزارنے کا ایک انداز بن گیا تھا۔ بیوی نے خود کو گھر کے کاموں، ٹی وی اور نماز روزے میں مصروف کر لیا تھا۔ شیخ مجیب عالم کا ایک چھوٹا سا سوشل سرکل بھی تھا جس کے لوگ آپس میں فون اور میل کے ذریعے رابطے میں تو رہتے مگر ملنے ملانے کا موقع کم کم ہی نکلتا۔ دفتر کے ملازم نے ان کے لیے چائے لا کر رکھی تو شیخ مجیب عالم نے اخبار کو ایک طرف کیا اور لیپ ٹاپ کو سرکاتے ہوئے سامنے کر لیا۔ ایسا کرتے ہوئے کی بورڈ پر کہیں ہاتھ لگنے سے لیپ ٹاپ کی اسکرین روشن ہو چکی تھی۔ انھوں نے میل چیک کرنے کے لیے گوگل کروم پر کلک کیا اور چائے کا کپ اٹھا لیا۔

یکسانیت کا احساس پچھلے کئی دن سے مسلسل بور کر رہا تھا، لیکن اس سے نکلنے کا کوئی راستہ انھیں سوجھ نہیں رہا تھا۔ اصل میں سب سے بڑا مسئلہ تو آدمی کی زندگی میں وقت پیدا کرتا ہے، وہ اکثر سوچتے۔ بس اس کے ساتھ ہی سوالوں اور خیالوں کا سلسلہ چل نکلتا، مثلاً یہ کہ وقت ہے کیا؟ ایک بہت ایب سرڈ چیز۔ اسے چھوا جا سکتا ہے نہ دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے گھومتے ہوئے پہیے کو روکا نہیں جا سکتا، الٹا نہیں پھیرا جا سکتا، اس کی رفتار کو گھٹایا تک نہیں جا سکتا۔ وقت کے ساتھ کچھ نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ آپ کے ساتھ سب کچھ کرتا ہے۔ آپ کے اندر ہوا بھر دیتا ہے اور آپ بادلوں پر سفر کرنے لگتے ہیں۔ یہ آپ کو بلندی پر لے جاتا ہے اور پھر یہ دُنیا، یہ زمین، اس کی سب چیزیں آپ کو چھوٹی نظر آنے لگتی ہیں۔ آپ ہوا میں تیرتے رہتے ہیں۔ کششِ ثقل آپ کا کچھ نہیں بگاڑ پاتی، اپنے سارے زور کے باوجود آپ کو نیچے نہیں لا پاتی۔ قوسِ قزح کے رنگ کبھی آپ پر برستے ہیں اور کبھی آپ کے اندر سے پھوٹتے اور آسمان پر پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ زمین آسمان

دونوں پر آپ کا تصرف قائم ہوتا ہے۔ آپ کی پسند، آپ کا اختیار ہر جگہ نظر آتا ہے۔ کسی اور کی زندگی میں ایسا ہو یا نہ ہو، کم سے کم شیخ مجیب عالم کی زندگی میں تو ایسا ہی ہوا تھا۔

یہ تو گئے دنوں کی بات ہے۔ انھوں نے اپنا پاس ورڈ ٹائپ کرتے ہوئے سوچا۔ اب تو وقت اُن کے ساتھ بھی وہی چال چل چکا تھا جو سب کے ساتھ چلتا ہے اور یہ نہیں دیکھتا کہ اس کے سامنے کوئی بادشاہ ہے یا فقیر اور نیک ہے یا بد۔ وہ اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ شیخ مجیب عالم کے ساتھ بھی کر چکا تھا۔ اس نے اُن کے اندر جو ہوا بھری تھی، وہ خود ہی دھیرے دھیرے نکال دی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ نیچے آتے چلے گئے اور اب پورے زمین پر تھے۔ وہ سب کچھ جو پہلے بہت چھوٹا اور ناقابلِ توجہ نظر آتا تھا، اب اپنے اصل حجم میں ان کے سامنے تھا۔ وہ پڑھے لکھے اور سمجھ دار آدمی تھے۔ بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ سامنے آنے والے حقائق کو تسلیم کرتے چلے گئے۔ کچھ باتوں کو ماننے میں تکلیف تو ضرور محسوس ہوئی، لیکن وہ جانتے تھے کہ مانے بغیر چارہ نہیں۔ اس لیے انھوں نے ماننے والی ہر بات کو بہر حال مان لیا تھا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ زندگی کے دھکوں سے بچ گئے۔ بس اب یہ تھا کہ کبھی کبھی بوریت اور یکسانیت کا احساس ستانے لگتا۔

اپنے ان بوکس پر نظر دوڑاتے ہوئے شیخ مجیب عالم نے طے کیا کہ کون سی میل پہلے دیکھنی ہے اور پھر ایک ایک کر کے دیکھتے اور رپلائی کرتے چلے گئے۔ ایک میل ذرا تفصیلی جواب مانگتی تھی، اس لیے انھوں نے اسے آخر میں رکھا تھا۔ جواب دینے کے علاوہ کچھ اٹیچ منٹس بھی اس کے ساتھ بھیجنی تھیں۔ شیخ مجیب عالم نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر کپ کو ایک طرف کیا اور دوبارہ نظریں لیپ ٹاپ کی اسکرین پر جما دیں۔ عین اسی لمحے ہلکی سی بیپ کے ساتھ ان کے موبائل فون کی اسکرین پر میسج والی روشنی پل بھر کو ابھری اور پھر غائب ہوگئی۔ ان کا ہاتھ بے اختیار موبائل کی طرف بڑھا۔ انھوں نے اسکرین پر اپنا پیٹرن بنا کر موبائل کو اَن لاک کر کے میسج دیکھا۔ وہی ٹیکسٹ دوبارہ واٹس ایپ پر آیا تھا۔

جس نمبر سے میسج کیا گیا تھا وہ شیخ مجیب عالم کے فون میں نام سے محفوظ نہیں تھا۔ انھوں نے کئی بار نمبر پڑھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ نمبر کچھ مانوس ہے مگر کوئی نام ذہن میں نہیں آرہا تھا۔ انھوں نے ایک بار پھر میسج دیکھا۔ یہ انداز کسی ایسے شخص کا معلوم ہوتا ہے، جس سے کوئی تعلق رہا ہو، بلکہ ذرا بے تکلفی کا رشتہ۔ انھوں نے سوچا۔ مسئلہ یہ تھا کہ ان کی زندگی میں تو درجنوں ایسے رشتے آئے اور اپنا اپنا وقت پورا کر کے رخصت ہوگئے۔ چھپن برس کی عمر تک آتے آتے جیون رستے میں کتنے ہی موڑ آئے تھے جہاں وہ رُکے تھے، جہاں کسی رنگ نے ان کا دامن تھاما تھا یا کسی آواز نے انھیں اپنے آنچل میں سمیٹ لیا تھا۔ کہیں کوئی خوش بو اچانک راہ میں آئی تھی اور پھر پل کی پل میں ٹوٹ کر ان پر برسی تھی۔ آدمی کے ساتھ زندگی میں کیا کیا ہوتا ہے، یہ سوچتے ہوئے بہ یک وقت کئی چہرے ان کے ذہن کی اسکرین پر چمک اٹھے۔ دل میں ابھرتی ہوئی کئی آوازیں کانوں میں رس گھولنے لگیں۔ رنگوں کی برکھا برساتے ہوئے کئی لمحات اور کئی مناظر آن کی آن میں آنکھوں کے آگے سے گزر گئے۔ شیخ مجیب عالم کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھے، لیکن پل بھر میں ہنس کر سیدھے ہوئے اور بلند آواز میں خود سے کہا، اچھی ہی گزر گئی زندگی۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ موبائل اب تک ان کے ہاتھ میں تھا۔ آخر یہ کون ہوسکتا ہے؟ انھوں نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو سر میں پھیرتے ہوئے خود سے دریافت کیا پھر سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے بولے، پہلے ذرا یہ ہاتھ کا کام نمٹا دیا جائے پھر دیکھتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ دوبارہ لیپ ٹاپ کی اسکرین پر متوجہ ہوگئے۔

کام سے فرصت پا کر انھوں نے موبائل اٹھایا۔ ایک بار پھر میسج پڑھا، فون نمبر پر غور کیا، لیکن دماغ بس یہ کہہ رہا تھا کہ نمبر کچھ جانا پہچانا ہے۔ اس سے آگے خاموشی تھی۔ انھوں نے ایک مدت سے کوئی ٹیلی فون انڈیکس نہیں بنائی تھی، البتہ

ٹیبل ڈائری پر کچھ فون نمبرز کو کبھی کبھی نوٹ کرلیا کرتے تھے۔ ویسے ضرورت کے سب نمبرز تو اب موبائل میں ہی محفوظ تھے۔ خیال تو نہیں تھا کہ یہ نمبر ٹیبل ڈائری پر کہیں نوٹ کیا گیا ہوگا، لیکن پھر بھی انھوں نے ایک ایک صفحہ پلٹ کر دیکھا۔ نمبر کہیں درج نہیں تھا۔ ذہن الجھ رہا تھا کہ آخر یہ کس کا میسج ہے، مگر کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

دوسرے دن زندگی پھر اپنے معمول کے مطابق شروع ہوئی۔ گزرے دن کی الجھن ذہن سے رفع نہیں ہوئی تھی، مگر انھوں نے اب اس سے توجہ ہٹالی تھی۔ دفتر کے کام خود اتنے ہوتے ہیں کہ ایک بار آدمی ان میں مصروف ہوجائے تو پھر ادھر اُدھر کی چیزوں کی طرف دھیان نہیں جاتا۔ اسی انداز سے دن گزر رہا تھا۔ ساڑھے تین بجے وہ لنچ کے لیے اٹھے تو پھر اس میسج کا خیال آیا۔ دفتر کے ایم ڈی اور ساتھی ڈائریکٹر کے ساتھ مل کر وہ لنچ کرتے تھے۔ وہ تینوں ذرا دیر سے لنچ کے عادی تھے۔ وہ اپنے کمرے سے نکلے تھے کہ اسی وقت دوسرے ڈائریکٹر صاحب بھی اپنے کمرے سے برآمد ہوئے۔ دونوں ایم ڈی صاحب کے کمرے میں آ گئے۔ گپ شپ کھانے کے ساتھ چلتی رہی۔ دفتر کی اور دُنیا کی کتنی ہی باتیں ہوجاتی تھیں اس وقفے میں۔

کھانے کے بعد واپس کمرے میں آ کر ایک فائل پر فنانس ڈائریکٹر کا نوٹ پڑھتے اور چائے پیتے ہوئے موبائل کی میسج بیپ سن کر انھوں نے فون اٹھایا۔ اسی نمبر سے میسج تھا جسے پڑھتے ہوئے ان کے چہرے سے تشویش کی لہر گزری:

ایم ڈی کے ساتھ کھانا کھانے کے بعد اب اپنے کمرے میں آ کر آپ چائے پی رہے ہوں گے اور اطمینان سے کوئی فائل دیکھ رہے ہوں گے۔

آخر یہ کون ہے جو اُن کے معمولات سے اتنا واقف ہے کہ اسے یہ سب کچھ معلوم ہے۔ انھیں الجھن بھی ہوئی، لیکن ساتھ ہی اپنائیت کا احساس بھی ہوا۔ واٹس ایپ کے اس اکاؤنٹ کے ساتھ پروفائل فوٹو نہیں آ رہا تھا، بلکہ اس کی جگہ برف پوش پہاڑوں کا منظر لگایا گیا تھا۔ انھوں نے سوچ کر ذہن میں لانے کی کوشش کی کہ ایسا ذوق کس دوست کا ہے، لیکن ذہن کا میجک بورڈ بالکل کورا تھا۔ انھوں نے سوچا کہ جوابی میسج کرکے پوچھیں کہ کون ان سے مخاطب ہے، لیکن یہ اُن کی عادت نہیں تھی۔ وہ کسی نامانوس نمبر سے فون کال ریسیو کرتے تھے اور نہ ہی ایسے کسی نمبر کے میسج کو ریپلائی کرتے۔ انھوں نے سوچا، کسی تجسس کے اظہار کی کیا ضرورت ہے؟ جو بھی ہے اسے خود اپنا تعارف کرانا چاہیے۔ یہ سوچ کر وہ میسج کرنے سے رُک گئے مگر اب ذہن پر مسلسل ایک بار سا ہوگیا تھا۔

تیسرے دن شیخ مجیب عالم خود اس نمبر سے میسج کے منتظر تھے، لیکن شام ہوگئی اور اس طرف مکمل خاموشی تھی۔ ہفتے کے اختتامی دن یوں تو دفتر کے اوقاتِ کار ذرا پہلے ختم ہوجاتے تھے، لیکن وہ اس دن بھی روز کے وقت تک ہی بیٹھتے تھے کہ یہاں سے اٹھ کر وہ بڑی بہن کے یہاں جاتے۔ وہاں ایک ڈیڑھ گھنٹا گزارتے اور پھر اپنے گھر روانہ ہوجاتے۔ اس اضافی وقت میں اگر آفس کا کام نہ ہوتا تو ان کا وقت کمپیوٹر یا موبائل کے ساتھ ہی گزرتا۔ اس وقت جوں ہی انھوں نے موبائل اٹھایا عین اسی لمحے ایک میسج کو دگیا۔ انھوں نے سوچا، شاید اسی نمبر سے میسج ہو۔ واقعی اسی نمبر سے تھا:

آج تو آپ کو بڑی بہن کے ہاں جانا ہوگا۔ یقیناً بہت خوش قسمت ہیں وہ کہ انھیں آپ جیسا خیال رکھنے والا بھائی ملا ہے۔ ہم بھی کبھی ان لوگوں میں تھے جنھیں آپ کی توجہ حاصل ہوتی تھی۔

شیخ مجیب عالم چکرا گئے۔ ارے بھئی ایسا کون ہے یہ شخص کہ جسے میرے بارے میں ہر بات معلوم ہے۔ اضطراری کیفیت میں انھوں نے ڈائل پیڈ کھولا اور نمبر ڈائل کرنے کا سوچا، لیکن پھر سر جھٹک کر فون رکھ دیا۔ کون ہے یہ جو

اس طرح پہیلیاں بجھوائے جا رہا ہے اور اپنی واقفیت جتائے جا رہا ہے۔ یہ سب باتیں تو کوئی ایسا ہی شخص جان سکتا ہے جو بہت قریب رہا ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ ضرور کوئی خاتون ہیں۔ اپنی اس رائے پر انھیں خود ہنسی آ گئی۔ گویا وہ کہہ رہے تھے کہ اُن کے اتنے قریب کوئی عورت ہی آ سکتی تھی مرد نہیں۔ خیر جو بھی ہے، سامنے کیوں نہیں آ رہی وہ۔ انھوں نے جھنجھلا کے سوچا۔ موبائل نے پھر بیپ دی۔ اسی نمبر سے ایک اور میسیج تھا:

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے فون میں ہمارا نام اور نمبر محفوظ نہیں ہے۔ آپ نے بھلا دیا ہمیں۔ حالاں کہ ہم یوں بھلا دینے والے تو نہیں تھے۔

وہ ابھی یہ میسیج پڑھ کر ہی بیٹھے تھے کہ ایک اور میسیج ٹپک گیا:

ہمیں معلوم ہے کہ آپ کو اس اجنبی نمبر کے میسی جز سے اب الجھن ہو رہی ہوگی۔ اگر یہ نمبر آپ کے موبائل میں نام کے ساتھ محفوظ ہوتا تو آپ یقیناً رپلائی کر چکے ہوتے۔ ہمارے کسی میسیج کا جواب اس لیے نہیں آیا کہ آپ کسی اجنبی نمبر کو رپلائی نہیں کرتے۔ سوچیے جب ہم آپ کے بارے میں اتنی باتیں جانتے ہیں تو ضرور آپ کے بہت قریب رہے ہوں گے نا۔

یہ میسیج پڑھ کر شیخ مجیب عالم واقعی پریشانی میں پڑ گئے اور اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی کوفت پیدا کر رہا تھا کہ اگر واقعی کوئی ایسا شخص ہے جس سے قریبی تعلق رہا ہے تو یہ خفت کی بات ہے کہ ذہن میں شخصیت اور موبائل میں نمبر کچھ بھی محفوظ نہیں۔ اتنی دیر میں ایک اور میسیج آ گیا:

چلیے خیر، کوئی بات نہیں۔ یہ دُنیا ہے اور یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔

میرا نام روبینہ ہے۔

خدا کے لیے اب یہ نہ پوچھ لیجیے گا، کون روبینہ؟

نام پڑھتے ہی شیخ مجیب عالم کو کرنٹ لگا، لیکن پھر اگلے ہی لمحے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی اور ایک پل میں سارا ذہنی تناؤ ختم ہو گیا۔ تھینک گاڈ! انھوں نے بلند آواز میں کہا۔ عورتیں، چہرے یا نام —— کچھ بھی کہا جائے، اس حوالے سے اُن کی زندگی بہت بھرپور گزری تھی۔ عمر کا ہر موڑ حسین چہروں سے سجا ہوا تھا۔ ان کے یہاں یہ ایک طویل تاریخ، ایک بڑا ریکارڈ تھا۔ اس طویل تاریخ میں، لیکن روبینہ ایک ہی تھی۔ یہ صرف نام ہی ایک نہیں تھا، بلکہ روبینہ کی شخصیت، فکر اور والہانہ پن سب کچھ سب سے الگ تھا۔ انھوں نے سوچا، کسی سوشل گیدرنگ یا کسی پروفیشنل میٹنگ میں ملنے اور پھر قربت کے لمحات تک پہنچنے والے چہروں اور جسموں کی ساری چکاچوند مختصر ہوتی ہے۔ عام طور سے چند بار یا چند ہفتے اور اگر بہت زیادہ بھی چلے تو چند ماہ۔ اس کے بعد ایسے سیارے کسی نہ کسی وجہ سے مدار بدل لیتے ہیں۔ اس کے بعد جانے والے کو کوئی دیر پا رنج ہوتا ہے نہ پیچھے رہ جانے والے کو دائمی ملال۔ اپنے اپنے نئے مدار کی کہکشائیں دونوں کو پچھلا سب کچھ بھلا کر نئے دودھیا راستوں کی طرف متوجہ کر دیتی ہیں۔ روبینہ کی شخصیت کی طرح اس کا معاملہ بھی مختلف ثابت ہوا۔ چند ہفتے، چند مہینے نہیں، یہ تعلق کئی برسوں تک چلا اور ایسے چلا کہ بس۔ کیسا زور تھا کہ ٹوٹتا ہی نہ تھا۔ کیسی کشش تھی کہ ماند ہی نہ پڑتی تھی۔ شیخ مجیب عالم کی آنکھوں کے آگے سے ایک ایک کر کے رنگ برنگی ہنستی بولتی تصویریں گزرنے لگیں۔ انھوں نے میسیج رپلائی کرنے کے لیے فون اٹھایا، لیکن پھر نمبر ڈائل کر کے بات کرنے لگے۔

فون پر گفتگو اچھی رہی۔ وہی شائستہ آواز اور وہی اپنی طرف کھینچتا ہوا لہجہ۔ برسوں کی دُھند سے ایک ایسے چہرے کا اُبھر آنا جس کی خوش بو تیز بارش کے جھالے کی طرح ایک عرصہ ان پر برستی رہی تھی، شیخ مجیب عالم کو اچھا لگا۔ ایسے

سب رشتوں کی طرح یہ رشتہ بھی فیڈ آؤٹ تو شکایتوں کے غبار ہی میں ہوا تھا، لیکن دوسروں کے برخلاف ایک بار پھر ابھر آیا تھا اور دوبارہ ابھرتے ہوئے اس پر کسی شکایت کی گرد تھی نہ کسی تر ڈد کا غبار۔ وہ دوبارہ ساتھ گزرے ہوئے لمحات کو یاد کرنے لگے، تب انھوں نے سوچا کہ ساری باتیں ہوئیں، لیکن ملاقات کی خواہش یا فرمائش کا اظہار کسی طرف سے نہیں ہوا۔ ' چھپن سال کا مرد ایک دم ایکسا یئٹڈ نہیں ہوتا۔ انھوں نے خود سے کہا اور ہنس دیے۔

روبینہ سے اب روز چیٹنگ ہورہی تھی ۔ یکسانیت اور بوریت شیخ مجیب عالم کی زندگی سے ایک دم بالکل غائب ہوگئی تھی۔ اس کا اظہار اُن کے طرزِ عمل سے بھی ہورہا تھا، جبھی تو کل ایم ڈی نے ان سے کہا تھا کہ آج کل آپ زیادہ چارجڈ اور چیرفل نظر آرہے ہیں۔ مرد کی کیمسٹری بھی عجیب ہوتی ہے۔ ایک مہربان عورت اسے مکمل طور پر بدل کر رکھ دیتی ہے۔ انھوں نے سوچا۔ روبینہ سے چیٹنگ میں بہت ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ ہوتی تھی، جس میں کسی رومان کا کوئی رنگ نہ ہوتا، جسمانی قربت کے خیال کا تو سوال ہی کیا، لیکن پھر بھی شیخ مجیب عالم کو اس رشتے کا بحال ہونا اچھا لگ رہا تھا۔ روبینہ دو تین دن کے بعد واٹس ایپ پر لگایا گیا پروفائل فوٹو بدل دیتی۔ پہلے برف پوش پہاڑ تھے، پھر پھولوں کا تختہ لگا، اس کے بعد سمندر کی طوفانی موجیں آ گئیں۔

شیخ مجیب عالم نے پوچھا، ''آپ پروفائل میں اپنی تصویر نہیں لگاتیں؟''

جواب آیا، ''لگاتی ہوں۔''

''انھوں نے لکھا، ''لگائیے نا پھر، میں نے بہت دن سے آپ کو نہیں دیکھا۔''

چند منٹ بعد جواب آیا، ''لیجیے۔''

شیخ مجیب عالم نے دیکھا، تصویر میں وہی دل کش چہرہ تھا۔ تصویر تازہ معلوم ہورہی تھی ۔ زیادہ سے زیادہ سینتیس اڑتیس برس، انھوں نے عمر کا اندازہ کرتے ہوئے سوچا اور پوچھا، ''کب کی ہے یہ تصویر؟''

جواب آیا، ''پچھلے ہفتے کی۔''

''اس کا مطلب ہے، آپ پہلے سے زیادہ حسین اور قاتل ہوگئی ہیں۔''

جواب میں ایک لمبا قہقہہ آیا۔

شیخ مجیب عالم بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ خود سے بولے، خوب صورت ہی نہیں، بہت زندہ دل بھی ہے یہ عورت۔

تین دن بعد میسج پڑھتے ہوئے شیخ مجیب عالم نے غور کیا کہ پروفائل فوٹو پھر بدل گیا تھا۔ یہ تصویر تو کسی اور کی ہے، انھوں نے سوچا۔ بڑی کر کے دیکھی تو ایک دم جھٹکا لگا۔ نظریں تصویر پر جم کر رہ گئیں۔ یا خدا! کیا مطلب، یہ کیا ہے؟ وہ بڑبڑائے اور اُن کا ہاتھ بے اختیار پیشانی کی طرف بڑھا۔ وہ ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھے تھے، لیکن پیشانی پر پسینہ تھا۔ نگاہیں تصویر سے نہیں ہٹ رہی تھیں۔ یہ ایک چھ سات برس کی بچی تھی جو بالکل اُن کی سب سے چھوٹی بیٹی جیسی لگ رہی تھی ۔ عفت کی چند برس پہلے کی یہ تصویر روبینہ کے پاس کیسے پہنچ گئی؟ یہ تصویر تو اُس کے فیس بک البم میں بھی نہیں ہے۔ انھوں نے سوچا۔ اس ڈبدھا میں انھوں نے فیس بک لوگ ان کی ۔ جلدی سے بیٹی کے اکاؤنٹ پر گئے اور اس کا فوٹو البم چیک کیا۔ یہ تصویر اس میں نہیں تھی۔ سخت اچنبھا تھا کہ یہ تصویر روبینہ کے ہاتھ کیسے لگی؟ صرف یہی ہے یا ایسی کچھ اور بھی چیزیں... یہ سوچتے ہوئے اچانک ایک خیال نے انھیں جھٹکا دیا اور شیخ مجیب عالم کا ہاتھ بے اختیار فون کی طرف بڑھا مگر اگلے ہی لمحے وہ رک گئے ۔ اطمینان سے میسج دوبارہ پڑھا، اس کا جواب بھیجا پھر فوراً ایک اور میسج بھیجا جس میں پوچھا کہ یہ تصویر کس کی ہے؟

ترنت جواب آیا، ''کیا آپ پہچان سکتے ہیں؟''

وہ ایک لمحے کو چکرائے، کیا جواب دیں پھر بہت سنبھل کے لکھا، ''مجھے معلوم ہوتا تو پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ویسے بہت سوئیٹ، بہت کیوٹ سی بچی ہے۔''

''کچھ اندازہ لگائیے نا۔ ویسے آپ کا یہ خیال درست ہے کہ بچی واقعی بہت کیوٹ ہے۔'' جواب آیا۔

''تو پھر اسے آپ کی بیٹی ہونا چاہیے۔''

''بالکل درست۔ میں اس کی ماں ہوں۔''

''ارے زبردست! بہت بڑی خبر ہے یہ۔ پارٹی ہونی چاہیے۔''

''ضرور، آپ جب کہیے پارٹی ہو جائے گی۔''

''بہت شکریہ۔ ماشاء اللہ بہت پیاری ہے۔ اور کتنے بچے ہیں؟''

''یہی ہے اکلوتی۔''

''ماشاء اللہ! سلامت رہے۔''

''شکریہ۔ لیکن آپ نے آدھا پہچانا ہے ابھی، یعنی ماں کا بتایا ہے، ذرا باپ کو بھی پہچانیے۔''

شیخ مجیب عالم بہت سنبھل کر اور نورمل نظر آنے کی کوشش میں چیٹنگ کر رہے تھے، لیکن اندر سے وہ خوف زدہ تھے اور سارا خوف اسی ایک سوال کا تھا۔ انھیں ایک لمحے تو سمجھ ہی نہ آیا کہ کیا جواب دیں پھر ذرا سنبھلے اور لکھا، ''ہاہاہاہاہا! ارے آپ کے خیال میں کیا ہم آپ کے شوہرِ نامدار کو بھول چکے ہیں؟''

''نہیں، وہ نہیں ہیں۔'' مختصر اور سنجیدہ جواب آیا۔

''ارے یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ ایسا مذاق کرتے ہیں بھلا؟''

''میں سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں۔ یہ آپ کی بیٹی ہے۔ تصویر کو ایک بار ذرا غور سے دیکھیے، آنکھیں، ماتھا، ناک، ہونٹ سب کتنے ملتے ہیں آپ سے۔ آپ کے پاس اپنے بچپن کی کوئی تصویر ہو تو اس سے ملا کر دیکھیے۔''

''ہاہاہا! اتنا بڑا کریڈٹ دیا جا رہا ہے مجھے۔''

چیٹنگ ختم ہو گئی تھی مگر شیخ مجیب عالم دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھے تھے، اس لیے کہ ان کی چھٹی حس کہہ رہی تھی، یہاں سے ایک نئی کہانی شروع ہونے جا رہی تھی۔ اوہ مائی گاڈ! یہ معاملہ آگے کہاں تک پہنچے گا، اس خیال سے ہی سر چکرا گیا۔ کمرہ گھومتا ہوا نظر آنے لگا۔ کیا چاہتی ہے یہ عورت؟ کیا یہ اب مجھے بلیک میل کر کے رقم ہتھیانا چاہتی ہے؟ کتنی رقم؟ اِس کا منہ بند رکھنے کے لیے اگر میں ایک بار رقم دے بھی دوں تو کیا یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا؟ نہیں، یہ تو عمر بھر کی بلیک میلنگ کا معاملہ ہے۔ جوان اولاد، خاندان، سماجی حیثیت، عمر کا یہ حصہ — افوہ! انھیں جھرجھری آ گئی۔ اچھا تو یہ عورت اتنے برسوں کے بعد اس لیے رابطے میں آئی ہے مجھ سے۔ اُن کا دل بیٹھ گیا۔ معلوم نہیں انھیں کیسی اور کتنی قیمت چکانی پڑے گی، انھوں نے سوچا۔ کیا انھیں یہ ماننے سے انکار کر دینا چاہیے کہ اُن کا اس عورت سے کبھی ایسا کوئی رشتہ رہا ہے کہ جس کا یہ نتیجہ نکلے؟ لیکن کیا ان کے انکار سے مسئلہ حل ہو جائے گا؟ لوگ ان کی بات کا یقین کر لیں گے؟ کیا یہ عورت اُن کے مکر جانے پر مایوس ہو کر بیٹھ جائے گی؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ زخمی ناگن بن جائے۔ ان کا سوشل اسٹیٹس تو اس مسئلے کو میڈیا کے لیے خبر بنا دے گا۔ اگر بات ڈی این اے چیک اپ تک پہنچ گئی تو — اوہ خدایا! کیا ساری عمر کی عزت خاک میں مل جائے گی؟ ایسا نہیں ہونا چاہیے، ہرگز نہیں۔ چاہے اس کے لیے انھیں کوئی بھی قیمت چکانی پڑے۔ یہ عورت کیا ڈیمانڈ

کر سکتی ہے؟ پھر انھیں خیال آیا کہ روبینہ کا تعلق تو خود کھاتے پیتے گھرانے سے ہے۔ اس کا میکا اور سسرال دونوں خوش حال خاندان ہیں۔ شوہر خود بہت اچھی حیثیت کا آدمی ہے۔ کیا اس کے حالات خراب ہو گئے ہیں؟ کیا یہ شوہر سے الگ ہو گئی ہے؟ آخر کس وجہ سے رابطہ کیا ہے اس نے؟ کیا چاہتی ہے مجھ سے؟ شیخ مجیب عالم کے ذہن میں سوچوں کے اور سوالوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔

اس گفتگو کے بعد کئی دن گزر گئے تھے، لیکن روبینہ کی طرف سے کوئی ڈیمانڈ سامنے نہیں آئی تھی۔ وہ روز اُن کے ساتھ معمول کے مطابق چیٹنگ کر رہی تھی۔ ایک بار فون پر بات بھی ہوئی، لیکن ایسا کوئی اظہار نہیں ہوا تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا، شیخ مجیب عالم کا ذہنی دباؤ بڑھ رہا تھا۔ ویسے تو وہ بھی روبینہ سے نورمل انداز سے پیش آ رہے تھے اور ایسا کوئی تأثر نہیں دینا چاہتے تھے کہ انھیں اس خبر سے کوئی پریشانی ہوئی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ سخت ڈپریشن میں تھے اور دو دن سے تو باقاعدہ اس کی دوا لینے لگے تھے۔ اس لیے کہ ان کا ذہن بار بار خودکشی اور اس عورت کے قتل کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ اندر کی شدید گھٹن کا احساس آخر انھیں ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ دوا سے انھیں زیادہ افاقہ تو نہیں تھا، لیکن ڈاکٹر نے تاکید کی تھی کہ دوا پابندی سے اور اس وقت تک لینی ہے، جب تک وہ خود اُن سے بند کرنے کے لیے نہ کہے۔

آخر بلی کے تھیلے سے باہر آنے کا وقت آ ہی گیا۔ روبینہ نے ان سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ انھوں نے اسی شام کے لیے ہامی بھر لی۔ وہ چاہتے تھے کہ جو بھی ہونا ہے بس اب فوراً ہو جائے۔ گومگو کی اس کیفیت نے انھیں بری طرح تھکا دیا تھا، بیمار کر دیا تھا۔ وہ اب فوراً مسئلے کی تہہ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ کئی بار انھوں نے سوچا کہ وہ خود ملنے کی خواہش کا اظہار کریں، لیکن یہ سوچ کر رک گئے کہ اس طرح تو روبینہ پر ان کی بے چینی اور خوف کا راز کھل جائے گا اور پھر یہ عورت انھیں اپنی شرائط اور منہ مانگی قیمت پر مجبور کرے گی۔ اس لیے وہ اُسی کی طرف سے ملاقات کی خواہش کے اظہار کا انتظار کر رہے تھے اور جوں ہی یہ سوال کیا گیا انھوں نے یہ تأثر دیتے ہوئے کہ وہ بھی اپنی پرانی دوست سے ملنے کو بے چین ہیں، فوراً آمادگی ظاہر کر دی۔

روبینہ اب بھی سلم، اسمارٹ اور اسی طرح پُرکشش تھی۔ انھوں نے ملاقات کا آغاز اسی فقرے سے کیا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے آج ان کی توجہ کسی اور چیز پر نہیں بس ایک ہی نکتے پر مرکوز تھی۔ روبینہ بچی کو بھی اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ بچی بہت معصوم اور پیاری تھی، لیکن اسے دیکھ کر اُن کی وحشت بڑھ گئی تھی۔ وہ ہو بہ ہو اُن کی چھوٹی بیٹی جیسی تھی، جیسے بنانے والے نے دو صورتیں ایک جیسی بنائی ہوں، دونوں میں اگر کوئی فرق تھا تو بس چار پانچ برس کی عمر کا تھا۔ سارا خاندان کہتا تھا کہ وہ شیخ مجیب عالم کی ٹرو کاپی ہے۔ یا خدا! اگر یہ بچی اُن کی بیٹی کے ساتھ بٹھا دی جائے تو کسی ڈی این اے ٹیسٹ کے بغیر ہی یہ ثابت ہو جائے گا کہ دونوں سگی بہنیں ہیں۔ شیخ مجیب عالم کے پیٹ میں ایک بگولا سا گھوم گیا۔

ملاقات گھنٹے بھر سے جاری تھی۔ کافی، اسنیکس، باتیں، مذاق، قہقہے سب کچھ ہو چکا، لیکن روبینہ کے ہونٹوں پر وہ بات اب تک نہیں آئی تھی، جس کے شیخ مجیب عالم منتظر تھے۔ وہ خود کو بالکل بے بس محسوس کر رہے تھے اور انھیں یقین ہو گیا تھا کہ اس دوران میں اس عورت نے ان سے جتنی باتیں کی ہیں، وہ سب کی سب اس خبر کے ان پر اثر کا اندازہ لگانے کے لیے کی گئی ہیں اور یہ قیاس کرنے کے لیے کہ وہ اس بلیک میلنگ میں ان سے کتنی رقم بٹور سکتی ہے۔ خیر، انھوں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ وہ اس سے بہت اطمینان سے اور ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ انھوں نے کئی بار اس بات کو دُہرایا تھا کہ وہ ان دنوں مالی بحران کا شکار ہیں۔ پہلے ایک کاروبار میں بڑی رقم لگا کر نقصان اٹھایا، اس

کے بعد والدہ اور پھر بیوی کی بیماری پھر کچھ اور خاندانی مسائل نے انھیں مالی تنگی میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس پر روبینہ نے افسوس کا اظہار کیا اور دعا کی کہ وہ جلد اس کرائسس سے نکل آئیں۔ آخر گھڑی دیکھتے ہوئے وہ بولی، ''اب چلنا چاہیے۔ مجھے تو ابھی راستے میں پنکی کے لیے کچھ خریداری بھی کرنی ہے۔''

''اچھا دیکھ لیجیے، جیسے آپ کی مرضی۔'' شیخ مجیب عالم نے بھی گھڑی دیکھی۔

''آپ پوچھیں گے نہیں کہ میں آپ سے ملنا کیوں چاہتی تھی؟''

شیخ مجیب عالم کا چہرہ ایک دم پھیکا پڑ گیا۔ انھوں نے خود کو سنبھالتے ہوئے قہقہہ لگایا اور بولے، ''اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔ مجھے معلوم ہے، آپ کا دل چاہا کہ ملاقات ہو، جیسے میرا دل چاہ رہا تھا اور بس آپ آ گئیں۔''

روبینہ نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی، ''اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے۔''

شیخ مجیب عالم کے دل کی حرکت ایک دم آہستہ ہو گئی۔ انھوں نے گہرا سانس لیا اور بولے، ''اچھا— وہ کیا؟''

''میں پنکی کو آپ سے ملانا چاہتی تھی۔''

''پنکی بہت پیاری بچی ہے۔ اس سے مل کر بہت اچھا لگا، بہت خوشی ہوئی۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے اس سے ملاقات کروا دی۔''

پنکی اُن دونوں سے بے نیاز اپنی ماں کے موبائل پر کوئی گیم کھیلنے میں مصروف تھی۔

''میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ ملاقات بہت ضروری ہے۔'' روبینہ ایک لمحے کے لیے رُکی۔ شیخ مجیب عالم اسے سانس روکے دیکھ رہے تھے۔ وہ پھر بولی، ''اصل میں اگلے ہفتے ہم لوگ کینیڈا جا رہے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' شیخ مجیب عالم کے منہ سے بس اتنا ہی نکلا۔

''امیگریشن کے لیے اپلائی کیا ہوا تھا، وہ مل گئی ہے۔ سب کام ہو گئے ہیں، بس اب اگلے ہفتے ہم لوگ وہاں شفٹ ہو جائیں گے۔''

''اچھا— پوری فیملی— ہمیشہ کے لیے؟''

''جی!'' روبینہ کی آنکھیں اُن کے چہرے پر تھیں۔ ''میرا جی چاہتا تھا کہ جانے سے پہلے کم سے کم ایک بار آپ کی بیٹی کو آپ سے ضرور ملوا دوں۔'' شیخ مجیب عالم کو کچھ سمجھ نہ آیا کہ وہ جواباً کیا کہیں۔ وہ مسکرا کے رہ گئے۔

روبینہ خاموشی سے اُن کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ چند سیکنڈ اس کی آنکھیں ان کے چہرے پر رُکی رہیں۔ شیخ مجیب عالم کو لگا جیسے کتنے برسوں سے وہ اُن کے چہرے کو تکے جا رہی ہے اور کوئی دروازہ تلاش کر رہی ہے جو اُسے اُن کے اندر لے جا سکے۔

گھڑی دیکھتے ہوئے روبینہ اٹھی لیکن پھر فوراً ہی بیٹھ گئی۔ ''ایک بات اور کہنی تھی آپ سے۔ میرے پاس کچھ تھوڑے سے پیسے ہیں۔ اپنا اکاؤنٹ نمبر مجھے ٹیکسٹ کر دیجیے، آن لائن ٹرانسفر کرا دوں گی۔ آپ فنانشلی کچھ پریشان لگ رہے ہیں ان دنوں۔ بہت زیادہ تو نہیں ہیں، شاید پچیس لاکھ تک میں ٹرانسفر کرا دوں گی آپ کے اکاؤنٹ میں۔ کچھ آسانی ہو جائے گی آپ کو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

شیخ مجیب عالم بالکل گنگ اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ اُس نے اُن سے ہاتھ ملایا اور بچی کا بازو تھام کر چل دی۔ شیخ مجیب عالم کچھ کہنا چاہتے تھے، اس کے ساتھ ہی وہاں سے اٹھنا چاہتے تھے، لیکن انھیں لگا وہ گھٹنوں تک زمین میں دھنسے ہوئے ہیں۔

پارکنگ ایریا

غضنفر

محلّے میں پہنچ گیا تھا مگر اسے خالہ کا مکان نہیں مل رہا تھا۔

چار پانچ سال پہلے جب وہ ہاؤس آیا تھا تو گھر آسانی سے مل گیا تھا۔ خالو نے اسے بس اتنا بتایا تھا کہ مکان مسجد کے پاس ہے اور آنگن میں اشوک کا ایک پیڑ کھڑا ہے۔

مسجد کے پاس پہنچ کر آنگن میں پیڑ والا مکان وہ چاروں طرف ڈھونڈتا پھر رہا تھا مگر اس علاقے میں کوئی بھی ایسا مکان نظر نہیں آرہا تھا جس کے آنگن میں پیڑ ہو۔ پیڑ کیا، وہاں تو اسے کوئی آنگن بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اسے پریشان دیکھ کر ایک بزرگ شخص جو کرتا پاجامہ اور ٹوپی پہنے ایک عمارت کے گیٹ کے پاس لوہے کی کرسی ڈالے بیٹھے تھے، اسے مخاطب کر کے بولے

''صاحبزادے آپ کو کس کے گھر جانا ہے؟''

''خلیل اللہ صاحب انجینئر کے یہاں۔'' اس نے انجینئر پر زور دے کر جواب دیا۔

''وہی خلیل اللہ نا جو ایم۔سی۔ڈی میں ہیں؟''

''جی ہاں، وہی۔'' اسے کچھ اطمینان سا محسوس ہوا۔

''آپ تو ان کے فلیٹ کے سامنے ہی کھڑے ہیں۔ اس بلڈنگ کی دوسری منزل کا داہنی جانب والا فلیٹ انھی کا ہے۔''

''یہ ہے ان کا مکان؟ پہلے تو یہ ایک منزلہ مکان تھا اور اس کے آنگن میں اشوک کا ایک پیڑ کھڑا تھا۔ میں تو اسے ہی ڈھونڈ رہا تھا۔'' اس کی آنکھیں حیرت سے اس عمارت کو گھورنے لگیں۔

''میاں! اس مکان کو فلیٹ میں تبدیل ہوئے بھی ایک عرصہ ہو گیا۔ لگتا ہے آپ کافی دنوں بعد ادھر تشریف لائے ہیں۔''

''جی، میں کوئی چار پانچ سال بعد آیا ہوں۔''

''چار پانچ سال! یہاں تو روز کچھ نہ کچھ بدل جاتا ہے۔''

''اچھا!'' اس کی نگاہیں ایک لمحے میں چاروں طرف دوڑ گئیں۔ محلّے کے بدلاؤ کا نقشہ اور بھی نمایاں ہو گیا۔

''چچا میاں! کون سی منزل پر بتلایا تھا؟'' آس پاس میں ہوئی غیر معمولی تبدیلی اور حیرت و استعجاب کی شدّت نے اس کے دماغ میں ایسی اتھل پتھل مچادی تھی کہ کچھ دیر پہلے کی سنی ہوئی بات بھی ذہن کے پردے سے محو ہو گئی تھی۔

''دوسری منزل پر داہنی جانب والا فلیٹ۔''

''شکریہ!'' وہ سامنے والی عمارت کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے داہنی طرف والی کال بیل کا بٹن دبادیا۔

کوئی آٹھ دس منٹ بعد دروازہ کھلا۔ وہ بھی آدھا۔ ادھ کھلے دروازے کی اوٹ سے ایک لڑکی بولی۔
''کس سے ملنا ہے؟''
''جی، خلیل اللہ صاحب سے۔''
''وہ تو ابھی آفس سے نہیں آئے ہیں۔ شام کے وقت پہنچتے ہیں۔'' اتنا کہہ کر وہ لڑکی دروازہ بند کرنے لگی۔
''سنیئے تو۔۔'' اس نے روکا۔
''جی، کہیے۔'' لڑکی کے لہجے میں کسی قدر سختی در آئی تھی۔
''خالہ، مرا مطلب ہے ان کی بیگم صاحبہ ہیں؟''
''ہیں تو مگر وہ لیٹی ہوئی ہیں۔ شام میں آیئے گا۔''
''دیکھیے۔ میں دیوریا سے آیا ہوں اور میرا نام اشف۔۔۔'' قبل اس کے کہ وہ اپنا پورا نام بتاتا دروازہ بند ہو گیا۔

اسے ایک دھکا سا لگا۔ وہ نیچے سے اوپر تک ہل گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسک گئی ہو۔ اُس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ ایسا کچھ ہوگا۔ بلکہ اس کے ذہن میں تو کچھ اور ہی نقشہ تھا۔ بنّو خالہ کے گھر والا تازہ تازہ ریسپشن بسا ہوا تھا۔ بنّو خالہ اور خلیل اللہ خالو کی بیوی شبّو خالہ دونوں سگی بہنیں تھیں۔ بنّو خالہ ضلع دیوریا کے ایک قصبہ زیرادیئی میں بیاہی گئی تھیں۔ کچھ دنوں پہلے اسے ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ دستک دیتے ہی بچّے باہر آ کر اس سے لپٹ گئے تھے۔ وہ ایک دن کے لیے گیا تھا مگر خالہ اور بچّوں نے ضد کر کے اسے کئی دنوں تک روک لیا تھا۔ بار بار اسے اپنا قصبہ بھی یاد آ رہا تھا جہاں پہلی دستک میں دروازہ کھل جاتا ہے اور پٹوں کے کھلتے ہی آنے والے کو اندر آنے کے لیے کہا جاتا ہے اور بنا کچھ پوچھتا چھ کے پانی پیش کر دیا جاتا ہے اور پھر۔۔۔

کچھ دیر تک وہ اس لوہے کے بند دروازے کو دیکھتا رہا اور اپنے قصبے اور بنّو خالہ کے گھر کو یاد کرتا رہا۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ زینے سے اتر کر سیدھے اسٹیشن چلا جائے مگر خالو سے ملنا ضروری تھا۔ جی کڑا کر کے وہ دُکھی من اور بوجھل پیروں سے نیچے اتر آیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ وقت کس طرح بتائے؟ شام ہونے میں ابھی ایک سوا گھنٹہ باقی تھا۔ گیٹ سے نکل کر وہ سڑک پر پہنچا ہی تھا کہ اس بزرگ شخص کی آواز جس نے خالو کے مکان کا پتا بتلایا تھا، کانوں سے آ ٹکرائی۔

کیا بات ہے؟ آپ بہت جلدی واپس آ گئے۔''
''جی دروازہ بند ہے۔''
''آپ نے کھٹکھٹایا نہیں؟''
''کھٹکھٹایا تھا۔ شاید گھر والے گہری نیند سو رہے ہیں۔''
''کمال ہے! اس وقت تک سو رہے ہیں؟'' بزرگ شخص نے اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے انھوں نے اس کا جھوٹ پکڑ لیا ہو۔ کھٹاک کی آواز دوبارہ اس کے ذہن میں گونج پڑی۔
قدرے توقف کے بعد اس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ بزرگ بولے
''تو کیا آپ لوٹ جائیں گے؟''

''نہیں، خالو سے ملنا ضروری ہے۔اس لیے انتظار کروں گا۔''
''آیئے، میرے پاس بیٹھ جایئے۔آپ کے ساتھ کچھ میرا بھی وقت کٹ جائے گا؟''
آگے بڑھ کر وہ ایک اور کرسی اٹھا لائے۔
''خلیل صاحب سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟'' اس کی طرف کرسی بڑھاتے ہوئے بولے
''میں ان کی بیوی کی ممیری بہن کا بیٹا ہوں۔ میرا مطلب ہے خلیل صاحب میرے خالو لگتے ہیں''
''اچھا ہوا کہ آپ نے دوسرا جملہ بھی بول دیا ورنہ اس طرح کے درمیانی حوالے اکثر راستے کی دیوار بن جاتے ہیں اور کبھی کبھی تو منزل۔۔۔۔خیر چھوڑیے، یہ بتایئے کہ آپ کیا کرتے ہیں؟ کہاں کے رہنے والے ہیں اور یہاں کیوں کر آنا ہوا ہے؟''
''ایک ساتھ تین تین سوال؟ اسے کچھ عجیب سا لگا۔ پھر یہ سوچ کر کہ وقت گزارنے کے لیے یہ سوال برے نہیں ہیں۔اس نے جواب دینا شروع کر دیا۔
''میں ضلع دیوریا کے پاس کے ایک قصبے کا رہنے والا ہوں۔ابھی ابھی ایم۔اے کا امتحان پاس کیا ہے۔رزلٹ نکلنے ہی والا ہے۔جامعہ سے ریسرچ کرنے کا ارادہ ہے، اسی سلسلے میں یہاں آنا ہوا ہے۔خلیل اللہ خالو سے رہائش وغیرہ کے متعلق بھی کچھ بات کرنی ہے، اور ابو کا ایک خط بھی ان تک پہنچانا ہے، لہٰذا ان کا انتظار کرنا ضروری ہے؛''
''ہاں، تب تو انتظار کرنا ہی پڑے گا، جامعہ میں تو ہاسٹل کی قلّت ہے، اس لیے اس بات کا قوی امکان ہے کہ آپ کو باہر رہنا پڑے۔''
''کوئی بات نہیں، گھر سے جب نکلنا ہے تو ہاسٹل کیا اور باہر کیا۔البتہ ایک بات کی خوشی ضرور ہے کہ یہاں خالو کا گھر ہے تو کبھی کبھار گھر کا مزا بھی مل جایا کرے گا۔ چچا میاں کیا آپ یہیں رہتے ہیں؟''
''ہاں، میں اسی بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں رہتا ہوں، میرا فلیٹ کافی اوپر ہے۔اترنے چڑھنے میں سانس پھول جاتی ہے، اس لیے بار بار اوپر نہیں جاتا۔ یہاں وقت بھی اچھا کٹ جاتا ہے۔''
''آپ کے گھر میں اور کوئی نہیں ہے کیا؟''
''ہے کیوں نہیں؟ ماشا اللہ دو دو بیٹے ہیں۔ بہوئیں ہیں۔ پوتے پوتیاں ہیں۔''
''تو ماشاء اللہ بھراپُرا گھر ہے۔ مکان آپ کا اپنا ہے یا کرائے پر لیا ہے؟''
''ہے تو اپنا ہی مگر مکان نہیں، فلیٹ ہے۔''
''مکان اور فلیٹ میں کوئی فرق ہے کیا؟ میں تو دونوں کو ایک ہی سمجھ رہا ہوں۔''
''آپ دہلی میں نہیں رہتے نا، اس لیے ایسا سمجھ رہے ہیں۔اگر دہلی یا کسی اور بڑے شہر میں رہ رہے ہوتے تو آپ کو مکان اور فلیٹ کا فرق ضرور معلوم ہوتا۔''
''کیا فرق ہے؟'' فرق جاننے کا اس میں تجسّس پیدا ہوا۔
''مکان اسے کہتے ہیں جس کی زمین اور چھت دونوں اپنی ہوتی ہے۔اس میں کسی کا کوئی حصہ نہیں ہوتا اور فلیٹ میں نہ فرش اپنا ہوتا ہے نہ ہی چھت اپنی ہوتی ہے۔بس دونوں کے درمیانی حصے پر مالکانہ اختیار یا قبضہ ہوتا ہے۔
''پھر تو واقعی دونوں میں کافی فرق ہے۔''

''ایک فرق اور ہے میاں۔''

''وہ کیا؟''

''فلیٹ تو مل جاتا ہے مگر مکان ہر کسی کو حاصل نہیں ہوتا اور اب تو دلّی کا یہ حال ہے کہ یہاں مکان کا کوئی خواب بھی نہیں دیکھتا اور ایک فرق یہ بھی ہے کہ مکان رکھنے کے لیے قلب و ذہن میں کشادگی ضروری ہے جو بدقسمتی سے رخصت ہوتی جارہی ہے۔''

''کیوں؟''

''کوئی ایک وجہ ہو تو بتاؤں۔''

''پھر بھی، ایک آدھ تو بتا ہی دیجیے۔''

''ایک تو یہی ہے کہ ادھر اُدھر کا دباؤ ہمارے دل و دماغ کو اپنے شکنجوں میں کستا جارہا ہے۔ دوسری یہ کہ ہم الگ تھلگ رہنے کے عادی بنتے جارہے ہیں اور ایک یہ بھی کہ فطری آب و ہوا کے بجائے ہمیں کولر اور اے۔سی کی ہوا زیادہ بھانے لگی ہے۔''

جس شخص کو تھوڑی دیر پہلے وہ چوکیدار یا چوکیدار جیسا آدمی سمجھ رہا تھا، وہ اچھا خاصا دانشور لگنے لگا تھا۔ اس کی باتیں سن کر وہ اپنے اس دباؤ کو بھولتا جارہا تھا جو خالو کے فلیٹ کے پٹوں کے ''کھٹاک'' سے اس کے دل و دماغ پر طاری ہوگیا تھا۔ اس میں اب اس کی دلچسپی بڑھنے لگی تھی۔ اس نے اس بزرگ کے سراپے کا جائزہ لینا شروع کیا تو آنکھوں میں بہت سے سائے لہرانے لگے۔ اسے محسوس ہوا جیسے ان کے چہرے کے پیچھے کوئی اور بھی چہرہ چھپا ہوا ہے۔

''چچا میاں! آپ نے اپنے مشغلے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟'' اس نے ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''میاں آپ نے پوچھا ہی کب کہ بتاتا۔ اب جبکہ آپ کی دلچسپی میری جانب بڑھی ہے تو بتاتا ہوں کہ میں جامعہ میں درس وتدریس سے منسلک تھا۔ پینتیس سال تک خدمت انجام دینے کے بعد اب سبکدوشی کی زندگی گزار رہا ہوں ''۔

''آپ سے ایک ایسا سوال بھی کرنے کو جی چاہ رہا ہے جو خود مجھے بھی اٹ پٹا لگ رہا ہے۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو پوچھوں؟''

''ضرور پوچھیے۔ میں بالکل برا نہیں مانوں گا۔ آپ کے اس طرح کے سوال کے لیے میرا ذہن پہلے سے تیار بھی ہے کہ آپ کی نظریں آلریڈی اس کا اشارہ مجھے دے چکی ہیں۔''

''آپ اس پارکنگ ایریا میں اپنا زیادہ وقت صرف اس لیے بتاتے ہیں کہ آپ کو اوپر چڑھنے اُترنے میں پریشانی ہوتی ہے یا کوئی اور وجہ بھی ہے؟

یہ سوال سن کر اس بزرگ نے اپنی آنکھیں اس کے چہرے پر مرکوز کردیں جیسے اس نے اس کی اصل وجہ جان لی ہو۔ کچھ دیر تک وہ اسے گھورتے رہے، پھر بولے۔

''صاحب زادے! آپ کافی ذہین معلوم ہوتے ہیں اور قیافہ شناس بھی۔ اس لیے اب آپ کے سامنے جھوٹ نہیں بولوں گا اور بولوں گا بھی تو آپ یقیناً اس جھوٹ میں چھپے سچ کو جان لیں گے۔ سچ یہ ہے برخوردار کہ تنگی نے مجھے فلیٹ

سے اتار کر اس پارکنگ میں پہنچا دیا ہے۔ اگر دیر تک میں اوپر کمرے میں رہتا ہوں تو میرے پوتے پوتیوں کی پڑھائی اور ان کی پرائیویسی دونوں متاثر ہوتی ہیں اور میں نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہوتا ہوں۔ اس لیے میں اپنے کمرے میں جو کہنے کے لیے تو مرا کمرہ ہے مگر وہ ڈرائنگ روم بھی ہے اور اسٹڈی روم بھی، بہت کم جاتا ہوں اور اس وقت جاتا ہوں جب میرا وہاں جانا ناگزیر ہو جاتا ہے اور زیادہ وقت یہاں بتاتا ہوں۔ مانا کہ یہاں صفائی کم ہے۔ آس پاس میں کوڑا کباڑ بھی پڑا ہوا ہے جس کی طرف آپ کی نظریں بار بار چلی جا رہی ہیں، پھر بھی یہاں دم نہیں گھٹتا بلکہ کھلا پن محسوس ہوتا ہے اور اوپر کے مقابلے میں یہاں بیٹھنا بھی اچھا لگتا ہے کہ آتے جاتے کچھ لوگوں سے سلام دعا بھی ہو جاتی ہے۔'' بات کرتے کرتے وہ ایک دم سے خاموش ہو گئے۔ اسے محسوس ہوا جیسے ان کی آنکھوں میں کچھ اتر آیا ہو۔

اسے اس کے دادا یاد آ گئے۔ ان کی بیٹھک میں دن بھر محلے کے لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے اور رات میں گھر کے بچے انھیں گھیر کر بیٹھ جاتے ہیں۔ دیر تک کہانی سننے اور سنانے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ بیچ بیچ میں مونگ پھلی اور چائے وغیرہ کا دور بھی چلتا رہتا ہے۔

''چچا میاں آپ کہاں کھو گئے؟'' اس نے بزرگ کی خاموشی کو توڑنے کی کوشش کی

اس کے سوال پر وہ ایک لمبی سانس لے کر بولے۔

''میاں! کبھی ہمارے پاس بھی اپنا مکان تھا۔ یہ پوری زمین ہماری تھی۔ گھر کے تمام افراد کے پاس ان کے اپنے کمرے تھے۔ بلکہ ایک آدھ کمرے ضرورت سے زیادہ بھی تھے۔

''پھر آپ نے اسے فلیٹ میں کیوں بدل دیا؟'' اس کا تجسس بڑھنے لگا

''میں نے نہیں بدلا۔ یہ کام میرے بیٹوں نے کیا۔ انھوں نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اسے کسی بلڈر کو سونپ دوں کہ وہ اس زمین کی اچھی قیمت کے ساتھ ساتھ مفت میں ہمیں ایک فلیٹ بھی دے گا۔ انھوں نے مجھے اس طرح بھی سمجھایا کہ یہ کام سبھی کر رہے ہیں۔ کوئی اکیلا میں نہیں کروں گا اور کچھ ایسی ضرورتیں بھی میرے سامنے رکھ دیں کہ اپنے دل و دماغ کے دباؤ کے باوجود میں نا نہ کہہ سکا۔ اس طرح ہمارا مکان جو کافی کشادہ تھا دو کمروں کے فلیٹ میں تبدیل ہو گیا۔

''دیر تک آپ کا یہاں رہنا آپ کے بچوں کو کیا اٹ پٹا نہیں لگتا؟''

''پتا نہیں، ویسے کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ وہ اور ان کے بچے مجھ سے پوچھیں کہ میں یہاں کیوں پڑا رہتا ہوں مگر آج تک کسی نے بھی یہ سوال مجھ سے نہیں کیا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ میری بیوی یہ دن دیکھنے سے پہلے ہی یہاں سے رخصت ہو گئیں، ورنہ پتا نہیں ان بیچاری کا کیا حال ہوتا؟''

ان کی آواز بند ہو گئی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ آنسو بیوی کی جدائی کے غم کے تھے یا بچوں کی بے اعتنائی کے یا اس کی کوئی اور وجہ تھی ٹھیک سے مجھ پر واضح نہ ہو سکا۔

کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد میری طرف دیکھتے ہوئے انھوں نے پھر بولنا شروع کیا

''بعد میں جب میں نے اپنے بیٹوں سے تنگی کی شکایت کی تو انھوں نے میرے سامنے ایک نئی منطق رکھ دی۔

''وہ کیا منطق تھی؟''

''میں نے جب ان سے کہا کہ دو سو گز کا مکان اب 100 گز میں سمٹ کر رہ گیا ہے تو بولے۔

''ابا ہماری زمین تنگ نہیں ہوئی ہے بلکہ اور کشادہ ہو گئی ہے۔ پہلے اس کا رقبہ صرف دو سو گز یعنی اٹھارہ سو

اسکوائرفٹ تھا۔اب وہ رقبہ دوسوگز سے بڑھ کر ہزار گز یعنی اٹھارہ ہزار اسکوائرفٹ ہوگیا ہے۔ پہلے اس جگہ صرف ہمارا یعنی ایک کنبہ رہتا تھا، اب کئی خاندان آباد ہو گئے ہیں۔''

''ان کی منطق سن کر میرے منہ سے تو کچھ نہیں نکلا البتہ میری آنکھیں ان کی طرف مرکوز ہو گئیں۔ دھیرے دھیرے ان کے دیدوں میں اس منطق کا کھوکھلا پن سمٹ آیا تھا اور ان کی پلکیں کسی بوجھ سے جھکتی چلی گئی تھیں۔''

''چچا میاں! چاہے ان کی نیت صاف نہ رہی ہو مگر یہ منطق کوئی غلط تو نہیں لگتی؟''

''منطق صحیح بھی ہو تب بھی اس سے تنگی تو دور نہیں ہو جاتی۔ ہاں کسی کو بسانے کا احساس ضرور کچھ خوشی دے سکتا ہے مگر اس طرح کی خوشی ایسے میں کب تک قائم رہ سکتی ہے جب کہ دُکھ کا شکنجہ روز بہ روز جسم و جان کو کستا جا رہا ہو۔ میاں سچ تو یہی ہے کہ ہماری زمین ہم پر تنگ ہو گئی۔ ہماری گھٹن بڑھ گئی۔ ایک ہماری ہی کیا، یہاں جتنے لوگ رہتے ہیں زیادہ تر اس گھٹن اور تنگی کے شکار ہیں۔ آدھے فلیٹس تو ایسے ہیں جہاں سورج کی روشنی پہنچتی ہی نہیں۔ ہوا کا گزر بھی مشکل سے ہوتا ہے۔ کچھ کمروں میں تو بالکنی تک نہیں ہے اور جن کمروں میں ہے بھی تو وہ اتنی تنگ اور پتلی ہے کہ اس میں ٹھیک سے لوہے کی ایک فولڈنگ کرسی بھی نہیں پڑ پاتی۔ برسات میں کپڑے آئرن سے سکھانے پڑتے ہیں اور بجلی اتنی پھنکتی ہے کہ اللہ کی پناہ! اکثر بالکنیوں سے بجلی کے موٹے موٹے تار چپک کر گزرتے ہیں جن کا خوف کسی سانپ کے خوف کی طرح ہر وقت سروں پر مسلط رہتا ہے۔ پتا نہیں ان میں سے کوئی کب پھنکار مار دے اور ہم میں سے کوئی پیلا پڑ جائے۔''

''چچا میاں! آخر اس علاقے کو یہاں کے لوگوں نے اتنا گنجان کیوں بنا دیا؟ کسی نے دباؤ تو ڈالا نہیں ہوگا کہ آپ اپنی کشادہ زمینوں کو اپنے اوپر قبر کی طرح تنگ کر لیں؟

''میاں! جب میں اس کرب سے دوچار ہوا تو اس مسئلے پر بہت سوچا۔ یہ سوال جو ابھی آپ نے مجھ سے کیا ہے میرے ذہن میں بھی ابھرا اور بار بار ابھرا اور اس کا جواب مجھے یہ ملا کہ بظاہر تو ایسا نہیں لگتا کہ کسی نے فورس کیا ہو یا دباؤ ڈالا ہو لیکن جو لوگ اس علاقے میں رہتے ہیں یا رہنا پسند کرتے ہیں ان پر اور اپنی زمینی حقیقت پر غور کیا جائے تو کوئی نہ کوئی دباؤ بھی ضرور نظر آ جائے گا۔''

''آپ کو تو وہ دباؤ نظر آیا ہوگا؟''

''ہاں، آیا تو ہے؟

''تو اس پر کچھ روشنی ڈالیے نا۔''

''میاں! آپ نے یہ کہاوت تو سنی ہوگی ''چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا۔ یعنی جتنی چادر ہو پاؤں اتنا ہی پھیلانا چاہیے، ادھر جو لوگ رہتے ہیں یا رہنے کی کوشش کرتے ہیں انھیں اس حقیقت کا احساس ہے کہ ان کے پاس جو چادر ہے وہ چھوٹی ہے۔ اتنی چھوٹی کہ پورے پاؤں پھیلا نہیں سکتے۔ نتیجتاً انھیں اپنے پیروں کو موڑ کر یا سکوڑ کر رکھنا پڑتا ہے۔ پیروں کو موڑنے میں گھٹنے اور ناک تو ٹکرائیں گے ہی اور جب یہ صورت حال پیدا ہوگی تو گھٹن تو ہوگی ہی۔ پھر یہاں کی تنگی نے مزید تنگی پیدا کر دی ہے۔''

''اس کا مطلب کیا ہوا، چچا میاں؟''

''مطلب یہ ہے میاں کہ کم زمین ہونے کے سبب ہر آدمی اپنی زمین کو دائیں بائیں سے کچھ بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس ہوڑ میں لوگ ایک دوسرے سے سبقت بھی لے جانے کی سعی کرتے ہیں۔ نتیجے میں روشن دان کھلے ہونے

کے باوجود بند رہتے ہیں۔ کھڑکیاں بے مصرف ہوجاتی ہیں۔ مکانوں کے چھجے راستوں پر آجاتے ہیں۔ اوران چھجوں پر بالکنیاں بن جاتی ہیں اور اس طرح وہ راستہ جو نیچے چوڑا ہوتا ہے اوپر آتے آتے اتنا تنگ ہوجاتا ہے کہ ہوا اور روشنی دونوں کا گلا بھینچ جاتا ہے۔

تنگی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان علاقوں میں وہ لوگ بھی اب آنا پسند کرنے لگے ہیں بلکہ اس طرف بھاگنے لگے ہیں جو کشادہ علاقوں میں بسے ہوئے ہیں یا جو اُدھر بسنے کی سکت رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں ترقی پسند خیال اور سیکولر مزاج والے لوگ بھی شامل ہیں۔''

''ایسے لوگ بھی؟''

''ہاں، ایسے لوگ بھی۔ دہشت کا گرد باد جب لہراتا ہے تو مضبوط سے مضبوط فلسفے کا پیڑ بھی اُکھڑ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایمان ویقین کا برگد بھی گر پڑتا ہے۔''

''ایسا کیوں ہو رہا ہے؟'' حالات کو سمجھنے میں اس کی دلچسپی بڑھنے لگی۔

''اس لیے کہ لوگ اُدھر خود کو محفوظ نہیں سمجھتے۔''

''محفوظ کیوں نہیں سمجھتے؟''

''اس لیے کہ دھمک کہیں بھی ہو، ان کی کھڑکیاں لرز جاتی ہیں اور کبھی کبھی تو ایسی لرزتی ہیں کہ ہفتوں دل ودماغ پر لرزہ طاری رہتا ہے۔

''ایسا کیوں ہوتا ہے؟''

''اس کیوں کو جاننے کے لیے یہاں کی تاریخ اور جغرافیہ میں دور تک جانا ہوگا اور کئی سو سالہ تہذیب ومعاشرت کے سرد وگرم کو سمجھنا ہوگا۔ یہ ایسا سوال ہے کہ اس کا جواب جاننے میں ذہن جھلسنے اور دل بیٹھنے لگتا ہے۔ اس کا جواب ایک دو جملے میں دیا بھی نہیں دیا جاسکتا۔ اس لیے فی الحال تو ہمیں لوگوں کے ادھر آنے کی وجوہات پر غور کرنا چاہیے اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بڑی اور صاف ستھری کالونیوں میں ہمارے لیے مرنے کے بعد کا انتظام نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں کالونیاں اکثریت کی آبادی کو ذہن میں رکھ کر بنائی جاتی ہیں۔ چوں کہ ہماری اکثریت کو مرنے کے بعد کے قیام کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، انھیں مرنے کے بعد کوئی جگہ نہیں چاہیے اس لیے قبرستان کا پروویژن نہیں رکھا جاتا لیکن ہمیں تو اسکے بعد بھی دوگز زمین چاہیے، وہ اُدھر نہیں ملتی۔ اس ضمن میں ایک دل دہلا دینے والا واقعہ بھی سن لیجیے۔ میرے ایک جاننے والے بتارہے تھے کہ ان کی کالونی میں کسی کی وفات ہوئی۔ ان کی میت آس پاس کے کسی گاؤں کے قبرستان میں لوگ دفنانے کے لیے لے گئے تو اس گاؤں کے لوگوں نے یہ کہہ کر منع کردیا کہ ہماری جگہ تو پہلے ہی سے چھوٹی ہے، ہم اگر دوسروں کو بھی اس میں جگہ دینے لگے تو ہمارا کیا ہوگا۔ لوگ اس میت کو لے کر ادھر ادھر گھومتے رہے، کہیں جگہ نہ ملی تو آخر کار بڑی مشکل سے کسی علاقے میں زمین خرید کر اس میت کو ٹھکانے لگایا گیا۔ ان صاحب نے یہ بھی بتایا کہ میت کے گھر والے رو رو کر کہہ رہے تھے کہ کاش ان کے گھر میں کوئی آنگن ہوتا یا کم سے کم ان کے کمروں کا فرش ہی مٹی کا ہوتا! یہ مسئلہ ابھی اس طرف پیدا نہیں ہوا ہے۔ ایک سبب شاید یہ بھی ہے کہ زمینی صورتِ حال نے ہمیں تنگ دامانی پر مجبور کردیا ہے۔''

''وہ کیسے''؟

وہ اس طرح کہ وسعت کے لیے وسائل چاہییں۔ وسائل وراثت میں ملتے ہیں یا پیدا کیے جاتے ہیں۔ ہم میں

سے بیشتر کے پاس وراثت نام کی کبھی کوئی چیز رہی نہیں، جن کے پاس رہی بھی تو ان میں سے کچھ کی کب کی چھن گئی یا کچھ کی کھوکھلی ثابت ہوگئی اور کچھ کی بک بکا گئی۔ رہی وسائل پیدا کرنے کی بات تو پیدا کرنے میں صرف خود کا دخل نہیں ہوتا۔ اس کے لیے بہت ساری چیزیں درکار ہوتی ہیں اور وہ بہت ساری چیزیں بہت سی ناگفتہ بہ صورتوں اور بہت سی مصلحتوں کی شکار ہیں۔ لہٰذا اس راستے سے بھی ہم وسائل کا حصول نہیں کر پاتے۔ ایسی صورت میں ہم وہیں جا سکتے ہیں جہاں ہمارے محدود وسائل ہمیں جانے کی اجازت دیتے ہیں۔''

''آپ کا مشاہدہ کتنا سچا لگ رہا ہے چچا میاں!''

''ایک مشاہدہ میرا اور بھی ہے برخوردار؟''

''وہ کیا؟''

''وہ یہ کہ اس بڑھتی ہوئی آبادی اور سمٹتی ہوئی زمین نے جامعہ جیسے تعلیمی علاقے میں بھی تاجرانہ ذہنیت پیدا کرنی شروع کر دی ہے۔''

''بھلا وہ کیسے؟'' اس کا لہجہ اور بھی متجسس ہو گیا۔

''وہ اس طرح کہ فلیٹوں کی مانگ اور نئی زندگی کے مطالبوں نے درس و تدریس سے جڑے اساتذہ تک کو بھی زمینی کاروبار اور مکان کے لین دین کے دھندے میں لگا دیا ہے۔ اچھا خاصا پڑھا لکھا آدمی بھی پراپرٹی کی دلالی کے پیشے میں کود پڑا ہے۔ اپنی زمین کا رقبہ بڑھا کر خود کی رہائش کو تنگ کرنے، آس پاس کی زمینوں کو قبھانے یا انھیں بلڈروں کو دلا کر کمیشن کھانے کے چکّر میں پڑ گیا ہے اور اس تجارتی ذہنیت نے ہم سے ہمارا وہ سب کچھ چھین لیا ہے جن سے ہماری پہچان وابستہ تھی۔ اس نے ہماری اس شے کو کچل کر رکھ دیا ہے جس کی بدولت دل گداز اور آنکھیں نم ہوتی ہیں۔ اس کام میں ہمارے محلے کے بھی کافی لوگ لگے ہوئے ہیں۔ خود آپ کے خالو کا بھی یہ سائڈ بزنس بن گیا ہے۔ وہ سامنے جو کام ہو رہا ہے وہ سائڈ بھی آپ کے خالو کا ہی ہے۔ دوسری طرف طلبہ سے کرائے کی موٹی رقم وصولنے کے چکّر میں فلیٹ کے لوگ ایک کمرے میں سمٹتے جا رہے ہیں اور باقی کمرے لڑکوں کو کرائے پر دے رہے ہیں۔ انھیں یہ بھی نہیں خیال رہتا کہ گھر میں جوان بہو، بیٹیاں بھی رہتی ہیں۔ اس کے جو برے نتائج سامنے آ رہے ہیں وہ آئے دن آپ بھی اخباروں میں پڑھتے ہوں گے مگر پوچھنے اور ٹوکنے پر وہ بھی وہی منطق پیش کر دیتے ہیں جو میرے سامنے میرے بیٹوں نے پیش کی تھی اس ذہنیت سے ایک خرابی اور بھی پیدا ہو رہی ہے۔''

''وہ کیا؟''

''وہ یہ کہ ایک چھوٹے سے کمرے میں پانچ پانچ چھ چھ لڑکے رہتے ہیں اور تقریباً دس دس بارہ بارہ افراد ایک Toilet استعمال کرتے ہیں۔ اس سے آئے دن سنڈاسوں کا برا حال ہوتا رہتا ہے اور ماحول میں جو بدبو پھوٹتی ہے سو الگ۔ مکان اور محلے کا جو حشر ہوتا ہے وہ تو ہوتا ہی ہے خود ان لڑکوں کا بھی بیڑا غرق ہو رہا ہے جو ایسی حالت میں رہ کر اپنا کیریئر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں اور جن کا مقابلہ ان سے ہوتا ہے جو کشادہ علاقوں اور صاف ستھرے گھروں میں رہتے ہیں اور جو باقاعدہ اپنے اسٹڈی روم میں بیٹھ کر تیاری کرتے ہیں۔ معاف کیجیے گا میں آپ کو چائے بھی نہیں پلا سکتا۔''

''کوئی بات نہیں، چائے میں زیادہ پیتا بھی نہیں۔''

''آج آپ کا قیام رہے گا یا آج ہی واپسی ہے۔''

''ابھی کوئی طے نہیں ہے، خالو سے ملنے کے بعد ہی کوئی پروگرام بنے گا۔''

''برخوردار برا مت ماننا مگر میں اپنے تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں یہ بات کہہ رہا ہوں کہ خلیل صاحب کے گھر والے سوئے نہیں ہوں گے۔انھوں نے جان بوجھ کر دروازہ نہیں کھولا ہوگا یا کھولا بھی ہوگا تو اندر بلانا ضروری نہیں سمجھا ہوگا اور لگے ہاتھوں ایک تلخ بات اور کہہ دوں کہ یہ بھی ضروری نہیں کہ رات میں وہ آپ کو۔۔۔ خیر چھوڑیے۔معاف کیجیے گا میں ذرا صاف گو آدمی ہوں، اس لیے میں نے جو محسوس کیا، اسے بنا لاگ لپیٹ کے کہہ دیا۔''

''نہیں نہیں، اس میں معافی مانگنے کی کیا بات ہے۔آپ نے جیسا محسوس کیا، بتا دیا۔اچھا چچا میاں! اب میں چلوں گا۔میں نے آپ کا کافی وقت لے لیا۔''

''کہاں جائیں گے، خلیل صاحب تو ابھی آئے نہیں؟''

''ذرا جامعہ تک جا رہا ہوں پھر آ جاؤں گا۔''

''ارے! لیجیے، وہ تو آ بھی گئے۔خلیل صاحب! آپ کے یہ مہمان میرے پاس کب سے بیٹھے ہوئے ہیں۔''

''خلیل صاحب ان کی طرف مڑے ہی تھے کہ وہ اٹھ کر تیزی سے ان کے پاس چلا گیا۔''

''اسلام علیکم خالو جان!''

''وعلیکم اسلام۔تم کب آئے اشفاق؟'' اس کے سلام کے جواب کے ساتھ ہی ان کے منہ سے یہ سوال اچھل پڑا۔شاید اس کا وہاں بیٹھنا خلیل صاحب کو اچھا نہیں لگا تھا۔

''بس تھوڑی دیر پہلے''۔اس نے دھیرے سے جواب دیا۔

''دہلی یوں اچانک! پہلے سے کوئی اطلاع نہیں؟''

''اچانک ہی پروگرام بن گیا۔''

''کوئی خاص کام؟''

''جی، سب کی یہی رائے بنی کہ میں ریسرچ جامعہ سے کروں سو کچھ ضروری معلومات کے سلسلے میں آنا پڑا۔''

''اچھا، آؤ گھر چلیں۔''

''جی''

وہ خالو کے پیچھے ہولیا۔خالو کا برتاؤ دیکھ کر اسے اچھا لگا کہ اُس سے پارکنگ ایریا والے بزرگ کا impression غلط ثابت ہو رہا تھا۔

وہ خالو کے ساتھ جیسے جیسے ان کے فلیٹ کے قریب پہنچ رہا تھا ایک عجیب طرح کی الجھن سے دوچار ہوتا جا رہا تھا۔من ہی من میں دعا کر رہا تھا کہ صفیہ سے فوراً سامنا نہ ہو، خواہ مخواہ بے چاری کو سب کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا اور خود وہ بھی embarrassing situation میں آ جائے گا۔

''میں ابھی آیا'' اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر خلیل صاحب اندر چلے گئے۔تھوڑی دیر کے بعد کمرے کی طرف آتے ہوئے ایک سے زیادہ پیروں کی آہٹ محسوس ہوئی۔اس کے دل کی کیفیت دگرگوں ہونے لگی۔ایسا لگنے لگا جیسے غلطی صفیہ کی بجائے اس سے ہوئی ہو۔وہ آنے والی چویشن کے لیے اپنے کو تیار کر ہی رہا تھا کہ ایک دم سے خالو اور خالہ اندر آ گئے۔ان کے ساتھ صفیہ کو نہ دیکھ کر اس نے اطمینان کی سانس لی۔

اس کے خالہ کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی۔ خالہ نے اس ٹرے کو میز کے اوپر رکھ دیا۔ ٹرے اتنی بڑی تھی کہ اس کا ایک طرف کا کنارہ میز سے تھوڑا باہر نکل گیا۔ ٹرے میں تین خوبصورت پیالیاں تھیں جن کے اندر سے گرم چائے کی بھاپ اٹھ رہی تھی۔ ایک تشتری میں نمکین اور دوسری میں بسکٹ تھے۔ ٹرے میں کانچ کا ایک گول سا ڈبا بھی تھا جس میں کئی خانے بنے ہوئے تھے اوران خانوں میں اوپر تک کاجو، کشمش، بادام، اخروٹ اور پستہ بھرے ہوئے تھے۔

''لو کھاؤ'' خالہ کانچ کے ڈبے سے ڈھکن اتارتی ہوئی بولیں۔

اس نے بادام کی ایک گری اٹھا کر اپنے منہ میں رکھ لی۔

چائے کے دوران خالہ نے اس کی خیریت معلوم کی۔ امی ابو کا حال پوچھا اور اس کے آنے کا مقصد دریافت کیا۔ اس کے خوشگوار تاثرات میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

چائے پیتے ہوئے بار بار اس کی نگاہیں سامنے کی دیوار پر آویزاں قدِ آئینے پر مرکوز ہو جاتی تھیں جس میں کمرے کی ایک ایک چیز دکھائی دیتی تھی۔

ایک طرف ڈائننگ ٹیبل، اس کے اردگرد چھ کرسیاں، کرسیوں پر کشن، ٹیبل پر چند ایک اسٹینڈ، کچھ برتن، دو چار مرتبان، اور کچھ ڈبے۔

ٹیبل کے دائیں طرف کی دیوار سے لگی ایک بڑی سی شیشے کی الماری جس سے کھڑکی کا تقریباً آدھے سے بھی زیادہ حصہ ڈھک رہا تھا۔ اس الماری کے مختلف خانوں میں تلے اوپر رکھے ہوئے چینی مٹی، اسٹیل اور کچھ دوسرے مٹیریل کے برتن، ہوٹ پاٹ، کیتلی، تھرمس، کیٹلری، شیشے کے گلاس، ٹی سیٹ وغیرہ۔

ٹیبل کے بائیں جانب والی دیوار سے سٹی ایک ریک، جس کے دو خانے بند تھے اور ایک میں کئی ایک رجسٹر اور کچھ بہی کھاتے رکھے ہوئے تھے۔ جس جگہ پر صوفہ سیٹ بچھا ہوا تھا اس کے ایک طرف ایک وال ماؤنٹ تھا جس کے اوپری خانے میں میوزک سسٹم اور درمیان کے خانے میں ٹیلی وژن رکھا ہوا تھا۔ کنارے کے چھوٹے چھوٹے خانوں میں کچھ دوسرے الیکٹرانک سامان سجے ہوئے تھے۔ پاس ہی میں ایک پتلی سی میز تھی جس پر کمپیوٹر پڑا تھا۔ کمرے کے کونوں میں کورنر اور خالی جگہوں میں کئی چھوٹے اسٹول تھے جن پر طرح طرح کے شوپیس پڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف ایک بڑا سا فرج تھا جس کے اوپر بھی کچھ ڈبے نظر آ رہے تھے۔ اس کا انہماک دیکھ کر خالو بول پڑے۔

''روم ذرا چھوٹا ضرور ہے مگر اس کی capicity بہت ہے۔ دیکھتے نہیں ہو کہ اس نے اپنے اندر کیا کیا سمیٹ رکھا ہے۔''

'' کچھ الیکٹرونک گڈس تو ابھی ڈبّوں میں بند ہیں۔ بچّوں کو فرصت ہی نہیں ملتی کہ کھول کر انھیں سجا دیں'' خالہ بھی بول پڑیں۔

صفیہ کے نہ آنے سے اس کی الجھن تو دور ہو گئی تھی مگر یہ توقع موجود تھی کہ وہ آئے گی اور اپنی غلطی پر شرمندگی کا اظہار کرے گی اور خالہ بھی اس کی اُس حرکت کی صفائی دیں گی۔''

اس نے جب بتایا کہ اس کا جامعہ سے ریسرچ کرنے کا ارادہ ہے تو خالہ بولیں،

''یہ تو اچھی بات ہے کہ تم نے ایم۔ اے۔ کر لیا اور اب جامعہ میں پڑھنا چاہتے ہو مگر کم بخت اس یونی ورسٹی کا برا حال ہو گیا ہے۔ داخلہ بڑی مشکل سے ملتا ہے اور نئے وی سی اتنے سخت ہیں کہ کوئی کسی کی سفارش بھی نہیں سنتا اور اگر کسی

طرح داخلہ مل بھی گیا تو ہاسٹل نہیں ملتا۔ بڑی مصیبت کا کام ہے یہاں پڑھنا بھی۔" خالہ نے ایک عجیب سے اضطراب کے ساتھ یہ جملے ادا کیے۔

یکا یک اُس کی آنکھوں کے سامنے ابّو کا وہ خط کُھل گیا جو خالو کے نام لکھا گیا تھا اور جواب تک اُس کی جیب میں پڑا ہوا تھا:

بھائی جان! آداب

ہماری دلی خواہش ہے کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ اشفاق اللہ کی تربیت بھی ہو جائے۔ اس کام کے لیے جامعہ سے بہتر جگہ اور کون سی ہو سکتی ہے اور وہاں آپ کی سرپرستی بھی حاصل ہو جائے گی۔

کوشش کیجیے گا کہ ہاسٹل میں جگہ مل جائے۔ نہیں تو کچھ دنوں کے لیے آپ کو زحمت کرنی پڑے گی۔ اشفاق اللہ ذرا شرمیلا ہے وہ اس بابت خود سے کچھ نہ کہہ سکے گا اس لیے یہ بات میں آپ کے گوش گزار کر رہا ہوں۔

آپا کو سلام اور بچّوں کو پیار۔

فقط والسّلام

آپ کا بھائی

نعیم اللہ

"ہمیں پتا ہے خالہ! اسی لیے تو ابّو نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کچھ دنوں تک میں کرائے کے مکان میں رہوں۔ بعد میں کوئی مکان، میرا مطلب ہے فلیٹ خرید لیں گے۔ تب تک چھوٹے چچا کا بیٹا عرفان اللہ بھی میٹرک کر لے گا اور اس کا بھی داخلہ جامعہ میں کرا دیا جائے گا۔" بغیر کسی توقف کے وہ فوراً بول پڑا۔

اس کا یہ جملہ سُن کر خالہ بولیں:

"نعیم کا یہ فیصلہ بہت اچھا ہے" خالہ کے لہجے میں اضطراب کی جگہ اطمینان نے لے لی تھی۔

خلیل صاحب جو کسی خیال میں کھوئے ہوئے تھے جھٹ سے وہ بھی بول پڑے۔

"تمہارے ابّو کا یہ فیصلہ واقعی بہت اچھا ہے۔ ان سے بولنا کہ ہماری جو نئی بلڈنگ بن رہی ہے اس میں جلد سے جلد ایک فلیٹ بک کرا لیں۔ ابھی گنجائش ہے۔ بعد میں مشکل ہو جائے گی۔ اس وقت مناسب ریٹ میں بھی مل جائے گا۔ اچھا اشفاق میں تو چلوں گا ایک زمین کے سودے کے سلسلہ میں کسی سے ملنا ہے۔ اپنے ابّو امّی کو میرا سلام کہنا۔ پھر خالہ سے مخاطب ہو کر بولے،

"اسے نئی بلڈنگ کا ایک بروشر ضرور دے دیجیے گا۔ چلتا ہوں"

خلیل صاحب ایک دو قدم آگے بڑھ کر اچانک پیچھے پلٹ آئے اور اسے مخاطب کرتے ہوئے بولے،

"اشفاق! یہ تو بتاؤ کہ تمہارے بس اڈّے والے مکان میں کون رہ رہا ہے؟ اب تو وہ کافی بوسیدہ ہو گیا ہوگا؟"

"ہاں کافی خستہ حالت میں ہے۔ اوپر کا حصہ خالی ہے۔ نیچے ایک دو کرائے دار ہیں اور ایک طرف جمو اور اس کے بال بچے رہتے ہیں۔ وہی مکان کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔"

"کرایا تو بہت nominal آتا ہوگا؟"

"ہاں بہت ہی کم۔ دادا کے جان کے زمانے میں جو کرایہ تھا وہی آج بھی ہے۔"

’’تم لوگ کرایہ بڑھاتے کیوں نہیں؟‘‘
’’ابّو کہتے ہیں کہ کیا بڑھانا۔ ہمارے گھر میں کچھ بے گھر لوگوں کا خاندان پل رہا ہے، یہ احساس ہی ہمارے لیے کافی ہے۔‘‘
اس نے اپنے ابّو کی سوچ اور ان کے رویے کو دہرادیا۔
’’تمھارے ابّو غلط سوچتے ہیں اتنی اچھی جگہ۔ پر اور اتنا بڑا مکان یوں بے مصرف پڑا ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انھیں اس کے متعلق کچھ اور سوچنا چاہیے۔ اچھا، اس سلسلے میں خود کسی دن آ کر ان سے ملتا ہوں۔ اچھا اب میں چلوں گا خدا حافظ۔‘‘
خلیل صاحب کمرے سے نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی خالہ اٹھیں اور سامنے کی الماری کے پاس پہنچ گئیں۔
خلیل صاحب خدا حافظ کہہ کر جا چکے تھے۔ خالہ بروشر لانے کے لیے اُٹھ گئی تھیں لیکن اُسے صفیہ کا اب بھی انتظار تھا۔ اسے پتا نہیں کیوں یقین سا تھا کہ وہ آئے گی اور شرمندگی کا اظہار کرے گی۔ ممکن ہے شرمندگی کی وجہ سے ہی وہ نہ آ رہی ہو۔ اس کے دل کے کسی کونے سے آواز اُبھری۔ اپنی اس سوچ پر اسے قدرے اطمینان محسوس ہوا۔
خالہ الماری کے پاس سے لوٹیں تو ان کے ہاتھ میں چکنے پیپر کا ایک چھوٹا سا کتابچہ تھا۔ وہ اس کتابچے کو اس کی طرف بڑھاتے ہوئی بولیں۔
’’لو، یہ بروشر رکھ لو اور اسے اپنی بنّو خالہ کو بھی دکھلا دینا کہ وہ بھی ایک فلیٹ بُک کرالے۔‘‘
ہاتھ میں بروشر لیتے ہی اس کے سامنے خالو کا وہ سائڈ سمٹ آیا جس کی طرف پارکنگ ایریا والے بزرگ نے کچھ دیر پہلے اشارہ کیا تھا اور جس کا نقشہ اس وقت اس بروشر میں بند تھا۔
اس کے دیدوں میں اینٹ، پتھر، ریت اور سمینٹ کا ڈھیر لگ گیا۔ کچھ دیر بعد پارکنگ والے بزرگ بھی ابھر آئے اور ساتھ ہی ان کا یہ جملہ بھی:
’’تنگی نے مجھے اس پارکنگ میں پہنچادیا ہے۔‘‘
اُسے محسوس ہوا جیسے تنگی نے وسعت پالی ہو اور اس پارکنگ ایریا میں کچھ اور کرسیاں پڑ گئی ہوں۔

☆......☆......☆

ڈھول بگولا

طاہرہ اقبال

کھنڈرات میں اُڑتی دھول کو رازی نے دونوں نتھنوں سے ڈِیک لگا کر سونگھا، خشک گرم مٹی کی مہک پھیپھڑوں میں کھانسی بن کر اُترتی جیسے کچرے کے ڈھیر میں دفن دیسی شراب کے پُرانے مٹکے کے منہ پر بندھی بوسیدہ دھجی اچانک کھل گئی ہو۔ دھواں چھوڑتی بھاپ اُڑاتی غٹ غٹ اُبھرتی ہوئی کچی دھول سے اُٹھتی گرم لو کے مٹکیے جالے تانتی سُرمئی بھاپ۔

"ہزاروں برس پرانی اس مٹی کو پھپھوندی کیوں نہیں لگتی۔ کیڑے نہیں کھا جاتے۔ ایک یہ انسان کی مٹی کہ ذرا جان نکلی نہیں کہ گلنے سڑنے لگی۔ بدبو مارنے لگی، پھر یہی سانس لیتی مٹی تعفن زدہ بے جان انسانی مٹی کو خود میں سمو لیتی ہے۔"

اس صدیوں پرانے متبذل فلسفے پر راستی نے سورج کی بھٹی میں بھن بھن روڑ بنی مٹی کو مٹھی میں بھر کر اُچھالا۔ نتھنے اور پلکیں بھر گئیں۔

"رازی! اس پھٹیچر حقیقت میں تمہاری invention کیا ہے۔ بھلا۔۔۔"

راستی نے نازک ہیل والے اٹالین جوتے کو ہزاروں برس پُرانے ملبوں کے اُونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان گھومتی پٹڑی پر ٹک ٹک بجایا جو دھول میں بُری طرح لتھڑ چکا تھا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ رازی یوں ہونڈا اکارڈ کا رُخ یکبارگی موڑ دے گا ہنی مون کے رستے میں پڑنے والے ان صدیوں پرانے کھنڈرات کی سیر کرنے کو وہ چلے آئیں گے۔

"ہم بھی عجب فطرت لوگ ہیں کہ بار بار عبرت سے دوچار ہونا چاہتے ہیں۔ سیر کرنے کو بھی مزاروں اور کھنڈروں کا انتخاب کرتے ہیں یعنی آبادی کے آغاز میں بربادی کا نظارہ۔ ہنی مون کو بھی عبرت کی دھول چٹا کر Celebrate کرتے ہیں۔"

"ہسٹری ڈارلنگ ہسٹری۔ انسان کی ڈھٹائی کی ہسٹری بکھری پڑی ہے۔ ان آثاروں میں یعنی انسان بھی قدرت سے آڈا لگا بیٹھا ہے، کہتا ہے تو برباد کر میں آباد کروں گا تو اُجاڑ میں بساؤں گا۔ اگر انسان اس قدر ڈھیٹ فطرت نہ ہوتا تو کب کی یہ انسانیاتی دُنیا تمام ہو چکی ہوتی۔۔۔"

کتنی جنگوں، قحطوں، زلزلوں، سیلابوں، طوفانوں نے نسلِ انساں کو نیست و نابود کر ڈالنے کی ٹھانی لیکن یہ ضدی فطرت ہر بار نئی تعمیر بنا بیٹھا۔۔۔"

راستی نے سوچا بالکل تم جیسی ضدی فطرت رازی جو نئی زندگی کے آغاز میں اختتام کا نظارہ کرنے کی ضد لے بیٹھا۔ کتاب زندگی کے بے شمار صفحے اُلٹے بنا آخری صفحے کو پڑھنے کی ضد ایک نان رومنٹک شخص اور اس قدر رومنٹک ضد۔۔۔"

اس نئی نئی آبادی کا آج پانچواں روز تھا۔ اس لیے پہلا پہلا لحاظ اچھا تاثر بنانے والا صبر ان کھنڈرات میں اُترنے پر اُسے مجبور کر گیا تھا۔ وہ جس لباس، جوتوں اور میک اَپ میں آراستہ و پیراستہ تھی وہ نیویارک میں اُترنے والی اُس لگژری فلائیٹ کے لیے ہی مناسب تھا، جہاں اُن کے ہنی مون کے لیے لگژری اپارٹمنٹ بک تھا۔ اس سڑی ہوئی گرمی اور بھربھری دہکتی بوڑھی دھول میں لپٹا ہوا یہ مدفون شہر بیچ میں نجانے کیوں آن پڑا تھا، جہاں موئی مردہ زرد رو اینٹوں کی بنیادیں اُن تعمیروں کا نقشہ بنا رہی تھیں جو کبھی عظیم الشان رہی تھیں، جن کا ملبہ اب اُٹھی پر ڈھیر تھا، جس میں سے کار آمد چیزیں اُٹھالی

گئی تھیں یا چرالی گئی تھیں یا شاید میوزیم کے شوکیسوں میں سجادی گئی ہوں۔

رازی اس پانچویں دن کی دُلہن کی بے زاری بھانپ چکا تھا، جو شاید اب انھی بھربھری بنیادوں کی طرح اپنا ملبہ اُس پر اندھانے والی تھی۔

''بس تھوڑی دیر ڈارلنگ، ذرا کھوئے ہوؤں کی تلاش میں نکلیں، زوال کے دائمی پرت پھرولیں شاید کسی پنے پر ہمارا نام بھی لکھا ہوا ملے۔ اس زندگی کا تماشا کریں جس کی رگِ جاں منقطع ہوئے صدیاں بیت گئیں لیکن جس کی مٹی ابھی بھی دھڑکتی ہے۔ نسلوں کا فوسل، اَن گنت سانسوں کی گرمی۔۔۔ یہ صدیوں پُرانی مٹی کتنی زندہ اور اِشتہا انگیز ہے۔ کچھ بھی ہڑپنے کو اُڑتی، بجھتی، اُگلتی، نگلتی ''انی'' مچارکھی ہے اس نے۔۔۔''

راستی نے بے زاری سے تاریخ کے منہدم آثاروں پر نگاہ دوڑائی جنھیں خاردار تاروں کے جنگلے نے لپیٹ رکھا تھا۔ اُس کی نگاہ کے تار سے بندھا گارڈ کھینچا چلا آیا۔ حفاظتی تار ہٹا کر اُنھیں کھنڈرات کے اندر داخل ہونے کی دعوت دی۔ راستی کی اٹالین، ہیل کچی دھول میں سٹریپ تک دھنس گئی۔ دھول مٹھیاں بنا بنا معطرا سٹریٹ ہوئے بالوں پر بیٹھنے لگی۔

تاریخ کی قبر کا مجاور، وقت کی اندھائی ہوئی مٹی کی ڈھیری کا سوداگر اب اپنے مال کی خوبیاں بڑھا چڑھا کر پیش کرے گا جو کبھی اس کا حصہ نہ رہا تھا وہ فسانہ بھی شامل کرلے گا یہ تاریخ بھی کسی ناچنی جیسی نا۔۔۔ ہر کوئی اپنی تال پر جسے نچوانے لگتا ہے اپنے اپنے شوق کے گھنگھروا سے پہنالیتا ہے۔

''سر! یہ اناج کی منڈی ہے۔۔۔''

یعنی یہ جو گول چبوترے پکی اینٹوں سے بنے ہیں۔ ان پر بیر گکڑیاں، چبڑ پیلوھوں، ہندوانوں کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ کنک، جوار، موٹھ اور چھٹی کے عوض یہاں مٹی اور دھات کے زیور بکتے تھے۔ ایک کھیس کے بدلے ایک ٹوپا موٹھ، گیہوں کی سرساہی کے بدلے تانبے کا چوڑا، مردوں کو دفنانے والے مٹکوں کی بڑی مانگ تھی۔ لوگ زیادہ مرتے تھے نا سر! آج والے علاج تو تھے نہیں۔۔۔ اس بازار میں کئی کارخانے چلتے تھے۔ ادھر بڑھئی چرخے بیلنے ہل پھالے گھڑتے تھے اُدھر کھڈیاں تانیاں لگی ہوتی تھیں۔ لوہا پگھلانے والی بھٹی یہاں دہکتی تھی۔ اُدھر چاک پر چڑھے مٹکے اور رکابیاں آویاں اور اینٹوں والے بھٹے دھواں دھکاتے تھے۔ ہر پاسے لہریں بہریں، رونق میلا، بیجا بیجا۔۔۔''

''یار تو بھی ادھر ہی کہیں دُکان داری کرتا تھا کیا کس شئے کے عوض کونسی سوغات بیچتا تھا تو۔۔۔''

آہنی تاروں میں مقید آثاروں کے قلب سے مٹی کا بگولا اُٹھا جو کھتک کے بھاؤ بتاتا رازی کے جملے کا اگلا حصہ ہمراہ لے اُڑا، انھی کھنڈرات کے ہم سن کھوکھلے تنوں والے ون اور لمبی لمبی جڑوں والے باریش بڑ گھمائیں بنائے، پرانی کہانیوں کی جگالی کرتے تھے، جن کے اندر چمگادڑیں اُلٹی لٹکتی تھیں۔ اوکاں ون اور جنڈ کے ٹیڑھے میڑھے درختوں کی گھاؤں میں بنے سیمنٹڈ بینچوں پر مضافاتی عورتیں بوسیدہ کرتے اُٹھائے یا گلے کے بٹن کھولے بچوں کے منہ میں چھاتیوں کے نپل ڈالے چنگیریں اور چھکو بناتی تھیں۔ کھجور کے پتوں اور گندم کے ناڑ کو گہرے لال، ہرے، گوڑھے نیلے، کالے رنگوں میں اُبال کر یوں بنتی کرتیں کہ سفید ناڑ میں رنگیلے پھول کھل اُٹھتے۔ اپنے بڑے بچوں کو اُن کے پیچھے لگا کر خود بے نیازی سے اپنے کام میں مصروف تھیں۔ بہتی ہوئی سنک ٹخنوں تک جھولتے میل میں اکڑے ہوئے کُرتے دس گیارہ برس کے یہ لڑکے جنھیں تہمد یا شلوار پہنانے کی ابھی عمر نہ آئی تھی، جن کا ستر گاڑھا دبیز دھول کا گولا تھا جو گھورے بناتے اُن کے ننگے پاؤں سے اُٹھتا اور رنگ اُڑے دھوپ کھائے بالوں کے چھتے تک تن جاتا تھا، لیکن چار پانچ برس کی یہ دراوڑی نقوش

والی لڑکیاں جن کے سروں پر کسی اوڑھنیاں اُن کے چیکٹ بالوں سے یوں چپکی تھیں کہ تیز ہوا کے جھونکے دھول کے غبار اُن کے پیچھے بھاگتے دوڑتے ایک دوسرے سے دھینگا مشتی کرتے بھی دوپٹہ اپنی جگہ سے کبھی سرکا نہ سکے تھے۔ راستی کو لگا جیسے یہ مخلوق بھی صدیوں پرانے ٹیلوں کی کھدائی کے دوران برآمد ہوئی ہے کہ پانچ ہزار برس پہلے جس شکل میں ہڑپہ کی ابتدائی بستیوں میں پیدا ہوئی تھی۔ آج بھی اس ناک نقشے کے تسلسل کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ پھیلی ہوئی پھینی ناکیں، موٹے ہونٹ، سیاہ رنگتیں، کوتاہ ماتھے اور قامتیں اور بڑی بڑی چھاتیاں، زرد دانت، موٹے کالے جھنگ بال، ہڑپہ کی آبائی مخلوق جیسے پانچ ہزار سال پرانے کھنڈروں سے نکل کر اس تباہ حال بستی میں اِستراحت کرتی ہو۔ دُنیا کی قدیم نسل جو اسی قدیم ترین مٹی کی تخلیق ہے۔ صدیوں کی تیز دھوپ میں گندھی ہوئی رنگ اُڑی سانولی مٹی تہ در تہ پرت در پرت پانی کی سطح پر چھت بنی ہوئی مٹی جس میں سے ون کیکر اوکاں جنڈ پھلائی خود رو درخت پھوٹ پڑے تھے۔

درختوں کی ٹھنڈی غاروں میں گرم دوپہر کاٹتی ان مضافاتی عورتوں نے اپنے ننگ دھڑنگ بچے اُن کے پیچھے لگا رکھے تھے۔ میلے کچیلے دراوڑی نقوش والے بھک منگوں کا غولِ بیابانی، گائیڈ کی کہانیوں کی پکی گواہیاں، جیسے ان کے استقبال کے لیے ہزاروں برس پرانی نیند سے ہڑبڑا کر مٹی کے مدفونوں سے مادرزاد نکل آئے ہوں اور اب رقصِ مقابر کا مقابلہ جاری ہو۔

راستی نے بیگ میں سے اِمپورٹڈ مشروب کی بوتل نکال کر ایک سانس میں آدھی پی اور باقی آدھی ایک بھوتنے کی سمت اُچھال دی۔ صدیوں کی پیاسی اس مخلوق پر جیسے آریاؤں نے ہلّا بول دیا ہو۔ دھول آسمانوں کو چڑھی، بوتل بیچ میں اندھائی۔ ہڑپہ کی ہزاروں برس قدیمی بھربھری پیاسی مٹی پل بھر میں سارا مشروب چوس گئی۔ پانچ ہزار سال کے پیاسے ہونٹ لپ لپ کھول دیئے۔

یہ دراوڑی نقوش والی بھوتیا مخلوق جب بوتل پر ڈھیر تھی تو اس وقفے میں وہ اُمراء کے محلّات کے آثاروں میں نکل آئے تھے۔

''سر یہ بڑی حویلیاں اور محلّات غریب محلے سے کافی دُور واقع ہیں۔ وہ اُدھر جہاں چھوٹی اور تنگ کمروں کی بنیادیں موجود ہیں وہاں غریب غربا رہتے تھے، جن کے مکان تھے تو پکی اینٹوں کے لیکن تنگ وتاریک اور افرادِ خانہ زیادہ ہوتے تھے۔ امیروں کی حویلیاں دو منزلہ روشن کھلی اور ہوادار تھیں اور افرادِ خانہ کم تھے۔ ایک امیر کی خدمت گزاری کے لیے دس غریب درکار ہوا کرتے تھے۔ کنویں سے پانی کھینچنے ''کھار'' مل مل نہلانے کپڑے دھونے جوتے بنانے محل کی صفائی کرنے کو بہت سے نوکروں کی ضرورت رہتی تھی۔ ایک محل کی چاکری کے لیے پورا غریب محلّہ کام آجاتا تھا۔''

رازی اس ازلی فلسفۂ تفریق کی بازخوانی سے اُکتا گیا۔

''یار تمہارا مکان بھی یہیں کہیں ہوتا تھا یہ چھوٹا سا مکان تمہارا ہی تو نہیں۔۔۔''

ذرا سا بگولا سو بل کھاتا کئی منزلہ مکان کی صورت اُن تینوں کو لپیٹ گیا۔

''نہیں سر یہ تو لوہا پگھلانے والی بھٹی تھی یہاں سکے ڈھالے جاتے تھے۔۔۔''

گارڈ نے دھول کے تپتے غباروں میں اپنی معلومات کا رُعب پورے اعتماد سے جھاڑا۔۔۔

''سکے؟ لیکن یہاں تو تم لوگ بارٹر کا لین دین کرتے تھے۔۔۔''

''جی سر! لیکن ادھر مینجو میں سکوں کے بدلے بھی چیزیں بکتی تھیں، ان سکوں کی قدر آج کے روپوں کے برابر ہی تھی۔۔۔''

''ان روپوں کے برابر۔۔۔''

رازی نے جیب سے چند نوٹ نکالے۔
''لے اور اب اپنی دُکان بڑھا لے جا۔۔۔
ہمیں اکیلا چھوڑ دے۔۔۔''
رازی کے کرخت لہجے نے ہڑپہ کے مدفونوں کے رکھوالے کو پرے دھکیل دیا، جہاں کھدائی شدہ آثاروں سے بھاپ کے سُرمئی بادل اُٹھتے تھے جیسے یہ آثارِ قدیمہ کسی بڑے سے تنور پر چڑھے اُبلتے ہوں، کڑھتے ہوں اور بھاپ بن تحلیل ہوتے ہوں۔
رازی کو احساس ہو چکا تھا کہ ہنی مون سے پہلے والا لحاظ اب اس نئی نویلی دُلہن کے لیے برقرار رکھنا مشکل ہو رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ گارڈ پھر اُچھل پڑے اور کہے۔
''ایسے ہی سر بالکل ایسے ہی اُس وقت بھی میاں بیوی میں ایسے ہی جھگڑا ہوا کرتا تھا۔ تب بھی عورت مرد پر ایسے ہی حاوی تھی جیسے اس نئے دور میں حاوی ہو رہی ہے۔
راستی کو لگا بدن پر چھڑکا قیمتی پرفیوم پسینے میں رچ رچ میل بن رہا ہے۔ اُسے احساس تھا کہ جب وہ اے۔ سی گاڑی میں بیٹھے گی تو یہ پسینہ اُس کے بدن کی خوشبو چُرا کر بدبو بن چکا ہوگا۔
شادی کے آج پانچویں روز وہ اپنے نفاست پسند شوہر کے پہلو میں بدبو میں سنی ہوئی تو نہ بیٹھ سکتی تھی۔ وہ گھنے جھنڈ میں چھپی سنگی۔ بینچ پر پسینہ سکھانے اور ستانے کو ٹک گئی۔ ون کی گہری چھاؤں میں ہوا سرسرانے لگی، جس کے کثیر الشاخی تنے پر بے شمار نام کھدے تھے۔ گرم دھول کے گھونٹ بھرتی صحرائی ہوا جھنڈ کی کچھار میں اپنے جلتے وجود کو جیسے ٹھنڈا کرتی ہو۔ ٹیلے کے گرداگرد لٹکتی لمبی لمبی باریش شاخیں بینچ کے گرد چلمن سی تانے تھیں۔ وہ پرس سے نیل کٹر نکال کر پہلو بہ پہلو نام گودنے لگی۔
رازی راستی۔
''ہم دس برس بعد پھر یہاں آئیں گے اور اس تنے پر کھدے اپنے ناموں کو تلاش کریں گے کہ کھردرے چھال نے ہمارے ناموں کو اُگل دیا کہ جذب کر لیا یا پھر ثبت رہنے دیا۔''
راستی نے مدفونوں پر چکراتے دھول کے غباروں میں سے کئی برس آگے جھانکنے کی کوشش کی۔۔۔
بے شمار ناموں کے ہیولے کثیر الشاخی تنے پر منڈلانے لگے۔
''ہاں آئیں گے اپنے بچوں کے ہمراہ آئیں گے۔۔۔''
رازی کو عجب خیال سوجھا تھا۔ دھول کے دبیز پردوں میں سے دس برس آگے کا زمانہ جھلملانے لگا۔
''چلو لگے ہاتھوں ان ہونے والے بچوں کے نام بھی یہاں گُرید دو۔ شاید اُس وقت ہمیں سوچ و بچار کی فراغت میسر نہ ہو۔ میں اپنے بزنس اور تم اپنی کٹی پارٹیز میں بے طرح اُلجھ چکی ہو۔۔۔''
مدفونوں کے قلب سے اُٹھتا بگولا ناموں والے تنے پر سوار ہو گیا۔ راستی کی گھنی پلکیں چھوٹے چھوٹے تنکوں سے بوجھل ہو گئیں جیسے ناموں والے سارے ہیولے اپنے اپنے ناموں کی حفاظت کے لیے درخت کے گرداگرد منڈلانے لگے ہوں کہ کہیں اُن کے مٹتے ہوئے ناموں پر نئے نام نہ چڑھا دیے جائیں۔
''ایک نام تم لکھو ایک نام میں لکھتا ہوں تا کہ آئندہ ناموں کے اختلاف میں اُلجھ کر ہم اپنا قیمتی وقت برباد نہ کریں۔ یہ مشکل کام آج فراغت کے لمحوں میں نمٹا ہی لیتے ہیں۔۔۔''

اس رازی کے بچے کو بھی ناہر کام بے موقع سوجھتا ہے۔ اچانک اچنبھا، ناوقت سرپرائز اور اب یہ یک دم، اچانک ہمکتے، کلکاریاں مارتے دو بچے راستی کی سمت بے اختیار بڑھے تھے۔ گورے چٹے تیکھے نقوش والے اس مدفون بستی کے ہومیوار ٹیک خدوخال سے بالکل مختلف کچھ کچھ آریاؤں کے ہم شکل۔۔۔

''پہلے تم لکھو۔''

بچوں کے نام والا آئیڈیا راستی کو قبل از وقت لگا۔ اُسے فیصلہ کرنے میں تھوڑا وقت درکار تھا۔ ایسا اہم فیصلہ ایسے جذباتی لمحوں میں تھوڑی ہوا کرتا ہے۔ مستقبل کی نسل کو نام دینا انتہائی سنجیدگی اور سوچ وبچار کا تقاضا کرتا ہے آخر ان ناموں نے ان کے اپنے ناموں کے تسلسل کو بڑھانا ہے۔

لیکن رازی نے نام کریدنے میں پل بھر کا بھی توقف نہ کیا۔

''حوا۔''

''اُف اتنا پرانا نام۔۔۔''

راستی نے جنڈ کی کھردری بوڑھی چھال میں سے اُترتے ہلکے زرد رنگے سفوف کی تازہ تازہ مہک کو سونگھا، نومولود نام کو ہاتھ کی کٹوری سے ڈھانپ دیا جیسے ان آثارِ قدیمہ کی ویران وحشتوں سے اپنے نوزائیدہ کو محفوظ کر رہی ہو۔

''حوا'' پرانا کہاں سدا رہنے والا نام ''حوا'' جب تک نسلِ انسانی چلتی رہے گی یہ نام پرانا نہیں ہو سکتا۔۔۔ تم بھی تو حوا ہو۔۔۔ یہاں ان کھنڈروں میں نجانے کتنی حوائیں فاسفورس ہو چکیں، یہاں تمہارے قدموں میں اس ٹیلے کے نیچے۔۔۔''

راستی نے اس کے ہاتھ سے نیل کٹر چھینا۔

ابھی ہم فوسل نہیں بنے مسٹر۔۔۔ ابھی ہم زندگی کی شروعات کرنے جا رہے ہیں۔۔۔ تم تو نا رازی ازل اور ابد کے قلابے یوں ملا دیتے ہو جیسے درمیانی وقفہ بس اس دھول بگولے جیسا جو آسمانوں کو چڑھا جاتا ہے۔

''حوا''

حرف رازکی سرگوشی کی نسبت لبوں کی گرمی نے راستی کے گال تپا دیئے۔

دیکھو وہ دراوڑی بھک منگیاں دیکھ رہی ہیں جیسے میوزیم کی الماریوں میں بند مٹی کی مورتیاں بٹ بٹ گھورتی ہوں۔''

راستی درخت کے چھال اُترے ملائم حصے کو گودنے لگی۔ پرانے تنے کا ارادہ ترخے ہوئے چھال پر اٹکنے لگا۔ ''آدم'' آدم کا مدخشک تنے پر کریدنے میں کچھ وقت لگا۔ بار لیش شاخوں سے اُلٹا لٹکی چمگادڑیں چیں چیں کی ہنگامی آوازیں نکالنے لگیں، جیسے اپنی جاتی کو کسی خطرے سے آگاہ کر رہی ہوں۔

دھول بگولے ٹوکریوں کی ساخت اوڑھے بوسیدہ اینٹوں کی بنیادوں پر شتاپو کھیلنے لگے، جیسے ہڑپہ کی مضافاتی عورتیں ٹکلیں لپیٹے گدا ڈالتی ہوں۔ یہ گپھائیں بنائی ہی اسی لیے ہیں قدرت نے کہ بے اختیار حوا اور آدم یہاں پیار کر سکیں۔۔۔

شفاف گردن کی صراحی سے لبوں کے پیالے گھونٹ گھونٹ پیاس بجھانے لگے۔ چمگادڑوں کے سائرن اُسی رفتار سے بڑھنے لگے۔ اندھی مخلوق جن کے تھنوں سے ذرا ذرا بچے چپکے تھے۔

''بو ہو چکی ہے یہ گردن ابھی نہیں۔۔۔''

دھول کا پھکا اُڑ کر دانتوں تلے کرچ بن گیا۔

راستی گرفت سے چھٹنے کو مچھلی سی تڑپی۔

اُسے دوسرا نام گرید نا تھا۔ ''حوا'' کتنا نامکمل اور ادھورا ادھورا لگ رہا تھا جس کی تکمیل آدم کو کرنا تھی۔

لبالب لبوں کے پیالے سے قطرہ سا ٹپکا۔

''آدم''

''دراصل اس نسل انساں کے یہی دو نام ہیں

''حوا اور آدم''

جیسے بکری اور بکرا، جیسے چڑیا اور چڑا جیسے مچھلی اور مچھ۔۔۔ یہ انسان بہت خود پسند ہے۔ اپنا ذاتی نام اور شناخت چاہنے لگتا ہے۔ اِسی لیے مرتا ہے چوپائے چرند پرند کبھی نہیں مرتے۔ انسان بھی سدا جیتا ہے مرتا وہ ہے جو عیسیٰ، موسیٰ، داؤد بن بیٹھتا ہے، سکندر، ہٹلر، افلاطون کہلانے لگتا ہے، پھر وہ مرنے لگتا ہے مثلاً اگر رازی مر گیا تو تمہیں تکلیف ہوگی۔

کیونکہ تم رازی ڈھونڈو گی۔ آدم نہیں آدم بہت ہوں گے پر رازی ایک ہی ہوگا۔''

''رازی میں تمہیں سچ میں مار ڈالوں گی۔''

"I Kill you."

وہ اُس پر جھپٹی۔ کوا اور کوی اپنے گھونسلے سے نکل کر پرواز بھر گئے۔ چڑیا اور چڑا بے نیازی سے اپنی نسل بڑھانے کے عمل میں مصروف رہے۔ رازی گھوم کر تننے کی دوسری سمت بڑھا پیروں تلے ٹیلے کا بھربھرا کنارہ یکبارگی اپنی ہی بنیادوں میں ڈھ گیا۔

بوسیدہ مٹی کے غباروں میں لپٹا رازی اسی منہدم ٹکڑے پر سوار کہیں نیچے ہی نیچے اُترتا چلا گیا۔ ایسے ہی جیسے کبھی یہ عالیشان شہر اپنی بنیادیں چھوڑ کر مٹی میں اُترتا چلا گیا تھا۔

اُمراء کے محلے میں ترتیب سے اُوپر نیچے رکھی اینٹوں پر بج کر کھوپڑی یوں پھٹی تھی، جیسے کوئی کھکھری پتھر پر مار کر دو ٹکڑوں میں چیر دی جائے۔ سفید بُراق قیص پر سفید دندانے دار مغز کے لوتھڑے چپکے تھے جیسے خربوزے کے بیج بکھر کر چپک گئے ہوں، جس پر دھول کی ڈھیریاں جم رہی تھیں۔ انسانیاتی تمدن کے آبائی آثاروں پر ناچتا اُنھی کا ہم سن بگولا دیوانہ وار لپکا تھا۔ سوسو بل کھاتا کتھک کے بھاؤ بتاتا رازی کو گھیر چکا تھا۔

''رازی''

سمیٹڈ پٹڑی پر اُونچی اتالین ہیل پر راستی دوڑتی چلی گئی۔ بر بینڈ ڈ شوز کے نازک سٹریپ ٹوٹ گئے۔ دھول سے لتھڑے ہوئے تڑخے ہوئے جوتے جیسے اُنھی کھنڈروں کی کھدائی میں سے نکلے ہوں۔ دراوڑی نقوش والیاں چہروں پر بدبودار اوڑھنیاں ڈالے بین کرتی تھیں، جیسے ہڑپہ کے کھنڈروں سے نکلی سُرخ مٹی کی اوّلین انسانی نقوش والی مورتیاں ازلی و اَبدی فلسفۂ کائنات کا دُکھ روتی ہوں۔۔۔

چڑیا اور چڑا۔ کوئل اور کوا

راستی اور رازی۔۔۔

دھول کے خیمے اپنی میخیں مضبوطی سے گاڑے ہوئے تھے جن پر سے مٹی کے باوے ٹاپ رہے تھے۔

☆......☆......☆

خارزار

محمد الیاس

جہاز سے اُتر کر طارق محمود، اس کی بیوی، ماضی کی کیتھرین اور حال کی آمنہ، ان کی آٹھ سالہ بیٹی آتکہ اور دس سالہ حمنہ نے اپنے خوابوں کی سرزمین پر بسم اللہ پڑھ کر قدم رکھے اور کلمۂ شکر ادا کیا۔ ماں بیٹیوں نے عین شریعت کے مطابق، عبایہ اور حجاب سے اپنے بدن اور چہرے چھپا رکھے تھے۔ اِن کے دل جوش اور جذبے سے لبریز ہو گئے۔ تینوں، یعنی بیوی اپنے شوہر اور بیٹیاں اپنے باپ کے آبائی وطن کی زمین پر چل رہی تھیں، جس کے بارے میں طارق محمود کی زبانی اتنا کچھ سن رکھا تھا کہ نہ صرف جانا پہچانا محسوس ہوا کرتا بلکہ ذہنی طور پر اسے ہی اپنا اصل گھر تسلیم کر لیا تھا۔ طویل عرصے سے یہاں آنے کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ ایمان کی روشنی میں یہ باور کر لیا تھا کہ پاک سرزمین پر ہی وہ صحیح معنوں میں دینِ مبین پر عمل پیرا رہ کر زندگی بسر کر سکتی ہیں۔

انٹرنیشنل ایئرپورٹ کے لاؤنج اور باہر پارکنگ میں مقامی خواتین میں سے بیشتر کو جدید لباس پہنے دیکھ کر ماں بیٹیوں کو حیرت ہوئی۔ آتکہ نے مایوس ہو کر باپ سے پوچھ لیا کہ ہماری ان مسلم بہنوں نے چہرے بھی نہیں چھپا رکھے۔ ان کو کسی نے کیوں نہیں بتایا کہ عورتوں کو پردے میں رہنے کا حکم ہے۔ بیٹی کو دوٹوک تشفی آمیز جواب دینے کی بجائے، طارق محمود دُور از کار تاویلیں پیش کرنے لگا کہ کس طرح بعض لوگ نام کے مسلمان ہوتے ہیں۔ اسلامی ملک کے شہری ہوتے ہوئے بھی شریعت پر پوری طرح عمل نہیں کرتے۔ یہ ان کی بدقسمتی ہے اور سچے مومن کا یہی امتحان ہے کہ وہ ایسے معاشرے میں بھی دامن بچا کر چلے۔ جیسے آپ کی والدہ، مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد پوری کی پوری دینِ حق میں داخل ہوئیں، یہ بڑے نصیب کی بات ہے۔ اللہ نے ان کو توفیق دی، انھوں نے اپنا دل و دماغ روشنی سے بھر لیا۔ جس کا باطن منور ہو جائے، اُس کو تاریکی میں بھی راستہ سجھائی دینے لگتا ہے اور خارزار سے دامن بچا کر نکلنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ آپ دونوں بہنوں نے زندگی بھر اپنی والدہ محترمہ کے کردار و عمل کی پیروی کرنی ہے۔

پندرہ برس پہلے دیارِ غیر میں طارق محمود اور کیتھرین کی ملاقات ہوئی تھی۔ دونوں ایک ہی ادارے میں ملازمت کرتے تھے۔ طارق کی مہذب گفتگو، شرافت اور کردار کی مضبوطی نے کیتھرین کو بہت متاثر کیا۔ وہ اُن دنوں تیئس چوبیس سالہ انتہائی پرکشش اور بھرپور جوان خاتون تھی، طارق سے عمر میں صرف ایک ڈیڑھ سال چھوٹی۔ اس عام سے قبول صورت مرد کی محبت میں ایسی گرفتار ہوئی کہ ہر قیمت پر شریکِ حیات بننے کی خواہش کا برملا اظہار کر دیا۔ اس کے ہم وطن دوستوں اور خصوصاً والدین نے حوصلہ افزائی نہ کی، بلکہ تحفظات سے آگاہ کرتے ہوئے اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنے کا مشورہ دیا۔ ماں نے سوال کیا کہ اُسے ایک غیر مذہب کے ایشین میں ایسی کون سی خوبی نظر آ گئی، جو ایسے انتہائی اقدام سے رجوع کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہی۔ ایک عام سے تارکِ وطن کے ساتھ ازدواجی رشتہ جوڑنا درست نہیں۔ کیتھرین نے ماں سے کہا تھا کہ اس نے طارق کی آنکھوں میں جو حیا دیکھی ہے، وہ آج تک کسی مرد میں نظر نہیں آئی۔ اور انسان کی آنکھیں ایسا آئینہ ہوتی ہیں، جس میں اُس کے باطن کا صحیح عکس دکھائی دے جاتا ہے۔ طارق کا باطن بالکل صاف شفاف ہے۔

طارق نے کیتھرین سے مزید چند مہینوں کی مہلت مانگ لی اور اُس کو مشورہ دیا کہ وہ اس عرصہ میں اچھی طرح

سوچ لے۔ مذہب تبدیل کرنے کے ساتھ ہی خود کو یکسر بدلنا پڑے گا، جو اتنا آسان نہیں ہوتا۔ عقیدے کے ساتھ مخصوص ثقافت جُڑی ہوتی ہے، جس کو اپنانا، کڑے مجاہدے کے مترادف ہے۔ شریعت، حدیث، سیرت اور اللہ کی کتاب کے مستند انگریزی تراجم پر مشتمل کُل چار کتب بھی مطالعہ کے لیے دیں، جو اُس نے بصد شوق شکریہ کے ساتھ قبول کرلیں اور بغور مطالعہ کرنے کا وعدہ کیا۔

پہلی ملاقات کے ٹھیک دس مہینے اور تیرہ دن کے بعد کیتھرین نے نئے مذہب اور نئے نام کی شناخت سے شریعتِ محمدیؐ کے مطابق نکاح کرلیا۔ اس نے طارق کے تجویز کردہ مختلف اسلامی ناموں میں سے اپنے لیے ''آمنہ'' ہی پسند کیا تھا۔ آمنہ نے پوری نیک نیتی سے دین اسلام کو قبول کیا اور پوری کی پوری اس میں رنگی گئی۔ عربی صرف اتنی ہی سیکھ سکی کہ کلمے، نماز اور چند آیات، خوب یاد کرلیں۔ البتہ مذہب کا مطالعہ انگریزی کتب کے ذریعے بدستور ذوق وشوق سے کرتی رہی۔ نکاح سے پہلے ہی ملازمت چھوڑ دی اور صحیح معنوں میں خاتونِ خانہ بن کر رہ گئی۔ تقریباً ڈیڑھ سال کے عرصے میں اس قابل ہوگئی کہ روزمرہ کی گفتگو اردو اور شوہر کی مادری زبان میں کرنے لگی۔ پہلی اور پھر دوسری بیٹی پیدا ہوئی۔ دونوں کی تربیت عین اسلامی تقاضوں کے مطابق کی۔ انھیں، مادری اور پدری، دو تین زبانوں میں مہارت حاصل ہوئی۔

میاں بیوی نے خوب غور وخوض کے بعد باہمی مشاورت سے فیصلہ کرلیا کہ بیٹیوں کو عُنفوانِ شباب میں قدم رکھنے سے پہلے ہی اس مادر پدر آزاد معاشرے سے نکال لے جایا جائے، وہاں، جہاں شرم وحیا کے تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھنے کا چلن ہے۔ تاکہ ان کو آئندہ کی زندگی، شریعت کے تابع رہ کر گزارنے کے لیے سازگار ماحول میسّر آسکے۔

گزشتہ پندرہ بیس برسوں میں طارق محمود چند ایک بار ہی مختصر عرصے کے لیے وطن آسکا تھا۔ تاہم بیرونِ ملک سے بھیجی ہوئی رقوم کے عوض، دونوں بڑے بھائیوں نے آبائی شہر کے جدید ایریا میں ایک کنال کے پلاٹ پر کوٹھی تعمیر کروا رکھی تھی اور ٹیکس فری زون میں قائم انڈسٹریل اسٹیٹ میں فیکٹری لگا رہے تھے۔ کوٹھی اس کے نام تھی لیکن اس کی اجازت سے دونوں بھائی مع اہل وعیال اُس میں رہائش پذیر تھے۔ تاہم فیکٹری میں طے شدہ معاہدے کے مطابق نصف کا مالک طارق اور باقی کے نصف میں دونوں بڑے بھائی برابر کے شراکت دار قرار پائے تھے۔

طارق اور آمنہ اس اطمینانِ قلب کے ساتھ وطن لوٹ رہے تھے کہ رہنے کو کشادہ پُرآسائش گھر ہے اور پانچ چھ مہینوں تک فیکٹری سے بھی معقول آمدنی ہونے لگے گی۔ بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم دلائیں گے۔ یہاں اُن کے لیے مناسب رشتے ملنے کا مسئلہ نہیں بنے گا۔ باقی کی زندگی دونوں میاں بیوی سکون آرام سے بسر کریں گے۔ جاری تعلیمی سال اختتام پذیر ہونے کو ہے۔ دونوں بھتیجیوں کو یونیورسٹی بہت نزدیک پڑتی ہے۔ ایم اے کے امتحانات دیتے ہی اُن کی رخصتی ہے۔ دونوں کنبے فوراً بعد کوٹھی خالی کردیں گے۔ بھائیوں نے آبائی گھر کی مرمت اور رنگ روغن کروا کر ٹیلیفون کنکشن بھی لگوا دیا ہے۔ تمام سہولتیں مہیا کردی ہیں۔ وہاں اس چار افراد پر مشتمل کنبے کو صرف تین ماہ کا عرصہ گزارنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔

ایئرپورٹ پر ظہیر اور زبیر بھائی انھیں لینے کے لیے بڑی آرام دہ، نئی جیسی ''لائٹ ایس'' لائے ہوئے تھے، جس میں سارا سامان آسانی سے سما گیا۔ قیمتی والا گاڑی کے پچھلے حصے میں تو باقی کا اوپر رکھا گیا۔ چاروں آسودہ ہوکر بیٹھ گئے۔ بڑے بھائی نے فرنٹ سیٹ سنبھالی اور منجھلا، زبیر ڈرائیونگ کرنے لگا۔ قانون کا احترام کرنا، شروع سے ہی طارق محمود کے مزاج کا فطری خاصہ رہا تھا۔ قواعد وضوابط کی کبھی خلاف ورزی نہ کی اور حق بات پر مضبوطی سے ڈٹ جایا کرتا۔ اپنے ہم

وطنوں کے بارے میں یہ نہ بھولا کہ بندۂ خدا کوئی کوئی اور بندۂ زر اوپر سے نیچے تک ہر کوئی۔ اس مرتبہ بھی کسٹم کلیئرنس کے مرحلے پر چیخ چیخ ضرور ہوئی مگر وہ کسی کے بھرّے میں نہ آیا۔ متعلقہ اہل کار ہاتھ ملتے ہی رہ گئے کہ اتنی موٹی مرغی صرف بلند آہنگ کڑکڑاہٹ پر صاف بچ نکلی۔ طارق کا دل جلنے لگتا کہ اپنے مُلک کے لوگ اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو گئے ہیں۔ ہر جائز ناجائز طریقے سے مال کمانے یا دوسرے کا اُڑانے، کھینچنے اور مارنے کو ہر ہتھکنڈا آزمانے پر ہر دم تیار بیٹھے ہوتے ہیں۔

ان دنوں مُلک کے زیادہ تر حصے سرِ شام ہی دھند کی لپیٹ میں آ جاتے اور جوں جوں رات ڈھلتی، اس میں اتنی شدت آتی کہ چند گز آگے تک کا منظر صحیح طور پر دکھائی نہ دیتا۔ جی ٹی روڈ پر احتیاط سے سفر جاری رہا۔ مہمان مسافر جلد ہی سو گئے۔ ہڑبونگ مچنے اور طارق کی کنپٹی سے ریوالور کی یخ بستہ نالی چھونے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ گاڑی، جی ٹی روڈ کے ایک پرانے متروک ویران ٹکڑے پر لا کر روک دی گئی تھی۔ آمنہ ہڑبڑا کر جاگ اُٹھی اور شوہر کو اسلحہ کی زد پر دیکھ کر اس سے لپٹ گئی۔ پیچھے بیٹھی دونوں بچیاں رونے لگیں۔ ایک پسٹل بردار اگلی سیٹ کا دروازہ کھولے پائیدان پر کھڑا نظر آیا اور تیسرے نے ہُوبہُو اسی طرح ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھول کر زبیر کی گردن پر پسٹل کی نالی رکھی ہوئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے تین بندوں نے سارا سامان اتار کر پیچھے کھڑی پک اَپ میں رکھ لیا۔ طارق کی جیبیں خالی کیں اور تینوں ماں بیٹیوں کے ہینڈ بیگ بھی چھین کر لے گئے۔ ڈاکوؤں نے اُونی مفلروں سے چہرے چھپا رکھے تھے اور اُن کے سروں پر پولیس کی ٹوپیاں تھیں۔ جاتے ہوئے لائٹ ایس کے اگلے دائیں ٹائر کو گولی مار کر پھاڑ گئے۔

بڑے ارمانوں سے نئے وطن کو اپنانے کی غرض سے آنے والی ماں بیٹیوں کو اس صدمے نے دہلا کر رکھ دیا۔ طارق نے گاڑی کی سٹپنی لگتے ہی بھائیوں سے تھانے چلنے کو کہا۔ وہ سمجھانے لگے کہ رپورٹ درج کرانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ بلکہ مزید مالی بوجھ پڑنے کا امکان ہے۔ ضروری نہیں کہ ڈاکوؤں نے پولیس کی جعلی وردیاں پہن رکھی ہوں۔ گویا اُن کے اصل ڈاکو اور اصل پولیس اہل کار ہونے کے امکانات برابر برابر ہیں۔ لہٰذا بہتر ہوگا کہ اس مالی نقصان کو برداشت کر لیا جائے۔ لیکن طارق محمود نہ مانا اور وہ لُٹا پٹا قافلہ تھانے پہنچ گیا۔

ڈیوٹی پر موجود ہیڈ کانسٹیبل نے طارق سے شروع میں چند سوالات کیے لیکن فوراً ہی ساری تحقیق اور تفتیش کا رُخ دونوں بھائیوں کی طرف موڑ دیا۔ طارق کو حیرت ہونے لگی۔ ظہیر، ہیڈ کانسٹیبل سے اُلجھ پڑا اور کہا کہ وہ ایسے سوال کر رہا ہے، جیسے ہم نے ہی اپنے بھائی کو لُوٹا ہے۔ زبیر نے ہیڈ کانسٹیبل کے اس سوال کے جواب میں کہ رات کے وقت، مخصوص پولیس ناکوں کے علاوہ ویران جگہ پر گاڑی کھڑی ہی کیوں کی تو جواب دیا: ''ڈاکوؤں کی پک اَپ بالکل پولیس موبائل جیسی تھی اور وہ تقریباً آدھی سڑک روکے کھڑی تھی۔ تین وردی پوشوں نے گاڑی کے آگے آ کر ٹارچوں سے روشنی ڈالی اور رُکنے کا اشارہ دیا تو میں نے بریک لگا دی......''

ہیڈ کانسٹیبل نے پوچھا کہ اُن دونوں بھائیوں سے ڈاکوؤں نے کیا چھینا؟ زبیر اور ظہیر دونوں نے کہا کہ جو بھی نقدی تھی، وہ انھوں نے لے لی۔ ہیڈ کانسٹیبل نے خود اٹھ کر دونوں کی پوری طرح جامہ تلاشی لی اور دو اہل کاروں کو ہمراہ لیے باہر آ گیا۔ گاڑی کو اندر سے دیکھا اور اگلی دونوں نشستوں کے نیچے جھانکا۔ میٹ اٹھا کر چھوٹا سا دستی بٹوا برآمد کر لیا، جس میں نقد رقم کے علاوہ دونوں بھائیوں کے شناختی کارڈ، زبیر کا ڈرائیونگ لائسنس اور گاڑی کی رجسٹریشن بُک بھی تھی۔ وہ بوکھلا کر متضاد بیان دینے لگے کہ زیادہ رقم دونوں کی جیبوں میں تھی، جو ڈاکوؤں نے نکال لی۔ پرس میں ضروری کاغذات اور دو تین ہزار روپے ڈال کر گھر سے نکلتے ہی احتیاطاً میٹ کے نیچے چھپا دیے تھے، جن کے بارے میں بتانا یاد نہ رہا۔

ایسی گنجلک صورتِ حال پیدا ہوئی کہ طارق محمود کا سر چکرا گیا۔ اُس کو اعتبار نہ آیا کہ بڑے بھائی ہی اس کے خلاف کسی سازش کے مرکزی کردار ہو سکتے ہیں۔ وہ دونوں اس سے شکوہ کرنے لگے کہ اسی لیے پولیس اسٹیشن آنے سے منع کیا تھا۔ یہاں اُلٹا مظلوم کو ہی ظالم بنا دیا جاتا ہے۔ ظہیر نے یک طرفہ فیصلہ کرتے ہوئے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا: ''حوالدار صاحب! ہم نے رپورٹ درج ہی نہیں کروانی۔ آج خود تجربہ کر کے دیکھ لیا۔ پہلے صرف سنا کرتے تھے کہ ہماری پولیس مقتول کے گھر والوں کو ہی شاملِ تفتیش کر لیتی ہے، تاکہ مال بنایا جا سکے......''

حوالدار کچھ زیادہ ہی دبنگ شخصیت ثابت ہوا۔ بول پڑا: ''بالکل صحیح سنتے رہے ہو۔ گھر سے ہی قاتل ثابت بھی ہو جایا کرتے ہیں۔ جیسی رُوحیں ویسے فرشتے۔ جیسے عوام ویسی پولیس۔ یہاں اس مُلک میں سگے باپ اپنے پردیس گئے بیٹوں کو لوٹنے سے باز نہ آئے، تم دونوں تو بھائی ہو اور وہ بھی برادرانِ یوسف۔ پرچہ درج نہ کروانے کی پچیس ہزار روپے فیس دینا ہوگی۔ پولیس وقت ضائع کرنے کے لیے نہیں بیٹھی ہوئی۔ اس کو بہت کام کرنے ہوتے ہیں۔ میں پکی رپورٹ لکھ رہا ہوں......''

وہ براہِ راست طارق سے مخاطب ہوا اور کہا: ''ہم معصوم بچیوں اور ان کی والدہ کو زیادہ دیر نہیں روکنا چاہتے۔ تینوں باپردہ ہیں۔ اتنا لمبا سفر اور پھر شاک۔ انھیں فوراً گھر لے کر جائیں......'' ظہیر کی طرف اشارہ کر کے بولا: ''یہ بطور ضمانت ہمارے پاس رہے گا۔ اس کا بھائی ہماری فیس لے آئے اور اِس کو لے جائے۔ آپ کا ذاتی معاملہ ہے، نقصان برداشت کرنا چاہیں، ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ ویسے یہ دونوں بھائی ڈرائنگ رُوم میں پندرہ بیس منٹ کے اندر اندر ساری کہانی بتا دیں گے۔ لہٰذا آپ کے حق میں یہی ہے کہ رپورٹ درج کروائیں۔'' حوالدار نے امتحانی گتے میں سفید کاغذ لگا کر اوپر قلم رکھا اور طارق کی طرف بڑھا کر بولا: ''درخواست لکھیں: بخدمت جناب ایس ایچ او صاحب...... میں مختصراً لکھواتا ہوں......''

طویل سفر کی تھکن اور صدمے سے نڈھال، ماں بیٹیاں، نیند پوری نہ ہونے سے اَدھ موئی ہوئی پڑی تھیں۔ گھر پہنچ کر ناشتا کرتے ہی سو گئیں۔ طارق کے بزرگوں میں صرف سگی پھوپھو ہی رہ گئی تھی۔ بیوہ اور نادار خاتون، جس کو طارق ہی باقاعدگی سے خرچہ بھیجتا رہا تھا۔ اُس نے ایسا انکشاف کیا کہ بھتیجے کو ہلا کر رکھ دیا۔ کہنے لگی: ''میرے بچے! تیرے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔ بات ایسے ہی نہیں اُڑی کہ کوٹھی اور فیکٹری دونوں بھائیوں نے اپنے نام لگوا رکھی ہے۔ دفتروں کا ریکارڈ چیک کرواؤ۔ خود جاؤ، کسی کا اعتبار نہ کرنا۔ تم نے دونوں ظالموں کو مختار نامہ بھی لکھ دیا تھا۔ اللہ جانے کیا کیا ہیرا پھیری کی ہے۔ ان کی اولاد بھی علی الاعلان کہتی پھرتی ہے؟ کون چاچا؟ کوٹھی اور فیکٹری ہماری ہے۔ گوری سے شادی کر لی، اب گوروں کے دلیس میں رہے، یہاں کیا لینے آئے گا؟''

بات کھلنے پر آئی تو سال مہینے یا دن نہیں لگے، گھنٹوں میں کھلتی چلی گئی۔ دونوں بھابیاں جوان بیٹیوں کے ہمراہ آ کر ایک لحاظ سے حملہ آور ہو گئیں۔ عذر تراش لیا کہ اس نے آتے ہی دونوں بھائیوں کو پھنسانے کی پوری کوشش کی۔ وہ تو قسمت اچھی رہی کہ پولیس کو رشوت دے کر عزت بچا لی۔

شہر کے ترقیاتی ادارے اور انڈسٹریل اسٹیٹ کے ریکارڈ میں سرے سے طارق کا نام ہی نہیں تھا۔ وہ تھانے گیا تاکہ باقاعدہ رپورٹ درج کروائے۔ چھوٹے بڑے عملے نے پروں پر پانی نہ پڑنے دیا۔ شور شرابا کر کے ایس ایچ او سے ملا لیکن اُس نے یہ کہہ کر ٹرخا دیا کہ گھریلو جھگڑوں میں پولیس کو اُلجھانے کی بجائے، آپس میں مل بیٹھ کے معاملات سیٹل

کیے جائیں۔

طارق محمود کی قوتِ ایمانی بروئے کار آ گئی کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہونا چاہیے۔ مسئلہ یہ بن گیا کہ تمام تر دستاویزات، خواہ وہ جعلی تھیں یا اصلی، لوٹے گئے سامان میں چلی گئیں۔ پاسپورٹ، زیورات، پونڈ اور سب کچھ۔ لباس بھی صرف وہی رہ گئے، جو تن پر تھے۔ پرکھنے کو کچھ بچا ہی نہ تھا۔ بھائی کھل کر سامنے آ گئے اور صاف کہہ دیا کہ اُس نے دونوں کو تھانے میں ذلیل کروایا، لہٰذا اب وہ ایک روپیہ بھی دینے کے روادار نہ ہوں گے۔ اِس مشکل گھڑی میں بہنوئی، محمد سلیمان ساتھ چل پڑا۔ اکلوتی بہن کا شریکِ حیات، شہر کی سیاسی بساط کا اہم مہرہ اور موجودہ چیئرمین زکوٰۃ کمیٹی۔ گو کہ بہن کی اپنے شوہر سے کبھی نہ بنی۔ بھائی کو دبے لفظوں میں بچ کے رہنے کی تلقین کر گئی۔ لیکن اس کی مجبوری تھی کہ کوئی مشورہ دینے والا بھی نہ تھا۔ سلیمان سے ادھار رقم پکڑ لی تاکہ روزمرّہ کا خرچ جیب میں ہو۔ اسی کی مدد سے ایس ایس پی کو جا ملا اور متعلقہ پولیس اسٹیشن کے حوالے سے ساری رُوداد گوش گزار کر ڈالی۔

ایف آئی آر درج کر لی گئی اور ایس ایس پی نے اس کیس کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے تفتیش ایک اچھی شہرت کے حامل سب انسپکٹر کے سپرد کرتے ہوئے کہا: ''اوورسیز پاکستانی کی جائیداد ہڑپ کرنے کا سنگین جُرم ہوا ہے۔ اس کی نومسلم بیوی نے ہم لوگوں کے بارے میں بہت بُرا تاثر لیا ہوگا۔ ڈاکے کی اصلیت کھلنے سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔ یہ کیس ہمارے لیے چیلنج سے کم نہیں......''

دونوں بڑے بھائیوں نے ضمانتیں کروالی تھیں، تاہم اُنھیں شاملِ تفتیش کر لیا گیا۔ طارق نے ایک وکیل کے ذریعے سِول عدالت میں کوٹھی اور فیکٹری کی بازیابی کا دعویٰ بھی دائر کر دیا۔ اُس نے تمام رقوم قانونی طریقے سے بذریعہ بینک بھیجی ہوئی تھیں۔ صرف یہی ایک ثبوت تھا جو متعلقہ برانچ سے بآسانی حاصل ہو گیا۔ جج نے ظہیر اور زبیر سے دوٹوک کہا: ''انکم ٹیکس کا ریکارڈ لے آؤ۔ تم دونوں کی آمدن ثابت ہو گئی تو ٹھیک ورنہ عدالت ایک دو پیشیوں میں فیصلہ دے ڈالے گی۔'' مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی اور تفتیشی افسر نے ڈاکے کے اصل کردار گرفتار کر لیے۔ جن میں فیکٹری کے تین مزدور، ایک کلرک اور دو سکیورٹی گارڈ تھے۔ کچھ سامان، اٹیچی کیس، ہینڈ بیگ اور پاسپورٹ بھی برآمد ہو گئے۔ تاہم زیور، کپڑوں اور فارن کرنسی میں سے کچھ نہ ملا۔ دونوں بھائیوں کی ضمانتیں منسوخ ہوئیں اور ہتھکڑیاں لگ گئیں۔ طارق محمود بظاہر جتنا مضبوط عقیدے کا حامل دکھائی دیتا رہا، حقیقت میں ایسا ثابت نہ ہوا۔ اُسی روز گھر آیا اور دل کا دورہ پڑنے سے چل بسا۔

ظہیر اور زبیر کے سسرال والے میدان میں آ گئے۔ ساتھ ہی ان دونوں کی بیٹیوں کے منگیتر کود پڑے۔ قرضۂ حسنہ دینے کے حوالے سے بیان حلفی لکھے گئے اور جائیداد ہڑپ کرنے کی نیت سے وسیع پیمانے پر منصوبہ بندی ہونے لگی۔ آمنہ کو پیغام پہنچایا گیا کہ سپریم کورٹ تک مقدمہ بازی چلے گی۔ دورانِ تفتیش، ظہیر زیادہ سختی برداشت نہ کر سکا اور اُس نے بک دیا تھا کہ ڈاکہ اس لیے ڈلوایا تاکہ جعلی دستاویزات ضائع ہو جائیں اور جعل سازی کا کیس نہ بنے۔ علاوہ ازیں اپنے تئیں یہ باور کر لیا تھا کہ ایسی سنگین واردات سے دوچار ہونے پر بیٹیاں اور بیوی خوفزدہ ہو کر طارق کو فوری واپسی کے لیے رختِ سفر باندھنے پر آمادہ کر لیں گی۔ اُن کے پاسپورٹ اسی لیے محفوظ رکھے تھے کہ موقع پا کر کسی رات گھر کے صحن میں پھینک دیں گے۔

آمنہ اپنے تمام تر معاملات کا حل، دینی احکامات کی روشنی میں تلاش کرتی۔ جو بھی مسئلہ درپیش ہوتا، مرحوم شوہر کی دی ہوئی کتابوں اور قرآن پاک سے رجوع کرنا اس عورت کی پختہ عادت بن چکی تھی۔ بیٹیوں کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہونے پر فکرمند ضرور رہی۔ ذریعۂ آمدن ندارد ہونے سے نوبت فاقہ کشی تک آ گئی۔ بڑی خواری کے بعد ایک اکیڈمی میں

انتہائی کم معاوضے پر کام مل گیا، جہاں نوجوان لڑکے لڑکیوں کو روزمرّہ کی انگریزی بول چال میں ماہر کرنے کا فریضہ ذمے لگا لیکن اس عورت کا پردے کے شرعی احکامات پر سختی سے کاربند رہنا نہ صرف رُکاوٹ بن گیا بلکہ اس کا مذاق بھی اُڑایا جاتا۔ مقدمے کی پیروی بھی اسی لیے نہ کرسکی کہ بے پردگی ہوتی ہے اور مالی وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔

گلی محلے کے لوگوں کو اس بے سروسامان اور منفرد مزاج کی بیوہ اور یتیم بچیوں سے دلی ہمدردی ہوگئی۔ اڑوس پڑوس کو خبر رہی کہ ماں بیٹیاں صبح کے وقت انتہائی معمولی ناشتا کر کے شام کے کھانے تک بھوکی رہتی ہیں۔ ایک تو اس آبادی کے زیادہ تر لوگ بھی تہی دست تھے، دوسرا اس عورت کی انا آڑے آجاتی۔ قرض لیتی نہ خیرات قبول کرتی۔ اکیڈمی سے ملنے والے حقیر معاوضے پر گزارہ چلتا رہا۔ رمضان المبارک کی آمد سے پہلے محمد سلیمان ملنے آگیا۔ اس نے پردے میں رہتے ہوئے دروازے کے پیچھے سے آنے کا سبب پوچھ لیا تو وہ بولا: ''بھابھی صاحبہ! ہمارے دین میں اتنی سختی نہیں جتنی آپ نے اپنے اوپر روا رکھی ہوئی ہے۔'' وہ بولی: ''جی! ہم کو پتا ہے، دین میں سختی بالکل نہیں۔ ہم کو خود اس سے بہت خوشی ملا ہے......'' وہ کہنے لگا: ''آپ قرآن حدیث کا مطالعہ کرتی ہیں۔ اس میں بے شک دیکھ لیں کہ زکوٰۃ پر آپ کا جائز حق بنتا ہے۔ میں زکوٰۃ کمیٹی کا چیئرمین ہوں۔ قانون یہ ہے کہ مستحق فرد کو بذریعہ چیک ادائیگی کی جائے۔ مگر میرے صوابدیدی اختیارات بھی ہیں۔ کمیٹی کے ممبران کی متفقہ منظوری سے زیادہ ضرورت مند کو نقد ادائیگی کرسکتا ہوں۔''

''بہت مہربانی بھائی صاحب!'' آمنہ نے محمد سلیمان کو ٹوک دیا اور بولی: ''ابھی ہم اکیڈمی جائے گا۔ واپسی پر زکوٰۃ کو اچھی طرح پڑھ لیں گا۔ آپ آنے کا تکلیف مت کرو، فون پر پوچھ لو۔ اللہ کے حکم کو ہم ضرور مانے گا۔''

محمد سلیمان نے کہا: ''ایک اور بات کہنا چاہوں گا کہ زکوٰۃ فنڈ کی رقم آپ کو نقد مل جائے گی۔ اس کے علاوہ بہت سے اہلِ ثروت ہماری کمیٹی کے ذریعے امداد تقسیم کرتے ہیں۔ اس میں رمضان پیکج بنا ہوتا ہے۔ گھی آٹا چینی دالیں وغیرہ، بہت کچھ ہوتا ہے۔ وہ بھی لے آؤں گا۔ اس میں لینے اور دینے والے، کسی کا اجر کم نہیں ہوتا......'' وہ جواب میں بولی: ''جی بھائی صاحب! اللہ بہت رحیم ہے، اس کا ہم کو پتا ہے......''

اکیڈمی سے واپسی پر آمنہ نے بڑی توجہ سے زکوٰۃ کے احکامات کا مطالعہ کیا اور پوری طرح مطمئن ہوگئی کہ وہ اس کا استحقاق رکھتی ہے۔ مزید یہ کہ اس کو قبول کرنے میں کسی قسم کی قباحت نہیں۔ سلیمان کی فون کال آنے پر اس امر کی تصدیق کردی اور کہا کہ وہ جس شکل میں چاہے، امداد لے آئے۔ فون بند کرنے سے پہلے جو آخری جملہ بولی، اُس کا مفہوم کچھ اس طرح کا تھا: ''بھائی صاحب! یہ کارِ خیر جو آپ کرنے جارہے ہیں، اس کا اجر صرف اللہ پاک سے مانگیے گا۔''

سلیمان اپنی ذاتی کار میں اچھا خاصا سامان رکھ کر لے آیا اور ڈیوڑھی کا دروازہ کھلوا دیا۔ ڈگی سے آٹے کا ایک تھیلا نکال کر خود اندر رکھا۔ اس کے بعد تین کارٹن باری باری اٹھا کر اندر لایا۔ آخر میں ایک بڑا سا پلاسٹک کا تھیلا اٹھائے ہوئے آگیا۔ آمنہ پوری طرح پردے میں تھی اور کونے میں لگی کھڑی دیکھتی رہی۔ اُس نے چند ایک بار شکریہ کے الفاظ ادا کردیے۔ سلیمان نے آخری تھیلا، کارٹن پر رکھتے ہوئے بتایا کہ اس میں بسکٹ، مٹھائی، کھجوریں اور کچھ خشک میوہ جات ہیں۔ باقی کے تینوں کارٹنوں میں چاول، دالیں، چینی، پتی، گھی اور دودھ ہے۔ ان شاء اللہ کوئی کمی نہیں آئے گی۔ میں ایک فون کال پر ہر وقت حاضر ہوں۔

جیب سے تہ کیے ہوئے ہزار روپیہ مالیت کے چند نوٹ نکالتے ہوئے سلیمان نے تین چار چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائے اور آمنہ کے قریب آگیا۔ دایاں ہاتھ، جس میں رقم تھام رکھی تھی، اُس کی طرف بڑھایا اور بولا: ''یہ لیجیے......اور

جب بھی ضرورت پڑے، صرف اشارہ کر دیجیے گا......'' سلیمان کی آواز میں لرزش آ گئی تاہم اتنے میں آمنہ داہنا ہاتھ آگے بڑھا چکی تھی۔ نہ جانے کیا سُوجھی کہ خاتون کو نوٹ پکڑانے کی بجائے بائیں ہاتھ سے اُس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا اور رقم ہتھیلی پر رکھتے ہی اپنی ہتھیلی اُس پر جما دی۔ وفورِ جذبات سے لرزتی آواز میں بول پڑا: ''اسلام میں اتنی تختی نہیں، جتنی آپ نے اپنے دماغ پر سوار کر رکھی ہے۔'' ساتھ ہی اُس کے سراپا پر اوپر سے نیچے تک بڑی بھرپور فریفتہ نگاہ ڈالی۔ لبوں سے کچھ اس طرح کی سِسکاری برآمد ہوئی، جس کے بارے میں شاید خود بھی نہ سمجھ پایا ہو کہ بے ساختہ تھی یا شعوری کوشش کا شاخسانہ۔

بُت بنی کھڑی خاتون ذرا بھی مشتعل نہ ہوئی۔ اُس نے اپنا ہاتھ اس صفائی سے کھینچ لیا کہ کرنسی نوٹ سلیمان کی بائیں ہتھیلی پر دھرے رہ گئے۔ ایک لفظ بولے بغیر آگے بڑھی۔ اُلٹے ہاتھ میں ڈرائی فروٹ والا تھیلا اُٹھایا اور سیدھے ہاتھ کی انگلیاں ایک کارٹن کے گرد لپٹے سٹریپ میں پھنسا کر اُٹھا لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں چیزیں دروازے سے باہر رکھ دیں۔ اُسی لمحے سامنے والے گھر سے پڑوسن اور اُس کا جوان بیٹا نکل آیا۔ وہ دونوں اپنے گھر کی کھڑکی کا پردہ سرکا کر ڈیوڑھی کا منظر دیکھتے رہے تھے۔ سلیمان گنگ ہوا کھڑا رہ گیا۔ اتنے میں آمنہ نے آٹے والا گٹو بھی فرش پر گھسیٹتے ہوئے گلی میں لا ڈالا۔ پڑوسن نے بیٹے سے دونوں کارٹن اٹھا کر باہر رکھنے کو کہا۔ اُس نے فوراً تعمیل کر دی۔ سلیمان کھسیا کر بول پڑا: ''آمنہ بہن! ایسا مت کرو۔ یہ اللہ کی رضا کے لیے کیا ہے، آپ پر کوئی احسان نہیں......'' اس اثنا میں وہ خود بھی باہر گلی میں آن کھڑا ہوا تھا۔ اڑوس پڑوس کے چند اور مرد و خواتین بھی نزدیک آ گئے۔ آمنہ کچھ نہ بولی اور دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈیاں چڑھا لیں۔

اگلے روز صبح نو بجے ہی اہلکاروں سے بھری پولیس موبائل کے ساتھ ایک لینڈ کروزر آن کھڑی ہوئی، جس سے آمنہ کے آبائی وطن کے سفارتی مشن کی خاتون کوارڈینیٹر نکلی۔ اُس کے ساتھ آئے عملے کے دو ارکان گاڑی میں ہی بیٹھے رہے۔ ہر عمر کے مردوں اور عورتوں سے گلی بھر گئی۔ محلے کے معزز بزرگ حاجی ذکا اللہ کی معیت میں دو ادھیڑ عمر خواتین اور دو ہی بوڑھے مرد، آمنہ سے ملنے آ گئے۔ معلوم ہو گیا کہ وہ اپنی بیٹیوں کے ہمراہ وطن واپس جا رہی ہے۔

حاجی ذکا اللہ دل گرفتہ سے ہوئے بول پڑے: ''بیٹی! ہم تمہارے مجرم ہیں۔ بڑی کوتاہی ہو گئی۔ مرحوم طارق محمود کے ساتھ سراسر ظلم ہوا۔ ہمیں ہر حالت میں اُس کا ساتھ دینا چاہیے تھا۔ گلی محلے کے لوگ شرمندہ ہیں اور فضا سوگوار ہو گئی ہے۔ تم واپس مت جاؤ۔ ہم تمہاری فیکٹری اور مکان کا مقدمہ جیت کے دکھائیں گے۔ طارق مرحوم اپنی بیٹیوں کو جس خراب ماحول سے نکال لایا، اُس میں ان معصوموں کو واپس مت لے جاؤ......''

آمنہ نے بڑے تحمل سے بات سنی اور کہا: ''جن بھائیوں نے مکان اور فیکٹری کے واسطے ایمان خراب کر لیا، اُن سے یہ چیز مت چھینو۔ انھوں نے بہت زیادہ قیمت دے دیا......اور......اور اُدھر ہمارے وطن میں بیٹی کو خطرہ نہیں۔ اِدھر بیٹی اور ہم کو بھی خطرہ ہے۔ وہاں جب عورت خود خرابی مانگتا، اُس کو برابر مل جاتا۔ یہاں جو عورت خرابی نہیں مانگتا، اُس کو بھی بہت لوگ زبردستی خرابی دیتا۔ ہم نے شادی سے پہلے طارق محمود کا آنکھ دیکھا۔ خوب جان گیا، نیکی والا اچھا آنکھ کیسا ہوتا۔ اِدھر اکیڈمی کا اونر......اور......اور بہت زیادہ لوگ......وہ ہمارا اینگ میل اسٹوڈنٹس کا آنکھ دیکھا......سب نہیں، تھوڑا زیادہ عورت کو خرابی دینے کے واسطے دیکھتا......اچھا نہیں......آئم سوری۔ سب اچھا ہو گیا۔ ہم کو ''خدا حافظ'' کا گفٹ دے دو......اور نی......''فی امان اللہ'' کا گفٹ ہم بھی دیتا، آپ بھی دے دو۔''

☆......☆......☆

تین منظر (یہاں وہاں سے)

محمد عاصم بٹ

اطمینان

بس کی بریکیں شاید ہوا خارج کرتی تھیں کیوں کہ جب وہ لگتی تھیں تو ہوا کا بھبھکا سا شراٹے مارتا خارج ہوتا اور ایسا بار بار ہونے سے اس کی توجہ کسی اور طرف جا ہی نہیں پا رہی تھی۔ وہ دروازے کے برابر ہی ایک سیٹ پر بیٹھا تھا۔ تبھی اس کی نظر کھڑکی کے پاس ہی لگی ایک تختی پر پڑی، لکھا تھا، 'معذور افراد کے لیے۔' تختی پر اشارہ اسی کی سیٹ کی طرف تھا۔

اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا۔ آس پاس نظر دوڑائی۔ بس میں اب کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہیں بچی تھی۔ آراے بازار تک ابھی راستے میں بارہ تیرہ سٹاپ تو ہوں گے۔ آس پاس دکھائی دینے والی سواریوں میں کوئی بھی معذور معلوم نہیں ہوتی تھی۔

یوں بھی ایک معذور فرد کے لیے کیسے بس میں سوار ہونا ممکن تھا۔ کسی سٹاپ پر یہ آدھا منٹ بمشکل ہی رکتی تھی۔ اور وہ بھی کہاں مکمل رک پاتی تھی، ہولے ہولے سرکتی رہتی، سواریاں اترتی اور تقریباً بھاگتے ہوئے چڑھتی تھیں۔ ایسے میں کوئی معذور چاہے کتنا ہی چوکس ہو کر سٹاپ پر منتظر کھڑا ہو، کیسے بس تک آ سکتا تھا۔ اور بالفرض اگر وہ بروقت بس تک پہنچ بھی جائے تو اوپر کیسے چڑھے گا۔ ڈیڑھ ایک فٹ کی پہلی سیڑھی تھی، اس سے آگے کوئی پون فٹ کی دوسری۔ ایک معذور کے لیے ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ ہولے ہولے سرکتی بس میں یہ دونوں سیڑھیاں پھلانگ کر چڑھ جائے۔ معذور افراد کی جو بھی صورتیں اس کے ذہن میں موجود تھیں، ان میں سے کسی ایک کے لیے بھی بس میں داخل ہونے کا کوئی آسان اور موزوں راستہ نہیں تھا۔

اس کے وہاں بیٹھنے میں کھنڈت پیدا ہونے کی کوئی صورت فوری طور پر ممکن نہیں تھی۔ اس خیال نے اس کے چہرے کے تناؤ کو کم کیا۔ سانس کی رفتار متوازن ہو گئی۔ جسم کو اس نے ڈھیلا چھوڑ کر اوپر چھت کی طرف دیکھا۔ وہ ایک عوامی بس میں بیٹھا تھا، کون اسے اٹھنے کو کہہ سکتا تھا۔ وہ مطمئن تھا۔

لیانی گفتگو

لکھا تھا، ''یہاں لیانی گفتگو منع ہے۔''

ایک سادہ کاغذ ماموں پان والا نے اپنی دکان ہی میں سگریٹوں کے شیلف کے برابر دیوار پر چپکا رکھا تھا۔ موٹے قلم سے بدخط میں یہ عبارت لکھی تھی۔ کافی دیر بعد غور کرنے پر یہ سمجھ میں آیا کہ لفظ لایعنی کو ایسا لکھ دیا گیا ہے۔

ماموں سے بات کی کہ یہ لفظ یوں نہیں بلکہ یوں ہے۔

انھوں نے بے اعتنائی سے جواب دیا، ''ہمارے ہاں ایسا ہی بولتے ہیں۔''

وہ اہل زبان ہونے کے دعویدار تھے۔ ہمیں بھی زعم تھا کہ اس دشت کی سیاحی میں چند ماہ و سال بتائے ہیں، تو دعوی ہمارا بھی بنتا ہے۔ اس سے بحث کا آغاز کیا کہ جناب اعلی، لیانی کوئی لفظ نہیں ہے، لغت سر دست موجود نہیں ہے، ورنہ ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوسکتا تھا۔ ماموں نے تنگ کر کہا کہ لغت کی کیا بات ہے، ہمارا کہا لغت ہے۔ بات طول پکڑ گئی، اور الجھتی چلی گئی، جیسا کہ متوقع تھا۔ ماموں نے پان لگانے موقوف کر دیے، بے اعتنائی کی جگہ ان کے لہجے میں بے زاری کا عنصر نمایاں تھا، دلائل میں انانیت کی سرخی در آئی تھی۔

تبھی خیال آیا کہ اسی لیے تو پہلے سے لکھ کر لگا دیا گیا تھا کہ 'لیانی گفتگو منع ہے۔''

یہی تو لیانی گفتگو تھی، جو ہم کر رہے تھے۔ میں یکبارگی خاموش ہو گیا۔

ماموں نے دشمن کو پسپائی اختیار کرتے دیکھا تو اپنا دوسرا مورچہ سنبھالا، پتہ پکڑا اور اس پر کتھا پھیرنے لگا۔

فون کال

ہیلو کیسی ہو

فائن پاپا

پڑھائی کیسی جا رہی ہے

سپرب

کالج

ایکسیلنٹ

جمعہ کو آ رہا ہوں

اعلی، پاپا

کیا لاؤں

چاکلیٹس پاپا، ایپل آئی سیون، اور اور، ایپل ٹیبلٹ

تم سن بھی رہی ہو میں کیا کہہ رہا ہوں

یس پاپا

کان میں سے ہیڈ فون اتارو، گانے بند کرو، میری بات سنو

گانے نہیں سن رہی پاپا

سن رہی ہو

اچھا اتارتی ہوں

(کچھ وقفہ)

نکال دیا

جی پاپا (آواز میں نقاہت ہے۔)

ایگزیمز کب ہیں

سمسٹر کے اینڈ پر پاپا
تیاری ہے
جی پاپا
کالج ٹھیک چل رہا ہے؟
جی پاپا
جمعے کو آ رہا ہوں، کچھ لاؤں۔
کچھ نہیں پاپا،
تمھارے لیے نہیں، ماما کے لیے۔
وہ کہہ رہی تھیں، واشنگ مشین خراب ہوگئی ہے۔ نئی لانی پڑے گی، ایک لیتے آئیے گا۔
تمھارے لیے کچھ
نو پاپا
او کے
(فون بند ہو جاتا ہے۔)

☆......☆......☆

مراجعت

اقبال نظر

اٹھتے ہوئے گہرے اودے بادل، جیسے محبوب کے آنے سے کچھ دیر پہلے کی کیفیت، ماحول کی بے چین گھٹن، جیسے وصال واتصال سے چند ثانیے ادھر والی بے باک وحشت، خود سپردگی لئے درختوں کی لمبی شاخیں جیسے بیتے موسم کو اشارے سے بلاتی بانہیں، ہوا کے دوش پر برستی ہوئی نرم رو پھوار جیسے گزرے ہوئے مہربان لمحوں کا گہرا سایہ، سرمہ بن کر آنکھوں میں پھر جانے والی روشنی کی لکیر جیسے چمکتی ہوئی آسمانی بجلی جو آنے والی نیندیں بھی اڑا دے، دوئی کو مٹا دینے پر تلی ہوئی پہاڑوں سے ہم آغوش ہوتی حسین وادی، آنکھ کے راستے سارے وجود میں پھیل جانے والا ریشمی سبزہ، اتنا نازک کہ انسان خود اپنے اندر بہت احتیاط سے اترے، چار بر آمدوں کی گود میں کچھ سوئی اور کچھ جاگی ہوئی لکڑی کے موٹے شہتیروں سے بنی ایک کٹیا، آس پاس شام کا ترستا ہوا وہ لمحہ جب ہر طرف کسی کے آنے کے ایسے قرینے ہوں کہ دم بخود نگاہیں دن، تاریخ اور مہینے بھول کر بس ایک راستے پر جا ٹکیں، نیچے اترتی پگڈنڈی کے پہلو میں دھیمی آواز سے بہتا ہوا اجلا پانی۔ اس گزرگاہ کا ایک سرا فریم کے انتہائی حصے میں پہنچ کر ترچھا ہوتا ہے اور اچانک باہر کو نکل جاتا ہے۔

دراصل یہ ایک پینٹنگ ہے جو اس کے ڈرائنگ روم میں نمایاں جگہ پر آویزاں ہے۔

یہ سارا منظر ایک ہمہ وقت سوچ ہے، اتنی گہری، جیسے کسی سنگ تراش نے ہتھوڑا، چھینی لے کر بڑی مہارت سے اس کے دماغ پر نقش کر دی ہو۔ وہ جب بھی خالی یا بہت مصروف ہوتا خود کو اس سنیری کے روبرو لا کھڑا کرتا، جب کبھی کسی ایسے غم سے جس میں آدمی ہنس دے یا کسی ایسی خوشی سے جس میں آنسو نکل آئیں، دوچار ہوتا، تب بھی یہی منظر اس کے پیشِ نظر ہوتا، اس لمحے یہ منظر شکمِ مادر بن جاتا جس میں وہ خود کو پوری طرح محفوظ خیال کرنے لگتا، یہی منظر کبھی دستِ مسیحا بن جاتا جو اُسے وقتی طور پر دکھوں کی دلدل سے باہر نکال لاتا، گاہے دیدۂ یعقوب نظر آتا اور وہ رونا دھونا یکسر بھول جاتا۔

اس ایک سنیری میں کتنے استعارے، کتنی تشبیہات اور کتنی تماثیل تھیں، وہی جانتا تھا، کبھی کبھی یہ منظر اُسے اتنا جاندار معلوم ہوتا کہ وہ بڑی شدومد کے ساتھ اس میں داخل ہونے کی کوشش کرنے لگتا، اس لمحے منظر کی ساری جزئیات اسے باتیں کرتی محسوس ہوتیں اور وہ حقیقتاً ان سے ہمکلام بھی ہو جاتا، ساری شکایتیں، تمام اندیشے اور سارے وسوسے ان پر آشکار کر دیتا اور پھر ذرا دیر میں ہلکا پھلکا ہو جاتا۔ رات کے پچھلے پہر جب کوئی ڈراؤنا خواب اُسے گھیر لیتا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا اور منظر کے نزدیکی صوفے پر سر کو اپنے ہی سینے میں چھپا کر لیٹ رہتا، بالکل اس بچے کی طرح جو ڈر کر ماں کی گود میں چھپ گیا ہو۔ وہ جب کبھی سنیری کے فریم سے باہر نکلنے لگتا اسے یوں محسوس ہوتا وہ اچانک اپنی ماں کے پیار سے خالی ہو گیا ہو۔ ماں جو ہر سال اس کی سالگرہ کے دھاگے میں بڑے چاؤ سے گرہ لگاتی تھی۔ پھر اسے اپنی بیوی یاد آئی جو عرصہ ہوا اس کا بچہ لے کر امریکہ بھاگ گئی تھی، وہ بھائی یاد آیا جو موروثی گھر میں رہتا تھا اور جائیداد سے دستبرداری کے علاوہ اس سے کوئی اور بات نہیں کرتا تھا۔ اس کی کوئی بہن نہیں تھی ایک منہ بولی تھی جو اپنے سرقے کا حدف پورا کر کے اپنے سگے بھائیوں کی طرف پلٹ گئی تھی۔ اس کے دوست اتنے قریبی تھے کہ جیب کے اندر تک کا حال بخوبی جانتے تھے، ایک بڑے مالی نقصان کے بعد یہی وجہ دوری کا سبب بن گئی اور پھر کبھی کبھار آ جانے والے خیر و عافیت کے فون بھی آنے بند ہو گئے۔ اب اس کی ذات اکیلی رہ گئی تھی جو پینٹنگ میں منتقل ہو چکی تھی۔ وہ یوں بھی کسی اور کو اپنے ساتھ اتنی معصوم اور بے غرض جگہ لے جانا نہیں چاہتا تھا۔ سنیری کی جھاڑ پونچھ اس کے لئے ایک مذہبی فریضہ ہو کر رہ گئی تھی، جسے وہ باقاعدگی سے ہر روز ادا کیا کرتا، گھر آیا کوئی مہمان جب دیر تک سنیری کو محویت سے تکتا تو وہ اس کی توجہ ہٹانے کی پوری

کوشش کرتا، مبادا وہ سنہری کا سارا حسن آنکھوں ہی آنکھوں میں نہ لے اڑے۔ پھر وہ لمحہ آیا جب تصویر بھی اُسے با آواز باتیں کرتی محسوس ہونے لگی۔ پہاڑوں کو دیکھ کر گمان ہوتا جیسے کوئی ان پر چڑھنے کے بعد گہری سانسیں لے رہا ہو، سفیدے کے درخت آپس میں سرگوشیاں کرتے اور وادی میں اُترے ہوئے بھورے بادل اس کا ہاتھ تھام کرنا معلوم منزلوں کی طرف چل پڑتے۔ پھر ایک دن اُسے یقین ہو گیا پہاڑی ٹیکرے پر بنے لکڑی کے کٹیا نما گھر میں کوئی رہتا ہے، وہ اُسے خوب جانتا ہے، جب سے ہوش سنبھالا ہے اُسی کے خیال میں بے ہوش ہے۔

رہائش گاہ کے ہر طرف خودرو گھاس اور جنگلی درختوں کے جھاڑ جھنکاڑ اتنی بے ترتیبی سے پھیلے ہوئے تھے کہ گھر بھی خودرو معلوم ہونے لگا تھا۔ یہ جھاڑ جھنکاڑ کوئی صاف کیوں نہیں کرتا؟ لیکن پھر وہ اپنے دل کو تسلی دے لیتا۔ اندر رہنے والا تو ہر وقت اس کے خیال میں گم رہتا ہوگا۔ آٹھ پہر دھیان کے بعد اس کے پاس وقت ہی کہاں بچتا ہوگا جو کٹیا سے نکل کر باہر کا منظر دیکھے۔ جب کوئی غیر متوقع سفاکی اُسے نرغے میں لے لیتی تب پینٹنگ سے نکلتی ہوئی اجنبی مہک اس کے گرد ہالا بنا لیتی اُسے رہ رہ کر اکساتی کہ آؤ کٹیا کے اندر دیکھتے ہیں، وہاں کون رہتا ہے۔ تصور گہرا ہوتو تصویر بن جاتا ہے، ایک روز اُسے یوں لگا گویا چھوٹی سی کٹیا کے اندر ایک پوری کائنات آباد ہے، اس کائنات نے بالوں کو ہٹایا تو چہرہ معدوم ہو گیا، سامنے صرف دو آنکھیں تھیں، ان میں ایک دنیا تھی اور دوسری مافیا۔ دنیا والی آنکھ اُسے انسان کے روپ میں دیکھ رہی تھی اور مافیا والی مجسم محبت کے روپ میں، بینائی کی اس کارفرمائی سے وہ پہلے کبھی دو چار نہیں ہوا تھا، اس ایک دید میں ایسی دردمندی تھی کہ سارا بگاڑ سدھار میں بدل گیا، اردگرد پھیلے ہوئے سارے اپنے پرائے جو اس کا گوشت اپنی خوراک سمجھ کر مسلسل کھا رہے تھے، دھواں بن کر اڑ گئے، بے چینی بے فکری میں یوں بدل گئی جیسے زندگی نے موت کو خدا حافظ کہہ دیا ہو۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا وہ اس کٹیا میں ضرور جائے گا۔ اُسے تلاش کرے گا۔ اسے کامل یقین تھا کہ یہ جیتا جاگتا منظر اپنے ہی ملک کے کسی دور دراز پہاڑی علاقے کا ہے۔ اس نے جذبۂ بے اختیار کو زادِ راہ کے طور پر ساتھ لیا اور چل پڑا، بعض مرتبہ انسان خود نہیں چلتا، راستے قدم بن جاتے ہیں، اُسے ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ کئی دفعہ وہ اس لینڈ اسکیپ کے بہت قریب پہنچ گیا۔ لیکن وہاں کی جزئیات کل نہیں تھیں، وہ پینٹنگ کو بغور دیکھتا تو کوئی نہ کوئی کمی ایسی نظر آ جاتی جو منظر کو ادھورا چھوڑ دیتی اور وہ نئی راہ کا سرا تھام لیتا۔ ایک مرتبہ سب کچھ ویسا ہی تھا لیکن یہاں پانی کے ساتھ والی گزرگاہ کا وہ سرا نہیں تھا جو فریم کے انتہائی حصے تک پہنچ کر خمیدہ حالت میں باہر کو نکل گیا تھا اور...... ایک جگہ وہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔ دو ماہ کی مسلسل جستجو کے بعد سنہری والا منظر اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ اُس کے سامنے تھا۔ نیلگوں بادل، اونچے پہاڑ، نیم خوابیدہ وادی، سنہرے کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، دھیرے دھیرے بہتا ہوا اُجلا پانی اور چار برآمدوں کی گود میں کچھ سوئی کچھ جاگی، لکڑی کے موٹے شہتیروں سے بنی ایک کٹیا جس کے اردگرد خودرو گھاس اور پہاڑی درختوں کے جھاڑ جھنکاڑ بالکل ویسی ہی بے ترتیبی سے پھیلے ہوئے تھے جو اس کے دھیان کا حصہ بن چکے تھے۔ منظر مراد کی صورت اس کے سامنے تھا۔ اُسے یوں لگا جیسے زندہ دفن کر دینے کے بعد اُسے بحفاظت باہر نکال لیا گیا ہو۔ ہاتھ میں تھامی ہوئی پینٹنگ پھینک کر وہ تیزی سے اس کٹیا کی طرف لپکا، جہاں انتظار سے شرابور دو مہربان آنکھیں دنیا و مافیا بنی اُسے اپنی طرف بلا رہی تھیں، جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا، اُس کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی، اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دنیا جہان کی تمام زندہ نفرتیں، بے شمار خوف، ان گنت منافقتیں، گہرے دکھ، اندھی محرومیاں، زہریلے انتقام سبھی کو پیروں تلے روندتا فاتحانہ انداز سے پستی سے بلندی کی طرف جا رہا ہے۔ اس کی نگاہیں بدستور کھڑکی پر جمی ہوئی تھیں اور وہ راہ میں آنے والے پتھروں اور جھاڑیوں سے الجھتا تیزی سے کٹیا کی طرف بڑھ رہا تھا اور پھر کٹیا سے چار قدم ادھر اس کا پیر پھسلا اور وہ سینکڑوں فٹ بلندی سے پہاڑ کے دامن میں آ گرا اور یہ وہی جگہ تھی جہاں گزرگاہ کا ایک سرا فریم کے انتہائی نشیب میں جا کر اچانک ترچھا ہو کر باہر کو نکل گیا تھا۔

☆......☆......☆

سنگم

اجمل اعجاز

ماہ رخ اور میرے درمیان دوستی اور محبت کا رشتہ وقت کے ساتھ ساتھ تیزی سے پروان چڑھ رہا تھا۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم دونوں کے حالات میں بے حد یکسانیت اور مماثلت تھی۔

اس کے والدین بچپن میں اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے جبکہ میں بھی بچپن ہی میں اپنے والدین کی شفقت و محبت سے محروم ہوگئی تھی۔

والدین کی وفات کے بعد اس کی سرپرستی اس کی خالہ نے کی تھی جبکہ میری پرورش اور نگہداشت میری پھوپھی کی ذمہ داری ٹھہری تھی۔

اس نے تنگدستی میں زندگی بسر کی تھی اور بمشکل تعلیم حاصل کر پائی تھی جبکہ میری گزر بسر کا بھی یہی حال تھا اور تعلیمی حصول میرے لئے بھی کبھی آسان نہ رہا تھا۔

اس نے بھی شہر کے ایک مقبول اور معتبر ادارے سے نرسنگ کا دوسالہ تربیتی کورس سرکاری وظیفے کی مدد سے مکمل کیا تھا اور میں نے بھی۔

کامیاب تربیت کے بعد ہم دونوں کی تقرری بھی ایک ہی ہسپتال میں ہوئی تھی۔

ہم دونوں کی پوسٹنگ بھی ایک ہی دن اور ایک ہی وارڈ میں ہوئی تھی۔

ہماری دوستی کی بنیاد تربیت کے دوران ہی پڑی۔ شروع شروع میں ہماری ملاقاتیں مسکراہٹوں کے تبادلوں پر مبنی تھیں۔ پھر مسکراہٹوں کے تبادلوں کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے ہاتھ ملانے کا عمل شروع ہوا، بعد میں مسکراہٹوں اور ہاتھوں میں ہاتھ ڈالنے کے ساتھ ساتھ ہم ایک دوسرے سے بغلگیر ہونے لگے۔ ملاقات پر جذباتیت اور گرمجوشی کا اظہار زیادہ تر ماہ رخ کی جانب سے ہوتا تھا۔ وہ بے حد حساس تھی اور وہ اپنی بے پایاں محبت کے اظہار میں اکثر میرے گالوں اور لبوں کو چوم لیتی تھی۔ وہ کہتی:

"باجی آپ کا وجود میرے لئے کائنات کی وسعتوں میں پھیلے ہوئے آسمان کی طرح ہے جس کے زیرِ سایہ میں ہمیشہ اپنے آپ کو پرسکون اور محفوظ تصور کرتی ہوں۔"

وہ عمر میں مجھ سے دو تین سال بڑی تھی لیکن مجھے عزت و تکریم دینے کے لئے ہمیشہ باجی کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ میں نے بھی اسے ہمیشہ چھوٹی بہن کی طرح سمجھا۔

وہ میری اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر جذباتی لمحوں میں اکثر میری بانہوں میں پناہ تلاش کرتی تھی۔

اس دن ہم دونوں فارمیسی میں تھے۔ مریضوں کی فائلوں کا ڈھیر کاؤنٹر پر ہمارے سامنے تھا۔ ہم فائلوں میں موجود ڈاکٹروں کے تجویز کردہ نسخوں کے مطابق مریضوں کے لئے دواؤں کے پیکٹس بنانے میں مصروف تھیں کہ اچانک

بجلی چلی گئی۔
''باجی آپ کہاں ہیں؟'' ماہ رخ کی خوف میں ڈوبی ہوئی آواز اندھیرے میں ابھری۔
''کیوں؟'' کیا ہوا؟ میں تمہارے قریب ہی ہوں۔ میں نے جواب دیا۔
''باجی مجھے اندھیرے میں ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ ہاتھوں کی مدد سے ٹٹولتے ہوئے میرے قریب آ گئی۔
''ڈرنے کی کیا بات ہے؟ میں تمہارے پاس ہوں ناں ......'' میں نے اسے اطمینان دلایا۔ وہ اچانک مجھ سے لپٹ گئی۔ اس نے اپنی دونوں بانہیں میری کمر میں حائل کر دیں اور اپنا منہ میرے سینے میں چھپا لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ خوف سے کانپ رہی ہے۔

جنریٹر چلنے سے بجلی جلد ہی بحال ہوگئی۔ روشنی میں، میں نے دیکھا۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد تھا، آنکھوں میں سرخی در آئی تھی اور اس کے بال شانوں پر بکھر گئے تھے۔
''یہ کیا ہوگیا تمہیں؟ پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔
''سوری باجی ...... مجھے خود پتا نہیں، مجھے کیا ہوگیا تھا۔'' وہ شرمندہ اور شرمسار تھی۔ بچپن میں ماں باپ کی شفقت ومحبت سے محرومی اکثر اس طرح کے ذہنی مسائل کو جنم دیتی ہے، میں نے سوچا۔

اس دن وہ ڈاکٹر سلمان کی وزٹ پر ان کے ساتھ ساتھ تھی، ڈاکٹر کے جانے کے بعد جب وہ واپس آئی تو اس کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔
''کیا شاندار اور خوبصورت پرسنالٹی ہے!''
ڈاکٹر سلمان کا شمار ہمارے ہسپتال کے ایک نوعمر، خوبرو اور قابل ترین ڈاکٹروں میں ہوتا تھا۔ اپنی نرم خو گفتگو اور شائستہ اطوار کی وجہ سے وہ ہر دل عزیز تھے۔
''ہاں ڈاکٹر سلمان کی شخصیت حقیقتاً شاندار اور خوبصورت ہے۔'' میں نے گردن اٹھا کر ماہ رخ کی جانب دیکھا اور اس کی بات کی تائید کی۔
''ارے ہنس بھئی ......'' وہ ناگواری سے بولی۔ ''میں ڈاکٹر سلمان کی بات نہیں کر رہی؟''
''پھر کس کی بات کر رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔
''آپ نے کمرہ نمبر 205 کی مریضہ کو دیکھا ہے'' میرے سوال کے جواب میں اس نے دوسرا سوال کر دیا۔
''ہاں دیکھا ہے۔'' میں نے اپنے ذہن پر زور دیا۔ ''وہ آج صبح ہی تو داخل ہوئی ہے اور کل اس کا آپریشن ہے، لیکن مجھے تو وہ شاندار اور خوبصورت نظر نہیں آئی۔'' میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔
''باجی پھر آپ نے کچھ نہیں دیکھا۔ آیئے میرے ساتھ......'' اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور میں کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ 205 نمبر کمرے کے دروازے پر اس نے آہستہ سے دستک دی، دروازہ کھولا اور ہم دونوں اندر داخل ہوگئے۔

میرے سامنے بستر پر ایک لاغر اور دبلی پتلی لڑکی دراز تھی۔ گندمی رنگت، موٹے موٹے ہونٹ، بے رونق چہرہ، اوپری ہونٹ کے اوپر ختم ہوتی پھیلی ہوئی ناک، بکھرے اور بے ترتیب بال......
''کیسی طبیعت ہے؟'' ماہ رخ کا لہجہ نرم وملائم اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔
''درد ہے ابھی......'' اس نے کہا۔

''ابھی آپ کو جو دوائیں دی گئی ہیں، اس میں درد کی گولی بھی شامل ہے، ان شاءاللہ آپ کا درد جلد ختم ہو جائے گا۔ ماہ رخ نے اسے تسلی دی۔

''کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا:

''نہیں......'' مریضہ کا مختصر جواب تھا۔

''کسی چیز کی ضرورت ہو گھنٹی کا بٹن دبا دیجئے گا...... میں فوراً حاضر ہو جاؤں گی۔'' ماہ رخ نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ہم دونوں دروازے کی طرف بڑھے۔

''یوں تو ساری مخلوق اللہ نے بنائی ہے، لیکن انسان شاندار اور خوبصورت کیا چیز ہے بھلا؟'' میں نے سرگوشی کی۔

اس نے میرا رخ دوبارہ مسہری کی طرف پھیر دیا اور آہستہ سے بولی۔

''ذرا آپ اس کا سینہ دیکھیں......'' میں نے غور سے دیکھا اور مجھے لگا جیسے ریگستان میں چلنے والی تیز ہواؤں نے ریت کے بگولوں کی مدد سے زمین کے سینے پر دو چھوٹے چھوٹے ٹیلے تشکیل کر دیئے ہوں، جنہیں دور سے دیکھا جا سکتا ہو۔ اس کے لاغر جسم پر اس کے سینے کی گولائیوں کے اتھل پتھل ہوتے کنارے، اسپتال کی ڈھیلی ڈھالی قمیص کے گلے کی صریحاً سرحدی خلاف ورزی کر رہے تھے۔

اب ہم کمرے سے باہر آ چکے تھے۔

''دیکھا آپ نے؟ ہے ناں حیرت انگیز......'' وہ اب بھی حیران تھی۔

''ایسا کسی کے ساتھ ہوتا ہے میری جان'' میں نے کہا اور ساتھ ہی میری نظریں اس کے سپاٹ اور ہموار سینے پر ٹک گئیں۔

''احساس محرومی کی شکار، بے چاری لڑکی۔'' میں نے سوچا۔

ان دنوں وہ وقفے وقفے سے ہسپتال سے غیر حاضری کی مرتکب ہو رہی تھی، اور اس دن بھی ڈیوٹی پر نہیں پہنچی تھی، اس نے اپنی غیر حاضری کی اطلاع یا چھٹی کی درخواست بھی نہیں دی تھی۔

میرے انٹرکام کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو!'' میں نے ریسیور اٹھایا۔

''مہرین صاحبہ میں ڈاکٹر سلمان بول رہا ہوں۔''

''جی جی ڈاکٹر صاحب السلام علیکم'' اچانک ان کی آواز پر میں گھبراہٹ کا شکار ہو گئی۔

ایک سال کی ملازمت کے دوران انٹرکام پر ڈاکٹر سلمان کی یہ پہلی کال تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ مریضوں کے کمروں میں وزٹ کرتے تھے تو ان کی معاونت کے لئے کبھی میں اور کبھی ماہ رخ ان کے ہمراہ ہوتی۔ وہ مریض کا حال احوال معلوم کرتے چارٹ دیکھتے، کبھی نسخہ لکھتے اور کبھی ہمیں زبانی ہدایات دیتے تھے اور بس۔

''کیا آپ میرے کمرے میں تشریف لا سکتی ہیں؟'' ان کی آواز میں مٹھاس اور شائستگی تھی۔

''جی میں ابھی حاضر ہوتی ہوں۔'' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ ریسیور کریڈل پر رکھا اور تیزی سے ان کے کمرے کی طرف چل دی۔

میں نے دروازہ پر آہستہ سے دستک دی اور دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو گئی۔

’’تشریف رکھئے......!!‘‘ انہوں نے مجھے دیکھے بغیر کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
’’جی ڈاکٹر صاحب‘‘ کرسی پر بیٹھتے ہی میں نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
’’پہلے آپ چائے پئیں۔‘‘ انہوں نے پہلے سے میز پر موجود چائے کا کپ میری جانب بڑھایا۔
’’ڈاکٹر صاحب بھلا اس کی کیا ضرورت تھی، آپ فرمائیں میرے لئے کیا حکم ہے؟‘‘
’’پہلے آپ چائے پئیں، پھر بات کرتے ہیں۔‘‘ ڈاکٹر سلمان پرسکون تھے۔
’’جی فرمایئے۔‘‘ میں نے چائے کا پہلا گھونٹ لیا۔
’’آج آپ کی سہیلی نہیں آئیں۔‘‘ انہوں نے گردن اٹھا کر مجھے دیکھا۔
’’میری سہیلی!؟‘‘
’’میرا مطلب ہے سسٹر ماہ رخ۔‘‘ انہوں نے وضاحت پیش کی۔
’’جی ہاں، وہ آج نہیں آئیں......‘‘
’’یقیناً کوئی مجبوری ہوگی۔‘‘ وہ بولے۔’’آپ جانتی ہیں مس ماہ رخ کو اسپتال میں سب ہی بے حد عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس کا بنیادی سبب ان کی مریضوں سے بے غرض، بے لوث اور بے مثال محبت اور جذبہ ہمدردی ہے، جس کی ہمارے پیشے میں سب سے زیادہ اہمیت ہے۔‘‘
’’جی ڈاکٹر صاحب۔‘‘ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔
’’جو بھی مریض ان کی زیر نگرانی رہتا ہے ان کے حسن سلوک کی تعریف کئے بنا نہیں رہتا۔ میرا خیال ہے وہ خدمت کو عبادت سمجھتی ہیں۔‘‘ ڈاکٹر سلمان نے کہا۔ میں خاموش رہی۔
’’مس مہرین بے شک آپ اسے خود غرضی کا نام دیں لیکن میری شدید خواہش ہے کہ محبت اور ہمدردی کے اس چلتے پھرتے پیکر کو میں اپنی ذات کا حصہ بنالوں۔ میں مس ماہ رخ کو اپنا جیون ساتھی بنانا چاہتا ہوں۔ مجھے اس سلسلے میں آپ کا تعاون درکار ہے۔ آپ اس کی دوست بھی ہیں اور ساتھی بھی، مجھے یقین ہے، آپ میرے موقف اور خواہش کو ان تک کامیابی سے پہنچا سکتی ہیں۔‘‘
’’مجھے خوشی ہوگی سر، آپ کا پروپوزل اس تک پہنچانے میں اور میرا خیال ہے کوئی وجہ نہیں ہونی چاہئے کہ وہ اس رشتے سے منکر ہو۔‘‘ میرے لہجے میں اطمینان اور کامیابی کی نوید تھی۔
’’مس مہرین آپ نے ہر قیمت پر اس رشتے کی تکمیل کرانی ہے۔‘‘ جب میں نے ان سے واپسی کی اجازت مانگی تو ان کی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔ وہ مجھے رخصت کرنے دروازے تک آئے۔
اگلے دن میں قبل از وقت ہی ڈیوٹی پر پہنچ گئی تھی اور بے چینی سے ماہ رخ کا انتظار کر رہی تھی۔
وہ وقت پر ڈیوٹی پر پہنچ گئی۔ اس کے چہرے پر نقاہت اور بے چینی کے آثار تھے، لیکن اس کے باوجود وہ مسکرائی، گرمجوشی سے ہاتھ ملایا، مجھے گلے لگایا، اور میرے رخساروں اور لبوں کو چوما۔
’’خیریت تو ہے۔ کل کیوں غیر حاضر تھیں؟‘‘ میں نے تشویش کا اظہار کیا۔
’’ہاں......بس چند دنوں سے طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔‘‘ وہ افسردہ تھی۔
’’کیوں، کیا ہوا۔‘‘ میں نے پوچھا۔

''کچھ پتا نہیں، میرے ساتھ نہ جانے کیا ہو رہا ہے۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔
''مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟'' میں بھی پریشان ہوگئی۔
''بس کیا بتاؤں باجی!'' وہ خاموش ہوگئی۔
''کوئی فیملی پرابلم؟''
''نہیں!''
''تو پھر؟''
''بس ہیلتھ پرابلم سمجھیں۔''
اس نے گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا اور اپنی روزمرہ کی مصروفیات میں جت گئی۔
جب ہم معمول کی مصروفیات سے فارغ ہوئے اور سانس لینے کا وقفہ ملا تو میں نے ڈاکٹر سلمان کا پیغام اس تک پہنچانے میں دیر نہیں کی۔
''آج ایک بڑی خوشخبری ہے تمہارے لئے۔'' میں مسکرائی۔
''تو بتاؤ نا جلدی سے؟'' وہ سراپا اشتیاق تھی۔
''تمہیں ڈاکٹر سلمان کیسے لگتے ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔
''وہ بہت اچھے ہیں، صورت سے بھی اور سیرت سے بھی'' وہ سنجیدہ تھی۔
''اگر ڈاکٹر سلمان کو تمہاری صورت اور سیرت پسند آ جائے تو؟''
''یہ میرے لئے یقیناً اعزاز کی بات ہوگی......'' وہ بولی۔
''اور اگر وہ تمہیں شادی کے لئے پروپوز کر دیں تو......؟''
''کیا کہا، شادی! میرے ساتھ!!......'' وہ یکدم کرسی سے اچھل پڑی۔
''ناممکن، بالکل ناممکن، بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' وہ غیر یقینی کی کیفیت میں تھی۔
''ڈاکٹر سلمان اس بارے میں بالکل سنجیدہ ہیں۔'' میں نے اسے یقین دلایا۔
''باجی آپ ہی سوچیں کہاں ڈاکٹر سلمان اور کہاں بی ماہ رخ۔'' وہ جیسے اپنا تمسخر اڑا رہی تھی۔
''بھلا تم میں کیا کمی ہے۔ تمہارے بلند قامتی، سرخ و سپید رنگت، بڑی بڑی غلافی آنکھیں، کمر تک لہراتے بھورے بھورے بال، ہر دم چہرے پر مچلتی شوخ مسکان، کیا کسی کو اپنے دام میں گرفتار کرنے کے لئے یہ سامان ناکافی ہے؟'' میں نے مسکرا کر اس کے سراپا پر نظر ڈالی۔
''باجی بس رہنے دیں...... مجھے پتا ہے ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہ صرف آپ کی نظروں کی خوبصورتی ہے۔''
''اب تم سنجیدگی سے میری بات سنو۔'' میں نے اسے اعتماد میں لینے کی کوشش کی۔
''کل ڈاکٹر سلمان نے مجھے یہ ذمہ داری سونپی ہے کہ میں ان کا یہ پیغام تم تک پہنچا دوں۔''
''کیا!!!'' اس کے منہ سے یہ لفظ اتنی زور سے نکلا کہ آس پاس کے سب لوگ ہماری جانب متوجہ ہو گئے۔
''چیخو مت...... دیکھو سب لوگ ہماری جانب دیکھ رہے ہیں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔
اس کے چہرے پر یکدم اداسی چھا گئی۔ لگتا تھا کہ وہ ذہنی کشمکش اور تذبذب کا شکار ہے۔

''باجی میں ابھی شادی نہیں کر سکتی......'' اس نے جیسے اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا۔
''پاگل ہوئی ہو کیا؟'' مجھے غصہ آ گیا۔ ''کیا تمہارے لئے اس سے بہتر رشتہ آ سکتا ہے؟ آخر تمہارے اس انکار کی کوئی وجہ تو ہوگی؟''
''باجی آپ پلیز ناراض نہ ہوں۔ میں ذہنی طور سے ابھی شادی کے لئے تیار نہیں ہوں۔''
''تو تیار کر لو اپنے ذہن کو...... ہم ڈاکٹر سلمان سے کچھ مہلت مانگ سکتے ہیں۔ بتاؤ تمہیں فیصلے کے لئے کتنا وقت درکار ہے؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔
''باجی آپ کو تو پتا ہے، ہمارے حالات کا۔ ہمارے پاس نہ رہنے کو ڈھنگ کا مکان ہے، نہ کسی کو بٹھانے کے لئے مناسب جگہ......''
''حالات بدلنے کا یہی تو موقع ہے پگلی۔ اس موقع کو غنیمت جانو، تمہاری زندگی سنور جائے گی......'' میں نے اسے سمجھایا۔
''میں موقع سے فائدہ اٹھانے والی نہیں ہوں باجی...... مجھے معلوم ہے یہ طبقاتی فرق عمر بھر مجھے احساس کمتری میں مبتلا رکھے گا۔ آپ پلیز انہیں انکار کر دیں'' ۔ وہ روہانسی ہوگئی۔
''بھلا یہ کیا جواب ہوا۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ ہمارے اس جواب سے وہ مطمئن ہو جائیں گے۔''
''پھر آپ انہیں بتا دیں کہ میرا رشتہ کہیں اور طے پا چکا ہے۔'' اس نے اپنی نظریں نیچے جھکا لیں۔
''یہ بھی سراسر جھوٹ ہے۔'' تم غلط بیانی سے کام لے رہی ہو۔
وہ لاجواب ہوگئی اور اچانک اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے، میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور تسلی دی، اسے گلے سے لگایا تو اس نے مجھے اپنے ہاتھوں کے حصار میں جکڑ لیا اور اپنا منہ میرے سینے میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اگلے دن وہ ڈیوٹی سے پھر غیر حاضر تھی، پھر اس کی مسلسل غیر حاضری کو پانچ دن ہو گئے۔ مجھے تشویش ہوئی۔ میں نے موبائل پر رابطے کی کوشش کی، لیکن اس کا فون مسلسل بند ملا۔
شام کو ڈیوٹی سے فراغت کے بعد میں نے رکشہ پکڑا اور اس کے گھر پہنچ گئی۔ رکشہ دروازے پر رکا تو دروازے پر جھولتے ہوئے تالے نے مجھے مایوس کر دیا۔
میں نے رکشہ والے کو رکنے کا اشارہ کیا اور پڑوس کے ایک دروازے کو کھٹکھٹایا۔ ایک عمر رسیدہ خاتون نے دروازے سے جھانکا۔ میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ ماہ رخ بیمار ہے اور نیشنل ہسپتال میں داخل ہے۔ میں رکشے میں دوبارہ بیٹھی اور ڈرائیور کو نیشنل ہسپتال جانے کی ہدایت دی۔
اسپتال کے کمرہ نمبر 36 کے دروازے پر میں نے آہستہ سے دستک دی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔
سفید بستر پر سفید چادر اوڑھے ہوئے وہ آنکھیں بند کئے بستر پر دراز تھی۔ مسہری سے تھوڑے فاصلے پر اس کی خالہ کرسی پر بیٹھی تھیں، مجھے پہچانتے ہی وہ یکدم کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور فرط مسرت سے مجھے اپنے گلے لگا لیا۔
''خالہ کیا ہوا اسے؟'' میں نے آہستگی سے پوچھا۔
''اس کا آپریشن ہوا ہے بیٹی اور اب یہ لڑکی سے لڑکا بن گئی ہے۔''
''What!'' میرے حلق سے اچانک حیرت میں ڈوبی ہوئی چیخ نکلی۔

چیخ کی آواز پر اس نے آنکھیں کھولیں اور مسکرانے کی کوشش کی۔
''یہ اچانک کیسے ہو گیا ماہ......'' میں ماہ رخ کہتے کہتے اچانک رُک گئی۔
''تم اب اسے شاہ رخ کے نام سے پکار سکتی ہو......'' خالہ نے میری مشکل آسان کر دی۔ میں اب شاہ رخ کے قریب پہنچ چکی تھی۔
''یہ سب کچھ اچانک بالکل نہیں ہوا۔'' اس کی آواز میں مردانہ آہنگ در آیا تھا۔
''وہ کسی شاعر نے کہا ہے ناں، وقت کرتا ہے پرورش برسوں، میرے اندر عرصے سے ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری تھا اور یہ عرصہ میرے لئے کتنا اذیت ناک تھا اس کا تصور بھی محال ہے...... آپ مجھے معاف کر دیجئے گا......'' اس کی آنکھوں میں نمی چھلک رہی تھی۔
''جب تمہارا اپنا اسپتال موجود تھا تو تم یہاں کیوں آئے؟ اپنے اسپتال میں تمہارا علاج بھی مفت ہو جاتا۔'' میں نے شکایت کی۔
''وہاں جاتا تو تمام لوگوں کو میری حالت کا پتہ چل جاتا اور مجھے بے حد شرمندگی ہوتی۔'' وہ جیسے اپنی موجودہ حالت پر اب بھی شرمسار تھا۔
''عجیب منطق ہے۔ کیا اب سب لوگوں کو علم نہیں ہوگا اور بھلا اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے۔'' میں نے اس کے خدشات دور کئے۔
اچانک میری نظر اس کے لمبے لمبے بھورے بالوں پر پڑی جو تکیئے پر ابھی تک سانپ کی طرح لہرا رہے تھے۔
''خالہ جان ان کے لمبے بالوں کا تو کچھ علاج کریں، عجب مضحکہ خیز لگ رہے ہیں''۔ میں ہنس دی۔
''میں نے ڈیوٹی روم فون کیا تھا۔ حجام کل صبح ان شاء اللہ آئے گا تو اس کے بال بھی چھوٹے ہو جائیں گے۔'' خالہ نے بتایا۔ میں تقریباً نصف گھنٹے وہاں بیٹھی رہی اور جب جانے کے لئے اٹھی تو میں نے شاہ رخ سے کہا۔
''تمہیں نئی زندگی مبارک ہو۔ بس اب تم جلدی سے صحت مند ہو کر اپنی ڈیوٹی پر واپس آ جاؤ۔'' دروازے پر پہنچ کر میں نے کہا۔ ''مگر میں تمہیں مردانہ وارڈ میں نہیں جانے دوں گی۔'' ساتھ ہی میرے منہ سے ایک زوردار قہقہہ نکلا۔
''سنئے مس مہرین۔'' دروازہ کھولنے سے پیشتر شاہ رخ کی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔ اس نے آج پہلی مرتبہ باجی کے بجائے مجھے میرے نام سے مخاطب کیا تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر اس پر نظر ڈالی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا۔ میرے آگے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور میں چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔
''کہو کیا بات ہے؟''
''اپنا کان میرے منہ کے قریب لائیے۔'' اس کے چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ تھی۔ لیکن اب مجھے اس کے قریب جاتے ہوئے حجاب محسوس ہو رہا تھا۔ میں تذبذب میں پڑ گئی۔
''ڈرو نہیں۔ میرے قریب آؤ پلیز!'' اس کے لہجے میں محبت حلول کر گئی تھی، تب میں نے ہمت کی اور اپنا کان اس کے منہ کے قریب لے گئی۔ وہ مسکرایا اور پھر اس کی مدھم آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔
''مجھ سے شادی کرو گی؟''

☆......☆......☆

بچا کھچا سانچا

زیب اذکار حسین

اب کیا گم ہو گیا ہے؟ کیا شے کھو گئی ہے۔ بندۂ بے دام تو اضافتوں کو بھی سنبھال کر رکھتا ہے، سابقے اور لاحقے تو ایک گمان آلود زندگی کا حاصل ہیں۔ ابھی تک کچھ نہیں بگڑا ہے، وہ اپنا کچھ کا کچھا تو ہے اب وہی کام آئے گا۔ اس کی آوازوں کی بازگشت آہ و زاری کو زندہ رکھے گی۔ یہ احباب احباب غفلت مارا سہی، اس کی خبر گیری کرنے والے تو محتاط ہیں اس کے اندیشہ گر تو مال برداری میں طاق ہیں وہی گواہی دیں گے کہ میں پرندے نے پر مارا ہے اور کون فاختہ، فاختہ آرائی پر بضد ہے۔ کچھ کھونے کے لئے کچھ پانا تو پڑتا ہی ہے...... اس پڑاؤ میں کچھ پانے سے کچھ کھونے تک کا عمل کب آیا۔ کچھ خبر نہیں ہے اگر کوئی شے گم ہو چکی ہے تو پھر کسی شے کا اضافہ بھی تو ہونا چاہیے تھا...... وہ کہاں ہے؟ اس بار کوئی سمجھوتہ نہیں ہو گا...... جو بھی ہے سامنے آئے!!

دنوں کی دہائی سے کس کو سروکار ہے؟
راتوں کی راحت کس کا خواب ہے

اب تو واجب الوقت ہوا سے اس بندۂ بے جان کو اتنی غرض ہے کہ سامنے آئے اور اپنا حساب چکتا کرے۔

یہ بندۂ بے دام تو اسی روز مر گیا تھا جس روز اس پر منکشف ہوا تھا کہ دنوں کی گنتی میں اس کا خود کو ہلکان کرنا مناسب نہیں ہے اس کے لئے مناسب کیا تھا اسے خود سمجھنا تھا...... مگر یہاں پر بھی رائے زنی کام نہ آئی...... تاریکی پر بھی اس کا تصرف نہیں تھا۔ تاریکی بھی کسی اور کی ملکیت تھی۔ اُس کے دن کب کے گنے جا چکے تھے اور وہ تھا کہ دن میں تارے تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ اُسے خبر ہی نہ تھی کہ روشنی کب کی جا چکی ہے...... وہ اب کسی ٹیکسٹ کو اپلائی نہیں کرے گا اور کوئی سیلفی سٹیک SelfieStick اسے متوجہ نہیں کر سکے گی وہ ہاتھ اُٹھا کر چلے یا سر جھکا کر چلے بات ایک ہی ہے وہ جسے جسم سمجھتا رہا تھا وہ محض ایک سایہ تھا اور وہ جسے سایہ سمجھ رہا تھا وہ ایک ہیولہ، ہاؤ ہو تھا جواب اس کے اوسان خطا ہونے کی صورت میں تحفتاً عطا کیا گیا تھا، یہ ٹویٹر (Twitter) کا زمانہ تو لوٹر (Looter) کا زمانہ بن گیا تھا۔ چور مچائے شور کا ترانہ اہلیتوں کی جانچ کیلئے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ اس کا آنا وارفتگی کی فضا کو فزوں تر کر دیتا تھا مگر اب اس کی آمد آوارگی کی نذر ہو چکی تھی۔ اس نے ان کا دل دیکھ لیا تھا وہ تو اُجاڑ پڑا تھا۔ اُسی اجاڑ پڑے میں مچھلی کی موت چھپی تھی وہ اس کی جانب یوں لپکی جیسے اسے قتل ہی کر ڈالے گی۔ پھر بھی اس کی نظر کسی پاپا رازی کے کمرے پر جا پڑی تھی شاید وہ ''اُجاڑ پڑے'' کی شان و شوکت میں اضافہ کی نیت سے وہاں پھینکا گیا تھا کیمرے کی آنکھ کا موتیا دیکھا جا سکتا تھا مگر اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی گئی تھی...... اس نے لمحوں کا فاصلہ صدیوں میں طے کرنے کی ٹھانی اور گزرے دن کو ''گئے دن'' کے نام سے موسوم کیا...... اسے اپنی بیتی مسافت کا مرتبہ بھی طے کرنا تھا جو دن اُس کا نہیں تھا وہ اُس دن کا نہیں تھا...... وہ بھی تو دن جلی تھی۔ اس کا اجلاپن بھی تو دن کو کھٹکتا رہا تھا۔ اب بندۂ بے دام کو اپنی آنکھ کا خوف ستانے لگا۔ اُس نے تیمی سے اپنی گری پڑی نظر کو اٹھایا اور وہاں سے چلتا بنا۔ اُسے اُس روشنی سے کچھ غرض نہ تھی جو دن کے تسلط میں اپنی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اسے وہی روشنی عزیز تھی جو آنکھ کے

آنگن میں بیٹھی مسکراتی رہی تھی...... گنگناتی رہتی تھی یا پھر ہنگامہ آرائی پر اتر آتی تھی...... ہنگامہ آرائی پر اُترنا آنکھ کے آنگن کی ویرانی کا سبب بن جاتا مگر اب اس بات کی کیا پروا...... اس کی ناراضی کی اپنی کوئی وجہ تو ہوتی نہیں تھی اس لئے وجہ کی ضرورت اور تلاش کی بچت پر بات ختم ہو جاتی۔ وہ بے حسی کی مدت بھی طویل تھی جب یہ خفت بردار دنوں کو اپنا سمجھتا رہا تھا اور پھر اس خوش فہمی میں بھی برسوں مبتلا رہا تھا کہ رات تو اپنی ہے۔ دنوں کی گنتی کرنا دنوں کا حساب کتاب رکھنا، دنوں کا انتظار کرنا اور دنوں سے دل لگانا...... بعد میں کھلا کہ یہ ہر ایک کے اختیار کی بات نہیں تھی...... اس بے وقت کی راگنی نے اس خاموشی کو جنم دیا تھا جس کا تذکرہ کسی تیاگی یکسر کی صورت میں بھی نہیں آئے گا۔ گو...... ہکلا ہکلا کر معلومات حاصل کرتے پھریں گے مگر کچھ حاصل نہ ہوگا اور متوقع انتقال پر ملال کو حادثاتی موت کے ذیل میں شمار نہیں کیا جا سکے گا۔ خانہ بدوش اپنی نیندیں اٹھائے اٹھائے پھریں گے اور بے وزن وجودی وراثتوں کے بہی خواہ اپنے خواجہ سرا یونہی آہٹوں سے اٹھکیلیاں کرتے رہیں گے۔ ہاتھ وہی آئے گا...... جو ہاتھ نہ آئے گا۔ مُسکان ماری منظر نگاری کتنی بار آئے گی......

کچھ احباب حباب کا خیال خام یہ بھی تھا کہ جب بندۂ بے دام کو اس بانکپن کی ممکنہ حدیں پھلانگ ہی چکا ہے تو باقی کا حساب چکتا کرنے میں کیا برائی ہے۔ لگے ہاتھوں وہ بھی ہو جائے جس کی اجازت فہم نہیں دیتی۔

گویا بندۂ آرام کی گراوٹ ازبس ضروری تھی انہیں سرزمینا وجود پر پانی کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے...... یوں تو بندہ مشاورت کا زیادہ قائل نہیں تھا مگر اس مرحلے پر اس کی ضرورت بھی محسوس کی گئی...... سر میں درد نے آنکھ بنالی تھی۔ کوفی (Coffee) کا کپ کفایت شعاری کے ساتھ خرچ کیا جا رہا تھا۔ نمک کی مقدار اتنی بھی نہیں تھی کہ مٹھاس کا دم ہی گھٹ جائے۔ پھر بھی لگ رہا تھا کہ شکر قدرے کم ہو گئی ہے۔ خیر چائے بھی تو ٹھنڈی ہوتی جا رہی تھی۔ غور کرنے پر کھلا کہ سوفٹ ڈرنک زیادہ موزوں رہے گی۔ ٹھنڈک کا زمانہ جا چکا تھا اور گرمائش کا دور دورہ تھا۔ اُس کی آواز کب سے گھور رہی تھی۔ ٹیلی فونک کنورسیشن بے نتیجہ رہی تھی۔ وہاں سے ہٹ جانا ہی بہتر تھا لیکن ہٹنا بھی تو مشکل نظر آ رہا تھا۔ ایک نیم وا مسکراہٹ مسلسل پھنکار رہی تھی۔ شاخوں نے در بدر بھٹکنا چھوڑ دیا تھا بچا کھچا سانچہ کسی کام کا نہیں تھا۔ اُس کے تیور ہی بتا رہے تھے کہ وہ گفتگو کو خاموشی پر ترجیح دینے کا قائل ہے۔ ایسی صورتِ حال میں آنکھیں کس کام کی رہ جاتی ہیں لہٰذا اُنہیں بصارت کے سپرد کر دینا ہی ایک بہتر وطیرہ رہ جاتا ہے۔ گمنامی کی قوت نیک نامی سے کہیں برتر ہے، اسے نہ آسمان کا رنگ فہم گزیدہ تھا۔ یوں دکھائی پڑتا تھا جیسے ہر پانی میں نیلاہٹ کا فور ہو گیا ہو جیسے بلیونس (Bluness) میں گرین نس (Green Ness) گھل مل گئی ہو یا مل کر گھل گئی ہو اور خنک فائدہ خیز اپنی موجودگی میں چھٹی حیثیت اختیار کر گیا ہو...... اور پھر جیسے اُس سے ایک تمپشی رنگت کو احساسِ موثر کر دیا گیا ہو...... اور یہ آغاز یہ پیش کش گویا روش رنگ کو یوں لے ڈوبی کہ بے نوری مقدر بن گئی۔ دو دریا ہنوز بالشت بھر کا فاصلہ قائم رکھے ہوئے تھے۔ نیکی کا یارا نہیں تھا، بُرائی کا کنارا نہیں تھا...... نیتاً نیک ہو نہیں سکتا...... آدمی ایک ہو نہیں سکتا جاگ اٹھوں گا پھر سویرے میں...... سوچتا ہوں تو سو نہیں سکتا اپنی حالت پہ رو نہیں سکتا، بھیڑ وہ ہے کہ کھو نہیں سکتا۔

ملبہ ویسے کا ویسے ہی پڑا تھا البتہ اُسے صاف کر دیا گیا تھا۔ بظاہر ملبہ ہٹانے کا کام جاری تھا۔ ٹھیکیداران دُنیا تھے کہ مسلسل معائنے اور مشاورت کے لئے آ رہے تھے۔ زلزلہ اور زلزلہ گری اُن کا موضوع تھا...... وہ زلزلوں، بادتوں، دھماکوں، کیمیائی اوزاروں اور ہتھیاروں کی آوازوں اور آزمائشوں کے ممکنہ اثرات کو بھی پیش نظر رکھ کر اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا چاہتے تھے۔ وہ نزلے اور زکام کی بیماریوں پر بھی تحقیق کر رہے تھے کیونکہ زلزلے نے بہتوں کی حالت

خراب کر رکھی تھی۔ محبِ وطن شہریوں کی سلامتی کی فکر گویا اُن کا مقصدِ حیات تھا۔ ایک شہر کا گرنا اُن کے لیے ایک مُلک کے گرنے کے مترادف تھا اور ایک مُلک کا بسنا، گویا اُن کے لئے ایک کائنات کا بسنا تھا...... یہی وجہ ہے کہ وہ ملبے کی ممکنہ صفائی ستھرائی پر طبع آزمائی کر رہے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ مضبوط بنیادوں پر استوار عمارتیں شاذ و نادِر ہی گرتی ہیں، لہٰذا ملبے کا ہٹنا اتنا اہم نہیں ہے جتنا اہم ملبے کا ٹھیک سے جمنا اور مرتب ہونا ہے۔ پڑوسی ممالک سے تمام شعبہ ہائے زندگی سے متعلق وفود آ، جا رہے تھے پڑوسی ہی کیا دُور پار کے ممالک سے بھی محققین آ، جا رہے تھے۔ شہروں کے تعلق سے بنیادی نکتہ یہی تھا کہ زلزلہ نام کی بلا کب اور کیوں آ چمٹتی ہے اور یہ کہ ملبہ سازی کا کاروبار کیوں کر محفوظ رکھا جا سکتا ہے، زلزلے کے اثرات اور کیمیائی آلات کی تباہ کاری کے اغراض سے...... بندۂ بے دام ابھی تک بھاؤ تاؤ کے حصار سے باہر تھا اور اِس امر پر مسلسل غور کر رہا تھا کہ کیا شے گم ہوگئی ہے اور کیا شے بڑھ گئی ہے...... اور آخر کس شے کو پانے کے لئے کیا چیز کھوئی جا سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ صفحہ پلٹنے کی گردان بھی کئے جا رہے تھا۔

پھیرن میں اُلٹی کیسر کانگڑی

زین سالک

''آپ غلط جگہ پر آگئے ہیں۔ آپ کی سیٹ آگے تھی۔'' ڈرائیور نے آہستہ سے ٹکٹ پر 'سعید بھٹ' دیکھتے دیکھتے کہا۔

سفر کے آغاز پر ہی یہ ذومعنی جملہ 'خبر یہ سن کر اسے انجانا سا دھچکا لگا۔ اور وہ سر جھٹک کر پہلی بس کے گرے ہوئے پردوں کی نیم تاریکی میں اپنا ٹرالی بیگ اٹھا کر خاموشی سے اوپر ڈیک والی سیٹ پر چلا گیا۔ اور اپنی سفری دستاویزات کو کوٹ کی اندرونی جیب میں ٹٹول کر اطمینان کرنے کے بعد بریف کیس سے لیپ ٹاپ نکالتے سے سوچنے لگا کہ دوسرے مسافروں کو اب تک بس اسٹینڈ آ جانا چاہئے تھا......شاید لوگ سوچ سوچ کر آرہے تھے۔

اسٹارٹ بس کی تقریباً غیر محسوس ارتاشی لہریں ان کی ابھی تک منتظر تھیں۔

سری نگر میں لاری اڈے پر شدت پسندوں کے حملے کے پس منظر میں! پتہ نہیں بس روانہ ہو سکے گی یا نہیں......؟

بے اختیاری میں اس کا ہاتھ ٹبیکو پاؤچ کی طرف گیا......اور پھر پائپ سلگاتے سلگاتے، تمباکو نوشی کی ممانعت کا ان دیکھا سرخ چکر اا ور کراس اپنے سر پر محسوس کر کے اس نے بجھا کر بریف کیس میں واپس ٹپک دیا۔

اس نے دوبارہ اوپر اپنا بیگ دیکھا جس میں روم سے خریدے ہوئے Scaldinos کے علاوہ بہت کچھ زادِ راہ تھا۔

اپنا سر ہیڈ ریسٹ پر ٹیک کر اس سے پہلے کہ وہ آنکھیں موندتا اور پچھا سے الجھنے لگتا......اس نے لیپ ٹاپ آن کر کے ڈیسک ٹاپ پر انہیں سنانے کے لئے محاورے اور Stanza کی فائل اوپن کر کے ایک بار پھر سے اسے چیک کیا۔

'what laila was on majnun's bosm so is the kanger to a kashmiri'

وہ زیرِ لب مسکرایا اور دوسری فائل کھولی......

oh kangri! , oh kangri!

you are the gift of houries of fairies; when I thak you under my arm yor drive fear from my heart.

'السلام علیکم......!انوار لون......!

مصافحے کے لئے بڑھا ہاتھ بعجلت لیپ ٹاپ بند کر کے اس نے تھام لیا......ڈاکٹر انوار لون ڈینٹسٹ......! اس کا سعودیہ کا فلیٹ میٹ......اس کا تعلق وادیٔ کشمیر کے شمالی علاقوں میں آباد کشمیری مسلمانوں کے عظیم ترین زراعتی خاندان سے تھا......اس کی سیٹ عقب میں تھی......قلق ہوا......

لیکن جلد ہی بہت سے یکے بعد دیگرے منّو، وائیں، راٹھور، بٹ، ڈار، ڈرابو، سپرو، بقال، راتھر آتے رہے اور ایک دوسرے سے گھل مل گئے...... ایک نیا کنبہ وجود پذیر تھا۔

ان کا پہلا موضوع سری نگر کا واقعہ تھا۔ لیکن جلد ہی وہ اپنے بچھڑے ہوئے رشتہ داروں اور منازل کے بارے میں رسمی بات چیت کر کے عام بے ضرر سے موضوعات پر آ گئے۔

ایتابھ منّو ہے...... سعادت حسن منٹو...... نہرو پنڈت...... مسلم سپرو نے بتایا کہ وہ اب شیخ کا ٹائٹل استعمال کرتا ہے...... علامہ اقبال بھی سپرو تھے...... سپرین گاؤں...... برہمنوں کا شیوائی مذہب...... زرتشتی عقائد سے ملتا جلتا...... وغیرہ......

اور اُسے ان باتوں میں خاصا مزا آنے لگا......

اُس کے برابر والی سیٹ پر ملک اسلم، دلبر ہوٹل کے کپواڑہ سے آئے چھوٹ راجپوت خاندان کے ملک جمال کا بیٹا تھا جس نے اپنے دوست ملک غلام محمد کے ساتھ مل کر یہ ہوٹل بنایا تھا۔

اس نے اپنے ہوٹل آنے والی کئی سیاسی شخصیات کا ذکر کیا...... جس میں لیاقت علی خاں، شیخ منظور (سپیکر)، ممتاز بھٹو، عبدالحفیظ پیرزادہ، میاں نواز شریف اور دوسری اعلیٰ اختیار شخصیات کا کشمیری دسترخوان 'وزدان' کا دلچسپ پیرائے میں ذکر تھا۔

بھٹو کے بارے میں اس نے بتایا کہ کشمیری شال اوڑھے، ماؤزے تنگ کیپ لگائے...... بھٹو کو اس کے والد نے بتایا کہ وہ انہیں نہ پہچان سکے جب تک کہ انہوں نے شال نہ اتاری...... انہیں رِستے (مٹن کی ڈش) یمبر زل (ابلے انڈے اور مٹن کی ڈش)، ہریسہ آب گوشت اور کرم مچھلی پسند تھی۔ کھیر کے علاوہ آخری دور کشمیری قہوہ تھا اُس دن۔

سفر اچھا کٹ رہا تھا۔

بس کے ٹی وی سیٹ پر 'پارتو' فلم شروع ہو چکی تھی۔ ایک پروفیسر کی کہانی جو اپنے ادبی جنون کی خاطر سب کچھ چھوڑ دیتا ہے۔

چکوٹھی پر وہ کب اترے چڑھے، پل پیدل کراس کیا، سفری دستاویزات چیک کرائیں، پتہ نہ چلا...... بس دوبارہ چلی تو 'کشمیر کی کلی' کی طرف کچھ دیر تک لوگوں کا دھیان لگا رہا......

دیکھی ہوئی ہونے کے سبب اُس نے سر پیچھے ٹکایا آنکھیں موندھیں اور چچا سے بحث کرنے لگا......

'خدا بہشت بریں عطا کرے اس کشمیر الاصل ذہین و فطین شخص کو جس نے کانگڑی ایجاد کی...... اور مظلوم کشمیری عوام کی خدمت گراں مایہ انجام دے کر اپنے لئے صدقۂ جاریہ محفوظ کر لیا'......

'بس کریں چچا اس نے کشمیری عوام میں جمود، کاہلی اور آلسی پن پیدا کیا ہے'...... 'ایک کانگڑی ہی وفا اور خلوص کا رشتہ نبھا کر کشمیریوں کے جسم میں روح کی گردش برقرار رکھتی ہے'...... انہوں نے جواب دیا۔

'موسم سرما کی شدت سے بچنے کے لئے لکیر کے فقیر والی بات ہوئی، یہ تو' سعید بولا۔

'کانگڑی صدیوں پہلے جیسی تھی آج بھی ویسی کی ویسی ہے'...... چچا اڑے رہے۔

'اچھا یہ جدید اطالوی Scaldino دیکھئے...... جو میں آپ لوگوں کے لئے لایا ہوں'۔

'اس بدیسی کو رہنے دو...... کانگڑی کشمیر کی مخصوص علامت بن چکی ہے، میاں'...... چچا ضد پر اتر آئے۔

تیز روشنی سے اس کی آنکھیں کھلیں۔ کوچ کے پردے سب نے پورے پورے کھول دیئے تھے۔ بس پامپور ع کے زعفرانی کھیتوں سے گزر رہی تھی۔

عورتیں مرد بنفشی رنگ کے پھول شاخوں سے بنی ٹوکریوں میں جمع کر رہے تھے۔ ایک موڑ پر کوچ آہستہ ہوئی تو شیشوں سے ایک پھول چننے والی کا ہاتھ آدھے ناخنوں پہ مہندی لگا، ہلکی سنہری دھات کے بنے منقش گڑے پہنے نظر آیا۔ ذرا آگے برابر میں ایک لکڑی کی میز پر پھول رکھے تھے...... چار عورتیں پھیرن پہنے سر پر مخصوص رومال باندھے یا چادر کا پلو لپیٹے موچنی سے بنفشی پھولوں کے سرخ غنچۂ گل سے ریشے نکال رہی تھیں......

ان میں سے کم از کم ایک نے نسبتاً نفیس، رنگین، زری والی پھیرن پہنی تھی۔ لیکن اس کی انگلیوں کی پوروں سے بھرا جفاکشی کا میل اور جھریوں بھری خشک پھٹتی ہوئی جلد والا کمپلیکشن لئے وہ دنیا کا مہنگا ترین مسالہ بنانے جا رہی تھی...... پھولوں کی چھائی چیر کو نفاست سے ریشے نکال کر ایک طرف اور خالی پھوکے بے ریشہ پھول دوسری طرف کرتی جا رہی تھی...... ان پھولوں کا کیا بنے گا وہ سوچنے لگا۔

بس آگے بڑھی تو دوبارہ پردے گرا دیئے گئے...... اور وہ کسی ممکنہ مشترکہ کشمیر کانفرنس کا خواب دیکھنے لگا۔ کیا ان دونوں خطوں کے مشترکہ حسن، روایات، کلچر و ثقافت، ادب و موسیقی کی کشش...... کیا یہ سب مل کر بھی...... دو طاقتوں کی ازلی رسہ کشی سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتیں...... بزکاشی کی بے بس گوسفند ہی بنے رہیں گے ہم لوگ......؟

'اے وطن تیری جنت میں آئیں گے اک دن'

ڈرائیور نے جیسے غلطی سے سی ڈی لگاتے ہی کچھ احساس ہونے پر بند کردی اور اس نے پھر سے سلسلہ جوڑا......

وہ دن ضرور آئے گا جب یہ دونوں دبا کر آپس میں صرف اور صرف تجارت کریں گے...... صنعتکار کا بیٹا مطمئن ہو گیا کہ اگلی بار آؤں گا تو امن کی آشا حقیقت میں تبدیل ہو چکی ہوگی۔!

نہ گل کھلے ہیں نہ تم سے ملے نہ مئے پی ہے......!

'کسی نے اپنا تھری ان ون آن کر دیا تھا۔ اس کا دھیان فیض، ایلس شادی اور نکاح خواں شیخ عبداللہ کی طرف چلا گیا...... یہ اگلے وقتوں کے شاعرانِ کرام کس قدر خوش نصیب ہوتے تھے کہ اپنا سر پائے ساقی پر رکھ کر موتیوں کی لڑی پرو لیتے تھے'......

قریب آتی رشتہ داروں کی شادی کی تقریب اور پھر عید کے کشمیری کھانوں کے بھپکے آنے لگے......

'حضرت بل، حضرت بل'...... 'موئے مبارک'...... اور لوگ اس طرف متوجہ ہو کر نام محمدؐ کو ناخنوں کو چومنے اور اسے دیکھنے میں لگ گئے۔

بارہ مولہ، چرار شریف سب گزر چکا تھا۔ وہ چنار وادیوں میں تھا......

اور پھر روشنی کا ایک چھپا کا سا ہوا...... سب پردے پہلے ہی اُٹھا چکے تھے۔

اس کے سامنے پانی کا بڑا سا تھال تھا۔ جس کے ایک طرف نیم دائرے میں شری دیوی (لکشمی) کا سورج میں نہایا دولت نگر اور دوسری طرف بلند پہاڑ نیم دائرہ بناتے پانی کو سہارا دیئے ہوئے......!

یہ دن والی ڈل کی آغوش تھی جس میں تیرتے باغات نما کھیت، ان پر پھیلا ہوا سبزہ عجب بہار دکھا رہا تھا......

ہاؤس بوٹ، عام کشتیاں، ڈونگے، شکارے، ڈل کی سطح پر کہیں محوِ خرام مٹک چال میں اور کہیں ساکت ہونے کی ناکام

معشوقانہ کوشش میں پہلو بدلتے مچل رہے تھے۔

سفید کنول کے پھول، سنگھاڑا اور دیگر کئی اقسام کے سرکنڈے ڈل کے ریشمی صاف نرم پانی میں دِکھ رہے تھے۔

دوستی بس اڈے پر پہنچی...... چچیروں نے اسے پیار و محبت کی بغل میں دبالیا اور وہ گھر میں اپنا مال و اسباب کھول کھال کر جلد ہی ہر ایک کو اس کے تحفے پکڑا رہا تھا......

اُس نے کانگڑی کا نعم البدل اطالوی ہیٹر انہیں چلا کر دکھایا اور اسے پشمینہ کی خاص میٹھے پانی میں ڈھلی کشمیری شال اور زری کے کام والے پھیرن لباس کے ساتھ جدت طراز، دیدہ زیب سٹائل کی نقش و نگار اور گل بوٹے والی کانگڑی اور درگاہ حضرت بل کی رنگ برنگی گولک ملی۔

کھانے پر وہ سب اس کے اور چچا کے درمیان ہوا جو وہ سوچ کر آیا تھا۔ اس نے ان سے کانگڑی کینسر، کا بھی ذکر کیا تھا۔ جو شاید انہیں معلوم تھا...... وہ سب اس کے آگے پیار محبت میں بچھے جا رہے تھے۔

اس نے رضیہ کو پہلی بار نظر بھر کر دیکھا اور بے چین ہو گیا...... رخساروں کے گڑھوں سے نکل کر وہ چاہِ زنخداں میں کھو گیا...... ماتھے پر بندھے رومال، زری بنت کی پھیرن، کانوں میں گولوں والی بالیاں، سحرانگیز مسکراہٹ ہاتھ جھلانے باندھنے کا مخصوص انداز...... اس نے ہاتھ پیر ڈال دیئے......اور جب اس کی آنکھیں چار ہوئیں تو وہ پوری طرح سر تا پا انہیں میں ڈوب چکا تھا۔

ان کے یہاں گرم حمام تھا۔ غسل کے لئے وہ طوعاً و کرہاً اٹھا...... بعجلت غسل کیا اور پھر سلپچی میں روایتی انداز میں اس کے ہاتھ دُھلائے گئے......

کشمیری وازوان کا پورا پورا اہتمام تھا...... شلجم کی شب دیگ، گشتابہ، طبق ماز، میتھی ماز، رمزہ، کشمیری کباب تھے......اور میٹھے میں زعفرانی فیرنی......

'سعید بھائی اب آپ یہیں کاروبار شروع کر دیں...... پھیرن کی فیکٹری، قالین بافی یا کیسر کی پیکنگ کا ٹھیکہ وغیرہ ان میں بہت پیسہ ہے......

ایک کلو زعفران خریدنے نکلیں گے تو آپ کو ایک لاکھ اسی ہزار میں پڑے گا، چچیرے ارمغان نے رضیہ اور ارسلان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا......اور رضیہ نے بھرپور تائید کی...... فوراً چھوٹے کیتلی نما سماوار سے پیالیوں میں انڈیلے زعفران کے تیرتے ریشے والا قہوہ سب کے ساتھ پی کر دل ہی دل میں وہ

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است وہمیں است وہمیں است

جس کمرے میں اسے سلایا گیا اس کے وسطوں وسط بخاری کی چمنی چھت سے لگتی تھی۔ اس کی بڑی سی ریشمی ٹنکی ہوئی رضائی علیحدہ تھی۔ کونوں میں اتحاد کا خالص مٹی کی آوے میں پکی سادہ بغیر شاخ بندی کے کام والی کانگڑیاں بھی رکھی تھیں۔ ایک پیالے میں ایک طرف بڑے بڑے چلغوزے رکھے تھے۔

نیند میں ساری رات وہ ڈل کے گنڈولے میں بہتا رہا...... اس کے ساتھ تختے کی نشست پر پاؤں پر پاؤں رکھے پھیرن کا گھیر ڈالے کوئی بے چہرہ لڑکی تھی......

صبح ناشتے میں سماوار کے بلبلوں کی پھک پھک والی کشمیری میوہ چائے کے ساتھ ساتھ تازہ بہ تازہ تنور سے نکلے

ہوئے گرم کشمیری کلیجے کی دم توڑتی حدت، ہریسہ، خستہ ختائیاں ہمیشہ کے لئے اس کے حافظے کا حصہ بن چکے تھے۔

ان کے یہاں آنے والے ہر مہمان کو سب سے پہلے زیارت پر حضرت بل اور بعد ازاں ڈل وغیرہ جانے کا پروگرام بنایا جاتا تھا...... ان سب نے ایک ساتھ زیارت کا پروگرام بنایا تھا...... چچا گھر پر ہی رہ گئے۔

وہاں جالیوں کے پیچھے دعا مانگتے اس نے چوری چھپے ایک بار پھر سے نظر بھرنے کی کوشش کی لیکن خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی...... وہ تختے والی پھیرن پہنے تھا۔

واپسی میں ڈل کو رات کی روشنی میں دیکھنے کے پروگرام میں اس کی مراد بر آئی...... اس کے ساتھ صرف ارمغان اور رضیہ تھے۔

دور سے شکارے سے چھوٹے چھوٹے ٹاپو لگ رہے تھے...... اور ہاؤس بوٹ پانی پر تیرتے چھوٹے چھوٹے گھر جن کی روشنیاں رات کو ڈل کے پانیوں میں منعکس ہو کر بقول کسے سونے کی لہریں بن جاتی ہیں۔

'بوٹ اسٹیشن سے بک کروایا جا سکتا ہے انہیں' جو ساحل کے ساتھ ساتھ قائم ہیں۔'

'کسی دن آئیں گے دن میں' سعید بولا......

'ہاں 'ڈل گیٹ' سے نہرو پارک تک جائیں گے...... شکارا میں...... میں آپ کو 'راڈ' (بہتے باغات کا اس نے یہ کشمیری نام بتاتے کہا) کی چوری کے بارے میں بھی بتاؤں گا۔ یوں سمجھئے کہ ڈل وہ جگہ ہے جہاں پورے کا پورا کھیت زمین سمیت چوری ہو جاتا ہے، اپنی جگہ بدل لیتا ہے۔

'برفباری کے دنوں میں جھیل اکثر جم جاتی ہے۔ ان دنوں میں پوری طرح کھلے ہوئے پھولوں والے تیرتے باغات سے آپ لطف اندوز ہو سکتے ہیں'۔ ارمغان نے کہا۔

'ڈل Pleistocene دور میں بنی جبکہ درجۂ حرارت میں زبردست تبدیلیاں واقع ہوئیں اور برفانی دور کے بعد بین برفانی عہد اول بدل کر آئے یعنی فوق جدید' رضیہ بولی' اور اس کے بیچوں بیچ جہلم بھی تو گزرتا ہے'۔

'اور وہ بھی بتا دوں' رضیہ کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے استفسار کیا...... 'پٹھان ستر ابوں کی حرکت'......!

'نہیں...... نہیں' برا سا منہ بنا کر رضیہ بولی...... لیکن وہ نہیں رکا۔

' گورنر اسد خاں دو دو پنڈتوں کو بندھوا تا گھاس کے تھیلوں میں رسی باندھ کر اور ڈل جھیل میں ڈبو دیتا۔ اور تفریحاً ایک مٹکا غلاظت سے بھرا پنڈتوں کے سروں پر رکھتے جاتے اور پھر پتھر مار کر انہیں توڑا جاتا اور بدقسمت شکار غلاظت سے اندھے ہو جاتے' ...... اس نے ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔

'تم بہت گندے ہو'...... ! رضیہ نے کراہتا کہا......

سعید نے پوچھا' کیا ارسلان کو ایسی سیاحتی، تاریخی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ آج بھی نہیں آیا'۔

دونوں بہن بھائی ایک دم سنجیدہ ہو گئے اور کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے موضوع بدلا...... 'اچھا یہ بتاؤ وہ زُ دبن مہتا والا کنسرٹ کہاں ہوا تھا؟ اور وہ مجنون' والوں کا بھی......؟

'وہ جھیل کنارے مغلیہ طرز کے شالیمار گارڈنز ہیں......'

'اس نے بہت عمدگی سے جرمن بیتھوفن، ہائڈن اور روسی چیکا فوسکی کے کلاسیکی فن پارے پیش کئے تھے...... میں گیا تھا' احساس کشمیر' میں...... ان دونوں کنسرٹس میں...... بہت مزا آیا تھا'...... ارمغان بولا۔

’آپ یونان بھی گئے تھے...... ہمارا کشمیر زیادہ خوبصورت ہے یا یونان؟‘ رضیہ بھی......
’مجھے کچھ ڈالر کرنسی چینج کرنی ہے...... ساتھ ساتھ باتیں کرتے جائیں گے۔ بتاتا ہوں...... ابھی‘......
’مجھے معلوم ہے ادھر چلئے بھائی جان...... منی چینجر مجھے معلوم ہے‘...... ارمغان نے بتایا۔ وہ گویا ہوا۔
’خوبصورت یونان نے اپنے اودے متفرق شکل وصورت پہاڑوں اور مرقص سمندر اور شفاف آسمان سے باوقار یونانیوں کو جنم دیا...... خوش جسم (ہینڈسم) کروکس ایک خوبصورت دیوی تھی یونان دیومالا کی۔ شاید تمہیں معلوم ہو......؟
لیکن کشمیر یونان سے زیادہ خوبصورت ہے...... اس کا نیلا آسمان ایک سا ہے...... اور شاندار سورج کی روشنی...... لیکن اس کی اودی پہاڑیاں کہیں زیادہ پرشکوہ پیمانے پر ہیں۔ اور اگر اس کے سمندر نہیں تو اس کی جھیلیں اور دریا ہیں۔ اور ساکن زیادہ برفانی پہاڑ...... اس کی بھی کہیں بڑی اقسام قدرتی مناظر کی ہے...... کھیت اور جنگل سنگلاخ پہاڑ اور کھلی کشادہ وادیاں...... میرے لئے جس نے ان دو جگہوں کو دیکھا ہوا ہے...... کشمیر زیادہ خوبصورت ہے...... کا قدرتی حسن کسی نسل پر کہیں زیادہ اثر انداز ہوتا ہے......
ہمارا زعفران تک ان کے زعفران سے زیادہ اعلیٰ اور قیمتی ہے۔
تمہیں اندازہ ہے......؟
دونوں کی آنکھیں وطن کی محبت میں شدت جذبات سے نم ہو چکی تھیں۔ منی ایکس چینجر نے سعید کو جانے کس بات پر طنزاً کہہ دیا......
’ڈالر کی اہمیت آپ کی طرف ہوگی...... یہاں نہیں‘۔
اُسے غصہ آ رہا تھا کہ محض سو ڈالر چینج کرنے کے لئے تلخ بات سننی پڑ گئی۔ ان دونوں کو اس کے موڈ کا اندازہ ہوا اور تینوں ’شہداء قبرستان کی سی خاموشی لئے گھر روانہ ہو گئے۔
راستے میں موڈ کچھ بہتر ہوا تو وہ مصمم ارادہ کر چکا تھا کہ یہیں ڈل کنارے ڈوب کر وہ زربفتی پھیرن بنانے والی فیکٹری، کیسر کی پیکنگ کا ٹھیکہ اور کسی بنفشی کھیت کی خریداری کرے گا اور یہاں کی کروکس کے چرنوں میں نچھاور کر دے گا......
گھر پہنچ کر اسے غیر معمولی خاموشی کا احساس ہوا...... کوئی کچھ نہیں کہہ رہا تھا......
وہ بھی بجھا بجھا سا اپنے کمرے میں چلا گیا...... اور ٹرالی بیگ کو عادتاً کھول کر دیکھنے لگا...... اس کی ڈالر پونجی ندارت تھی۔
اس کے پھیرن میں کیسر کانگڑی اُلٹ گئی اور سنہرا خالی تھال دُور سے اس کا منہ چڑانے لگا......!

☆......☆......☆

پانچواں موسم

شاہین کاظمی

بارش اب بھی زوروں پر تھی، اندھیرے میں بجلی کے کوندے زمین کی طرف لپکتے دکھائی دینے لگے، اس نے گہرا سانس لے کر روشنی گل کی اور سونے کے لیے کمرے میں چلی آئی، ہاتھ میں پکڑی کتاب بستر پر رکھ کر پردے برابر کرنے لگی، چاند پورا تھا نیند جانے کہاں رہ گئی تھی، اس نے بے خیالی میں ورق پلٹا

''پانچواں موسم،،

''زندگی میں پانچواں موسم اُترے تو اُس کا حسن معدوم ہونے لگتا ہے، راستہ کوئی بھی ہو غبار اُٹھتا ہی ہے، انگور کی بیلوں پر سانپ چڑھ جائیں تو شراب زہریلی ہو جاتی ہے، شبِ فتنہ کب کٹے گی؟ میرے آنگن میں کھلے گلِ لالہ پر بارود کی راکھ پڑی ہے، تم چراغ بجھنے تک لڑتے رہنا،،

اس نے کتاب بند کر دی، ذہن کہیں اور بھٹک گیا تھا

''تمہیں لڑنا ہوگا، میرے لئے، اِس مٹی کے لئے،،

اس کچے سے کمرے کے ایک کونے میں جھلنگا سی چارپائی پر پڑے وجود میں اگر کچھ زندہ تھا تو اُس کی نیلگوں سمندروں جیسی آنکھیں، یہ ماجد کی ماں تھی

''مجھ سے وعدہ کرو تم لڑو گے، جب تک ساری بلائیں ختم نہیں ہو جاتیں تم لڑو گے،، بوڑھے سرد ہاتھ ماجد اور نوما کے ہاتھوں پر جمے ہوئے تھے، آنکھوں میں ابھرتی، ڈوبتی حسرت اور اُمید، ماجد کا سر بے اختیار ہاں میں ہل گیا،

''ہم لڑیں گے ماں آخری دم تک لڑیں گے،، ماجد کی آواز سن کر بوڑھے نیلگوں سمندروں میں جوار بھاٹا اٹھنے لگا، ماجد جانتا تھا اِن نئے بدیسی بھیڑیوں سے لڑنا آسان نہ ہوگا، جبکہ دھرتی کے سینے پر رو بل کی تال پر رقص کرتے سؤروں کے لگائے زخم ابھی تازہ تھے، سؤروں کو دھرتی سے باہر ہانک تو دیا گیا تھا، لیکن امن واپس نہ آسکا، چاند ابھرا تو نئے بھیڑیئے گھپاؤں سے باہر نکل آئے، اِن کے لے پالک نے جب ڈوریاں توڑ کر اپنے آزادانہ رقص کا آغاز کیا تو نائیکہ کی تیوری چڑھ گئی، اُس کی نظروں کا زاویہ بدلا تو وہی لے پالک جو بہت چنیدہ تھے نظروں سے گر گئے لیکن انھیں بھی پروا کب تھی، انھوں نے نئی تال چنی اور دھمال شروع ہو گیا، بندوقوں کے سائے میں ابھرتے نغموں میں سوز اُمڈ آیا، لہولہان دھرتی دم بخود تھی ہر طرف بہنے والا خون اپنا تھا۔

جنت کی اور جاتی پگڈنڈیوں پر جب موت اُگنے لگی تو ایک دن وہ اپنے بچے کی انگلی تھامے وہاں سے نکل پڑی

''چلو میرے ساتھ،، اس نے ماجد کا ہاتھ تھام لیا

''نہیں جا سکتا،،

''کیوں؟،،

''ماں سے کیا وعدہ نبھانا ہے،،

''کس سے لڑو گے؟ جب دونوں اطراف اپنا ہی سینہ ہو بندوق کس پر چلے گی،، اِس کے لہجے میں دکھ تھا

لیکن وہ غلط تھی، بندوق کی نال شرارے اُگل رہی تھی، سؤروں کی جگہ بھیڑیے شہر میں دندنانے لگے، اُس نے ایک نظر مڑ کر دیکھا شہر ملبے کا ڈھیر تھا، اپنے آنسو چھپاتے ہوئے وہ قافلے کے ساتھ ہولی، یہ اعلیٰ سالاروں کا قافلہ تھا جو سمندر پار جا کر رکا، ماجد کے بغیر زندگی مشکل ضرور تھی ناممکن نہیں، جلد ہی زندگی میں رچاؤ آنے لگا

محبت کے شیریں ہونٹوں سے
چھوٹنے والے نغموں کی مدھر لے
آتش شوق بھڑکا دیتی ہے
جیسے خشک گھاس میں گرنے والی ننھی سی چنگاری
زخمی کونج کی پکار
روح میں اُتر رہی ہے
دن رات کے سینے میں جذب ہو رہا ہے
مجھے دیدار کی مے دو
کہ پیاس بڑھ رہی ہے
محبت اگر دلوں میں حلاوت نہ جگائے
تو اس کے اجزاء میں پاکیزگی ترتیب
اُلٹ گئی ہے
چاند کی ساحر کرنیں
پھول پر منعکس ہیں
زیست انگڑائی لے کر بیدار ہو رہی ہے
سچے سُر کے لئے من کا اُجلا ہونا ضروری ہے
من میں کدورتوں کا میل سُر گدلا کر دیتا ہے
اور وہ محض کانوں میں اٹک کے رہ جاتا ہے
اگر سُر من میں اُجالا نہ پھونکے
تو اس کے اجزاء میں پاکیزگی کی ترتیب اُلٹ گئی ہے،

نوجوان شاعر کے ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا، دھماکے سے در و دیوار لرز اٹھے تھے، وہ تیزی سے اٹھا اور پتھریلی دیواروں والے سرد تہہ خانے کے کونے میں دھری اکلوتی موم بتی گل کر دی، اچانک اُسے اپنے ہاتھوں پر ننھے ننھے سرد ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا، یہ نوما تھی اُس کی بھوری آنکھوں میں خوف تھا، جنگی جہاز سے گرنے والی موت نے زندگی سے موت کو جاتی سرحد پر بھیڑ جمع کر دی، بدن ٹکڑوں میں بٹنے لگے نوما کو سینے سے لگائے وہ ٹھنڈی دیوار سے ٹیک لگائے ساکت بیٹھا تھا، چھوٹے سے روشن دان کے ٹوٹے شیشے سے شمالی ہوا برف کے ذرات اندر اچھال رہی تھی، اُس نے ٹٹول کر پرانا کمبل اپنے اوپر کھینچ لیا۔

اچانک خاموشی چھا گئی، شاید جہاز واپس جا چکے تھے، نوما بھی سوگئی تھی، اُس کے سانسوں کی ہلکی سی آواز تہہ خانے کے بھیانک ماحول میں بھلی لگ رہی تھی لطف اللہ نے اُسے بستر پر لٹا دیا، اُس کے گالوں پر آنسوؤں کے نشان تھے۔ اس نے اپنی ادھوری نظم پھر سے لکھنے کی کوشش کی لیکن ذہن منتشر تھا ساتھ نہ دے سکا، کاغذوں کے پلندے میں بہت سی آدھی ادھوری نظمیں اور گیت مکمل ہونے کے منتظر تھے، بالکل اُس کی ادھوری زندگی کی طرح۔

''مجھے لکھنا ہے اِس سے قبل کہ وقت کے کھنڈر میں زندگی کی چاپ معدوم ہو جائے مجھے لکھنا ہے،، وہ بہت تیزی سے صفحے الٹ پلٹ رہا تھا۔

''آنے والوں کو کیسے پتہ چلے گا کہ ہم کس کرب سے گزرے ہیں، میں جانتا ہوں اچھا وقت دور نہیں،، اس نے نوما کو دیکھا جو ابھی تک سو رہی تھی

''سوتی رہو میری گڑیا، دنیا دکھوں سے بھر گئی ہے، موت زندگی پر پنجے گاڑے ہوئے ہے، یہ سب کچھ تمہارے دیکھنے کے لائق نہیں ہے، سوتی رہو میری گڑیا،، اُس کی خود کلامی جاری تھی۔

''لیکن میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ دشمن دروازے پر بیٹھا ہو تو کیسا لگتا ہے، جب رگوں سے زندگی نچڑ رہی ہو تو سانس سینے میں اٹک جاتی ہے، میری باتیں ابھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی، تم زندگی کو اپنے انداز سے دیکھو گی لیکن نوشتہ ءدیوار بھی پڑھنا ہوگا، زندگیوں میں اندھیرے در آئیں تو اُمید مرنے لگتی ہے، کسی کو جگنوؤں کی کھوج میں نکلنا ہوگا،،

سائیں سائیں کرتی ہوا مردہ تنوں کی باس لئے گلی کوچوں میں کرلا رہی تھی، وہ بس خالی خالی نظروں سے کاغذوں کو گھورتا رہ گیا۔

اُس کی آنکھ کھلی تو روشن دان سے ہلکی ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی، اُس نے کھونٹی پر لٹکی میلی سی جیکٹ چڑھائی اور ملبہ ہٹاتے ہوئے باہر رینگ آیا، رات ہونے والی بمباری نے بہت تباہی مچائی تھی، ہر طرف گہرا سکوت تھا، کھانے کی تلاش میں جیسے ہی وہ نکڑ مڑا گلی کے کونے پر بکتر بند گاڑیوں کے ساتھ فوجیوں کا دستہ دیکھ کر ٹھٹھک گیا، وہ تیزی سے پلٹا لیکن فوجی اُسے دیکھ چکے تھے، تڑ تڑ کی تیز آواز کے ساتھ اُسے اپنے شانے اور کمر میں آگ اُترتی ہوئی محسوس ہوئی، وہ وہیں ملبے پر ڈھیر ہو گیا، آخری خیال جو اُس کے ذہن میں آیا وہ نوما کا تھا۔

ہر شام اپنے گھونسلوں میں لوٹتی چڑیاں بہت شور کرتیں، وہ اِس شور کا عادی تھا لیکن کبھی کبھی جانے کیا ہو جاتا، شور اعصاب پر کوڑے برسانے لگتا، اور انتہائی بے چین ہو کر چڑیوں پر برس پڑتا، آج بھی اسی کیفیت کا شکار تھا، بیئر کا آخری گھونٹ گلے میں اتار کر اِس نے بوتل کو پوری طاقت سے درخت کے تنے کی طرف اچھالا اور گالیاں بکنے لگا، پارک کے داہنی طرف پرانے بینچ پر لیٹا ہوا بوڑھا ایک دم چونک کر اٹھا، کچھ ناقابل فہم انداز میں بڑبڑایا اور پھر سے لیٹ گیا، اندھیرا پھیلتے ہی چڑیوں کا شور تھمنے لگا، بوڑھا بھی پرسکون ہو گیا، چاند نے ہولے سے زمین پر جھانکا تو چاندنی کھلکھلا کر گھاس پر رقص کرنے لگی، بوڑھے نے اپنے تھیلے سے پرانا سا وائلن نکالا اور بجانے لگا، اِس کی ٹھٹھری ہوئی موٹی بھدی انگلیوں میں دبی وائلن کی سٹک بہت خوبصورتی سے تاروں پر رواں تھی۔

منڈیروں پر اونگھتے چراغ بجھ جائیں تو
موت کے مہیب سائے در و دیوار پر منڈلانے لگتے ہیں

مسافر راستہ کھوٹا کر لیتے ہیں
اُن میں لہو ڈالتے رہو
کہ روشنی
زندگی کی علامت ہے

بوڑھے کی آواز میں عجیب سا سوز تھا، اس کے سال خوردہ چہرے کا ملال بتا رہا تھا کہ زندگی نے اُس کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا، یہ ملال وائلن سے پھوٹتے نغموں سے بھی عیاں تھا، گیت کی دھن بہت عام فہم نہ تھی، لیکن پارک سے گزرنے والے اُسے جانے کب سے سن رہے تھے، بوڑھے کے سامنے پڑے گلاس میں سکے گرتے رہے اجنبی دھن پر بجتے نغمے کے سُر فضا میں بکھرتے رہے، بوڑھے نے سکّوں والا خالی کیا اور دوبارہ وہیں رکھ دیا، وائلن درد اگلتا رہا، گھنے پیڑوں کی اوٹ سے افسردہ چاند جھانکتا رہا اور رات دھیرے دھیرے بھیگتی رہی۔

''مٹی کا نوحہ کون لکھے گا؟
جب بیٹے ماں کی چادر نوچ لیں تو کیا قیامت نہیں آئے گی؟
سفید پھولوں کے باغ میں سؤر چرنے لگے ہیں
چولہے پر دھرا کھانا پختہ ہونے کے انتظار میں ہے
لیکن آگ چولہوں میں نہیں شہروں میں بھڑک رہی ہے
مسافر تمہارا سفر کب تمام ہوگا؟

نہ ہی سفر تمام ہوتا ہے اور نہ ہی وحشت کبھی سیراب ہوتی ہے، اچانک اٹھنے والی آندھی سب کچھ لپیٹ میں لے کر سارے منظر دھندلا دیتی ہے، اُس دن بھی لمبے انتظار کے بعد بھی لطف اللہ نہ پلٹا تو نوما اپنی پناہ گاہ سے باہر نکل آئی، ہر طرف سؤر دندناتے پھر رہے تھے، بدن بدن بٹتے ہوئے محض دس سال کی عمر میں وہ بہت کچھ سمجھنے لگی تھی، وجود کی ناؤ کا ناہموار بہاؤ، ہچکولے انگ انگ توڑ دیتے ہیں، آنے والا ہر نیا مسافر ناؤ میں اپنے انداز میں سوار ہوتا ہے، جب تک لنگر آنکڑے میں پھنسا ہوناؤ حرکت نہیں کرسکتی، وہ بھی جال میں پھنسی مچھلی کی طرح تڑپ سکتی تھی لیکن آزادی اُس کا مقدر نہیں تھی، لیکن پھر ایک دن اچانک لنگر اُٹھا دیا گیا، یا شاید گھاٹ بدل دیا گیا تھا، اب ایک مسافر تھا اور وہ، رات دن اُسے ڈھوتے ڈھوتے اُس کی ہمت ٹوٹنے لگی، کچے پھل سخت اور کڑوے ہوتے ہیں لیکن اس کے باجود کچھ لوگ ان میں دانت گاڑ دیتے ہیں چاہے بعد میں تھوکنا پڑے، لیکن نہیں وہ شاید کم عمری میں ہی گدرا گئی تھی، اس لئے تھوکنے کی نوبت کم ہی آتی ،البتہ اس نے تھوکنا سیکھ لیا، بھاری بوٹوں کی ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی اس کی تھوکنے کی عادت نہ گئی، پھر ایک دن اچانک وہ اکلوتا مسافر ایک ایسے گھاٹ پر اُتر گیا جہاں سے آگے کا سفر ممکن نہ تھا، نوما نے اُس کے سرد بے جان چہرے کو دیکھا تو اُبکائی روکنا مشکل ہوگیا۔

''دیکھو چھوٹی لڑکی انجانی منزلوں کا سفر آسان نہیں ہوتا، پاؤں میں تھکن اُتر آتی ہے، لیکن چلنا تو پڑتا ہے، ورنہ چاند پورا ہونے پر بھیڑیئے اپنی اپنی گھپاؤں سے نکل آتے ہیں، انھیں تازہ نرم گوشت میں دانت گاڑنا پسند ہے اُن کی غرّاہٹیں سانسیں توڑ دیتی ہیں لیکن تم ڈرنا مت،، کہیں بہت قریب کوئی جانی پہچانی سرگوشی اُبھرے گی وہ بہت چھوٹی تھی لیکن ذہن کے کسی گوشے میں الفاظ جیسے پیوست ہو گئے تھے، اس کی آنکھوں میں نمی اُبھرنے لگی، اُسے انجانی منزلوں کی طرف

جاناتھا، ہوا میں خون اور بارود کی بُو رچی ہوئی تھی ’’لیکن مجھے ڈرنا نہیں،،
وہ دھرتی کو ان سؤروں سے پاک کرنے کے لیے مجاہدین سے جا ملی،
’’میں اکیلا فیصلہ نہیں کر سکتا اس وقت اپنے سائے پر بھی بھروسہ کرنا مشکل ہے تم انتظار کرو،،
’’کب تک؟،، اُس کی آواز میں بیقراری تھی
’’ربانی کے آنے تک،، امین وردک آگے بڑھ گیا
کئی چاند اُبھرے اور ڈوبے، سؤر کھیت کھلیان تاراج کر رہے تھے، موت کا رقص جاری رہا، اندھیرے بڑھنے لگے، لوگ کم ہوتے جا رہے تھے، ربانی نے اُسے مجاہدین میں شامل ہونے کا عندیہ دے دیا تھا، کہ وہ بدیسی سؤروں کی زبان بہت روانی سے بولتی تھی لیکن اُس کی کوکھ میں پلتا بچہ جسے وہ سفید سؤر کا بچہ کہتی تھی اُس کی راہ روکنے لگا۔

گھپاؤں کے در بند کرنے ہوں گے
ورنہ اندر پلتی بلائیں آبادیاں نابود کر دیں گی
چاندنی کا سحر دماغ اُلٹ دیتا ہے
جنت کی طرف جاتی پگڈنڈیوں پر
موت اُگنے لگے تو
پہچان کم ہو جاتی ہے
وقت کے ہاتھ لکھنے میں مصروف ہیں
الفاظ شرمندگی میں ڈھلتے جاتے ہیں

شہر میں چاند اُبھر آیا تھا، بہت عجیب سا چاند، سحر زدہ کر دینے والا، لوگ بے سدھ ہونے لگے، ماجد ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اُس کے جسم میں تشنج اور اینٹھن تھی یکایک اُس کی انگلیوں کے سروں پر نوکیلے ناخن نمودار ہونے لگے، چند لمحوں بعد اس نے اپنی لمبی تھوتھنی اوپر اٹھائی اور ہوووووو کی لمبی آواز کے ساتھ آبادی کی طرف بھاگ کھڑا ہوا، اُس کے تیز نوکیلے دانت چمک رہے تھے، اُس کے ساتھ اُس جیسے اور بھی کئی تھے، گھپاؤں کے در بند نہیں کیے جا سکے تھے، پھر ہر روز اُن میں اضافہ ہونے لگا، خونخواریاں بڑھنے لگیں صدیوں سے سیف الملوک میں رقص کرتی پریوں کے گھنگھرو توڑ دیئے گئے آدمی کی جون بدلنے لگی چاند پورا ہوتے ہی گھپاؤں سے نکلنے والے اپنے نوکیلے دانت اور پنجے نکال کر بھیڑیئے بن جاتے اور اپنے ہی ہم جنسوں کو بھنبھوڑنے لگتے، قندھاری اناروں سے ٹپکتا لہو سیف الملوک میں بھرنے لگا، اب کی بار بھیڑیئوں کے جسم سے اٹھتی باس پرائی نہ تھی۔
اُس ڈھلتی شام پارک میں وائلن پر بجتی دھن نے اُس کے قدم روک لیے، دل اتنی زور سے دھڑکا کہ قیامت اُٹھا دی، وہ یہاں اس شہر میں اپنے کسی پرانے ساتھی سے ملنے آئی تھی، اُس کا وطن میں رہ گئے ساتھیوں سے رابطہ کبھی نہیں ٹوٹا تھا، وہ اپنے بیٹے کو ساری عمر سفید سؤر کا بچہ کہتی اور سمجھتی رہی، اور اُس روز اُس دوست کے کہنے پر اُسے بلا جھجک آگ میں جھونک دیا، آج اُس کی موت کی اطلاع جانے کیوں اُسے بے چین کر گئی، تیسری نسل کا لہو بھی دھرتی کے چاک رفو نہیں کر پایا تھا، بوڑھا گا رہا تھا۔
’’جب عہد فراموش کر دیئے جائیں

محبت مرجائے
یقین باسی ہو جائے
قدم اجنبی سمتوں میں اُٹھنے لگیں
مٹی سے دغا عام ہو جائے

تو جان لو
کہ زندگی کے اجزاء میں
پاکیزگی کی ترتیب اُلٹ گئی ہے

''لطف اللہ؟،، وہ دوزانو بوڑھے کے پاس بیٹھ گئی اُس کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے، بوڑھے کی موٹی ٹھٹھری ہوئی انگلیوں میں دبی سٹک ہوا میں معلق رہ گئی

''کون؟،، اُس کی آواز میں لرزش تھی

''میں نوما،، سٹک گر چکی تھی بوڑھے کا پورا وجود زلزلے کی زد میں تھا

''نہیں میں اسماعیل خان، لطف اللہ تین گولیاں کھا کر کچھ دن زندہ رہ سکا

''لیکن تم نے یہ گیت کہاں سے سیکھا؟ یہ تو لطف اللہ کا لکھا ہوا ہے،،

''یہ تمہاری امانت، لطف اللہ نے مرتے وقت تمہیں دینے کو کہا تھا،، بوڑھے نے ایک پرانی ڈائری نوما کی طرف بڑھائی

''جانے کب سے لئے پھر رہا ہوں، لگتا نہیں تھا کہ میں امانت حق دار کو پہنچا سکوں گا،، اس نے ڈائری تھام لی، ٹھنڈا اور اندھیرا تہہ خانہ اچانک روشن ہو گیا،

''چاچا،، ننھی نوما کے ہاتھ سرد اور آنکھیں خوف سے بھری ہوئی تھیں نو سال عمر ہی کتنی ہوتی ہے، ماں باپ اور بہن بھائیوں کی کٹی پھٹی لاشیں اُسے آسیب بن کر چمٹ گئی تھیں

'' کچھ نہیں ہوگا میں ہوں نا،، لطف اللہ نے اُسے سینے میں چھپالیا، بابا کی مہک نتھنوں سے ٹکرائی تو آنکھوں میں نمی اترنے لگی

''تم کیا لکھتے ہو؟،، نوما کی گہری آنکھیں اُس پر مرکوز تھیں

''اپنی مٹی کا دکھ، اپنے لوگوں کا نوحہ،، وہ کچھ نہ سمجھی'' بڑی ہو کر اسے ضرور پڑھنا، تمہیں معلوم ہونا چاہیے ہمارے خواب کیسے بکھرے،،

نوما نے ڈائری کو کھولا'' پانچواں موسم،، لطف اللہ کے خوبصورت حروف کی سیاہی اُس کی پہچان کی طرح ماند پڑ رہی تھی،'' آؤ میرے ساتھ،، نوما نے بوڑھے کی طرف ہاتھ بڑھایا

''کہاں؟،، بوڑھے کی آنکھوں میں استعجاب تھا

''اپنے گھر، اپنی بیٹی کے گھر،، اُس کی آنکھیں چھلک پڑھیں

بوڑھے نے بیساکھی ایک طرف رکھی اور نوما کا سہارا لے کر اُٹھ کھڑا ہوا

☆......☆......☆

واپسی

عابدہ تقی

اس چار دیواری کی اپنائیت بھری فضا اور اس میں رچی بسی مخصوص مہک گجو بھائی کی سانسوں میں ہی نہیں زندگی میں بھی گھل چکی تھی۔ اسی کی کھڑکیوں کے پار سے سنہری دھوپ کی چمک، بادلوں کی دھند اور تیز ہواؤں کے ہاتھوں سے پھسلتی ہوئی بارشوں کے سب منظر ان کی آنکھوں پر کتنے سالوں سے اتر رہے تھے۔ ان کے ڈیسک کے بائیں جانب بڑی کھڑکی کے باہر سبز درخت اور ان کے گرد گولائی میں چنی ہوئی سرخ اینٹوں کے درمیان اگے ہوئے پھول، مناسب فاصلے پر بچھے ہوئے سنگِ مرمر کی بینچ نما نشستیں اور ان پر دن بھر غم و فکر سے آزاد طالب علم لڑکے لڑکیوں کی ٹولیاں اور ان کے قہقہے، گویا زندگی گجو بھائی کو بھرپور انداز میں یہیں ملا کرتی تھی۔ انہیں یہ بھی یاد نہیں تھا کہ کب وہ یہاں غضنفر علی سے گجو بھائی مشہور ہو گئے تھے اور اب بہت کم لوگوں کو ان کا اصل نام یاد تھا۔ لیکن انہیں یہاں کی کسی بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ یہی چار دیواری ان کی پہچان کا مضبوط حوالہ بن گئی تھی۔ بچوں کو اسکول کے لئے تیار کرتے اور انہیں ناشتہ دیتے ہوئے خرچے کے پیسوں کا مطالبہ کرتی ہوئی بیوی سے فوری جائے فرار بھی یہی جگہ تھی۔ پرانے ویسپا اسکوٹر پر بچوں کو بٹھا کر اسکول چھوڑتے ہوئے جب وہ کالج والی روڈ پر پہنچتے تو ان کے ماتھے کی شکنیں غائب ہو جاتیں اور ان کی جگہ ایک اطمینان بھری مسکراہٹ چہرے پر ابھر آتی جیسے وہ ڈیوٹی پر نہیں کسی محبوبہ سے ملنے جا رہے ہوں۔

''گجو بھائی کبھی ترقی نہیں کر سکتے، لائبریرین تھے اور لائبریرین ہی رہیں گے'' ابھی ابھی کالج لائبریری سے نکلتے ہوئے گروپ میں یہ آواز وقاص کی تھی۔

''ان کے ابا نے جب ان سے پوچھا ہوگا بیٹا بڑے ہو کر کیا بنو گے؟ تو معلوم انہوں نے کیا کہا ہوگا'' جواد نے ہاتھ میں اٹھائی ہوئی کتابیں ہمیشہ کی طرح امین کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا تو سارا گروپ چلتے چلتے رک گیا۔

''کیا؟ سب نے کورس میں پوچھا

''لائبریرین ابا جان'' جواد نے جھک کر کہا تو ایک قہقہہ فضا میں گونجا۔

''یار مجھے تو لگتا ہے یہ پیدا ہی بطور لائبریرین ہوئے تھے۔ نرس کو پہلی بار دنیا میں آتے ہی کہا ہوگا'' دیکھو بی بی کتابیں وقت پر واپس کر دینا'' عاطف نے اپنے حصے کا مصالحہ بات کو لگا دیا۔

''او مائی گاڈ عاطف spare us your extra ingredients اب تو ہنستے ہنستے منہ دکھنے لگ گیا ہے'' ماریہ کو تو ہنسی کا بس بہانہ ہی درکار ہوتا تھا۔

''یار اگر دیو آنند صاحب کو لائبریرین کا کردار کرنا پڑے تو انہیں گجو بھائی سے ضرور مل لینا چاہئے'' شکیل کب پیچھے رہ سکتا تھا۔

''تمھارا مطلب حلئے اور کپڑوں کی چوائس کے سلسلے میں ناں! یار اتنی فینٹاسٹک چوڑی اور لمبی ٹائیاں اور ایسی کھلی پتلونیں پہننے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ سعید نے بھی تبصرہ کر دیا۔

''میں نے پوچھا تھا ایک دن تو بولے ''حلیے کا کیا ہے عارف میاں۔ منٹو حلیے کی وجہ سے مشہور تھوڑا ہی ہوئے تھے۔ کافکا، جوائسے، ویلز، برنارڈ شا، میراجی، کیٹس، ٹالسٹائی کیا پہنتے تھے کسے یاد ہے؟ ہاں کیا تخلیق کرتے تھے یہ قابلِ ذکر ہے''۔

''ویسے دیکھا جائے تو پورے حلیے میں ایک جدت ہے اور وہ ہے ان کی ناک پر رکھی ہوئی چھوٹے فریم کی عینک۔ سنا ہے وہ بھی پروفیسر عسکری نے بنوا کر دی ہے'' سب ہنس دئے اور پھر 'یُو نو گجو بھائی، یُو نو گجو بھائی' کی آوازیں آہستہ آہستہ دور ہوتی گئیں۔

انہوں نے چشمہ اتار کر اسے صاف کرنے کے بہانے کچھ دیر کو آنکھیں موند لیں۔ بند آنکھوں پر اک اک کر کے اترنے والے منظر کتنے شفاف کتنے دلکش ہوتے ہیں ذرا سی دیر میں ساری زندگی کے بیتے ہوئے لمحے کسی فلم کی طرح سامنے لے آتے ہیں۔ انہیں وہ زمانہ یاد آ گیا جب اس شہر کے اسی کالج میں وہ بطور لائبریرین اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے آئے تھے۔ کتابوں کے بڑے بڑے شیلف کتنی محنت سے دوبارہ ترتیب دئے تھے انہوں نے اور ہر حصے کو ایک ایک نام سے بھی نواز رکھا تھا۔ 'گوشۂ ادب'، 'خانۂ تاریخ'، 'دینی کتاب گھر'، 'کنجِ اشعار'، 'زعفران زار'، 'مرکزِ تراجم'، 'بابِ سخن'، 'جہاں نما' وغیرہ اور جن موضوعات سے خود گجو بھائی کو زیادہ دلچسپی نہیں تھی ان شیلفوں پر 'کتب ہائے دیگر' کا لیبل لگا کر انہوں نے اس لائبریری کو اک اپنے انداز کی دنیا میں بدل دیا تھا۔ اب تو کتابیں اور ان کا مقام ان کی انگلیوں کو بھی حفظ ہو گیا تھا۔

لائبریری کے اندر کا ماحول بھی گردشِ وقت کا بہترین عکاس رہا تھا۔ کبھی ان کو ٹیبل پر بیٹھے طلبا میں سے کوئی پکار کر پوچھتا تھا'' گجو بھائی کوئی اچھا سا مجموعہ کلام آیا یا نہیں؟'' ''گجو بھائی انتظار حسین کے تازہ افسانوں کی کتاب مجھے ایشو کیجئے گا پہلے'' ارے گجو بھائی فیض صاحب کی شاعری پر تبصرے کی کوئی کتاب ملے گی'' اور یہ مطالبات گجو بھائی کو جوش دلاتے تھے کہ وہ تازہ ترین فہرستیں تیار کرنے لگ جاتے جسے صدیقی صاحب پرنسپل بھی منظور کر لیتے۔ لیکن وقت کے ساتھ ان آوازوں میں بھی تبدیلی آ گئی تھی'' گجو بھائی فورتھ ائیر کی لڑکیاں کب آتی ہیں لائبریری میں''۔ ''گجو بھائی فرزانہ وغیرہ کا گروپ دیکھا تھا کل لائبریری میں ساتھ کون کون تھا؟'' ''گجو بھائی آپ نے کبھی محبت کی ہے؟'' لیکن اس تبدیلی کے باوجود بھی لائبریری کی رونق برقرار تھی۔ لائبریری آنے والے طلبا و طالبات کے شوقِ مطالعہ کے ساتھ ساتھ رنگینیاں بھی دیکھنے کو ملا کرتی تھیں۔ اس وقت کے نوجوانوں کا دھڑکتے دلوں سے کتابوں میں پھول یا خط رکھ کر محبوبہ کی طرف کتاب بڑھانا اور دزدیدہ نگاہوں سے آنکھوں کے سامنے رکھی ہوئی کتاب کی آڑ سے دور کونے والی میز پر بیٹھی جانِ جاں کو چوری چوری تکنا اور پھر کسی دوست کے شانہ ہلانے پر چونک کر دوبارہ کتاب کی طرف متوجہ ہونا انہیں ابھی بھی یاد تھا۔ اکثر کتابیں لائبریری میں واپس اندراج کے لئے آتیں تو ذو معنی اشعار بھی ان پر لکھے ہوتے ہر چند کہ کتاب پر واضح طور پر لکھا ہوتا کہ اس پر کچھ لکھنا منع ہے لیکن نوجوان نسل کے وحشی جذبوں کو کون روک سکتا تھا اس وقت بھی'

''گجو بھائی زندگی کا مزہ بھی لیا کریں ورنہ کسی دن ان کتابوں میں دب جائیں گے آپ'' اس وقت بھی تبصرے ہوتے تھے لیکن ذرا لفظوں کا چناؤ محتاط تھا یا شاید تہذیب نے ابھی بد تہذیبی کی کروٹ نہیں بدلی تھی۔

''کیا مزہ لیں بے چارے۔ اس کے لئے تو حسنِ نظر چاہیے جذبۂ شوق بھی اور یہاں تو دونوں ہی ناپید ہیں'' وجاہت میاں پڑھائی میں لائق فائق تھے اس لئے ان کا کہا ہوا گجو بھائی کو برا نہیں لگتا تھا۔ فقط ایک دہائی کے ساتھ ہی لائبریری کے اندر کا ماحول بھی بدل چکا تھا۔ اب کتابوں، اخباروں، رسالوں کی آڑ میں ہاتھ پکڑنے اور چھڑانے، کتابوں کے سیکشن سے نکلتے ہوئے ایک دوسرے سے ٹکرانے، گرنے اور تھامنے کے حادثے بھی لائبریری میں ہونے لگے تھے۔ وہ

گلا کھنگار کر گارڈ کے اضافی فرائض بھی سرانجام دیتے رہے اور اس کی انہیں کوئی داد دینے والا نہیں تھا۔
صدیقی صاحب کالج کے پرنسپل خود بھی ادبی ذوق سے مالا مال اور مطالعہ کے شوقین انسان تھے اور ان کے دور میں ہی گجو بھائی کے لئے لائبریرین ہونا ایک ایسا اعزاز تھا جس کی بدولت انہیں نہ صرف صدیقی صاحب کی قربت بھی حاصل تھی بلکہ ان کے ملاقاتیوں میں شامل تمام قابل، ذکر ہستیوں سے بھی گجو بھائی کا تعارف بھی تھا اور دوستی بھی۔ اکثر اوقات وہ نجی اور سرکاری محفلوں میں انتہائی احترام سے بلائے جاتے تھے اور صدیقی صاحب کے تعارف کرانے کا انداز بہت انوکھا تھا۔
''ضمیر صاحب ان سے ملئے بھئی یہ ہمارے کالج کے قیمتی خزانے یعنی کتابوں کے نگہدار ہیں غضنفر علی صاحب ۔کہنے کو لائبریرین ہیں لیکن بہت صاحب علم انسان ہیں''۔ اور جب ایک ادارے کا سربراہ کسی کا تعارف یوں کروارہا ہو تو ملنے والے کے دل میں اس کی توقیر اور بڑھ جاتی ہے۔ گجو بھائی صدیقی صاحب کے بہت معتقد تھے۔ وہ واحد پرنسپل تھے جو فرائض منصبی میں سے کافی وقت نکال کر لائبریری اور اس کی ترقی کے سلسلے میں بھرپور تعاون کرتے تھے۔ ان کے کالج سے چلے جانے کا صدمہ گجو بھائی کے دل میں بہت عرصہ رہا اور یہ صدمہ کم ہونے کی بجائے وقت کے پہیے کے گھومنے سے اور بھی بڑھ گیا جب خواجہ ظہور نئے پرنسپل نے انہیں پہلی ملاقات کے لئے طلب کیا۔
''غضنفر صاحب میں نے سنا ہے آپ کی لائبریری نے خاصی جگہ گھیر رکھی ہے میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کا الگ ڈیپارٹمنٹ کھولنا چاہتا ہوں اور ظاہر سی بات ہے اس کے لئے ہمیں جگہ تو بنانی ہوگی۔ کوئی گنجائش نکل سکتی ہے؟ خواجہ صاحب نے انہیں ابھی تک بیٹھنے کو بھی نہیں کہا تھا اور اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتے کہ وائس پرنسپل کے ایک چمچہ قسم کے دوست پروفیسر نے جن کا تعلق انتظامی امور سے تھا فوراً ایک نقشہ کھول کر پرنسپل کے سامنے پھیلا دیا۔
''سر یہ دیکھئے کالج کے پرانے نقشے میں لائبریری صرف اتنے حصے پر بنی تھی۔ پھر اس کے ساتھ پرانے اسٹور روم کی دیوار گرا کر اس کمرے کو بھی جو ہال جتنا ہے اس میں شامل کر لیا گیا اور آج سے پانچ سال قبل یہ مین لان سے 8x8 کا ایک اضافی زمین کا ٹکڑا بھی لائبریری میں شامل کر لیا گیا تھا صدیقی صاحب کے زمانے میں کیونکہ اردو ادب کے سیکشن کے لئے غضنفر صاحب کو جگہ کم پڑ رہی تھی'' انہوں نے داد طلب نظروں سے پرنسپل کو دیکھا۔
''سر میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ چل کر لائبریری کا معائنہ کیجئے اور دیکھئے کہ اب ہماری لائبریری کا کوئی حصہ بھی ایسا نہیں جو کتابوں سے خالی ہو۔ سر یہ جس اضافی حصے کی بات کر رہے ہیں وہ جگہ طالبعلموں کے بیٹھنے کے لئے کم تھی اس لئے اسے بڑھا کر اس میں یہ گنجائش رکھی گئی کہ اس میں اسٹوڈنٹس بیٹھ سکیں'' گجو بھائی نے مناسب انداز میں دفاع کیا۔
'' کتنے لوگوں کی ایک وقت میں بیٹھ کر پڑھنے کی گنجائش ہے غضنفر صاحب اب لائبریری میں؟
''سر اس شہر کے تمام کالجز میں یہ بات ہمارے لئے فخر کا باعث ہے کہ ہمارے ہاں تقریباً ایک سو کے قریب طلباؤ طالبات مطالعے کے لئے اس میں باآسانی سما سکتے ہیں'' ۔غضنفر علی نے جیسے گول برابر کر دیا تھا لیکن یہاں تالیاں بجنے کی بجائے دوسرا سوال داغ دیا گیا۔
'' کتنے طالب علم اب ایک ہی وقت میں وہاں آتے ہیں جو بیٹھ کر مطالعہ کرتے ہیں آجکل؟ پرنسپل صاحب تفتیشی افسر لگ رہے تھے۔

اس سوال پر وہ بوکھلا کر رہ گئے تھے کیونکہ گزشتہ چند سالوں کے دوران لائبریری آنے والے طلباوطالبات کے گروہ سکڑ کر چند ٹولیوں کی شکل اختیار کر چکے تھے وہ بھی زیادہ دیر کیفے ٹیریا میں یا اوپن ائیر میں میوزک یا پھر کرکٹ گراؤنڈ میں گزارتے تھے۔ یہاں تو وہ کتابیں ایشو کرانے آتے تھے یا واپس کرنے۔ اوراب کے سالوں میں تو لمبے بالوں اور کانوں میں بالی لٹکائے امراء کے لڑکے لڑکیوں اور No Smoking کے بورڈ کے سامنے کش لگانے والے نوجوانوں کی دوڑاب کیٹس، ملٹن، شیلے، بائرن، غالب، فیض، میراجی سے نکل کر ملزاینڈ بون کے رومانی ناولوں یا ویلنٹائن ڈے کی شاعری کی تلاش تک ہی محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ بعض لڑکے لڑکیوں سے کتابیں واپس کرنے کے جتن کرنے پڑتے تھے اور کارڈز پر ان کے سائین لینے کے لئے بھی پیچھے بھاگنا پڑتا تھا۔

''اوکم آن گجو بھائی ہو جائے گا۔ I will take care of books'' کہہ کر لڑکے لڑکیاں غائب ہو جاتے تھے اور وہ سوچتے رہ جاتے کہ نئی پود کس طرف جا رہی ہے۔

''جی غضنفر صاحب اب کتنے اسٹوڈنٹس وہاں بیٹھ کر پڑھتے ہیں'' پرنسپل صاحب نے دوبارہ سوال دہرایا تو وہ اپنی سوچوں کی دنیا سے باہر نکل آئے۔

''سر۔۔وہ سر۔۔کافی تعداد میں آتے جاتے رہتے ہیں سر'' انہوں نے عینک اتار کر پھر لگاتے ہوئے کہا۔

''پھر بھی کتنے؟

''زیادہ تر تو کتابیں ایشو کروا لیتے ہیں سر لیکن پھر بھی دس پندرہ تو موجود ہی ہوتے ہیں'' اتنا اٹک اٹک کر یہ تعداد بولتے ہوئے ان کا پورا وجود پسینے سے شرابور ہو گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا اس میں ان کی کوئی غلطی تھی۔

''دس یا پندرہ۔ او۔ کے۔ اب دیکھیں اتنی کم تعداد کے visitors کے لئے ایک ہال جتنی پوری جگہ کو ضائع کرنا کوئی عقلمندانہ بات نہیں۔ او۔ کے۔ آپ کی بات بھی درست ہے میں کل دس بجے لائبریری کا چکر لگاؤں گا پھر بات کریں گے اس ایشو پر'' خواجہ صاحب نے انہیں کوئی مسکراہٹ دیئے بغیر بات ختم کر دی اور پرنسپل آفس سے لائبریری تک کا سفر گجو بھائی کے لئے ایک لمبی مسافت بن گیا تھا۔

اس شام گجو بھائی کو بیٹی کے رشتے کے لئے آنے والوں سے بھی کوئی خاص سروکار نہیں تھا۔ ساری گفتگو کے دوران وہ خاموش ہی رہے جس کا مطلب یہی لیا گیا کہ نازو کی جدائی کا سوچ کر اداس ہیں۔ رات انہوں نے کڑھی پکوڑا کے مینو میں شامل ہونے پر بھی کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا اور بیگم جو ہونے والے داماد کی تعریفوں کے پل باندھ رہی تھیں اس پر بھی کوئی ایسا تاثر نہیں دے سکے جس سے پتہ چلتا کہ وہ اس رشتے کے آنے پر خوش ہیں یا ناخوش۔

''دیکھئے وہ تو ان کی اعلیٰ ظرفی ہے جو کہہ رہے ہیں بس بیٹی دے دیں لیکن ہمیں تو بیٹی کو خالی ہاتھ رخصت نہیں کرنا۔ کچھ نہ کچھ تو آپ کے پراویڈنٹ فنڈز سے مل جائے گا۔ میں ڈرائینگ روم اور بیڈروم کا سارا فرنیچر دونگی نازو کو'' بیگم کراری آواز میں بولے جا رہی تھیں۔

''اماں بجیا کو ڈائینگ ٹیبل کا بہت شوق ہے'' چھوٹی نے کہا تو ماں کی آواز میں اور جوش آ گیا۔

''پہلی پہلی لڑکی کی شادی ہے کیوں نہیں دینگے؟ ڈائینگ ٹیبل بھی دیں گے۔ سنتے ہیں نازو کے ابا'' بیگم نے ان کے کان کے قریب چلا کر کہا تو وہ ''ہاں خدا خیر کرے'' کہہ کر وہاں سے اٹھ گئے۔

''دیکھ لو تمھارے باپ کی حرکتیں۔ ساری عمر میری نہ سنی۔ اب اتنا اہم مسئلہ ہے بیٹی کا اور اٹھ کر چل دئے'' بیگم

اولاد کے سامنے پھر باپ کی غیر ذمہ داری کی دہائی دینے لگ گئیں اور وہ سوچنے لگے۔
'اگر اس ہال کو خالی کروالیا گیا جو انہوں نے اور صدیقی صاحب نے کتنی محنت سے بنوایا تھا طالبعلموں میں مطالعہ کے شوق کو اجاگر کرنے کے لئے تو پھر کیا ہوگا؟ اور اگر دوسرے حصے میں پارٹیشن کروادی تو کتابیں کہاں جائیں گی'۔ غیر ملکی وفود تک ان کی لائبریری کی فلمیں بنا کرلے جاچکے ہیں۔ ان کی لائبریری کو کئی انعامات بھی مل چکے ہیں۔ پراویڈنٹ فنڈز تو ریٹائرمنٹ پر ملتے ہیں۔ نازو کی ماں جلد شادی کرنا چاہتی ہے۔ ہاں جی بیٹی تو پرایا دھن ہوتی ہے کرنا تو پڑے گا کچھ۔ 'ایسے نایاب نسخے پرانی کتابوں کے اب شہر میں کہاں دستیاب ہیں جو ان کے پاس ہیں لائبریری میں' کیا استعفیٰ دے دوں'۔ ان کی سوچیں گڈمڈ ہوتی چلی گئیں۔
''دیکھئے گجو بھائی میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں آپ جیسے کتاب دوست اور انسان دوست آدمی کم ہی ہوتے ہیں لیکن کچھ چیزیں وقت کی ضرورت ہوتی ہیں اور ان کا بروقت کئے جانا ہی سب کی بھلائی کا باعث ہوتا ہے''۔ نئے پرنسپل ان کو تسلی دے رہے تھے۔
لائبریری کے معائنے کے دوران ہی فیصلہ ہوگیا کہ دیوار کھڑی کر کے دو حصے بنائے جائیں گے یہاں تک کہ اضافی زمین کا ٹکڑا بھی اس حصے میں شامل ہوگیا۔ ہال کے حصے میں دیوار کھڑی کردی گئی اور ادب کی لاتعداد کتابیں حکومت کی لائبریری کو بھجوادی گئیں۔ گوشۂ ادب سکڑ کر ایک شیلف تک محدود ہوگیا اور باقی تمام جگہ پر رکھے شیلفوں میں جدید ٹیکنالوجی اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کی کتابوں کو بھر دیا گیا۔ جہاں کبھی لائبریری کا اک وسیع حصہ تھا اب وہاں ایک بورڈ بھی نصب ہوگیا جس پر 'کمپیوٹر ڈیپارٹمنٹ اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی'' لکھا تھا۔ وہاں سے گزرنے پر گجو بھائی کو ایک ہی منظر دکھائی دیتا تھا چند انگریزی بولنے والے نئے چہرے اور کمپیوٹر ہی کمپیوٹر۔ یہی نہیں ایک دن کمپیوٹر ان کی لائبریری میں بھی آن گھسا تھا دو سسٹم اینالسٹ نوجوانوں کے ساتھ جو انہیں ایسے سافٹ وئیر کی تربیت دینے آئے تھے جس کے بعد لائبریرین کا بھی زیادہ تر کام سمجھو کمپیوٹر سے ہی ہونا تھا۔
''کوئی پریشانی کی بات نہیں یہ آپ کی سہولت کے لئے ہے۔ اس کے بعد آپ کا کارڈز اور الماریوں کے پیچھے بھاگنے والا سسٹم ختم۔ سرچ آپشن سے آپ بیٹھے بیٹھے بتاسکیں گے کہ کون سی کتاب کہاں ہے، کس کو ایشو ہوئی؟ کب واپس کی گئی وغیرہ؟ دونوں نوجوان انہیں ایک مانیٹر کے سامنے ماؤس کے ساتھ بٹھا کر کافی دن نیا سافٹ وئیر سکھاتے رہے اور اس سے گجو بھائی کی پریشانیوں میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ ان کی اور اسسٹنٹ لائبریرین شبیر کی دنیا میں اس نئے اضافے کی کوئی ضرورت نہیں تھی' وہ اکثر سوچتے لیکن کچھ کر نہیں سکتے تھے۔
''گجو بھائی آپ نے تو کالج کے بہت زمانے دیکھے ہیں بتائیں سب سے اچھا دور کون سا تھا'' سیاست ہر دور کے طلبا کا من پسند موضوع تھا اور یہاں بھی کسی پروفیسر کی الوداعی تقریب میں یہ بحث زور و شور سے جاری تھی اور اسٹوڈنٹس نے انہیں دیکھ کر سوچا کہ ان کی رائے لی جائے۔
''سب سے اچھا دور کتاب سے محبت کا دور تھا'' ان کے جواب پر محفل میں خامشی چھا گئی۔ کچھ پروفیسر صاحبان نے سر ہلایا اور کچھ مزید خوش گپیوں میں مصروف ہوگئے اور گجو بھائی کے ساتھ کوئی کمپیوٹر سافٹ وئیر اسپیشلسٹ اپنی بیرون ملک سے حاصل کی گئی ڈگریوں کی اہمیت پر زور دینے لگ گئے۔ کچھ لڑکے ویب سائیٹ کے فوائد پر بحث کرتے رہے اور گجو اس بات سے دکھی ہوتے رہے کہ ان ساری ٹولیوں میں کوئی بھی کتاب کی بات نہیں کر رہا تھا۔

اس دن لائبریری کی خاموش فضا میں کچھ رونق دکھائی دی۔ فائنل ائیر کا وہ پٹاخہ سا گروپ جو پاپ میوزک کے علاوہ کسی طرف مائل نہ تھا لائبریری میں آن دھمکا۔ پہروں خالی پڑی رہنے والی لائبریری میں ان کا آنا بھی غنیمت تھا لیکن اس سے زیادہ حیران کن ان لوگوں کا سنجیدگی سے کچھ میگزین لے کر خاموش بیٹھ کر پڑھنا تھا۔ ابھی وہ اس پر مزید غور کر تے کہ پرنسپل نے کچھ مصنفین کی کتابیں فوری طور پر چیک کر کے انہیں بھجوانے کا کہلا بھیجا اور یوں انہیں اپنے من پسند گوشہء ادب تک جانا پڑا۔ لیکن یہ کیا؟ وہ ٹھٹھک گئے۔ پاؤں گویا زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ یہ یہاں کیا دیکھ رہی تھیں ان کی آنکھیں؟ کیا یہ دیکھنا باقی رہ گیا تھا اس مقدس چاردیواری میں۔ فکشن اور شاعری کی بڑی بڑی الماریوں کے درمیان ایکدوسرے کی بانہوں میں محبت کا کھیل کھیلتے ہوئے اسی پاپ گروپ کا ایک جوڑا۔ گجو بھائی کو اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ اس طرح پکڑے جانے پر بھی کوئی شرمندگی نہیں تھی بلکہ نکلتے ہوئے ان کا ڈھٹائی سے 'No privacy anywhere'' کہہ کر وہاں سے نکلنا تہذیب کے نقطہء انجماد کی انتہا تھی۔ گجو بھائی اپنی سیٹ پر آئے تو گروپ جا چکا تھا اور ان کی سیٹ پر ایک چٹ پڑی تھی جس پر دھمکی نما جملے تھے اس طرح درج تھے۔ گجو بھائی

''Keep your mouth shut or you would bear the consequences

اور غصے سے ان کا چہرہ تمتما اٹھا۔ انہیں پرنسپل صاحب کو فوری طور پر بتانا ہوگا۔ یہ سوچ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

''غضنفر صاحب میں ان لڑکے لڑکیوں کو بلا کر ان کی سرزنش نہیں کرسکتا وہ اس شہر کے رئیسوں کے بچے ہیں اور آپ نے نہیں لیکن میں نے ابھی سروس کرنی ہے''۔ پرنسپل قاسم نیازی صاحب کا اس شہر میں ٹرانسفر بھی تو انہی رئیسوں میں سے کسی ایک کی سفارش پر ہوا تھا اور وہ مجبور تھے لیکن گجو بھائی بھی مجبور تھے کیونکہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اس چاردیواری کا تقدس مجروح ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اور فیصلے کی گھڑی بھی شاید یہی تھی یعنی اپنی اس چاردیواری کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہنا۔ ہر سفر کے اختتام پر واپسی کا سندیسہ تو رکھا ہوتا ہے چاہے لوٹ کر جانا کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو انہوں نے دکھ سے سوچا۔

نئے لائبریرین کو لائبریری کا ریکارڈ اور چابیاں سونپنے کے بعد وہ گوشہء ادب میں آخری بار آئے۔ آخری بار کنج اشعار کی مہک کو سانسوں میں اتارا اور ایک ایک کتاب کو انگلیوں سے ایسے چھوا جیسے وہ الہامی کتابیں تھیں اور اس سے قبل کہ وہاں سے نکلتے یا آگے بڑھتے کہ وہ پیچھے سے اپنا نام پکارے جانے پر مڑے تو منٹو کھڑے ان سے مخاطب تھے۔

''آپ دل چھوٹا نہ کریں گجو بھائی۔ آپ اکیلے نہیں جارہے ہم سب آپ کے ساتھ ہی یہاں سے جارہے ہیں۔ آپ ہمارے ساتھ رہے اتنا عرصہ اب ہم آپ کے ساتھ رہیں گے۔'' یکا یک فیض، دانش، غالب۔ میر، سودا، منٹو، سب کی آوازیں اس میں شامل ہوگئیں۔

''میرے ساتھ مگر کہاں؟ وہ حیرت زدہ سے تھے۔

''ہم الماریوں میں کب رہتے ہیں گجو بھائی ہم تو یوں بھی اپنے قدردانوں کے دل میں رہتے ہیں اب آپ کے دل میں رہیں گے'' سب ہستیوں نے یک زبان ہو کر کہا تو مارے خوشی کے ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ اب گھر واپسی کے سفر میں ان کے قدم بوجھل نہیں رہے تھے کیونکہ وہ اس چاردیواری کو چھوڑ کر نہیں اس کی ساری رونق کو ساتھ لئے جارہے تھے۔

☆......☆......☆

دستخط

رابعہ الرَّبّاء

وہ نشے میں دھت مسلسل رم پے جا رہا تھا۔ پارٹی ختم ہو چکی تھی۔ سب رقص و سرور سے مدہوش جا چکے تھے۔ ایک وہ اور ایک لڑکا جو اس کا ساتھ دے رہا تھا۔۔۔ وہ خود تو ریڈ بیئر تک محدود تھا اور بہت کم لے رہا تھا مگر اپنے باس کا ساتھ زر خرید غلام کی طرح سے دے رہا تھا۔

بس ایک بار۔۔۔ ایک بار۔۔۔۔ وہ مجھے مل جائے تو۔۔۔ کسی بھی قیمت پر۔۔۔ ایک بار۔۔۔، بس ایک بار ۔۔۔ کسی بھی قیمت پر۔۔۔ تو زندگی میں لوٹ۔۔۔ لوٹ آؤں گا کسی بھی قیمت پر۔۔۔

وہ نشے کی حالت میں بس یہی الفاظ دھرائے جا رہا تھا۔ اس لڑکے کو سمجھ آ گیا کہ اس شریف باس کی اس کمزوری سے بہتر اب کوئی اور شے نہیں۔ وہ اسے سنتا رہا۔۔۔ سمجھتا رہا۔۔۔ باس کو تسلی دیتا رہا۔

سر جی۔۔۔ ''چھوڑیے، ایسی تو آتی جاتی رہتی ہیں''

''چھوڑئے سر۔۔''

''حکم کریں تو دنیا کی سب سے حسین ہاٹ گرل آپ کے قدموں میں لے آؤں، ایک دفعہ حکم تو کریں۔۔''

اس کے لہجے میں اتنا اعتبار تھا جیسے وہ مس یونیورس کو بھی اپنے باس کے قدموں کی خاک بنا سکتا ہو۔

''نہیں کے جے نہیں یار۔۔۔

بس، وہ۔۔۔ تجھے پتا نہیں۔۔۔

وہ کیا چیز ہے۔۔۔

اپنا دل، پہلی بار دھڑکا ہے کے جے۔۔۔

وہ بھی عمر کے اس حصے میں۔۔۔ جب لوگوں کو دل کے دورے۔۔ دورے پڑتے ہیں۔۔۔

اپنا دل دھڑکا ہے۔۔۔

اس میں سورج جیسی گرمی ہے اور چاند سی ٹھنڈک۔۔۔ کے جے وہ نا قابل بیان سراپا ہے۔۔۔ نا قابل بیان۔۔۔ اس میں سے جیسے کوئی لہریں اٹھتی ہیں اور سامنے والوں کو۔۔۔ اپنی لپیٹ میں لے۔۔۔ لے لیتی ہیں۔ یہ وصف تمہیں پتا کن کو ودیعت ہوتا ہے۔۔۔۔؟ چھوڑو۔۔۔ کے جے۔۔۔ دل دھڑکا ہے۔۔۔ یار

وہ سمجھ گیا کہ باس سچ میں اب باس وہ نہیں رہا، کچھ ہوا ضرور ہے۔ کہیں کوئی زلزلہ آیا ہے۔ کوئی بڑا جغرافیائی، سمندروں کو ہلا دینے والا طوفان آیا ہے جو اپنے اثرات بہت گہرے چھوڑ گیا ہے۔ اس کے اندر اک ہلچل سی ہوئی آخر ہے کون؟ جس کو ہر قیمت پر پانے کے لیے۔۔۔

باس کی یہ حالت تو میں نے تب بھی نہیں دیکھی تھی جب انہوں نے اپنی بیوی کو طلاق دی تھی۔ اور بچے چھوڑے تھے۔ اپنی ماں کے بعد اگر انہیں محبت تھی تو وہ اپنے بچوں سے تھی۔ مگر بچوں کو محبت اپنی ماں سے تھی۔ لہذا وہ پیسوں کی مشین بنا رہا۔ سٹیٹس کا بت، گریڈ ٹوئنٹی ون کا آفیسر۔ جس پہ معاشرہ رشک کرتا ہے۔

اسے یہ سب سوچتے سوچتے، پیتے پیتے پھر اپنا گریڈ یاد آنے لگا۔صرف نائینٹین پلس۔۔۔اس کی رکاوٹ بھی تو یہی باس تھا۔یہی اس کا یار، شریف باس، ایک فائل کے سائین ہی کی تو بات ہے۔۔۔

اس کا دھیان پھر اس لڑکی کی طرف چلا گیا

کون ہوسکتی ہے وہ پری وش؟

میں بھی تو اس شہر کی ہر پارٹی میں جاتا ہوں تو پھر کیوں نہیں جانتا۔۔۔؟

میری نظروں سے کیوں نہیں گزری؟

اس کے باس نے گلاس میز پر رکھنا چاہا تو اچانک وہ گر کر ٹوٹ گیا۔اس نے خاموشی سے باس کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔اسے ان پر رحم آنے لگا۔

سر چلتے ہیں؟

چلو۔۔۔لے چلو جہاں چاہو۔۔۔

اس نے انہیں سہارا دیا اور ہوٹل سے باہر لے گیا۔ڈرائیور کو فون کیا وہ پارکنگ سے گاڑی پاس لے آیا۔دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھے۔وہ باس کو اپنے گیسٹ ہوم میں لے گیا۔اس نے انہیں کمرے تک پہنچایا۔

وہ اسے بھولنے کے لیے ابھی اور پینا چاہ رہا تھا مگر حالت اب ایک گھونٹ کی اجازت بھی نہیں دے رہی تھی۔

کے جے نے ہمت کی اور پوچھ ہی لیا سر وہ ہے کون؟

"ہے یار۔۔۔ایک سنجیدہ لڑکی۔۔گولڈ میڈل دینے گیا تھا اس کو۔۔۔

سنجیدہ ہے، اپنے آپ میں رہنے والی

اپنے گھر میں رہنے والی، گھر کی اونچی چاردیواری کے بیچ۔۔

ہے یار۔۔۔وہ ہے۔۔

مگر نہیں ہے۔۔۔"

سر وہ کرتی کیا ہے؟ کہاں ملے گی؟

ارے یار نہیں معلوم، کچھ نہیں معلوم۔۔نہیں۔۔۔

میری گاڑی میں ایک رسالہ پڑا ہے

ایک رسالہ۔۔۔

وہ دیکھ۔۔۔لو۔۔۔

ظالم اپنے ملک کے لیے لکھتی بھی نہیں"

"سر اپنے ملک میں کوئی پڑھتا بھی تو نہیں" وہ دھیرے سے بڑبڑایا

اس نے باس کے ڈرائیور کو فون کیا۔وہ کچھ دیر میں گھر پہنچ چکا تھا۔کے جے نے اپنے ملازم کو باس کی گاڑی سے رسالہ لانے کو کہا۔

اتنی دیر میں وہ اپنے وزیٹنگ کارڈ کو غور سے دیکھتا رہا، کامران جواد۔۔مگر باس ہمیشہ کے جے ہی کہتا تھا۔وہ مسکرایا۔۔۔باس بستر پر دراز ہو چکا تھا۔

اس نے رسالہ غور سے دیکھا، اسے کوئی لڑکی سمجھ نہ آئی، وہاں تو آدھے آرٹیکل لڑکیوں کے تھے اور سب ہی اسے حسین لگ رہی تھیں کیونکہ اس کا ذاتی خیال بھی یہی تھا کہ عورت بدصورت نہیں ہوتی بس کچھ زیادہ حسین ہوتی ہیں کچھ کم۔۔۔

یہاں بھی اسے یہی معمہ نظر آیا۔اس نے باس کی طرف دیکھا

''سر کونسا آرٹیکل؟

وہ جو مشرقی و مغربی تہذیب پر ہے۔اس نے پھر سے رسالہ کھولا تو وہی صفحہ اس کے سامنے تھا

''اوہ''

وہ لڑکی تو سچ میں حسین ہے مگر گھریلو نہیں لگتی، باس کو چکمہ دے گئی ہے۔۔وہ یہ سوچ کر مسکرانے لگا

جوان ہے حسین ہے۔۔۔ہاٹ مین چاہتی ہوگی

اسے اپنی جوانی پہ مان ہونے لگا۔اس نے وہاں سے اس کا ای میل آئی ڈی اپنے موبائیل میں نوٹ کر لیا۔لڑکی کی تصویر میں ایک غرور حسن بھی تھا۔ جو اسے بھا گیا۔وہ عورت کو تب تک عورت سمجھتا تھا جب تک کہ اس کے غرور کو توڑ نہ دے۔اس کے بعد کوئی عورت اس کے قابل نہیں رہتی۔

''یک ناشد، دو شد،

وہ زیر لب مسکرایا۔باس نیم غنودگی کے عالم میں وقفے وقفے سے وہی جملے دھرا رہا تھا۔اس نے ہمدردانہ باس پہ ایک نظر ڈالی۔اٹھا اور ایک سائیڈ لیمپ جلا دیا۔باقی کی تمام روشنیاں گل کر دیں اور آہستگی سے کمرے سے باہر نکل آیا۔باہر کھڑے ملازم کو آنکھوں کے اشارے سے سمجھایا کہ صاحب کا خیال رکھنا اور رسالہ اٹھائے باہر نکل گیا۔اسے دیکھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی سٹارٹ کی۔وہ بے نیازی سے، سوچوں میں گم پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''گھر چلو'' بس اس نے انہی دو الفاظ کا سہارا لیا۔سارے رستے اُسے لڑکی کے حسن کا غرور دکھائی دیتا رہا، جو اس کا اصل حسن تھا۔حسن بھی کیا شے ہے، غرور کے بنا جچتی ہی نہیں، ٹوٹے بنا بنتی بھی نہیں۔

عجب فلسفے اس کے اندر گردش کرتے رہے۔کہ اسے پتا ہی نہیں چلا کب گھر آ گیا اور گھر کا دروازہ بھی کھل گیا، گاڑی گیراج میں بھی پہنچ گئی

''صاحب جی۔۔'' ڈرائیور کی آواز نے اسے چونکایا'' ہوں،،

''اوہ،،۔۔۔'' اچھا،، یار تم بھی کمال کے انسان ہو، بس اسی لیے مجھے اچھے لگتے ہو،،

وہ اسکا دل رکھتے ہوئے گاڑی سے اتر گیا۔اور اندر گیا۔اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔نیم تاریکی تھی۔گویا بیوی سو چکی تھی۔آج تو اسے کلب بھی جانا تھا۔تھک گئی ہوگی۔وہ یہ سوچتے ہوئے ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔کپڑے اتارے اور نہانے چلا گیا۔اب نائیٹ سوٹ میں وہ خود کو آزاد پنچھی محسوس کر رہا تھا۔اپنے قد کے برابر آئینے کے سامنے کھڑے اس نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرنا چاہا۔مگر وقت کا سفر کافی سفر ہو چکا تھا۔اب ان ریشمی گھنے بالوں کی جگہ ریشم کے چند تار رہ گئے تھے۔وہ مسکرایا، اپنا موبائیل اٹھایا اور سٹڈی روم چلا گیا۔

لیپ ٹاپ آن کیا اس پری وش کو ایک روایتی تعریفی ای میل کیا۔اسے یقین تھا کہ اس کے لفظوں کا جادو چلے گا کیونکہ وہ اس کی تحریر پڑھ کا سمجھ چکا تھا کہ وہ ملائم اور ریشمی زبان کی رسیا، کسی خیالی پرستان کی دیوی ہے۔

آج وہ بہت تھکن محسوس کر رہا تھا۔ مسلسل کوشش ناکام ہو رہی تھیں۔اس ناکامی نے اسے تھکن سے چور کر دیا

تھا۔ بس ایک دستخط کی دیر تھی۔
وہ کمرے میں اور لیٹتے ہی سو گیا۔ بوجھ تو وہ شاید پری وش کی ای میل میں اتار آیا تھا۔ محبت کے لفظ، محبت کے جذبے بھی تو کبھی بوجھ بن جاتے ہیں۔ انہیں بھی کبھی کوئی کاندھا چاہئے ہوتا ہے۔ کوئی خالی کاندھا۔۔۔
صبح دفتر کے کام دھندوں۔ سہ پہر کلب میں میٹنگ تھی۔ ادھر چلا گیا۔ ابھی وہ کچھ لمحے کسی سے ملنا نہیں چاہ رہا تھا۔ سردی کی سنہری دھوپ میں باہر کسی درخت کے نیچے تجی میز کرسیوں کی طرف بڑھ گیا۔ اپنا ٹیب نکالا اور ای میل چیک کرنے لگا۔ پری وش کا شکریہ کے پھولوں سے بھرا ای میل آیا ہوا تھا۔ وہ سمجھ گیا بات بن گئی۔ وہ مسکرایا۔ اور اس کو جوابی بہار رنگ ای میل کر دیا۔ اس نے اب اپنا موبائیل نمبر، اپنے عہدے کے ساتھ ایک اضافی سرکاری ذمہ داری کا اعزاز یہ بھی رقم کر دیا۔ جس کے مطابق وہ خواتین کے حقوق کا پاسبان بھی مقرر تھا۔
بات میل سے فون تک آ گئی۔ وہ عورت کو عزت دینا جانتا تھا۔ اس کی عزت بھی کرتا تھا۔ اور یہ بھی جانتا تھا کہ عورت کو محبت کے جال سے پہلے عزت کے جال میں پھانستے ہیں۔ عورت جتنی مظلوم ہوگی اتنا جلد عزت کے سنہری جال میں آ جائے گی۔ وہ عزت ہی کی تو پیاسی ہوتی ہے۔ اس سے اس کا اعتبار بحال ہو جائے تو محبت کا جال اس کے بعد پھینکا جاتا ہے۔ اور پھر جال خود بخود کٹ پھٹ جاتا ہے۔
کے جے نے اسے اپنی باتوں، اپنے لفظوں، اپنے لہجے سے ایسے ایسے شاہی لباس پہنائے کہ وہ خود بخود محبت کی ڈوری میں بندھتی چلی گئی۔
زمینداروں کے مذہبی روایتی رواجوں کی پابند سلجھی، پڑھی لکھی حسینہ جو محافظوں بنا گھر سے نکل بھی نہیں سکتی تھی۔ اس سے ملنے ایک بار ملنے کا وعدہ کر بیٹھی۔ اور آخر ٹوٹی کانچ کی راہوں پہ چل کر اسے ملنے آ گئی
اس نے اُسے ایک اعلیٰ شان ہوٹل میں بڑی شان سے بلایا تھا۔ دھیمی موسیقی، اور خوابی رشنیوں میں وہ اور زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ بت تراشنے والوں جیسے تھے۔ چائے پیتے ہوئے وہ اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ جو نظریں کہہ رہی تھیں ''آؤ تمہیں باہوں میں بھر لوں''
دوسری طرف دل کہہ رہا تھا'' کاش ابھی۔۔۔،،
وہ ان نگاہوں کی گرمی سے ٹپ ٹپ ہونے لگی۔ وہ نگاہیں جس میں ہوس نہیں تھی۔ تکریم ذات تھی، مان تھا، تمنا تھی، بُلاوا تھا۔ اس سے قبل اس نے یہ سب کسی کی نادان آنکھوں میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ جاتے جاتے دل کے ساتھ جان بھی دے گئی۔ وہ محبت سے اگلی منزل پہ خود قدم رکھ چکی تھی۔
بات ہوتی رہی۔ وہ سمجھ گیا۔ وہ آسمانوں پہ اڑنا چاہتی ہے۔ جینا چاہتی ہے، اپنے حصے کی زندگی آپ گزارنا چاہتی ہے۔ کے جے کا خیال بھی یہی تھا کہ یہ پری وش کا حق ہے۔ اسے ملنا چاہیے۔ کے جے نے اسے زندگی اور زندگی کا ساتھ دینے کا وعدہ کر لیا۔ اس نے بھی کے جے کی آنکھوں سے ٹپکتے جذبوں کا اعتبار کر لیا۔ کے جے نے اسے دور۔۔۔ یہاں سے بہت دور لے جانے کا وعدہ کیا۔ اور یقین دلایا کہ عمر بھر ساتھ دے گا اور کوئی اس تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اس کے پاس اتنی طاقت وقوت ہے کہ وہ اس کے خاندانی غرور کی تلواریں اس تک نہیں پہنچنے دے گا۔
چند دن بعد وہ کے جے کے کہنے پر اسی ہوٹل آ گئی۔ یہیں سے کے جے اسے اپنی گاڑی میں بیٹھا کر نجانے کون سے جہان کی اور چل پڑا۔ گھنٹوں کے سفر کے بعد جب گاڑی رُکی تو یہ ویرانے میں بنا ایک طویل و عریض بنگلا تھا۔ بڑے

رقبوں، اونچی دیواروں کی رہنے والی وہ خود بھی تھی۔ یہ مادیت اسے متاثر نا کر سکی۔ اس کا مان تو وہ ساتھ تھا، جو اس کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی، ساتھ نا تھا۔ اندر اچانک اک گھن سا تھا جو لگ گیا تھا۔ کے جے نے تو شرعی ساتھ کا وعدہ کیا تھا۔۔۔ شرعی ساتھ کے بنا اینٹوں کی یہ قبر اس کے لیے تنگ ہو رہی تھی۔

اسے اب بھی کے جے کی آنکھوں اور لہجے میں ہوس نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ اسے ایک پر تکلف کمرے میں چھوڑ کر خود باہر نکل گیا۔ وہ سہمی ہوئی تھی۔

رات کو جب وہ لوٹا تو اس کی نگاہوں میں وہی مان، وہی عزت، وہی آس، وہی تمنا ٹمٹمار ہی تھی۔ وہ ان جگنوؤں کے سامنے بے بس ہو گئی۔ جوں جوں رات گہری ہوتی گئی، اس کی یہ بے بسی بڑھتی گئی۔ اور آخر کار شب کا ذب پری وش اور کے جے کے درمیان سب پردے اُٹھ گئے۔

زندگی وہ جینا چاہتی تھی۔ مگر جب ہوش میں آئی تو اسے لگا زندگی کے عوض وہ مر چکی تھی۔ کے جے کی آنکھوں اور رویے میں اب بھی ہوس نہیں تھی۔ اس کی نرم و ریشمی باتوں کے ساتھ اس کے لمس میں بھی لطافت کا احساس تھا۔ اک مان تھا جس کے سامنے وہ بے بس تھی۔

یہ انسانوں کی کیمسٹری بھی کیا شے ہے۔ کسی کے سامنے سیسے کی دیوار ہے تو کسی کے سامنے پانی کا بہاؤ۔۔

کئی دن یونہی گزر گئے۔ کے جے صبح چلا جاتا اور رات کو آتا۔ یونہی ایک ماہ گزر گیا اور اسے محسوس ہوا کی اس کے جسم کے اندر جیسے اک اور جسم نے جگہ بنالی ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کے جے کو بتایا۔ وہ یہ سنتے ہی خوشی سے اسے لپٹ گیا۔ لیکن اس کی قبر کی دیواریں اس کے اپنے ہی گرد اور تنگ ہو رہی تھیں۔ اب تو پسلیوں کی ہڈیاں بھی آپس میں کڑ کرانے لگی تھیں۔ "یہ روح کس کے نام سے منسوب ہوگی" یہ سوال اس کو اندر ہی اندر گھول رہا تھا۔ بظاہر وہ زیادہ حسین ہوتی جا رہی تھی۔ مگر اندر۔۔۔ اس اعلی شان عمارت کے اندر گھن کا کیڑا گھس گیا تھا۔

کے جے بہت خوش تھا۔ پری وش کو اس بات پہ بھی حیرت تھی کہ کے جے کی محبت بڑھتی جا رہی تھی۔ کالے شیشوں کی گاڑی میں لیڈی ڈاکٹر بھی آنے لگی۔ اس کا چیک اپ کرتی، مسکراتی، مبارک دیتی، چلی جاتی۔

وہ اڑنا چاہتی تھی۔ وہ اڑ تو رہی تھی۔ پرواز کہاں کو تھی۔ یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ کے جے اسے سوال کرنے کا موقع ہی نہیں دیتا تھا۔ ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیتا۔ میں خوش ہوں ناں۔۔ تو تمہیں بھی خوش ہونا چاہئے۔ میں تمہیں چھوڑ کر تو نہیں جا رہا ناں۔۔۔ عمر بھر ساتھ کا وعدہ کیا ہے تو نبھاؤں گا۔

ابھی تک اس نے ایک وعدے کے سوا سب وعدے نبھائے بھی تھے۔ زبان کا پکا نکلا۔۔ اس لیے پری وش بے بس ہو کر خاموش ہو جاتی۔ یوں بھی اب وہ بے بس ہو چکی تھی۔ سب کشتیاں جل چکی تھیں۔ موت آگے تھی، تو پیچھے بھی موت ہی تھی۔

نو ماہ یونہی آنکھ مچولی میں ہی گزر گئے۔ ڈاکٹر گھر پہ ہی رہنے لگی۔ اور ایک رات کے جے کی صورت کا ایک بچہ اسی پرُ لطف کمرے میں لیڈی ڈاکٹر کے ہاتھوں میں رو رہا تھا۔

آج اس کو کے جے کی ضرورت تھی مگر آج کے جے کہاں تھا؟ آج وہ کے جے کے ساتھ اپنی خوشی بانٹنا چاہتی تھی لیکن آج کے جے آیا ہی نہیں۔ پری وش رات بھر اس کی منتظر رہی۔ مگر وہ نہیں آیا، ایک دن۔۔۔ دو دن۔۔۔ تین دن۔۔۔ ڈاکٹر بھی پھر آنے کا کہہ کر چلی گئی۔ رابطے کی کوئی صورت نہیں تھی، نا فون تھا۔ نا سیل تھا، نا انٹرنیٹ وہ کس جگہ تھی اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا، اتنے عرصہ میں کے جے اتنے دن اس سے دور رہا بھی نہیں تھا۔ اس کا دل گھبرانے لگا۔

کے جے آج پھر اسی ہوٹل میں اپنے باس کے ساتھ تھا۔اور باس آج بھی یہی کہہ رہا تھا
ایک بار۔۔۔بس ایک بار کسی بھی قیمت پر۔۔۔زندگی اس کے قدموں میں۔۔۔قدموں میں نچھاور کردوں گا۔۔اس نے۔۔۔پہلی بار۔۔۔یار پہلی بار۔۔۔کسی نے میری روح کو۔۔۔

روح کو چھوا۔۔۔ہے۔۔۔

سر اور اگر آپ اس کی زندگی کے پہلے مرد نا ہوئے تو؟ کے جے نے سنجیدگی سے پوچھا

''تو ہمیں۔۔۔اپنے والی۔۔۔کون سی۔۔۔کون سی۔۔۔پہلی جگہ ملی تھی۔۔۔کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔عورت جس سے منسوب۔۔۔منسوب ہوتی ہے۔۔۔اس کی نا بھی ہو تو۔۔۔اسی کی کہلاتی۔۔۔کہلاتی ہے،،

سر میں کوشش کر رہا ہوں۔اسے آپ کے قدموں کی دھول بنا دوں۔۔۔کر رہا ہوں کوشش۔۔۔

گلاس آج بھی گر کر ٹوٹ گیا تھا۔آج بھی کے جے انہیں اپنے گھر لے گیا تھا۔آج بھی وہ نیم تاریک کمرے میں غنودگی کے عالم میں تھے۔آج بھی کے جے ڈرائیور کے ساتھ گھر چلا گیا تھا۔

صبح یار باس کے دفتر کے باہر کے جے کی گاڑی رکی۔اس نے اپنے ڈرائیور کے ہاتھ ایک فائل باس تک پہنچائی۔

یار باس نے فائل کھولی۔اس میں ایک کاغذ پہ مختصر تحریر رقم تھی

''میں نے اس لڑکی کو ایک گروہ سے بازیاب کروالیا ہے۔وہ میری تحویل میں ہے۔سرکاری طور پر یہ بات ابھی خبر نہیں بنی۔میں اس مجبور لڑکی کو سمجھا کر آپ تک پہنچا سکتا ہوں۔وہ سچ میں محبت کے قابل ہے۔اور اگر آپ مظلوم کو پناہ دے بھی دیتے ہیں تو الزام آپ پہ نہیں آئے گا

بلکہ کریڈٹ ہوگا کیونکہ وہ کئی ماہ سے گھر سے غائب تھی۔مگر ایک فائل آپ کی میز پر بھی دستخط کی منتظر ہے۔

یار باس نے پڑھا تو بے چین ہوگیا۔ساری عمر نہیں کیا میں نے یہ سب۔اب آخری سال میں۔۔۔جاب کے آخری سال میں۔۔۔اس نے اپنے ویسٹ انڈین ڈرنک میں پناہ تلاش کی۔وہ سمجھ نہیں پار ہا تھا کیا کرے۔۔۔ساری رات تاروں میں بیت گئی۔اگلی صبح وہ دفتر جلدی چلا گیا

اس نے فائل پر دستخط کر دیئے۔فائل کو آج پیر لگ گئے تھے۔

رات کو کے جے کا ڈرائیور یار باس کو اس بڑی سی قبر میں لے گیا۔جہاں اک محبت مسکرا رہی تھی۔یار باس گاڑی سے اترنے لگا تو ڈرائیور نے ایک لفافہ ان کی طرف بڑھا دیا

بڑے صاحب یہ صاب جی نے دیا تھا کہ آپ کو دے دوں۔یار باس نے لفافہ پکڑ لیا اور باہر نکلا۔ٹھنڈی ہوا محو رقص تھی۔یار باس نے لفافہ کھولا۔کاغذ پہ دو جملے مسکرا رہے تھے

''سر عورت کو ہمیشہ آنکھوں کے پانیوں میں سنبھالتے ہیں۔اسے سنبھال کے رکھیئے گا،بہت قیمتی ہے''

☆......☆......☆

''مدہوشی سفر کرتی ہے''

سیمیں کرن

بچہ اپنے کھلونوں کے ساتھ کھیل میں پوری طرح مگن تھا وہ کبھی ایک کو اٹھاتا، دوسرے کو پٹخ دیتا، بھالو کی آنکھوں میں اُنگلیاں کھبو کر خوشی سے قلقاری لگاتا، کبھی اپنے ہتھوڑی نما جھنجھنے سے وہ چھوٹے سے پٹی کھلونے کی پٹائی کرنے لگتا اور کبھی وہ گڑیا کے بال نوچنے لگتا!

جو کھلونے چابی یا سیل سے چلنے والے تھے، وہ اس ''تشدد'' پر ردِعمل کے طور پر اپنی مخصوص میڈ کی آوازیں نکالتے تو بچہ خوشی سے تالیاں پیٹنا شروع کر دیتا! ان کے خاموش ہونے پر وہ اپنے عمل کو دہراتا اور دوبارہ سے اس ردِعمل سے خوشی کشید کرتا۔ اپنی خوشی کے اظہار کے لئے کبھی وہ قلقاریاں لگاتا، تالیاں پیٹتا اور منہ سے بے معنی سی آوازیں اور مسرت بھری چیخیں مارتا۔

وہ بہت دیر سے کھیل رہا تھا، اور کھیلتے اب شاید اُوب گیا تھا۔ وہی کھلونے جو چند لمحہ پہلے توجہ کا مرکز تھے، اب اس نے کچھ پٹخ دیئے اور کچھ کو لات مار کر پرے کر دیا۔ اُس نے اپنے اردگرد دیکھا، کسی کو بھی متوجہ نہ پا کر وہ رونے لگا! رونے کے اس مشغلے اور کھیل نے اِک اور نئے کھیل کو جنم دے دیا!

اُس کو روتا دیکھ کر بڑا بھائی اس کی جانب متوجہ ہوا، اس نے بچے کو گود میں اٹھالیا، اس کو چوما، اس کی بغلوں میں ہلکی سی گدگدی کی، بچہ کھکھلا اٹھا، کھلکھلانے سے اس کے پھولے پھولے گالوں میں اِک ڈمپل اُبھرا۔ بھائی نے اُس ڈمپل میں اپنی انگلی کھبو دی، بچے کو درد محسوس ہوا تو وہ رونے لگا۔ بھائی نے چپ کروانے کو دوبارہ گدگدی کی، بچہ پھر ہنسنے لگا، کچھ دیر بچہ اور بھائی اسی طرح کھیلتے رہے۔

اب بڑے بھائی نے اِک اور وطیرہ اختیار کیا، وہ بچے کو ہوا میں زور سے اچھالتا اور بچہ خوف سے چیخیں مارتا تو بھائی لطف سے کھکھلا اٹھتا، ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتا، بچہ کچھ دیر خوف سے چیختا رہا مگر بعد میں اسے کھیل کی سمجھ آ گئی، اس نے چیخنا چھوڑ دیا تو اس نے بچے کو تنگ کرنے کا اِک اور طریقہ ایجاد کیا۔ وہ اس کے ہاتھ میں پکڑی چیز چھینتا، بچہ کچھ دیر واپس لینے کی کوشش میں ہلکان ہوتا، آخر غصے سے چیخنے چلانے لگتا تو بھائی کھلونا واپس کر دیتا!

ماں کتنی دیر سے دونوں بچوں کو مشاہدہ کر رہی تھی وہ کوشش کرتی تھی کہ بچے باہمی تعلقات کو خود درست اور منظم کرنا سیکھیں، اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ بطور ماں ان کے معاملات میں کم سے کم مداخلت کرتی، اس کی آرزو تھی کہ بچے اک دوسرے کے وجود کی اہمیت، شخصی احترام سے خود آگاہ ہوں اور ایک دوسرے کے وجود سے خوشی کشید کرنے کے ہنر سے بہرہ ور ہوں! مگر موجودہ صورتحال ناقابل برداشت تھی اس کے لئے۔

بڑا اپنی طاقت کے زعم میں فاعل بنا بیٹھا تھا اور چھوٹے کو مفعول بنا لیا تھا، جبکہ وہ کیوں اس بات سے ناآشنا تھا کہ وہ بڑا اسی لئے کہلاتا ہے کہ کوئی اس سے چھوٹا ہے!

وہ دونوں اپنی جگہ اپنی ذات میں مقصود بالذات تھے!

بس یہی احساس ماں کو مشتعل کر گیا، وہ غصے سے چیختے ہوئے بولی۔

''یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' کیا یہ کھیل، تفریح، خوشی ہے یا پھر وحشت! اور یہ تسکین تمہیں اُس کو دکھ دینے میں کیوں مل رہی ہے تم یہ کیوں کر رہے ہو؟''

بچہ ماں کی سرزنش پر شرمندہ ہو گیا اس نے چھوٹے بھائی کو چھوڑ دیا، شرمندگی کے احساس نے غصے اور غصے نے عدم دلچسپی اور لاتعلقی کو جنم دیا!

کھیل ختم ہو گیا مگر شاید کھیل تو اِک دائرہ ہے اور دائرے کا کنارہ کوئی نہیں، اک کھیل کسی نئے اور بڑے دائرے میں داخل ہو کر اپنی ماہیت بدل لیتا ہے۔ بس!

ماں بچوں کی حرکت سے دل برداشتہ ہو کر ٹی وی کے آگے بیٹھ گئی، وہاں مختلف چینلز میں ایک ہی طرح کے بارہ مصالحوں کو تھوڑا سا ردو بدل کر کے ڈراموں کا اک ہی طرح کا کھیل رچایا جا رہا تھا، یہ خیال اِک طاقتور محسوس بن کر اُس کے دماغ کے دائرے میں داخل ہوا تو اُس کو جیسے اُبکائی سی آئی!

اُس نے بد دل ہو کر چینل بدلا۔ وہاں اک دستاویزی پروگرام چل رہا تھا جو دیکھنے میں کافی معلوماتی اور دلچسپ محسوس ہوا۔ اس نے ریموٹ کنٹرول کو اک سائیڈ پر رکھ دیا اور ذہن کو جھٹک کر انہماک سے نگاہیں ٹی وی پر جما دیں! دستاویز کیا تھی، ماضی سے مستقبل کی جانب سفر کرتا اِک منظر نامہ تھا، جہاں افغانستان کی تباہی سے جنم لینے والی اک تشدد پسند لہر تھی جو کیسے چھوٹے ترقی پذیر اور غریب ملکوں کو، مسلم ملکوں کو نگل رہی تھی، عراق کی تباہی، یوں لگ رہا تھا کوئی ظالم دیو اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کے لئے ان ممالک کو کھلونوں کی طرح روندتا چلا جا رہا تھا۔ اس ظالم دیو کی بھوک سیاہ بہتا زیر زمین آب حیات تھا۔ اک کے بعد اک منظر بدلتا جا رہا تھا اور وہ مسحور و مبہوت بیٹھی دیکھ رہی تھی، کیسے بلند و بالا ٹاور سے کھلونوں جیسے دو جہاز ٹکرائے اور سب کچھ خاک کر گئے، اک عجیب وحشت بھرا کھیل جس میں انسان بے جان کھلونوں کی طرح چرمرائے پڑے تھے، اس کھیل نے عالمی منظر نامہ بدل دیا۔ دنیا دو بڑی جنگوں کی ہولناکی، تباہی بھول کر نئے زخموں کو چاٹنے کی تیاری کر رہی تھی، یہ کھیل وسیع ہو کر اک تیسری عالمی جنگ میں بدل رہا تھا۔ اسے یوں لگا کہ اس کا سانس جیسے اس بربریت کو دیکھ کر بند ہو جائے گا۔

وہ سوچتی ضرور تھی مگر اک سادہ سی عورت، اک عام انسان تھی جیسا گلی میں سبزی کی ریڑھی لیکر آنے والا، اک عام دکاندار، اک آفس کلرک جس کے لئے اس کے خاندان اور اس کی عاقبت کے دم آخر تک سب کچھ اک عنصر بیرون ہی رہتا ہے۔ سو وہ سب کچھ جھٹک کر اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی، دوپہر اور رات کے کھانے کا انتظام کرتی رہی!

شام کو فارغ ہوئی تو اپنے کمرے میں داخل ہوئی، سامنے وہ سرخ سوٹ جس پہ ریشمی سنہرے دھاگے سے کڑھائی ہوئی رکھی تھی، کو دیکھ کر اس کا دل اک لمحے کو ذرا زور سے دھڑکا۔

ماں کے لبادے کو اتار کر وہ اک دم جیسے عورت کا پیراہن اوڑھ کر سامنے آ گئی۔ ماں کے سنجیدہ، باوقار، ملکوتی و مقدس لباس میں اک عورت کے جسم کو داخل کرنا کبھی کبھی اسے اک عجیب سا کھیل لگتا، اک دلچسپ تماشا! اور پھر وہ سوچنے لگتی کہ یہ عورت کا اصلی، سُچا اور سچا جسم ہی تو ہے جو اسے ماں کی باوقار پوشاک عطا کرتا ہے! اور پھر وہ خود اپنی پہلی سوچ کی نفی کرنے لگتی۔

''نہیں نہیں یہ تبدیلی، یہ ماں سے عورت اور عورت سے ماں کا سفر اور چکر کوئی کھیل نہیں...... یہ زندگی ہے''۔

اب وہ سرخ سوٹ میں ملبوس، نکھری سنوری لبوں اور رخساروں پر چمکتی محبت کی سرخی لئے اک سراپا محبت میں ڈھلی عورت تھی جس کے لئے محبت ہی اس کا طواف تھا اور اس کی زندگی! وہ اپنے ہمسفر اپنے محبوب کی فرمائش پر اس کے پسندیدہ رنگ میں ڈھلی تھی، یہ احساس جیسے کائنات پہ پھیلا نظر آ رہا تھا اسے اس لمحے!

وہ جب گھر آیا تو جیسے ہر شے پہ محبت کا ارغوانی و سرخ غبار چھایا ہوا تھا، اک سرخ دھند تھی جو حواس پہ براہ راست اثر انداز ہوتی تھی، اک ہلکا ہلکا سرور و نشہ لئے! یہ نشہ جیسے وجود سے بڑھ کر پورے ماحول پہ احاطہ کئے ہوئے تھا۔

وہ کھانا لگاتی، برتن ٹیبل پر رکھتی، مسلسل خود اپنے مرد کی نگاہوں کے ارتکاز کو محسوس کر کے دل میں اک گدگدی کی سی کیفیت کو محسوس کرتی تھی، مرکز نگاہ ہونا بھی اک عجب کھیل ہے!

کھانے کی میز پہ بچے اور وہ دونوں اک اسی سرخ دھند بھرے ارغوانی سے غبار میں جیسے خوشیوں کے پنڈولوں پر سوار تھے، خوشی اس غبار میں رقص کرتی پھر رہی تھی۔ یہ رقص اک دلکش تماشے کو جنم دے رہا تھا!

کھانے کی میز سے اٹھ کر وہ ٹی وی لاؤنج میں آ بیٹھے، وہ مختلف کاموں میں مصروف کبھی بچوں اور مرد کے درمیان آ بیٹھتی، کسی بات میں شامل ہو کر پھر اٹھ جاتی۔ مرد گہری معنی خیز بولتی آنکھوں سے اسے مسلسل حصار میں لئے ہوئے تھا۔ ان آنکھوں میں بہت واضح اشارے اور پیغام تحریر تھے۔ وہ ان کو پڑھ کر اندر ہی اندر جھنپ جاتی اور آنکھ اوپر اٹھانا بھول بیٹھتی۔ دل خوشی کے کسی اور اونچے رتھ پر سوار ہو کر خود کو مرکز نگاہ اور مرکز حیات کے تخت پر بیٹھا دیکھ کر اک عجیب سی راحت کشید کر رہا تھا!

رات گئے جب وہ گھر کی تمام فالتو لائٹس آف کرتی، بچوں کے ماتھے پر شب بخیر کا بوسہ دیکر، بچے ہوئے کھانے کو فریج میں سمیٹ کر اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو اس کا دل تیرے پہ اک دم دھڑکا اور اس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔ وہ کمرے میں اسکا منتظر تھا۔ اس کے اندر آتے ہی والہانہ اس کی طرف بڑھا اور اس کو باہوں کے گھیرے میں لے لیا۔ اس کے لب بے قراری سے اپنی پیاس بجھانے لگے!

اس کو لگا کمرہ محبت کے سرخ غبار سے نہا گیا ہے، محبت بڑھ بڑھ کر اک دوسرے کے گلے مل رہی تھی۔ اک دوسرے کے وجود کو اثبات دیتی، اپنے ادھورے پن کا اعتراف کر رہی تھی، محبت کا یہ روشن سرخ غبار بڑھتے پھیلتے اک تاریک سرنگ میں داخل ہو رہا تھا۔ اک تاریک حبس بھری تنگ سرنگ جہاں صرف چڑھتے اترتے سسکتے سانسوں کا راج تھا۔

اور یہ چڑھتے اترتے، پھیلتے پھولتے سانس پھر یک دم اک ہوا نکلے غبارے کی طرح پچک سے گئے جیسے!

غبارہ کیا پچکا، دلچسپی، وابستگی، یکدم لاتعلقی میں بدل گئی!

اس لاتعلقی نے اسے رائیگانی وارزانی کے اک عجیب سے رنج میں مبتلا کر دیا۔

وہ یونہی بکھری لٹی پٹی حالت میں بیڈ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اک نظر سوتے شوہر پر ڈالی، وہ مکمل سکون، اطمینان اور لاتعلق ہوا دوسری طرف کروٹ لئے ہلکے ہلکے خراٹے لے رہا تھا اسے جانے کیوں صبح اپنے بچے کے ٹوٹے کھلونے یاد آ گئے!

وہ بستر سے کسی ٹوٹے ہوئے کھلونے کی طرح اُٹھ کر باہر چلی آئی، سوئے بے خبر مطمئن مرد کو اب کہ بستر کے خالی پن کی نہ خبر ہوئی اور نہ ہی شاید کوئی فرق پڑا۔

کھلونے تو کھلونے ہی ہوتے ہیں ٹوٹ بھی جائیں تو اپنے مقدر سے نہیں لڑ سکتے!

سو وہ بھی کھلونے کی طرح اندر کہیں ٹوٹ کر بھی زندگی کے کھیل میں اسی طرح شامل تھی مگر یہ شاید اس کا مزاج تھا کہ احساس کی نیت میں چبھا کانٹا کبھی نہیں نکلتا تھا اندر ہی اندر کہیں دکھ دیتا رہتا تھا، یہ دُھن کسی طرح آفاقی حقیقتوں سے جا جڑتی اور خود بخود نتائج اس کے ہاتھ میں تھما دیتی!

اک خود کار کھیل جو اندر جاری و ساری رہتا!

وہ اور اس کا بیٹا کچھ سامان خریدنے گھر سے نکلے تھے مارکیٹ کو جاتے رستے کو شارٹ کٹ کرنے کو اکثر وہ قریبی پارک میں سے گزرتے ہوئے جاتے۔ یہ پارک کالونی کے وسط میں واقع تھا۔ وہ پہلے گیٹ سے اندر داخل ہوئے، دوسرا گیٹ مارکیٹ کے آغاز پہ کھلتا اور وہاں سے مارکیٹ میں داخل ہو جاتے!

اس دن بھی ان دونوں نے اپنے معمول کے رستے کو اپنایا!

معمول بھی لگا بندھا اک تماشا ہی ہوتا ہے!

اس کے بیٹے نے پارک میں سے گزرتے ہوئے اس سے باتیں کرتے کرتے سفید خوشنما پھولوں کے اس کنج کو دیکھا تو ٹھٹک کے رُک گیا، یہ پودا شاید کچھ عرصہ قبل پارک کے رکھوالے نے یہاں لگایا تھا، اس نے بھی یہ پھول پہلی بار دیکھے تھے، خوبصورت چھوٹی چھوٹی کلیاں، اس سے پہلے کہ ماں بچے کو روکتی، لڑکے نے ہاتھ بڑھا کر پھول توڑ لیا اور لاپرواہی سے باتیں کرتا پارک کے دوسرے گیٹ سے ماں کے ساتھ باتیں کرتا باہر نکل آیا۔

اس کے بیٹے نے پھول کو ناک کے پاس کیا، سونگھا تو جیسے حیرت و مایوسی سے جھٹکا لگا۔ ’’ارے ماں، یہ تو بغیر خوشبو کے ہے، اس کا بھلا کیا فائدہ۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے پھول غصے اور حقارت سے پھینک دیا!

ماں کے لئے یہ حیرت ناک تھا، اس حیرت کے در نے اس پر جیسے کچھ چیزوں کو منکشف کیا، کچھ چیزیں اک پراسرار عمل کے تحت خود بخود اک دوسرے سے جڑتی چلی گئیں۔ اک بار پھر اسے اپنے منے بیٹے کے کھلونے یاد آئے، بڑے بیٹے کا چھوٹے بھائی سے کھیلنا یاد آیا، شوہر کا محبت کا کھیل یاد آیا، اس کو یوں لگا کہ اس کھیل کا بھید اس کے ہاتھ لگ گیا ہے، ہر کھیل افادے کی بنیاد پر کھیلا جاتا ہے، پھول خوشبو کے لئے ڈال سے توڑا جاتا ہے، خوشبو نہ ہو ختم ہو جائے تو پھول کچرے کے ڈبے میں پھینک دیئے جاتے ہیں، یہ فطری اور منطقی عمل اس کو بھلا کس لئے چھیل رہا تھا؟!

وہ یہ سب سوچتی، الجھتی آگے بڑھ رہی تھی، اس کے بیٹے نے اس کی جانب دیکھا اور دل میں سوچا ’’چلو تماشا شروع، ماں حسب معمول کسی سوچ کے غار میں داخل ہو گئی۔‘‘

وہ اسی طرح آگے بڑھ رہی تھی کہ سامنے سڑک آ گئی، اس سڑک کے پار مارکیٹ تھی جہاں ان دونوں کو جانا تھا، سڑک پر رش تھا، ہر کوئی زندگی کی ریس میں جیت کا کھیل کھیلنے پہ جیسے مصر تھا، ان کو رُکنا پڑا!

اچانک تیز رفتار کار سامنے آئی لوڈر وین سے ٹکرا گئی، ایکسیڈنٹ اتنا شدید تھا کہ گاڑی کا مالک خون آلود حالت میں گاڑی سے باہر جھول رہا تھا، گاڑی میں بیٹھا چھوٹا بچہ گاڑی کی ونڈ سکرین پھاڑتا باہر سڑک پر خون و خاک سے لتھڑا پڑا تھا۔ بس چند پل کا کھیل تھا، چند پل کا کھیل جو اوپر بیٹھے تماشا گر نے جانے کس افادے کی بنیاد پر کھیلا تھا؟......

اس کی آنکھیں چندھیا سی گئیں، اک مدہوشی عالم بے ہوشی کی طرف سرکنے لگی، اسے یوں لگا جیسے گاڑی میں بیٹھے مرد کے جسم پر جو چہرہ تھا وہ اس کے مرد کے چہرے میں ڈھل گیا اور وہ بچہ بھی شاید جو ابھی گھر سے کھلونوں سے کھیلتا ہوا آیا تھا!

بھید کا جنم

اقبال خورشید

سڑک پہ بچھی خاموشی، فضا میں منجمد کشیدگی، پیڑ پر لرزتی اضطرابی چیخ...بھید بھرا لمحہ تھا وہ۔ اُس عمل کے وقوع پذیر ہونے کے لیے، جو وقوع پذیر ہونے کو تھا، انتہائی سازگار۔

میں نے آسمان پر نگاہ کی۔ شام سے پر غالب تھی۔ سورج وقت سے پہلے بجھ گیا تھا۔ تاریکی میں تیرگی تھی، جو خبردار کرتی، اُس خطرہ سے، جس سے میں آگاہ تھا۔

میرا بھیتر دہکتا تھا۔ مرکز میں سنسناہٹ کی چاپ تھی کہ میں خوف زدہ تھا کہ میں اور وہ — دونوں — ایک دوسرے کی پُراسرار موجودگی کا ادراک رکھتے تھے۔

میں نے اُس کی چال میں درآنے والی عجلت کو محسوس کیا۔

اور میں نے بھی — لمحے کے ہزاروں حصے میں، جو کبھی گرفت میں نہیں آتا — اپنی رفتار بڑھادی۔

میرا ہاتھ جیب تک گیا۔ اطمینان کے ایک لمحے کا جنم ہوا، جو لجلجا سا تھا۔

سڑک پر خاموشی بچھی تھی، جو ہمارے قدموں تلے دھمکتی تھی۔

ایک شخص، جس کے بدن سے پسینے کی بُو اٹھتی تھی، مجھے گھورتے ہوئے پہلو سے گزرا۔

"کیا اِس شخص نے اُسے بھی گھورا ہوگا، جس سے اِس پل میری قسمت، عجیب ڈھب سے، جڑی ہے، جو میری موجودگی سے، اور جس کی موجودگی سے میں آگاہ ہوں؟"

سوال میرے اندرون میں لرزا، کسی ایسے سائے کے مانند، جو ٹھیک اِس پل، یا شاید گزرے چکے کسی پل اُس کے اندرون میں لرزا ہو۔ یا شاید نہیں لرزا ہو۔

فضاؤں میں کشیدگی منجمد تھی۔ اور میرا گلا پیاس سے چٹختا تھا۔ ٹھہرنے کا تقاضا کرتا تھا، مگر میں ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ کم از کم اس پل تو نہیں۔

چلتے چلتے اچانک مجھ پر انکشاف ہوا کہ میرا مثانہ بھر چکا ہے۔

میں نے انکشاف کو پتھریلی زمین پر دے مارا۔

"مثانہ خالی کرنے کا وقت نہیں۔" دل بڑبڑایا۔ "رفتار دھیمی کرنا سم قاتل ثابت ہوگا۔ چلتے رہو۔"

وقت — یونہی، خاموش — گزرتا تھا۔

اُس کے اور میرے درمیان فاصلہ دھیرے دھیرے گھٹ رہا تھا۔ اور دھیرے دھیرے یہ سوال میرے ذہن میں ابھرنے لگا تھا کہ کیا اب — ٹھیک اب — میں دوڑ پڑوں؟

"ہاں!" جواب آیا، اتھاہ گہرائی سے۔ مگر میں نے دوڑنے سے اجتناب برتا کہ یہ سڑک کچھ آگے جا کر ایک تباہ حال بستی کی سمت نکل جاتی تھی، شہر خموشاں جس کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ جہاں آسیبی پیڑوں کی قطار میں اندھیرا اچانک گہرا

ہوتا تھا۔ پیڑ، جن کی شاخوں پر کرم کا جرثومہ جنبش کرتا تھا۔

ہاں، وہ دوڑنے کے لیے بہتر مقام تھا۔ نسبتاً۔

وہ اور میں، ایک دوسرے کی موجودگی سے آگاہ، ایک ایسے احساس کے ساتھ، جسے اضطراب کہا جا سکتا ہے، یا اضطراب بھی کہا جا سکتا ہے، چلتے رہے۔

زمین سے ٹکراتے اُس کے جوتوں کی آواز میرے کانوں سے تک پہنچتی تھی، جو اُس کے مرکز میں ٹھہرے خلا کا پتا دیتی تھی، جس کے وہاں ہونے کا میں علم رکھتا تھا۔

لمحے صدیوں کے مانند طویل تھے۔

میں چل رہا تھا۔ اور اب تھکنے لگا تھا۔

اور جسم اکڑنے لگا تھا کہ تناؤ نے میرے گردوں میں انڈے دے دیے تھے۔

اور کانٹوں کی زرخیز فصل زبان پر اگ آئی تھی۔

اور حدت نے لہو میں گردش تیز کر دی تھی۔

میں نے — شاید تھوک نگلتے ہوئے، یا پھر اگلتے ہوئے — وسعتوں کی سمت دیکھا۔ وہاں ایک گدھ تیرتا تھا، جس کے پروں میں اطمینان پھڑ پھڑاتا تھا۔ اُسے جلدی نہیں تھی، مگر مجھے...

''دوڑو!'' دل پر دستک ہوئی۔ میں نے نظر اٹھائی۔ اُدھڑی ہوئی سڑک اُس مقام تک آن پہنچی تھی، جو پراسراریت کے لیے سازگار تھا کہ وہاں تاریکی، تاریکی سے اختلاط کرتی تھی۔ اور سناٹا، سناٹا جنتا تھا۔ اور منتروں کا حصار کم زور پڑ جاتا تھا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کی موجودگی کا ادراک رکھتے تھے۔ اور میرا بھیتر دہکتا تھا کہ وہ پُرخطر، پُراسرار لمحہ آن پہنچا تھا۔

میرے قدموں کی حرکت میں، لمحے کے خفیف ترین حصے میں، ایک تبدیلی ظاہر ہوئی۔ پیر جسم میں سنسناتی کُل قوت کا مرکز بن گئے، اور میں نے جست لگائی۔

میں دوڑ رہا تھا۔ دیوانہ وار، پوری قوت سے۔ اور... وہ بھی دوڑ رہا تھا۔ اپنی کُل توانائیاں صَرف کرتا ہوا۔ مسلسل۔

فاصلہ گھٹتا جا رہا تھا، اور میری دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی۔

دھڑکن بڑھ رہی تھی کہ وہ قریب آ رہا تھا۔

وہ میرے قریب آ رہا تھا، اور میرا ہاتھ جیب میں رینگ رہا تھا، جہاں کچھ ایسا تھا، جو اس پُرخطر — اور کم از کم میرے لیے پریشان کن — صورت حال کا ماخذ تھا، جس کی بُو گدھ کو یہاں کھینچ لائی تھی۔

اُس کے اور میرے درمیان فقط ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ گیا۔ اور یہی وہ لمحہ تھا، جب میرے خوف نے، کہلانے والے احساس کی اوج کو چھویا کہ اب — اُس موڑ پر، جس کا ظہور ہو چکا تھا — وہی ہونا تھا، جس کا میں متمنی تھا۔

میں نے جست لگا کر اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ زمین پر گر گیا۔ میں اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ جیب میں ہاتھ

ڈالا۔ اگلے ہی لمحے سناٹے میں چاقو کھلنے کی آواز لرزی۔
اُس نے گرفت سے نکلنے کی کوشش کی کہ وہ خوف زدہ تھا، اُس رقم کو کھونے سے، جو مہینے بھر کی کمائی تھی۔ اور یہ ایک فاش غلطی تھی کہ میں اُس سے زیادہ خوف زدہ تھا کہ یہ میرا، کسی انسان کے سینے پر سوار ہونے کا پہلا تجربہ تھا۔
لمحہ... جس واقعے کے لیے سازگار تھا، وہ وقوع پذیر ہونے کو تھا کہ قلم لکھ کر خشک ہوگیا تھا۔
اُس نے میری گرفت سے نکلنے کی کوشش کی، اور میں نے اُس کوشش کو ناکام بنانے کے لیے چاقو اُس کے سینے میں گھونپ دیا۔
نہیں... اُس نے زیادہ وقت نہیں لیا۔ جتنی دیر میں جیبیں خالی ہوئیں، بس تب ہی تک زندہ رہا۔ دُور، خلاؤں میں گھورتا رہا۔ اور پھر مزید نہیں رہا۔
خاموشی تھی۔ کشیدگی تھی۔ اور اضطراب تھا، مگر میرا خوف گھٹ چکا تھا کہ میں اُس کی لاش کو پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ شاید چند میل پیچھے... یا شاید جنموں پیچھے۔
میری ایک جیب میں نوٹوں کی گڈی تھی۔ دوسری میں چاقو۔ سناٹے کے باوجود میرے جثے میں سکون تھا۔
دفعتاً نظر آسمان کی سمت اٹھی۔ اور میں ششدر رہ گیا۔
وہاں ایک گدھ تیرتا تھا، جس کے پروں میں اطمینان پھڑپھڑاتا تھا۔
یک دم مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔
معدے میں اُگی اضطراب کی جھاڑی میں سرسراہٹ ہوئی۔ اور ہیبت کے سیال نے جوش مارا، جس نے میرا خون گدلا دیا۔
میں پلٹا۔
وہاں کوئی تھا... مجھ جیسا یا پھر مجھ سے الگ... فقط چند قدموں پرے... ہاتھ جیبوں میں دیے... تھوڑا خوف زدہ، تھوڑا پُراسرار... اس بات سے آگاہ کہ میں اس کی موجودگی سے آگاہ ہوں۔
منظر وہ ہی تھا۔ اور صورت حال بھی وہ ہی۔ بس، مقامات بدل گئے تھے۔
میرا ہاتھ جیب میں رینگ گیا، جہاں ایک لجلجا احساس منتظر تھا۔
چاقو وہاں نہیں تھا، شاید وہ صدیوں پیچھے رہ گیا تھا۔ شاید وہیں، آسیبی پیڑوں تلے، اُس لاش کے سینے میں پیوست، جسے گدھ چھوڑ آیا تھا۔
یک دم میری چال میں عجلت در آئی... اور اُس کی رفتار بھی، لمحہ کی پُراسراریت کے زیرِ اثر، تیز ہوگئی۔
بھیتر دہکتا تھا، مرکز میں سنسناہٹ تھی کہ میں ڈرا ہوا تھا کہ یہ سڑک اُسی مقام تک جاتی تھی، جہاں بستی اور شہر خموشاں کے درمیان، پیڑوں تلے اندھیرا گہرا ہوتا تھا۔ اور شاخوں پر کرم کا جرثومہ جنبش کرتا تھا۔
ایک اور بھید جنم لینے کو تھا۔

☆......☆......☆

نہیں منّت کشِ تابِ شنیدن داستاں مری

(زیرِ تحریر ناولوں کے ابواب)

''مَیں فرام موہنجوڈارو''

(''اور سندھ بہتا رہا'' کا ایک باب)

مستنصر حسین تارڑ

ابھی کچھ دُھوپ تھی..

گرینڈ پریسٹ کا مجسمہ سفید چُونے سے ڈھلا سفید تھا اور اُس سے پرے موہنجو کے ڈھے چکے شہر کے ٹیلوں کے انبار تھے..اور وہ سُرخ تھے کہ اینٹیں جب پانچ ہزار برس کی بہاروں، خزاؤں اور برساتوں کے موسمی دُکھ سُکھ جھیلتی بھربھری ہونے لگتی ہیں..مسمار ہونے لگتی ہیں تو اُن میں سُرخ مٹی جھومنے لگتی ہے اور وہ دن کی دُھوپ میں بھی شفق کے رنگ میں ڈوبی ہوتی ہیں۔

میں موہنجوڈارو میں اجنبی نہ تھا..

میں اس کی ایک ایک اینٹ سے شناسا تھا۔ میں نے ''بہاؤ'' لکھنے سے پیشتر وادیٔ سندھ کی تہذیب کے بارے میں برسوں پُرمشقت اور آنکھ سے دکھا دینے والی تحقیق میں اپنے آپ کو غرق کیا..میری مدد کو بہت سے لوگ آئے جن میں علامہ فرید کوٹی، علی عباس جلالپوری، عارف وقار وغیرہ شامل تھے لیکن سرِفہرست ملتان کے مرزا ابن حنیف تھے جنہوں نے اپنی عمر بھر کی تحقیقی کمائی میری جھولی میں ڈال دی..اس معاونت کے باوجود یہ میری زندگی کے کچھ برس تھے جو میں نے 'ضائع'' کیے یہاں تک کہ میں عہدِ موجود سے بیگانہ ہوکر پانچ ہزار برس کے قدیم زمانوں کا باشندہ ہوگیا۔ پاروشنی، سمرو، پکلی، ورچن، مامن ماسا اور ورچن کی سرسوتی ندی کے کنارے کا باسی ہوگیا۔

میں موہنجوداڑو میں اجنبی نہ تھا اسی لیے مجھے کسی سے راستہ دریافت کرنے کی حاجت نہ تھی۔ میں خوب جانتا تھا کہ یہ گلی موہنجو کے عظیم تالاب کی طرف جاتی ہے۔اس گلی کے آخر میں وہ کنواں موجود ہوگا جہاں سے موہنجو کی ناریاں پانی بھرتی تھیں۔اور جیسے لاہور کے بارے میں وہ حکائتی سوال جواب ہے کہ مجھے بتاؤ تو سہی کہ لاہور میں کتنے کنویں ہیں اور کن کا پانی کھارا ہے اور کن کا شیریں ہے تو جواب آتا ہے کہ جن کنوؤں سے محبوب پانی بھرتے ہیں وہ سب میٹھے پانی والے ہیں اور بقیہ کھارے پانی والے ہیں تو اس طور موہنجو کے کھنڈروں میں حیرت انگیز طور پر متعدد کنوؤں کی گولائی کے آثار اب بھی نمایاں ہوتے خبر کرتے ہیں کہ ان کنوؤں کے پانی میٹھے ہی ہوتے ہوں گے..

البتہ جس کنویں سے نرتکی موہنجوڈارو کی اپنی گاگر بھرتی ہوگی اُس کے پانیوں میں مٹھاس کے علاوہ اُس کے آبنوسی بدن کے نمک عشق کی بھی گھلاوٹ ہوگی۔

تو ایک تصور اور تحقیق کی آمیزش سے ''بہاؤ'' اور ''دُھند کے پیچھے شہر'' تھا. میں جو موہنجوداڑو وجود میں آیا.اُس تصوراتی شہر میں اور اس ڈھلتی دُھوپ میں سُرخی میں ڈھلتے شہر میں جسے پہلی بار میری آنکھ دیکھ رہی تھی، کچھ فرق تھا..نہیں تھا..وہ ہوبہو وہی تھا جس نے میری برسوں کی تحقیق کے تصور میں جنم لیا..البتہ ایک فرق تھا..کہ موہنجو ایک سُرخی میں ڈوبا سُرخ شہر تھا..سب کھنڈر درو بام سُرخ..گلیوں کے فرش، نالیوں کو ڈھانپتی اینٹیں سُرخ..بھربھری سُرخی ہر اینٹ میں سے

اُبھرتی سرخ..اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ ان کنووں میں اگر پانی ہوتے تو وہ بھی سُرخ ہوتے۔

اس کے راستوں پر چلتے..گلیوں میں جھانکتے میرے جوگرز کے تلووں سے چمٹتے مٹی کے ذرّے بھی سُرخ..اک شب ہوٹل میں جب میں نے اپنے جوگرز اُتارے تو اُن کے تلووں سے چمٹی مٹی کے ذرّے سُرخ جگنوؤں کی مانند دہکتے تھے..تو میری تحقیق اور تصوّر میں بس یہی کمی رہ گئی تھی. مجھے یہ گمان نہ ہو سکا کہ موہنجوداڑو ایک سُرخ شہر ہے۔

اُردن کے ''روز ریڈ سٹی پیٹرا'' کی مانند ایک گلابی رنگت کا شہر ہے. شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ..

کھنڈر ہو چکے ایوانوں، تالابوں، رہائش گاہوں اور گلیوں میں اینٹوں میں سے سُرخ سفوف جھڑتا تھا.

بس یہی کمی رہ گئی..

وہ سٹوپا جو موہنجوڈارو کی پہچان ہے جو پاکستان کے کرنسی نوٹوں پر بھی ثبت ہے..بہت سنبھالا گیا. ذرا دوبارہ لیپ کر کے تعمیر کیا گیا تھا اس شہر کے تاریخی اور تہذیبی تسلسل کی ایک نشانی تھی۔ اس کے آثار اس حقیقت کی نشاندہی کرتے تھے کہ موہنجو ہندوستان پر آریائی حملہ آوروں کے نتیجے میں برباد نہیں ہو گیا تھا. یہ ہزاروں برسوں تک قدیم دراوڑی تہذیب کا مرکز رہا، اُجڑا نہیں..تقریباً دو ہزار برس بعد یہاں بُدھ مت کی تہذیب کا غلبہ ہوا اور یہ سٹوپا وجود میں آیا۔ گویا موہنجوڈارو کم از کم دو ہزار برس تک ایک آباد اور زندہ شہر چلا آیا تھا۔

ہمارے شہروں میں سے لاہور، کراچی، کوئٹہ وغیرہ کے نصیب میں کیا یہ ہے کہ وہ دو ہزار برس تک آباد رہیں گے. نہیں رہیں گے۔

دُھوپ ڈھلتی جارہی تھی اور اُس کے ساتھ موہنجوڈارو کے کھنڈر مزید سُرخ ہوتے جارہے تھے..ڈھلتے سُورج کی سُرخی اُس کی ہر اینٹ پر اثر انداز ہوتی اُسے خُون کے رنگ میں ڈبوتی تھی۔

اس شہر میں سرسوتی ندی کے کناروں پر زندگی کرتا اور چن طویل مسافتیں طے کرتا آیا تھا۔

(بہاؤ سے اقتباس)

ہم جب موہنجوڈارو کے کھنڈروں میں داخل ہو رہے تھے تو دیدہ دِل کا ایک چاچا، اپنی داڑھی خزابِ الٰہی کیے ہمارے لیے کینٹکی چکن اور فرنچ فرائز کا من و سلویٰ لیے موجود تھا..اس ''چاچا'' کے رنگ ڈھنگ نرالے تھے۔ بیشتر رنگ قانون کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور ڈھنگ؟؟ بھی تھے اُن میں ملک ملک کی خواتین کے ساتھ شب بسری کی داستانیں تھیں۔ عجب چاچا تھا۔

عظیم سٹوپا کے گرد ایک گردش کر کے، ایک طواف کرنے کے بعد، کہ ہم بہت بھُوکے ہو رہے تھے..اور یہ بھُوک کچھ نہیں ہے۔ پانچ ہزار برس سے موہنجو میں چلی آ رہی ہے۔ ہم نے سٹوپا کے نشیب میں واقع ایک ایسے مختصر کھنڈر کمرے کا انتخاب کیا جس کی صرف بنیادیں باقی تھیں اور اُس کے سُرخ فرش پر پچھلی شب کی بارشوں کی نمی تھی اور وہ بھی سُرخ تھی...ہم نے اِک کمرے میں بیٹھ کر..ذرا تصور کیجئے..امریکی کینٹکی چکن اور فرنچ فرائز نہایت رغبت سے نوش کیے۔

کیا اس کمرے کا مکین، آج سے چار پانچ ہزار برس پیشتر یہاں رہائش رکھنے والا یہ تصور کر سکتا تھا کہ کبھی آئندہ زمانوں میں ہم لوگ اُس کی خلوت کو مجروح کرتے کینٹکی چکن کی ٹانگوں کو بھنبھوڑتے ہوں گے۔

تو کیا آج آپ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ جن شہروں میں آپ رہتے ہیں. جن مکانوں میں بسیرا کرتے ہیں اُن کے کھنڈروں میں آج سے چار پانچ ہزار برس بعد وہ کون سے لوگ ہوں گے جو اپنی بھُوک جانے کون سی خوراکوں سے مٹاتے

ہوں گے۔

اور اس دوران جب میں اُس کھنڈر ہو چکے آثار کے ایک اُبھار پر براجمان کینٹکی چکن سے لُطف اندوز ہو رہا تھا ہمہ وقت یہ خیال آتا رہا کہ آخر وہ کون ہوگا جو اس کوٹھڑی کا مکین ہوا کرتا تھا۔ شاید کوئی مُہریں ڈھالنے والا۔ عظیم پروہت کے گیت گانے والا۔ یا پھر موہنجوڈارو کی رقاصہ کا کوئی عاشق۔ وہ کون ہوگا۔

موہنجوڈارو اِک ڈھلتے سورج کی سُرخی میں سُرخ ہوتے ایک شاہ حسین ہوا جاتا تھا۔

انساں اندر باہر لال ہے

ساہنوں مُرشد نال پیار ہے

یا پھر..

ڈھواں دُکھے میرے مُرشد والا

جاں پھولاں تاں لال نیں

موہنجوڈارو کا کھنڈر اندر باہر لال ہے.. جس اینٹ کو بھی کھوج کر لو وہ لال ہے۔

اُس ڈھلی ہلکی دُھوپ میں موہنجوڈارو کے سُرخ کھنڈروں میں جان بُوجھ کر بھٹکتا ایک جوڑا تھا۔

لڑکی واجبی شکل کی تھی پر اُس کے بالوں پر موہنجو کی اینٹوں میں سے بکھرتے سُرخ ذرّے دمکتے تھے۔ اُس کی نیلی جین جس میں وہ پیوست تھی وہ بھی سُرخ سفوف سے سُرخ ہوتی دکھائی دیتی تھی۔ اور وہ جولڑکا تھا مٹنگ اور اچھی شکل والا وہ ایک جن بے پرواہ تھا.. اور وہ لڑکی بہانے ڈھونڈتی تھی اُس کی قُربت میں ملاپ کرنے کے لیے۔ اُسے کبھی کسی کھنڈر گلی میں یا کسی دیوار کی اوٹ میں لے جاتی تھی..

سُورج ڈھلتا جاتا تھا۔

موہنجو کے کھنڈروں سے پرے ڈھلتے سورج میں زرد ہوتا، دریائے سندھ تھا۔

یہی میرا شہرِ تمنا تھا..

شہرِ آرزو تھا..

مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ موہنجوڈارو ایک نہیں، کئی شہر ہوا کرتے تھے..

وہ ایک دوسرے میں منسلک اور جُڑے ہوتے تھے اگرچہ الگ الگ تھے..

اُس مرکزی پہچان سٹوپا کی کھنڈر ہو چکی عظمتِ رفتہ کے آس پاس تین اور کھنڈر ہو چکے شہر تھے.. ایک دوسرے پر انحصار کرتے الگ الگ اور وہ اس شہرِ بے مثال کو مکمل کرتے تھے..

میں تو بے خبر تھا۔ یہ دیدہ دل تھا جو دِلوں کے حال جانتا تھا ایسے ہی موہنجو کو بھی خوب جانتا تھا کہ وہ "موہنجوڈارو کا شخص تھا.. لاڑکانہ کا باسی تھا..

جب سے سندھ کے عظیم دانشور سوبھو گیان چندحصول علم کی خاطر رابندر ناتھ ٹیگور کی تاریخی درس گاہ شانتی نکیتن پہنچے تو ٹیگور نے پوچھا، کہاں سے آئے ہو تو اُنہوں نے کہا سندھ کے شہر لاڑکانہ سے تو ٹیگور مسکرا کر بولے.. گویا تم "مین فرام موہنجوڈارو" ہو.. اور یوں شانتی نکیتن کے اساتذہ اور طالب علم اُنہیں اسی خطاب سے پُکارتے تھے..

سوبھو نے کہا تھا کہ میرے تین جُرم ہیں.. میں ہندو ہوں۔ سندھی ہوں اور پھر کمیونسٹ ہوں..

اور یہ دیدہ دل تھا جس نے کہا، تارڑ صاحب، یہ تو موئنجوڈارو کے وہ کھنڈر ہیں جو تصویر اور تحریر میں آتے ہیں جو اس بُلند سٹوپا کے اردگرد پھیلے ہوئے ہیں لیکن اصل موئنجوڈارو وہ ہے جو اَب ہم دیکھنے جا رہے ہیں..
ہم ان مرکزی کھنڈروں سے نیچے اُترے. گرینڈ پریسٹ کے سفید مجسمے کو سلام کیا بلکہ پرنام کیا اور باہر آ گئے..
بائیں جانب ان کھنڈروں سے پرے ایک اور شہر تھا جس کی جانب کم لوگ جاتے تھے.. یہ کھنڈر دوسرے آثار کہلاتے تھے. یعنی سٹوپا کے گرد سُرخ ہوتے بُلند کھنڈر نقشِ اوّل تھے اور یہ نقشِ دوم تھا اور تیسرا نقش یہاں سے کچھ فاصلے پر تھا جہاں ہم وقت کی کمی کے باعث جا نہ سکے.
اور نقشِ دوم حیرت انگیز طور پر کہیں زیادہ پُراثر اور مکمل تھا.. یہ میرے سامنے آیا. سورج کی آخری کرنوں میں ڈوبتا ہوا وہ شہر میری آنکھوں میں یوں بجھ گیا کہ اُس کی گلیاں، راستے، کنویں اور مکان.. کھنڈر تو نہ تھے. وہ ایک آباد شہر تھا جس کے مکین شام ڈھلتے ہی اپنے مکانوں میں جا سوتے تھے..
جیسے آثارِ قدیمہ کا برطانوی ماہر جب چند سیڑھیاں ریت میں دفن سیڑھیاں اُترا تو ایک مقفل شاہی دروازہ ظاہر ہوا اور جب اُس نے اُس کے کواڑ دیکھے اور اندر داخل ہوا تو وہ اپنی آنکھوں پر یقین نہ کر سکا کہ اُن آنکھوں میں مصر کی تاریخ میں کسی بھی فرعون کا آج تک پوشیدہ، مکمل حالت میں موجود مدفن تھا. جُوں کا تُوں تھا. سینکڑوں سونے کے ظروف.. مجسمے.. اور روزمرہ کے استعمال کی اشیاء سب کی سب سونے میں ڈھلی اور اُن کے درمیان فرعون توتن خامن کا سنہری تابوت پڑا تھا جس کے ڈھکن پر اُس کا اور وہ بھی سونے سے بنایا ہوا تصویری نقاب آراستہ تھا.. میں نے ایک بار نیویارک میں اسی مقبرے سے دریافت ہونے والے نوادر اور آثار کی نمائش دیکھی تھی لیکن وہاں توتن خامن کے چہرے کا وہ.. فرعون تہذیب کا سب سے نمائندہ شاہکار موجود نہ تھا.. میرے استفسار پر بتایا گیا کہ وہ نادر نقاب یا مجسمہ اتنا بیش قیمت ہے کہ اُسے مصر سے باہر لے جانے کی اجازت نہیں..
کارٹر جب اُس مقبرے میں داخل ہوا تو اُس کا کہنا تھا کہ پانچ ہزار برس کے بعد وہ پہلا شخص تھا جو اُس کی تنہائی میں مُخل ہوا.. مقبرے کے اندر پانچ ہزار برس قدیم ہوا جو حنوط ہو چکی تھی وہ پہلا شخص تھا جس نے اُس میں سانس لیے.. یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی ابھی فرعون کے خاندان کے افراد، درباری اور وزیر اور غلام اُس کے تابوت کا طواف کر کے باہر گئے ہیں.. یہاں تک کہ ایک طاقچے میں جو چراغ روشن تھا اُسے جاتے ہوئے کسی شخص نے ہتھیلی سے بجھا دیا تھا اور طاقچے کی دُھواں آلود محراب میں اُس شخص کی انگلیوں کے نشان ابھی تک موجود تھے..
یہ طویل بیانیہ دراصل میری اُس کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے جب میں موئنجوڈارو کے اس دوسرے شہر میں داخل ہوا.. کارٹر کی مانند مجھے بھی محسوس ہوا کہ میں پہلا شخص ہوں جو.. اور یہ بھی اُس مقبرے کی مانند پانچ ہزار برس کی تنہائی میں حنوط تھا.. اس شہر میں داخل ہونے والا پہلا شخص ہوں.. ابھی کچھ لمحے پہلے یہ آباد تھا.. پُررونق اور پُرشور تھا.. اس کے متعدد کنوؤں سے ناریاں پانی بھرتی تھیں.. گلیاں سُونی نہیں تھیں. پُرہجوم تھیں.. ان میں اُن زمانوں کے مرزے، رانجھے اور مجنوں پھرتے تھے اور اُن کی صاحباں، ہیریں اور لیلائیں اُنہیں لُک چھپ دیکھتی تھیں اور وہ جو ایک عظیم چوڑی شاہراہ تھی جوان کھنڈروں کے درمیان دُور تک چلی جاتی تھی. جس کے کناروں کی شکستہ بکھر بکھری اینٹوں کی دیواروں پر سے خودرَو جھاڑیوں اور کیکروں کا ایک جھاڑ جھنکار جھانکتا تھا اور اُس شاہراہ پر اب تو ڈُوب چکے سُورج کی زردی یُوں بجھی ہوئی تھی کہ اُس کے اینٹوں کے فرش میں پیوستہ ہر اینٹ زردی کی سوگواری میں ڈُوبی ہوئی تھی تو ابھی ابھی اس شاہراہ پر بیل گاڑیوں کے لکڑی

کے پہیئے کھڑکھڑاتے تھے اور پیدل چلنے والے لوگ اُن کی کھڑکھڑاہٹ سُن کر اپنے آپ کو بچانے کے لیے دیواروں سے لگ جاتے تھے. بھٹیار خانوں کے تندور گرم تھے.. یہ شاہراہ گویا آج کی مال روڈ تھی. پیرس کی شانزے لیزے اور لنڈن کی ریجنٹ سٹریٹ تھی.. وہاں کیسی کیسی ناریاں بانہوں میں کہنیوں تک کنگن سجائے اٹھلاتی پھرتی تھیں اور کیا پتہ اُن میں موہنجو کی ڈانسنگ گرل بھی اپنے دراوڑی مہاندرے کے ساتھ اٹھلاتی پھرتی ہو.. موہنجوڈارو کی یہ شاہراہ کے ایک جانب جنگل اُترتے تھے اور دوسری جانب رہائش گاہوں اور تنگ گلیوں کے سُرخ آثار تھے ایک عجوبہ تھی..

ابھی تک قائم تھی..

اور ابھی کچھ دیر پہلے.. وہ سب لوگ اس شہر کو خالی کر گئے.. گلیاں ویران کر گئے.. جانے کہاں دفن ہو گئے اور اب پانچ ہزار برس بعد میں پہلا شخص تھا جو اس عظیم مقبرے میں داخل ہوا تھا.. اور اُس قدیم ہوا میں سانس لیتا تھا جس میں موہنجو کے ہزاروں باسی سانس لیا کرتے تھے.. وہ ہوا ابھی تک حنوط تھی. جُوں کی تُوں میرے انتظار میں ٹھہری ہوئی تھی..

جمیل، کامران، دیدہ دل میں دیکھ سکتا تھا کہ اُن کے چہروں پر میرے لیے فکرمندی اور تشویش پھوٹتی تھی.. مجھے واقعی کچھ ہو گیا تھا. میں اُن سے بچھڑ چکا تھا. میرے خزاں رسیدہ چہرے پر نہ صرف ڈوب چکے سورج کی زردی اُترتی تھی بلکہ موہنجوڈارو کی ہر بھرتی ہوئی اینٹ کے سُرخ سفوف کا لیپ ہو رہا تھا.. میں اپنی خصلت کے ہاتھوں مجبور اُن سب سے الگ ہو گیا اور وہ میرے حال کے محرم تھے.. اُنہوں نے مجھے الگ ہو جانے دیا.

گلیاں گیلی تھیں، بارش بہت ہوئی تھی. میں اُن میں تنہا بھٹکتا پھرا. وہاں قدیم رہائش گاہوں کی محرابیں تھیں. کسی گلی میں پوشیدہ ایک کنواں اپنی گولائی میں بُلند ہوتا تھا.. میں اُن کنووں میں جھانکا کیا. ابھی ابھی تو نرتکیاں ان میں سے پانی بھرتی تھیں.. وہ پانی کیا ہوئے..

کبھی کسی سنسان گلی میں چلتے ہوئے مجھ پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی. میں راستہ بھول گیا ہوں.. انسانی تہذیب کے قدیم ترین کھنڈر میں گم ہو گیا ہوں۔ پانچ ہزار برس کے پہلے کے کوچوں میں بھٹک گیا ہوں تو شاید اُنہی زمانوں میں سانسیں لیتا اُنہی زمانوں میں چلا گیا ہوں تو میں کیسے اپنے زمانوں میں واپس جاؤں گا..

کبھی کسی گلی کے اختتام پر ایک دیوار حائل ہو جاتی.

وہ کوئی بہت شاندار حویلی تھی جس کی ایک دیوار بدستور قائم تھی، اگرچہ وہ اپنے ہزاروں برسوں کے بوجھ سے قدرے جھکی ہوئی تھی اور اُسے قائم رکھنے کے لیے سہارے دیئے گئے تھے.. محکمہ آثار قدیمہ اتنا خوابیدہ بھی نہ تھا. اگر یہ سہارے ایستادہ نہ کیے جاتے تو یہ قدیم دیوار کب کی ڈھے چکی ہوتی.. ویسے یہ کیا بھید ہے کہ میں دنیا بھر کے بہت سے تاریخی کھنڈروں میں بھٹکا میں مرعوب ہوا اُن کی عظمت کے سامنے سرنگوں تو ہوا لیکن یہ کیسا بھید ہے کہ صرف موہنجوڈارو کے کھنڈروں میں جب میں تنہا اُس مُردوں کے ٹیلے کی گلیوں اور بازاروں میں چلا تو یہ یوں محسوس ہوا کہ میں بھی کبھی اس شہر کا باسی تھا. میں یہیں کا رہنے والا ہوں. یہ میرا اپنا شہر ہے. شاید یہ میری جڑیں تھیں جو اس دھرتی کی گہرائی میں روشن چراغوں میں سے پھوٹتی تھیں. نہ میں ایرانی، طورانی، نہ ترک تھا، نہ عرب تھا. میں کہیں سے نہ آیا تھا. نہ میں غزنوی، قریشی، عباسی، بخاری، بغدادی، شیرازی، تبریزی یا جامی تھا. محض ایک تارڑ تھا جو یہاں کا تھا، کہیں سے نہ آیا تھا اور مہر تہذیب اور تاریخ کا ایک تسلسل تھا جس کے گھومتے چرخے کے تکلے میں سے سُوت کے جو دھاگے جنم لیتے تھے میں اُن میں بندھا ہوا تھا.. چنانچہ میں اپنے شہر میں واپس آ گیا تھا..

میں بھی ایک ''مین فرام موہنجوڈارو'' تھا۔
جمیل نے ایک کنویں کے قریب ڈھیر ہو چکی پُرانی اینٹوں میں سے ایک اینٹ اُٹھائی اور جھجکتے ہوئے بولا:
''سر.. یہ اینٹ ساتھ لے چلیں؟''
'آئے ہیں اس گلی میں تو..ایک اینٹ ہی لے چلیں''
دل بہت چاہا کہ اگر میری سٹی ٹیبل پر موہنجوڈارو کی ایک تقریباً پانچ ہزار برس پُرانی سُرخ رنگت کی اینٹ دھری ہو تو اُس پر آنکھیں رکھ کر میں اپنی تحریر میں کیسے کیسے گزر چکے زمانوں کی داستانیں بیان کر سکتا تھا..
''نہیں جمیل.. بے شک یہاں لاکھوں اینٹوں کے سُرخ ڈھیر پڑے ہیں لیکن اگر ہم اُن میں سے ایک اینٹ اپنے ساتھ لے جائیں گے تو موہنجوڈارو اُجڑ جائے گا..
جیسے میں غارِ حرا کا کوئی پتھر نہ لایا تھا، جبل احد کا کوئی کنکر اٹھا کر نہ لایا تھا. تو اس اینٹ کو پڑا رہنے دو.. کہ اس کے اندر موہنجوڈارو ابھی تک آباد ہے..اسے اُجاڑنا نہیں..رہنے دو...''
اگر میرے بس میں ہوتا تو میں الحمرا اور غارِ حرا کی مانند موہنجوڈارو میں بھی ایک رات بسر کرتا..
اگر کرتا تو کون سے مقام پر رات بسر کرتا..
کسی کنویں کی منڈیر کے قریب..
اُس حویلی کی جھکتی ہوئی دیوار تلے جو سہاروں پر قائم تھی..
موہنجوڈارو کی شانزے لیزے کے کناروں پر کسی بھٹیار خانے کے کھنڈر میں..
عظیم تالاب کے کھنڈر میں اُتر کر..
اگر کرتا تو کہاں رات کرتا..
جب میں تنہا اُس اُتر چکی شب کے نیم اندھیارے میں ایک گلی کی تاریخی ویرانی میں چلتا تھا تو مجھے دائیں جانب ایک شگاف نظر آیا تھا، میں بمشکل سر جھکا کر اپنے آپ کو سنبھالتا ہوا اُس میں داخل ہوا تو وہاں ایک کوٹھڑی کے آثار تھے جس کی چاروں دیواریں قائم تھیں..ظاہر ہے چھت نہ تھی لیکن ایک دیوار میں اینٹوں میں سے گرتے سفوف میں ملبوس ایک طاقچہ تھا..میں وہاں رات کرتا..اور اُس طاقچے میں دل کا دیا جلاتا جس کی روشنی میں مجھے پاروشنی کی پرچھائیاں نظر آتی.. ورچن میرے ساتھ باتیں کرتا، اپنی ندی سرسوتی سے یہاں تک کے سفر کی حکائتیں بیان کرتا..یہ بھی ممکن تھا کہ ڈانسنگ گرل سندھیا بھی چلی آتی..انسان اپنے آپ کو فریب دینا چاہے تو اس نوعیت کے فریب تصور میں تصویر ہوتے ہیں..
اُس طاقچے میں میرے دل کا دیا جلتا تھا جب اُتر چکی شام میں..میں اپنے آبائی شہر موہنجوڈارو سے جُدا ہوا..

ناول کے چار ابواب

مرزا حامد بیگ

انار کلی

دوسرے سیشن کے اختتام پر عصر کا وقت ہو چلا تھا۔

مغلئی آنکھوں والے کے اشارے پر راجہ رسالو نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے اپنے قریب کھڑے ہوئے ہُد ہُد کے کندھے زور سے تھپتھپائے، پر با آواز بلند بولے:

''جس طرح شہزادہ سلیم کا دماغ باغیانہ خیالات کی آماجگاہ بنتا چلا گیا، وہی حال ہمارا ہے............ یلغار ہو......!''

قریب کھڑے مندوبین کچھ نہ سمجھتے ہوئے مسکرا دیئے۔

یہ سن کر ہُد ہُد نے دھیرج سے راجہ رسالو کا بازو تھاما اور اُنہیں ہجوم سے باہر نکال لے گیا۔

''راجہ صاحب، اُس پر رحم کھائیں۔ مر جائے گا سالا۔ کل بیڈمنٹن کورٹ میں اُس کے ساتھ جو کچھ ہوا، ابھی تک سنبھل نہیں پایا۔ آج سارا دن جھینپ مٹانے کی کوشش کرتا رہا اور لڑکیاں اُس پر ہنستی رہیں۔ بہت ہو گئی اس کے ساتھ پلیز، اب اُسے معافی دے دیں۔'' ہُد ہُد منت سماجت کے انداز میں بُڑبڑایا۔

''نہیں .... اب میں اُس کے پیر نہیں لگنے دوں گا۔ کیا کوہ مری میں ہی طے نہیں پا گیا تھا اُس کا جھٹکا؟ میں دو لیٹر بارود اپنے ساتھ لایا تھا۔ کیا وہ سب واٹسن اینڈ کو والوں کو لوٹا دوں، یہ کہہ کر کہ ہم ہیجڑے ہیں جناب۔ ہم سے ہوتا ہواتا کچھ نہیں۔'' مغلئی آنکھوں والے نے فیصلہ سنا دیا۔

''اگر ایسا ہی ہے تو مان سنگھ، یلغار ہو۔'' راجہ صاحب نے نعرہ بلند کیا۔

لان میں بچھی آرام کرسیوں پر چائے کے مگ ہاتھوں میں تھامے ڈاکٹر ستنام، سرخ بالوں والے نیرنگ اور میر صاحب کے قریب کھڑے ڈاکٹر بالوخ نے خوش دلی سے قہقہہ لگایا۔

نجمہ بیگم بیڈمنٹن کورٹ میں پیش آنے والے واقعہ سے رنجور تھیں۔ اُنہوں نے لان میں آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے چونک کر خوش گپیوں میں مصروف مندوبین اور چائے کی ٹیبل پر نگاہ کی۔

اُن کی نظریں سنّی اور آصفہ کو اکٹھا دیکھنا چاہ رہی تھیں، لیکن ایسا کچھ تھا نہیں۔ سنّی سب سے الگ تھلگ چائے کا ڈسپوزایبل گلاس تھامے لان کے آخری سرے پر تاڑ کے درخت سے ٹیک لگائے اکیلا بیٹھا تھا اور آصفہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

جانے کہاں چلی گئی .... سنّی کل کا سپر سٹار ہے .... لیکن بخت ماری کو اپنی کچھ فکر ہو تو...... نجمہ بیگم نے سوچا۔ زندگی کی لمبی دوڑ میں ہانپتی ہوئی نجمہ بیگم کے سامنے تپا ہوا صحرا تھا اور حدِ نگاہ تک ریت اُڑ رہی تھی۔

☆☆☆

سورج کی زردی مائل ٹکیہ مغربی سمت کے پہاڑوں میں اُتر گئی تو ڈاکٹر ستنام اور میر صاحب تیار ہو کر لان کی جانب چلے تو ڈاکٹر نذیر غائب تھے۔ ڈاکٹر لوباخ، نجمہ بیگم اور نیرنگ صاحب کی معیت میں کچھ دیر پہلے جانے کِدھر نکل گئے......

اس وقت کمرے میں اُن دونوں کے علاوہ کوئی اور نہ تھا اور کمرے میں اپرن مور کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر ستنام نے گوشہء مستورات کی بغلی دیوار کے ساتھ کرسیاں بچھوانے کا ابھی سوچا ہی تھا کہ اُنہیں ڈاکٹر نذیر کا خیال آیا۔

"کچھ بتا کر گئے تھے ڈاکٹر صاحب؟" ڈاکٹر ستنام نے پوچھا۔

"بھئی یہیں کہیں ہوں گے۔ آ جائیں گے۔" میر صاحب نے پائپ کا گہرا کش لیا۔

"شاید بتا کر نکلے ہوں...... شازی سے پتہ کروں......" وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں اور اونچی ایڑھی کی سینڈل پاؤں میں اڑستی اور ساڑھی کا پلو سنبھالتی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

اُنہوں نے دیکھا کہ شازی نیم روشن برآمدے کے آخری سرے پر ریلنگ سے کرسی جوڑے شانت بیٹھی تھی اور سامنے لان میں دن بھر کے بحث مباحثے کے تھکے ہارے، کچھ لیٹے اور کچھ بیٹھے ہوئے مندوبین گھاس کے تختوں پر رات کا کھانا لگنے کے منتظر تھے۔

اُس وقت معمول سے ہٹ کر کچھ بھی تو نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ راجہ رسالو کی معیت میں ڈاکٹر نذیر مغلئی آنکھوں والے کے کندھے کا سہارا لئے پتھروں پر سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے ریسٹ ہاؤس کے سامنے والی پہاڑی چڑھ آئے تھے اور بُدبُد نے غم غلط کرنے کا بہانہ بنا کر سنّی کو غروب آفتاب سے پہلے وہاں پہنچا دیا تھا۔

سنّی نے شہریار مرزا کو دیکھا تو ناگواری سے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

"نہیں بھئی، یوں نہیں۔ چلو، تلخی بھلا کر اچھے بچوں کی طرح گلے ملو۔ دیکھو، ان دوستوں نے آپس میں مل بیٹھنے کا کیسا اہتمام کیا ہے۔" ڈاکٹر نذیر نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ شہریار مرزا اور سنّی کو دونوں بازوؤں کے گھیرے میں لے کر آپس میں گلے ملوا دیا۔

"میرا اُٹھنا بیٹھنا بڑے بڑے بلانوشوں کے ساتھ رہا لیکن میں نے ساری زندگی چکھی تک نہیں۔ نہ آج پیوں گا۔ صرف تم لوگوں کی دیکھ دیکھ کے لئے یہاں چلا آیا........... اُدھر ڈاکٹر ستنام اور میر صاحب مجھے کوس رہے ہوں گے کہ کہاں چلا گیا........... تھک گئے یار۔" ڈاکٹر نذیر ایک چٹان سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

راجہ رسالو نے ریسٹ ہاؤس کے وارڈروب سے نکالی ہوئی چادر بچھا کر 'ہائی لینڈ' کی فل بوتل، پانچ خالی گلاس، پانی سے بھرا ہوا تھرمس اور نمکو کے دو بڑے پیکٹ درمیان میں سجا دیے۔

"لو جی، کم گیا مک تے جھگڑا گیا چک .... ہُن بیہہ جاؤ سرکاراں۔" راجہ رسالو، دونوں ہاتھ جھاڑ کر بچھی ہوئی چادر کے ایک سرے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ اُس کے بعد بُدبُد کے بازو پکڑ کر بٹھانے سے سنّی بھی چار و ناچار شہریار مرزا کے پہلو میں ٹِک ہی گیا۔

ڈاکٹر نذیر قدرے بلندی پر بڑے سکون سے بیٹھے تھے۔ سامنے ترائی میں گیسٹ ہاؤس کے برآمدوں اور لان کی راہداریوں میں بجلی کے قمقمے روشن تھے۔ جن کی مدھم روشنی میں سارا احوال تو نہیں، البتہ کچھ کچھ ضرور جھائی دے رہا تھا۔ ایسے میں بوتل سے گلاسوں میں شراب انڈیلنے کی کل، کل نے ڈاکٹر نذیر کو کہیں بہت پیچھے ماضی میں دھکیل دیا۔ وہ ہلکا ہلکا گنگنانے لگے تھے۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ بھی اِدھر آ جائیے نا۔" شہریار مرزا نے تھرمس سے گلاسوں میں پانی انڈیلتے ہوئے کہا۔

"نہیں یار........... میں یہاں ٹھیک ہوں۔ لمحہ بھر کو یوں محسوس ہوا جیسے اردی بہشت کا مہینہ ہے اور میں توڑے

دار بندوق تھامے قلعہ لاہور کے اکبری دروازے کی دندانے دار فصیل پر بیٹھا ہوں .... غروب آفتاب کا وقت ہے۔ بارگاہ شاہی کے گرد قناطیں لگی ہوئی ہیں۔ دسترخوان سجا ہے۔ ناشپاتی، بابا شیخی، علی شیری، رائحہ برگ نے اور دُود چراغ غرضیکہ مختلف اقسام کے خربوزوں کے ساتھ بدخشاں سے آئے خربوزے موجود ہیں البتہ علاقہ بھکر کے نواح میں سواچلیے کے جاڑوں میں تیار کردہ خربوزے فراہم نہ ہو سکے۔ ہاں انار بے دانہ، سیب، بہی، امرود، شفتالو اور آلوچہ سے بھرے طشت دھرے ہیں۔ آج جہاں پناہ نے احباب کے ساتھ مل کر شُرب، افیون یا سبرس کا شغل کرنا ہے۔ جو کھایا گیا سو کھایا گیا، جو بچ گیا اُسے جہاں پناہ حاضرین محفل کو بطور الوش تقسیم کریں گے۔'' ڈاکٹر نذیر لہر میں تھے۔

''ڈاکٹر صاحب، اُدھر محفل شرب میں اتنا کچھ اور اِدھر صرف نمکو!'' راجہ رسالو کی اس بات پر سب ہنس دیئے۔

''ایسا نہیں ہے۔ ہمارے کھانے کو بھی کچھ نہ کچھ رکھا ہے۔ میں نے مطبخ والوں کو کہہ دیا تھا کہ ہمارا کھانا الگ کر دیں۔ ہم دیر سے کھائیں گے۔'' ڈاکٹر نذیر نے مژدہ سنایا۔

''زندہ باد! ڈاکٹر صاحب۔'' راجہ صاحب نے نعرہ لگایا۔

اب ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی اور ڈاکٹر نذیر ترنگ میں تھے: ''لو...... اب کارندے بارگاہ شاہی میں ظل سبحانی کے ایجاد کردہ خوشبودار مصالحہ جات کو سونے اور چاندی کی انگیٹھیوں میں سُلگا کر لے آئے۔ اس کا مطلب ہے شہنشاہ، خلوت خانہ سے اِدھر کا رخ کرنے والے ہیں۔

دیکھ رہے ہو...... جہاں پناہ کا ایجاد کردہ فانوس، اکاس دیا، ایک گز الٰہی کی بلندی پر نصب ہے۔ جس کے ساتھ زینہ لگا کر فوری شمع کی بتی کتر دی گئی۔ کھلے آسمان تلے بارگاہ کی تیاری کچھ آسان کام تو نہ تھا۔ فراش خانے سے اس نوتعمیر شدہ بارگاہ تک کارندے پہروں دوڑتے پھرتے۔ مخمل و زربفت سے تیار کردہ زرّیں بارگاہ میں ایرانی و تورانی قالینوں کے علاوہ گوشکان، خورستان، کرہان اور سبزوار سے آئے ہوئے قالین سازوں کے آگرہ، فتح پور اور لاہور میں تیار کردہ چوبیس چوبیس گز اور سات سات طسوج لمبے قالینوں پر اور تنگ شاہی سے فاصلے پر کابل و فارس سے منگوائے گئے تکیہ نمدہ ریشم سے تیار کردہ جاجم، شطرنجی اور بلوچی دھری ہیں اور سونے کے مرصع تخت کے سامنے کے رخ پر چار لوازمہ حشمت کوکبہ آویزاں ہے اور پیچھے غلاف بند علم، پانچ عدد قُر کے ہمراہ دکھائی دے رہے ہیں۔ جیسے ہی ظل سبحانی نے قدم رنجہ فرمایا، علم ریشمی غلافوں سے باہر نکال کر آویزاں کر دیئے جائیں گے اور حاضرین محفل دست راست پیشانی پر رکھ کر کورنش بجا لائیں گے۔

نقارے پر چوٹ پڑی۔

''نگاہ رُوبرُو .... نگاہ روبرو....'' دروازے پر کھڑے نقیبوں نے آواز بلند کی...... ایک ارادت مند پکارا: ''اللہ اکبر۔'' حاضرین محفل یک زبان ہو کر بولے: ''جلّ جلالہ۔''

اُس وقت تک شہریار مرزا، کمال مہارت سے سنی کے گلاس میں قدرے زیادہ ہائی لینڈ انڈیل کر پانی سے سطح برابر کر دیتا رہا تھا۔ نیز اس نے سگریٹ بھی سلگا رکھی تھی، جس کی راکھ تواتر سے سنی ہی کے گلاس میں گرتی رہی تھی۔ اور یہ عمل سنی کو اُلٹا دینے کے لئے کافی تھا۔ یہی سبب تھا کہ ڈاکٹر نذیر نے ''جلّ جلالہ'' کہا تو سنی نے راجہ رسالو کے کندھے پر سر ٹیک دیا۔

یہ دیکھ کر راجہ صاحب نے احوال جاننے کی خاطر ہاتھ لہرا کر صرف اتنا کہا: ''اکھ لڑے تے...... اکھ لڑے تے۔''

یہ سننا تھا کہ سنی نے گیت کا بول لکنت آمیز آواز میں مکمل کر دیا: ''لڑائی جا چپ کر کے۔''

''ہاں........ اکھ لڑے تے لڑائی جا، چپ کر کے۔'' راجہ صاحب نے کسمسا کر فضاء میں ہاتھ لہرایا تو سنی،

شہر یار مرزا کے کندھے کا سہارا لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

''چُپ کر کے، ہاں.......... چُپ کر کے۔'' سنی نے اپنے ہونٹوں پر دائیں ہاتھ کی اُنگلی رکھی تھی اور نرت بھاؤ دکھا رہا تھا۔

''ارے پکڑو اسے۔ شیطانو، تم نے کیا بنا دیا اسے.......... ارے پکڑو، تم لوگ کمرے میں نہیں، پہاڑی پر ہو۔ خبردار! اس کا ذرا سا پاؤں رپٹا تو مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔''

وہ تینوں تالیاں بجا رہے تھے۔

ڈاکٹر نذیر اٹھے اور لہرئیے لیتے سنی کو بازوؤں میں بھر کر قدموں میں بٹھا لیا۔

''اس کا کام ہو گیا ڈاکٹر صاحب۔ اب اس نے نہیں اٹھنا۔ اب یہ یہیں پڑا رہے گا صبح تک...... یقین مانیں، نہیں اُٹھنے۔'' مغلئی آنکھوں والے نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

اب سنی، وہیں پسر گیا تھا اور تھوڑی دیر بعد اُس کے خراٹوں کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔

''کیا وقت ہو گیا ہو گا؟'' ڈاکٹر نذیر نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ کی۔

''آدھی رات ہو گئی، ڈاکٹر صاحب۔'' ہُد ہُد کی آواز جیسے کنویں میں سنائی دی۔

یہ دیکھ کر ڈاکٹر نذیر گویا ہوئے: ''ایک زرگر کے دل میں خدا طلبی کا درد پیدا ہوا تو اُس کے مرشد نے اُس کا دِلی تعلق ایک گائے سے کروا دیا اور اُسے ایک تنگ جگہ پر بٹھا کر ہمہ وقت گائے کے خیال میں محو رہنے کی ہدایت کی۔ قلیل مدت کے بعد جب مرشد نے اس شخص کی آزمائش کے لئے اسے اس تنگ جگہ سے باہر نکلنے کا حکم دیا تو وہ شخص گائے کے خیال میں اس قدر محو ہو چکا تھا کہ اس نے معذوری کا اظہار کیا اور بولا: ''مُرشد! میں اتنے بڑے سینگوں کے ساتھ اس تنگ دروازے سے باہر کیسے نکلوں؟''

''بس یہی حالت میری بھی ہو گئی ڈاکٹر صاحب!'' ہُد ہُد بولا۔

''کیا مطلب چلو سمیٹو یہ سارا کچھ اور چلیں ریسٹ ہاؤس کی طرف.......... لیکن سنی تو اِس قابل نہیں رہ گیا۔ آپ میں سے کوئی ایک یہیں رُکے گا۔'' ڈاکٹر نذیر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''جی بالکل...... میں رُکوں گا یہاں.......... سنی کے ساتھ۔'' ہُد ہُد نے جھٹ حامی بھر لی ''تا کہ کوئی حادثہ نہ پیش آئے۔'' مغلئی آنکھوں والے نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے راجہ رسالو کا کندھا دبایا اور دونوں ڈاکٹر نذیر کی معیت میں پہاڑی سے نیچے اُترنے لگے۔

ڈاکٹر نذیر کو کیا خبر کہ سنی کو وہاں اکیلے سوتا چھوڑ کر ہُد ہُد بھی پتھروں پر سنبھل کر قدم رکھتا اُن کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

☆☆☆

گزشتہ رات کے ہنگامہ خیز مشن اور آج کے طولانی سیشن نے ہُد ہُد اور راجہ صاحب کو نڈھال کر دیا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ دونوں سب سے نظر بچا کر گرتے پڑتے اپنے اپنے بستروں تک چلے آئے تھے اور اِس وقت اُن کے درمیان خراٹوں کا مقابلہ جاری تھا۔

شہر یار مرزا، سُن گُن لینے کی خاطر صفیہ کے ساتھ لان میں بیٹھا رہا تھا تو ایک جانب سے مسلسل سیٹی کی آواز سنائی دے رہی تھی اور دوسری جانب سے غُراہٹ...... دو ایک بار زور سے کھانسا بھی، لیکن وہ دونوں تک جیسے شرط بد کر

سوئے تھے۔ تھکاوٹ کا احساس تو شہریار مرزا کو بھی تھا، لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ لیٹ گیا۔

جلال الدین محمد اکبر کے سفرِ کشمیر کے دوران، 1597ء میں رجوڑی کے مقام پر کیا ہوا؟ گزشتہ روز یہ گتھی، وہ سلجھا نہیں پا رہا تھا۔ شہزادہ سلیم بارگاہ اکبری میں حدِ ادب سے آگے بڑھا تو کیوں؟ اُس نے ذہن پر زور ڈال کر ابوالفضل کی ''آئین اکبری'' کے آئین: 16 کو دھیان میں لانے کی کوشش کی۔ پھر اُسے شاہی سفر کے اسباب، قیام منزل کی کچھ کچھ یاد آئی اور گزشتہ رات کے ہنگامہ خیز مشن کی بے سروسامانی بھی۔ اس کے ساتھ ہی اُس کی آنکھیں مندتی چلی گئیں۔

پھر اس نے دیکھا کہ جھٹپٹا سا ہے۔ گلال بار بچھی ہے۔ اس سے قدم آگے بڑھائیں تو قفل وکلید سے کھلنے والا دروازہ ہے اور خیمے کا گھیر سو گز مربع۔ جس کے گرد چوبیس گز لمبی اور چودہ گز چوڑی قنات ہے۔ راوٹی سے متصل، دو منزلہ خیمے میں نوشی کی محفل جمی ہے۔ جہاں پناہ رونق افروز ہیں اور اراکین دربار کا مُجرئی قبول کر رہے ہیں۔

اُس خیمے کے ساتھ زردوزی، زربفتی اور مخملی سائبان لگے ہیں اور اُن کے ساتھ والے خیموں میں اُردو بیگنیاں ہیں، جن کی نظریں حرمِ شاہی کا طواف کر رہی ہیں۔ دولت خانہ خاص کے سامنے مہتابی کے گرد پاسبان پہرہ دے رہے ہیں۔ پھر اچانک حرم شاہی کی جانب سے ایک سایہ قنات کے ساتھ جُڑ کر نکلا اور غائب ہو گیا۔ شہریار مرزا کو یوں لگا جیسے وہ کوئی اور نہیں ڈاکٹر ستنام کی بیٹی شازی ہو۔ چلنے کا وہی انداز، اور ہاتھ میں جیسے کوئی شے تھام رکھی ہو۔

''ہیلو، ایوری باڈی! فرسٹ کال فار بریک فاسٹ۔''

راجہ صاحب کی آواز سنائی دی تو شہریار مرزا نے چونک کر کروٹ لی۔

برآمدے میں کھلنے والے دروازے میں کھڑے ہو کر شاید وہ چمچ سے پلیٹ بجاتی رہی تھی اور اب پلٹ کر ڈائننگ ہال کی جانب جا رہی تھی۔ چلنے کا وہی انداز، اور ہاتھ میں جیسے کوئی شے تھام رکھی ہو۔

''شہزادہ، جاگ گیا کہ نہیں؟'' راجہ صاحب نے اُس کا کندھا تھپتھپایا۔

''راجہ صاحب، میں سویا ہی کب تھا۔''

''رات کو خنکی بڑھ گئی تھی۔ دو بار تو سردی کی وجہ سے میری آنکھ کھلی ہے اور دونوں بار اپنے شہزادے کو اس چادر سے ڈھانپا ہے، جس وقت اوپر میرا جگر سو رہا تھا۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں راجہ صاحب، اب تو سونے اور اور جاگنے کا فرق نہیں رہ گیا۔'' مغلئی آنکھوں والا کسملندی سے آنکھیں ملتا اُٹھ بیٹھا۔

وہ خواب تھا یا حقیقت؟ یہ اُلجھیڑا ہی رہا۔

آج اُسے تیار ہونے میں دیر ہو گئی۔ جب ناشتہ سے فارغ ہو کر کانفرنس ہال میں پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ آج اکبر کا سفرِ کشمیر ہی زیرِ بحث تھا۔

اُس نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں مل کر اپنے آپ کو یقین دلایا کہ وہ سو نہیں رہا، جاگ رہا ہے...... وہ دروازے کے ساتھ ہی لگ کر بیٹھ گیا۔

''............شاہی سواری کے ساتھ ہمیشہ دو خیمے چلتے تھے۔ ایک وہ نصب شدہ خیمہ، جس میں ظلِ الٰہی نے رات بھر قیام کرنا ہوتا اور دوسرا وہ، جس میں اگلا قیام مقصود ہوتا۔ اُن خیمہ جات کے ہمراہ دریا پار کرنے کو ایک شاہی کشتی بھی ہاتھی پر ساتھ چلتی تھی۔ بار برداری کے لئے دو سو اونٹ اور پچاس ہاتھی...... تین پالکیاں اور پچاس اونٹوں پر پانی۔ چھوٹے خیموں سے لدے

آٹھ خچر۔ دو خچروں پر بادشاہ کے پہناوے اور عطر ساتھ چلتا تھا۔ تا کہ طے شدہ پروگرام سے ہٹ کر اگر ظلِ الٰہی کہیں مختصر قیام کرنا پسند فرمائیں تو انتظام ممکن ہو۔ اسی طرح شاہی سواری کے ساتھ شامل سفر شہزادگان بھی اپنے اپنے رُتبے کے مطابق، ہاتھی پر سوار، سفری لوازم سے لدے پھندے اونٹوں کے ساتھ چلتے تھے۔ نیز پچاس اونٹوں پر لدا باورچی خانہ اور دودھ دینے والی پچاس گائیں۔ دو سو ملازمین کے سروں پر چینی کے برتنوں کی ٹوکریاں اور دیگر سامان بھی ساتھ چلتا تھا۔ اُن مزدور پیشہ افراد کے علاوہ، جو بسولوں، کلہاڑیوں، کدالوں اور پھاوڑوں سے لیس ہوتے اور دشوار گزار راہوں کو ہموار کرتے چلے جاتے۔

شاہی سواری کے آگے نقارے پر ہلکی ہلکی چوب پڑتی جاتی تھی تا کہ شاہی گزرگاہ کے اطراف و جوانب کے لوگ جان لیں کہ شاہی سواری ہے...... دور ہٹ جائیں۔

بادشاہ کے گرداگرد مسلح پیدل سپاہیوں کے علاوہ ہاتھ میں بید تھامے سپاہی اُن لوگوں کو مار بھگانے کا کام کرتے جو بادشاہ کی ایک جھلک دیکھنے کے خواہاں ہوتے۔

رسی سے فاصلہ ناپنے والے اُن کے علاوہ ہوتے جو ظلِ الٰہی کے دریافت کرنے پر فوری طور پر بتا سکتے تھے کہ کتنا فاصلہ طے ہو گیا اور کتنا رہ گیا۔ ایک پیدل اہلکار، گھڑی کا شیشہ تھامے وقت کی پیمائش کرتا ہوا ساتھ چلتا تھا۔ ہر تھوڑی دیر بعد کانسی کی طشتری پر ہتھوڑے کی ضرب لگا کر وقت کا اعلان کرنا اُس کا کام تھا۔

شاہی کاررواں سے آگے سفید چادروں سے لدا پھندا، کارندوں کا ایک گروہ ایسا بھی تھا، جس کا کام شاہی گزرگاہ کے دونوں اطراف میں حدِ نگاہ تک مرے ہوئے اشخاص اور جانوروں کی ادھ کھائی لاشوں اور ڈھانچوں کو سفید چادروں سے ڈھانپ دینا تھا، تا کہ بادشاہ کی طبع نازک پر گراں نہ گزرے۔

شاہی حرم کی بیگمات اور لونڈیاں پتمبر اور پالکیوں میں سوار، کرخت چہروں والے خواجہ سراؤں کے جلو میں شاہی سواری کے پیچھے چلتی تھیں۔"

شہریار مرزا نے نظر بھر کر چاروں اور دیکھا...... سبھی موجود تھے لیکن اُسے پورے ہال میں کہیں شازی دکھائی نہ دی۔

وہ گزشتہ دو روز سے کسی ذہنی اُلجھن کا شکار تھی۔ اُس میں وہ پہلے والی بات رہ ہی نہیں گئی تھی...... کوہ مری میں مرحبا ریستوران کے صدر دروازے پر کس قدر کھلی کھلی اور خوش تھی .... کیا ہو گیا اُسے؟

شہریار مرزا، یہ سوچتے کرتے کانفرنس ہال سے باہر نکل آیا۔

اُس وقت ڈاکٹر لوباخ کی معیت میں سرخ بالوں والے خاموش طبع محقق پورے فلم یونٹ کے لئے بے تکان Tips فراہم کر رہے تھے اور وہ سب سر جھکائے نوٹس لینے میں جُٹے تھے۔

☆☆☆

زوال کا وقت تھا۔ ڈاکٹر نذیر اور نجمہ بیگم گوشۂ مستورات سے نکل کر لان کی سیڑھیاں اُترتے دکھائی دیئے تو ڈاکٹر ستنام نے بیٹھے بیٹھے میز کھسکا کر کرسیوں کے درمیان کر لیا۔

"ارے! کدھر نکل گئے میر صاحب...... کوئی ڈھونڈو انہیں۔"

"جی اچھا......" ذرا فاصلے پر کھڑی، خوش گپیوں میں مصروف دھان پان سی صفیہ تیز قدم اٹھاتی آگے کو نکل گئی۔

"میر صاحب کو ذرا جو وقت کا احساس ہو...... دیکھ بھی رہے ہوں گے کہ سورج غروب ہو رہا ہے...........

پرانے پاپی ہیں۔ پی رہے ہیں تو بے شک مٹکا بھر پلا دو۔ قائم رہیں گے، بہکیں گے نہیں۔ لیکن ایک وقت ہوتا ہے نا ہر کام

کا............بھئی وقت پر آ جاؤ......'' ڈاکٹر ستنام مسلسل بڑبڑا رہی تھیں۔

''ستنام جی، وقت کی پابندی تو حضرت جوش ملیح آبادی پر ختم تھی۔ ادھر مغرب کی اذان ہوئی، اُدھر انہوں نے پہلا گھونٹ لیا۔'' ڈاکٹر نذیر نے نجمہ بیگم کا ہاتھ دبا کر مزہ لینے کی خاطر لقمہ دیا۔

ڈاکٹر ستنام نے کندھے اچکاتے ہوئے، سامنے دھرے میز پر تین گلاس اور پانی کا جگ ترتیب دیتے ہوئے، بیٹھے بیٹھے کرسی کی پشت سے لٹکے ہالڈال کی زِپ کھول کر ڈرائی جن کے دواَدھیے اور نمکو کے پیکٹ برآمد کر لئے۔

''بھئی نجمہ، ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا کہ تم بھی گناہگاروں میں شامل ہو......دیکھ جو رہی تھیں......اتنے دن سے کہ ہم لوگ یہ شغل کرتے ہیں، تو خود ہی چلی آتیں۔''

''وہ.........ناماں جی، ہم ٹھہرے چھوٹے لوگ۔ آپ لوگوں کے برابر کے تو نہیں نا۔''

''ارے، یہ کیا بات ہوئی۔ اتنا نام ہے تمہارے گھرانے کا۔ اتنی عزت کمائی۔ لو، یہ تو مجھ سے کھل نہیں رہی..........اتنی پکی سیل لگی ہے۔'' ڈاکٹر ستنام نے اَدھیہ نجمہ بیگم کو تھماتے ہوئے کہا۔

''دیکھ لیں.........ناماں جی ہم ٹھہرے جدی پشتی سیلیں تڑوانے والے اور آپ ہمیں سیل توڑنے کو کہہ رہی ہیں...... لیجئے کھل گئی۔'' نجمہ بیگم نے دبے انداز میں چُہل کی۔

''بھئی حد کر دی تم نے نجمہ بیگم......اس معاملے میں گھرانوں کی کوئی قید نہیں۔'' ڈاکٹر نذیر چہکے اور ڈاکٹر ستنام نے بازو پھیلا کر نجمہ بیگم کو سینے سے لپٹا لیا۔

''جہنمیوں کی محفل کے لئے یہ نیا چہرہ خوب ڈھونڈ نکالا آپ نے۔'' میر صاحب نے کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔

''ہماری عزت بڑھائی ہے ناماں جی۔'' نجمہ بیگم، ہاتھ جوڑ کر ماتھے تک لے آئیں۔

''میر صاحب! ہماری فلم پس پردہ موسیقی کے بغیر بننے سے رہی۔ سوچا نجمہ بیگم کو بھی شامل گفتگو کر لیں.........لیکن آپ کا لڑکپن نہیں گیا۔ کوئی وقت کا احساس بھی ہے آپ کو؟'' ڈاکٹر ستنام نے نمکو کا پیکٹ دانتوں سے کاٹ کر سامنے رکھتے اور گلاسوں میں برابر کی اُنڈیلتے ہوئے سرزنش کی۔

بوتل کی کل کل تھمکی تو میر صاحب نے سُنی ان سُنی کرتے ہوئے اپنا گلاس اٹھا کر فضا میں بلند کیا: ''چیرز''۔

''چیرز۔'' تین گلاس دھیرے سے ٹکرائے اور دُور شفق پر زردی کا ایک اور چھینٹا پڑا۔

''آپ لوگ دیکھ رہے ہیں ناں.........صرف پیلاہٹ رہ گئی۔ تھوڑی دیر تک یہ بھی ختم ہو جائے گی.........میں آج بھی جلال الدین محمد اکبر کے آفتاب عالم تاب کو اُن پہاڑیوں کے پیچھے ڈوبتا اور مرتا دیکھتا رہا۔''

اس سے پہلے کہ بات کسی اور رخ پر چل نکلتی، ڈاکٹر نذیر نے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت میر صاحب اور نجمہ بیگم کی موجودگی کا فائدہ اُٹھانے کے لئے پلٹا کھایا۔

''میر صاحب، میں اکثر غروب آفتاب کے بعد اکبر اعظم کی محافل شبینہ کے بارے میں سوچتا رہا ہوں۔ خاص طور پر فن موسیقی سے اُس کے خصوصی شغف اور سرپرستی کے بارے میں۔ تان سین، بابا رام داس، سُر گیان خاں سے لے کر تان سین کے بیٹے تان ترنگ خان تک اُس کے دربار سے وابستہ رہے۔ کے آصف نے فلم 'مغل اعظم' کے لئے عہد اکبری کے خنیاں گراں میں سے بطور کریکٹر تان سین کو چنا، اور تان سین کی نمائندگی کے لئے اُس نے نہ صرف اپنے دور کے سب سے بڑے فن استاد بڑے غلام علی خاں کا انتخاب کیا بلکہ انہیں بھاری معاوضہ دے کر فلم میں گانے کے لئے بھی آمادہ کر لیا۔

کام تو کیا ناں اُس نے۔"

میر صاحب مسکرائے اور تمباکو کا گہرا کش لے کر گویا ہوئے: "ڈاکٹر صاحب! تان سین 1588ء میں سورگ باش ہو گیا تھا۔ اُسے ہم 1595ء تا 1599ء قلعہ لاہور میں نہیں دکھا سکتے۔ جیسا کہ کے آصف نے کیا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کم علمی بڑے بڑے گل کھلاتی ہے۔ فلم 'بیجو باورا' میں بلاتحقیق تان سین اور بیجو کی گائیکی کا مقابلہ کروا دینا کتنی مضحکہ خیز بات ہے۔ ابوالفضل نے 'آئین اکبری' میں بیجو باورا، جس کا اصل نام بیج ناتھ تھا، کو دربار اکبری سے متعلق نہیں بتایا۔ بیج ناتھ قدرے بعد کا گائیک ہے۔ اکبر کے قیام لاہور کے دوران بیجو شکشا حاصل کرنے تان سین کے استاد ہری داس سوامی کے پاس برندابن میں مقیم تھا۔

رِیوا کے برہمن زادے تان سین کے بارے میں ابوالفضل لکھتا ہے کہ ایسا مغنی ایک ہزار سال سے ملک ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا۔ طاس ولیم بیل کی کتاب اور ینٹل بایوگرافیکل ڈکشنری کے مطابق تان سین راجہ رام چندر کے دربار کا گائیک تھا۔ راجہ نے جلال الدین محمد اکبر کی فرمائش پر اُسے آگرہ بھیج دیا اور اُس کی دُھرپد گائیکی پسند کی گئی۔ گوالیار میں اُس کے سادھی ہندوستان کے گلوکاروں کی زیارت گاہ ہے۔"

"کیا کہنے میر صاحب۔ ہم یوں ہی تو آپ کو پیر و مرشد نہیں مانتے۔" ڈاکٹر ستنام کھل اٹھیں۔

"آداب! لیکن کیا حق الخدمت کے طور پر میرا اگلا پیگ ڈبل نہیں کریں گی؟"

"بالکل ہوگا۔ اب رہ گیا یہ سوال کہ زمانہ حال میں دُھرپد گائیکی کے لئے ہم کسے چُنیں؟"

ڈاکٹر نذیر بولے: "جو دُھرپد کا ماہر ہو یا راگ درباری، میاں کی ٹوڈی، میاں کا سارنگ اور میاں کی ملہار گاتے ہوئے کمال کا مظاہرہ کرے۔ نیز یہ کہ ہمارا منتخب کردہ گلوکار رباب بجا سکتا ہو۔ اس لئے کہ پوپلے کے مطابق رباب تان سین کی ایجاد ہے۔ ابوالفضل نے بھی 'خنیا گراں' کے عنوان کے تحت اس ساز کا حوالہ دیا ہے۔ یقیناً تان سین کا بیٹا تان ترنگ خاں، قلعہ لاہور میں رباب بجاتا رہا ہوگا۔ کیوں، ٹھیک ہے ناں میر صاحب؟"

"ہاں...... آگرہ گھرانے کا کوئی فرد لیا جا سکتا ہے۔ بے شک رباب بجانا نہ جانتا ہو۔ فلم میں اس کی گنجائش ہوتی ہے۔" میر صاحب نے عندیہ دیا۔

"استاد فیاض خاں تھے، جو گزر گئے۔ ہمارے ہاں غلام حسین شگن تو ہیں لیکن اگر بھارت سے بھاسکر راؤ با کھلے یا دلیپ چندر ویدی کا انتظام ہو جائے تو کیا کہنے...... کیا کہتی ہیں نجمہ بیگم؟" میر صاحب نے استفسار کیا۔

"جی...... بھاسکر راؤ اور دلیپ چندر ویدی کے کیا کہنے...... دیکھ لیجئے۔ بعد از طلوعِ آفتاب کے لئے آساوری راگ ہے۔ آروہی میں پانچ اور امروہی میں سات سُروں کا راگ۔ اسی طرح آہیر بھیروں ہے، بھیروں ٹھاٹھ کا سمپورن یعنی سات سُروں کا راگ۔ کیا مناسب نہیں ہوگا کہ طلوعِ آفتاب کے وقت کے لئے میاں کی ٹوڈی کا انتخاب کیا جائے؟ ٹھیک ہے ناں ڈاکٹر صاحب؟ ٹوڈی ٹھاٹھ کا کھاڈو سمپورن، یعنی آروہی میں چھ سُر اور امروہی میں سات سُروں کا راگ۔ اس کا وادی سُر گندھار اور سموادی سر دھیوت ہے اور ہم نے اپنے بڑوں سے یہی سنا ہے کہ یہ راگ بھی میاں تان سین کی ایجاد ہے۔

راگ میاں کی ٹوڈی کی استھائی دیکھیے:

"اب موری نیا پار کرو گے"

اَستھائی ختم ہوتے ہی اَنترہ کا نقطۂ عروج آئے گا:

"دُکھ دلدر سب دُور کرن ہار"

میرے دادا اُستاد، اللہ مغفرت کرے، کہا کرتے تھے کہ قدیم وقتوں میں خیال کے آخری حصے میں 'ابھوگ' ضرور شامل کیا جاتا تھا۔ جس کا رواج خیال گائیکی میں اب بہت کم رہ گیا۔ کیا ابھوگ کو شامل کرنا ضروری نہیں ہوگا، اکبری عہد کی چیز ثابت کرنے کے لئے؟"

"جی، بالکل ضروری ہوگا۔ نجمہ بیگم نے بہت عمدہ بات کی۔" ڈاکٹر نذیر نے خوش ہوکر کہا۔

"پھر اگر شب کے دوسرے پہر کے لئے کسی راگ کا انتخاب کرنا ہو تو باگشیری ہے۔ آروہی میں پانچ سُر اور امروہی میں سات۔ یہ ٹیڑھی چال کی راگنی ہے۔ اسی طرح میاں کی ملہار ہے۔ کافی ٹھاٹھ کا وکر کھاڈو سمپورن .... آروہی میں چھپے اور امروہی سات سروں کا راگ۔ سنا ہے، یہ راگ بھی میاں تان سین کی ایجاد ہے۔ ہاں یاد آیا۔ اللہ بخشے استاد برکت علی خاں صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ شب کے دوسرے پہر میں گانے کے لئے راگ درباری سے بہتر کوئی راگ نہیں۔ اب یہ بات صحیح ہے یا غلط، سُنا ہے کہ پہلی راگ گا کر میاں تان سین نے اکبر کے دل میں جگہ بنائی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہی میر صاحب؟"

"نہیں...... اِس راگ کا ابتداء چونکہ کرناٹک سے ہوئی تھی، اس لئے 'راگ کرناٹ' بھی کہلاتا ہے۔ پھر اُسے 'کانہڑہ' کہنے لگے تو اسے 'راگ درباری' کا نام دے دیا۔ اس راگ کا حسن مندر استھان میں ہے۔"

"میر صاحب آپ کی بات بڑی ہوتی ہے۔ میں ایک معمولی سی گانے والی...... راگ درباری گاتے ہوئے امروہی میں دِھیوت کا سُر حذف کر دیا جاتا ہے اور آروہی میں 'گا' اور 'دھا' کے سُروں کو جُھلا کر گایا جاتا ہے۔"

ڈاکٹر نذیر گویا ہوئے: "بے شک۔ اسے بلمپت میں گانا مناسب تر ہے۔ کیوں نا۔ "یار من بیا بیا" اِس کے بول مقرر کر لئے جائیں؟ اور......"

میر صاحب نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا: "شاہ حسین، ڈاکٹر صاحب! شاہ حسین کی کوئی چیز.................، جو 1595ء تا 1599ء کے اکبری عہد کی گواہی دے اور انارکلی کے دِلی جذبات کی عکاس بھی ہو:

نی سَیّو اَسیں نیناں دے آکھے لگے

ہمارے موضوع سے مطابقت بھی رکھتی ہے اور کیا کمال کی چیز ہے...... 1595ء میں شاہ حسین...... ستاون سال...... تھے، جب قلعہء لاہور میں شہزادہ سلیم اور انارکلی کا معاشقہ شروع ہوا اور اُسی سال 1599ء میں دُنیا سے پردہ کر گئے، جب انارکلی، حبس دم کا شکار ہوئی۔"

"اوہ! پھر تو شاہ حسین ہوں گے صاحب۔ کیوں نا بازار میں وکھانا پڑے اُنہیں۔ .... ملامتی صوفی کے طور پر داڑھی منڈھوا کر اور بازار میں رقص کر کے اپنے عقیدت مندوں سے جان چھڑواتے ہوئے۔" ڈاکٹر ستنام نے چوتھا پیگ بناتے ہوئے فیصلہ سنا دیا۔

"یہ ہوئی نا بات...... اب چل نکلی ہے تو ستنام جی کسی کو کہہ کر برف کی کیوبز منگوا لیں اور کھول دیں وہ چھٹنکی بھر کی بوتل بھی، جو آپ نے الگ سے چُھپا کر رکھی ہے۔" میر صاحب لہر میں تھے۔

☆......☆......☆

گرد کے بگولے......۳

نجیبہ عارف

قصبے میں اپنی معاشی حیثیت اور کم مائیگی کا احساس اسے بہت شروع سے ہونے لگا تھا۔ لنڈے کا وہ سرخ کوٹ، جس پر لکڑی کے بڑے بڑے بٹن لگے ہوتے تھے اور جسے دیکھتے ہی سب پہچان لیتے تھے کہ یہ کوٹ لنڈے کا ہے، سردیوں میں وہ پہن تو لیتی تھی لیکن جتنی دیر تک وہ کوٹ اس کے بدن پر رہتا، اسے اپنے آپ سے کوفت ہوتی رہتی۔ وہ خود سے بھی آنکھیں چرائے رکھتی۔ اپنے آپ کو رد کرنے، خود کو جھٹلانے اور اپنی نفی کرنے کی عادت شاید یہیں سے اس کے اندر پختہ ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی حساسیت روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔

اس دن تو حد ہی ہوگئی۔ اماں اسے ساتھ لے کر اس کی سہیلی ناز کے گھر چلی گئیں۔ سہیلیوں کے گھر جانے کی اسے بالکل اجازت نہیں تھی لیکن اس دن جب اماں نے یہ مژدہ سنایا تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس خوشی کی دو بڑی وجہیں تھیں، ایک تو یہ کہ وہ ناز سے ملے گی اور دوسری یہ کہ اس بہانے وہ قصبے کی واحد کوٹھی دیکھ لے گی۔ ناز ایک بڑی کوٹھی میں رہتی تھی جس کے باہر سرسبز لان کے پیچھے گول ستونوں والے برآمدے تھے۔ ان ستونوں سے گھنی جھومر بیلیں لپٹی ہوئی تھیں جن پر گہرے گلابی پھولوں کے گچھے کے گچھے لٹکتے رہتے تھے۔ برآمدوں میں بید کی کرسیاں پڑی رہتیں جن پر کبھی کبھی گھر کے مرد بیٹھا کرتے تھے۔ دوسری طرف ایک بڑا دروازہ تھا جو رہائشی حصے کی طرف کھلتا تھا۔ وہ اکثر اس گلی سے گزرتے ہوئے اس کوٹھی کی نیچی سی چار دیواری کے قریب سے گزرتی اور اچک اچک کر اندر جھانکنے کی کوشش کرتی۔ اس کے خیال میں اس عمارت کے اندر ایک پرستان آباد تھا۔ ایک باغ، جس میں اونچے اونچے درخت ہوں، اور ان کی شاخوں سے لمبی لمبی پینگیں بندھی ہوں، باغ کی روشوں پر پھولوں سے بھری شاخیں جھکی ہوں، شاید کوئی تالاب بھی ہو جس کے کنارے کوئی گل بکاؤلی سفید سفید پاؤں شیشے جیسے پانی میں ڈالے بیٹھی ہو۔ گھاس پر مور پنکھ پھیلائے پھرتے ہوں اور گلہریاں اور خرگوش پھدکتے ہوں۔ پرستان کا اس کے ذہن میں کچھ ایسا ہی تصور تھا۔ یہ کوٹھی بھی اسے پرستان لگتی تھی۔ اس کا کوٹھی کہلایا جانا ہی اسے پراسرار بنا دیتا تھا کیوں کہ باقی سب گھر مکان کہلاتے تھے۔ اس نے کبھی کوئی کوٹھی اندر سے نہیں دیکھی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کوٹھیوں میں لوگ کیسے رہتے ہیں۔ اسے تو بس محلوں کا حال معلوم تھا جو اس نے ''بچوں کی دنیا'' کی کہانیوں میں پڑھ رکھا تھا۔ لیکن محل تو پرانے زمانے میں ہوتے تھے، جب بادشاہ اور شہزادے شہزادیاں ہوتی تھیں۔ اس زمانے میں کوٹھیاں ہوتی تھیں، جہاں بڑے بڑے لوگ رہا کرتے تھے۔ یہ لوگ کیسے رہتے ہیں، ان کے کمروں کی آرائش کیسی ہے، ان کے بستر کے گدیلے کتنے نرم ہیں، ان کے فرش کیسے قالینوں سے ڈھکے ہوئے ہیں، ان کے کھانے پینے کے برتن کیسے ہیں، طور طریقے اور آداب کیا ہیں؟ یہ سب باتیں اسرار کی دھند میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ناز، اس کی ہم جماعت اور سہیلی، جو ٹاٹ پر اس کے بالکل ساتھ بیٹھتی تھی، اسی کوٹھی میں رہتی تھی لیکن وہ بہت کم گو اور قدرے خود پسند سی تھی۔ اس نے کبھی اپنے گھر کی کوئی بات اس سے نہیں کہی تھی۔ خود پوچھتے ہوئے اسے شرم محسوس ہوتی تھی، انا بھی آڑے آتی تھی۔ لیکن اسے اتنا ضرور معلوم تھا کہ گھر میں ناز کا اپنا ایک کمرہ تھا، جس میں اس کی گڑیاں سجی ہوئی تھیں، کھلونے رکھے تھے اور ایک میز

تھی جس پر اس کی کتابیں اور لکھنے پڑھنے کا سامان پڑا رہتا تھا۔ یہ سب باتیں اس کی شان و شوکت کا اظہار کرنے کے لیے کافی تھیں۔ اس کے اپنے گھر میں اماں کے جہیز کی صرف دو کرسیاں تھیں جن پر بیٹھنے کی انھیں قطعاً اجازت نہ تھی۔ جب کوئی بہت خاص مہمان آتے تو یہ کرسیاں بڑے اہتمام سے انھیں پیش کی جاتیں۔ ہمسائی عورتوں اور اماں کی سہیلیوں کے لیے کرسی پیش کرنا قطعی غیر ضروری تھا۔ وہ اماں کے پاس ہی بان کی کھری چارپائی پر آ کر بیٹھ جاتیں اور دیوار سے ٹیک لگا کر پاؤں اوپر کر لیتیں۔ پھر اماں کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو جاتیں۔

تو ناز کے گھر کی یہ باتیں اسے خاصی رومان انگیز لگتی تھیں۔ وہ اکثر خیال ہی خیال میں کوئی ایسا واقعہ فرض کر لیتی جس کے نتیجے میں وہ اس کوٹھی کی مکین بن سکتی تھی۔ پھر وہ اپنے تخیل کی مدد سے اس پر تعیش گھر اور اس میں جینے کے کئی امکان ایک ایک کر کے خود پر طاری کرتی اور اس لذت انگیز عمل سے خوب محظوظ ہوتی۔ لیکن آج اماں نے جب اسے ساتھ لے کر ناز کے گھر جانے کا ارادہ کیا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ خود کو کیسا روپ دے کہ اس کوٹھی میں اجنبی اور غیر معلوم نہ ہو۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کوٹھی کے مکینوں کو اسے دیکھ کر ایسا لگے جیسے وہ بھی ہمیشہ سے انھی کی طرح رہتی سہتی آئی ہے۔ اس نے اپنا بہترین جوڑا، جو پچھلی عید پر بنا تھا، لکڑی کے صندوق سے نکال کر پہن لیا۔

''عید کے کپڑے کیوں پہن رہی ہو؟'' اماں نے اسے دیکھا تو تیوری چڑھالی۔

''اماں، تم ہی نے تو کہا تھا کہ آنے جانے کے لیے رکھ چھوڑو! آنے جانے کے لیے ہی پہن رہی ہوں۔''

اماں نے اسے پھر سے گھورا اور چپ ہو گئیں۔ وہ محسوس کرنے لگی تھیں کہ کچھ عرصے سے وہ ہر بات میں زبان چلانے لگی تھی اور اکثر ایسی دلیلیں دیتی تھی، جن کا اس کے پاس کوئی جواب نہ ہوتا۔ ایسے میں اماں کبھی اسے نظر انداز کر دیتیں اور کبھی لاجواب ہو کر بلاوجہ ایک دو دھپے جما دیتیں۔ اب ماں کی مار کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔ انھیں لامحالہ برتری حاصل ہو جاتی اور وہ روتی ہوئی ادھر ادھر ہو جاتی۔

اس نے کپڑے بدل کر بالوں میں نیلے ربن کی بو والا کلپ لگایا، اسکول کے یونی فارم کی گرگابی پہنی کیوں کہ چپل کے علاوہ اس کے پاس وہی ایک جوتوں کا جوڑا تھا، اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ناز کی طرف جانے کو چل پڑی۔

ناز کے گھر کے اندرونی رہائشی حصے میں داخل ہوتے ہی اس نے خود کو ایک بہت بڑے لان کے بالمقابل پایا جس کے پار سرخ رنگ کی عمارت بڑے غرور سے سر اٹھائے کھڑی تھی۔ اس کا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ عمارت کے اندرونی حصے میں داخل ہونے کے شوق نے اس کے خون کی گردش تیز کر دی تھی۔ لان میں دو تین مالی گھاس پر سوکھے پتوں کی طرح بکھرے پڑے تھے۔ شاید کوئی کام کر رہے تھے لیکن اس نے مالیوں کی طرف توجہ نہیں دی اور اماں کا ہاتھ تھام کر رہائشی حصے کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کے خیال کے منظر حقیقت میں اس کے سامنے آنے والے تھے۔

ناز کا کمرہ کہاں ہوگا؟ وہ کیا کر رہی ہوگی؟ اسے دیکھ کر حیران رہ جائے گی۔ پھر وہ دونوں مل کر اس کے کمرے میں جائیں گے اور اس کی۔۔۔۔'' وہ ایسے ہی خیالی پلاؤ بنا رہی تھی کہ اچانک اسے ایک دھچکا سا لگا۔

کسی نے اسے اور اماں کو وہیں روک دیا تھا۔

''کیا بات ہے؟ کس سے ملنا ہے؟ کہاں منھ اٹھائے چلی آ رہی ہو؟''

وہ شاید کوئی ملازمہ تھی۔

''بیگم صاحبہ سے ملنا ہے، ایک کام ہے۔'' اماں نے ذرا ہکلاتے ہوئے کہا تو اسے بہت برا لگا۔

''ہونھ! ڈرنے کی کیا بات ہے؟'' دل ہی دل میں دلیری سے یہ سوچ کر اس نے اونچی آواز میں کہا:
''ناز میری سہیلی ہے، اس کے پاس جا رہی ہوں میں!''
''ناز بی بی کے سونے کا وقت ہے۔ پھر کبھی آنا!'' ملازمہ نے اس کی ماں کی درخواست بالکل نظرانداز کر دی تھی۔ غصے اور خجالت سے اس کی کنپٹیاں سلگنے لگیں۔
''نہیں نہیں، ناز بیٹی سے نہیں، بڑی بیگم صاحبہ سے ملنا ہے، مجھے ایک ضروری کام ہے۔ ذرا ملوا دو!'' اماں نے اتنی لجاجت سے کہا کہ ملازمہ کو ترس آ گیا اور وہ ان دونوں کو انتظار کرنے کا حکم دے کر اندر چلی گئی مگر اس کی سلگتی ہوئی کنپٹیاں اب سرخ ہو کر پھڑکنے لگی تھیں۔
وہاں کھڑے ہو کر ''بیگم صاحبہ'' کا انتظار کرنے کے دس پندرہ منٹ اسے صدیوں جتنے طویل معلوم ہوئے۔ وہ غریب ضرور تھے مگر کسی کے محتاج نہیں تھے۔ غیرت مندی اور خودداری اسے اپنے ماں باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ ان کے ماحول میں ایک دوسرے کے گھروں میں آنے جانے کے ایسے تکلفات روا نہیں رکھے جاتے تھے۔ جب کوئی مہمان گھر میں آتا تھا تو سب گھر والے اپنے سارے ضروری کام چھوڑ کر پوری طرح مہمان کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ لمبی چوڑی مہمان داریوں کے تو وہ متحمل نہیں ہو سکتے تھے لیکن گھر بھر کی توجہ اور عزت افزائی ضرور مہمان کو حاصل ہوتی تھی۔
کافی دیر بعد اسے ناز کی امی باہر آتی ہوئی دکھائی دیں۔ ناز بھی ان کے ساتھ تھی۔ وہ خوش ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ ناز آتے ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے جائے گی، اس کی امی اسے پیار کریں گی اور اماں کو اپنے ساتھ مہمانوں کے کمرے میں لے جائیں گی۔ لیکن اس کا خیال خام ثابت ہوا۔ ناز کی امی نے بڑی رکھائی سے اماں کے سلام کا جواب دیا اور پوچھنے لگیں کہ کیا کام ہے؟
اماں ان سے درخواست کرنے لگیں کہ اگر بڑے ملک صاحب ہیڈ ماسٹر سے سفارش کر دیں تو اس کے ابا کو بڑے سکول کے سامنے نان چھولوں کی ریڑھی لگانے کی اجازت مل جائے تاکہ چھٹی کے وقت لڑکے وہاں سے نان چھولے خریدیں اور ان کی بکری کچھ زیادہ ہو جائے۔
ناز کی امّی کچھ زیادہ امید دلانے والی نہ لگتی تھیں۔ انھوں نے صرف اتنا وعدہ کیا کہ وہ بڑے ملک صاحب سے پوچھ لیں گی اور وہ جو بھی کہیں گے، اسے بعد میں بتا دیا جائے گا۔
سلیمہ کو معلوم نہ تھا کہ اماں ناز کے ہاں کس مقصد کے لیے آئی ہیں۔ اب اچانک اسے ان کا یوں سوالی بننا نظر آیا تو دل ہی دل میں وہ سخت ندامت محسوس کرنے لگی۔ اسے ناز کے سامنے اپنی بہت سبکی محسوس ہو رہی تھی۔
ابھی بات یہیں تک پہنچی تھی کہ کچھ مہمانوں کی آمد کا شور مچا۔ باہر گاڑیاں رکنے اور دروازے کھلنے کی آواز بلند ہوئی۔ ناز کی امی نے ملازمہ کو پکار کر کہا:
''جلدی سے گول کمرہ کھولو! مہمانوں کو بٹھاؤ! چلو جلدی کرو!'' ملازموں میں ہڑبونگ سی مچ گئی۔ مہمانوں کے استقبال کے لیے نوکر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔
ملازمہ گول کمرہ کھولنے چلی گئی تو انھوں نے سوالیہ نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ اماں نے اپنا برقع جلدی سے دوبارہ سر پر جما لیا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔
''چلو سلیمہ! جلدی کرو!''

''اس نے بے اختیار ناز کی طرف دیکھا، جیسے وہ اسے روکنے والی ہو۔
ناز بالکل خاموش کھڑی تھی۔
''تو اب ہم جائیں؟؟'' اس نے ایک بار پھر ناز کی طرف دیکھا۔
اس کا دل چاہ رہا تھا، ناز اسے زبردستی روک لے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر کہے،
''بالکل نہیں! میں تمھیں اتنی جلدی نہیں جانے دوں گی۔ چلو آؤ، میں تمھیں اپنا کمرہ دکھاؤں۔ ہم گڑیا کی شادی کرتے ہیں۔''

وہ نخرے دکھائے اور کہے، ''نہیں نہیں ناز، میں اماں کے ساتھ ہی چلی جاتی ہوں۔'' تاکہ اس کی امی کے روپے کا کچھ تو انتقام لے سکے۔ لیکن اس کا موقع نہ مل سکا۔

ناز نے بڑے سپاٹ انداز میں ''اچھا'' کہا اور اس کی طرف یوں دیکھا جیسے خدا حافظ کہہ رہی ہو۔ اس کا دل ڈوب گیا۔ اماں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے مگر بھاری قدم اٹھاتی ہوئی وہ کوٹھی سے باہر نکل آئی اور پھر کبھی ناز کے گھر نہیں گئی۔

مگر اس سبکی، اس خجالت کو وہ کبھی دل سے بھلا نہیں پائی۔ اسے ہمیشہ یاد رہا کہ اپنے گھر کی گرتی ہوئی معیشت کو سہارا دینے کے لیے اسے اپنی اماں کے ساتھ، اپنی سہیلی کے گھر سوالی بن کر جانا پڑا تھا اور اس گھر میں انھیں مہمان نہیں سوالی ہی سمجھا گیا تھا۔ اس نے یہ بات اپنی روح کے دھاگوں میں پرولی تھی۔ پتا نہیں یہ انا کہاں سے اس کے اندر آ سمائی تھی۔ اس کا تعلق جس سماجی گروہ سے تھا وہ انا جیسی عیاشی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ قدم قدم پر انا کا سودا کرنا پڑتا تھا۔ قدم قدم پر ذلت اور بے بسی کا احساس ہوتا تھا۔ ہر بار تلخی کا ایک نیا ذائقہ دریافت ہوتا تھا۔ ہر بار خود کو اندر سے کھرچنے اور کڑھنے کی ایک نئی صورت پیدا ہو جاتی تھی۔ خود اذیتی اور گرفتاری کا احساس شدید تر ہو جاتا اور اس کے ظاہر و باطن میں فاصلہ اور بڑھ جاتا۔ اس کے بس میں اور تو کچھ تھا نہیں، وہ بس اتنا ہی کر سکتی تھی کہ کسی پر اپنی ٹوٹ پھوٹ ظاہر نہ ہونے دے، اپنی شکست خوردگی کو دوسروں سے چھپائے رکھے، اپنی بے چارگی کا انکار کرتی رہے۔ سو اس نے یہ بھاری پتھر بہت کم عمری میں ہی اٹھا لیا تھا۔

☆☆☆☆
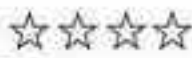
اس کے اردگرد کی دنیا بڑی محدود سی تھی مگر اس کی حدود کا واضح تعین کرنا مشکل تھا۔ مثلاً گھر میں وہ کل چار ہی افراد تھے۔ وہ خود، اس کا ایک رشتے دار بھائی جو نیم پاگل تھا، اماں اور ابا۔ اس کی دوسری سہیلیوں کے برعکس اس کا نہ کوئی ننھیال تھا، نہ ددھیال۔ نہ خالہ ماموں، نہ چچا پھوپھی، نہ ان کے بچے۔ بچپن میں تو اسے کبھی یہ خیال نہ آیا کہ ان کا گھرانہ تنہا کیوں ہے؟ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے اردگرد کے ماحول میں غیریت نہیں تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ اس اکلاپے کی وجہ سمجھ میں آتی گئی۔

ان کا مکان جس گلی میں تھا اسے مہاجروں والی گلی کہا جاتا تھا۔ یہ ہندوؤں کے متروک مکانوں کی گلی تھی۔ اس گلی میں ہجرت کے بعد یہاں آ کر آباد ہونے والے خاندان رہائش پذیر تھے جنھیں یہ مکان، ان کی جائداد کے کلیم میں الاٹ ہو گئے تھے اور یا پھر انھوں نے کسی اور سے کرائے پر حاصل کیے تھے۔ یعنی ان لوگوں سے جنھوں نے بزور بعض مکانوں پر قبضہ کر لیا تھا اور پھر انھیں مہاجروں کو کرائے پر اٹھا دیا تھا۔ خود ان کا سہ منزلہ مکان بھی کرائے کا تھا جس کی دوسری منزل

میں مالک مکان نے اپنا سامان رکھ کے تالہ لگا دیا تھا۔ ایسی ہی چند گلیاں اور بھی تھیں، جو سب کی سب دونوں طرف سے بند تھیں۔ داخلے کی طرف بڑے بڑے آہنی گیٹ تھے جو ہمیشہ کھلے رہتے تھے اور کھلے پٹوں کو زنگ کھاتا چلا جاتا تھا۔ ان کھلے پٹوں میں چھوٹے چھوٹے دروازے بھی تھے جو بچوں کے کھیلنے کے کام آتے تھے۔ ان گلیوں کے آخری سرے پر یا تو کسی مکان کی عمارت تھی یا محض دیوار بنا کر دوسری طرف کا راستہ بند کر دیا گیا تھا۔

مشہور تھا کہ یہاں رہنے والے ہندو بہت مال دار تھے اور اسی لیے انھوں نے اپنے رہائشی علاقے کو اکثریتی اجڈ آبادی سے محفوظ رکھنے کے لیے قلعہ بند کر لیا تھا۔ یہ بھی مشہور تھا کہ پاکستان بننے کے بعد جب انھیں اچانک یہاں سے جانا پڑا تو وہ اپنی ساری نقدی اور زیورات سمیٹ کر ساتھ لے گئے تھے مگر گھروں کے قیمتی سامان پر مقامی آبادی نے ہاتھ صاف کر لیا تھا۔ مہاجروں کے حصے میں صرف اینٹ پتھر کی عمارتیں ہی آئی تھیں۔ وہ بھی ان کے ذوق کے مطابق نہیں تھیں۔ ہندو ثقافت کے مظہر یہ تمام مکان تنگ و تاریک اور کنویں کی طرح گہرے اور اونچے تھے۔ اکثر مکان تین چار منزلہ تھے۔ ہر منزل پر ایک دو کمرے اور لکڑی کے چھجے سے تھے۔ دھوپ اور ہوا صرف بالائی منزل پر آتی تھی۔ نچلی منزلوں میں دن بھر سایہ، ٹھنڈی ٹھنڈی تاریکی اور ٹھہرا ٹھہرا سکوت بھرا رہتا۔ ان میں سے کچھ مکان تو باقاعدہ اور اعلانیہ آسیب زدہ تھے اور کئی ناخوش گوار واقعات کے بعد اب خالی پڑے تھے۔ ان کے اردگرد کے لوگ اب بھی کہتے تھے کہ رات کو یہاں سے نسوانی چیخوں کی آوازیں آتی ہیں، کبھی کوئی سایہ سا چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے، کبھی ہوا میں لہو کے چھینٹے اڑتے ہیں اور کبھی اچانک کوئی نامانوس سی خوشبو علاقے میں پھیل جاتی ہے۔ خود ان کی گلی میں بھی پانچویں نمبر کا بڑا سا حویلی نما مکان خالی پڑا تھا جس پر پیلی پیلی قلعی کی گئی تھی جو دھوپ اور بارشوں میں دھندلا کر مٹیالی ہو گئی تھی۔ وہ اکثر کسی آسیب کی تلاش میں اس مکان کی طرف دیر دیر تک دیکھتی رہتی لیکن اسے کبھی کوئی ایسا سنسنی خیز مشاہدہ یا تجربہ نہ ہوا۔ آسیب کا خوف اور اس کے بالمقابل آ کر اسے جاننے کا شوق بیک وقت اسے بے تاب و مضطرب رکھتے تھے۔

ان گلیوں کے نام نہیں تھے، نمبر تھے۔ ایک نمبر گلی، دو نمبر گلی، تین نمبر گلی۔ یہ سب لوگ مختلف علاقوں سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ زیادہ تر مشرقی پنجاب سے آنے والے تھے مگر چند ایک خاندان دہلی اور اس کے اردگرد کے علاقوں سے بھی آئے تھے۔ یہ لوگ اپنی خاندانی حیثیت یا مرتبے کے مطابق نہیں رہتے تھے بلکہ ان کی قسمت سے جو مکان انھیں الاٹ ہوا تھا، اسی کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال چکے تھے۔ البتہ ایک بات ان سب نے اپنالی تھی یعنی ایک دوسرے کو اپنا خاندان مان لیا تھا۔ ایک دوسرے کی غمی خوشی میں شریک ہوتے تھے اور اپنی بے سروسامانی اور مہاجرت کے رنج مل جل کر سہتے تھے۔ ان میں سے کچھ گھروں کے مکین تو ایسے تھے جن کے رشتے دار پاکستان کے دوسرے شہروں میں آباد ہو گئے تھے اور وہ کبھی کبھار ان سے ملنے کے لیے لمبے لمبے سفروں پر جاتے تھے؛ لیکن کچھ ایسے بھی تھے جنھیں اپنے کسی رشتے دار کی خبر نہ ملی تھی۔ ان کا دنیا میں کوئی سگا نہ تھا لیکن ان گلیوں کے باقی مکین اس کمی کو پورا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے تھے۔ مقامی لوگوں میں سے کچھ تو انھیں شک و شبے کی نظر سے دیکھتے تھے، لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو ان سے ہمدردی اور محبت روا رکھتے تھے۔ البتہ دونوں طرح کے لوگ برس ہا برس سے انھیں مہاجر ہی کہہ کر پکارتے رہے تھے اور ان کی گلیاں ہمیشہ مہاجروں کی گلیاں کہلاتی رہی تھیں۔ وہ بھی مہاجر گھرانے کی ایک فرد تھی۔ یہ مہاجرت پہلے ایک شناخت تھی پھر آہستہ آہستہ اس کا حال بنتی گئی۔ اس کے خون کے ہر خلیے میں بیگانہ روی کا رنگ بن کر بہنے لگی، اسے حاضر و موجود سے بیزار کرنے لگی۔ اور جب اسے اس حقیقت کا ادراک ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔

قصبے کے باقی تمام رہائشی علاقے محلے کہلاتے تھے۔ بیشتر محلے یا تو مختلف ذاتوں سے منسوب تھے یا پیشوں سے جو رفتہ رفتہ ذات ہی بن گئے تھے۔ مثلاً پاؤلیوں یعنی جولاہوں کا محلّہ ان کی گلی کے بالکل عقب میں تھا جہاں مکانوں کے برآمدوں میں کھڈیاں لگی تھیں اور وہ جب کبھی عید، شب برات یا کسی اور موقع پر کڑھے ہوئے رومال سے ڈھکی پلیٹ میں حلوہ لے کر ان گھروں میں جاتی تو بڑے شوق سے اس کھڈی میں جھانکتی جس میں پیر لٹکا کر فیقا پاؤلی بڑے سے لکڑے کے ہتھے کو آگے پیچھے کرتا ہوا، دری یا کھیس بننے میں مصروف ہوتا اور وہ حیرت اور تجسس سے سوت کے تانے بانے کو ایک واضح نقش میں ڈھلتے دیکھتی۔ فیقے پاؤلی کی بیوی صحن میں بیٹھی بڑے سے رنگین چرخے پر کپاس سے دھاگہ بنتی رہتی۔ ایک ہاتھ سے چرخے کا پہیہ گھماتی جاتی اور دوسرا بازو اوپر لے جا کر باریک دھاگے کو کھینچتی جاتی۔ روئی کی پونیاں اس کے ہاتھوں میں غیر محسوس طریقے سے گھومتیں اور سلیمہ بی بی کو ان کا ریشمیں لمس اپنی ہتھیلیوں پر محسوس ہوتا۔ اسے یہ دونوں فن کار اس قدر عظیم لگتے کہ اس کا جی چاہتا انھی کی بیٹی بن جائے اور ان سے روئی کے پولے پولے گالوں کو دریوں اور کھیسوں کے رنگین پھولوں میں بدلنا سیکھ لے۔ مگر یہ کب ممکن تھا۔ اپنی تمام تر بے بضاعتی کے باوجود اس کے ماحول میں موجود یہ احساس اس کے لاشعور کا حصہ تھا کہ پاؤلی اس کے سماج کا کم تر حصہ تھے۔ کسی نچلے درجے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ کمّی کمین تھے۔ ان کے ساتھ تعلقات میں برابری قائم نہیں ہو سکتی تھی۔ انھیں عید شب برات پر حلوہ تو بھیجا جاتا تھا لیکن ان کے ساتھ شادی بیاہ کا رشتہ قائم کرنا ممکن نہ تھا۔ یہ سب باتیں لاشعوری طور پر اس کے وجود کا حصہ تھیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ کئی سوال بھی تھے جو ذرا دیر بعد آہستہ آہستہ اس کے اندر سے یوں نکلنے والے تھے جیسے کسی اندھے کنویں کی گہرائی سے ایک دھندلا سا غبار اٹھتا ہے جو اسے اور بھی اندھا بنا دیتا ہے۔

پاؤلیوں کے محلے سے ذرا آگے نکلتے تو لڑکوں کے پرائمری سکول کے پاس، ملک صاحب کی کوٹھی کے دوسری طرف، سیدوں کا محلّہ تھا جہاں صرف ایک ہی غیر سید گھرانہ تھا: ان کے مولوی صاحب کا گھرانہ، جن سے اس نے قرآن پڑھا تھا اور جو بعد میں کافر قرار پا گئے تھے۔ اس علاقے سے اکثر عقیدت مند سر جھکا کر گزرتے تھے اور اگر کوئی سید بزرگ چلتے ہوئے نظر آ جاتے تو شاہ صاحب! شاہ صاحب کہتے ہوئے ادب سے ان کے گھٹنے چھوتے اور ہاتھوں پر بوسہ دیتے۔ ان کے ماحول میں سیدوں کو بہت عزت و احترام حاصل تھا اور ان میں شیعہ اور سنی بھی سید شامل تھے۔ لوگ انھیں عقیدت سے دیکھتے تھے اور یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ ان کے پیارے نبی کی اولاد میں سے ہیں۔ یہ ایسا رشتہ تھا جو انھیں اپنی جان، مال اور ناموس ہر شے سے پیارا تھا۔ لوگ اس نسبت کے احترام میں اتنا غلو کرتے تھے کہ اکثر سیدوں کی بڑی بڑی خطاؤں سے بھی چشم پوشی کر لیا کرتے تھے اور اپنی اس ادا کو ہی اپنی بخشش کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

سیدوں کے محلے سے آگے دریا کے کنارے، شاہ جمال الدین کے دربار کے پار، مصلیوں کی بستی تھی جنھیں قصبے میں سب سے زیادہ حقیر سمجھا جاتا تھا۔ جب کسی کی تحقیر یا تذلیل مقصود ہوتی تو مصلّی کا لفظ گالی کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا جسے سن کر سامنے والے کے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی اور بات ہاتھا پائی تک پہنچ جاتی۔ مصلیوں کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کوئی کام نہیں کرتے، سخت ہڈحرام اور ڈھیٹ ہوتے ہیں۔ غیرت اور خودداری کے احساس سے بالکل تہی۔ کام چور۔ مفت خورے۔ مگر جب کبھی کسی گھر میں مرنا پرنا، یعنی مرگ یا شادی بیاہ کا موقع آتا تو یہی مصلی طلب کیے جاتے جو دیگوں کے نیچے آگ جلاتے، صحنوں میں دریاں یا چارپائیاں بچھاتے، مہمانوں کو چائے کی پیالیاں پکڑاتے اور بعد میں تقریب کے مقام پر جھاڑو دیتے۔ اس کے بدلے انھیں بچا ہوا کھانا، نیا یا پرانا جوڑا اور کبھی کبھی کچھ نقد انعام بھی عطا

ہو جاتا تھا جس سے وہ اگلے چند دن خوب عیاشی کرتے، بیڑی پیتے، مرغی پکاتے، بٹیر لڑاتے یا تانگے میں بیٹھ کر سینما دیکھنے جاتے جو اس قصبے میں عیاشی کی انتہا تھی۔

اس کی گلی کے بالکل سامنے شیخوں کا محلّہ تھا جس میں قصبے کے بیشتر کاروباری افراد رہتے تھے۔ بازار میں کپڑے اور جوتوں کی دکانیں، چینی اور آٹے کے راشن ڈپو، گھی اور صابن کی چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں انھی شیخوں کی ملکیت تھیں۔ یہ سب آپس میں رشتے دار تھے۔ آپس ہی میں رشتے ناطے کرتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے جھگڑتے بھی خوب تھے۔ ان کی عورتیں بھی چھوٹے موٹے کاروبار کرتی تھیں۔ ازار بند بنتیں، دال کی بڑیاں بنا کر بیچتیں یا دوپٹوں، کرتوں اور بستر کی چادروں پر کشیدہ کاری کر کے فروخت کرتیں۔ ان سے اکثر لوگ ڈرتے تھے کیوں کہ ان کی برادری بہت وسیع تھی اور باہر کے لوگوں سے معاملہ کرنے میں یہ سب لوگ اکٹھے ہو جاتے تھے۔

قصبے کے دوسری طرف، بڑے بازار اور سول ہسپتال کے عقب میں اور بھی کئی محلے تھے، مثلاً سناروں کا محلّہ، جو خود کو بڑے فخر سے زرگر کہتے تھے۔ زرگروں کی ایک بیٹی اس کی جماعت میں بھی پڑھتی تھی۔ وہ واحد لڑکی تھی جو اپنے نام کے ساتھ اپنے باپ کا نام اور پیشہ بھی لکھا کرتی تھی۔ ''شہناز جمیل ولد محمد جمیل زرگر۔'' وہ ہمیشہ، ہر جگہ، اپنا پورا نام بتاتی اور لکھتی تھی جس سے سننے والوں پر خاطر خواہ رعب پڑ جاتا تھا۔ خاص طور پر سلیمہ بی بی تو بہت ہی مرعوب ہو جاتی تھی کیوں کہ اس کے ابا کا بھی نام تو بہت لمبا چوڑا تھا، مرزا شمیم بیگ، مگر خود ان کے سوا کوئی بھی انھیں اس نام سے نہیں پکارتا تھا۔ اکثر لوگ انھیں چھمو چھولیاں والا کہتے تھے۔ جسے سن کر ابا کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا جاتا۔ اس وقت اگر وہ اتنی چھوٹی نہ ہوتی تو سمجھ جاتی، کہ مہاجروں کے مکانوں میں بسنے والے آسیب دراصل انھی سایوں کے تھے۔

ابا بڑے کم گو اور سنجیدہ تھے۔ سلیمہ نے کبھی انھیں ہنستے مسکراتے یا خوش ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ صبح سویرے جب اس کی آنکھ کھلتی تو اماں تانبے کے ایک بڑے سے قلعی شدہ پتیلے میں گرم گرم چھولوں پر ہرا دھنیا اور گرم مصالحہ چھڑک رہی ہوتیں۔ نان تندور سے آتے تھے، جنھیں ابا ایک بڑے سے رنگین دسترخوان میں لپیٹ کر بانس کے پتوں سے بنی ٹوکری میں دبا دبا کر رکھ دیتے۔ پھر وہ بھائی رحمانی کو آواز دے کر بلاتے جسے سن کر بھائی تیزی سے ان کی طرف لپکتے تھے۔ بھائی رحمانی دن بھر تو دیوانے سے بنے رہتے لیکن ابا کی آواز سن کر کبھی کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ بھاگ کر آتے، چھولوں کا پتیلا ابا کے ساتھ مل کر اٹھاتے اور ریڑھی پر رکھ دیتے۔ پانی کی بالٹی بھر کر ریڑھی کے نیچے بندھے ہوئے ایک بانس سے لٹکا دیتے۔ نان بھری ٹوکری پتیلے کے اوپر ٹکا دیتے، دوسری طرف تانبے کی چھوٹی چھوٹی سیاہ کٹوریاں اور لمبے گلاس، جن کی قلعی کئی جگہ سے اکھڑ گئی تھی، اچھی طرح جما دیتے۔ ان کے ساتھ ہی اخباری کاغذوں کا ایک گٹھا سا رکھ دیتے۔ اور ابا ریڑھی کی پشت پر کھڑے ہو کر اسے دھکیلتے ہوئے گھر سے باہر نکال لے جاتے۔

ابا اپنی ریڑھی خود ہی چلاتے تھے۔ صبح جب چھولوں بھرا پتیلا ریڑھی پر لدا ہوتا تو انھیں اسے دھکیلنے میں خاصی دقت ہوتی تھی، بہت زور صرف کرنا پڑتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ریڑھی کا توازن برقرار رکھتے ہوئے، طے شدہ مقام تک جا پہنچتے، جہاں ان کے لگے بندھے گاہک تھے۔ دکانوں پر کام کرنے والے ملازم لڑکے جو اکثر دکانوں کے اندر ہی سویا کرتے تھے، قریبی دیہات سے آنے والی ارائیں عورتیں جو صبح صبح سبزیوں کی چھابڑی سر پر اٹھا کر آتیں اور قصبے کے چوک میں بیٹھ کر چند گھنٹوں میں اپنی سبزی فروخت کر کے واپس چلی جاتیں، کمیٹی کے خاکروب جو فجر سے گلیوں میں جھاڑو دینے کے بعد، اب تھک کر چور ہو چکے ہوتے اور بھوک سے بے حال ہوتے۔ کبھی کبھی کسی قریبی گھر سے بھی کوئی بچہ یا

جوان سلور کا ڈول یا کٹورا ہاتھ میں پکڑے ناشتہ لینے آن پہنچتا۔ عموماً اس وقت جب گھر کی عورت میکے گئی ہو، بیمار ہو یا اچانک کوئی مہمان آ گیا ہو۔ صبح نو ساڑھے نو بجے تک چھولوں کا پتیلا خالی ہو جاتا اور ابا بڑی سہولت سے ریڑھی دھکیلتے ہوئے گھر آ جاتے۔ دوسرا چکر شام کو لگتا، سہ پہر تک اماں چھولوں کا دوسرا پتیلا تیار کر چکتی تو ابا دو تین گھنٹے کے آرام کے بعد پھر اسی طرح ریڑھی دھکیلتے ہوئے باہر نکل جاتے۔ لیکن شام کو پتیلا خالی ہونے کے بعد بھی وہ دیر تک گھر نہ لوٹتے۔

ابا کے ساتھ بات چیت کا سلسلہ بڑا محدود رہتا تھا۔ گھر اور اس کی زندگی کے تمام امور پر اماں ہی کی حکومت تھی۔ اماں بڑی دور اندیش، جہاں دیدہ اور دبنگ عورت تھی۔ وہ نہ صرف گھر داری کے فرائض بڑی سمجھ داری اور سلیقے سے انجام دیتی تھی، بلکہ محلے داری کے رکھ رکھاؤ میں بھی اس کی اپنی ہی ایک شان تھی۔ مہاجروں کی گلیوں میں ہی نہیں، اردگرد کے محلوں میں بھی اسے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اماں محنتی اور خدا ترس تھی۔ وہ صبح سویرے جانے کس وقت اٹھ کھڑی ہوتی تھی۔ نماز پڑھتی، پھر تکیے پر قرآن رکھ کر بآواز بلند تلاوت کرتی، پھر اسے اٹھا کر مولوی صاحب کے ہاں روانہ کرتی اور خودرات کے بھگوئے ہوئے چنے، مٹی کے چولہے پر چڑھا دیتی۔ لکڑیوں کی آگ کو برابر رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ گھر کے دوسرے کام بھی نپٹاتی جاتی۔ بستر لپیٹتی، ابا کے صاف کپڑے نکال کر غسل خانے کی دیوار پر رکھ دیتی، ان کا حقہ تازہ کرتی، ان کے لیے تیل کے چولہے پر دیسی گھی کا پراٹھا بناتی، پچھلی طرف زمینداروں کے گھر سے لسی مانگ کر لاتی اور سلور کے لمبے گلاس میں ڈال کر ابا کو تھما دیتی۔ جب سلیمہ بی بی قرآن پڑھ کر واپس آتی تو ابا ریڑھی لے کر جانے کے لیے تیار ہوتے۔ اسے دیکھ کر ابا ہلکے سے مسکراتے اور اپنی جیب سے ایک آدھ سکہ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیتے، کبھی اکنی، کبھی دس پیسے، کبھی بہت ہوا تو چونی۔ وہ خوش ہو جاتی۔ ابا کی مسکراہٹ اس کے اندر جیسے ایک شکتی سی بھر دیتی۔ ابا اتنا کم مسکراتے تھے۔

ابا کا صرف ایک ہی دوست تھا، غلام محمد دھوبی، جو ان کے مکان سے متصل ایک احاطے میں رہتا تھا۔ غلام محمد دھوبی عمر میں ابا سے کافی چھوٹا تھا مگر اس کے چہرے پر ایسی سنجیدگی اور الم ناکی چھائی رہتی کہ وہ اپنی عمر سے کہیں بڑا دکھائی دیتا۔ اس کی اکلوتی بیٹی نسرین اختر، سلیمہ کی ہم جماعت تھی۔ اس احاطے میں صرف ایک کوٹھڑی تھی جس کے آدھے رقبے پر ناتراشیدہ لکڑی کی ایک بڑی میز دائیں طرف کی دیوار سے لگی رہتی۔ اس میز پر سفید چادر بچھی رہتی اور اس کے کناروں پر دھلے ہوئے تہ شدہ کپڑوں کی ڈھیریاں قطار میں رکھی رہتیں۔ شام کے بعد اس میز کے اس طرف والے کنارے پر غلام محمد دھوبی، ٹانگوں پر ایک پتلی سی دھوتی لپیٹے، کھڑا دکھائی دیتا۔ اس کے ایک ہاتھ میں سیاہ رنگ کی بڑی سی لوہے کی استری ہوتی جس میں کوئلے دہکتے اور استری کے وزن سے اس کے دبلے پتلے بازو کی مچھلیاں تڑپتی نظر آتیں۔ کمرے سے باہر احاطے کی دیوار کے نیچے نسرین اختر کی ماں بُورے والی انگیٹھی پر الٹا توا رکھے باریک باریک پھلکے سینکتی، جن کی خوشبو بُورے کی بساند سے مل کر ایک عجیب سی فضا پیدا کر دیتی۔ انگیٹھی کے پاس بیٹھی نسرین اختر مٹی کے ڈھیلے اچھال اچھال کر ایک ہاتھ سے پکڑنے کی کوشش میں مصروف نظر آتی یا پھر سہ پہر کو ٹوٹے ہوئے گھڑے کی ٹھیکری سے کچی زمین پر لکیریں لگا کر ایک پاؤں سے خانے پھلانگتی رہتی۔ یا زمین پر اسکول والی بوری بچھا کر سلور کی چھوٹی سی دیگچی میں مٹی اور پانی ڈال کر جھاڑو کے تنکے سے ہلاتی اور جھوٹ موٹ کی ہنڈیا پکاتی اور دل میں سوچتی ہے کہ کاش دنیا میں کوئی اسکول نہ ہوتا۔ لیکن جب سے ساتھ والے میں گھر میں نان چھولے والے مرزا شمیم بیگ آئے تھے، اس کا اسکول جانا پکا ہو گیا تھا۔ اس کے ابا نے مرزا شمیم بیگ کے کہنے پر اسے ہدایت کی تھی کہ ہر روز سلیمہ بی بی کے ساتھ اسکول جایا کرے اور اس کے ساتھ ہی واپس آیا کرے۔ اس

کی اماں نے بھی سلیمہ کی اماں کے کہنے پر اسے سمجھا دیا تھا کہ آئندہ وہ دونوں اکٹھی ہی اسکول سے آئیں جائیں گی۔ یہ بات اسے سخت ناپسند تھی۔

سلیمہ بی بی کو وہ پہلے ہی جانتی تھی۔ اس سے عمر میں ایک دو سال چھوٹی تھی مگر جماعت میں اس کے ساتھ ہی تھی۔ سخت بے وقوف اور پڑھا کو اور جماعت میں فرسٹ آنے والی۔ ایسی لڑکیاں اسے زہر لگتی تھیں جنھیں روز سبق یاد ہوتا ہے اور جنھیں روز شاباش ملتی ہے۔ اسکول کی استانیاں ان سے اپنے سارے کام کرواتی ہیں اور سالانہ امتحان والے دن بہت سے نمبر دے کر پاس کر دیتی ہیں۔ مگر اب وہ کیا کرتی۔ مجبوری تھی۔ غلام محمد دھوبی کو بہت شوق تھا کہ اپنی اکلوتی لڑکی کو میٹرک کے بعد استانی کا کورس کروائے اور میونسپل کمیٹی کے پرائمری اسکول میں بھرتی کروا دے تا کہ اسے دھوبیوں والی مشقت نہ کرنی پڑے۔ روز اسکول کی لڑکیاں گھر آ کر گھر کے کاموں میں بھی مدد کر دیا کریں اور مہینے کے مہینے لگی بندھی تنخواہ بھی آتی رہے۔ یوں شاید اس کا شمار بھی قصبے کے معزز لوگوں میں ہونے لگے اور کسی اچھے گھر سے رشتہ آنے کی امید بھی بندھ جائے۔ آخر وہ شروع سے دھوبی تھوڑی تھے۔ یہ تو ہجرت کے بعد اس کے باپ کو اور پھر اسے بھی دھوبی بننا پڑا، ورنہ فیروز پور کے قریب اس کے باپ کے پاس آٹھ بیگھے زمین تھی جس پر اس کا اور اس کے خاندان کا اچھا بھلا گزارا ہوتا تھا۔

اسے پرانی باتیں اب اچھی طرح یاد نہیں رہی تھی مگر پوری طرح بھولی بھی نہیں تھیں۔ انسان کے دماغ کا کمپیوٹر بڑے حیران کن کام کرتا ہے۔ غلام محمد دھوبی کو شعور، لاشعور اور تحت الشعور والا قضیہ تو معلوم نہیں تھا مگر وہ واضح طور پر محسوس کرتا تھا کہ پرانی یادیں اس کے ذہن میں ایک دھندلی تصویر کی طرح موجود ہیں جنھیں پوری طرح ڈی کوڈ کرنا بھی آسان نہیں اور ان سے صرف نظر کرنا بھی مشکل ہے۔ جب انسان کا واسطہ ایسے کاموں سے پڑتا ہے جو نہ مشکل ہوں اور نہ آسان تو عام طور پر وہ انھیں سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ ان سے نظریں چرا لیتا ہے۔ اسے بھی کئی تکلیف دہ سوالوں سے نظریں چرا لینا آسان لگتا تھا۔ مثلاً یہی ہجرت والا معاملہ۔ فسادات ہوئے، گھر بار لٹے، خاندان کے افراد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ وہ ایک اجنبی زمین پر آن پہنچے، ایک متروکہ احاطہ بھی انھیں الاٹ ہو گیا۔ اس کے باپ نے چھوٹے موٹے کاروبار کرنے کی بہت کوشش کی اور کئی ناکام کوششوں کے بعد دھوبی کا پیشہ اپنا لیا یہ سب تو ہوا سو ہوا مگر اس کی بہن ۔۔۔ جب بھی اسے یاد آتا، دل میں ایک کٹار سی اتر جاتی۔ ایک ایسے استفسار کی کٹار، جس کے لیے نہ کوئی لفظ ملتا ہے نہ لہجہ، نہ اشارہ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا پوچھا جائے، کس سے پوچھا جائے اور کیسے پوچھا جائے۔

اسے یاد ہے۔ وہ سردیوں کی ٹھنڈی ٹھار صبح تھی۔ سورج ابھی کہیں بستر میں دبکا پڑا تھا اور وہ خود اور اس کی بہن ابا کی پٹی سے لگے بیٹھے تھے۔ ابا کو کئی دن سے بخار تھا۔ کھانسی تو اسے ہلکی ہلکی رہتی ہی تھی۔ اس روز کھانسی میں بھی شدت تھی۔ سردیوں میں ٹھنڈے پانی میں کپڑے دھونے سے ٹھنڈ اس کی ہڈیوں میں اتر گئی تھی۔

ابا نے اپنے دائیں طرف کی چارپائی پر لیٹی اس کی بہن کو بستر سے اٹھا کر کہا تھا:

''بیٹی، مجھے چائے بنا دو!''

اس کی بہن ابھی ابھی تو لیٹی تھی۔ وہ رات بھر باپ کی تیمارداری میں مصروف رہی تھی مگر آواز سنتے ہی اس نے بستر سے اٹھ کر چادر اپنے اردگرد لپیٹی اور چائے بنانے چل دی۔ اچانک باہر سے شور سا اٹھا۔ کئی لوگوں کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر سامان اٹھانے اور پھینکنے کی آوازیں آئیں۔ ابا نے اسے کہا:

''ذرا دیکھو تو باہر کیا ہو رہا ہے''؟

اس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ عقبی محلے میں رہنے والے ایک بابو جی کا سامان اٹھا کر باہر پھینکا جا رہا تھا۔ یہ بابو جی، سرکاری ملازم تھے۔ ان دنوں کلرکوں کو بابو جی کہنے کا رواج عام تھا۔ انھیں بھی سب چھوٹے بڑے بابو جی کہ کر بلاتے تھے۔ کسی اور شہر سے تھے اور یہاں اکیلے، ایک کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ مالک مکان ان سے یہ گھر خالی کروانا چاہتے تھے مگر وہ کسی وجہ سے ایسا کرنے پر رضامند نہیں تھے۔ مالک مکان اسی محلے کے بااثر لوگ تھے۔ آج انھوں نے بابو جی کا سامان اٹھا کر باہر پھینک دیا تھا۔

اس نے اندر آ کر اپنے ابا کو بتا دیا۔ ابا بے چارے بابو پر افسوس کرنے لگے۔ پھر یکایک شور مچا کہ پولیس آ گئی۔ کھٹا کھٹ کی آوازیں پھر سے بلند ہوئیں۔ لوگ اونچی آواز میں بولنے لگے۔ ابا کا بھی جی چاہ رہا تھا کہ باہر جا کر حال معلوم کریں مگر طبیعت کی خرابی نے انھیں بستر سے باندھ رکھا تھا۔ اسی حال میں دو تین گھنٹے گزر گئے۔ ابا کی طبیعت اب قدرے بحال ہو گئی تھی۔ انھوں نے کھونٹی سے اپنی جناح کیپ اٹھائی اور سر پر رکھ لی۔ پلنگ کے نیچے جھک کر بوٹ نکالے اور بستر کی پٹی پر بیٹھ کر پہننے لگے۔ بہن نے باہر جانے سے منع بھی کیا مگر ابا نے اسے تسلی دی اور دروازے کی طرف بڑھے۔ اس وقت صبح کے نو بجے تھے۔ اس نے ابا کے جانے کے بعد انھی کے بستر میں گھس کر اپنی نیند پوری کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی اور وہ غنودگی میں ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور ایک لمبی چارپائی ڈیوڑھی سے اس کے گھر میں داخل ہوئی۔ اس چارپائی پر ابا کی میت تھی۔

یہ کیا ہوا؟'' اس کا ذہن واقعے کی تفہیم سے قاصر تھا۔ اس کی بہن ٹکر ٹکر ابا کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یکایک پڑوس کی عورت اندر داخل ہوئی اور اس کی بہن کے سر پر دونوں ہاتھوں سے تھپڑوں اور مکوں کی بارش کر دی۔

''نامراد، بے شرم، بے حیا، تو نے پورے محلے کی عزت خاک میں ملا دی۔ جانے کہاں سے آئے ہیں یہ مہاجر، یہ بے غیرت لوگ، نجانے کس خاندان کے ہیں، اپنے باپ کی جان لے لی، بے چارہ رسوائی کا داغ نہ جھیل سکا، صدمے سے جان دے دی۔''

بہن کی گویائی جواب دے چکی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ خاموشی سے مار کھاتی رہی اور الزامات کے تیر سہتی رہی۔

''خالہ، کیا ہوا؟'' بڑی مشکل سے اس نے پوچھا

''کیا ہوا؟ ارے بے غیرت، باہر جا کر دیکھ، سارا شہر تھو تھو کر رہا ہے۔''

''مگر کیوں خالہ؟''

''اے ہے! کیسے نادان بنتے ہیں۔ اپنی شریف زادی بہن سے پوچھ، جس نے بابو جی سے ناجائز تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ آج صبح تمھارے چاچا نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ ارے تبھی تو وہ مکان خالی نہیں کر رہا تھا۔ یہاں چھڑے جو اڑائے جا رہے تھے۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ مہاجروں کا یہ خاندان کس قماش کا ہے ورنہ کبھی اپنے شہر میں پناہ نہ دیتے۔ یہ تو آج تمھارے چاچا نے ہمت دکھائی۔ صبح سویرے تمھاری بہن کو وہاں سے جا پکڑا اور چٹیا پکڑ کر واپس گھر بھیج دیا۔ یہ تو انھوں نے محلے داری کی لاج رکھ لی، ورنہ اس بابو کے ساتھ ساتھ اسے بھی تھانے بھیج دیتے۔ پولیس والوں سے بھی انھوں نے کہہ دیا کہ اس چوٹی کا باپ شریف آدمی ہے، اسے تھانے کے چکروں میں نہ ڈالیں۔ ورنہ وہ تو تم تینوں کو جیل میں بند کرنا چاہتے تھے۔''

وہ دونوں بہن بھائی یوں خاموش کھڑے تھے جیسے انھوں نے کبھی بولنا سیکھا ہی نہ ہو۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہیں۔

محلے داروں نے ان کے باپ کی میت صحن کے درمیان رکھ دی تھی اور لوگوں کا ایک ریلہ صحن میں آ دھمکا تھا۔

ان سب کی اپنی اپنی بولیاں تھیں۔ سب صبح کے واقعے کو دہرا رہے تھے۔ ہر بار اس واقعے میں نئی تفصیلات کا اضافہ ہو جاتا اور وہ پہلے سے زیادہ سچا لگنے لگتا۔

سنا ہے ان کے باپ نے مرتے وقت صرف یہ کہا تھا کہ کاش آج ساری رات وہ میرے بستر کی پٹی سے لگ کر نہ بیٹھتی تو میں یقین کر لیتا کہ وہ بدکار تھی۔ پھر اس کا دل چلتے چلتے رک گیا۔

اس کی بہن نے یہ سنا تو پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ یہ آنسو رنج کے نہیں، طمانیت کے تھے۔ اسے بہت فخر محسوس ہوا کہ اس کے باپ کو اس کی بے گناہی کا یقین تھا۔

پھر بہت کچھ ہوا۔ ایک اخبار والا آ دھمکا۔ اس نے بغیر اجازت اس کی بہن کی کئی تصویریں بنائیں اور اگلے دن کے مقامی اخبار میں ایک چٹ پٹی کہانی شائع ہوئی۔ اس کہانی میں اس کے بہن کی عشق کی کئی ناگفتنی تفصیلات تھیں، ان کے خاندان کے بارے میں کئی قیاسی داستانیں درج تھیں، ان کے حسب نسب کے متعلق کئی مفروضے قائم کیے گئے تھے۔ یہ پاکستان میں زرد صحافت کی ابتدائی مشقیں تھیں، صحافیوں نے اپنی طاقت کو نیا نیا دریافت کیا تھا اور ابھی صرف مسکینوں پر آزما رہے تھے۔ وہ دونوں ہکا بکا تھے۔ انھیں ذرا بھی معلوم نہ تھا کہ ایسے وقت میں کیا کرتے ہیں۔ وہ اپنی بہن کی پاک بازی کا کیا ثبوت پیش کرتا۔ ان کے باپ کی موت تو الٹا اس واقعے کی تصدیق سمجھی جا رہی تھی۔ جیسے شدید طوفانوں کے دوران پرندے اپنے گھونسلوں میں دبک کر بیٹھ جاتے ہیں وہ بھی چپ چاپ اپنے گھر میں بیٹھے رہتے۔ ان کے پاس تو ایک دوسرے سے کہنے کے لیے بھی کچھ نہ تھا۔

خلقِ خدا ایک افسانے سے جلد ہی اکتا جاتی ہے۔ کچھ عرصہ تک اس کہانی میں رنگ رنگ کی تفصیلات بھری جاتی رہیں پھر آہستہ آہستہ اس قصے میں لوگوں کی دلچسپی کم ہوتی گئی۔ اب وہ کسی ضرورت سے باہر نکلتا تو لوگ اس کی طرف اشارے نہ کرتے بلکہ حسب معمول کام میں لگے رہتے۔ گاہے گاہے دھلائی کے لیے کپڑے بھی آنے لگے۔ اس کی بہن زیادہ تر خاموش ہی رہتی۔ کوئی ضروری بات ہوتی تو کہہ دیتی ورنہ چپ چاپ گھر کے کام کاج میں لگی رہتی اور فارغ ہو جاتی تو کپڑے استری کرتی رہتی۔

باپ کی موت کے بعد سنبھلنے میں انھیں کئی دن لگ گئے تھے۔ یہاں تک کہ ایک دن اس کی بہن عصر کی نماز پڑھ کر آرام کرنے کے لیے بستر پر لیٹی اور پھر نہ اٹھی۔ اسے چار کہاروں نے آ کر اٹھایا اور کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے، اس کے گناہوں کی مغفرت کی سفارشیں کرتے ہوئے خاک میں ملا آئے۔

اسے اس صدمے سے نپٹنا مشکل نہ لگا۔ تنہائی میں ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے جب مزید تنہائی کا امکان معدوم ہو جاتا ہے۔ بے آسرا ہونے سے کہیں مشکل بے آسرا ہونے کا خوف ہے۔ وہ ان دونوں مرحلوں سے گزر آیا تھا۔ اب زندگی اسے ایک جیسی لگتی تھی اور کچھ بھی ایسا نہیں تھا جسے کھو دینے کا خوف اسے بے چین رکھتا۔ کئی دن یوں ہی گزر گئے اور پھر اس کی زندگی میں پروین بیگم کا اضافہ ہو گیا۔ پروین اسی گلی کے ایک مہاجر خاندان کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ دہلی کے نواح کے کسی دیہاتی علاقے سے تعلق رکھتی تھی اور نجانے فسادات کے دوران اس پر کیا بیتی تھی کہ اس کی زبان بند ہو گئی تھی۔

وہ بول نہیں سکتی تھی۔ ایک خاندان نے ترس کھا کر اسے اپنے ہاں پناہ دے رکھی تھی۔ غلام محمد کی تنہائی کو دیکھتے ہوئے اسی خاندان نے کوشش کر کے دونوں کا نکاح پڑھوا دیا۔ دو خاموش یکجا ہو گئے اور اسی خاموشی سے، زندگی کے معمولات میں زیادہ تبدیلی لائے بغیر، وہ نسرین بیگم کا باپ بن گیا۔

مرزا شمیم بیگ کے اس گلی میں آنے سے غلام محمد دھوبی کو پہلی بار ایک دوست ملا تھا۔ دونوں کے درمیان نجانے کیا کیا باتیں ہوا کرتیں۔ ڈیوڑھی میں، صحن کے ایک کونے میں، بازار میں، ریڑھی کے ساتھ کھڑے کھڑے وہ دونوں گھنٹوں باتیں کیا کرتے۔ کبھی کبھی سلیمہ بی بی ان کی باتوں کی طرف کان لگانے کی کوشش کرتی تو ابا اسے جھڑک دیتے۔

رحمانی بھائی البتہ دونوں کے درمیان بڑے اعتماد سے بیٹھے رہتے اور چپ چاپ ان کی باتیں سنتے۔ کبھی کبھی ان کا چہرہ تمتمانے لگتا، آنکھیں بوٹی کی طرح لال ہو جاتیں اور نتھنے پھڑکنے لگتے۔ ایسے میں ابا انھیں زبردستی اندر بھیج دیتے۔ سلیمہ کو اور بھی تجسس ہوتا کہ ایسی کون سی باتیں تھیں جنھیں سن کر رحمانی بھائی کا یہ حال ہو جاتا تھا۔ لیکن جب اسے ان باتوں کی سمجھ آنی شروع ہوئی تو رحمانی بھائی اس کے سوالوں کا جواب دینے کو موجود نہیں تھے۔

جندر

اختر رضا سلیمی

(۵)

آوازوں کے صرف نام رکھے جا سکتے ہیں؛ ان کی کوملتا یا کرختگی کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایک ایسا شخص جس نے زندگی بھر کبھی کوئل کی کوک نہ سنی ہو، صرف اس کے بارے میں کتابوں میں پڑھا ہو، کبھی نہیں جان سکتا کہ اس کی ماہیت کیا ہوتی ہے۔

جن لوگوں نے گھومتا جندر دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ جب گھومتے پاٹوں کے اوپر لٹکی نالی سے پاٹوں کے سوراخ میں دانے گر رہے ہوتے ہیں تو اس کی گونج میں ایک خمار بھری سرشاری ہوتی ہے۔ چوں کہ یہ سرشاری صرف محسوس کی جا سکتی ہے ____ اسے بیان نہیں کیا جا سکتا ____ اس لیے اگر آپ نے کبھی جندر کے گھومتے ہوئے پاٹ نہیں دیکھے تو اس گونج کی سرشاری سے کبھی آشنا نہیں ہو سکتے؛ اور نہ درد بھری اس کوک کے بارے میں جان سکتے ہیں جو اس وقت سننے کو ملتی ہے جب جندر کا کھارا خالی ہوتا ہے اور اسے اس کا دانہ پانی نہیں مل رہا ہوتا۔ جوں ہی نالی کے ساتھ لٹکا لکڑی کا ٹکڑا، جو نالی کو تھرتھراہٹ پیدا کرنے کی غرض سے (تا کہ اس کی تھرتھراہٹ سے نالی ہلتی رہے اور دانے نیچے گرتے رہیں) گھومتے پاٹ کے اوپر رکھا ہوتا ہے، اوپر اٹھایا جاتا ہے، یہ خمار بھری گونج، یک دم درد اور یاسیت بھری کوک میں تبدیل ہو جاتی ہے اور کچھ روز مسلسل سننے کے بعد یہ وجود کی گہرائیوں سے اُٹھی ہوئی ہوک معلوم ہونے لگتی ہے۔

میں کہ ساری زندگی جندر کی خمار بھری سریلی گونج سننے کا عادی رہا، گزشتہ پینتالیس دنوں سے، روح تک کے بخیے ادھیڑ دینے والی، اس کی یہ دکھ بھری کوک سن رہا ہوں اور اب یہ مجھے جندر کے پاٹوں کے درمیان سے نہیں اپنے معدوم ہوتے وجود کی گہرائیوں سے اٹھتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ یہ کوک اتنی شدید ہے کہ، میرا گوشت؛ جو کچھ دن پہلے تک، میری ہڈیوں پر یوں کسا ہوا تھا کہ ستر سال کا ہونے کے باوجود، سوائے ماتھے کے میرے چہرے پر ایک شکن بھی نہیں ابھری تھی ؛اس کی شدت نے ان چند ہی دنوں میں اسے ہڈیوں سے علاحدہ کر کے رکھ دیا ہے؛ اور میں جو پینتالیس دن پہلے تک، پینتالیس پچاس سال کا اُدھیڑ عمر آدمی لگتا تھا؛ صرف پینتالیس دنوں میں، نوے برس کا انتہائی نحیف و نزار بوڑھا لگنے لگا ہوں؛ اور گزشتہ تین دنوں سے اس میں اتنی تیزی آ گئی ہے کہ اب تو جندر کے گھومتے پاٹ کے ہر چکر پر میں گوشت کے ریشوں کو ہڈیوں سے علاحدہ ہوتے ہوئے باقاعدہ محسوس بھی کر سکتا ہوں۔

مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ میں نے گھومتے جندر کی سریلی گونج پہلی دفعہ کب سنی۔ میرے باپ کے بقول جب مجھے پہلی بار یہاں لایا گیا تھا اس وقت میری عمر تین سال کے لگ بھگ تھی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میں یہ گونج اس سے پہلے بھی کہیں سن چکا تھا؛ شاید ماں کے پیٹ میں۔

مجھے یقین ہے کہ جب میں اپنے باپ کی پشت سے ماں کے رحم میں منتقل ہوا اور اس کا پاؤں بھاری پڑا تو زچگی سے پہلے کے ایک دو ماہ کو چھوڑ کر وہ میرے باپ کو کھانا دینے یہاں آتی رہی ہو گی اور میرے کان، جو ابھی اپنی تشکیل کے ابتدائی مرحلے میں ہوں گے، یہ سریلی گونج محسوس کرتے رہے ہوں گے۔ اگرچہ میرے باپ نے کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا ___ گو کہ وہ؛ ہر وہ بات جس کا تعلق میری ماں سے ہو پوری جزیات کے ساتھ مجھے بتا دیا کرتا تھا ___ لیکن پھر

بھی مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور آتی رہی ہوگی اور یہاں میرے سامنے والے تھلے پر بیٹھ کر میرے باپ کو کھانا کھاتے دیکھتی اور جندر کی سریلی گونج سے لطف اندوز ہوتی رہی ہوگی۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ جب میرا باپ آہستہ آہستہ چبا چبا کر کھانا کھار ہا ہوتا ہوگا ________ کہ میں نے ہمیشہ اسے اسی طرح کھانا کھاتے دیکھا ______ تو وہ نیچے کھائی میں اتر کر جندر کے پاٹوں کے آگے جمع شدہ گرم گرم آٹا بھی بوریوں میں ڈالتی رہی ہوگی کہ میں نے بچپن سے لے کر بڑھاپے تک، بوریوں میں آٹا ڈالتے ہوئے، سینکڑوں مرتبہ اس کا لمس محسوس کیا۔ یہاں تک کہ پینتالیس دن پہلے؛ اس وقت بھی جب میں آخری چونگ پیس کر پسا ہوا آٹا بوری میں ڈال رہا تھا، موت کے ساتھ ساتھ، میں نے اس کا ہاتھ بھی اپنے شانے پر محسوس کیا تھا اور تب یہ کسی بھی لمحے میرے شانے سے جدا نہیں ہوا۔ حالاں کہ میرے باپ کے بقول میری پہلی سانس اس کی آخری ہچکی ثابت ہوئی تھی۔

(۶)

''شادی کے پانچ سال تک ہمارے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔'' میرے باپ نے مجھے بتایا تھا۔'' جب ہماری شادی کو دو سال گزر چکے اور تمھاری دادی کو پوتے پوتی کی خوش خبری نہ مل سکی تو اس نے میری دوسری شادی کرانے کی کوششوں کا آغاز کر دیا۔ چوں کہ ہمارا جندر بارہ مہینے چلتا تھا اور میں دن رات اس پر محنت کرتا تھا اس لیے گاؤں میں ہماری زرعی زمین بہت کم ہونے کے باوجود بھی ہمارے مالی حالات دوسروں سے اچھے تھے۔ مالی حالات کی بہتری کی وجہ سے کئی لوگ دوسری شادی کے لیے بھی مجھے رشتہ دینے پر رضا مند تھے کہ بھوک اور افلاس کی کثرت کے باعث زیادہ تر والدین، رشتہ طے کرتے ہوئے صرف یہ دیکھتے تھے کہ ان کی بیٹی کو کہاں بہتر نان ونفقہ ملے گا۔ ایک آدھ رشتہ تو ایسا بھی آیا کہ میرا دل للچا اٹھا اور میں نے دل ہی دل میں دوسری شادی کا ارادہ باندھ لیا؛ اگر چہ میں نے ابھی رضا مندی کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن تمھاری ماں، جو میرے دل میں پیدا ہونے والے خیالات سے بھی آگاہ ہو جایا کرتی تھی، فوراً بھانپ گئی اور اس کا چہرہ یک دم اتر گیا۔ میں نے اک نظر اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور اگلے ہی لمحے انکار کا فیصلہ کر لیا۔ اگلے دو روز ہم دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں نہیں دیکھا؛ میں نے شرمندگی کی وجہ سے اور اس نے دکھ کی وجہ سے۔ تیسرے روز جوں ہی اس نے میری آنکھوں میں دیکھا، اس کے چہرے پر دوبارہ رونق ابھر آئی شاید میرے بتائے بغیر ہی اس نے میری آنکھوں ہی سے جان لیا تھا کہ میں اپنے ارادے سے باز آچکا ہوں۔

ادھر میری ماں کا اصرار جاری رہا۔ جب بھی ہم گھر میں بیٹھتے؛ موضوع چاہے جندر کے پاٹ کی تبدیلی ہو، فصل کی کٹائی یا بوائی ہو، یا گابھن گائے کی زچگی؛ ماں کی تان آکر میری دوسری شادی پر ہی ٹوٹتی تھی۔ جب میری ماں کا اصرار حد سے بڑھنے لگا تو تمھاری ماں کے دل میں ایک خوف سا بیٹھ گیا تھا کہ اماں اس پر سوتن لا کر ہی چھوڑے گی۔ اس خوف نے اس کے شاداب چہرے پر اپنی پیلاہٹ بکھیرنا شروع کر دی۔ جوں جوں میری ماں کا اصرار بڑھتا گیا، تمھاری ماں کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔ یہاں تک کہ اس کا شاداب چہرہ کا ہو کے زرد پتے کی طرح ہو گیا اور اس کے چہرے کی طرف دیکھنا میرے لیے ناممکن ہو گیا۔ مجھے حیرت تو اس وقت ہوئی جب کچھ ہی عرصے بعد یک دم اس نے بھی میری دوسری شادی پر اصرار کرنا شروع کر دیا۔

'میں چاہتی ہوں ہماری اولاد ہو؛ اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب تم دوسری شادی کرو۔' اس نے دلیل گھڑی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ یہ الفاظ، جو اس کے منہ سے ادا ہو رہے ہیں، اس کے نہیں

،میری ماں کے بین۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ بادل نخواستہ ہی مجھے دوسری شادی کی اجازت دے رہی ہے؛ لمحہ بھر کے لیے اسی لڑکی کا چہرہ میرے ذہن میں لہرایا تھا، جس کا رشتہ آتے ہی میرے دل میں پہلی مرتبہ دوسری شادی کا خیال آیا تھا۔ اس لڑکی کے چہرے کو ذہن میں ٹھہرا کر میں نے دوبارہ تمھاری ماں کی آنکھوں میں جھانکا تو مجھے لگا کہ اگر میں نے ایسا کیا تو وہ مر جائے گی اور پھر اگلے ہی لمحے میں نے عمر بھر کے لیے دوسری شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور آج تک اس فیصلے پر قائم ہوں۔

وقت گزرتا رہا، ماں کا اصرار، میرے انکار کی وجہ سے آہستہ آہستہ دھیما پڑتا گیا اور پھر ہماری شادی کے پانچویں سال ایک معجزہ رونما ہو گیا؛ تم اس کی کوکھ میں اتر آئے اور اس کا چہرہ یک دم پھر سے کھل اٹھا۔

'وہ آ گیا ہے۔' ایک دن اس نے کھنکھناتی ہوئی آواز میں مجھے بتایا تھا۔ میں نے اس کی آواز میں خوشی کی کھنکھناہٹ تو محسوس کی تھی لیکن میں ٹھیک سے سمجھ نہیں پایا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی ہے۔ پھر جب اس نے شرماتے ہوئے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کیا تھا تو مجھ پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ تمھیں شاید یہ بات بری لگے مگر سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے تمھارے پیدا ہونے سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ اب اماں میری دوسری شادی پر اصرار نہیں کرے گی اور تمھاری ماں کو سوتن کا دکھ نہیں سہنا پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ خبر میں نے سب سے پہلے اپنی اماں تک پہنچائی تھی؛ اسے تو یقین ہی نہیں آیا تھا۔ یقین آتا بھی کیسے وہ تو میری شادی کے دوسرے ہی سال سے تمھاری ماں کو بانجھ سمجھنا شروع ہو گئی تھی۔

ارمان خان! یہ جو تمھارا نام ہے ناں؛ اسی کا تجویز کردہ ہے اور تم یقین نہیں کرو گے کہ یہ نام اس نے اسی دن تجویز کر لیا تھا، جس دن اسے پتا چلا تھا کہ تم اس کی کوکھ میں اتر آئے ہو۔

''اگر بیٹی ہوئی تو؟'' میں نے فوراً جرح کی تھی۔ ''نہیں بیٹا ہی ہوگا۔'' اس نے کہا تھا۔ ''میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں۔ میں تمھیں اس کے خدوخال تک بتا سکتی ہوں۔'' اس کے لہجے میں ایسا اعتماد تھا کہ اگلے ہی لمحے مجھے بھی کچھ کچھ یقین سا ہو گیا تھا لیکن ویسا نہیں جیسا تمھاری ماں کو تھا؛ وہ اس حوالے سے عین الیقین کے درجے پر تھی۔

تمھاری پیدائش سے کوئی مہینہ بھر پہلے اس نے مجھے کہا تھا کہ بازار جا کر کپڑا لے آؤ تاکہ میں بچے کے جوڑے سی سکوں۔ میں بازار گیا تو احتیاطاً زنانہ کپڑا بھی لے آیا تھا تاکہ اگر لڑکی پیدا ہو تو وقتی طور پر کوئی پریشانی نہ اٹھانا پڑے۔

'لڑکی کے کپڑے کیوں لے آئے ہو؟' اس نے میرے ہاتھ میں زنانہ کپڑے دیکھتے ہی کہا تھا۔ اس کے لہجے میں سخت برہمی اور غصہ تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی دفعہ اسے اتنے غصے میں دیکھا تھا۔ اس نے پھول دار زنانہ کپڑے، میرے ہاتھ سے لے کر زمین پر پٹخ دیے تھے اور مردانہ کپڑا سینے سے لگا لیا تھا جو اگلے دو دنوں میں تمھارے ننھے منے جوڑوں کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

اگرچہ تم ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے لیکن اس نے مجھے تمھارے خدوخال تک بتا دیے تھے یہاں تک کہ تمھارے گال پر موجود اس تل کے بارے میں بھی، جو مجھے ہمیشہ اس کی یاد دلاتا ہے۔ 'میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ہمارا بیٹا گورا چٹا اور گول مٹول ہے اور اس کے گال پر ویسا ہی تل ہے جیسا میرے گال پر ہے۔' اس نے کہا تھا؛ اور جب تم پیدا ہوئے تو تم بالکل ویسے ہی تھے جیسا اس نے بتایا تھا۔ لیکن وہ تجھے نہ دیکھ سکی۔ تمھاری دائی نے مجھے بتایا تھا کہ جیسے ہی تم نے پہلی سانس لی، اس کی سانس تھم گئی تھی۔ میں حیران ہوں کہ تمھارے گال پر موجود تل تک کے بارے میں بتا دینے والی اپنی موت کے بارے میں مجھے کیوں نہ بتا سکی۔

مرنے کے بعد اس کا چہرہ کیسا تھا؟ شاداب یا پیلاہٹ زدہ۔ مجھے کچھ پتا نہیں کہ میں اُس کا آخری دیدار نہیں کر

سکا تھا۔ جب اسے کفنا کر صحن میں دیدار عام کے لیے لایا گیا تھا میرا بہت جی چاہ رہا تھا کہ میں اسے دیکھوں کہ مرنے کے بعد اس کا چہرہ کیسا ہے مگر یہ کہہ کر مجھے اس کا چہرہ دیکھنے سے روک دیا گیا تھا کہ وہ اب میرے لیے غیر محرم ہو چکی ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ مرنے کے بعد بھی اس کے چہرے پر وہ شادابی رہی ہو گی جو تمھارے اس کے کوکھ میں اترنے سے تمھاری پیدائش تک اس کے چہرے پر متواتر رہی تھی۔ نو مہینے کی یہ شادابی کم از کم نو دن تو قبر میں بھی اس کے چہرے پر رہی ہو گی۔

دو ماہ کم تین سال تک تجھے تیری دادی نے پالا۔ جب وہ چل بسی تو میں تجھے اپنے ساتھ جندر پر لے آیا تھا۔ تم نے پہلی دفعہ جندر کے گھومتے پاٹ دیکھے تو بہت خوش ہوئے تھے؛ اتنے خوش کہ اس کے بعد میں نے آج تک تجھے اتنا خوش نہیں دیکھا۔'' میرے باپ نے مجھے بتایا تھا۔

(۷)

مجھے یقین ہے کہ میں نے دو ماہ کم تین سال کی عمر میں جب پہلی دفعہ گھومتے جندر کا نظارا کیا ہوگا، اس کا کھارا دانوں سے لبالب بھرا ہوگا اور اس کی گونج میں وہی سرشاری ہوگی جس کا میں ساری زندگی اسیر رہا اور اب جسے ترس رہا ہوں۔ تبھی تو میں، بقول اپنے باپ کے، خوش ہوا تھا ورنہ مجھے اس کی آواز کبھی خوش نہ آتی؛ بل کہ ویسی ہی لگتی جیسی اب لگ رہی ہے: کرب آمیز، تلخ اور کرخت؛ اور میں بجائے خوش ہونے کے رو پڑتا۔ مجھے یقین ہے یہ وہی اولین سرشاری تھی جس نے مجھے ساری زندگی جندر کے گھومتے پاٹوں سے باندھے رکھا۔

میری زندگی کی پہلی یاد اس بکری کے دو سینگوں سے جڑی ہوئی ہے جسے میری ماں نے اپنی موت سے کوئی چھ مہینے پہلے خریدا تھا اور دادی کی وفات کے بعد جب میرے باپ نے مجھے جندر پر ساتھ لے آنے کا منصوبہ بنایا تو اسے بھی ساتھ لے آیا کہ اب گھر میں اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ جندر پر آنے کے بعد بکری نے دو بکروٹے دیے۔ جنھوں نے میری تنہائی کو ایک حد تک کم کر دیا۔ بکری صحن میں موجود، کاہو کا درخت، جو، ان دنوں میرے باپ کی طرح جوان تھا، کے ساتھ بندھی رہتی جب کہ اس کے بکروٹے صحن میں گھومتے رہتے اور میں سارا دن ان کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ بکری کے تھنوں پر ہر وقت ایک تھیلی سی چڑھی رہتی تا کہ بکروٹے میرے حصے کا بھی دودھ نہ پی جائیں۔ ایک دن میں بکروٹوں کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ بکری نے مجھے اپنے سینگوں پر اٹھا کر پٹخ دیا۔ میرے باپ نے، جو غالباً اس وقت آٹا سمیٹنے والی کوچی لے کر جندر کی کھائی میں اترا ہوا تھا، جب میرے رونے کی آواز سنی تو بھاگتا ہوا آیا اور مجھے اٹھانے سے پہلے بکری پر پل پڑا۔ یہ پہلا اور آخری موقع تھا جب میں نے اسے غصے میں دیکھا۔ اس کے بعد وہ کئی دنوں تک بکری کو سہلاتا اور پیار کرتا رہا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب کچھ عرصے بعد یہی بکری تھلے پر چڑھنے کی کوشش میں گلے میں پڑی رسی سے لٹک کر مر گئی اور میں سہمے ہوئے انداز میں مری ہوئی بکری کو دیکھ رہا تھا تو میرا باپ مجھے سینے سے لگا کر بہت دیر تک روتا رہا۔ شاید اسے میری ماں کی سونپی ہوئی نشانی پر اتارا گیا غصہ یاد آ گیا تھا، ورنہ عام حالات میں، میں نے اسے کبھی روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ بابا جمال دین نے تو مجھے یہاں تک بتایا تھا کہ وہ میری ماں کے مرنے پر بھی بالکل نہیں رویا تھا الٹا دوسرے رونے والوں کو دلاسے دیتا پھرتا رہا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر تیرا باپ اس دن جی بھر کر رو لیتا تو جوانی میں نہ مرتا۔

میری ماں کی موت کے بعد اس نے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ تاہم جب تک وہ زندہ رہا، اس نے میرا ہر طرح سے خیال رکھا۔ میں نے اسے ہمیشہ ایک خاموش طبع، اپنے آپ میں گم اور اپنے کام سے کام رکھنے والا شخص پایا۔ وہ

سوائے بابا جمال دین کے کسی سے کم ہی بات چیت کرتا تھا۔ اگر بابا جمال دین اسے نہ کہتا تو شاید مجھے سکول میں داخل کرانے کا بھی اسے خیال نہ آتا۔

مجھے سکول میں داخل کرانے کی طرف اس کی توجہ بے شک بابا جمال دین ہی نے دلائی تھی تاہم اس کے لاشعور میں کہیں نہ کہیں یہ خواہش موجود تھی کہ میں پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنوں۔ اس کا اندازہ مجھے اس کے اس رویے سے ہوا جو اس نے سکول کے سلسلے میں مجھ سے روا رکھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پانچ سال کی عمر میں جب مجھے اسکول میں داخل کرا یا گیا، جو یہاں سے کچھ ہی فاصلے پر ایک خستہ عمارت میں اب بھی موجود ہے، تو وہ ایک سال تک خود مجھے سکول لے جانے اور واپس لانے کی ذمہ داری نبھاتا رہا۔ حالاں کہ سرکاری سڑک بننے سے پہلے جندر کے پچھواڑے سے گزرنے والا یہ راستہ جو آج کل خاصا ویران ہے اور جس میں جھاڑیاں سی اُگ آئی ہیں، خاصا آباد ہوا کرتا تھا اور اس پر ہر وقت لوگوں کی آمد ورفت لگی رہتی تھی۔ میرے بیشتر ہم جماعت بھی یہیں سے گزر کر سکول جاتے تھے جو عموماً میرے ہی ہم عمر تھے لیکن وہ مجھے ان کے ساتھ بھیجنے سے گریز کرتا۔ سال بعد جب میری پکی جماعت میں ترقی ہوئی تو بابا جمال دین ہی کے کہنے پر اس نے مجھے وہاں سے گزرنے والے دوسرے بچوں کے ساتھ سکول بھیجنا شروع کیا۔ شروع شروع میں وہ میرا یونیفارم اور بستہ ایک تھیلے میں بند کر کے رکھتا تا کہ وہ آٹے سے اٹھنے والی دھول سے محفوظ رہیں۔ پھر اس نے جندر کے کمرے کے ساتھ ایک پسار بھی ڈال دیا جس کا مصرف صرف میرا یونیفارم اور بستہ لٹکانا تھا۔

میں صبح سویرے اٹھتا، جندر کے پچھواڑے جا کر کٹھے میں ہاتھ منہ دھوتا؛ واپس آ کر ناشتہ کرتا اور سکول چلا جاتا۔ واپس آتا تو میرا باپ کھانا تیار کر رہا ہوتا، میری یادداشت میں کوئی بھی ایسا دن محفوظ نہیں، جس میں اس نے میری واپسی سے پہلے کھانا کھایا ہو۔ ہم ہمیشہ اکٹھے کھانا کھاتے۔ میں کھانا کھا کر، ندی کے کنارے گھروندوں سے کھیلتا رہتا یا پھر جندر کے صحن میں موجود کاہو کے ڈالے سے بندھی پینگ میں ہلارے لیتا رہتا۔ کبھی کبھار میں ندی کے کنارے چلتا چلتا اس بند تک چلا جاتا جہاں سے پانی موڑ کر ایک کٹھے کی صورت جندر کے کمرے تک لایا گیا ہے۔

سکول کا کام میں ہمیشہ، شام کے وقت، جندر کی کھائی کے کنارے بیٹھ کر کرتا۔ پہلی دفعہ میں نے وہاں بیٹھ کر پڑھنا کب شروع کیا، میرے حافظے کے شکستہ آئینے میں اس کا کوئی عکس محفوظ نہیں؛ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ کسی دوسری جگہ بیٹھ کر پڑھنے سے پڑھائی میں میرا دل نہیں لگتا تھا یہاں تک کہ سکول میں بھی۔ اگر چونگ نہ ہونے یا کسی اور وجہ سے پاٹ رکے ہوتے تو مجھے اپنا دماغ گھومتا ہوا محسوس ہوتا اور سبق یاد کرنے میں دشواری ہوتی۔ یہ بات میں نے کبھی اپنے باپ کو نہیں بتائی؛ اور بتاتا بھی تو شاید وہ اس پر زیادہ توجہ نہ دیتا اور سرسری گزر جاتا۔ ویسے بھی میں کیا کرتا ہوں کیا سوچتا ہوں، اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی۔ بس وہ مجھے ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں اس سے کہہ دیتا کہ میرا اسکول جانے کو جی نہیں چاہتا تو وہ اپنی لاشعوری خواہش کے برعکس، میری خوشی کا خیال رکھتے ہوئے مجھے سکول سے ہٹا دیتا۔

جب میری ماں مری تو وہ بالکل جوان تھا لیکن اس نے دوسری شادی نہیں کی اس کی ایک وجہ وہ وعدہ بھی ہو سکتی ہے، جو اس نے اپنے آپ سے کیا تھا مگر میں جانتا ہوں کہ اس کے شادی نہ کرنے کی ایک اہم وجہ میں بھی تھا کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی دوسری بیوی میرے ساتھ سوتیلی ماؤں والا سلوک کرے۔ حالاں کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر سوتیلی ماں اپنے سوتیلے بچوں سے سوتیلی ماؤں والا ہی سلوک کرے لیکن اس کے دل میں یہ ڈر بیٹھ گیا تھا: ویسا ہی ڈر جیسا میری ماں کے دل میں اس وقت بیٹھا تھا جب میری دادی میرے باپ کی دوسری شادی کرانے پر اصرار کر رہی تھی۔

اگرچہ جب تک وہ زندہ رہا میں اس کے ساتھ رہا لیکن مجھے معلوم ہے کہ میں اس کی تنہائی بانٹنے میں ناکام رہا۔ وہ تنہائی جو میری ماں مرتے وقت اسے سونپ گئی تھی۔ اس نے میری ماں کی سونپی ہوئی تنہائی کو ہمیشہ سینے سے لگا کر رکھا اور اس میں کسی کو بھی مخل نہیں ہونے دیا؛ یہاں تک کہ مجھے بھی؛ جسے وہ بہت عزیز رکھتا تھا۔ میں آج تک اس بات کا فیصلہ نہیں کر پایا کہ وہ مجھے زیادہ عزیز رکھتا تھا یا میری ماں کی سونپی ہوئی تنہائی کو۔ شاید اس نے ان دونوں کے درمیان کوئی نامعلوم توازن دریافت کر کے ایک لکیر کھینچ لی تھی۔ اس لکیر کے ایک طرف میں تھا اور دوسری طرف وہ تنہائی جو اسے اس کی بیوی یعنی میری ماں نے سونپی تھی۔

وہ لوگوں سے بہت کم بات چیت کرتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم وہ شروع ہی سے ایسا تھا یا میری ماں کے مرنے کے بعد اسے چپ لگ گئی تھی؛ بہر حال میں نے جب سے ہوش سنبھالا اسے ایسا ہی پایا تھا۔ غلہ لے کر آنے والوں سے وہ چند رٹے رٹائے جملے ہی بولتا تھا مثلاً؛ گھر میں سب خیریت ہے ناں؛ آج کل چونگوں کا رش ہے ترسوں آنا؛ یا چونگ یہاں نہ اتارو، اندر فلاں رنگ کی بوری کے اوپر رکھ دو وغیرہ وغیرہ۔ اور دوسرے لوگ بھی اس سے زیادہ بات چیت نہیں کرتے تھے شاید سال ہا سال کے تعلق کی وجہ سے وہ اس کی کم گوئی سے واقف تھے۔ البتہ وہ مجھ سے پوری توجہ سے بات کرتا تھا۔ راتوں کو وہ زیادہ تر مجھے وہ قصے کہانیاں سناتا تھا جو اس نے بابا جمال دین سے سن رکھے تھے تاکہ میرا دل لگا رہے۔ اس وقت تو مجھے اتنی سمجھ نہیں تھی لیکن اب جب میں ان واقعات پر غور کرتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں تنہائی کا وہ روگ جسے اس نے حرزِ جاں بنالیا تھا میری بھی روح میں سرایت نہ کر جائے۔ قصے کہانیوں کے علاوہ وہ اپنی نوجوانی کے قصے بھی سناتا تھا لیکن ان قصوں میں سے اسی فی صد میں مرکزی کردار میری ماں ہی ہوتی تھی اور ہر قصے میں اس کا کردار ہمیشہ ہیروئن ہی کا تھا۔ اس نے ان قصوں کے ذریعے مجھے میری ماں کے بارے میں اتنا کچھ بتا دیا تھا کہ باوجود اس کے کہ وہ میرے پیدا ہوتے ہی مر گئی تھی، مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں نے اس کے ساتھ کئی جنم گزار رکھے ہیں۔ یہ قصے رفتہ رفتہ میرے خوابوں کا حصہ بنتے گئے۔ میں نے کئی بار اپنی ماں کو خواب میں دیکھا؛ وہ ہو بہو ویسی ہی تھی جیسی میرے باپ نے اپنے نوجوانی کے قصوں میں مجھے دکھائی تھی۔ ابھی کچھ دن پہلے میں نے خواب میں دیکھا کہ وہ میرا انتظار کر رہی ہے۔

جیسا کہ میں نے بتایا کہ میرا باپ تنہائی پسند ہونے کے باوجود مجھے پوری توجہ دیتا تھا لیکن ایک بات جو بہت دیر بعد، جب اس کی ہڈیاں بھی گل سڑ چکی ہوں گی، میری سمجھ آئی کہ اس نے مجھے کبھی اس تنہائی میں شریک نہیں کیا جو اسے میری ماں نے سونپی تھی۔ وہ اسے تنہا ہی جھیلتا رہا، مجھ پر اس کا سایہ تک نہیں پڑنے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ میرے ساتھ بظاہر خوش خوش رہنے والا اندر سے جنگلی انار کے پرانے درخت کی طرح کھوکھلا ہو چکا تھا لیکن آخری وقت تک نہ صرف اپنی جڑوں پر قائم رہا بلکہ پھل بھی بدستور دیتا رہا۔

مجھے اب بھی یاد ہے کہ اس منحوس دن سے ایک رات پہلے، جب میں نے سکول سے واپسی پر اسے جندر کی کھائی میں مردہ حالت میں پایا تھا؛ وہ ساری رات نہیں سو سکا تھا شاید میری ماں کے برعکس، میری طرح اسے بھی اپنی موت کا پہلے ہی پتہ چل گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس رات؛ میں نے نیم خوابی کی حالت میں اس کی انگلیوں کا لمس کئی بار اپنے بالوں میں محسوس کیا تھا اور اس کے بوسے کا لمس میں اب بھی؛ اس لمحے بھی، اپنے ماتھے پر محسوس کر رہا ہوں؛ اور اس کی آنکھ سے گرا ہوا آنسو تو، باون چون سال گزر جانے کے باوجود، اب بھی میرے گال کو جھلسا رہا ہے۔ مجھے اب بھی یوں محسوس ہو رہا ہے کہ میرے گال پر جہاں اس کا آنسو گرا تھا، ایک چھالا سا بنا ہوا ہے۔ میں ساری زندگی اس چھالے کو پھوڑنے کی کوشش کرتا رہا

لیکن ناکام رہا اور اب جب کہ میں جندر کی کھائی کے تھلے پر لیٹا دھیرے دھیرے موت کی کھائی میں اتر رہا ہوں اس کی جلن بدستور محسوس کر رہا ہوں اور لگتا ہے یہ جلن میری موت کے بعد جسم سے نکل کر میری روح میں اتر جائے گی اور امر ہو جائے :امر ربی کی طرح۔ مرنے کے بعد اگر میں جنت میں گیا تو بھی یقیناً اسے ساتھ ہی لے کر جاؤں گا۔

اس روز جب میں سویرے اٹھا تو مجھے یہ تمام واقعات خواب جیسے لگے؛ ان کی حقیقت تو مجھ پر اس وقت کھلی جب میں سکول سے واپس آیا اور اسے مردہ حالت میں پایا۔

اُس صبح میں بول براز کر نے اور کھٹے پر ہاتھ منہ دھونے کے بعد واپس آیا تو میرا باپ حسب معمول میرا ناشتہ تیار کر چکا تھا۔ جب وہ میرے ساتھ ناشتہ کرنے بیٹھا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ زبردستی کھا رہا ہے۔ نوالہ نگلنے میں اسے خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ لیکن وہ ناشتہ کرنے کی اداکاری کرتا رہا اس خوف سے کہ اگر اس نے ہاتھ کھینچ لیا تو کہیں میں بھی بغیر سیر ہوئے اسکول نہ چلا جاؤں۔ میں نے بستہ اٹھاتے ہوئے ایک نظر اُس کے چہرے پر ڈالی تو وہ مجھے کچھ بدلا بدلا سا لگا۔ لیکن پندرہ سولہ سال کا ایک ایسا لڑکا جس نے ساری زندگی ندی کنارے ایک جندر میں گزاری ہو، اس بات کا اندازہ کیسے کر پاتا کہ جب وہ واپس آئے گا تو یہ تنہائی کا مارا چلتا پھرتا لاشہ جندر کی کھائی میں بے حس وحرکت اوندھا پڑا ہوگا۔

سکول سے واپسی پر جب میں جندر کے پچھواڑے سے اتر رہا تھا تو مجھے خالی گھومتے پاٹوں کی کوک سنائی دی۔ لمحہ بھر کے لیے میں نے سوچا کہ ہو نہ ہو آج بابا کی آنکھ لگ گئی ہے اور وہ اگلی چونگ کھارے میں الٹا نہیں پایا تبھی جندر خالی گھوم رہا ہے۔ جب میں دروازے پر پہنچا اور کھائی میں جھانک کر دیکھا تو وہ کھائی میں اوندھا پڑا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں خالی بوری تھی؛ دونوں کا منہ کھلا ہوا تھا بوری کا بھی اور میرے باپ کا بھی۔ اس کا نصف سے زائد چہرہ آٹے میں کھبا ہوا تھا اور آٹے پر ایک سرخ سا دھبا تھا یہ یقیناً خون نہیں تھا؛ تنہائی تھی، جو اس نے جاتے جاتے اگل دی تھی شاید اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ مرتے ہی اپنی بیوی سے جا ملے گا لہٰذا اب اسے ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے جب اسے سیدھا کیا تو میری سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ میں کافی دیر وہیں کھائی کے کنارے سے ٹیک لگائے، اس کے چہرے پر نظر جمائے کھڑا، جندر کی کُوک سنتا رہا؛ جو آہستہ آہستہ ہُوک میں بدل رہی تھی۔ تب سے یہ مجھے جندر کے بجائے اپنے وجود کی گہرائیوں سے اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے؛ جیسے اب محسوس ہو رہی ہے۔

اچانک مجھے جندر بند کرنے کا خیال آیا اور میں نے کمرے کے پچھواڑے جا کر پانی موڑا۔ واپس آ کر اس کی اکڑی ہوئی لاش اٹھا کر کھائی سے باہر نکال کر اس چارپائی پر ڈالی جس پر وہ سویا کرتا تھا۔ جب میں نے اس کے منہ پر چادر ڈالی تو مجھے لگا جیسے وہ مرا نہیں، سو رہا ہے اور یہ شک اس وقت تک قائم رہا جب تک میں اس کے منہ پر سے چادر اٹھا کر اس کی کھلی آنکھوں میں نہ جھانک چکا۔ میں نے جب غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو وہاں سے تنہائی غائب تھی؛ میری ماں کی سونپی ہوئی تنہائی۔ اگلے ہی لمحے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مر چکا ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں بالکل نہیں رویا۔ میں جلدی جلدی اٹھا دروازہ بند کیا اور اپنے چچا کو بتانے گاؤں چلا گیا۔ چچا نے اپنے بھائی کی موت کا سن کر جب مجھے گلے لگایا تو تب میری آنکھوں سے پہلا آنسو امڈا اور جب وہ اس نادیدہ چھالے سے ٹکرایا، جو گزشتہ رات میرے باپ کی آنکھ سے گرنے والے آنسو سے میرے گال پر بنا تھا، تو اس کی جلن میں نے روح کی گہرائیوں تک محسوس کی اور میں دھاڑیں مار کر رونے لگا۔

☆☆☆☆
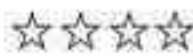
لگا رہا ہوں مضامینِ نَو کے پھر انبار

(تنقید و تحقیق)

ادیب، قاری، کتاب اور درس گاہ

ڈاکٹر انوار احمد

نئی تنقید نے مصنف کی موت کا اعلان کر کے بظاہر زبان یا متن کو بنیادی اہمیت دی اور متن کی توضیح یا تشریح کے منصب سے اس کے خالق کو یکسر معزول کر کے قاری کو ایسی اہمیت دی کہ اس تنقید کو ہی اساس تنقید کہا جانے لگا، اسی لیے انتظار حسین نے سجاد ظہیر کی اپنے ناولٹ سے متعلق رائے کو اسی مقبول نظریئے کے تحت یہ کہہ کر مسترد کیا، اچھا شعر، اچھا افسانہ، اچھا ناول تخلیق ہونے کے بعد اپنے خالق کی گرفت سے آزاد ہو جاتے ہیں، پھر وہ اپنے مفسر آپ ہوتے ہیں، مصنف کی تعبیر و توجیہہ کو قبول نہیں کرتے۔ (۱) حالانکہ مکرِ شاعرانہ کی طرح یہ بھی مکرِ ناقدانہ ہے کہ قاری کے نام پر دراصل نقاد نے متن کی توضیح اور تشریح کے تمام فرائض سنبھال لیے ہیں اور دنیائے تخلیق سے تخلیق کار کو تقریباً بے دخل کر دیا ہے حالانکہ تخلیق اور تخلیق کار کے بغیر تنقید کے سبھی مباحث لایعنی ہیں۔ تخلیقی عمل کسی معاشرے میں جہاں تازہ خیالات کو محسوس کرنا سکھاتا ہے وہاں انفرادی اور اجتماعی زندگی کو توازن اور ترتیب کے خواب یا امید سے ہمکنار کر کے جینے کا جواز فراہم کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ تخلیق کا بنیادی محرک اپنے تجربے، احساس اور فکر میں اپنے حقیقی یا تخیلی ہمزاد کو شریک کرنا ہے اور یہی ہمزاد اس کا پہلا قاری ہے جس کا دائرہ جتنا پھیلے اور اس شرکت کی حد جس قدر وسیع ہو ادیب کو اتنی ہی جمالیاتی مسرت ملتی ہے۔ کم و بیش دو ہزار سال پہلے لان جائنس نے ترفع یا علویت کی پہچان ہی یہ بتائی تھی کہ یہ وہ آگ ہے جو دونوں سروں پر روشن ہوتی ہے یعنی مسرت بھری آگہی یا آگہی سے لبریز مسرت تخلیق کار پر تو طاری ہوتی ہی ہے اسی کے قاری پر بھی ہونی چاہیے۔ سارتر نے اپنے مضمون 'اپنے عہد کے لیے لکھنا' میں کہا تھا:

> ''اس کی تصنیف پڑھ کر جب تک لوگوں کو غصہ آئے گا، بے چینی ہوگی، شرم آئے گی، نفرت ہوگی، محبت ہوگی، وہ زندہ رہے گا۔'' (۲)

اس لیے ضروری محسوس ہوتا ہے کہ پہلے عصری حقائق، ادیب کے منصب یا اس سے متعلق کوئی بات کرنے سے پہلے ہمارے ہاں قارئین کے مسئلے کو لے لیا جائے۔ اس مفروضے کو درست ہی خیال کیا جانا چاہیے کہ ہمارے ہاں ادب کے قارئین مفقود نہیں تو کم یاب ضرور ہیں اور ایسا رفتہ رفتہ ہوا ہے تاہم قارئین کا ایک متعین حلقہ یا گروہ کبھی نہیں ہوتا، ان کے کئی زمرے ہوتے ہیں۔

۱۔ محرومی، تشنگی اور ناآسودگی کے تخیلی سطح پر ازالے کے تمنائی
۲۔ فطری حسِ لطیف کی آسودگی اور اپنے جذبات کی تہذیب کے آرزومند
۳۔ زندگی اور فطرت کے رموز کو سمجھنے کے طلبگار
۴۔ اجتماعی زندگی میں ترتیب و توازن پیدا کرنے کے جویا
۵۔ فیض کشی یا Inspiration کے لیے خواہاں یا متجسس
۶۔ فیس بک یا سیلفی کلچر کے ذریعے خود کو سنجیدہ کتاب بیں ظاہر کرنے کے آرزومند

ظاہر ہے ان میں وہ قارئین بھی شامل ہیں، جو اپنے اجداد کی ٹوٹی ہوئی تلوار سے کشور کشائی کا عزم رکھتے تھے، وہ بھی جن کے نُچے ہوئے تکیے بالآخر بھیگنا چاہتے تھے، وہ بھی جو نامحرم سرگوشی میں اپنے وجود کو تحلیل کرنا چاہتے تھے، وہ بھی جو راکھ کریدر ہے تھے اور وہ بھی جو الاؤ سے اپنی مشعل روشن کرنے کے خواہاں تھے، ان میں سے جو داستان کے قاری تھے یا مردہ رگیں جگانے کے لیے زیر علاج تھے، ان کے لیے بہت سے ڈائجسٹ نکلے، مقبول ہوئے اور انھیں اس ملک میں بے پناہ قارئین ملے، جہاں شرح خواندگی شاید ۴۰ فیصد سے زیادہ نہیں اور جہاں چار قسم کے سکول اور نصاب اس لیے ہیں کہ قومی یکجہتی کے موضوع پر زوردار سیمینار ہوتے رہیں .... میں شرح خواندگی کے علاوہ دیگر وجوہات گنوانا چاہتا ہوں، جو ادب کے قاری کی گمشدگی یا کم یابی کا باعث بنی ہیں۔ اگر چہ گابریل لاؤب نے کہا تھا:

''ٹیلی ویژن کی ایجاد کا مقصود دراصل ان پڑھوں کے لیے عینک لگانے کا بہانا پیدا کرتا ہے۔'' (۳)

تاہم اس کی افادیت اور طاقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے ماہرین سماجیات کو اس نکتے پر غور کرنا چاہیے کہ جب آنہ لائبریریاں، وڈیو شاپس میں تبدیل ہو جائیں تو گلی محلوں میں بھی رویے کیسے تبدیل ہوتے ہیں؟ پھر ٹیلی ویژن پر ادبی پروگرام کو کلاسیکی موسیقی جتنا وقت اور نصف شب کے بعد اسے نشر کرنے کی پالیسی کا بھی یقیناً کچھ مفہوم ہوگا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ٹیلی ویژن تخلیقی فنکار کو اس فریب میں مبتلا کرتا ہے کہ اس نے چند قارئین کی بجائے ہزاروں، لاکھوں ناظرین کے احساس وادراک کو متحرک کیا ہے، وہ بھول جاتا ہے کہ اس کی تخلیق کو سنوارنے اور ہر زمانے میں اسے متکلم رکھنے کا ضامن قاری کا وہ تخیل ہے، جو ناظر کے پاس نہیں۔

رسول حمزہ کی ایک نظم 'داغستانی خاتون اور شاعر بیٹا' کا ترجمہ فیض احمد فیض نے یوں کیا تھا:

اس نے جب بولنا نہ سیکھا تھا
اس کی ہر بات میں سمجھتی تھی

اب وہ شاعر بنا ہے نامِ خدا
لیکن افسوس کوئی بات اس کی
میرے پلے ذرا نہیں پڑتی (۴)

ہمارے ہاں بھی ۱۹۵۰ء کے بعد بہت سے ادیب شاعر اک دم سے بڑے ہو گئے اور ان کی باتیں ان کی اپنی دھرتی ماں کے لیے بھی ناقابل فہم ہو گئیں۔ جب بھی کسی نے ابلاغ کی اہمیت پر بات کی ہے، انھیں 'ابہام کے سات اسالیب' نامی کتاب پڑھنے کو کہا گیا، ایک بڑے ادیب سے کہا گیا کہ آپ کے قاری آپ سے شکوہ کرتے ہیں کہ آپ کے ہاں ابلاغ نہیں تو انھوں نے فوراً کہا میں تو اپنے آنگن میں بیٹھی ہوئی چڑیا کے لیے لکھتا ہوں، کسی نے ان سے نہ کہا کہ وہ پھر چوں چوں کرنے پر ہی اکتفا کیوں نہیں کر لیتے؟ اُردو میں ضخیم ناول کیوں لکھتے ہیں؟ ــــ قاری کو کم وبیش دو عشروں تک یہ اذیت ناک احساس دلایا جاتا رہا کہ اگر کہانی یا نظم اس کی سمجھ میں نہیں آئی تو اس کا سبب یہ نہیں کہ تخلیق کار کے پاس کہنے کو کچھ نہیں، یا اس نے جہاں سے خیال یا 'تجربہ' مستعار لیا، اسے پوری طرح تصرف میں لانے کی قدرت یا اختیار نہیں تھا اگر وہ سمجھ نہیں سکتا تو وہ جہنم میں جائے [اور وہیں تخلیق کار کا انتظار کرے] پھر جو لسانی تشکیلات کی شعوری کاوشیں ہوئیں اس کے مطابق نئی ذہنی اور ثقافتی فضا بنانے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی بلکہ یہ تاثر دیا گیا کہ قاری خود جاہل یا نیم خواندہ ہے حالانکہ تخلیق کو تو پھٹکار کی بجائے محبت، بھرا بلاوا بننا چاہیے۔ ایک جرمن شاعری کی اس تنبیہ کے باوجود کہ:

"جب نظموں کی زبان سہل ہونے لگی تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ زندگی بھی آسان ہوگئی ہے۔" (۵)

پاکستان میں بیشتر ایسے حکمران آئے جن کے ضمیر پر اپنے حقِ حکمرانی کے حوالے سے بوجھ تھا۔ اس لیے مذہب، تاریخ، ثقافت اور قومی امنگیں سرکاری توشہ خانے میں جمع کرا دی گئیں، خاص طور پر ثقافت جو مذہب، تاریخ، دھرتی اور قومی فخر کے اجزاء سے عبارت ہے اور جو کسی قوم کی داخلی شخصیت کے تعین اور نمو پذیری میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے اور جس کا تخلیقی ادب سے ناگزیر رشتہ ہے، طاقتور مصلحت کے ہاتھوں مسخ ہوئی۔ غیر ملکی مہمانوں اور مراعات یافتہ طبقے کی اولاد کی درسگاہوں میں پاکستانی ثقافت کا مفہوم اور تھا اور میڈیا، نصاب اور عام مدرسوں میں پڑھنے والوں (نہ پڑھنے والوں) کے لیے اور۔۔۔۔۔ پاکستان کو ایک جغرافیائی حقیقت ماننے میں بھی مفروضہ نظریاتی اساس کا تزلزل دیکھا گیا، اسی طرح اُردو ادب کو ان تہذیبی مراکز سے ہی منسلک رکھا گیا جو، اب تاریخ اور تہذیب کے سفر میں دل آویز نشانیاں ہی ہیں چنانچہ ادب کے کینوس پر پاکستانی ثقافتی شخصیت کے نقوش ابھر نہ سکے یا اپنی پہچان نہ کرا سکے اور یوں پاکستان کی سرزمین کو آسٹروٹرف میں تبدیل کر دیا گیا۔

میں نے اپنے زمانہ طالب علمی میں کوی حسام الدین سے جب سنا تھا کہ ادب کا سب سے بڑا مسئلہ کاغذ کی گرانی ہے تو یہ بات سطحی محسوس ہوئی تھی۔ مگر اب اس کی معنویت آشکار ہوئی ہے، جب ادبی کتابیں عام کیا، نسبتاً باوسیلہ شخص کی دسترس سے بھی باہر ہوئی ہیں، حاکموں کی علم دشمنی، پبلشروں کی ہوس زر اور فروغ ادب کے اداروں کے تغافل نے عام ادیبوں کو سستا اور ادبی کتابوں کو مہنگا کر دیا ہے۔

معارف، مخزن، زمانہ، نگار، ساقی، ادب لطیف اور پھر نقوش، نیا دور، فنون، اوراق اور سیپ محض ادبی جرائد کے نام نہیں رہے ادب کے قارئین کی تربیت اور توجہ کے مراکز بھی رہے ہیں، ان کے تعطل یا ضعف کے باعث بھی ادب اپنے روایتی قارئین سے محروم ہوا ہے مگر اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ان کی جگہ بعض وقیع، فکر انگیز اور طباعت کے لحاظ سے جاذبِ نظر جرائد شائع ہونے لگے ہیں۔ پھر بھی ہماری اجتماعی زندگی کا المیہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں ذہانت اور ندرتِ خیال کو حب الوطن کے منافی خیال کیا گیا، دیانتِ فکر، احساسِ انا اور عزتِ نفس کو قابلِ خرید سمجھنے والے طاقتور کی ڈھٹائی نے بھی تخلیقی لفظ کو بے توقیر اور نامعتبر کر دیا، ریاکاری نے اقدار اور خیالات کے زندہ نظام کو سردخانے کی تحویل میں دیا، جس نے حسِ لطیف اور ذوقِ سلیم کو مسخ کیا، اجتماعی احساس کو سراب بنایا اور تخلیقی عمل سے تعمیر نو یا احیاء کے خواب کو تعبیر سے ہمیشہ کے لیے جدا کرنے کے لیے رائیگانی کے پچھتاوے میں تبدیل کر دیا۔

آج ہمارا سماج ہر قسم کی فکری تحریک سے محروم نہیں بے نیاز بھی ہے، بیگانگی یا مغائرت کی فصیل کو جسے ہم آمرانہ نظامِ حکومت کی دین سمجھتے تھے، آج نیم جمہوری دور کے حکمران بھی گرانے سے قاصر نہیں، کھلی مارکیٹ کی بے رحمی کے روبرو صارفین کی ڈھلی ڈھلائی عادات واطوار کی تشکیل کے لیے ہماری اشرافیہ کی خود سپردگی، نظریاتی جدل پر مفادات کے پیکار کا غلبہ اور ہر ادارے اور ہر ارادے کا زوال جو منظر نامہ بنا رہا ہے، اس کی تفہیم میں شاید فیض احمد فیض کا یہ شعر مدد دے۔

صفِ زاہداں ہے تو بے یقین، صفِ مے کشاں ہے تو بے طلب
نہ وہ صبح وردو وضو کی ہے، نہ وہ شام جام وسبو کی ہے

ظاہر ہے کہ شعر وادب میں تحریکیں اور رجحانات جو تموج، اضطراب اور ہلچل پیدا کرتے ہیں، وہ اپنے معاشرے میں کارفرما تحریکوں اور رجحانات کا تسلسل ہوتے ہیں اور جو معاشرہ ان سے محروم اور بے نیاز ہو، وہاں کا ادب

کس طرح کسی سمت، وژن اور تخلیقی جوت کا حامل ہو گا، سارتر نے کہا تھا:

''ایک کتاب کو پڑھنا، اسے پھر سے تصنیف کرنا ہوتا ہے۔'' (۶)

گویا قارئین کے ذریعے کتاب حیات نو پاتی ہے اور تسلسل کی ضمانت حاصل کرتی ہے اور قارئین کا ردعمل یا رویہ (Response) ہی تخلیق کار میں خود تنقیدی کے عمل کو متحرک رکھتا ہے۔

جب ہم اپنے ہاں ادیب کے سماجی منصب کی بات کرتے ہیں تو پھر قومی شعور یا اجتماعی احساس کی بیداری میں اس کے کردار کے بارے میں بلند آہنگ گفتگو شروع کر دیتے ہیں حالانکہ ہمیں یہ دردناک حقیقت ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ یہ اصطلاح دوہرے مفہوم کی حامل ہے۔ حکمران طبقات اور ان کے کارندوں کے ذریعے ہمیشہ صابر اور شاکر قربانیاں دینے والی، حرف شکایت زبان پر نہ لانے والی، کہکشاؤں سے کہیں دور ظلمات کی نذر ہونے والی جنت کے بہلاووں میں زندگی کی بنیادی سہولتوں سے دست کش ہونے والی رعایا ہمیشہ باشعور ہوتی ہے اور وہی قومی شعور سے لبریز ہوتی ہے۔ اس کے لیے قومی میڈیا خدمت گزاری کا فرض ادا کرتا ہے۔ قومی نصاب کمیٹیاں ہوتی ہیں، قومی وائس چانسلر ہوتے ہیں، قومی دانشور اور قومی مقالہ نگار ہوتے ہیں جبکہ اسکے مقابل وہ دنیا ہے جہاں ادیب، شاعر اور دانشور سچ کی صلیب اٹھاتا ہے اور کمزور اور نہتے لوگوں میں اپنے وجود کا احساس پیدا کرتا ہے اور پھر اس احساس کو شعور میں تبدیل کرتا ہے کہ دنیا کا کوئی مذہب، فلسفہ یا تہذیب، جہالت، غلامی افلاس اور ظلم کا ساتھ دینے کے لیے نہیں بلکہ ہر وہ حاکم، مراعات یافتہ طبقہ یا پنڈت، پروہت ملا یا قاضی قابل مذمت ہے جو، ان کو شرفِ آدمیت سے محروم کر کے غلامی، جہالت، افلاس اور ظلم کو برداشت کیے جانے کو ہی انسانی مقدر کہتا ہو اور یہ خیال کرتا ہو کہ وہ لوگ بے چارے معصوم ہیں، جو لال مسجد کے ایکشن کا بدلہ لینے کے لیے بچیوں کے سکول جلا رہے ہیں، وہ وضع دار اور غیرت مند شرفاء ہیں جن کے جرگے ٹریکٹر کے ہل کے ساتھ ان لڑکیوں کے جسموں کو کاٹ کر ریت میں گاڑ رہے ہیں، جو اکیسویں صدی میں بھی اپنی پسند کی شادی نہیں کر سکتیں، وہ اس معاشرے کو مشرقی روایات پر مبنی خیال کرتے ہوں، جہاں کاریوں کے لیے الگ قبرستان ہوں، جہاں نماز جنازہ بھی نہ پڑھائی جاتی ہو، ایسے لوگوں کو مجاہدین خیال کرتے ہوں جو وڈیو کی دکانوں کو جلا کر ایف ایم نشریات کے ذریعے خود کش حملوں کی تلقین کرتے ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ خود کش حملوں کے لیے ایندھن بننے والوں کو بھی ظلم، جبر اور تعصب پر مبنی نظام کو بدلنے کا کبھی ڈراوا اور کبھی دلاسہ دیا گیا، امریکی سامراج اور اس کے ہمنواؤں نے سرمایہ دارانہ نظام کے ناجائز منافع سے تہذیب عالم کا جو استبدادی تصور دیا ہے اس کے مقابل ان خود کش حملہ آوروں کا کمزور سا دفاع ٹیری ایگلٹن اور نوم چومسکی نے کرنے کی کوشش کی ہے۔ چومسکی تو ایک مظلوم فلسطینی احمد کے حوالے سے کہتا ہے:

''ظلم اور جبر سے کام لیا جائے تو ذاتی دفاع کی میکانیات نسلی منافرت کے بیج بونے لگتی ہے، جابر جو کچھ کر رہا ہے وہ اسے اپنے سامنے کیسے مبنی بر حق ثابت کر سکتا ہے، اگر اس کا شکار انسان ہو؟ نسلی منافرت آگے چل کر جہالت کو جنم دیتی ہے اور لوگوں کو تشدد کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیتی ہے اور آخر کار دنیا کے 'احمد' رنج و غم سے پھٹ پڑتے ہیں۔'' (۷)

مگر نسلی منافرت سے زیادہ مذہبی منافرت اور فرقہ وارانہ منافرت کے تشدد کو ہم پاکستانی، چومسکی سے بھی زیادہ سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایسے میں کیا ادیب اور دانشور کا کام ایک سہمے ہوئے ناظر کا ہے؟ طاقتوروں کے دسترخوانِ

ہدایت وانعام واکرام کے ریزہ چیں کا۔؟ آخر کوئی بات تو ہوگی کہ ایک بڑے تخلیق کار اشفاق احمد نے اپنی کتاب 'بابا صاحبا' میں لکھا ہے:

"شاعر غریبوں، ناداروں اور ذلتوں کے ماروں کے لیے کچھ کرتا نہیں ہے۔ صرف ان کے خوابوں میں رنگ بھر کر ان سے آنے جانے کا کرایہ، مشاعرے کی فیس اور ضیافتوں کا اہتمام کرا کے آ جاتا ہے۔" (۸)

مگر یہ ادیبوں کے محض ایک ایسے جمگھٹے کا تذکرہ ہے جس کا مقصود اپنے تخلیقی تجربات اور اظہار کے ذریعے آنے والی نسلوں کے محسوسات اور ذہن کے ساتھ رشتہ قائم رکھنا نہیں ہوتا، آخر ہماری تخلیقی دنیا میں منٹو، فیض، امرتا پریتم، استاد دامن، جالب اور ارون دھتی رائے بھی تو ہیں، وہ ارون دھتی رائے جو لکھتی ہے:

"ایک ادیب اپنی زبان کو صیقل کر کے اسے ممکن حد تک واضح، شخصی اور انفرادی بنا لے، پھر ادھر ادھر دیکھے کہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے تب وہ خود کو مخلوق کے قلب میں پائے گا اور وہ کچھ کہہ رہا ہوگا، جو لاکھوں اور لوگ بھی کہہ رہے ہوں گے، پھر اس کا تجربہ نجی، شخصی اور انفرادی نہیں رہے گا۔" (۹)

اسی طرح وہ لکھتی ہے:

............"اپنے ڈیسک پر خالی صفحے کے ساتھ بیٹھا ادیب اکیلا ہوتا ہے اور یہ شاید دنیا میں تنہائی کا سب سے بڑا تجربہ ہوتا ہے، مگر جونہی تخلیق مکمل ہوتی ہے، وہ تنہا نہیں رہتا۔" (۱۰)

یہاں مجھے ذی شان ساحل کی ایک نظم 'کاش کوئی' کی چند لائنیں یاد آ رہی ہیں، جن میں پابلو نرودا، ناظم حکمت اور فیض کے لہجے کی تجدید ہوتی ہے۔

"کاش کوئی ہتھیاروں کی چمک اور
ام کلثوم کی آواز کا فرق واضح کر سکے
کاش کوئی اوپیک کے اجلاس میں
نزار قبانی کی نظموں کی وضاحت کر سکے" (۱۱)

اب رہ گئی بات اس بدلتی دنیا کی تو ماجرا یہ ہے کہ آج یہ چرچا ضرور ہے کہ دنیا ایک ہی گاؤں یا قصبہ بن گئی ہے۔ یہ اور بات کہ زر اندوزوں کے لیے یہ خوش خبری ہے اور کم وسیلہ لوگوں کے لیے دھمکی، جب کہ بے وسیلہ لوگوں کے لیے سامانِ تفنن کہ جب ان کا گاؤں کسی شہر اور دنیا کا حصہ نہ تھا تب بھی وہ محروم تھے اور جب دنیا خود ایک گاؤں بن چکی ہوگی تب بھی وہ کچھ بھی چھننے کے اندیشے سے آزاد رہیں گے۔ اسی طرح عالمگیریت یا گلوبیت کے اثرات اور حکمتِ عملی سے آگاہ دانشوروں کی رقت میں یہ کہہ کر بھی کچھ کمی کی جا سکتی ہے کہ دنیا کے جس حصے میں ابھی بیسویں صدی طلوع نہیں ہوئی وہاں اکیسویں صدی کیسے قدم رنجہ فرما سکتی ہے؟ جہاں ایک بہت بڑے طبقے کے لیے پٹواری یا تھانے دار کا اشارا قضا و قدر کے اشارے سے زیادہ قوی ہو؟ وہاں فری مارکیٹ اکانومی، کارپوریٹ فارمنگ، صارفیت یا کنزیومرازم، پری ایمپٹو سٹرائک یا بزعم خود پیش قدم حملہ اور یک قطبی دنیا کے اجارہ دار کتنا بڑا ڈراوا بن سکتے ہیں؟ مگر اس دنیا کے معلوم نقشے پر بڑے

بڑے تغیرات اور انقلابات کے باوجود یہ کہنا بھی سادہ لوحی ہوگا کہ اس دنیا میں ادب یا ادیب کے کردار کے بارے میں مثالی تصورات پر نظرِ ثانی نہیں کی جا رہی۔ واقع یہ ہے کہ ماضی میں کائنات، حیات اور انسان کی ماہیت کے بارے میں شاعر کی بصیرت پر ایک زمانہ بھروسہ کرتا تھا، لیکن اب سائنسدانوں اور عالموں پر انسانوں کا بہت بڑا حصہ اعتماد کرتا ہے، حیات وکائنات کے بارے میں شاعروں کی نکتہ طرازیوں کو زیادہ سے زیادہ حسنِ تعلیل کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔ دوسرے زندگی بھی تیز رفتار ہوگئی ہے جبکہ شاعر اور تخلیق کار کی آرزو ہوتی ہے کہ یہ محشرستان ذرا تھم جائے یا آہستہ رو ہو جائے اور ظاہر ہے کہ تیز رفتاری کی دھن میں مبتلا لوگوں کے روبرو تخلیق کار نسبتاً پچھڑا ہوا اور پچھڑا ہوا فرد ہے۔ ہم جس خطۂ ارض پر بستے ہیں وہاں بہت سارے تعصبات نے ہماری اجتماعی یادداشت سے بہت کچھ چھین کر طاقتوروں کے گودام سے خارج ہونے والا تا بکار کاٹھ کباڑ بھر دیا ہے۔ اسی خطے میں بسنے والوں کا مستقبل ماضی کی کثرتِ تعبیر کے پاس گروی ہے مگر بعض مصلحتوں کا نقاب اترنے کے بعد یہ حقیقت سامنے آ رہی ہے کہ حکمرانوں اور بظاہر تاریخ سازوں کی بصارت کے مقابلے پر ہمارے تخلیق کاروں کی بصیرت زیادہ معتبر ہے۔ کوئی اس کو تاریخ کا خاتمہ کہے، کوئی ٹیکنالوجی کے ہاتھوں انسانیت کی موت، کوئی اسے یک قطبی دنیا کہے یا کچھ اور واقعہ یہ ہے کہ خیر اور شر کا جدل جاری ہے اور کسی تخلیق کار کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ حق کیا ہے، روحِ عصر کیا ہے اور اس کے واشگاف اظہار کی قیمت کیا ہے۔ اس مثالی بیانیے کے باوجود اس حقیقت کو نہیں چھپایا جا سکتا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے کام لینے والے ملکوں نے صرف مادی ترقی نہیں کی بلکہ ان کے ایسے ذہنی اکتسابات بھی ہیں۔ جنھوں نے اس طرح کے معاشرے اور نظام تشکیل دے لیے ہیں جوان لوگوں کے لیے جنت ارضی سے کم نہیں جنھوں نے صدیوں کا استحصال ایک موہوم جنت کے تصور میں برداشت کیا ہے اور وہ لوگ کسی بھی شناختی کارڈ، پاسپورٹ یا جعلی بشارت کے ذریعے صندوقوں، کنٹینروں، لانچوں اور خوابوں کے سہارے فنا آمیز تذلیل کی مسافرت کے بعد اسی جنت ارضی میں رہنا چاہتے ہیں جہاں عالمگیریت کے تابع انسانی شناخت کے سب حوالے تحلیل ہو جائیں گے، کمزور کی سبھی ثقافتیں، زبانیں فنون اور محسوسات کے حوالے ماند پڑ جائیں گے اور سرمایہ دارانہ نظام کے محافظوں کا طے کردہ نقشہ انسانی شناخت کا حوالہ بن کر سب پر غالب آ جائے گا۔ تاہم، ایک تقسیم تو قائم رہے گی جو پیداگیر اور صارف کے مابین ہے۔

پاکستان میں نظریہ پاکستان کے نام پر ذہنی عقوبت خانے بنانے والوں نے فکرِ اقبال کے ساتھ جو سلوک کیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں تاہم اسی اقبال نے ''پیامِ مشرق'' میں قسمت نامۂ سرمایہ دار و مزدور کے عنوان سے سرمایہ داری کے نظام پر قائم ورلڈ آرڈر کے جو خدوخال یا عہد نامہ پیش کیا ہے اس میں یہی ہے کہ ایک دنیا پروڈیوسرز کی ہے جو غریب صنعتی نظام کا جنجال اپنے گلے میں ڈالے ہوئے ہیں اور ایک دنیا محنت کشوں اور کنزیومرز کی ہے جن کے لیے کلیسا، مندر اور معبد کی ازلی سریلی آوازیں وقف ہیں۔ جن املاک اور باغات پر مالیہ، آبیانہ، عشر اور ٹیکس دینا ہوتا ہے وہ بیچارے زراندوزوں کے حصے میں ہیں اور باغِ بہشت، سدرہ وطوبیٰ بے زروں کے لیے، مرغابی تذرو کبوتر پہلے طبقے کے لیے اور ظلِ ہما اور شہپر عنقا دوسرے طبقے کے لیے اور پھر اس نظم کا کلائمکس یہ ہے کہ جب سرمایہ دار وسیع القلبی سے کام لے کر بے زر مزدور سے کہتا ہے کہ اس مٹی اور اس کے شکم میں چھپی معدنیات چلو میں لے لیتا ہوں اور اس زمین سے لے کر عرشِ معلیٰ تک کا علاقہ تمہارے لیے ہے۔ چنانچہ اب یہ امر تعجب خیز یا تاسف انگیز نہیں رہتا کہ امریکہ کی کسی ریاست میں سمندری طوفان آتا ہے تو نقصان نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے اور جب فطرت سونامی کی صورت میں انڈونیشیا میں چنگھاڑتی ہے، یا کشمیر اور کوئٹہ میں

زلزلے کی صورت میں اپنا بے رحم چہرہ دکھاتی ہے تو لاکھوں لوگ لقمہ اجل بن جاتے ہیں اور باقی بچے کھچے نیم جانوں کے سرہانے بیٹھا مذہبی طبقہ تلقین کر رہا ہوتا ہے کہ اپنے حقیقی اور مفروضہ گناہوں کے لیے توبہ و استغفار کریں۔ سو میرا نقطہ نظر ہے کہ دنیا میں بظاہر تبدیلیاں آئی ہیں مگر جوہری طور پر دنیا اسی طرح دو حصوں میں منقسم ہے۔ اس نقطۂ نظر کی پرکھ کے لیے ہم تخیلی طور پر ایک آزمائش کر سکتے ہیں وہ یوں کہ فرض کر لیجیے کہ وہ چند سچے لوگ اس دنیا میں دوبارہ پیدا ہو گئے، جنھوں نے اپنے نظریات کی صداقت کی خاطر زہر کا پیالہ پیا تھا۔ پھانسی پر جھولے تھے، سنگ سار ہوئے تھے جلاوطن ہوئے تھے اور معتوب ٹھہرے تھے مگر مسلمہ طور پر ان کے نام تخلیقی دنیا میں فیض رساں رہے ہیں۔ کیا ہم میں سے کوئی سچ مچ یہ خیال کرتا ہے کہ ہماری یہ بدلتی ہوئی دنیا سقراط، منصور، سرمد اور منٹو سے کوئی مختلف سلوک کرے گی۔ سو میں بڑے ادب سے عرض کروں گا کہ اوزاروں، ہتھیاروں، حکمت عملیوں اور ایجنسیوں کے ناموں اور اثر پذیری کے فرق کے باوجود ایک دنیا سیانوں اور سورج مکھیوں کی ہے۔ جس میں صارفیت، آسودگی اور کامیابی و کامرانی کے اپنے طریقے اور معیارات ہیں اور ایک دنیا ان معیارات سے انحراف کرنے والوں کی بھی ہے اور اس کی قیمت ادا کرنے والوں کی بھی ہے، جنھیں آپ ابنارمل کہیں، دیوانہ کہیں مگر وہ لوگ ہمیشہ سے ہیں اور ہر دور میں ان آفاقی قدروں کی حفاظت کرتے ہیں جنھیں زمینی حقائق کے نام پر موقعہ پرستی نامعتبر کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔

میں ادیب کے بارے میں کوئی رومانوی تصور پیش نہیں کر رہا کیوں کہ دنیا میں لاکھوں کروڑوں لوگ ہیں جو لفظوں سے کھیلتے ہیں کبھی خرید کر اور کبھی بیچ کر، وہ کسی بھی خیال یا نقطہ نظر کے بارے میں نظام کے محافظوں کی جانب دیکھتے ہیں کہ اس کی موافقت کرنی ہے یا مخالفت۔ چند ایسے ہنر فروش بھی ہو سکتے ہیں جو خسرو کے عشرت کدے پر مزدوری کی بجائے شیریں کی خواب گاہ اور بارگاہ میں باریابی کو زندگی کی سب سے بڑی کامرانی سمجھتے ہوں (حالاں کہ یہ بھی سربزانو خسروی کی خدمت بجالانے کی ایک صورت ہے) چند ایسے قلم کار بھی ہو سکتے ہیں جو اپنے فن کی معراج سرکاری پذیرائی کو خیال کرتے ہوں یا ایک بہت بڑے حلقے کی آٹو گراف طلبی کو مجید امجد کی حسرت کا کفارہ خیال کرتے ہوں۔ مگر ہر معاشرے اور ہر دور میں وہ تخلیق کار اور آرٹسٹ بھی ہوتا ہے جو طاقت وروں کی منشاء کے مطابق دیکھتا نہیں، ان کے وضع کردہ یا طے کردہ معیارات کے مطابق محسوس نہیں کرتا اور ان کی جانب سے فراہم کردہ لفظوں کے کوٹے میں اظہار نہیں کرتا، اس عہد کے بے بس اور بے کس لوگ یا شاید بے زبان لوگ اس کی کتاب خریدنے کی صلاحیت بھلے نہ رکھتے ہوں، آٹو گراف بھی نہ لیتے ہوں، اس کے گرد حلقہ زن بھی نہ ہوتے ہوں اور شاید اسے زیرِ عقوبت دیکھ کر اپنی سسکیوں کو بھی اپنی میلی پوٹلیوں میں چھپا لیتے ہوں مگر انھیں یقین ہوتا ہے کہ یہ ہمارا سچا دوست ہے، یہ طاقت وروں کے ایماء پر ہمیں نہیں کہے گا کہ پیدا کرنے والوں کی منشاء یہ ہے کہ ہم سے شرف آدمیت چھین لیا جائے اور ہم بنیادی انسانی ضرورتوں کو بھی ترستے رہیں۔ انھیں یقین ہوتا ہے کہ اس تخلیق کار کے سینے میں وہ سورج ہے جس کی روشنی اور تمازت آخرِ کار ہر آنگن میں پہنچے گی۔ شاید اسی لیے مجید امجد نے تخلیقی عمل کو عملِ خیر کہا تھا جو بدلنے کے فریب میں مبتلا دنیا میں بھی ایک پیہم عمل کے طور پر جاری ہے۔ سو یہ یاد رکھنے میں کیا ہرج ہے کہ گلوبل ولیج کے مقابل ایکیولاجیکل ولیج کا خواب دیکھنے والے بھی موجود ہیں جو اپنی تہذیب ثقافت اور زبان کے پانی اور سبزے کو ہر طرح کے تبدیل شدہ منظر میں باقی رکھنا چاہتے ہیں اسی لیے ہمارے بعض ادبا کا مثالی طرز عمل ہمارے لیے سبق آموز بھی جیسے مشتاق احمد یوسفی اور اجمل خٹک نے اپنے اپنے کمالِ فن ایوارڈ کی رقم پانچ لاکھ روپے) مختلف اداروں کو دے دی۔ اسی طرح سے ۲۰۰۶ء میں احمد فراز، زاہدہ حنا اور چار دیگر اہلِ قلم نے اپنے

اعزازات حکومت کو واپس کیے، یہ اور بات کہ بہت کم اہل قلم کی طرف سے کلمۂ تحسین آیا۔ ضیاء الحق کے دور میں ایوب خان کے زمانے میں بھی ادیب اور دانشوروں کے مشترکہ اعلامیے 'مردانِ آہن' کو خلجان میں مبتلا کرتے تھے، میں نے کہیں پڑھا ہے کہ جب پاکستانی جنگی قیدیوں کی رہائی کے لیے کرشن چندر نے بھارت میں ادیبوں اور دانشوروں کی دستخطی مہم چلانے کا عندیہ ظاہر کیا تھا، تو بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی نے ان سے رابطہ کر کے چند ہفتے توقف کرنے کو کہا تھا۔ اسی طرح پاکستان میں منٹو کی ۵۰ ویں برسی پر بعض مزدور انجمنوں نے تقاریب کیں اور ان کے ایک ترجمان رسالے نے منٹو نمبر چھاپا، یہ کیا ماجرا ہوا۔ پاکستانی ادیبوں میں سے سب سے زیادہ معتوب اور مقہور افسانہ نگار سے استحصالی نظام میں ستائے جانے والا طبقہ والہانہ انسیت محسوس کرتا ہے؟ اس کے نام پر بنائی فلم کو بھی نوجوان لڑکے لڑکیوں نے بڑے اشتیاق سے دیکھا اور کسی چودھری محمد حسین نے ان کے خلاف 'رپٹ' درج نہیں کرائی۔ پس یہ بھی ثابت ہوا کہ ترقی پسند تنظیم نے بعض فیصلے ایسے بھی کیے جو ملائیت ہی سے سرزد ہو سکتے ہیں؟ آج فیض اور منٹو کے بعد کس کس کو یہ مقام ملا ہے کہ معاشرے کے ہکلے انھیں اپنی زبان خیال کر کے اس طرح بولیں کہ جن کے خوف نے انھیں فطری صلاحیت سے محروم کیا تھا، اپنی حکمتِ عملیوں اور وسائل کے باوجود نہتے ہو جائیں؟

اس میں شک نہیں کہ اس ملک میں بہت سی جامعات کو اُس طرح کی فکری قیادت نصیب نہیں ہوئی کہ اُن جامعات میں غیر معمولی تخلیقی، فکری اور ثقافتی سرگرمی دیکھنے کو ملتی۔ آپ پورے ملک میں لاہور کو لے لیجئے جسے روشنی اور باغوں کے ساتھ کالجوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے اور یہ کالج اپنے غیر معمولی اساتذہ اور کتاب خانوں کے باعث پاکستان بننے سے بھی پہلے شہرت حاصل کر چکا ہے۔ مگر گورنمنٹ کالج لاہور کے سوا کوئی ایسا ادارہ دکھائی نہیں دیتا جس نے گذشتہ نصف صدی میں اپنی شناخت اور اپنی دیدہ زیبی کو قائم رکھا ہو۔ کیا اس کا سبب یہ ہے کہ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے بیشتر پاکستان کی نوکر شاہی میں جاتے ہیں اور یہ درسگاہ اختیار یا اقتدار میں رہنے والوں کا ایک زینہ بن جاتی ہے یا اس کے پیچھے اس کے سابق طلبہ کی شیرازہ بندقوت کا کردار ہے مگر نہیں میرے خیال میں ہم سمجھتے ہیں کہ پطرس بخاری اور ڈاکٹر نذیر احمد کا اساطیری سایہ اس درسگاہ کو ایسے میسر آیا کہ کوئی اور پرنسپل اس حصار سے باہر نکل نہیں سکا۔ پروفیسر احمد شاہ بخاری ایک غیر معمولی انسان تھے اس لئے نہیں کہ وہ انگریزی ادبیات کے استاد تھے بلکہ اُن کی قیادت میں ایک ایسا خوش فکر اور خوش خیال لوگوں کا گروپ وجود میں آیا جس نے جدید لاہور کی بنیاد رکھی۔ میرا اشارہ نیاز مندانِ پنجاب کی طرف ہے جس کے سرخیل پطرس بخاری تھے اور اُن کے ساتھ ڈاکٹر محمد دین تاثیر، فیض احمد فیض، صوفی تبسم اور بہت سارے لوگ تھے۔ یہ محض اہلِ زبان سے ہی چھیڑ چھاڑ نہیں کرتے تھے اور نہ راتوں کو کوئی ڈرامائی ایکٹوٹی تلاش کرتے تھے۔ بلکہ مختلف دوستوں میں ترجمے کا کام بانٹتے اشاعت کے منصوبے بناتے ڈرامیٹک سوسائٹیوں کو فعال کرتے جوہر قابل کی تربیت کرتے اور بسا اوقات بے تعلقی کی جانب گامزن نیم خواندہ لوگوں کو فرضی ناموں سے ایک دوسرے کے خلاف خط لکھ کر اُن سوالوں کی جانب متوجہ کرتے تھے جو معاشرے میں خرد افروزی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اُن کا آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہونا ایک طرف اُردو لکھنے والے بہترین دماغوں کی ریڈیو سے وابستگی کا حیلہ بنا اور ساتھ ہی ساتھ مداحوں اور شاگردوں کا ایک ایسا حلقہ تشکیل دیا کہ اُن کی ذات مجموعی طور پر تعلیمی اداروں کے لیے فیض رساں بن سکتی تھی اگر اُن اداروں کے سربراہوں میں کچھ سیکھنے کا ذوق ہوتا۔ پطرس بخاری کی شدید خواہش تھی کہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنیں مگر اس یونیورسٹی کی اپنی بد نصیبی ہے کہ اس طرح کے بڑے لوگوں کی خواہش کی راہ میں اس کا نظام حائل ہو جاتا ہے۔ بڑی عجیب بات ہے کہ اسی

حلقے کے دوسرے بیدار مغز رکن ڈاکٹر تاثیر بھی پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بننا چاہتے تھے مگر نظام نے یا موت نے اُنہیں موقع نہ دیا۔ اسی طرح ڈاکٹر نذیر احمد کی سادگی، بے ریائی کے ساتھ ایوب خان کی ڈکٹیٹر شپ کے بڑے ستون نواب آف کالاباغ کے مقابل اُن کی بے خوفی محض لاہور کا ایک وقوعہ نہ رہی بلکہ ڈکٹیٹر شپ کے خلاف طالبعلموں کی تحریکوں کے لیے ایک سرچشمہ فیضان بن گئی۔ پھر اس طرح کا کردار پروفیسر کرار حسین اور خلیل صدیقی کا دکھائی دیتا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی میں بھی پروفیسر حمید احمد خان کا ایک دور تصنیف و تالیف اور کتاب بینی کا سنہری دور ہے لیکن رفتہ رفتہ ان منصبوں کے طلبگاروں کا ایک ایسا جھرمٹ آیا کہ نوکر شاہی کو اُن کی تذلیل کے مواقع میسر آ گئے۔ اس کے برعکس جب کوئی پڑھتا ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی نے قرۃ العین حیدر کو پوئٹ ان ریذیڈنس کے منصب پر فائز کیا یا انتظار حسین کو تین ماہ کے لیے پریم چند پر توسیعی لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا یا جامع ملیہ میں اور بھارت کی دیگر یونیورسٹیوں میں کسی بھی زبان کے بڑے تخلیق کار کو پروفیسر کے گریڈ پر اس طرح لایا گیا کہ اُن سے اُن جامعات کی تہذیبی سطح بلند ہوئی مجھے یاد ہے بھارت کے دورے میں جب میرے سامنے اس طرح کی ایک دو مثالیں سامنے آئیں تو میں نے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو اُس وقت کے چیئرمین ڈاکٹر عطاء الرحمٰن کو لکھا کہ کتنا اچھا ہوتا اگر انتظار حسین کو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور منیر نیازی کو پنجاب یونیورسٹی لاہور جون ایلیا کو کراچی یونیورسٹی یا احمد فراز کو قائداعظم یونیورسٹی یا علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ایک برس کے لیے بھی اعزازی منصب دے دیتے جس کے تحت اُنہیں پروفیسر کا مشاہرہ دیا جاتا ہے ایک مقررہ بجٹ دیا جاتا ہے اور اُن پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ مہینے میں ایک یا دو سیمینار یونیورسٹی کے کس شعبے کے طالبعلموں کیلئے کس موضوع پر منعقد کریں گے۔ یہ لوگ باقی سربراہان شعبہ کی طرح چاپلوسی یا مطلب براری کا طریقہ کار اختیار کرنے پر مجبور نہیں ہونگے۔ ڈاکٹر عطاء الرحمٰن نے مجھے لکھا کہ یو جی سی اس طرح کی تقرریوں کے لیے فنڈز دینے کے لیے تیار ہے بشرطیکہ وہ یونیورسٹیاں خود اپنی اکیڈمک کونسل یا سنڈیکیٹ ایسی تجاویز منظور کر کے ہم سے رابطہ کریں سو میں نے اپنی طرف سے تین چار ایسے وائس چانسلروں کو خط بھی لکھے جو محسوس ہوتا تھا کہ شاید یونیورسٹیوں کی بیوروکریسی کے محاصرے سے آزاد ہو سکتے ہیں۔ مگر ایسا نہ ہو سکا البتہ مختلف یونیورسٹیوں میں کچھ چیئرز قائم کی گئی ہیں جن میں سے ایک آدھ پر ممکن ہے کسی موزوں شخص کا تقرر ہوا ہو اور اُس نے کوئی ڈھنگ کا کام بھی کیا ہو مگر پچھلے بیس سال سے ہم سن رہے ہیں کہ گورنمنٹ کالج لاہور میں اشفاق احمد چیئر قائم ہو گئی ہے اور شاید دو مرتبہ وہ مشتہر بھی ہوئی مگر اس پر کسی کا تقرر نہ ہو سکا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس وقت پاکستانی جامعات کے فاصلاتی نظامِ تعلیم کی بدولت یا مختلف کیمپسوں کے ذریعے اُردو ہی کے مضمون میں ڈھائی سے تین ہزار لوگ ایم فل کر رہے ہیں جو ہر راہ چلتے سے سوال کرتے ہیں کہ تحقیق کا کوئی موضوع تو بتاتے جائیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پطرس بخاری اور ڈاکٹر نذیر احمد کا تعلیمی ادارہ ایک مثال بن کر سامنے آئے جس میں سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم ہوئی، ڈرامیٹک سوسائٹی بنی، سابق طلبہ کی تنظیم بنی، ڈی بیٹنگ سوسائٹیاں متحرک ہوئیں، مطبوعات کا ایک سلسلہ جاری ہوا مگر سب سے بڑھ کر یہ کہ وہاں خشک ہوتے ہوئے دریائے راوی کو نوجوانوں کے تخیل میں ہمیشہ کیلئے شاداب کر دیا گیا ہے [کالج میگزین راوی کے ذریعے] اور وہاں ایک سے ایک بڑھ کر صاحبِ دل کی جانب سے گراں قدر کتابوں کا عطیہ موجود ہے خود اسی درسگاہ کے اندر اگر ایک ایسی فضا بن جائے تو ہمیں لوگوں سے یہ سوال نہیں کرنا پڑے گا کہ ادب کی دنیا میں کتاب خواں کہاں گئے یا قاری کہاں گئے۔

ابھی کچھ عرصہ پہلے میں ایک یونیورسٹی کے سیالکوٹ کیمپس میں کام کر رہا تھا وہاں میں نے کشور ناہید اور ڈاکٹر

فاطمہ حسن کے ساتھ ڈاکٹر ستیہ پال آنند کو بھی بلایا اُن کے آنے سے ایک دن پہلے میں تقریباً ہر کلاس میں گیا اور نوجوانوں سے سوال کیا کہ آپ جانتے ہیں کہ کشور ناہید کون ہیں۔ صدمے اور غم نے کم و بیش مجھے نڈھال کر دیا جب دو ہزار طالبعلموں میں سے محض دو نے ذکر کیا کہ وہ ایک اخبار میں بھی کالم لکھتی ہیں۔ یہ اُس تخلیق کار سے شناسائی کا عالم ہے جس نے تقریباً چھ دہائیوں سے لکھا ہے، ترجمہ کیا ہے، ادارے بنائے ہیں، اس کی بعض نظموں کا ترجمہ دُنیا کی پندرہ سے بیس زبانوں میں ہوا ہے اور پھر وہ ایک مقبول اخبار میں کالم بھی لکھ رہی ہیں۔ آخری چارے کے طور پر میں نے اپنے ساتھ آئی ٹی ڈیپارٹمنٹ کے دو تین لوگ بٹھائے ہم نے کشور ناہید کی کتابوں کے ٹائٹل سکین کیے کچھ اشعار کا انتخاب کیا تھوڑی سی اُن کی سوانح لکھی کچھ تصویریں اپ لوڈ کیں اور لیکچر مینجمنٹ سسٹم کے تحت وہ راتوں رات تمام مواد اپنے بچوں کو میل کر دیا، صبح کے وقت کشور ناہید کی مسرت دیدنی تھی جب پُر اشتیاق نوجوانوں نے اُس سے آٹو گراف لینا چاہا کچھ نظمیں سننا چاہی تو کشور نے کہا کہ تمہارے کیمپس کے بچوں کا ادبی ذوق قابل رشک ہے مگر فاطمہ حسن مجھ سے بار بار پوچھتی رہیں کہ جب ہم آپ کے کیمپس کے بچوں کے ذوق کی تعریف کرتے ہیں تو آپ کے چہرے پر فخر یا طمانیت کے کوئی آثار کیوں نہیں ہوتے۔

سرمایہ دارانہ نظام ایک معاشی نظریے کا بار بار چرچا کرتا ہے۔ جسے ریزش زر کا نظریہ کہتے ہیں اُن کے مطابق دولت یا ملکیت پر کوئی حد مقرر نہیں ہونی چاہیے چند بارسوخ اور چالاک [با صلاحیت؟] لوگوں کو اپنی جیبیں بھرنے دیں بالآخر ان کی جیبوں سے فالتو دولت گرنا یا ٹپکنا شروع ہوگی اور یوں نچلے طبقے تک کچھ نہ کچھ دولت پہنچ جائے گی اسے وہ 'ٹرکل ڈاؤن ایفیکٹ' کہتے ہیں۔ میں اس کو ایک اور طرح کی تمثیل بنا کر کہتا ہوں کہ آپ ہر درس گاہ کے ایک دو اُستادوں کو اسی طرح کا زر اندوز بننے دیں اُن کی تربیت کریں کتاب بینی کے اُن کے ذوق کو پروان چڑھائیں تا کہ اُن کی ذات اُن کے شاگردوں کے لیے فیض رساں بن جائے۔

حوالہ جات:

۱۔ سجاد ظہیر، دودھ اور بینگنیاں، دنیا زاد، کراچی، کتاب ۱۷، ص ۱۱۔

۲۔ ادب اور ادیب، ترجمہ: فاخر حسین، ص ۱۸۱۔

۳۔ 'معاصر جرمن ادب' انتخاب و ترجمہ منیر الدین احمد، جرمن پاکستانی فورم ۱۹۸۶ء۔ ص ۱۷۶۔

۴۔ 'نسخہ ہائے وفا'، کارواں پریس لاہور، ص ۴۰۸۔

۵۔ 'معاصر جرمن ادب' انتخاب و ترجمہ منیر الدین احمد۔ جرمن پاکستانی فورم ۱۹۸۶ء۔ ص ۳۱۔

۶۔ ادب اور ادیب، ترجمہ فاخر حسین، ص ۱۷۷۔

۷۔ ترجمہ: سید کاشف رضا، ''دہشت گردی کی ثقافت'' شہر زاد، کراچی، ص ۱۰۷۔

۸۔ 'بابا صاحبا' سنگ میل، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۲۴۔

۹۔ The SHAPE OF THE BEAST [Penguin-2008]، بیک ٹائٹل۔

۱۰۔ Ibid ص ۲۵۔

۱۱۔ نیا ورق ممبئی شمارہ ۲۹، ص ۲۴۔

اردو غزل کی نئی شعری جمالیات

ڈاکٹر نجیب جمال

ولی دکنی (سال ولادت نا معلوم/ وفات ۱۱۳۳ھ/ ۱۷۲۰ء۔ ۱۱۳۸ھ/ ۱۷۲۵ء کے درمیانی عرصے میں ہوئی) (۱) نے جب یہ کہا تھا کہ:

راہِ مضمون تازہ بند نہیں تا قیامت کھلا ہے بابِ سخن

تو درحقیقت یہ اردو شاعری کے امکانات کا برملا اعلان تھا۔ اردو شاعری اب تک فارسی شاعری کے اثرات کو قبول کیے ہوئے تھی تاہم اس کی اُٹھان ایسی تھی اور اس کے تیور بتا رہے تھے کہ یہ اثر مثلِ غبارِ راہ بس قدم دو قدم تک ہی ہے۔ امیر خسرو (۱۲۵۳ء۔ ۱۳۲۵ء) نے اس کی نشاندہی بہت ابتدا میں ہی کر دی تھی۔

زحال مسکیں مکن تغافل، دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

(۲)

اس غزل میں انھوں نے فارسی اور ہندوی کے ملاپ سے اردو شاعری کے نئے الاپ کو جنم دیا تھا۔ غزل، اردو کے شعری ادب کی آبرو کہلائی اور اس نے اردو زبان کے بے پناہ امکانات کے متوازی اپنا سفر طے کیا۔ غزل اپنی اصل میں تو عجمی تھی لیکن ابتدا ہی میں اس نے ہندی گیتوں کے مزاج کو اپنے اندر سمیٹ کر اپنی ایک نئی دنیا پیدا کی۔ ولی دکنی سے میر (۱۷۲۲ء-۱۸۱۰ء) و سودا (۱۷۰۶ء-۱۷۸۱ء)، مصحفی (۱۷۴۷ء-۱۸۲۴ء) و آتش (۱۷۷۸ء-۱۸۴۷ء) اور مومن (۱۸۰۰ء-۱۸۵۲ء) و غالب (۱۷۹۷ء-۱۸۶۹ء) تک آتے آتے غزل کے رنگ و روپ، زبان و بیان اور مزاج و اطوار میں جو تبدیلیاں آتی رہیں انھیں دیکھتے ہوئے اس کے ارتقائی رجحانات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ولی غزل کو دکن سے دلی لائے۔ ان کی یہ کاوش دکن اور دلی کو گھر آنگن بنا گئی۔ اردو شاعری کا لہجہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے طے ہو گیا۔ ان کے لہجے میں فارسی سے مرعوبیت کے باوجود اردو پن کی گہری چھاپ موجود تھی مگر صرف یہی نہیں، عشق کی کرامات اور حسن کی بے پناہ صفات کو بھی انھوں نے تمام تر شعری وسائل کے ساتھ پیش کیا۔ دیکھیے:

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا ٹک مہر کے پانی سوں یہ آگ بجھاتی جا
اس رات اندھاری میں مت بھول پڑوں تس سوں ٹک پاؤں کے جھانجے کی جھنکار سناتی جا
اس دل کے کبوتر کوں پکڑا ہے تری لٹ نے یہ کام دھرم کا ہے ٹک اس کو چھڑاتی جا
تجھ چال کی قیمت سوں نیں دل ہے مرا واقف اے ناز بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا

اگر دھیان دیجیے تو پوری فارسی اور اردو شاعری کے برعکس یہاں ایک اور ہی منظر دکھائی دے رہا ہے جہاں عاشق محبوب کے روبرو آ کر کچھ ایسے تقاضے کر رہا ہے، جس کی آج بھی ہمارے تہذیبی منظر نامے میں گنجائش نہیں مگر آج سے چار سو سال پہلے غالباً ایسا ممکن رہا تھا۔ ان اشعار میں جیسی خارجی حسیت، بے باک اسلوب پرستی اور پرجوش جمال دوستی نظر

آتی ہے ویسی پھر غزل کے شاعر کے لیے ممکن نہ ہو سکی۔ لکھنؤ کا معاملہ البتہ مختلف ہے۔ دہلی میں تو خدائے سخن کہلانے والے میر خانہ جنگیوں کا شکار ہو کر اس قدر خوف زدہ ہوئے کہ محبوب کا دور دور سے دیدار ہی ان کا مقدر، ان کی شرافت اور ان کی تہذیب کہلایا اور وہ ناموسِ عشق کی پاسداری پر مامور ہوئے۔

دور بیٹھا غبارِ میر ان سے   عشق بن یہ ادب نہیں آتا
پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ   کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

تاہم انھوں نے دیوانگی میں بھی ہشیاری کا ثبوت دیا۔ کبھی اِس سے تو کبھی اُس سے بات کر کے اس گلی میں دن سے رات کرتے رہے اور تہذیب رسمِ عاشقی کو ایک نیا سلیقہ اور ایک نئی جمالیات عطا کر گئے۔ دیکھیے:

کیا جانوں چشمِ تر سے ادھر دل کو کیا ہوا   کس کو خبر ہے میر سمندر کے پار کی
اک آفتِ زمانہ ہے میر عشق پیشہ   پردے میں سارے مطلب اپنے ادا کرے ہے

سودا سدا کے ہنسوڑ تھے، وہ ان باتوں پر بھی ہنس دیتے تھے جن پر دوسرے روتے تھے مگر جہان آباد کی بربادی نے انھیں بھی خون رلایا۔ دیکھیے:

نجیب زادیوں کا ان دنوں ہے یہ معمول   وہ برقعہ سر پہ ہے جس کا قدم تلک ہے طول
ہے ان کی گود میں بچہ گلاب کا سا پھول   اور ان کے حسن طلب کا ہر ایک سے یہ اصول
یہ خاکِ پاک کی تسبیح ہے جو لیجیے مول

دلی پر چوروں، اچکوں، سکھوں اور مرہٹوں نے ایسی قیامت ڈھائی کہ کسی کو کسی کی خبر نہ رہی سراسیمگی کا یہ عالم تھا کہ دلی جو عالم میں انتخاب تھی، منتخب روزگار لوگوں سے خالی ہو گئی اور یہ بکھری ہوئی سبھا اس دور کے راجہ اندر آصف الدولہ کے دربار میں شیرازہ بند ہوئی۔ دلی کی اجڑی ہوئی محفل لکھنؤ میں خوب جمی۔ بقول شرر (۱۸۶۰ء-۱۹۲۶ء):

اودھ نے نئی سجاوٹوں کے ساتھ مشرقی تمدن کا آخری نمونہ پیش کیا۔ (۳)

دلی کی تہذیبی بساط الٹی تو لکھنؤ ایک انتہائی دل فریب تہذیب کا مرکز بن گیا۔ اس کے سرسبز وشاداب باغات، پر تکلف عمارات، نشاط انگیز ماحول، خوش شکل وخوش ادا طوائفوں، خوش لباس لوگوں اور علمی وادبی محفلوں نے لکھنؤ کو ایک حسین وجمیل مرقع بنا دیا۔ ایسے میں شعری جمالیات کا پیرہن رنگوں سے مزین اور خوشبوؤں سے معطر ہو گیا۔ اسی ماحول میں پہلے پہل مصحفی نے رنگوں، رعنائیوں اور جمالِ یار کی آرائشوں کے مرقعے پیش کیے:

بھیگے سے ترا رنگ حنا اور بھی چمکا   پانی میں نگاریں کفِ پا اور بھی چمکا
جوں جوں کہ پڑیں منہ پہ ترے مینہ کی بوندیں   جوں لالۂ تر حسن ترا اور بھی چمکا

آتش نے شاعری کا درس مصحفی سے لیا تھا۔ میں نے ایک بات کی اس نے کمال کر دیا کے مصداق آتش نے لکھنوی تہذیب کی جمالیات کے سارے روپ شرما دیے۔

یار کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا   رات بھر طالعِ بیدار نے سونے نہ دیا
ہر روز روزِ عید ہے ہر شب شبِ برات   سوتا ہوں ہاتھ گردنِ مینا میں ڈال کر

عین اسی لمحے آگرے کا فقیر (۴) دن رات نقارہ بجا بجا کر قزاقِ اجل کے قصے سنا رہا تھا۔ عجب منظر ہے کہ ایک طرف تو یہ عالم ہے کہ مفلسی کی باڑ نے گھر کی ہی نہیں تہذیب کی دیواریں بھی گرا دی تھیں۔

جو اہل علم عالم و فاضل کہاتے ہیں — مفلس ہوئے تو کلمہ تلک بھول جاتے ہیں
پوچھے کوئی الف تو اسے بے بتاتے ہیں — وہ جو غریب غربا کے بچے پڑھاتے ہیں
ان کی تو عمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی

اسباب تھا تو کیا رکھتے تھے لوگ رشتہ — مفلس ہوئے تو ہرگز رشتہ رہا نہ ناتا
نے بھائی بھائی کہتا نے بیٹا کہتا بابا — اس پر نظر مجھ کو رونا بہت ہے آتا
اس مفلسی زدہ کو ٹبر ملا تو ایسا

اور دوسری طرف معرکۂ عشق بپا تھا جہاں تلوار کھا کے دستِ یار کا بوسہ لیا جار ہا تھا اور جہاں رات، رنگ، روشنی، رقص، موسیقی اور بن ٹھن کے بیٹھنے کا انداز سب کے سب ایک پیکرِ ستم میں ڈھل گئے تھے۔ بقول داغ دہلوی (۲۵ مئی ۱۸۳۱ء)

بھنویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو یوں بن ٹھن کے بیٹھے ہیں

مگر افسوس، اس پر فریب منظر کا خاتمہ انتزاع سلطنت پر ہوا اور پھر اس کے بعد بس چراغوں کا دھواں باقی رہ گیا۔ اسی دھواں دھواں منظر میں غالب کی شعری جمالیات نے ایک لذت زوال کی کیفیت پیدا کی۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے درست کہا ہے کہ

غالب کی تمام تر شاعری عمومی انسانی صورتِ حال کے خلاف ایک ردعمل ہے، ایک فریاد ہے جو اس کے خارجی ماحول سے بھی ایک ربطِ معنوی رکھتی ہے۔ (۵)

یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں — نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی — ایک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

غالب نے جس آخری شمع یعنی بہادر شاہ ظفر (۱۷۷۵ء-۱۸۶۲ء) کی طرف اشارہ کیا ہے، اس کی روح کا نوحہ خود اسی کے اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے۔ حزن و ملال، شکست خواب اور بے یقینی فردا ایک ایک لفظ میں نمایاں ہے حالانکہ با آسانی ردیف میں شاکر کی 'ر' کو 'ی' سے بدلا جا سکتا تھا مگر یہ کیا کم ہے کہ شائبۂ خوبی تقدیر نے اپنی تباہی کا گلہ بھی نہ کرنے دیا۔ دیکھیے

نے خرد، نے ہوش، نے تدبیر پر شاکر ہیں ہم — دوستو اپنی فقط تقدیر پر شاکر ہیں ہم
ہاتھ سے قاتل کے کچھ شکوہ نہیں کرتے کبھی — رکھ کے آپ اپنا گلا شمشیر پر شاکر ہیں ہم
لکھا پیشانی کا پیش آتا ہے ہم شاکی نہیں — کاتب تقدیر کی تحریر پر شاکر ہیں ہم
ہم تو ہیں صید محبت تیرے اے ناوک فگن — ذکر یاں شکوہ کا کیا ہر تیر پر شاکر ہیں ہم
ہے ظفر ہم سا جفاکش کون زیرِ آسماں — ہر جفائے آسمان پیر پر شاکر ہیں ہم

یوں اس دور کی شعری جمالیات، ذات کے اندرونی تضادات، داخلی انتشار اور فنا پذیری کے احساس کی شدت سے جنم لیتی ہے۔ یہ الگ بات کہ ولی، میر، سودا، مصحفی، نظیر (۱۷۳۵ء-۱۸۳۰ء)، آتش، غالب، مومن، ذوق (۱۷۷۸ء-۱۸۵۴ء) اور ظفر (۱۷۷۵ء-۱۸۷۲ء) نے تخلیقی عمل کو مکمل اور بامعنی بنا کر تاریخ کی عطا کو بے مقصد نہیں

جانے دیا۔ غالب کا معاملہ البتہ سب سے الگ ہے وہ بیک وقت دم توڑتی ہوئی تہذیب کا فرد بھی ہے اور معاشرے کے داخلی جمود، کہنگی اور فرسودگی کے مقابل ایک بالکل نئے عہد کا نمائندہ بھی۔ وہ کلاسیکی بھی ہے جدید بھی، وہ اپنے تہذیبی زوال پر ملول بھی ہے مگر برقی تار، بجلی، دخانی کشتی اور گراموفون ریکارڈ جیسی ایجادات نے اس کی فکر کو ہی نہیں شاعری کی جمالیات کو بھی تبدیل کیا۔ محمد علی صدیقی (۱۹۳۸ء-۲۰۱۳ء) کے لفظوں میں:

غالب کے سامنے ایک طویل ڈرامے کا آخری سین کھیلا جاتا تھا اور مرد بیمار کی آخری ہچکی سنائی دینے والی تھی۔(۶)

محمد علی صدیقی غالب کی شعری جمالیات کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

غالب کی اس نتائجی (pragmatic) فکر نے انھیں ایک جمالیاتی نقطۂ نظر بھی دیا۔ جمالیاتی نقطۂ نظر درحقیقت ادیب کا وہ واضح یا غیر واضح سیاسی و فکری ایقان ہوتا ہے جو فن میں در آتا ہے۔ جمالیات یا ذوقیات سے مراد ذوق کی نشو ونما نہیں جس طرح ترقی پسندوں کی جمالیات ادب برائے زندگی کی کوکھ سے پھوٹتی ہے اور جعت پسندوں کی ادب برائے ادب کے چسکے سے۔(۷)

جدید شاعری جس کا نقطۂ آغاز غالب کی غزل ہے غالب ہی کی تقلید میں حقیقت کو تسلیم کرنے سے پیدا ہوئی ہے۔ غالب نے گھوڑوں کے ذریعے ڈاک کی ترسیل کا نظام بھی دیکھا تھا اور اب برقی تار کے ذریعے پیغامات کی آناً فاناً ترسیل کا بندوبست بھی دیکھ رہے تھے۔ حقیقت تلخ ضرور تھی مگر حقیقت کو تسلیم کر لینا ہی وقت کی ضرورت تھی۔ غالب بھی اس کرب سے گذرے تھے جو کسی تہذیب کے خاتمے سے جنم لیتا ہے۔ جو تہذیب اوڑھنا بچھونا رہی ہو اور جس تہذیب میں تصوف کو شعری جمالیات میں خاص اہمیت حاصل رہی ہو، جس میں بے عشق عمر کا ٹنا محال رہا ہو اور جس میں لذت آزار زندگی کا حاصل رہا ہو اسے چھوڑ کر ایک ایسی تہذیب، کلچر اور تمدن کو اختیار کر لینا جو بڑی حد تک اجنبی، نامانوس اور نامحرم ہو کیونکر آسان رہا ہوگا۔ محمد علی صدیقی نے درست لکھا ہے۔

کون چاہتا ہے کہ جو تہذیب گھٹی میں پڑی ہو، نامساعد حالات کی کڑی دھوپ میں اسے ناکافی سمجھنے پر مجبور ہونا پڑے۔ ایسا سمجھنے سے آدمی کس قدر بجھ جاتا ہے غالب بھی ایسے ہی کرب سے گذرے۔(۸)

مگر غالب اس کرب سے بھی گذر گئے اور نئے دستور زمانہ کا ساتھ نبھانے پر کمر بستہ ہو گئے۔ یہی نہیں وہ تو سر سید (۱۸۱۷ء-۱۸۹۸ء) کو بھی اپنے ڈھب پر لے آئے۔ ان کی شعری جمالیات ان مخصوص حالات و واقعات کی دین ہے جس سے ان کا واسطہ پڑا۔ ان حالات میں ان کا جوہر فن چمکتا رہا اور وہ عشق کی جمالیات کے کرشمے دکھاتے رہے۔

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں

غالب کی شعری جمالیات سے ہی روشنی لے کر نئی اردو شاعری کی بوطیقا مرتب ہوئی مگر اس کے ساتھ بیسویں صدی میں انقلابوں، تحریکوں اور نظریوں نے بھی شاعری کو بے پناہ متاثر کیا۔ اب شاعری میں سیاسی و سماجی تناظر کو اہمیت حاصل ہوئی۔ بیسویں صدی نے جہاں نوآبادیاتی تسلط کا نظارہ کیا وہاں صنعتی معاشرے میں سرمائے اور محنت کے درمیان کش مکش ایک مسلسل آویزش کی صورت اختیار کر گئی۔ انقلابِ روس (۱۹۱۷ء) نے اشتراکیت کو ایک طاقتور نظریے کے طور پر متعارف کرایا اور پوری دنیا دو انتہاؤں میں تقسیم ہو گئی۔ سارتر (Sartre) (۱۹۰۵ء-۱۹۸۰ء) کی کتاب Being and Nothingness (سنِ اشاعت ۱۹۴۳ء) نے وجود و عدم کے معاملات کو پیش کیا تو وجودیت کے نام سے ایک نیا فلسفہ برآمد ہوا۔ اور یوں جہاں اشتراکیت ایک پرفریب نظریۂ زندگی بنا وہاں فلسفۂ وجودیت کو عصرِ حاضر کی ایک بڑی

تحریک تسلیم کرلیا گیا۔ اگرچہ برٹ رینڈ رسل (۱۸۷۲ء-۱۹۷۰ء) جیسے تاریخِ فلسفہ کے مصنف نے اسے باقاعدہ فلسفہ تسلیم نہیں کیا مگر اس فلسفے نے وجودِ کل کے تقدم کا نظریہ پیش کیا۔ وجودیت کو انسان کی تنہائی کا فلسفہ بھی قرار دیا گیا۔ اس خیال کو اس لیے بھی تقویت ملی کہ صنعتی معاشرے کا فرد خاندان کی اکائی سے کٹ کر تنہا رہ گیا تھا۔ انسان دوستی اور سیکولرازم اس فرد کے لیے مذہب کے متبادل بن کر سامنے آئے مگر چونکہ وجودیت انسان کو کوئی غیر معمولی تسکین نہ دے سکی اس لیے فرد کی یاسیت، تنہائی اور مغائرت میں اضافہ ہوتا گیا۔ جدید اردو شاعری کی جمالیات پر اشتراکیت اور وجودیت کے بڑے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

انقلابِ روس کے بعد طاقت پکڑنے والے نظریۂ اشتراکیت کا اثر اردو میں ترقی پسند تحریک کی صورت ہوا۔

"اس دور میں اردو شاعری نے غلامی، افلاس، جہالت، سرمایہ داری، اقتصادی ناانصافی کے خلاف ایک فعال تحریک اور کارگر آلہ کی صورت اختیار کرلی"۔ (۹)

ترقی پسند شاعروں میں سب سے نکھری ہوئی، اجلی اور متاثر کن آواز فیض (۱۹۱۱ء-۱۹۸۴ء) کی تھی۔ خاص طور پر ان کی نظم "مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ" تو نہ صرف ترقی پسند شاعری کی جمالیات کی نمائندگی کرتی ہے بلکہ اردو شاعری میں موضوعاتی سطح پر ایک بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوئی۔

اب بھی دل کش ہے ترا حسن مگر کیا کیجیے ‏ ‏ لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجیے
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا ‏ ‏ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

اسی نظریے سے وابستہ شعرانے ہندوستان کی تقسیم کے عمل اور آزادی کے بعد معاشرے میں تبدیلی کو بھی اپنے مخصوص انداز سے دیکھا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری (۱۹۲۶ء-۲۰۱۳ء) کے لفظوں میں:

"یقین تھا کہ آزادی کے بعد معاشرے کا انتظامی ڈھانچہ بدلے گا۔ اس کے سیاسی، سماجی، تعلیمی و تہذیبی رویوں میں تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ عہدِ غلامی میں عدل وانصاف، جبر واختیار اور سرمایہ و دولت کی تقسیم کے جو معیارات مقرر کیے گئے تھے ان پر نظر ثانی کی جائے گی۔ آزادی کی برکتیں کسی خاص طبقے یا گروہ کے لیے مخصوص نہ ہوں گی۔ معاش کے وسائل اور ان کی تقسیم کا نیا نظام قائم ہو گا۔ امیر وغریب کے درمیان فاصلہ کم ہو جائے گا، جاگیردارانہ نظام کا وہ جبر واستبداد جو ایک مدت سے چلا آرہا ہے تادیر باقی نہ رہے گا۔ سرمائے کے ارتکاز کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے گا۔ تعلیمی نظام میں انقلابی تبدیلیاں لائی جائیں گی۔ اس طرح کی اور بہت سی توقعات آزادی سے وابستہ تھیں۔ لیکن ظلم یہ ہوا کہ آزادی اور جمہوریت سے جو توقعات وابستہ تھیں وہ پوری نہ ہوئیں۔ آرزوؤں کے سارے خواب تعبیر سے محروم رہے"۔ (۱۰)

اس تناظر میں شعرا کا ردِ عمل کچھ اس طرح ظاہر ہوا۔

قفس سے نکلے تو صحنِ چمن میں بند ہوئے
رہائی مل نہ سکی قیمت اسیری سے
(فارغ بخاری)

ہر گام پہ کچھ مسلے ہوئے پھول ملے ہیں
ایسے تو مرے دوستِ گلستاں نہیں ہوتے
(احمد فراز)

بھری برسات خالی جا رہی ہے
سوئے ابر رواں دیکھا نہ جائے

ساحلوں پر ہے ابھی اہلِ تماشا کا ہجوم
جتنے پیاسے ہیں وہ فی الحال تو پیاسے جائیں
(اسلم انصاری)

میرے خوابوں کی یہ تعبیر نہیں ہو سکتی
میری نظروں میں کوئی اور جہاں رقصاں ہے
(انجم اعظمی)

ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی
(فیض)

روشنی کے دشمن کیا آنکھ کے بھی اندھے ہیں
خون دل کے چھینٹوں سے ہر طرف چراغاں ہے
(سحر انصاری)

یہ کیا ستم ہے کوئی رنگ و بو نہ پہچانے
بہار میں بھی رہے بند تیرے مے خانے
(زہرہ نگاہ)

پھولوں کا بکھرنا تو مقدر ہی تھا لیکن
کچھ اس میں ہواؤں کی سیاست بھی بہت تھی
(پروین شاکر)

دوسری جانب وجودیت نے جس اجتماعی اور انفرادی تنہائی کے رویے کو ایک احساس کی شکل دی اس کی صورت پذیری بھی اردو شاعری کی نئی جمالیات کا حصہ بنتی رہی۔ ذات کی پسپائی، زندگی کی لایعنیت اور اپنی تنہائی سے نبرد آزما رہنے کا رویہ کہیں یاسیت کہیں ملال تو کہیں ایسے کی صورت دکھائی دیتا ہے۔ جدیدیت نے فرد کی ذات کو منفرد، یکتا اور خود مکتفی بنانے کی کوشش کی مگر اس کوشش میں ذات کے بکھرنے کا عمل شروع ہوا۔ ہندوستان میں صنعتی دور کی آمد کے بعد فرد کی تنہائی نے شدت اختیار کی۔ خاندان کی اکائی پر ضرب پڑی تو گھروں کا سناٹا بولنے لگا۔ دیکھیے:

خزینے جاں کے لٹانے والو دلوں میں بسنے کی آس لے کر
سنا ہے کچھ لوگ ایسے گذرے جو گھر سے آئے نہ گھر گئے ہیں
(ادا جعفری)

گھر یاد آ رہا تھا چلے آئے ہیں مگر
ہم اپنے سر پہ لائے ہیں صحرا اٹھا کے ساتھ
(سرشار صدیقی)

گھر سے خوشبو کے تعاقب میں نکلنے والو
میری مانند کہیں تم بھی نہ بے گھر ہونا
(حسن اکبر کمال)

سواد جاں میں نہ یوں در بدر پھرا مجھ کو
مسافرت مرے گھر کا پتا بتا مجھ کو
(عالم تاب تشنہ)

اپنی مجبوری کو ہم دیوار و در کہنے لگے
قید کا ساماں کیا اور اس کو گھر کہنے لگے
(شبنم رومانی)

ہائے یہ اندر کی تنہائی جس کے لیے چھوڑ آئے
تیرے شہر اور ترے قریے اور اپنے ویرانے
(جمیل الدین عالی)

مجھے خبر ہے میرے گھر میں سانپ آنکھیں ہیں
وگرنہ غم کے خزینے چھپا کے رکھتی کیوں
(کشور ناہید)

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے
(افتخار عارف)

عذاب یہ بھی کسی اور پر نہیں آیا
کہ ایک عمر چلے اور گھر نہیں آیا
(افتخار عارف)

عجیب ہوتے ہیں آداب رخصتِ محفل
کہ اٹھ کے وہ بھی چلا جس کا گھر نہ تھا کوئی
(سحر انصاری)

اتنا مانوس ہوں سناٹے سے
کوئی بولے تو برا لگتا ہے
(احمد ندیم قاسمی)

ساری دنیا ہمیں پہچانتی ہے
کوئی ہم سا بھی نہ تنہا ہو گا
(احمد ندیم قاسمی)

اجنبی شہر، لوگ نامانوس
کیا سنے کوئی کیا کہے کوئی
(ناصر کاظمی)

اب ایک عمر سے دکھ بھی کوئی نہیں دیتا
وہ لوگ کیا تھے کہ آٹھوں پہر رلاتے تھے
(کشور ناہید)

اور اب آخر میں اردو کے ان دو شاعروں کا بطور خاص ذکر کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے اردو غزل میں جدید حسیت اور نئی جمالیات کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان میں ایک تو یگانہ (۱۸۸۴ء-۱۹۵۶ء) ہیں جو یوں تو اینٹی غزل رویے کے لیے پہچانے جاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے انسان کی بوالعجبی، زندگی کی لایعنیت اور اپنی تنہائی کا تجزیہ جدید حسی انداز میں کیا ہے۔ ان کی شخصی انفرادیت نے تخلیقی فنکار کی باطنی پہنائیوں کے بہت سے بھید کھولے ہیں۔

شیطان کا شیطان فرشتے کا فرشتہ — انسان کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی
پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے — اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا
جو خاک کا پتلا وہ صحرا کا بگولا — مٹنے پہ بھی اک ہستی برباد رہے گی
شہرہ ہے یگانہ تری بے گانہ روی کا — واللہ یہ بے گانہ روی یاد رہے گی
زمانے پر نہ سہی دل پہ اختیار رہے — دکھا وہ زور کہ دنیا میں یادگار رہے
دل طوفاں شکن تنہا جو آگے تھا وہ اب بھی ہے — بہت طوفان ٹھنڈے پڑ گئے ٹکرا کے ساحل سے
بلند ہو تو کھلے تجھ پہ زور پستی کا — بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

اپنے ایک شعر میں فراق گورکھپوری (۱۸۹۶ء-۱۹۸۲ء) نے بیسویں صدی کے ممکنہ آفاق کے حوالے سے بڑے پتے کی بات کہی تھی۔

ہر عقدۂ تقدیر جہاں کھول رہی ہے — ہاں غور سے سننا یہ صدی بول رہی ہے

فراق خود کہاں تک اپنے دور کی نمائندگی کر سکے ابھی شاید اس کا فیصلہ نہ ہو سکے تاہم یہ امر واقع ہے کہ انھوں نے ایک بالکل مختلف کام کیا کہ اپنے تنقیدی شعور کی مدد سے زندگی کے حقائق اور تلخیوں کو تخلیقی انداز میں پیش کیا۔

رکی رکی سی شب مرگ ختم پر آئی — وہ پو پھٹی وہ نئی زندگی نظر آئی
عجب نہیں کہ چمن در چمن بنے ہر پھول — کلی کلی کی صبا گود جا کے بھر آئی

یہ بات طے ہے کہ فراق نے غزل کو بالکل نیا انداز، نیا روپ سروپ اور نیا آہنگ عطا کیا۔ یگانہ اور فراق میں فرق یہ ہے کہ یگانہ کے کلام سے ہمیں ایک ایسے موڑ کا پتا چلتا ہے جہاں سے اردو شاعری حسن و عشق کے معاملات کو پار کر کے زندگی کے ناہموار راستے کی طرف قدم بڑھاتی ہے۔ یگانہ نے حسن، حقیقت اور ضمیر کے مروجہ تصورات پر کھل کر اپنے

عدم اطمینان کا اظہار کیا۔ فراق کا وجدان اشیا کے مابین لطافتوں کو نہ صرف محسوس کر لیتا ہے بلکہ انھیں ایک تسلسل بھی عطا کرتا ہے۔ اس کا جمالیاتی ادراک وجدان کے ذریعے زندگی کے نوع بہ نوع لطائف اور حقائق کو ایک سلسلۂ خیال کی صورت سامنے لاتا ہے اسی طرح حسن کی نزاکتیں اور عشق کی کرامات فراق کے یہاں ایک محشرِ خیال برپا کر دیتے ہیں۔

یہ نکہتوں کی نرم روی یہ ہوا یہ رات — یاد آ رہے ہیں عشق کے ٹوٹے ہوئے تعلقات
یوں تو بجی بجی سی اٹھی وہ نگاہِ ناز — دنیائے دل میں ہو ہی گئی کوئی واردات
جن کا سراغ پا نہ سکی غم کی روح بھی — ناداں ہوئے ہیں عشق میں ایسے بھی سانحات
شعلۂ گل پہ چادرِ شبنم سر تا سر تصویرِ حیات — رو لینا ہے ہنستے ہنستے ہنس لینا ہے غم کے بہانے
شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس — دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

آخری بات یہ ہے کہ یگانہ اور فراق نے غزل میں ٹھیٹھ لب و لہجے کو متعارف کرایا۔ دونوں کی لفظیات اور لفظی پیکر تراشی کا عمل بہت حد تک مقامی ہے اور سب سے بڑھ کر نئی شعری جمالیات اور بالکل نئے اور جدید موضوعات کے ذریعے غزل کو ذہن جدید کے قریب لانے میں ان دونوں کا نمایاں حصہ ہے۔

حواشی

۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو (جلد اوّل)، لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع چہارم: جون ۱۹۹۵ء، ص ۵۳۸۔
۲۔ ایضاً، ص ۲۸۔
۳۔ شرر، عبدالحلیم، گذشتہ لکھنؤ: مشرقی تمدن کا آخری نمونہ، کراچی، ۱۹۵۶ء، ص ۱۷۱۔
۴۔ نظیر اکبرآبادی (۱۷۳۵ء-۱۸۳۰ء)۔
۵۔ اسلم انصاری، بحوالہ مضمون ''غالب و مومن کے عہد کا ادب اور مسلمانوں کا سیاسی زوال'' مشمولہ کتاب ''ادبیات عالم میں سیر افلاک کی روایت''، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، اپریل ۲۰۰۶): ص ۱۳۸-۱۳۷۔
۶۔ محمد علی صدیقی، بحوالہ مضمون ''غالب کی جمالیات'' مشمولہ کتاب توازن کی جہات، ملتان، شعبۂ اردو بہاءالدین زکریا یونی ورسٹی، اپریل ۲۰۰۷، ص ۳۳۰۔
۷۔ ایضاً۔
۸۔ ایضاً، ص ۳۳۵۔
۹۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری بحوالہ مضمون و کتاب ''اردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ''، لاہور، وکٹری بک بینک، جولائی ۱۹۹۲ء، ص ۱۴۔
۱۰۔ ایضاً، ص ۱۵۔

فکرِ اقبال یا تفہیمِ اقبال کا المیہ؟

جلیل عالی

''رابطے'' کی ایک محفل میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے غیر رسمی گفتگو میں کہہ دیا کہ اقبال کو ہم لوگوں نے رحمتہ اللہ علیہ بنا رکھا ہے اور اس کے خلاف کوئی بات نہیں سنتے۔ میں نے بڑے ادب سے عرض کیا کہ جالبی صاحب آپ تو یوں نہ کہیں۔ آپ کی نظر سے کیا اوجھل ہے۔ اقبال کے خلاف کون سی، نا شائستہ بات بھی، ایسی ہے جو چھپی ہوئی موجود نہ ہو۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اقبال پر کوئی سنجیدہ بات کرنے کے لئے ایک خاص ذہنی اور مطالعاتی سطح درکار ہے، جو ہر کس و ناکس کے بس میں نہیں۔ یہ جمیل جالبی صاحب کی عظمت ہے کہ انہوں نے اتفاق فرمانے میں دیر نہ کی۔ اب جو ڈاکٹر صلاح الدین درویش کی زیرِ نظر کتاب ''فکرِ اقبال کا المیہ'' کے مقدمے میں ڈاکٹر روش ندیم کا ایسا ہی ایک بیان کہ

''اقبال پر تنقید کو کفر سمجھے جانے کے باعث روشن خیال، ترقی پسند، حتیٰ کہ لبرل اذہان اسے نظر انداز کرنے ہی میں عافیت جانتے ہیں'' (ص ۲۶)

دیکھا تو مجھے خیال آیا کہ یہ جو محترم ایوب صابر نے اقبال پر کئے گئے اعتراضات کے جواب میں پانچ چھ جلدیں قلمبند کر رکھی ہیں، اس سے بڑا دستاویزی ثبوت اور کیا ہوگا کہ اقبال کے خلاف کس بھاری مقدار میں چھپا ہوا مواد موجود ہے۔ فکرِ اقبال کی مخالفت کا سلسلہ تو ان کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ اس 'کارِ خیر' میں ملحد، مذہب مخالف اشتراکی اور مغرب زدہ لبرل دانشوروں کے ساتھ ساتھ علمائے دین بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش   میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

رینے گینوں کی پیروی میں اسلام کو سکونی تہذیب تصور کرنے والے محمد حسن عسکری اور ان کے ہمنواؤں، سلیم احمد جمال پانی پتی، احمد جاوید اور سہیل عمر کو شکایت ہے کہ اقبال نے فکرِ اسلامی میں ارتقائی سوچ کی بدعت داخل کر کے اچھا نہیں کیا۔ سہیل عمر تو یہاں تک کہہ گئے کہ اس حوالے سے اسلام کو جتنا نقصان اقبال نے پہنچایا ہے چودہ سو سال میں کوئی اور نہیں پہنچا سکا۔ ایک طرف یہ صورتِ حال ہے اور دوسری طرف اقبال کو علم و سائنس دشمن اور رجعت پسند قرار دینے والوں کی بھی کمی نہیں۔

اقبال کے خلاف اکثر تحریریں مناظراتی رویئے کی عکاس ہیں اور کسی ہم آہنگ نکتۂ نظر کا پتہ دینے کی بجائے جو بھی اینٹ روڑا میسر آ جائے، دے مارنے کے وتیرے کی مظہر ہیں۔ علی عباس جلالپوری جیسا عالم فاضل بھی اپنی تصنیف 'اقبال کا علم الکلام' میں اس روش سے دامن نہیں بچا سکا۔ مدیرِ فنون احمد ندیم قاسمی کے نام اس تصنیف بارے میرے ایک جملے کی پاداش میں، جسے مدیرِ محترم نے حذف بھی کر دیا، مجھے اڑھائی سال تک فنون بدر کئے رکھا۔ اس جملۂ معترضہ سے قطع نظر ڈاکٹر صلاح الدین درویش کی تصنیف میں بھی ایسا ہی مناظراتی مظاہرہ دیکھ کر میں نے طے کر رکھا تھا کہ اس پر کچھ نہیں کہوں گا۔ مگر اب میری معذرت نامنظور کرتے ہوئے موصوف نے اصرار کیا ہے کہ میں اپنے تاثرات ضرور سامنے لاؤں۔

تفصیل میں جانے سے پہلے عرض کردوں کہ کتاب بارے میرا تاثر یہ ہے کہ

(۱) صلاح الدین درویش نہ صرف سراسر مادی نظریۂ حیات پر یقین رکھتے ہیں بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کو انسانیت کا محسنِ اعظم گردانتے ہیں۔ اور زندگی اور کائنات کو کسی اخلاقی و روحانی زاویۂ نگاہ سے دیکھنے اور سمجھنے کے سخت خلاف ہیں۔

(۲) اقبال کو اپنے آخری تجزیے میں سائینسی تحقیق و تلاش اور مادی و تمدنی ترقی کا مخالف قرار دیتے ہیں۔

(۳) اور اس مقصد کے لئے اقبال کی کلی اپروچ سے رُوگردانی کرتے ہوئے اس کے شعری کلام اور نثری تحریروں کو اصل تناظر سے ہٹا کر دیکھتے اور اپنے نتائج کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔

(۴) اس سارے عمل میں واضح طور پر اپنے مؤقف کے خلاف جانے والے متن سے جان بوجھ کر اغماض برتنے اور کلامِ اقبال کی غلط اور من مانی تعبیر کرنے کے دونوں حربے بروئے کار لاتے ہیں۔

اقبال کے شعر و فکر کی ہمہ جہت اپیل پر غور کرنے کی بجائے صلاح الدین کو یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ مختلف نکتہ ہائے نظر کے لوگ اقبال کو اپنے اپنے مؤقف کی تائید میں کیوں استعمال کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ''اس مضمون کی تکمیل نے مجھے یہ کہنے کا حوصلہ دیا ہے کہ روشن خیال، اعتدال پسند، جمہوریت نواز، ترقی پسند اور مادیت پسند اشتراکی خیالات کے حامل حلقے فکرِ اقبال کی مربوط تفہیم کے بغیر ہی اپنی اپنی نظریاتی تشہیر کے لئے فکرِ اقبال کے مختلف گوشوں کو اپنی اپنی پسند اور ترجیح کے مطابق استعمال کر رہے ہیں'' (ص ۹، ۱۰)

تفہیمِ اقبال کی خاطر لکھی جانے والی تحریروں میں تو دیانت داری کا تقاضہ یہی ہے کہ اقبال کے اصل اور مرکزی فکری حوالوں کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ مگر اپنے کسی مؤقف کی تائید میں افکارِ اقبال سے جزوی استفادہ کرنا کوئی جرم تو نہیں ہے۔

مغرب کی تہذیبی تاریخ پاپائیت کی بالادستی کی تاریخ ہے۔ جس کے ردِعمل میں جدیدیت نے الوہی اتھارٹی کی نفی ضروری سمجھی۔ اقبال نے ہمیں یہی سمجھانے کی کوشش کی کہ اسلام ان معنوں میں مذہب نہیں ہے جو عیسائیت کی تاریخ سے مترتب ہوتے ہیں۔ یہ تو ایک مسلسل سماجی و تہذیبی تحریک کا نام ہے۔ اسی لئے اسلام میں نہ تو کبھی پاپائیت رہی اور نہ کبھی کسی لوتھر کے سامنے آنے کا کوئی امکان ہے۔ اب جس مجہول اور استحصالی باطن کا حوالہ پاپائیت بنی اس کی جائز نفی کا یہ مطلب کہاں نکلتا ہے کہ سرے سے انسان کی باطنی دنیا کا تذکرہ ہی بے جواز ہو جائے۔

صلاح الدین نے اقبال کی ابتدائی شاعری میں ایک رومانوی اور سرور بخش یاسیت کو مرکزی حیثیت دی ہے۔ اور اپنی ذات، کائنات اور خدا کی حقیقت جاننے کے بارے اقبال کے اس شدید اضطراب و تجسس کو درخورِ اعتنا نہیں جانا، جو اس کے فکر و احساس کے اگلے سفر کی سیڑھی بنا۔ اس سے قطع نظر کہ انسان کی اخلاقی و روحانی زندگی پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، موصوف کے نزدیک مادی ترقی ہی سب کچھ ہے۔ بلکہ روحانیت تو انہیں ایک بے معنی شے دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ اس پہلو سے وہ اقبال کی تشویش کو طنز کا نشانہ بناتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''مادی علوم و فنون کی تعلیم چونکہ مزید مادی ترقی کا باعث بنتی ہے اور مزید مادی ترقی چونکہ روحانیت کا مزید صفایا کر دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اقبال جدید تعلیم اور مادی ترقی کے زبردست ناقد ہیں

''(ص ۴۸)

سوال پیدا ہوتا ہے کیا مادی ترقی کی ہر صورت انسان کے مفید مطلب ہے؟ اگر قطعیت کے ساتھ ایسا نہیں ہے تو اعلیٰ انسانی مفاد میں مادی ترقی پر تنقیدی نگاہ ڈالنا غیر ضروری اور مذموم کیسے ہو گیا؟ پھر جو شخص خدا کو بھی یہ کہہ سکتا ہو کہ

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اور یہ سمجھتا ہو کہ

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں — کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے
جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہو گا یہی ہے اک حرفِ محرمانہ — قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ

وہ مادی ترقی کا آنکھ بند نقاد اور قطعی مخالف کیسے ہو سکتا ہے؟ سائنسی مشاہدہ و تحقیق کے ضمن میں تو ابتدائیہ نگار ڈاکٹر روش ندیم نے بھی پروفیسر فتح محمد ملک کا یہ اقتباس درج کرنا ضروری محسوس کیا ہے کہ

''اقبال کے خیال میں خالقِ اکبر کی نت نئی تخلیقی اداؤں کا سائنسی مشاہدہ افضل ترین عبادت ہے مظاہرِ فطرت کے مطالعے میں جذب سائنسدان کو اقبال ایک ایسا صوفی قرار دیتے ہیں جو اللہ کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ قوانینِ فطرت کی سائنسی تلاش و جستجو کو وہ قربِ خداوندی کا مؤثر وسیلہ قرار دیتے ہیں۔'' (اقبال فراموشی)

ایک اور تہمت یہ ہے کہ

''پورے کلام میں اقبال نے عقائد کی کمزوری کے اسباب کو کہیں بھی خود عقائد میں دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی اور سارا ملبہ کم و بیش اپنی شاعری میں جدید علوم، جدید معاشرت، جدید تہذیب اور مادی تمدن پر گرا دیا اور خود ہی عجیب و غریب نتائج اخذ کر لئے۔'' (ص ۵۱)

حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ تمام شارحینِ اقبال اس پر متفق ہیں کہ اقبال مسلمانوں کے زوال میں کلیدی سبب دنیا گریز عجمی تصوف کو قرار دیتا ہے۔ اور اس نتیجے پر وہ اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے ''ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقا'' کی تکمیل کے دوران ہی پہنچ گیا تھا۔ اس نے ایسے بے شمار اشعار لکھ رکھے ہیں۔

یہ امت روایات میں کھو گئی — حقیقت خرافات میں کھو گئی
تمدن، تصوف، شریعت، کلام — بتانِ عجم کے پجاری تمام

اس میں جدید علوم، جدید معاشرت، جدید تہذیب اور مادی تمدن پر مسلمانوں کے زوال کا ملبہ کہاں گرایا گیا ہے؟

مصنف فرماتے ہیں:

''زمانہ اپنی چال چل چکا ہے کل کے شاہانِ ارض و فلک مات کھا چکے ہیں۔ ان حالات میں اقبال

کے تصورات کی بنیاد پر ملتِ بیضا کی بیداری آخر کیا معنی رکھتی ہے۔ چنانچہ اقبال ملتِ بیضا کو معجزات کے انتظار میں تنہا چھوڑ دیتے ہیں'' (ص ۵۴)

اس کے بعد اقبال کے یہ اشعار درج کرتے ہیں

ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری — مشامِ تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشاں اس کا
مری دانش ہے افرنگی مرا ایماں ہے زناری — تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر

انہیں اس بات کا احساس نہیں کہ ان اشعار میں تو باقاعدہ مرض کی نشاندہی کی گئی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ خالی خولی اندازوں سے گوہرِ مقصود ہاتھ نہیں آسکتا۔ اہداف کے حصول کے لئے ضروری، خصوصی اور عملی اہلیت درکار ہوتی ہے۔ اور 'مرا ایماں ہے زناری' میں تو مسلمانوں کے مسخ شدہ عقائد ہی کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اور اقبال نے مسلمانوں کو معجزات کے انتظار میں نہیں چھوڑا بلکہ تاریخی اعجاز کر دکھایا۔ اپنے زندہ افکار اور تحریکی کلام سے ذہنی بیداری پیدا کر کے نہ صرف جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو آزادی کی راہ سجھائی اور دنیا کے نقشے پر پاکستان کو جلوہ گر کیا بلکہ بیسویں صدی کے اواخر پر اپنے معنوی مریدین علی شریعتی اور امام خمینی کے ذریعے ایران میں بادشاہت کا تختہ الٹوا کر عظیم انقلاب برپا کر دکھایا۔ یہ اکیسویں صدی جارہی ہے۔ کشمیر و فلسطین اور عراق و افغانستان کی مزاحمتی تحریکوں کے پیچھے اقبالی تصورات کی جھلک دیکھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آنی چاہئے۔

دیکھنا یہ ہوگا کہ کہ اقبال قرآنی حوالے بے عملی اور علم دشمنی پیدا کرنے کے لئے لاتا ہے یا تسخیرِ کائنات اور جہد و عمل پر ابھارنے کے لئے۔ مگر موصوف تو ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں کہ

''اقبال عقل و خرد کی ہنر کاری کا مذاق اڑاتے ہیں کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس میں بجز گمراہی کے کچھ نہیں دھرا۔۔۔ اقبال کی ایک نظم 'زمانہ حاضر کا انسان' اس سلسلے کی بہترین مثال ہے۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا — آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاؤں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا''

(ص ۵۷)

درویش صاحب یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ان اشعار میں عقل و خرد کا مذاق نہیں اڑایا گیا، اسے فلاحِ انسانی کا نصب العین یاد دلایا گیا ہے اور ترجیحاتِ انسانیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کسی بہتر نظریۂ حیات کی تشکیل کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

احمد فراز جب یہ کہتا ہے کہ

بستیاں چاند ستاروں کی بسانے والو — کرۂ ارض پہ بجھتے چلے جاتے ہیں چراغ

تو کیا وہ سائنسی تحقیق کی مخالفت کر رہا ہے؟ اقبال جو کہ بعض منطقوں میں عقل کی نارسائیوں کا احساس دلانے کے لئے بھی دلیل و برہان کا راستہ اختیار کرتا ہے وہ عقل و خرد کی کلی و قطعی نفی کیسے کر سکتا ہے؟ وہ تو مغرب کے سچے عشق سے تہی ہونے اور مشرق کے انتشارِ فکر اور حقیقی عقل سے محروم ہونے پر رنج و غم اور برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے۔

مردہ لادینی افکار سے افرنگ میں عشق — عقل بے ربطیِ افکار سے مشرق میں غلام

صلاح الدین درویش کو علم ہونا چاہئے کہ شاعری میں الفاظ علامتی واستعاراتی اور مجازی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں علمی واصطلاحاتی قطعیت کے ساتھ نہیں۔لہٰذا اشعار میں جہاں لفظ عقل دیکھا اسے فوراً علم وآ گہی کے مفہوم میں لے لینا اور جہاں لفظِ عشق دیکھا اسے فوراً نفیِ عقل وخرد تصور کر لینا درست نہیں۔شاعر کے استعاراتی مافی الضمیر اور الفاظ کے معنیاتی سیاق پر نگاہ رکھے بغیر اشعار کی درست تفہیم ممکن نہیں۔اخلاقی انسانی اقدار:اخوت،محبت،احترامِ انسانی،ایثاروقربانی،بلند کرداری اور عدل ومساوات کی پاسداری محض عقل نہیں عشق اور کومٹمنٹ سے بروئے کار آتی ہے۔

ایک اور اقتباس دیکھئے۔

''عالمِ رنگ وبو بھی چونکہ مغرب کے دستِ تحقیق میں ہے۔یہی وجہ ہے کہ اقبال اس عالم سے گزر جانے کی تلقین کرتے ہیں۔اوران جہانوں کی طرف نگاہ التفات اٹھانے کا پیغام دیتے ہیں کہ جسے اقبال کے خیال میں عقلی یا سائنسی انسانی تدبیر سے مسخر نہیں کیا جا سکتا۔اقبال دنیاوی زندگی کے وہ مسائل کہ جن کو عقل یا تدبیر سلجھانے کی کشمکش میں مبتلا ہے،سے مکمل اجتناب اور گریز کی تعلیم دیتے ہیں۔''

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا — کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
(ص ۶۰)

کسی بڑے نصب العین سے لے کر زندگی کے کسی بھی شعبے میں تحقیق وتلاش اور عروج وکمال کے لئے روزمرہ زندگی کے عیش وآرام کی قربانی لازم آتی ہے۔اوراس سفر میں چھوٹے چھوٹے مفادات سے اوپر اٹھانے والی رفعتِ نگاہ اور بلند کرداری از حد ضروری ہے۔اتنے توانا اور ترقی پسند خیال کو دنیا گریزی کی تعلیم کے معنی پہنانا کہاں کی شعرشناسی ہے؟اوراگراس شعر کے دوسرے مفہوم یعنی مادی دنیا کے علاوہ روحانی دنیا کی سیر کی دعوت کو بھی سامنے رکھا جائے تو اقبال نے مادی دنیا سے معاملے پر خطِ تنسیخ کہاں کھینچا ہے؟وہ تو مادی دنیا کے ساتھ ساتھ روحانی وارتقائی عالم کے ثمرات بھی سمیٹنے کی ترغیب دے رہا ہے۔

اقبال کے شعوروبصیرت بارے موصوف کے سوئے ظن کا یہ عالم ہے کہ انسان سے غیر معمولی کارنامے سرانجام دلانے والی یقین واعتماد کی نفسیاتی توانائی تک کی نفی کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔اوراقبال کے ایسے ولولہ انگیز اشعار کو فکری الجھاؤ کا نام دیتے ہیں۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا — تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا
غلامی میں نہ کام آتی ہیں تدبیریں نہ شمشیریں — جو ہو ذوقِ یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اشعار کی غلط تفسیر کے علاوہ انہوں نے واضح طور پر حرکت وحرارت اور جہد وعمل پر ابھارنے والے اقبال کے ایسے سینکڑوں اشعار کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی — یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد — مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے　　کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی　　اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

اقبال تو خدا اور کائنات اور روح و مادے کی دوئی کا قائل ہی نہیں ہے۔ وہ تو یہ سمجھتا ہے کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ ایک کی نفی دوسرے کی نفی ہے۔

بعض مقامات پر تو اپنی شعری روایت سے مصنف کی بے خبری پر حیرت ہی نہیں ہوتی باقاعدہ ترس آنے لگتا ہے۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ اقبال مغرب سے اللہ واسطے کا بیر رکھتا ہے، پانچویں باب کے آغاز میں لکھتے ہیں۔

''اقبال یورپ میں تھے تو بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں کا جدید ترین تمدن ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ لیکن اقبال نے اسے انسان کی عظمت قرار دینے کی بجائے لطیف پیرائے میں ویرانہ کہہ دیا۔

فرنگ میں کوئی دن اور بھی ٹھہر جاؤں　　مرے جنوں کو سنبھالے اگر یہ ویرانہ

(ص ۶۷)

انہیں اندازہ ہی نہیں کہ جنوں اور ویرانے کے شعری تعلق کی روایت سے ناواقفیت نے ان سے کیسی مضحکہ خیز بات کہلوا دی ہے۔ ہماری شعری روایت میں ویرانہ تو وہ میدانِ عمل ہے جو اپنی وسعتوں کے اعتبار سے عشق و جنوں (اعلیٰ مقاصد) کے بروئے کار آنے کے لئے سازگار ماحول کا ضامن ہوتا ہے۔ اقبال نے ایک اور شعر میں پوری فطرت (کائنات) کے بارے میں بھی یہی بات کہہ رکھی ہے۔

سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا　　غلط تھا اے جنوں شاید ترا اندازۂ صحرا

یہ صحرا وہی ویرانہ ہے جو غالب کے اس عظیم شعر میں دشت بن کر سامنے آیا ہے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب　　ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

اقبال مغرب کے تہذیبی و معاشرتی ماحول کو اپنے وجود کے جملہ تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں پاتا اور کئی پہلوؤں سے اس کی تنگ دامانی کی بنا پر تشنگی محسوس کرتا ہے۔ اپنے بہت سے اشعار میں اس نے اعلیٰ انسانی اقدار اور روحانی نشو و نما کے حوالے سے مغرب کی غفلت کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

اقبال مسلم ممالک کے درمیان جس ربطِ خفی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر　　خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمی

اور اس ربط و تعلق کو کوئی عملی سمت دے کر نتیجہ خیز بنانا چاہتا ہے، صلاح الدین درویش ایسے کسی ربط کے وجود و امکان کی مکمل طور پر تردید کرتے ہیں۔ حالانکہ اس ربط کی موجودگی کے کئی اثباتی اور سلبی مظاہر بار بار سامنے آتے رہتے ہیں۔ مثلاً

(۱) کیا گاندھی کی طرف سے مشرقِ وسطیٰ کے ممالک سے روابط استوار ہونے کے اندیشوں کی بنا پر مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کئے جانے،

(۲) پاکستان کے ایٹمی تجربے کو اسلامی بم کا نام دیئے جانے،

(۳) پاکستانی قیادت میں اسلامی سربراہی کانفرنس کے انعقاد سے مسلم ممالک کے درمیان اقتصادی تعاون کی

راہیں ہموار ہونے کے خدشات کے پیشِ نظر مغربی مہربانوں کی طرف سے نمائندہ کرداروں کے ساتھ کئے اور کرائے جانے والے 'عبرت ناک' سلوک اور

(۴) مسلم ممالک کے اندر اپنے استحصالی کردار کے خلاف شدید اجتماعی ردِعمل ابھرنے کے خوف سے خود کو جمہوریت کی سب سے بڑی حامی قرار دینے والی واحد عالمی سپر طاقت کی طرف سے ان میں بادشاہتوں اور فوجی آمریتوں کی سرپرستی کرتے چلے آنے کے حقائق سے عالمِ اسلام یا ملتِ اسلامیہ کے تصور کی تصدیق نہیں ہوتی؟

صلاح الدین درویش کو سرمایہ دارانہ نظام سرتاپا انسانیت کا محسنِ اعظم دکھائی دیتا ہے۔ وہ اس کے خلاف اعلیٰ اخلاقی و روحانی معیارات کے حوالے سے کی گئی اقبال کی تنقید تو ایک طرف، خالص مادی بنیادوں پر اٹھائے گئے اشتراکیوں کے اعتراضات کا بھی مضحکہ اڑاتے ہیں۔ انہیں عالمی سرمایہ داروں کی طرف سے دوسرے ممالک کو اپنی نو آبادیاں بنانے یا معاشی وسیاسی ہتھکنڈوں سے اپنا غلام بنائے رکھنے پر بھی اعتراض نہیں بلکہ وہ اس استعماریت کو شاندار سرمایہ دارانہ نظام کے کارپردازوں کا فطری حق گردانتے ہیں۔

> "وہ سرمایہ داری نظام جس نے اپنے قومی جاگیرداروں اور بادشاہ کو معاف نہیں کیا اور بطور ایک نئی قوت کے ان کی جگہ لے لی، ان سے یہ اخلاقی توقع رکھنا کہ وہ "اغیار" کے جاگیردارانہ اور شاہانہ نظاموں کو اکیلے مال ہڑپ کرتے رہنے کی کھلی اجازت دیئے رکھتے، تاریخی منطق کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ صنعتوں کو اپنے پیداواری اہداف کو پورا کرنے کے لئے خام مال کی لازمی ضرورت تھی اسلئے اس ضرورت نے سرمایہ داری نظام کو اپنی سرحدوں سے باہر نکلنے میں مدد دی۔" (ص ۸۳)

سرمایہ دارانہ نظام کی عمارت بے قید ذاتی ملکیت کی آزاد معیشت پر قائم ہوتی ہے۔ جب کہ اشتراکیت ذاتی ملکیت کے مکمل خاتمے اور اجتماعیت کے غلبے کا نظام ہوتا ہے۔ دونوں کے تجربے سے سبق سیکھ کر اب دنیا مخلوط معیشت کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔ اقبال کے ہاں فرد اور اجتماع کے درمیان ایک توازن کے قیام میں ایسی مخلوط معیشت کی طرف واضح اشارے ملتے ہیں جن میں ذاتی ملکیت کو مناسب حدود کے اندر رکھ کر اجارہ داری کا راستہ روکنے اور مکمل اجتماعی ملکیت سے فردی انفرادیت کو غارت ہونے سے بچانے کا جتن ہو سکے۔ مگر متوازن معاشی نظام کے باوجود انسان کو امن و محبت سے رہنے اور بہتر معاشرتی وتہذیبی سطح پر جینے کے لئے کسی جامع عمرانی معاہدے کی ضرورت ہے۔ اور انسانی زندگی کا یہی وہ علاقہ ہے جس میں اقبال کی طرح کے سنجیدہ فکر دانشوروں کی کاوشیں از حد ضروری ہیں۔ اقبال جاگیردارانہ جمہوریت اور سرمایہ دارانہ جمہوریت، دونوں کے خلاف ہے اور ان کے مقابل روحانی جمہوریت کا تصور پیش کرتا ہے۔ وہ جمہوریت کو اجتماعی انتظام و انصرام کا بہتر ذریعہ تو سمجھتا ہے مگر اسے کلی نظامِ حیات کے طور پر قبول نہیں کرتا۔ وہ مذہبی قانون سازی کا اختیار بھی پارلیمنٹ کو سونپ کر 'مذہب عوام کے ذریعے عوام کے لئے' کی راہ ہموار کرنے کا قائل ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ سمجھتا ہے کہ تمام اقدارِ حیات پر فیصلہ سازی کا حق اکثریتی رائے کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔ بعض مستقل روحانی اقدار کی پاسداری کے بغیر ہر معاملے میں جائز و ناجائز طے کرنے کے لئے اکثریت کی سند کو حکم بنانے سے ہی ہم جنسیت جیسی لعنت قانونی سرپرستی حاصل کر جاتی ہے۔

اشعارِ اقبال کے مطالب تک نہ پہنچ پانے کی معذوری یا ان کے مفاہیم کو عمداً مسخ کر کے پیش کرنے کی مثالیں اس کتاب میں جگہ جگہ بکھری پڑی ہیں۔ اقبال کے اس طرح کے اشعار کہ

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

میں بھی مصنف کو تسخیرِ فطرت و کائنات کے لئے مادی و سائنسی راہ اپنانے کی بجائے اقبال صرف باطنی حوالے پر بھروسا کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ان کے الفاظ یوں ہیں کہ

''وہ (اقبال) ستاروں پر کمندیں ڈالنے والوں سے محبت کرتے ہیں مگر کائنات کی تسخیر سائنس اور ٹیکنالوجی کے مادی وسائل کی بدولت نہیں بلکہ محض باطنی حوالے سے کرنے کو کہتے ہیں۔'' (ص۹۰)

اس طرح کے اشعار کا ایسا مفہوم تو سکولوں کے بچوں کی تقریروں میں بھی دکھائی نہیں دیتا۔ اگر ہمارے نوجوان بھی کلامِ اقبال کو موصوف کی نگاہ سے دیکھتے تو سائنس و ٹیکنالوجی کی یونیورسٹیوں کی دیواروں پر اس کے اشعار نہ جگمگا رہے ہوتے اور پاکستان کے بڑے بڑے سائنسدان اقبال کے دلدادہ نہ ہوتے۔

حضرت رنگ و نسل، فسطائیت اور پاپائیت کے خلاف اقبال کے واضح خیالات کی تحسین کرنے کی بجائے الٹا اقبال کو ان کا حامی ثابت کرنے نکل پڑتے ہیں۔ اقبال کا یہ مشہور شعر کہ

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے سومنات

نقل کر کے لکھتے ہیں کہ

''وہ (اقبال) خود اپنے فکری حوالوں میں نسل، قومیت، سلطنت، تہذیب اور رنگ کی خواجگی میں پیش پیش ہیں۔'' (ص۹۲)

ترکوں، عربوں، افغانیوں اور کشمیریوں کی تعریف میں کچھ کہہ دینے سے اقبال کو قوم پرستی کا مرتکب قرار دے ڈالنے جیسے جاروبی بیانات کو آزاد خیال ملائیت کے سوا کیا نام دیا جاسکتا ہے۔ وہ اس مقام پر اقبال کے یہ اشعار

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

بھی درج کر گئے اور یہ نہیں سوچا کہ اگر جغرافیائی قومیت پرستی ترجیح ہو تو مختلف مسلم اقوام کی مشترک میراثِ خلیل کے کیا معنی باقی رہ جاتے ہیں۔ جیسے کہ پہلے کہا گیا شاعری میں الفاظ لغوی یا اصطلاحی معنوں میں نہیں مرادی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس میں میراثِ خلیل سے مراد قرونِ وسطیٰ میں علم و تحقیق کے ناتے اسلامی دنیا کا تاریخ ساز کردار ہے۔ اور 'مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز' کا اشارہ ان کے علم و تحقیق سے دستکش ہو کر زوال کا شکار ہو جانے کی طرف ہے۔ 'تثلیث کے فرزند' سے مراد مسیحی دنیا ہے۔ یہاں اقبال دراصل اپنے اس معروف مؤقف کو دہرا رہے ہیں کہ عصرِ جدید میں مغرب کی علمی و تحقیقی ترقی کی بنیاد اسلامی دنیا ہی کا چھوڑا ہوا ورثہ ہے۔ اور وہ اس میدان میں مغربی دنیا کے عروج کا اعتراف کرتے ہوئے مسلمانوں کو پیچھے رہ جانے کی تلخ حقیقت کا احساس دلا رہے ہیں۔

کتاب کا ایک خوبصورت اور حقیقت پسندانہ اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

''فرنگی مدنیت ہرگز آئیڈئل نہیں ہے اور نہ ہی کوئی ارتقا پذیر تمدن آئیڈئل ہوسکتا ہے۔اس میں تدبر بھی ہے حماقت بھی،کمال بھی ہے لغزش بھی،عیاری بھی ہے سادگی بھی،جھوٹ بھی ہے سچ بھی،ظلم بھی ہے ناانصافی بھی اور تعمیر بھی ہے تخریب بھی'' (ص ۹۵،۹۶)

اب اقبال اگر اس تمدن کے منفی مظاہر پر تنقید کرتے ہیں تو یہ بھی تو تہذیبی ارتقائی عمل ہی کا حصہ ہے۔مگر یہ بات تو اقبال کو اس کے صحیح فکری تناظر میں دیکھنے ہی سے سمجھ میں آسکتی ہے،اسے علم،سائنس اور ترقی کا دشمن ثابت کرنے کے مناظراتی جنون سے کیا حاصل ہوسکتا ہے۔اقبال کی مخالفت میں اپنے اس اقتباس کو بھول کر وہ مغربی تمدن کی فحاشی وعریانی کو انسانی مسئلہ تصور کرنے ہی سے انکار کردیتے ہیں۔لکھتے ہیں

''عریانی و مے خواری اقبال کا اپنا کوئی اخلاقی مسئلہ ہے،تہذیب مغرب کا اس مسئلے کی خاص نوعیت سے کوئی تعلق نہیں'' (ص ۹۵)

اقبال تو صرف اخلاقی وروحانی معذوری ہی نہیں،مغرب کے استعماری اور استحصالی کردار کا بھی پردہ چاک کرتا ہے۔

شفق نہیں مغربی افق پر یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے
طلوع فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ

لوتھر،نٹشے اور میکیاولی کے پیدا کردہ مغربی جہان کی طرف سے ابھی ماضی قریب میں نیو ورلڈ آرڈر کے تحت عراق وافغانستان،لیبیا اور دیگر مسلم ممالک میں قتلِ انسانیت کی جو تاریخ رقم کی گئی ہے سب کے سامنے ہے۔دنیا کے بیسیوں ممالک میں استعماری مقاصد کے حصول کے لئے اتاری گئی افواج اور عسکری اڈوں کی موجودگی الگ ہے۔مگر صلاح الدین درویش تو اسے اپنے چہیتے سرمایہ دارانہ نظام کا تاریخی ومنطقی حق قرار دیتے ہیں۔

''اس بڑے کل کے اجزائے ترکیبی میں وطنیت اور قومیت پرستی،نسلی افتخار اور احساسِ برتری اور مغربی نوآبادیاتی نظام کے محکوم اقوام کے ساتھ جبری معاہدوں کی سیاست بھی شامل ہے۔محض آخرالذکر کو ہی کل قرار دے دینا سرمایہ داری کی تاریخ کو تعصب کی آنکھ سے دیکھنے کے مترادف ہے۔'' (ص ۸۰)

اقتباس کے دوسرے حصے بارے اتنا اشارہ ہی کافی ہے کہ سائنسی ترقی صرف سرمایہ داری نظام ہی سے مخصوص نہیں۔سائنسی ترقی تو سوشلسٹ نظاموں میں بھی ہوئی مگر انہوں نے استحصال اور سماجی جرائم کو بڑی حد تک کم کردیا۔جہاں تک اقبال کے لیکچرز پر تنقید کا تعلق ہے،اس سلسلے میں سب سے پہلے ان لیکچرز کے موضوع کو سمجھنا ضروری ہے۔یہ کوئی فلسفے کی کتاب نہیں ہے۔اس کے نام'' Reconsrution of religious thought in islam''ہی سے ظاہر ہے کہ اس کا موضوع اسلام میں مذہبی فکر کی نئی تشکیل ہے۔گویا یہ دیکھنا ہوگا کہ اقبال سے پہلے مسلم مذہبی فکر کی نوعیت کیا تھی۔اور اقبال کی فکر اس سے کتنی مختلف ہے۔کیا اقبال نے اس میں کسی نئی جہت کا اضافہ کیا ہے۔اور اگر کیا ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے۔اور مسلم تہذیب کے جنوبی ایشیائی منطقے اور پھر پوری اسلامی دنیا میں اس کی کیا قدر وقیمت ہے۔اس کے بعد عالمی فکری وتہذیبی تناظر میں بھی اس کی اہمیت کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ہمارے ملک کے ایک انتہائی روشن فکر فلسفی

دانشور ڈاکٹر منظور احمد کا کہنا ہے کہ چودہ سو سالہ مسلم فکری تاریخ میں جتنا بڑا ریک تھرو اقبال نے کیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ اقبال کہتا ہے کہ اس نے عصری تناظر میں نئی فکری راہیں کھولنے کی ابتدا کی ہے، وقت کے ساتھ اس میں اور لوگ اضافے کر سکتے ہیں۔ سو فکرِ اقبال سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر اسے کلی طور پر سائنس مخالف اور ترقی دشمن ثابت کرنے بیٹھ جانا علمی سنجیدگی اور فکری توازن سے لگا نہیں کھاتا۔ مزید یہ کہ جو شخص مذہبی قانون سازی کا اختیار بھی پارلیمنٹ کے سپرد کر دینے کی تلقین کر رہا ہو اس کو ملائیت کا واضح مخالف تو کہا جا سکتا ہے جمہوریت کا کلی مخالف نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ اقبال کو قرآنی ہدایت سے فیضیاب انسانوں کے اجتماعی ضمیر پر پورا بھروسہ ہے۔ وہ عوام پر کسی مذہبی گروہ کی حکمرانی کی بجائے مذہب براستہ عوام پر یقین رکھتا ہے۔ اقبال کی یہ اجتہادی فکر اس کے روحانی جمہوریت کے تصور کو اجاگر کرتی ہے۔

عالمی سرمایہ دارانہ استعماریت کے خلاف استحصال سے پاک معاشرے کے قیام کے عالمگیر نصب العین کی داعی خالص مادی بنیادوں پر اٹھنے اور آدھی دنیا پر اپنے نظام کا پرچم لہرا دینے والی اشتراکی تحریک کی پسپائی کے بعد انسان کی روحانی اور مادی دونوں جہتوں کو پیشِ نظر رکھنے والی فکرِ اسلامی، اقبال جس کا ایک اہم اور جدید نظریہ ساز ہے، دنیا میں جگہ جگہ مزاحمت کی تاریخ رقم کر رہی ہے۔ ایسے فعال کردار کی موجودگی میں اس پر بے مصرف ہونے کا بہتان نہیں باندھا جا سکتا۔ ایک طرف ایک مقدس نسلیت کی داعی انسانیت کُش جمعیت کی معاشی و سیاسی حکمتِ عملی کی آلۂ کار بن کر اب تک دنیا کو ایٹمی تباہی کا تحفہ عطا کرنے والی فسطائی قوت اور اس کے حواری ہیں اور دوسری طرف رنگ، نسل اور زبان کی تفریق سے اوپر اٹھ کر شرفِ انسانی کو افضلیت دینے والی تہذیبی تحریک ہے جو سائنسی ترقی اور سپر ٹیکنالوجی کو طاغوتی مقاصد کا ایندھن بنانے کے خلاف سینہ سپر ہے۔ ذرا سی ترمیم کے ساتھ اقبال ہی کے ایک مصرعے پر بات ختم کرتا ہوں کہ اس صورتِ حال میں

فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

مابعد جدید کلچر کی جمالیات

ڈاکٹر اقبال آفاقی

آرٹ سے متعلق تخلیقی خالص پن، تازہ کاری اور نبوغ کے تصورات بے حد کشش کے حامل ہیں۔ نشاط ثانیہ کے عہد سے انسان نے ان تصورات کے بارے میں رومانی انداز میں سوچتا آیا ہے۔ یہ سلسلہ روسی سوشلسٹ حقیقت نگاری کے دور تک پوری آن بان سے چلتا رہا لیکن سوشیور کی ساختیات کے فروغ کے ساتھ حالات نے پلٹا کھایا۔ خصوصاً فرانس میں انسانی علوم کے ماہرین اور آرٹ کے نقادوں کی طرف سے ان تصورات کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اس زمانے میں تجریدی آرٹ اپنے عروج پر تھا۔

سب سے پہلے آرٹ کے نقاد ٹام وولف نام نے شکایتاً لکھا کہ فن کارانہ خود پرستی اور بے مہار انفرادیت کے چکر میں پڑ کر مصوروں نے ایسی مجرد اور اظہاری پینٹنگز بنانا شروع کر دی ہیں جو بورژوائیت کی باسی کڑی کا ابال لگتی ہیں۔ یہ ایک نا قابل فہم اور بدمزہ کھیل ہے۔ اس کھیل کو کھیلنے والے آرٹسٹوں نے یہ ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے کہ دنیا کو ایک ایسے رخ سے دیکھا جائے کہ بورژوا طبقے کے لوگ بھی اسے نہ دیکھ سکیں۔ اس دوران آرٹسٹوں نے یہ بھی طے کر لیا کہ سربلندر ہنے کے لئے ضروری ہے کہ سرنگوں رہو اور ہمیشہ جوان رہو۔ اسے بوہمین طرز زیست کا نام دیا گیا۔ (1)

وولف نے مزید لکھا کہ بوہمین طرز زیست سے وابستہ خالص تخلیقیت کی نشوونما اب ممکن نہیں رہی اور نہ ہی اس قسم کے تصورات کی تائید کی جا سکتی ہے۔ تخلیقیت اور انفرادیت کے تمام دعوے موجودہ حالات میں کلیشے بن چکے ہیں۔ کلیشے جو لایعنی ہی نہیں دور از کار بھی ہوتے ہیں۔ یہ 1983ء کی بات ہے کہ ہال فوسٹر نے آرٹ کی عجب صورت حال سے ہمیں ان الفاظ میں آگاہ کیا۔ مابعد جدید عہد میں کوئی نظم یا مصوری کا نمونہ فن ایسا نہیں کہ جو دوسروں سے اعلیٰ اور ممتاز ہو۔ ان حالات میں کسی بھی نمونہ فن کو جدیدیت کی اصطلاح میں منفرد، یکتا، علامتی اور بصیرت افروز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ وجہ یہ کہ اس نے پہلے سے موجود متون کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور اس کی حیثیت تمثیلی اور حادث ہے۔ (2)

ابتداً یہ خیالات ساختیات کے ہمہ گیر دباؤ کے نتیجے میں سامنے آئے۔ ساختیات کے زیر اثر یہ یقین کر لیا گیا کہ آرٹ کی تخلیق میں لسانی اور ثقافتی ضابطوں کا کردار غالب ہوتا ہے۔ معروف فرانسیسی مارکسی مفکر آلتھیوسے مارکسی ساختیات کا ماہر ہے۔ اس نے ادب و فن کی نظریاتی حیثیت کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون (A Letter on ArT) میں آرٹ اور سائنسی علم کے درمیان جگہ دی ہے۔ آلتھیوسے کا خیال ہے کہ ادبی تخلیق لکھاری کے نظریے کی حدود سے آگے نکل جاتی ہے۔ لکھاری کسی صورت حال کو جس طرح محسوس کرتا ہے وہی دراصل اس کی آئیڈیالوجی ہوتی ہے۔ آلتھیوسے نے سماج کی تنظیم کو ایک ایسی ساخت کی صورت میں دیکھا جو لامرکز ہے۔ اس ساخت کا کوئی انتظامی اصول نہیں ہوتا، کوئی تمہید کا حامل بیج نہیں ہوتا، کوئی مجموعی وحدت نہیں ہوتی۔ (3)

اسی طرح ماشیرے کا دعویٰ ہے کہ تخلیق نامیاتی کل نہیں ہوتی کہ جس کا محض ایک معنی ہو بلکہ وہ تو ایک ساخت

ہے جو بہت سے معنی کا مخزن ہے۔ بقول ماشیرے ایک حقیقت پسند لکھاری کا مقصودنظر یہ ہوتا ہے کہ متن کے تمام عناصر کو یکسانیت کس طرح عطا کی جائے۔ جب متن کی تیاری کا عمل چل نکلتا ہے تو جو صورت سامنے آتی ہے اس میں ناگزیر طور پر بہت سے جھول رہ جاتے ہیں۔......... کچھ کہنے کے لئے ضروری ہے کہ بہت سی چیزیں بالکل نہ کہی جائیں۔ادب کی بقا کو یہ ثابت کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ تخلیق کے تمام اجزا کس طرح باہم مربوط ہوں اور یہ کہ تخلیق کے ظاہری تضادات کو کس طرح ہم آہنگ یا ہموار شکل میں سامنے لایا جاسکتا ہے۔ (4)

ایک بات طے ہے کہ آلتھیوسے اور ماشیرے دونوں ساختیات کے دائرۂ کار میں رہ کر ہر قسم کی نظریاتی کاملیت اور تصوراتی مرکزیت کی نفی کرتے نظر آتے ہیں۔آلتھیوسے جہاں آرٹ آئیڈیالوجی کے جبر سے انکاری ہے اور اصرار کرتا ہے کہ ادب آئیڈیالوجی سے آگے نکل جاتا ہے وہاں ماشیرے متن کے اندر موجود ناگزیر ناہمواری اور تضادات کی نشاندہی کو فرض جانتا ہے۔ استدلال یہ ہے کہ متن کے کوئی ایک معنی نہیں ہوتے اور نہ ہی متن کو کسی آئیڈیل فریم ورک میں رکھ کر دیکھا جاسکتا ہے جیسے کہ اظہاریت پسند آرٹسٹوں نے ذہن کے آئینے میں اس کی تصویر بنا رکھی تھی۔

مزید یہ کہ ساختیاتی نہج نے نہ صرف تصوریت وتجریدیت کی نفی کی بلکہ نزاکت اور نفاست کے قدری اور آرائشی پیمانوں کو بھی مسترد کر دیا ہے۔

علاوہ ازیں ساختیات نے اعلیٰ آرٹ کی برتری کے دعوؤں کی تنقیض کی ہے اور ذاتی بصیرت سے مربوط تخلیقی انفرادیت کے تصور کو وہم والتباس قرار دیا۔ جولیا کرسٹیوا نے اسی پس منظر میں فاعل کو جوہریت وآفاقیت سے محروم لامرکز ذات کہا ہے۔ کرسٹیوا موضوع کی نفی کے حوالے سے لاکان کے نیوفرائیڈین مکتب فکر سے متاثر تھی۔اس نے متن پر تجربے کو فوقیت دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بورژوا جماعت کی بجائے عام لوگوں کے مستند تجربات پر ادب اور آرٹ کی توجہ مرکوز ہونے لگی۔عام لوگ جو نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور جنہیں فرانز فینن نے Wretched of the Earth کہہ کر پکارا۔کافکا نے بھی جن کے بارے میں Metamporphosis ایسی بہت سی کہانیاں تحریر کیں۔ چنانچہ اب ادب وفن کا موضوع وہ لوگ قرار پائے اور ان لوگوں کے تجربات کو اہمیت دی گئی جن کے یہاں زندگی کے سفر میں کانٹوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔کوتاہ نصیب لوگ جو سماجی تذلیل اور اہانت کا شکار ہوئے یا جن کو کمتر قومیت، نسل، جنس اور اقلیتی جماعت سے متعلق ہونے کی بنا پر نظر انداز کر دیا گیا یا جن کو معاشی مفادات کی خاطر مرکز سے دور حاشیے پر پھینک دیا گیا۔مرکز جو طاقت اور مراعات کی علامت ہے۔

جولیا کرسٹیوا نے 1962ء میں ایک مضمون شائع کیا تھا۔''دہشت کی طاقت: اہانت پر ایک انشائیہ'' جس میں اُس نے استدلال کیا تھا کہ ہر وہ چیز یا شخص جو اہانت اور تذلیل کا شکار ہوتا ہے اسے سماج کے علامتی نظام سے باہر کر دیا جاتا ہے۔سماجی نظام بلاشبہ بے پناہ موضوعیت (Subjectivity) کو جگہ دینے کے باوصف شدید قسم کے تخصص کا پرچار کرتا ہے جس کے مطابق نظام میں ڈھلنا لازم ہوتا ہے۔نظام میں کوئی واضح حیثیت یا خاص مقام پانے کے لئے اپنے اندر کی ہر اُس چیز کو دبا دینا ضروری ہوتا ہے جو فرد کو اُس کی مادی فطرت کی یاد دلاسکتی ہے۔ چونکہ ارزل بشری تقاضوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے، اس لئے وہ اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ اپنی ذات کے مادی تقاضوں کو غلیظ اور ناگوار قرار دے کر ان سے گلوخلاصی حاصل کرے۔لیکن ارزل کی یہ کوششیں عارضی ہوتی ہیں۔ کیونکہ جلد ہی اسے احساس ہو جاتا

ہے کہ سماج کے علامتی نظام میں اُس کی شمولیت مشکوک اور اُس کے دائرۂ کار سے متصادم ہے۔ اُس لمحے جب (subject) کو ادراک ہوتا ہے کہ اُس کی مطابقت کی ہر کوشش مشکوک اور ناکام رہے گی تو اس کا ردِّعمل شدید قسم کے تنافر کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ جولیا کرسیٹوا اس ردِّعمل کو ارزلیت اور خفت سے موسوم کرتی ہے۔ (5)

اس سلسلے میں ایک اور لفظ بھی معنی خیز ہے فوکو نے جسے Alterity کا نام دیا ہے۔ یہ لفظ پس جدیدیت کے مخاطبوں میں غیر (Other) کا متبادل ہے۔ فوکو کے نزدیک 'غیر' کے معنی میں وہ تمام لوگ آتے ہیں جو طاقت اور اقتدار کے دائرے سے باہر پھینک دیئے گئے۔ چونکہ لبرل انسانیات کے متعین کردہ معیارات پر یہ لوگ پورا نہیں اُترتے، اس لئے ایسے لوگوں کو سماجی انا کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ فوکو کا اولین مقصد ان لوگوں کو تاریخ اور فلسفے کی غلام گردشوں سے برآمد کرانا ہے۔ ان لوگوں کی کہانی بیان کرنا ہے جنہیں تحتانی حیثیت دے کر تاریخ نے نظر انداز کر دیا۔ فلسفہ بھی ان کے خلاف سماجی تنافر کے سدباب میں ناکام رہا۔ نتیجتاً ان لوگوں کو اپنے سیاسی، قانونی اور سماجی حقوق سے محروم ہونا پڑا۔ فوکو کے نزدیک ہم جنس، خواتین، پاگل، سیاہ فام (Non-Whites) اور بہت سے دوسرے جو لبرل سماج کی موضوعیت (Subjectivity) پر پورا نہیں اُترتے یا معاشرتی درجہ بندی میں جن کا کوئی مقام نہیں۔ پس ساختیات اور مابعد جدیدیت کے حامی مفکرین نے ان مغربی سماج کے حاشیوں پر زندہ رہنے والے بے کس اور بے حیثیت لوگوں کو اہمیت دی ہے۔ ان کی لبریشن کی بات کرتے ہیں۔ ردِّتشکیلیت سے متعلق مخاطبوں (Discourses) میں ایسے لوگوں کو منفی حزبِ اختلاف کا نام دیا جاتا ہے۔ ان ماتحت طبقوں کی مزاحمتی آوازوں کو لوگوں تک پہنچانا اور ان کو نظریے اور معنی کے جبر سے نجات دلانا دریدا کی ڈی کنسٹرکشن کے اہداف میں شامل ہے۔

بہت سے ناول نگاروں اور فلم سازوں نے ڈی کنسٹرکشن کے بنیادی احساس کو پیشِ نظر رکھ کر عورتوں، خواجہ سراؤں اور لوطیوں، لزبینز اور Incest کے تجربات پر ناول لکھے اور فلمیں بنائیں۔ اس قسم تجربات و موضوعات اس لئے بھی مقبول ہوئے کہ ان کا مقصد مابعدالطبیعی جو ہریت اور سماجی Taboos کی مزاحمت اور مخالفت تھا۔ اسے آپ سماجی یا ثقافتی نظریات میں پیرڈائم شفٹ بھی قرار دے سکتے ہیں۔ آرٹ کے نقاد جان بیرل نے ماڈرنٹی کے دور میں پروان چڑھنے والے 'متوازن' آرٹ کے نظریے کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ اس کے نزدیک متوازن آرٹ جو مفروضہ طور پر ہنر مندی اور برجستگی کو بیک وقت اہم سمجھنے کا دعوے دار ہے۔ یہ آرٹ اوپر دی گئی صورتوں میں ایک جعلی حدِ اوسط کو بروئے کار لاتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے ایک مثالی تشکیل سے ملتی جلتی سماجی صورتِ حال کو مصور کرتا ہے جسے درمیانے طبقے کی صورتِ حال کا نام دیا گیا ہے۔ درمیانہ طبقے کا تعلق اشراف سے ہے نہ ہی اجلاف سے۔ یہ طبقہ رجعت پسند ہے نہ ہی ترقی پسند۔ (6)

لیکن سوال تو یہ ہے کہ اس خوشحال متوسط طبقے یا بورژوا جماعت کے پسندیدہ آرٹ کا بھلا ظلم اور ہتک کے شکار اور نظر انداز کردہ لوگوں سے کیا واسطہ؟ ماضی میں اس قسم کا آرٹ جو پس ماندہ اور بے حیثیت لوگوں کے زندگی کے تجربات کو بطور موضوع اور مواد بروئے کار لاتا اسے فضول، شرمناک، بدنما اور ناشائستہ کہہ کر دھتکار دیا گیا۔

بیرل نے بورژوائی آرٹ کی بجائے اس آرٹ کو ترجیح دی ہے جو محروم اور بے دخل لوگوں کی صداؤں کی بازگشت ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ انگلش ادب کی مسلمہ روایت کے اندر لکھی گئی زیادہ تر شاعری ایک مخصوص طبقے اور صنف کی تخلیق کردہ ہے۔ اس شاعری کو اعلیٰ آفاقیت کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ ان مخصوص معنوں میں جن کو سامنے رکھ کر ایک

مقتدر جماعت اور صنف آرٹ کو آفاقی بنا کر پیش کر سکتی ہے۔(7)

آفاقیت سے مراد اس جماعت یا جنس کی پسند و ناپسند سے متعلق ترجیحات کا دائرہ کار ہے۔ ہر وہ چیز آفاقی اور اعلیٰ شمار ہوگی جو اس مخصوص جماعت یا جنس کی ترجیحات کے ثقافتی امتیازات کو قبول کرتی ہے۔ جو چیز مخصوص ثقافتی امتیازات کی حدود سے باہر ہے وہ اعلیٰ اور آفاقی نہیں ہو سکتی۔ اعلیٰ آرٹ کا تصور ایسے ہی ثقافتی امتیازات کا پاسبان ہے۔ ان امتیازات کو اس ثقافتی گروہ کے داخلی تعصبات سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ معاصر مابعد جدید تناظر میں پسند و ناپسند کی اس طبقاتی تقسیم کو اہمیت حاصل ہوئی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم اس طبقاتی بصیرت کو انفرادیت اور خالص تخلیقیت کی اساس کیوں قرار دیتے ہیں۔ جواباً عرض کیا جا سکتا ہے کہ یہ بصیرت چونکہ مرکزیت پسند بھی ہے اور طاقتور کے جماعتی اور صنفی مفادات کا تحفظ بھی کرتی ہے اس لئے دلچسپی کا مرکز ہے۔ گویا یہ سارا کھیل مفادات کی پاسبانی کا کھیل ہے جس سے ایمانداری اور خلوص دونوں مفقود ہیں۔

للیئن ایلس رابنسن کی لکھی ہوئی دو صفحے پر مشتمل آٹو بائیوگرافی کی مثال اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ اس خود نوشت کا کمال یہ ہے کہ یہ کسی فرد یا صنف کی نمائندہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک عام گروہ کے احساسات کی ترجمان ہے۔ اس میں للیئن نے واقعاتی بیانیے کی تکنیک کو برت کر سروس کرنے والی عورتوں کے سر سکول کے واقعات کو بیان کیا ہے۔ اس تحریر میں افسردہ لمحات اور خوشگوار ڈرامائی کیفیات نہایت پیش پا افتادہ انداز میں سامنے آتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ اس کی تحریر میں خوبصورتی اور شائستگی کا وہ معیار مفقود ہے جو عام ادبی تحریروں کا خاصا ہے۔ اس کے باوجود یہ خلوص اور ایمانداری سے لکھی گئی تحریر ہے۔ یہی اس کی خوبصورتی ہے۔ رابنسن کا اصرار ہے کہ کلیشے اور جذباتیت کو امتیازی نثر کی پہچان نہیں بنانا چاہیے۔(8) یہ دعویٰ یوں درست نظر آتا ہے کہ کلیشے اور رومانی تخیلات باہم مل کر کسی بھی تحریر کو حقیقت سے دور مابعد الطبیعی موجودگی کی طرف لے جاتے ہیں۔ رامن سیلڈن نے لکھا ہے:

> ادبی نقاد اور تجزیہ نگار دریدا جو ردتشکیلیت کا بانی ہے نے اپنے جان ہاپکنز یونیورسٹی کے سمپوزیم میں پیش کردہ مقالے میں لکھا تھا کہ ساخت کے تصور کا انحصار مفہوم کے مرکز پر ہوتا ہے۔ یہ مرکز ساخت کا تعین کرتا ہے۔ مگر بذات خود ساخت پسندانہ تجزیے سے مشروط نہیں ہوتا کیونکہ مرکز کی ساخت معلوم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک اور مرکز دریافت کیا جائے۔ بہرحال لوگ اس لیے مرکز کے طلب گار ہوتے ہیں کہ یہ مابعد الطبیعی موجودگی کے ہونے کی ضمانت دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم اپنی ذہنی اور جسمانی زندگی کو ایک 'میں' پر مرکوز سمجھتے ہیں۔ یہ شخصیت اس وحدت کا اصول ہے جو اس خلا میں جو کچھ رواں دواں ہے اس کی ساخت میں کارفرما ہے۔...... مغربی سوچ نے بے شمار ایسی اصطلاحات کو فروغ دیا ہے جو مرکزیت کے اصول کو بروئے کار لاتی ہیں۔ مثلاً ہونا، نچوڑ، ٹھوس مواد، سچائی، شکل، آغاز، انجام، مقصد، شعور، آدمی، خدا وغیرہ۔" (9)

دریدا Logocenterism کا اس لیے بھی مخالف ہے کہ یہ قدیم الٰہیات سے متعلق ایک تعقل ہے جس میں مرکزیت اور وجود کے حوالے سے خدا کی موجودگی کا تصور لازمی ہے۔ اس تصور کو مغربی تہذیب نے وجودیات کے

ایوان کا بنیادی پتھر بنالیا ہے۔ بادشاہ، ہیرو، پوپ، آمر، شداد اور منظم مرکزی حکومتیں اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ایک ہی وجود کے چہرے ہیں۔ ایک ہی اسم اعظم کے کمالات ہیں۔ اسم اعظم تھیوری کے مطابق ہستی کو عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ دریدا نے مقدس لفظ کی الٰہیاتی مرکزیت اور اس کے معجزات کے نظریے کو مسترد کر دیا ہے۔ اس کی بجائے اس نے متن کی تکوین، معنی کی کثرتیت، وجود کے عدم استحکام اور صورت حال کی اضافیت پر زور دیا ہے یہاں ہمارا مقصود اس کے تفکر کو بروئے کار لا کر اس معنیاتی سامراجیت کو بے نقاب کرنا ہے جس کے زیر اثر مفکروں اور نقادوں نے زبان کے معنیاتی کھیل اور سماجی کوڈز کو بے اثر بنانے یا ان کے عمل دخل کو محدود کر کے ان کو مرکز فراہم کرنے یا ان میں معنی کی حضوریت کو ثابت کرنے اور ان کے ماخذ کی نشاندہی کی صدہا سال سے کوششیں کی ہیں تاکہ متن کو توازن اور ترتیب دی جاسکے، تاکہ اس کے ساخت کو منظم کیا جاسکے اس کو Being کے ابدی دائرے میں جگہ دی جاسکے۔ ان کوششوں پر پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ ابدیت کی ہر خواہش ایک فضول افلاطونی کھیل ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس قسم کی کوششیں بقول دریدا اس لئے کامیاب نہیں ہو سکتیں کہ ان کے تعین کے لئے کوئی اسٹرکچر موجود نہیں جو متن کو توازن اور ترتیب دے سکے۔ اگر کوئی نظر آتا بھی ہے تو اس کے اندر موجود بے شمار داخلی تضادات، روزیں اور دراڑیں موجود ہیں۔ چنانچہ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہیں ہوگا کہ کوئی متن یا تحریر کلی طور پر متحد اور یکسو نہیں ہوتی۔ نکتہ رس نقاد کی طرف سے کی گئی قرأت ہمیں ان فضول خوابوں سے بیدار کرا سکتی ہے جو ہم ساخت کی مکمل ہم آہنگی اور اس میں حتمی طور پر معنی کی موجودگی (Presence) کے بارے میں دیکھتے ہیں جسے ہم یقینی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ فہمیدہ قرأت ہمیں تضادات وافتراقات کا مشاہدہ کرنے کے قابل بناتی ہے۔ اسی حوالے سے پس ساختیات میں قاری اور تصنیف کے رشتے کو مصنف اور تصنیف کے رشتے پر فوقیت دی جاتی ہے۔

معنی کی مرکزیت کے عواقب پر والٹر بنجامن نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے سوال اُٹھایا ہے کہ کیا سماجی زندگی کا مکمل اور حتمی تصور (جس میں نبوغ اور تخلیقیت کے ساتھ اور اسراریت بھی موجود ہو) ہمیں بالآخر فسطائیت کی طرف نہیں لے جاتا۔ (10)

اگر کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے یہاں انسانیت اور سماجی زندگی کا طلسماتی طور پر درست وژن موجود ہے تو سیدھی سی بات یہ ہے کہ جو بھی اس تصورِ معنی اور اس کی تشریح سے اختلاف کرے گا سراسر غلط ہوگا جس کا مطلب یہ ہے اس کم فہم کو خود اپنی تصحیح اور اصلاح کرنا ہوگی۔ بہ صورت دیگر انتظامیہ کی ذمہ داری ہوگی کہ اسے ڈسپلن میں لائے یا منظر سے ہٹا دے۔ (11) وژن اور معنی جمالیاتی رویوں پر اجارہ داری کا مطلب فسطائیت نہیں؟ بارت نے اسی قسم کے منفی روّیوں کے پیش نظر فلاح کے فارمولوں اور ترقی کے کلیہ قائدوں پر مبنی انسان دوستی کے نظریات (مہابیانیوں) کو مسترد کیا ہے۔

دریدا نے دانش، بصیرت اور معنی پر اجارہ داری کے روّیوں کی نفی کرتے ہوئے متن کی مستقل، متعینہ مرکزیت پسندی کے تصور کی سخت مخالفت کی ہے کیونکہ اس ڈگر پر چل کر ذہنی آمریت اور نظریاتی نرگسیت پروان چڑھتی ہے جو اختلافی آوازوں اور افتراقی رویوں کو جبر سے دبا دینے پر قادر ہوتی ہے۔ معنی کی اجارہ داری اور وژن کی حتمیت کا عملی نمونہ روس میں بالشویکی کیمونسٹوں نے اشتراکی حقیقت پسندی کے نام پر پیش کیا۔ بورس پیسٹرنک نے اپنے ناول ڈاکٹر ژواگو میں نظریے کے نام پر دہشت گردی کو نہایت مہارت کے ساتھ مصور کیا ہے۔

بہر حال موضوع گفتگو یہ ہے کہ ہر قسم کی مفروضہ طور پر ہر اُریجنل تخلیق کی ساخت میں لسانی، ثقافتی سماجی

افراقات ومفادات پر مبنی ضابطے اور روایات کارفرما ہوتی ہیں۔ اگرچہ ضابطے اور روایات مربوط اور مکمل طور پر سامنے نہیں آتے، پس منظر میں رہ کر کام کرتے ہیں۔ بارت نے پس منظر میں موجود ضابطوں کو Langue کا نام دیا ہے۔ لانگ جسے نفسیات کی زبان میں اجتماعی لاشعور بھی کہا جاسکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اجتماعی لاشعور سے کیا مراد ہے۔ معروف ماہر نفسیات کارل یونگ نے اسے نسلی اور ثقافتی ورثے کا نام دیا ہے جو فرد کی نفسیات کے تہہ خانوں میں ماقبل تاریخ زمانے سے نسلی تجربات کی صورت میں یکجا ہوتا آ رہا ہے۔ (12) یونگ کے اجتماعی لاشعور کے بارے میں ثقافتی وراثت کے تصور کا بھی فرد/مصنف کو مابعدالطبیعی مرتبے سے محروم کرنے میں اہم کردار رہا ہے۔

یونگ کے اس تصور کو بنیاد بنا کر دعویٰ کیا گیا کہ تحریر یا تصنیف بہت سے متون کا آمیزہ ہے جو مشترکہ ثقافتی ورثے سے برآمد ہوئے۔ بارت نے بھی اس جواز کو سامنے رکھ کر ساختیاتی تعقلات مثلاً ادارہ، معنی، جواز (raison d' etre) اور مدلول ایسے تصورات سے کنارہ کشی کی ہے۔ اس کے نزدیک معنی متن سے بتدریج منہا ہوتا اور آخر کار معدوم ہو جاتا ہے۔ اس صورت حال میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر متن کس چیز کا نام ہے؟ متن بارت کے نزدیک Signifiers کی ایک کہکشاں کا نام ہے۔ یہ بات اس نے S/Z میں بالزاک کے مختصر ناول Sarrazine پر گفتگو کرتے ہوئے لکھی تھی۔ (13) اس کا مطلب یہ ہے کہ بارت کے یہاں معنی کی نفی دراصل متن کے تعقلاتی ساختیے کی نفی ہے۔ ایک ایسے متن کی نفی جس کا آفاقی سطح پر ادراک کیا جا سکے، جس کا ترجمہ اور ترسیل کی جا سکے۔ وہ Signifieds کے بارے میں نہیں سوچتا۔ اس کے نزدیک صداقت صرف سگنی فائرز کی صوتی جہات تک محدود ہے کیونکہ صرف سگنی فائرز ہی متن کی صداقت یا غیر صداقت کا تعین کرتے ہیں۔ بارت نے اس طرح اڈورنو کے ادب اور آرٹ کے بارے میں Truth Content کے تصور سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ اس کا اصرار اس نکتے پر ہے کہ متن کی فعلیت معانی کی بے پناہ کثرتیت کی حامل ہے۔ اس نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ معنی کی کثرتیت آرٹ اور ادب کی داخلی صفت ہے۔ متن کا کھلا پن اور ابہام نفسیاتی طور پر جمالیاتی آرزو کو نا مختتم نہ ہونے والی اہمیت کے ساتھ بیدار کرتے ہیں۔ کسی بھی فن پارے میں ساخت کے حوالے سے بیک وقت بہت سے معانی جلوہ آرا نظر آتے ہیں۔ چنانچہ یہ کہنا غلط ہوگا کہ معنی کی کثرتیت قاری کی خامیوں اور کمزوریوں کا نتیجہ ہے۔ (14)

جوناتھن کلر نے بارت کے استدلال کو کسی حد تک مبہم قرار دیا ہے کیونکہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے یہاں کوڈز سے مراد اجتماعی علم اور مشترکہ اقدار ہیں یا کچھ اور۔ تاہم بنظر غائر دیکھا جائے تو S/Z میں کوڈز کے بارے میں زیادہ واضح موقف اختیار کیا گیا ہے۔ بارت کی اس تشریح کے مطابق کوڈ ہر اس شے کو محیط ہے جو پہلے ہی لکھی، پڑھی، دیکھی اور کی جا چکی ہے۔ اگر اس تشریح کو قبول کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ معنی آفرینی، تخلیقیت اور نبوغ ایسے تصورات دل کی تسکین تو کر سکتے ہیں لیکن ان کی بجائے خود کوئی حیثیت نہیں۔ یہ بات طے ہے کہ معنی آفرینی اور تخلیقیت ایسے ماڈرن آرٹ کے تصورات ماضی قریب کی پیداوار ہیں۔ نشاط ثانیہ سے قبل آرٹسٹ کو زیادہ تر کرافٹ مین کہا جاتا تھا جو چرچ اور اشرافیہ کے لئے طے شدہ شرائط کے مطابق معاوضے پر کام کرتا۔ یہ تو رینے ساں کے دور میں ہوا کہ انفرادیت اور اپج کی قدر و تحسین کی جانے لگی۔ یورپ کی شہری زندگی میں ابھرتی ہوئی بورژوا کلاس نے بھی ان کو علیٰ پیانے پر ہنرمندی کے کمالات دکھانے کے مواقع فراہم کیے۔ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کی نہ صرف تحسین کی گئی بلکہ معاشی خوش حالی بھی ان کو حاصل

ہوئی۔ لیکن اٹھارویں صدی کے صنعتی انقلاب کی شروعات سے حالات شاعر، موسیقار اور کلاکار سرکار و دربار کی سرپرستی سے محروم ہوئے۔ اس دوران چرچ بھی حاکمانہ اثر و رسوخ کھو بیٹھنے کے سبب آرٹ کی استعانت کے قابل نہ رہا۔ آرٹسٹ کے لیے روزگار کے حصول کا اب ایک ہی راستہ تھا کہ بورژوا طبقے کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ اس سے مقابلے کی فضا پیدا ہوئی۔ انفرادیت اور تخلیقی اپج اور ذاتی ذوق کو فروغ ملا۔ زیرِ موج اُصول وہی کارفرما تھا جسے بقائے بہترین (Survival of the fittest) کا اصول کہتے ہیں۔ تخلیقی برتری کی خواہش نے مثبت مقابلے کی فضا پیدا کی۔ اس صورت حال میں کانٹ اور ورڈز ورتھ اور کانٹ ایسے نظریہ ساز مفکرین بھی منظر عام پر آئے جنھوں نے یہ تصور قائم کیا کہ آرٹسٹ اور مصنف خاص طرح کی انسپریشن اور نبوغ (genius) کی کیفیات سے ہم کنار ہوتا ہے۔ یہ کیفیات اسے تخلیقی عمل پر ابھارتی ہیں۔ اُصول یہ طے پایا کہ تخلیقی عمل میں انسپریشن اور نبوغ کے بغیر کمال حاصل کرنا ناممکن ہے۔ اس اُصول کی بنیاد پر مصنفوں اور آرٹسٹوں پر لازم ٹھہرا کہ وہ خود کو انڈسٹریل آرٹ اور گھریلو ہنرمندوں سے خود کو برتر ثابت کریں۔

فوکو نے آرٹ کے اس تاریخی پس منظر کو ایک مخصوص انداز میں اپنی کتاب The Order of things میں بیان کیا ہے۔ اس کے مطابق سترھویں اور اٹھارویں صدی کے دوران وہ حالات پیدا ہوئے جن میں جدید موضوعیت کی تشکیل وقوع پذیر ہوئی۔ اسے آپ یورپی سماج کی ایک ایسی کایا کلپ قرار دے سکتے ہیں جس میں مصنفوں اور آرٹسٹوں پر منکشف ہوا کہ وہ نئی صورت حال میں اپنے کام اور نقطہ ءِ نظر کے اظہار میں خود مختار ہیں۔ وہ جائیداد خرید سکتے ہیں اور لوگوں سے قابل عمل معاہدے کر سکتے ہیں۔ قانون ان کے حقوق کا محافظ ہے۔ یہ نئی سماجی تشکیل قرون وسطی کے جاگیر ارانہ قوانین وضوابط سے بالکل مختلف تھی جن کا مقصد ہمیشہ طاقتور کے حقوق کی پاسبانی اور ایک بڑے کونیاتی نظام کی پرستش تھا۔ اس کونیاتی نظام اور طاقت کے اصول کو سامنے رکھ کر افراد اور طبقات کی حیثیت اور مقام کا تعین کیا جاتا۔ ان کے مطابق حقوق مقرر کیے جاتے۔ قرون وسطی کے قوانین میں سے جاگیر دارانہ غلبے اور ملکیت کا قانون سب سے افضل تھا۔ اس کے برعکس دورِ جدیدیت میں طاقت کے اصول پر قائم سماجی نظام کی کسی بھی طبقاتی تقسیم کو قبول کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس انکار کو بذات خود ایک اجتماعی قدر کے طور پر آگے بڑھایا۔ انکار پر مبنی پروٹسٹنٹ تحریک اور Subjectivity اسی کا تسلسل تھے۔ اس انکار اور بغاوت کے نتیجے میں شہری سماج میں مڈل کلاس وجود میں آئی۔ افراد کو معاہدے کرنے اور اپنے تجربات و مشاہدات کو منظر عام پر لانے کی آزادی فراہم ہوئی۔ آرٹسٹوں اور مصنفین کو اپنی تخلیقات اور خدمات کی آزادانہ فروخت کا حق تفویض ہوا۔ انفرادی طور پر ان کو عزت و وقار کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ بارت نے اپنے آتھر کی موت والے مضمون میں لکھا:

> ''فلسفہ ءِ ایجابیت اور سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کا یہ نچوڑ اور منتہائے کمال تھا کہ جس نے مصنف کی شخصیت کو اہم ترین مقام عطا کر دیا۔'' (15)

مشل فوکو نے ماڈرنٹی کے دور میں موضوعیت کے فروغ کی روداد اس طرح بیان کی ہے:

> ''آپ بیتیاں لکھنے کا رواج روز افزوں ہے۔ خاندان بڑے ہو رہے ہیں اور اس کے ساتھ پورٹریٹ بھی خوب بن رہے ہیں۔ آئینوں کی مقبولیت میں اضافہ ہو چکا ہے۔ شخصیت کے تعقل کی نشو و نما تیزی سے ہو رہی ہے۔ پہلے دفاتر میں بیٹھنے کے لیے بنچ ہوا کرتے تھے، اب

انفرادی شوکت کی حامل کرسیاں استعمال ہو رہی ہیں۔ گھروں کے اندر تخلیے کا تصور بڑھ رہا ہے۔ ڈرامے اور ادب میں باطن نگاری پر زور دیا جا رہا ہے اور نتیجتاً تحلیل نفسی کا کاروبار خوب چل نکلا ہے۔" (16)

فوکو نے بارت سے مل کر انفردیت اور نبوغ ایسے تصورات کے خلاف اُبھرنے والے محاذ کی رہنمائی کی ہے۔ دونوں کا اصرار ہے کہ انفرادیت اور تخلیقیت کا مسلک تاریخ کی اس نئی منزل پر اپنے اختتام کو پہنچ چکا ہے۔ فوکو کے یہاں انسان (خودی، سیلف اور موضوعیت کے حوالے سے) کی موت کا نعرہ بہت اہم ہے۔ اس کے نزدیک انسان کی شناخت کا جدید تصور بیہودہ اور فضول ہے جو غلط شعور ذات سے برآمد ہوا ہے۔ فوکو نے انسان کی موت کے دعوے کو تسکین اور بے پناہ راحت کا سبب قرار دیا ہے۔ بقول فوکو:

> "یہ سوچنا صحیح ہے کہ انسان زمانہ قریب کی ایجاد ہے۔ .... اس کی حیثیت ہمارے علم میں ایک نئی شکن کا درجہ رکھتی ہے اور یہ کہ علم جوں ہی نئی شکل اختیار کرے گا یہ شکن غائب ہو جائے گی۔ .... میں اس کوشش میں ہوں کہ مغربی ثقافت کے عمیق طبقات کو بے نقاب کر سکوں۔ میں اس کوشش میں ہوں کہ اس زمین کو جو بظاہر غیر متحرک ہے اس کے شگافوں، اس کے عدم استحکام اور اس کے ان نقائص سمیت بحال کر سکوں۔ یہ وہی زمین ہے جو ایک بار پھر ہمارے پاؤں کے نیچے ہل رہی۔" (17)

فوکو کے مطابق افراد، آرٹسٹ اور مصنف سب نامکمل اور غیر مستحکم تاریخی صورتیں ہیں جن کا ظہور اسی طرح کی نامکمل اور غیر مستحکم تاریخی سماجی تشکیلات کے عمل میں آنے کے نتیجے میں ہوا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی پوری طرح اوریجنل اور مکمل طور پر مربوط نہیں اور نہ ہی حتمی انداز میں مستند۔ جیسا کہ بارت نے آتھر کی موت کا اعلان کرتے ہوئے دعویٰ کیا ہے

> "ہم جانتے ہیں کہ متن الفاظ کی کوئی واحد سطر نہیں ہوتی نہ ہی اس میں واحد الہیاتی معنی ہوتے ہیں۔ (یعنی لکھت خدا کا پیغام نہیں) بلکہ یہ ایک کثیر العباد سپیس ہوتی جس میں نو بہ نو لکھتیں جمع ہوتی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی اُوریجنل نہیں ہوتی۔ یہ سب ایک دوسرے میں آمیز ہوتی ہیں لیکن ان میں باہمی تضادات بھی موجود ہوتے ہیں۔ متن بہت سے حوالوں اور اقتباسات پر مشتمل ایک بافت ہے۔ ان اقتباسات کو بہت سے ثقافتی مراکز سے اکٹھا کیا گیا ہوتا ہے۔ مصنف صرف کوئی اشارت یا رویہ دے سکتا ہے جو مقدم ہوتا ہے لیکن اُوریجنل نہیں۔ وہ صرف اس قدر طاقت کا حامل ہوتا ہے کہ وہ تحریروں کو آمیز کر دے۔ ایک کو دوسرے کی مخالفت میں کچھ اس طرح کھڑا کر دے کہ کسی ایک پر بھی انحصار نہ کیا جا سکے۔ (18)

فوکو کی پرزور خواہش ہے کہ موضوع کو تخلیقی کردار سے محروم کر کے اسے ایک پیچیدہ اور متبدل ڈسکورس کے طور پر لینا چاہیے۔ (19) اس کا دعویٰ ہے کہ تخلیقی موضوع کے نام کی کوئی ذات نہیں جو اُوریجنل کا سرچشمہ قرار پائے۔ اس کی بجائے تاریخ کی بنائی ہوئی تخصیص ہے جو ایک دوسرے پر جھکی ہوئی دوطرفہ لہروں پر مبنی مخاطبہ ہے۔ یہ ایک ایسی شباہت ہے

جو پیچیدہ، بے مطلب اور خودرو لکیروں سے معرض وجود میں آئی ہے۔ مراد یہ کہ موضوع کی کوئی معروضی شناخت نہیں جس پر اصرار کیا جاسکے۔ موضوع کی تشکیل بہت سے موضوعی اور مختلف النوع تاریخی عوامل نے باہم مل کر کی ہے۔ اس کی تعریف میں معنی کی علویت اور ڈیزائن کو ہم نے خود شامل کیا ہے۔ لاکان نے موضوع کی شناخت کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فرد یا موضوع کی شناخت محض ایک تشکیل ہے کوئی مطلق اور معین حقیقت نہیں۔ اس کا لازمی طور پر تعلق خارج میں موجود شبیہ سے ہے۔ یہ داخل سے برآمد نہیں ہوتی، بلکہ اس صورت حال سے تشکیل پاتی ہے جس میں ہم پہلی دفعہ خود کو آئینے میں دیکھتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اجنبیت اور تقسیم کے ابعاد فرد کی شخصیت میں شروع سے ہی مدغم ہوتے ہیں۔ چنانچہ شناخت (Identity) کی تکمیل کی کوشش میں ہم عمریں بتا دیتے ہیں۔ لیکن یہ کبھی مکمل طور پر سامنے نہیں آتی۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ تصور ذات (Selfhood) کچھ بھی نہیں بجز مسلسل تبدیل ہوتے تناظر، غیر مستحکم، نامکمل اور نا مختتم آرزوؤں (Desires) کے آمیزہ کے جس کی کبھی تکمیل نہیں ہو پاتی۔

چنانچہ اب جب کہ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ جدید فرد اور تخلیقی فن کار کا تصور تاریخی تشکیل کے طور پر اُبھرا ہے تو یہاں ایک سوال بجا طور پر اُٹھایا جا سکتا ہے کہ اس تشکیل کی حدود میں عورت کا تخلیقی آرٹ کے حوالے سے کیا مقام بنتا ہے۔ یہ سوال اس لئے اہم ہے کہ تاریخ کے ایک مخصوص دورانیے میں بنی ہوئی فرد کی اس رواں تصویر میں مرد تو نظر آتا ہے عورت بہت کم۔ بلکہ نہ ہونے کی حد تک۔ یوں عورت مسلسل تعصب کا شکار نظر آتی ہے۔ اس کے بارے میں بالاصرار کہا گیا کہ وہ نابغہ نہیں ہوسکتی اور نہ ہی اعلیٰ درجے کا آرٹ تخلیق کر سکتی ہے۔ عورتوں کے بارے میں کہا گیا کہ وہ آرٹ کا جو بھی کام کرتی ہیں۔ اس کا تعلق اوپری سطح سے ہوتا ہے جسے گھریلو آرٹ اور تزئین و آرائش کے زمرے میں شمار کیا جا سکتا۔ امتیازی سلوک کی اس کہانی کو ایک دوسرے زاویہ نظر سے بھی دیکھا گیا ہے۔ کرسٹینی بیٹرس بی نے نابغے کے تعقل کا جائزہ لیتے ہوئے یونانی دور سے شروع کر کے نشاط ثانیہ، رومانی تحریک، انیسویں اور بیسویں صدی کے تصورات کی تاریخ کو کھنگال ڈالا اور ثابت کیا ہے کہ نابغے کا معیاری تصور (Standard Image) نسوانی قسم کا مرد ہے جس کی تخلیقی صلاحیتوں کی تعریف و تحسین کی جاتی ہے۔ اس نسوانی مرد کی نابغانہ جبلت، اس کی حسیت، وجدان اور تخیل حتیٰ کی اس کے پاگل پن کو عام فانی انسانوں سے مختلف سمجھا جاتا ہے۔ (20) نابغے کے اس تصور کو بنیاد بنا کر خواتین فنکاروں کی کنٹری بیوشن کو قابل توجہ نہیں سمجھا گیا۔ ان کی فنکارانہ مہارت اور محنت کو اگر تسلیم بھی کیا گیا تو اسے ان امور تک محدود رکھا گیا جو خالص نسوانی دنیا سے تعلق رکھتے تھے مثلاً ایمبر ائیڈری، برتن سازی، لیس سازی اور آرائش گل وغیرہ۔

اگر یہاں یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس رعونت آمیز رویے کے عقب میں وہ تعصب کام کر رہا ہے جو ارسطو کے عہد سے عورت کے خلاف چلا آ رہا ہے۔ اس تعصب کا جواز یہ دیا گیا کہ آرٹ ایک طلسماتی اور ملکوتی چیز ہے جو مرد کی پسلی سے پیدا ہونے والی عورت کی پہنچ سے باہر ہے۔ تانیثی تاریخ دان گریسلڈا پولک نے اس قسم کے خیالات کو مردانہ احساس برتری کا مظاہرہ اور تعصب پر مبنی مفروضہ کہہ کر مسترد کر دیا ہے۔ مابعد جدید نقادوں نے اس تنازعے کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ مصنف یا آرٹسٹ کا پرشکوہ تصور ایک مخصوص قسم کی رومانیت کا شاخسانہ ہے، ایک اسطور ہے جسے نشاط ثانیہ کے زمانے سے رواج ملا۔ اس اسطور کو غیر ضروری اہمیت دینے کی وجہ شاید یہ تھی کہ یہ تصور کر لیا گیا کہ متن میں پائے جانے والے معنی کا ماخذ و مرکز خود مصنف کی ذات ہے۔ دعویٰ کیا گیا کہ تصنیف کی امتیازی خصوصیات کی تلاش کا آغاز مصنف کی ذات میں

کرنی چاہیے جیسے صوفیا کائنات کی معنوی صفات کو خدا کی ذات میں تلاش کرتے رہے۔ اسی کو جواز بنا کر یہ دعویٰ کیا گیا کہ مصنف ہی بالآخر یہ بتا سکتا ہے کہ اس کی تحریر کی تفہیم کیونکر ممکن ہے اور یہ کہ متن کے مرکزی تصور اور معنویت تک رسائی مصنف کی رہنمائی کے بغیر ناممکن ہے۔

رولاں بارت نے اس دعوے کو چیلنج کرتے ہوئے اپنے مختصر مگر نہایت اہم مضمون The Death of the Author میں تین سوالات اُٹھائے۔ اوّل یہ کہ کسی نمونہ فن میں معنی کس طرح تشکیل پاتے ہیں؟ دوم یہ کہ معنی کا مصنف سے کیا تعلق ہے اور سوم یہ کہ قاری کا تصنیف کے معنی کی تلاش یا معنی کی تشکیل میں کیا کردار ہوتا ہے۔ بارت نے تخلیق کار کے رومانی تصور کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے تین اُصول مقرر کیے ہیں۔

1) قاری کی زندگی کا تعلق مصنف کی موت سے ہے۔

2) متن اقتباسات و مقولات کا وہ مجموعہ ہے جو ثقافت کے لاتعداد مراکز سے اکٹھا کیا گیا ہے۔

3) متن میں زبان بولتی ہے مصنف نہیں۔

بارت کے ان دعوؤں نے نابغے کے تصور اور مصنف کی تجلیل کے اسطور کو پاش پاش کر دیا ہے۔ دریدا کی ردّ تشکیلیت اس سے بہت آگے جاتی ہے۔ دریدا نے مصنف یا تخلیقی آرٹسٹ کے تصور کے ساتھ ساتھ متن کو بھی بے قدری کے گڑھے میں پھینک دیا ہے۔ یہاں تک کہ متن کی تعقلاتی شناخت ہی ممکن نہیں رہی۔ ایک تو بہت سے متون مل کر کوئی متن تشکیل دیتے ہیں دوسرے یہ کہ معنی کا مسلسل التوا ہو رہا ہے۔ صداقت متن کے اندر ہے نہ باہر۔ جہاں اس موقف کے خلاف نوام چومسکی جیسے فلسفیوں کا شدید ردعمل سامنے آیا ہے وہاں اس کی حمایت میں کئی آوازیں بلند ہوئی ہیں۔ بہت سے اثرات مرتب ہوئے ہیں جن پر کھل کر گفتگو فی الحال ممکن نہیں۔ بہرحال امر واقعہ یہ ہے کہ پس ساختیات کے اس موقف کو تانیثیت پسندوں نے آگے بڑھ کر خوش آمدید کہا ہے۔ اس کے نتیجے میں ثقافتی تناظر میں مثبت تبدیلی کا سلسلہ چل نکلا ہے جس میں تحتانیت (Subalternism) کے دائرے میں آنے والوں کو حوصلہ اور تقویت ملی ہے۔ ہر طرح کے اقلیتی گروپ مثلاً gays، اچھوت اور یورپ میں دوسرے ممالک سے آئے ہوئے مہاجر سماجی سطح پر مضبوط ہوئے ہیں۔ ان کی آواز کو سنا جانے لگا ہے اور پھر یہ کہ ثقافت کو اب ایک جمہوری پروجیکٹ کے معنوں میں لیا جا رہا ہے۔ اس جمہوری پروجیکٹ میں میتھو آرنلڈ کی کتاب Culture & Anarchy کے ان مندرجات کو مسترد کر دیا گیا ہے جن میں ارفع تفکر اور اعلیٰ طبقے کی ثقافت کی تجلیل کی گئی ہے۔ یوں اب ثقافتی مطالعات کے دائرے میں ہر قسم کے خیالات و افکار کو شامل کر لیا گیا ہے۔ ثقافت سے مراد معنی کا اشتراک ہے جسے ہم اپنی روزمرہ زندگی میں استعمال کرتے ہیں۔ ثقافت کا کوئی جوہر یا اصل نہیں کہ جس کی پہچان کسی خاص متن سے وابستہ ہو۔ یہ تبدیل ہوتے ہوئے ثقافتی متن سے معنی اخذ کرنے کا ایک عمل ہے جس سے ہم روزمرہ زندگی میں دوچار ہوتے ہیں۔ ثقافت کو اس پس منظر میں ایک ایسے سماجی سیاق و سباق کے طور پر لیا جا رہا ہے جو پیداواری اشیاء اور معنی کے فروغ اور صارفیت سے وجود میں آتا ہے۔ جب ہم کسی کلچر میں شمولیت اختیار کرتے اور اس کو بروئے کار لاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی تشریح کے کام میں ہم شمولیت اختیار کر رہے ہیں۔ اس صارفی ثقافت نے آرٹ کو بھی اپنا حصہ بنا لیا ہے۔ اب آرٹ وہ ہے جو منڈی میں بکتا ہے۔

کایا کلپ ہوتی ہوئی اس ثقافتی صورت حال میں اظہاریت پسند تجریدی آرٹ کی مصوری اور ادب 1960ء

کی دہائی کے آخر تک باسی کڑی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ فرسودگی کے عمل کا سب سے پہلے آرٹسٹ ہیرو کا تصور شکار ہوا۔ اس صورت حال کو سمجھنے کی خاطر جان فاولر کے ناول The French Lleutenent's Woman کے تیرھویں باب کے ایک پیراگراف کا ترجمہ پڑھ لیجئے۔

> ''میں کچھ نہیں جانتا۔ کہانی جو میں سنا رہا ہوں محض تخیل کا شاخسانہ ہے۔ کردار جو میں نے تخلیق کئے ہیں ان کا میرے ذہن سے باہر کوئی وجود نہیں۔ اگر میں نے اس سے پہلے اپنے کرداروں کے ذہن اور ان کے خیالات کے اندر جھانکنے کا بہانہ کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ایسی رسم کی پابندی کر رہا ہوں کہ جو اس ناول کے تحریر کئے جانے کے وقت پوری دنیا میں مروج ہے۔ وہ یہ کہ ناول نگار خدا کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس کا دوسرا روپ ہے۔ مصنف کچھ نہ جانتے ہوئے بھی بہانہ کرتا ہے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ لیکن میں الین روبی گرلٹ اور رولاں بارت کے زمانے میں زندہ ہوں (یعنی میں ایسا کیسے کر سکتا؟)۔ اگر یہ ناول ہے تو یہ (مابعد) جدید کے معنوں میں ناول نہیں۔ تو پھر میں شاید ادل بدل انداز میں خود نوشت لکھ رہا ہوں۔ شاید میں ان گھروں میں سے ایک گھر میں رہ رہا ہوں جسے میں نے فکشن کا حصہ بنا دیا ہے۔ شاید چارلس کے زیر نقاب میں خود ہوں۔ یا شاید یہ محض ایک کھیل ہے۔''

فاولر کے اس ناول کی اشاعت 1969ء میں ہوئی تھی جس کے بعد مابعد جدیدیت اور پس ساختیات کے فروغ کی وجہ سے دنیا ہی تبدیل ہوگئی۔ پہلا وار اظہاریت پسند آرٹ اور تجریدی ادب ہوا۔ مابعد جدید مفکرین نے دعویٰ کیا کہ اس طرح کے جمالیاتی تجربات بورژوائی ذوق کے آئینہ دار اور سرمایہ داریت کا شاخسانہ ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ مصنف کی سوانح کو غیر ضروری بوجھ قرار دے دیا گیا۔ یوں مصنف کی متن میں مرکزیت کا تصور انجام کو پہنچا۔ اس کی بجائے تصنیف یا متن کو فوقیت ملی۔ رولاں بارت کا مصنف کی موت کا دعویٰ متن کی اسی فوقیت کی آئینہ دار ہے۔ جہاں تک تنقید کا تعلق ہے تو اسے قاری ردعمل (Reader Response) کی تنقید کا نام دیا گیا۔ اس تنقید کا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ ادبی تنقید کو متن کی صداقت کے انکشاف کا دعویٰ نہیں کرنا چاہیے بلکہ اسے صرف قاری اور متن کے درمیان دلچسپ جمالیاتی کھیل کے طور پر لینا چاہیے۔ ایکو اور فاولیز دونوں بارت کے اتباع میں ہی کہتے ہیں کہ صداقت میرے ہاتھ کی رہبر نہیں۔ یہ کھیل ہے جو میری رہنمائی کرتا ہے۔ یہی کھیل کا سچ اور صداقت ہے۔ (21)

ادبی تنقید کے سلسلے میں بارت نے ایک اور اہم نکتے کی نشاندہی Le Pleaisir du texte میں کی ہے۔ یہ نکتہ قرات کی نشہ آور کیفیت سے متعلق ہے۔ نشہ آور کیفیت جو جنسی لذت کی سی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ رولاں بارت نے اسے لباس کے چاک میں سے ننگے بدن کی جھلک سے تشبیہ دی ہے اور اس طرح حاصل ہونے والی لذت کو Jouissance کہہ کر پکارا ہے۔ اس فرانسیسی لفظ کا انگریزی زبان میں ترجمہ موجود نہیں کہ جس کو اُردو زبان میں منتقل کیا جا سکے۔ بہر حال اس سے مراد کیفِ مسرت سے استفادہ کرنا ہے۔

یاد رہے کہ اصطلاح میں Jouissance کا اصل مطلب شہوت کے اُبھار سے لذت حاصل کرنا ہے۔ مابعد

جدیدیت میں تحلیل نفسی کی یہ اصطلاح مخالف معنوں میں اہمیت اختیار کرتی ہے اس کا مطلب خواہش کے ساتھ جنم لینے والا خلا ہے۔

جولیا کرسٹیوا کا خیال ہے کہ لفظ Jouissance پدری زبان کی حدود کو توڑ دیتا ہے۔ اس کے معنی صرف عورت کے وژن تک محدود ہیں۔ اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہ مسرت سے لبریز تجربہ ہے جو ماں کی بچے کے ساتھ مسلسل موجودگی سے کشید ہوتا ہے۔ (22)

یہاں چونکہ کرسٹوا کے افکار زیر بحث نہیں اس لئے ہم واپس بارت کی طرف آتے ہیں۔ بارت نے متن کی قرات کے تجربے کو Jouissance کی اصلاح میں بیان کر کے نہ صرف نطشے کے انداز میں ڈائیونیشیائی جمالیات کا روپ دیا ہے بلکہ اس نے فوکو کے کشفی انداز میں جسم کی مدح سرائی بھی کی ہے۔ بارت نے متن کو جسم سے مماثلت دی ہے۔ اسے مقصود بالذات ٹھہرایا ہے۔ اور لکھا ہے کہ متن کا جسم قاری اور مصنف کے جسموں سے لذت انگیز کھیل کھیلتا ہے۔ (23)

مختصراً یہ ایک ایسا وقوف ہے جو مادی اور لسانی جسم، صوتیاتی اکائی، قرأت کی آرزو اور مسرت کے رُخ کا تعین کرتا ہے۔ ادراک کی یہ صورت یکتائیت، متبدلیت کے حوالے سے زبان اور متن کے تخصص کی بہتر تفہیم کو ممکن بناتی ہے۔

تصنیف کے جسمی وجود کے بارے میں آرٹ کی یہ ڈائیونیشیائی تشریح اس پر دال ہے کہ وہ ساختیت کے دائرے کے اندر ہے گویا وہ ساخت کی نفی نہیں کر رہا بلکہ اسے لذت انگیز جسم کہہ کر اس کا اثبات کر رہا ہے۔ بارت کا متن کے بارے میں رومان بہرحال قائم ہے۔ اس قسم کے تخصیصی روّیے کو ہم نو ساختیت کا نام دے سکتے ہیں۔

دریدا کے یہاں یہ اختصاصی رویہ اپنی انتہا کو چھونے لگتا ہے۔ وہ بارتے کے برخلاف متن کے رومان میں بھی مبتلا نہیں۔ اس نے نہ صرف تصنیف کے اندر کسی دائرے یا مرکزیت کی موجودگی سے انکار کیا بلکہ ساخت کے تعقل کو ہی توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس نے بارت کے سائن تصور کے بارے میں نقطۂ نظر کو انقلابی طور پر اختصاصی بنا دیا ہے اور اس طرح اس نے ساخت کے تصور کی ہی ردّ تشکیل کر ڈالی ہے۔ دریدا کی ساخت شکن تنقید کسی سسٹم، کوڈ، متعین معنی، Cogito یا ماورائی مدلول کو نہیں مانتی۔ (24) دریدا کی ردّ تشکیلیت سے مراد سادہ زبان میں یورپی مابعد الطبیعیات کی تنقید و تردید ہے۔ اسے آپ نطشے اور ہائیڈیگر کا تسلسل کہہ سکتے ہیں۔ دریدا نے صداقت کے اس تصور کو مسترد کیا ہے جس کا مطلب معنی کی موجودگی ہے۔ اس طرح اس نے ان معیارات کو جو ساخت کے تعقل کی تعریف میں کام آتے رہے ہیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ (25) تنقید کے اس تہہ بال کر دینے والے تجزیاتی طریق کار کو ڈی کنسٹرکشن کا نام دیا گیا ہے۔ دریدا کے حامیوں کی فہرست طویل ہے تاہم دریدا کے خاص خاص ہم نواؤں میں سے پال ڈی مان، ہلس ملر اور جیفرے ہارٹ مین کے نام سرفہرست ہیں۔ ان کو Yale گروپ کے زیر عنوان یاد کی جاتا ہے۔ یہ سب لوگ آرٹ میں خالق، مصنف، سسٹم یا گرائمر کے ایسے تصورات کے انکاری ہیں۔

لیکن مابعد جدیدیت اور ردّ تشکیلیت کے مخالفین کا استدلال بھی کچھ کم مضبوط نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مابعد جدیدیت والوں کے یہاں آرٹ کے بارے میں کوئی ایسے قوانین وضوابط موجود نہیں کہ جن کی مدد سے آرٹ کی حدود کا تعین کیا جا سکے اور پھر سوال یہ بھی پوچھا گیا ہے کہ آرٹ کی حیثیت، مقصد اور مقام کیا ہے؟ اس سلسلے میں مابعد جدیدیت کے حامی کوئی مستند معیار فراہم نہیں کر سکے کہ جس کی بنیاد پر آرٹ کی قدر پیمائی کی جا سکے۔ ان حالات میں صرف یہی کہا جا

سکتا ہے کہ مابعد جدیدیت کے حامی نقادوں کے نزدیک آرٹ کی قدر پیمائی کا مسئلہ محض صارفین کے انتخاب کا مسئلہ ہے۔ وہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ آرٹ معیاری ہے یا نہیں۔ انہی معاملات کے پیش نظر بعض لوگ (مخالفین) مابعد جدیدیت کو تہذیب کا دشمن اور آرٹ کی اقدار کے زوال کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔

امریکن نقاد سوزی گیب لِک نے استدلال کیا ہے کہ معاصر آرٹ میں کمٹمنٹ کا احساس یا اخلاقی تحکم کا فقدان ہے۔ اس کے نزدیک جدیدیت کا مقصد ہمیشہ روحانی شباب کا احیا رہا ہے اس لئے مادیت پسندی کی اس نے مخالفت کی ہے۔ اس کے برعکس مابعد جدیدیت خوفناک حد تک ماس کلچر، اسمبلی لائن سوچ اور تاجرانہ ذہنیت کا شکار ہے۔ سوزی گیب لک کے نزدیک معاصر ماس کلچر کا نعرہ ذہنی دیوالیہ پن کی انتہا ہے کیونکہ یہ بین الاقوامی سرمایہ داریت کا آلۂ کار بننے کے مترادف ہے۔ جب کہ آرٹ کا کام فی الحقیقت ماس پروڈکشن کی مخالفت ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ مابعد جدیدیت نے بروئے کار آتے ہی آرٹ کو اپنے مقام سے گرا دیا ہے۔ وہ مقام جو روحانی طہارت کا تھا۔ آرٹ اب میڈیا کے ہوس ناک محور پر گھوم رہا ہے اور اشیائے صرف کی تشہیر کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آرٹ غالب مادیت پسند نظام اقدار کے خلاف آواز اُٹھانے سے قاصر ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یہ صارفی سرمایہ داریت کا مرہون منت بن چکا ہے۔ مابعد جدید آرٹ بے مرکز اور بے بنیاد ہے، اس کی جڑیں اقدار میں نہیں۔ اسے کمرشل ازم نے معنیات اور جذبی طاقت سے محروم کر دیا ہے۔

معروف امریکی مارکسی نقاد جیمی سن نے معنی خیز انداز میں مابعد جدیدیت پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جدیدیت کے پیش نظر ہمیشہ یہ خواہش، یہ قدر، یہ سوال رہا ہے کہ انسانوں کی اس دنیا کو کس طرح ایک بہتر دنیا میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور یہ کہ بود و باش اور رہن سہن کے اعلیٰ معیار کس طرح حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ مابعد جدیدیت نے انسانی اقدار پر مرکوز اس پراجیکٹ کو مہابیانوں کا جنجال کہہ کر نظر انداز کر دیا ہے جس کے نتیجے میں اعلیٰ ثقافت اور کمرشل کلچر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو چکے ہیں۔ اس حد تک کہ آرٹ کسی ایسے مقام پر ایستادہ ہونے سے قاصر ہے کہ جہاں سے وہ سماج پر تنقیدی نظر ڈال سکے۔ چنانچہ اب صورت حال یہ ہے کہ آرٹ اور اشتہار بازی میں فرق مٹ چکا ہے۔ (26)

اس کے برعکس مابعد جدیدیت کا استدلال یہ ہے کہ آرٹ کو ماس کلچر کے خلاف یا ماس کلچر کو آرٹ کے خلاف استعمال کرنے کی بجائے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آرٹسٹ اور اس کے چاہنے والے دونوں مختلف ثقافتی جگہوں کے درمیان ایک ڈھلوان سے پھسل رہے ہیں۔ آرٹ کی دنیا دکانوں، گھروں اور سماجی اداروں میں بچ چکی ہے۔ یہ سب مختلف ثقافتی مراکز ہیں جن میں آرٹ جابجا بکھرا ہوا ہے۔ آرٹ کی طے شدہ سرحدیں مفقود ہو چکی ہیں۔ ڈبل کوڈنگ کا تصور اسی صورت حال کا احاطہ کرتا ہے۔

اوپر اُٹھائے گئے سوالات اپنی جگہ پر درست ہو سکتے ہیں۔ ان سے اتفاق بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مسئلہ درپیش تو یہ ہے کہ مابعد جدیدیت کسی مہابیانیے، کسی بڑے سماجی پراجیکٹ، کسی مشنری منصوبے یا پروگرام، کسی صداقت پر مبنی تنقیدی تھیوری کو سرے سے ہی قبول نہیں کرتی۔ اس لئے مادیت پسند اقدار کے خلاف آواز اٹھانا، دنیا کو بہتر بنانے کی خواہش کرنا یا ثقافت اور سماج کو تنقیدی نظر سے دیکھنا آرٹ کی ذمے داری نہیں رہی۔ آرٹ یا ادب کا مطلب قاری اور متن کے درمیان نشانات کا کھیل ہے۔ اگر صداقت کی بات کی جائے تو کہا جاتا ہے کہ صداقت محض کھیل کے اندر ہے۔ باہر بس خلا ہے۔

اب اگر یہ کہا جائے کہ مابعد جدیدیت کے پیرامیٹرز کے اندر رہ کر اوپر دیئے گئے سوالات خود اپنی ہی نفی کرتے

ہیں تو یہ چنداں غلط نہ ہوگا۔ آرٹ کے بارے میں کسی تصوری رومانیت کی اس لئے بھی گنجائش نہیں رہی کہ مابعد جدیدیت کے اس دور میں آرٹ کو بہرحال ہنر مندی اور کاریگری تک محدود کر دیا گیا ہے۔ ڈونلڈ کسپٹ نے اپنی کتاب (27) میں لکھا ہے کہ ہنر یا کرافٹ معاصر آرٹ میں آہستہ آہستہ ایک سنجیدہ مسئلے میں تبدیل ہو چکا ہے۔ کیونکہ یہ آرٹ کی چند ایک اقدار میں سے واحد قدر رہے جو بچ گئی ہے۔ مابعد جدید کلچر میں اعلیٰ آرٹ کا تصور رفت و گزشت ہو چکا ہے۔ ہنر مندی اور کرافٹ نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ اینڈی وارہول کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

آخر میں چند سوال پھر سامنے آرہے ہیں مثلاً یہ کہ آرٹسٹ صارفی کلچر کا مقابلہ کس طرح کرے۔ کیا آرٹ کی ترقی خواب و خیال بن چکی ہے؟ کچھ ایسے تناظر بھی سامنے آچکے ہیں جن کے مطابق ماس میڈیا اور صارفیت مقصد کارپوریٹ سرمایہ داری نظام کے آلۂ کار ہیں جس کی عالمگیریت مقامی ثقافتوں کے لئے زہر قاتل ہے۔ اگر آرٹ کا کوئی مقصد معاصر دنیا میں ہے تو اسے اس نظام کی مخالفت اور اپنی انفرادیت کے حق میں اقدامات اٹھانے ہوں گے۔ اب سوال یہ بھی ہے کہ آرٹ میڈیا کی طاقت کو کس طرح Subvert کر سکتا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ آرٹسٹ صارفیت کی اس دنیا کی مخالفت اور مقابلہ اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک وہ سامان تعیش کی تیاری کا کام خود نہیں کرتا؟ یہاں غور طلب سوال یہ ہے کہ کیا آرٹ کا کام صرف سامان تعیش کی ہی تیاری ہے۔ کیا اس کا تعلق صرف بورژوا جماعت کے ذوق کی تسکین سے ہے یا ہر طرح کے جبر سے نجات کی سعی بھی اس کے دائرہ کار میں آتی ہے۔ جبر بورژوا اقدار کا ہو یا فرد کی خود پسندی کا ہر حال میں قابل مذمت ہے۔ پھر کوئی یہ بھی پوچھ سکتا ہے کرافٹ مین یا ہنر مند کہلانے میں حرج ہی کیا ہے۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ ماضی سے معنوی رابطہ بحال ہوگا اور دوسرا یہ کہ بادریلا کے Simulationism کے اس عہد میں آپ اس فائدہ مند آرٹ کی طرف متوجہ ہوں گے جو کہ میڈیا کی ضرورت ہے۔ کیا معاصر آرٹ کی مناسب Setting کا مطلب اسی بات سے پردہ ہٹانا کہ علم اور مسرت کو تصویری صورت میں کس طرح منتقل کیا جا سکتا ہے؟ سوالات کا ایک انبار اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ جواب تلاش کرنے میں نقاد حضرات کو ابھی کافی وقت درکار ہے۔ پہلے دھول بیٹھ جانے دیجئے۔

حوالہ جات

(1)Tom Wolfe, The Printed world , New york ,p. 15, 1975

(2)Hal Foster, in the Postmodernism:Anti-Aesthetic : Essays on Postmodern Culture 1983, Poert Townsend , pp. ix -xviat pp. x-xi)

(3) دیکھئے رامن سیلڈن، ترجمہ اعزاز باقر، صفحہ 41۔

(4) ایضاً، صفحہ 43۔

(5)Cambridge University Press.

(6)J. Barrell, Introduction, Poetry, Language and Politics, Mnachester, Manchester University Press, 1988 pp. 5-6.

(7)Barrell, Preface, in Ibid ., pp5-6.

☆.....☆.....☆

نظم میں جدت و قدامت کا قضیہ اور تیسری لہر

نصیر احمد ناصر

اس تحریر کا مقصود بنیادی نظری مباحث کو چھیڑنا اور از سرِ نو نظم یا جدید نظم کی تعریف متعین کرنا نہیں۔ کیونکہ جدید اردو نظم کے زیادہ تر مسائل نظری نہیں عملی نوعیت کے ہیں۔ اردو میں نظم کی عملی یا اطلاقی تنقید نہ ہونے کے برابر ہے اور اب تک سارا زور نظری تنقید یا تھیوری یا نصابی طرز کی تحقیقی اور تنقیدی ترجیحات و ترغیبات پر رہا ہے۔ نظم کیا ہے؟ قدیم نظم کیا ہے؟ جدید نظم کیا ہے؟ مابعد جدید نظم کیا ہے؟ نثری نظم کیا ہے اور کیوں ہے؟ غزل اور نظم کی مسابقت اور تقابل میں نظم کی قبولیت یا ناقبولیت میں کتنی حقیقت ہے کتنا افسانہ ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سارے مباحث بڑی حد تک اب ماضی کا قصہ ہیں۔ ان میں اب کوئی خاص کشش نہیں رہی اور ان پر بحث کا عمل پانی میں منتھن ثابت ہوتا ہے۔ زمانہ قدیم سے لے کر اب تک شاعری کی لاتعداد تعریفیں اور توجیہات بیان کی گئی ہیں جن سے ہر کوئی اپنے اپنے مزاج اور طبع کے مطابق شافی جواب حاصل کر سکتا ہے۔ البتہ ہر دور کی روحِ عصر، حالات و واقعات کا تناظر، داخلی اور خارجی محرکات اور بعض آفاقی قدروں کے رواں شعری تصورات بدلتے رہتے ہیں۔ شعری فردائیت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اور انہی سے نظم کے جدید یا قدیم ہونے کا ادراک ہوتا ہے۔ بقول ارسطو شاعر پر زندگی کی عکاسی فرض ہے لیکن ضروری نہیں کہ یہ عکاسی لمحۂ موجود یا گرد و پیش کے معاملات تک محدود ہو۔ شاعر کو آزادی ہے کہ چیزوں کو حسبِ مراد، یا تو اس طرح پیش کرے جیسے وہ کبھی تھیں یا جیسی وہ ہیں یا جیسا انہیں بتایا یا سمجھا جاتا ہے یا جیسا انہیں ہونا چاہیئے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہر دور کی شاعری، چاہے وہ کسی بھی صنفِ سخن میں ہو، جدید بھی رہی ہے، جدید تر بھی، قدیم اور روایتی بھی۔ اس میں ایک طرح کی اوورلیپنگ یا بر پوشی ہوتی ہے جس میں بہتر پرت کمتر پرت کو ڈھک دیتی ہے۔ بعض اوقات اس میں پھلانگ اور اچانک تغیر و تبدل آ جاتا ہے جس کا انحصار تاریخ اور وقت کے بہاؤ پر یا کرۂ ارض میں ہونے والے بڑے بڑے واقعات اور سانحات پر ہوتا ہے۔ کوئی بڑی سائنسی ایجاد یا بڑا سائنسی انکشاف بھی یکلخت شعر و ادب کا دھارا پلٹ دیتا ہے۔ لیکن اس میں جدید و قدیم کی تخصیص محض ہیئت سے نہیں بلکہ اس کے مواد، موضوع، اسلوب، تکنیک، لفظیات و تراکیب اور اس میں بیان کیے گئے معروضی اور باطنی تجربات سے ہوتی ہے۔ ہیئت تو ویسے بھی خارجی فنی صورت کا نام ہے، اگرچہ یہ نظم کے داخلی کروں اور منطقوں کی بھی ہم مرکز ہوتی ہے۔ گویا قدیم زمانے میں لکھی گئی کوئی نظم جدید ترین ہو سکتی ہے اور آج کی لکھی ہوئی کوئی نظم بوسیدہ یعنی نئے پن سے خالی ہو سکتی ہے یا اس کے بالعکس۔ اس تناظر میں اردو کے حوالے سے بات کی جائے تو پابند، معریٰ، آزاد اور نثری ان میں سے کسی بھی فارم میں لکھی گئی نظم جدید بھی ہو سکتی ہے اور فرسودہ اور از کار رفتہ بھی۔ اچھی نظم جدید یا قدیم سے نہیں روحِ عصر سے پہچانی جاتی ہے۔ اچھا تخلیق کار تاریخ اور وقت کے تمام ادوار سے جڑا ہوتا ہے، اس کے اندر گزری ہوئی صدیاں آرکائیو ہوتی ہیں، اس کے سامنے حال کا پینوراما ہوتا ہے اور اس کے تصورات میں مستقبل کے اَن دیکھے زمانے کئی شکلوں میں ڈھل رہے ہوتے ہیں۔ اسے کسی خاص تھیوری یا نظری بیانیے، ہیئت، طریقِ کار اور زمانے کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا وژن از خود قدیم و جدید کی حدِ فاصل قائم کرتا یا پار کرتا

ہے۔ اگر چہ یہ حدِ فاصل کسی زمانی لکیر کا نام نہیں۔ اقبال کی بعض نظمیں اپنی آفاقیت اور دوامیت میں قدیم وجدید کی حدوں سے ورا ہیں۔ جدید یا قدیم کسی بھی زمانے میں چلے جائیں اقبال صرف ایک ہے اور ایک ہی رہے گا۔

میں یہاں دہرائے ہوئے مختلف نظری تنقیدی مباحث اور دلائل نقل کرنے کے بجائے دنیا کے قدیم ادب سے چند عملی مثالیں پیش کرتا ہوں۔ تقریباً ساڑھے تین ہزار سے چار ہزار سال پہلے کی یہ نظمیں (ترجمہ شدہ، بحوالہ مصر کا قدیم ادب از ابن حنیف) دیکھیے اور خود فیصلہ کیجیے کہ یہ نظمیں اتنے زمانی فاصلے کے باوجود قدیم ہیں یا جدید؟ گو کہ یہ آزاد سادہ نثری ترجمہ ہے اور اُس زمانے کی ہیئتوں، تکنیکی پہلوؤں اور فنِ شاعری کی باریکیوں کو ظاہر نہیں کرتا لیکن اس کے باوجود کیا یہ نظمیں اپنے موضوعات، مواد، اسلوب، حسیات، اپنے عصری تقاضوں، شعری تجربوں، علامتوں، استعاروں، اثر پذیری، آفاقیت وغیرہ کے لحاظ سے جدید نہیں ہیں؟ کیا یہ ہمارے ہی دور کی داستان، ہمارا ہی خارجی و باطنی انتشار و کرب اور تلاش و تجربہ نہیں لگتیں؟ حالانکہ زمانی اعتبار سے بہت پارینہ ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کئی ہزار سال پرانی ہونے کے باوجود یہ نظمیں آج بھی جدید لگتی ہے اور آئندہ بھی جدید لگتی رہیں گی۔ انھیں پڑھنے کے بعد قدیم وجدید کی بحث از خود رفت گزشت ہو جاتی ہے۔ قدیم عالمی ادب سے ایسی بیسیوں مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

آج میں کس سے بات کروں

آج میں کس سے بات کروں
بھائی کمینے بن گئے ہیں
اور آج کے دوستوں میں محبت باقی نہیں رہی
آج میں کس سے بات کروں
دل لالچی ہو گئے ہیں
ہر شخص اپنے ساتھی کا سامان ہتھیا لیتا ہے
آج میں کس سے بات کروں
شرافت ختم ہو گئی ہے
اور متشدد آدمی ہر شخص پر پل پڑا ہے
آج میں کس سے بات کروں
لوگ لوٹ رہے ہیں
ہر شخص اپنے پڑوسی کو لوٹ لیتا ہے
آج میں کس سے بات کروں
راست باز لوگ باقی نہیں رہ گئے
اور ملک بدکرداروں پر چھوڑ دیا گیا ہے
آج میں کس سے بات کروں؟
دھرتی پر برائی کا دور دورہ ہے

اس (برائی) کی کوئی انتہا نہیں۔

موت کے بارے میں ایک نظم

موت آج میرے لیے ایسی ہے
جیسے کوئی بیمار صحت یاب ہو جائے
جیسے بیماری کے بعد کوئی باغ چلا جائے
موت آج میرے لیے ایسی ہے
جیسے مُر کی خوشبو
جیسے خوشگوار ہوا کے دن کوئی کشتی کے بادبان تلے بیٹھا ہو
موت آج میرے لیے ایسی ہے
جیسے کنول کے پھولوں کی مہک
جیسے کوئی سرزمینِ سرخوشی کے ساحل پر بیٹھا ہو
موت آج میرے لیے ایسی ہے
جیسے بارش کا طوفان تھم جائے
جیسے کوئی لڑائی سے گھر لوٹ آئے
موت آج میرے لیے ایسی ہے
جیسے صاف کھلا آسمان
جیسے کوئی اَن جانی بات جان لے
موت آج میرے لیے ایسی ہے
جیسے کئی برس قید میں رہنے کے بعد کوئی
اپنے گھر جانے کی تمنا کرے۔

پالکی برداروں کا گیت

بھری ہوئی پالکی خالی سے اچھی لگتی ہے
پالکی بردار خوش ہیں
کہ بھری ہوئی پالکی خالی سے اچھی لگتی ہے۔

محنت کشوں کا گیت

کام کر میرے بھائی، آرام کا وقت قریب ہے
فرعون ابدی ہے

زمین اور آسمان کے جانور اور پرندے
رینگنے والے جاندار اور اُڑنے والے جاندار
سب مشقت کرنے پر مجبور ہیں، سب کو مرنا ہے
پر فرعون ابدی ہے
دن کے وقت کام کر میرے بھائی
فرعون ابدی ہے
دریا اتر جاتے ہیں اور سوکھ جاتے ہیں
سنگِ مرمر چکنی مٹی کی طرح ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے
قومیں مٹ جانے کے لیے زوال پذیر ہونے لگتی ہیں
پر فرعون ابدی ہے
کام کر، یہی تیرا کٹھن انجام ہے
فرعون ابدی ہے
سائے اداسیوں میں سے گزر رہے ہیں
ایک زمانے کی جگہ دوسرا زمانہ لے لیتا ہے
سلاطین مقبروں میں اتر جاتے ہیں
پر فرعون ابدی ہے۔

ہزاروں سال کہنہ اتھروید میں درج یہ نظم (بحوالہ "ہندوصمیات" از ڈاکٹر مہر عبدالحق، اردو ترجمہ ڈاکٹر عرش صدیقی) خدائی صفات وواحدانیت، ابتدائے آفرینش، نظریۂ تخلیق، انسانی ارتقا اور حیات و کائنات کے اسرار کے حوالے سے حیران کن حد تک جدید طرزِ فکر کی عکاس ہے:

کچھ نہیں تھا
نہ چمکدار آسمان تھا نہ آسمان کی پھیلی ہوئی لامحدود چادر تھی
کس پردے میں سب کچھ تھا؟ سب کچھ کہاں پنہاں تھا؟
کیا کہیں پانیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں تھا سب کچھ؟
فنا نہیں تھی
لیکن بقا بھی تو نہیں تھی
رات اور دن کی سرحدیں نہیں تھیں، کچھ نہیں تھا
بس ایک ذاتِ واحد، صرف ایک ذات
اپنے آپ میں زندہ تھی اور سانس لے رہی تھی
اس ذات کے علاوہ نہ کبھی کچھ تھا نہ اب کچھ ہے

یہی ذاتِ واحد سب کچھ ہے
ہاں، اندھیرا تھا اور اس گہرے اندھیرے میں سب کچھ پنہاں تھا
ایک سمندر تھا نظر نہ آنے والا
تخمِ زندگی (اندر کی) گرمی سے پھوٹا اور محبت پیدا ہوئی
شاعروں کے دلوں میں اور ان کے دماغوں میں اس نے گھر بنالیا
اور یہ شاید ان چیزوں میں رابطے تلاش کرنے لگے جو تخلیق کردی گئیں تھیں
اور جو تخلیق نہیں کی گئی تھیں
یہ شعلہ تخلیق، یہ شعلہ کہاں سے لپکا؟ یہ شعلہ ہمہ گیر زمین سے نکلا یا آسمان سے آیا؟
کوئی نہیں جانتا
پھر بیج بوئے گئے، بڑی بڑی طاقتیں پیدا ہوئیں
نیچے فطرت تھی اور اوپر ایک قوت کی مرضی
کون اس راز سے واقف ہے؟
کون جانتا ہے کہ یہ ہزار رنگ کائنات یہاں سے، وہاں سے یا کہاں سے آئی؟
وہ ذات، ذاتِ یکتا ہے جس نے تمام کائنات کو تخلیق کیا
یہ اس کی رضا تھی یا اس کا حکم تھا یا اس کی خاموشی تھی
جس نے کائنات کو تخلیق کیا تھا
ہر بات صرف وہی جانتا ہے
وہ جو یکتا ہے، جس کا مقام عرشِ عظیم ہے
صرف وہی جانتا ہے
یا شاید
شاید وہ بھی نہیں جانتا!

یہاں چوتھی صدی عیسوی یعنی آج سے دو ہزار سال قبل کی ایک آفاقی کیلٹی نظم "اوسین کی پشیمانی ضعیفی میں" بطورِ خاص قابلِ غور ہے۔ (بحوالہ تاریخ ادبیات عالم از پروفیسر عبدالوہاب اشرفی) اس نظم میں بیان کردہ اور بین السطور حسیات کی جھلکیاں ماضی قریب سے حال تک کی انگریزی، لاطینی امریکی اور اردو شاعری میں جا بجا دیکھی جا سکتی ہیں۔ میرے خیال میں تو دو ہزار سال پرانی ہونے کے باوجود یہ نظم اپنے موضوع کے لحاظ سے اور وقت اور عمر کی ایک دائمی نامیاتی اکائی کے طور پر آج بھی جدید ہے اور آئندہ بھی جدید رہے گی۔

اوسین کی پشیمانی ضعیفی میں

آج کی رات مجھ پہ غم کے لمبے سائے ہیں

میرے لیے گذشتہ رات بھی کافی طویل تھی
یہ دن کٹھن اور دشوار گزار راستے پر سرگرم سفر ہے
تھکا دینے والے دیروز کے بطن سے ابھرا ہے
آنے والا ہر دن میرے لیے طویل ہوتا ہے
حالانکہ پہلے اس طرح کی بات نہ تھی
اب تو بچی خوشی بھی مجھ سے روٹھ کر کوسوں دور چلی گئی ہے
نہ رزم گاہ ہے نہ جنگ کی تیغ زنی
نہ سریلے گیت ہیں، نہ دل کو گرمانے والی موسیقی اور نہ ہی عورتوں کا حسن و جمال
نہ دہکتی ہوئی انگیٹھی ہے اور نہ کھانوں کا انبوہ
اور نہ ہی فراخ دل مالک کا اہتمامِ ضیافت
نہ غزالوں کا تعاقب، نہ راز و نیاز کی باتیں
اب تو عزیز سے عزیز تر بھی مجھ سے تجارت کی زبان میں بات کرتا ہے
افسوس! میں یہ دن دیکھنے کو زندہ رہا
ہر دن جو گوشہء مکان میں خوشیوں سے خالی گزرتا ہے
شکاریوں کو چونکا دینے والی صدا کے بغیر
نہ ہی شکاری کتوں کے بھونکنے کی صدا آتی ہے
لطیف مذاق سے عاری اور خوش طبعی کی ترنگوں سے محروم
آج کی رات مجھ پہ غم کے سائے لمبے ہیں
اتنے بڑے جہان میں کوئی انسان اتنا غم زدہ اور افسردہ نہ ہوگا
جتنا کہ میں آج کی رات ہوں
ایک بیچارہ بوڑھا انسان جس کی ہڈیوں کی رطوبت خشک ہو چکی ہے
جو کسی لائق نہیں جو سوائے منتشر سنگریزوں کو جمع کرنے کے
میں ایک معزز قبیلہء فن کی آخری یادگار ہوں
فن کا بیٹا اوسین
بنجر اور بھورے آسمان کے نیچے ایستادہ
گوش بر نوائے جرس
آج کی رات مجھ پہ غم کے سائے لمبے ہیں

جس طرح مغربی ادب پر اسٹیم انجن کی ایجاد، دو عظیم جنگوں، ایٹم بم اور سرمایہ داری اور اشتراکیت کی سرد جنگ کے دیرپا اور دور تک کے اثرات ہیں اسی طرح برصغیر کے اردو ادب پر تقسیم ہند کے گہرے اثرات مرتب ہوئے اور یہ ابھی

تک پوری طرح اس دبدھے سے باہر نہیں آ سکا۔ تاہم گزشتہ چالیس پچاس سالوں کی نئی اردو نظم کا اگر بغور جائزہ لیا جائے تو اس کی قریب ترین جرأت مجید امجد سے بنتی ہے۔ ادب کے تقسیم اور مابعد تقسیم کے منظر نامے سے ہٹ کر دیکھیں تو مجید امجد وہ شاعر ہے جس نے سب سے پہلے بدلتی ہوئی دیہی اور شہری قدروں کو صارفیت کے حوالے سے محسوس کیا اور نظم کو نئے عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کا آغاز کیا۔ لیکن موجودہ نظم جس کا مبدا ستر کی دہائی کا اواخر اور اسّی (۸۰) کی دہائی کا آغاز یعنی بعد مجید امجد دور ہے، مجید امجد کی نظم سے آگے کی چیز ہے۔ میرا جی، ن م راشد، فیض اور مجید امجد کے عہود سے ہمارے عہد تک آتے آتے کئی قیامتیں گزر گئیں ہیں اور نظم نگار کے اندر اور ارد گرد کی صورتِ حال زیادہ پیچیدہ ہو گئی ہے۔ ایران عراق جنگ، خلیج کی دو جنگیں، افغانستان کی خانہ جنگی، اشتراکیت اور روس کی شکست و ریخت اور تیسری دنیا میں ترقی پسندی کی نئی توجیہات، طالبان، القاعدہ، نائن الیون، نیو ورلڈ آرڈر، تہذیبوں کا ٹکراؤ، معادیات، نیٹو کا پھیلاؤ، افغانستان پر براہ راست امریکی حملہ، تورا بورا، مہاجرین، سیاسی پناہ گزین، آئی ڈی پیز، دہشت گردی، خودکش حملے، تکفیری آئیڈیالوجی، داعش، دوسری عرب سپرنگ، لیبیا، شام اور یمن کا بحران، روس اور چین کا نیا عالمی کردار، گلوبلائزیشن، پولرائزیشن، بائیو، الیکٹرو میکینیکس اور انوائرمینٹل وار فیئرز، فورتھ اور ففتھ جنریشن ڈاکٹرائن، انفارمیشن اور میڈیا وار، سائی اوپس، آئی ٹی، موبائل، انٹرنیٹ، ویکسینیشن، جی۔ ایم۔ اوز، فاسٹ فوڈ چینز، پلازہ کلچر، تعلیم اور صحت کی کمرشلائزیشن، ملٹائی نیشنل اور این جی اوز کی بھرمار، تیل اور توانائی کے بحران، آلودگی، آبی ذخائر کی پرخاش، بجلی اور گیس کی لوڈ شیڈنگ، کساد بازاری، اکنامک اینڈ کلچرل اوکلٹزم وغیرہ یہ وہ غیر معمولی مظاہر اور حادثات طبعی ہیں جن سے آج کا نظم نگار دوچار ہے اور مسائل و موضوعات کے انبار تلے دبا ہوا ہے۔ یہ جدت اور قدامت کا قضیہ نہیں۔ نہ یہ ماقبل اور مابعد جدید کی بات ہے۔ یہ ان سے آگے کا فنامنا ہے، جو بالخصوص ہمارے خطّے کے علاقائی زبانوں کے ادب اور اردو کی نظمیہ شاعری میں تیسری لہر کا مظہر ہے، لیکن ابھی تک قدیم، روایتی اور جدید و بعد جدید میں الجھے ہوئے ہمارے بیشتر نقاد اور زعمِ جدت میں مبتلا مگر لگے بندھے موضوعات اور بنے بنائے نقوشِ پا میں پاؤں رکھنے کے عادی بعض نئے نظم نگار خود بھی اس تیسری لہر سے آشنا نہیں۔

اختر الایمان کی نظم میں جلاوطنی کا اظہار

ڈاکٹر ناصر عباس نیرّ

اردو میں جدید نظم کے متعلق مقبول ہونے والے کچھ مفروضوں کو ساقط کیے بغیر ہم اختر الایمان (۱۹۱۵ء۔۱۹۹۶ء) کی نظم سے نہ لطف اندوز ہو سکتے ہیں، نہ اس کے معانی تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں! یاد رہے شاعری سے حاصل ہونے والی مسرت، اس کے معانی کی دنیا میں اترنے کا زینہ بن جایا کرتی ہے۔

یہیں بعض بنیادی مسائل کی نشان دہی بھی ہوتی ہے۔ اوّل یہ کہ ہم ادب کو نہ صرف بعض توقعات (جنھیں اصطلاحاً مفروضے کہا جا سکتا ہے) کی روشنی میں پڑھتے ہیں، بلکہ یہ توقعات ادب سے اخذ مسرت و معنی کے عمل پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ دوّم یہ کہ اردو کی جدید نظم تقاضا کرتی ہے کہ اس کی تفہیم سے پہلے، اس کی شعریات کی تفہیم، اور اس سے ایک عام درجے کا اتفاق کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں نظم کا ایک اہم حصہ نظم سے 'باہر' موجود ہوتا ہے، اور نظم کے قاری کو پہلے اس حصے سے متعارف ہونا چاہیے۔ (اگر کوئی قاری ایسا نہیں کر پاتا، یا نہیں کرنا چاہتا تو اسے نظم کی دنیا سے 'باہر' رہنے پر تیار رہنا چاہیے)۔

اس سے یہ شائبہ ہوتا ہے کہ نظم خود اپنے وجود کا جواز باور نہیں کرا سکتی، اور اسے اپنے ہی ایک طفیلی وجود یعنی تنقید پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ یہ شائبہ اس لیے ہوتا ہے کہ قبل جدید شاعری سے متعلق ہمارا خیال ہے کہ اسے اپنے وجود کے جواز کا سوال درپیش نہیں ہوتا؛ ہم تنقیدی تصورات کا پاسپورٹ رکھے بغیر اس شاعری کی دنیا میں داخل ہو سکتے ہیں۔ مگر کیا واقعی؟ اصل بات یہ ہے کہ ہم دو باتیں بھول جاتے ہیں۔ جدید اور قبل جدید یا کلاسیکی عہد کا فرق، اور جدید عہد میں کلاسیکی شاعری کے مطالعے کا طریقہ۔ قبل جدید عہد کی شاعری بھی تنقیدی تصورات رکھتی تھی، اور انھی کے ذریعے اپنے وجود کا جواز پیش کرتی تھی، مگر وہ تصورات عام ادبی شعور اور ثقافت کا حصہ بنے ہوئے تھے، اور اس لیے حصہ بنے ہوئے تھے کہ وہ انقطاع، عدم تسلسل وجود میں نہیں آیا تھا، جس کا تجربہ سیاسی و تہذیبی طور پر ہم نے نوآبادیاتی عہد میں کیا، اور فکری سطح پر جدیدیت کے فلسفے کے تحت۔ تاہم کلاسیکی عہد میں بھی جب کبھی کوئی شاعر عام ادبی شعور سے ہٹ کر کچھ لکھتا تھا، عام ادبی شعور سے خود کو منقطع کرنے کی جسارت کرتا تھا تو اسے وہی صورتِ حال درپیش ہوتی تھی، جس کا سامنا بیسویں صدی میں جدید شعرا کو ہوا۔ غالب کو یوں ہی نہیں کہنا پڑا: 'نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی'۔ علاوہ ازیں نوآبادیاتی سیاسی، تعلیمی اثرات نے جب کلاسیکی شاعری سے ہمارا ذوقی رشتہ کمزور کر دیا، اور جدیدیت کے فلسفے نے کلاسیکی تصور کائنات پر سوالیہ نشان لگا دیا تو کلاسیکی شاعری ہمارے لیے بڑی حد تک 'اجنبی' ہو گئی۔ بیسویں صدی کے اوائل سے احساس ہونے لگا کہ جب تک آپ کلاسیکی شعریات کا لحاظ نہیں رکھتے، کلاسیکی شاعری کے معانی تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ یعنی کلاسیکی شاعری کا ایک اہم حصہ بھی، جدید شاعری کی طرح اس سے 'باہر' موجود ہے؛ جب تک آپ اس حصے کا فہم حاصل نہیں کرتے، بلکہ اسے جذب نہیں کرتے، کلاسیکی شاعری کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔

جدید نظم جس جدیدیت کا تخلیقی مظہر ہے، وہ عام ادبی شعور ہی کو چیلنج نہیں کرتی، عام انسانی شعور سے بھی

مبارزت طلب ہوتی ہے، اور خود شعور کے عقب میں موجود اس دنیا میں بے دھڑک داخل ہوتی ہے، جو شعور کو تلپٹ کرنے پر آمادہ رہتی ہے۔ (مابعد جدیدیت اس سے ایک قدم آگے جا کر خود شعور، ذوق، معنی، متن وغیرہ کے قائم ہونے کے عمل پر سوال اٹھاتی ہے)۔ یعنی جدید نظم لکھی ہی اس منطقے میں جاتی ہے، جہاں وحدانی (Monolithic)، مقبول عام تصورات ، اجتماعی بیانیوں، ادبی سماجی کینن کو چیلنج کرنے کی عام اجازت ہی نہیں، اسے لازمی تخلیقی ضرورت کا درجہ بھی حاصل ہے۔ چوں کہ یہ منطقہ خود کار انداز میں وجود میں نہیں آتا، یا آسمان سے انعام کے طور پر نہیں اترتا، بلکہ اس بشری مرکزی فکر میں وجود رکھتا ہے، جو تمام انسانی ذہنی اعمال کی اصل 'تاریخ وسماج' اور ان سے رونما ہونے والی 'دنیویت' میں دیکھتی ہے، اس لیے اسے برابر واضح کیا جانا ضروری ہے۔ یعنی ایک ایسی انسانی فکر کی مسلسل ضرورت ہے، جو ہر شے پر سوال، خالص انسانی دنیوی تناظر میں سوال قائم کر سکے، اور نتیجتاً انسانی دنیا کے معاملات کی باگ انسانی ہاتھوں میں رہے۔ جدید نظم کی تنقید کا ایک حصہ اسی منطقے کے جواز، کارگزاری اور نظم سے اس کے تعلق پر روشنی ڈالتا ہے۔ اردو کے سماج میں جہاں جدیدیت، اور اس کی اگلی منزل مابعد جدیدیت کے خلاف 'مقدس نظریاتی مزاحمت' موجود ہے، جدید نظم کی مذکورہ تنقید کی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

علاوہ بریں جدید نظم جس دنیا (اور اس دنیا میں سماج، تاریخ، سیاست، علوم، جمالیات وغیرہ خاص طور پر شامل ہیں) کو لکھتی ہے، اس میں سب کچھ مسلسل بدل رہا ہے، فنا ہو رہا ہے، اندر یا باہر کوئی شے مستقل نہیں، ایک خطرہ، ایک بحران ہے، جس کی زد پر ہر جدید لکھنے والا خود کو محسوس کرتا ہے؛ کوئی ہیئت، کوئی تکنیک، کوئی اسلوب، لفظیات کا کوئی مجموعہ، موضوعات کی کوئی فہرست ایسی نہیں، جسے ہر شاعر قبول کر سکے، یا جسے اپنے تجربے کے اظہار کے لیے موزوں سمجھ سکے؛ ایک لنگر، ایک محفوظ ٹھکانے، ایک وطن کی جستجو سب کو ہے۔ جدید نظم اسی جستجو کا جمالیاتی مظہر ہے!

مختصر یہ کہ جدید نظم ماضی سے ایک دم کٹ جانے، اور ایک غیر متوقع حال اور غیر یقینی مستقبل کے روبرو ہونے کے تجربے کو لکھتی ہے۔ یہ کم وبیش ایک ایسی صورتِ حال ہے کہ آپ 'اپنوں' سے بچھڑ کر ایک نئی، اجنبی دنیا میں آ گئے ہیں، جلاوطن ہو گئے ہیں، بے گھر ہو گئے ہیں، محفوظ پناہ گاہوں سے بے دخل کر دیے گئے ہیں، اور اکیلے ہو گئے ہیں، اور آپ کا سامنا غیر متوقع حالات سے ہے، یعنی 'آج اور اس لمحے' سے ہے، جس کے ایک طرف ماضی منھ پھاڑے کھڑا ہے، اور دوسری طرف آنے والا، غارت گر لمحہ ہے۔ جدید شاعری جلاوطن، بے گھر افراد کی شاعری ہے، جن کا اگر کوئی گھر ہے تو یہی شاعری ہے، جسے 'آج، اس لمحے' کے 'اندر' لکھا گیا ہے۔ حقیقی جدید شاعر مکاں سے زیادہ زماں میں سانس لیتا ہے۔ اکثر لوگ 'بے گھری' کو تجربہ بنانے سے گریز کرتے ہیں، کیوں کہ وہ نئے جذبات اور ایک نئی قسم کی آزادی کو سہارنے سے قاصر ہوتے ہیں، اس لیے وہ 'گھر'، ماضی وروایت کے وحدانی تصور کی 'محفوظ پناہ گاہ' کی طرف مراجعت کر جاتے ہیں۔ یعنی کچھ نظم گو اپنی شاعری کو اپنا گھر نہیں بنا پاتے، اور قارئین جدید نظم کی بجائے روایتی، مانوس شاعری سے دل لگا لیتے ہیں۔

اختر الایمان کی شاعری ایک 'جلاوطن'، 'بے گھر' شخص کی شاعری ہے۔ انھوں نے ہجرت نہیں کی، وہ جلاوطن بھی نہیں ہوئے، مگر انھوں نے مہاجرت اور بے دخلی کے تجربے کی شاعری لکھی۔ کیسے؟ اس کا جواب آئندہ صفحات میں تلاش کیا گیا ہے۔

'جدید نظم، زبان کے علامتی استعمال سے عبارت ہے، اور علامت نظم کی زبان کو اجنبی، پیچیدہ، مبہم بناتی ہے'۔ یہ

مقبول ترین مفروضہ ہے، جسے جدید نظم کے ہر شاعر کے مطالعے میں اندھا دھند استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر آپ اس مفروضے کی روشنی میں اختر کی نظمیں پڑھیں تو عین ممکن ہے آپ کو سخت بے زاری محسوس ہو؛ اختر کی بڑی حد تک سادہ، کھردری، روزمرہ کی زبان، آپ کو جدید نظم کے لیے اجنبی محسوس ہو۔ تاہم اگر ہم مذکورہ مفروضے کے ٹھیک ٹھیک معنی اور کچھ مضمرات پر غور کرلیں تو ہمیں اس سوال کا جواب مل جائے گا کہ اختر الایمان کی نظموں کے لیے اسے ساقط کرنا کیوں ضروری ہے۔ اس مفروضے کا ٹھیک ٹھیک معنی یہ ہے کہ جدید نظم حقیقت کی عکاسی نہیں کرتی، حقیقت خلق کرتی ہے، اور اس ضمن میں زبان کا خاص طرح کا استعمال کرتی ہے۔ یہ خاص طرح کا استعمال، زبان کے اپنے معنی خیزی کے نظام کو متحرک کرنے سے عبارت ہے۔ یعنی زبان کا ایک طرح کا استعمال حقیقت کی عکاسی کرتا ہے، جب کہ دوسری طرح کا استعمال حقیقت خلق کرتا ہے۔ زبان کا یہ دوسری طرح کا استعمال اس تجربے یا حقیقت کو بے دخل کر دیتا ہے، جو سماجی یا نفسی دنیا میں بالفعل موجود ہوتی ہے۔ (یہ الگ بات ہے کہ بے دخل ہونے کے باوجود حقیقت کے کچھ ریزے اپنی لو دیتے رہتے ہیں)۔ اس کے نتیجے میں 'جدید نظم' ایک خود مختار حیثیت اختیار کرنے کا تاثر دیتی ہے۔ تاثر اس لیے کہ حقیقت کے ریزے، نظم کی لسانی خود مختاری پر دھاوا بولنے کا قوی امکان رکھتے ہیں۔ بہ ہر کیف مذکورہ مفروضے کی روشنی میں نظم کے اندر جھانکنے کے لیے کسی مانوس، جانی پہچانی حقیقت کی روشنی نہیں چاہیے، بلکہ خود نظم کی 'بند، تاریک دنیا' اپنے اندر اپنی طرز کی روشنی رکھتی ہے، اور اس تک رسائی، نظم کی علامتوں کی گرہوں کو کھولنے سے ہو سکتی ہے، اور علامتوں کی گرہیں کھولنے کے لیے ضروری ہے کہ خود علامت ہی کو حوالہ بنایا جائے۔ ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں کہ جدید نظم کے بعض ممتاز شعرا کے لیے یہ مفروضہ کلید کا درجہ رکھتا ہے، مگر اختر الایمان کے لیے نہیں، جو بلاشبہ جدید نظم ہی کے ایک ممتاز شاعر ہیں۔

راشد اور میراجی کی طرح، اختر الایمان کو بھی اپنی نظموں کی وضاحت کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ چناں چہ اپنی نظموں کی کتابوں کے دیباچوں میں انھوں نے اپنی کئی نظموں کی 'علامتوں' کی تشریح کی ہے ا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ وہ اپنی نظموں کی تشریح کے دوران میں خود اسی مفروضے کے اسیر ہوئے، جس کو معطل رکھنے کے نتیجے میں ان کی نظم نمو پاتی ہے۔ (یہ ایک عمومی رویہ ہے کہ اکثر شاعر اپنے تخلیقی عمل کے دوران میں ادعائی طرز عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں، مگر نظموں کی 'اپالوجی' تیار کرنے میں معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرتے ہیں)۔ ان کی نظم کی زبان ایک ایسی خود مختار حیثیت اختیار نہیں کرتی، جہاں وہ موجود و معلوم سے بے نیاز ہو کر خود اپنے موجود و معلوم، خود اپنے ڈھنگ سے خلق کرنے لگتی ہے؛ روزمرہ کی حقیقت پر 'لسانی، علامتی، نشانیاتی، خطابتی حقیقت' غالب آ جاتی ہے (اس طرح کی نظم کو ہم مابعد جدید کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا)۔ اختر الایمان کی نظم روزمرہ کی حقیقت میں بنیاد رکھتی ہے، لیکن یہ روزمرہ ہر اعتبار سے 'جدید' ہے؛ اس کا زمانی تعلق جدید دنیا سے ہے، جس نے اختر کے حین حیات خود کو پہلے نو آبادیاتی، پھر تقسیم و فسادات اور بعد میں صنعتی، سرمایہ دارانہ دنیا کے طور پر پیش کیا، اور اس کا علمیاتی تعلق جدیدیت کے فلسفے سے ہے، جس میں 'اپنی' ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو، پر شدید اصرار تھا، اور جس کا شعریاتی تعلق جدید شاعری کی اس تحریک سے ہے، جس میں کینن سازی کے خلاف مزاحمت موجود تھی۔ جب جدید شاعری کینن سازی کے خلاف مزاحمت کرتی ہے تو اس کا صاف سیدھا مطلب یہ ہے کہ ایک جدید شاعر، دوسرے جدید شاعر کے لیے کینن نہیں بن سکتا، اور ایک خطے کی جدیدیت، کسی دوسرے خطے کی جدیدیت کے لیے کینن نہیں بن سکتی۔ کینن شکنی کے اسی عمل کے نتیجے میں جدیدیت کا کوئی ایک مستند ورژن قائم نہیں ہو پاتا۔ جدیدیت کی ایک سے زیادہ اور مختلف صورتیں سامنے آتی ہیں۔ واضح لفظوں میں، جسے ہم جدید نظم کہتے ہیں، وہ کسی ایک انسانی آواز کی

نمائندگی نہیں کرتی، بلکہ وہ ایک ایسا تخیلی میدان ثابت ہوتی ہے، جہاں ہر انسانی آواز، اپنے اظہار کو مستند بنانے کا یکساں موقع حاصل کرتی ہے۔ یوں اصولی طور پر ہر جدید نظم ایک نئی انسانی آواز کو مستند بنانے کی کوشش ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک معلوم، روزمرہ کی حقیقت کو پیش کرتے ہوئے بھی جدید نظم یہ کوشش جاری رکھتی ہے۔

اختر الایمان کی شاعری میں جس انسانی آواز کو مستند بنانے کی کوشش ملتی ہے، وہ ایک جلاوطن کی آواز ہے۔ اختر کی اکثر نظمیں روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں، کیفیتوں، تجربوں کو پیش کرتی ہیں (اور یہاں وہ مجید امجد کے کافی قریب آتے محسوس ہوتے ہیں)، جس سے یہ لگتا ہے کہ وہ اپنے آس پاس اور اردگرد کی دنیا میں سانس لے رہے ہیں، یعنی 'گھر' اور 'وطن' میں ہیں، لیکن اس دنیا سے ان کا تعلق تطابق اور سمجھوتے کا نہیں، جیسا کہ محمد حسن نے کہا ہے[۲]، بلکہ ان سے 'باہر' ہونے کا ہے، جو جلاوطنی کی حالت ہے۔

جلاوطنی کی کئی صورتیں ہیں۔ ان سے جدید عہد میں کتنے ہی محبّ وطن سیاست دانوں سے لے کر دانش وروں اور تخلیق کاروں کا واسطہ پڑا۔ ان صورتوں میں جبری اور اختیاری تو سامنے کی ہیں۔ ان دونوں میں جلاوطن شخص اپنے وطن سے دور کسی اور خطے میں رہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ جلاوطنی کی یہ قسمیں ناظم حکمت اور محمود درویش کی نظموں میں خاص طور پر ملتی ہیں۔ ایک تیسری صورت 'گھر میں بے گھری' کی ہے۔ آدمی اپنے وطن میں رہتے ہوئے، اپنے وطن کے کلچر، زبان سے کٹا ہوا ہوتا ہے۔ جلاوطنی کی چوتھی صورت وہ ہے جسے ایڈورڈ سعید جلاوطنی کی استعاراتی صورت کہتے ہیں[۳]۔ خود کو مسلسل بے خانماں محسوس کرنا، اور اس کے نتیجے میں ایک کبھی ختم نہ ہونے والے اضطراب کی زد پر رہنا، جلاوطنی کی استعاراتی حالت ہے۔ اس حالت کا محرک حقیقی بے دخلی بھی ہوسکتی ہے، اور فکر و اظہار پر بندشیں بھی ہوسکتی ہیں، اور اپنے ادبی و علمی نظریات سے سماج کی عدم موافقت بھی۔ اختر الایمان کو بچپن میں ایک محدود قسم کی حقیقی جلاوطنی کا تجربہ ہوا۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۴ء تک کے چار سال انھوں نے موئیدالاسلام، دہلی میں گزارے۔ وہ دہلی میں چچا کے پاس آئے، جنھوں نے انھیں گھر میں رکھنے کے بجائے موئیدالاسلام پہنچا دیا۔ بہ قول اختر الایمان ''موئیدالاسلام ریفارمیٹری بھی تھا، مریض خانہ بھی، یتیم خانہ بھی، اور ایک باقاعدہ سکول بھی''[۴]۔ یہاں اختر الایمان کو کسمپرسی اور زندگی کرنے کے جبری طور طریقے اسی طرح اختیار کرنے پڑے، جس طرح ایک جلاوطن شخص انھیں اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اختر الایمان نے خاصی کمزور آپ بیتی لکھی ہے۔ انھوں نے واقعات تو بیان کردیے، مگر ان واقعات کے اثرات، اور اپنی نفسی و ذہنی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا تجزیہ نہیں کیا۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ والدین کے جیتے جی یتیم خانے میں نوعمری کے چار برسوں کا حقیقی، نفسیاتی اثر 'جلاوطنی' کا تھا۔ آگے ان کی نظموں میں جلاوطنی کی جو استعاراتی صورت پیدا ہوئی، اس کا ایک ممکنہ محرک یہ واقعہ ہوسکتا ہے۔

اختر الایمان کے یہاں جلاوطنی استعارہ بنتی ہے۔ یعنی یہ حقیقی جلاوطنی سے 'بڑھ کر' ہے۔ حقیقی جلاوطنی میں آدمی کسی دوسری سرزمین پر مہاجرت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتا ہے، اور خود کو سزا یافتہ تصور کرتا ہے، لیکن استعاراتی جلاوطنی میں آدمی اپنے وطن ہی میں مہاجرت و گھر بدری کے عذاب ہی نہیں سہتا، بلکہ جبریت و بے دخلی کی ایک کربناک حالت اور اس کے خلاف ایک مسلسل مزاحمت اور ایک لامتناہی اضطراب کی زد پر رہتا ہے۔ حقیقی جلاوطن شخص اپنے وطن کی یاد سے اپنی سزا میں کچھ کمی محسوس کرنے کے مواقع پیدا کرلیتا ہے، جس طرح ناظم حکمت یا درویش اپنے وطن کو یاد کرکے آسودگی حاصل کرلیتے ہیں۔ اصلاً وہ جلاوطنی کی اجنبی دنیا سے نکل کر کچھ دیر کے لیے مانوس، حسی دنیا میں داخل ہوجاتے ہیں۔ مثلاً ناظم حکمت کی نظم 'استنبول کا حراست گھر' کا یہ ٹکڑا دیکھیے:

مجھے اپنے ملک سے عشق ہے
میں اس کے چناروں پر جھولا جھول چکا ہوں
میں نے اس کے قید خانوں میں راتیں بسر کی ہیں
اس کے گیتوں اور تمبا کو سے بڑھ کر
میری روح کو اور کوئی شے نہیں گرماتی ۵

مگر استعاراتی جلاوطنی میں بے خانماں، 'گھر باہر' شخص، ایک مسلسل عدم موافقت کی حالت کا سامنا کرتا ہے۔ اس کے پاس ماضی کا کوئی مثالی، رومانوی تصور نہیں ہوتا، جس میں وہ پناہ لے سکے۔ اس لیے اس کی سزا میں حقیقتاً کمی نہیں ہوتی۔

اختر الایمان کی نظموں میں ماضی و تاریخ و روایت سے جلاوطنی کا موضوع ملتا ہے۔ ایک محرک نوآبادیاتی سیاست ہے، اور دوسرا محرک جدیدیت ہے، اور تیسرا محرک صنعتی سرمایہ داریت ہے۔ پہلے اور تیسرے کا تعلق حقیقی، سیاسی، سماجی، معاشی تاریخی صورتِ حال سے ہے، اور دوسرے کا تعلق نفسی، نجی، انفرادی دنیا میں واقع ہونے والے انقطاع سے ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اختر الایمان کو ترقی پسندوں اور جدیدیت پسندوں، دونوں نے اپنے اپنے دبستان کا شاعر سمجھا، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ نہ تو معروف معنوں میں ترقی پسند شاعر ہیں، اور نہ جدیدیت کے اس وحدانی (Monolithic) تصور پر پورا اترتے ہیں، جس کی نمائندگی میراجی اور راشد بہ طورِ خاص کرتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اختر الایمان جدید شاعر ہیں، مگر خود اپنا کینن آپ ہیں۔

نوآبادیاتی سیاست نے کس طرح ہندوستانیوں کو اپنے ہی گھر میں غلام اور اجنبی بنا کر رکھ دیا، کس طرح ان کی ثقافت کو حاشیے پر دھکیل دیا، کس طرح ان کی انسانی شناختوں کو مسخ کیا، کس طرح تاریخی عمل میں ان کے کردار کو محدود کر دیا، اور کس طرح ان کا معاشی استحصال کیا، اسے اختر نے متعدد نظموں میں موضوع بنایا ہے۔ ان میں طنزیہ ڈرامائی نظم 'سب رنگ' خاص طور پر اہم ہے، جس میں نوآبادیاتی سیاست کے سب رنگوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس نظم میں تمام کردار تمثیلی ہیں۔ آدم، بدیسی یعنی انگریز کی تمثیل ہے، گدھا، پٹے ہوئے شہزادے کی، سانپ، سیاسی رہنما کی، خچر، والئ ریاست کی، کتا، خطاب یافتہ شخص کی، بیل، محنت کش کی، گدھ، سرمایہ دار کی تمثیل ہے، اور قوتِ حیات و نمو خود ایک کردار ہے۔ چار رنگوں یعنی چار حصوں پر مشتمل یہ نظم ۱۹۴۰ء کی دہائی کی نوآبادیاتی، سیاسی صورتِ حال پر گہرا طنز کرتی محسوس ہوتی ہے۔ نظم کا بنیادی ارتکاز اس نکتے پر ہے کہ آدم یعنی انگریز نے ہندوستانیوں کو غلام بنانے اور تاریخ و ثقافت سے جلاوطن کرنے کا عمل گدھوں، خچروں اور سانپوں جیسے مقامی عناصر کی مدد سے کیا۔ نوآبادیات کا یہ ایک ایسا تضاد تھا جسے بہت کم اہل نظر نے سمجھا۔ یورپی نوآبادیات خود کو جدیدیت اور صنعتی سرمایہ داریت کی علمبردار بنا کر پیش کرتی تھی، اور اپنے اس امیج کے ذریعے ہندوستان سمیت دیگر نوآبادیوں کو یقین دلانے کی کوشش کرتی تھی کہ وہ انھیں غلام بنانے نہیں آئی، انھیں فکری سطح پر جدیدیت اور معاشی سطح پر صنعتی سرمایہ داریت کی برکتوں سے فیض یاب کرنے آئی ہے، لیکن اختر الایمان کے لفظوں میں یورپی نوآبادیات گدھوں، خچروں، کتوں اور سانپوں جیسے قدامت پسند طبقوں کی حمایت کر کے، اور بیلوں کی بجائے انھیں بااختیار بنا کر خود اپنے دعوے کی نفی کرتی تھی۔ لہٰذا انگریز راج کی اگر کوئی برکتیں تھیں تو ان سے قدامت پسند بالائی طبقات مستفید ہوئے۔ ایک تلخ سچائی یہ ہے کہ نئے قدامت پسند طبقے اب نئی نوآبادیاتی قوتوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ دوسری

طرف حقیقت یہ ہے کہ جلاوطنی کا تجربہ تمام ہندوستانیوں نے نہیں کیا، بلکہ محنت کش ہندوستانیوں نے کیا، اور استعاراتی سطح پر جلاوطنی کا دکھ تخلیق کاروں اور دانش وروں کے ایک طبقے نے بھوگا۔ نظم کا ایک ٹکڑا دیکھیے، جس میں بیل یعنی محنت کش، کتے یعنی انگریزوں کے خطاب یافتہ شخص، خچر یعنی والی ریاست، اور گدھے یعنی پٹے ہوئے شہزادے سے مخاطب ہے۔ بیل کہتا ہے کہ آدم کے رخسار کی سرخی، اس کے لہو کی مرہون ہے:

اس گھنے جنگل میں اگ آئیں اگر
تم سے احمق چند اور
زندگی بن جائے پھر
اک عذاب مستقل
یہ ردائے آب و آتش باد و گل
پھینک دینے کے سوا چارہ نہ ہو!
جانتا ہوں اس تمھارے رحم دل آدم کو میں
اس کے رخساروں میں جو
سرخیاں ہیں جلوہ گر
تم سے میں پوچھوں وہ ہے کس کا لہو
اس کی آنکھوں کی چمک، اس کے چہرے کی دمک
اس کی تابانی کا راز
میری بربادی میں ہے!

ان مصرعوں کا واضح اسلوب، جدید نظم کے خوش ذوق قارئین پر گراں نہیں گزرنا چاہیے، اس لیے کہ یہ ڈرامائی نظم ہے۔ بیل، عام لوگوں کی جس بربادی کا ذکر کرتا ہے، وہ محض معاشی نہیں، نفسیاتی، ثقافتی اور تاریخی بھی ہے۔ یعنی مکمل بربادی مکمل بے دخلی۔ چوں کہ مکمل بربادی اور بے دخلی کا تجربہ نچلے طبقات کو ہوا، اس لیے ان کے نمائندہ کردار کی زبانی اس کا اظہار ہوا ہے۔ درج ذیل حصے میں قوتِ حیات و نمو بیل یعنی ہندوستانی محنت کش سے مخاطب ہوتے ہوئے یہی بات کہتی ہے۔

قوت: تمھارا آقا ہے ایک آدم
تم آپ آپس میں کچھ نہیں ہو؟
تمھاری ہستی ہے اور سوغم
زمیں تمھاری نہ آسماں ہے؟
تمھیں نہیں حق کہ سانس بھی لو
بغیر مرضی کے دوسروں کی؟

نظم 'سب رنگ' کا مقام ایشیا کا ایک جنگل ہے۔ جنگل بھی تمثیلی مفہوم رکھتا ہے۔ جنگل، تہذیب اور تاریخ سے عاری سماج کی تمثیل ہے، جہاں کے رہنے والے سب جنگلی یعنی وحشی اور غیر مہذب ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ سوائے بیل

کے باقی سب اپنے حال میں مست ہیں، اس لیے کہ انھیں اپنے نئے کردار کا معاوضہ خطاب یا اختیار کی صورت میں مل رہا ہے۔ اس جنگل میں واحد مہذب مخلوق آدم یعنی بدیسی یورپی ہے۔ ایک آدم کے مقابلے میں تمام ایشائیوں کا جنگلی بن جانا ایک طرف ان کے سلب انسانیت (Dehumanization) اور دوسری طرف ان کی ثقافتی بے دخلی و مہاجرت (Cultural Displacement) کا بلیغ استعارہ ہے۔ ویسے ان دونوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ نظم 'ایک کہانی' جو پہلی نظم ہی کی طرح ڈرامائی نظم ہے، اس کا مقام تاریک سیارے کا ایک ملک ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ براعظم ایشیا ہی تاریک سیارہ ہے، اور اس کا ملک ہندوستان ہے۔ سیارہ ہے، مگر تاریک ہے۔ مدار میں رہنے کے باوجود روشنی کے منبع سے کٹ گیا ہے۔ یہ وہی تضاد ہے جس کا تجربہ وہ آدمی کرتا ہے جو وطن میں جلاوطن ہو۔ 'نظم ایک کہانی' کے کردار محبوبہ، باغی اور مستقبل ہیں۔ ماضی بھی ایک کردار ہے، جو حزنیہ کورس گاتا ہے:

کچھ دن بیتے اس دھرتی پر دیس تھا اک پھولوں سے پیارا

یہ حزنیہ کورس ناسٹلجیا ہے، جو ہر گھر بدر شخص کی تقدیر ہے۔ آدمی اپنے اس دیس کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے:

ہری بھری کھیتی کا دشمن
اک پاپی باہر سے آیا
آگ کی مدھم آنچ بڑھا کر
گھر پھونکے، ہنستوں کو رلایا

یہی بات اس نظم کی کردار محبوبہ بھی کہتی ہے:

موت کا تحفہ لے کر آئے

باہر سے پاپی بیوپاری

ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں کہ ان نظموں میں وضاحت کچھ زیادہ ہی ہے۔ ان میں وہ گریز پا کیفیت کم کم ہے جو قاری کو روک لیتی ہے اور پکڑ لیتی ہے؛ قاری کو اس بات سے روکتی ہے کہ جلدی جلدی لفظوں کو ہڑپ نہ کیا جائے، بلکہ لفظوں کی ان کہی کو دھیرے دھیرے گرفت میں لیا جائے، اور اس ان کہی سے پھوٹنے والی نرم، مدھم روشنی سے اپنے وجود کے ان حصوں تک رسائی حاصل کی جائے، جنھیں ہم زندگی کی بھاگم بھاگ میں بھول بیٹھتے ہیں۔ یہ کیفیت اختر الایمان کے بعض دوسری نظموں میں بلاشبہ موجود ہے۔

اختر الایمان نے ۱۹۵۲ء میں اپنے نیا مجموعہ تاریک سیارے کے نام سے شایع کیا۔ گرداب (۱۹۴۳ء) میں انھوں نے نوآبادیاتی سیاست کے ہاتھوں ہندوستانیوں کی بے دخلی و مہاجرت کو موضوع بنایا، اور تاریک سیارے کی آخری نظموں میں، اور اگلے مجموعوں میں صنعتی سرمایہ داریت کی لائی ہوئی جنگیں، ایٹمی اسلحے کی تجارت، ٹیکنالوجی کے ہاتھوں قدرتی وسائل کی تباہی کے موضوعات ملتے ہیں۔ اس نئے مجموعے میں دیس، انسان اور استعمار کار تینوں کے تصورات وسیع ہوگئے ہیں۔ اب سیارہ زمین ہی دیس بن گیا ہے، اور اسی کی مناسبت سے ہندوستانی باشندے کی جگہ زمین کے باسی انسان نے لے لی ہے، اور صنعتی سرمایہ داریت نے نئے استعمار کار کا روپ دھار لیا ہے۔ پہلے جلاوطنی اپنے دیس سے تھی، اور اب سیارہ زمین سے انسان کے جلاوطن ہونے کا اندیشہ شاعر کو پریشان کرتا ہے۔ نظم 'جنگ' کے یہ مصرعے دیکھیے:

''میں زمیں ہوں، مجھے ہر رنگ میں تم پیارے ہو!
میں یہ تفریق نہ کر پاؤں گی کس مٹی نے
تم کو پالا، تمھیں پروان چڑھایا تھا کبھی

زمین کی ممتا، اور اس کی بربادی کا خدشہ آخر تک ان کی نظموں میں ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی ان کے باقی مجموعوں بنت لمحات (۱۹۶۹ء)، نیا آہنگ (۱۹۷۷ء)، سر و ساماں (۱۹۸۳ء)، زمین زمین (۱۹۹۰ء) اور آخری، بعد از مرگ شایع ہونے والے مجموعے زمستاں سرد مہری کا (۱۹۹۷ء) میں رخ بدل بدل کر ظاہر ہوتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے شعری تخیل میں ایک ایسا 'غیر' پہلو بدل بدل کر ظاہر ہوتا ہے، جو سیارہ زمین پر بسنے والے انسان کو گھر بدر کرنے پر تلا ہوا ہے، اور اس کے نتیجے میں انسان بے دخلی و مہاجرت کے اذیت ناک تجربے سے گزرنے پر مجبور ہے۔ 'غیر' کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانی ہستی کے عمیق ترین حصوں تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ اسے یہ خصوصیت اس لیے حاصل ہے کہ اس کا پروٹو ٹائپ 'زبان' میں موجود ہوتا ہے؛ ہم زبان سیکھتے ہی 'غیر' سے آشنا ہوتے ہیں، یعنی ایک ایسے تخیلی، غیر وجود سے ہمارا تعارف ہوتا ہے، جس کے ذریعے ہم خود کو پہچانتے ہیں۔ اس طرح ہماری پہچان میں عدم پہچان، یا ذات کی شناخت میں، شناخت کو مسخ کرنے والا عنصر شامل ہو جاتا ہے۔ ہم 'غیر' کے ذریعے خود کو پہچانتے بھی ہیں، اور وہی 'غیر' ہماری پہچان کو مسخ بھی کر رہا ہوتا ہے۔ بعد ازاں سماجی ٹیبو سے لے کر 'ریاستی غیر اور نو آبادیاتی غیر اور صنعتی و صارفی معاشرت کے غیر' زبان میں وضع کیے گئے اپنے ڈسکورس کے ذریعے ہمارے وجود کی گہرائیوں میں راہ پا لیتے ہیں، اور ہم قدم قدم پر، اپنی تنہائی و لاشعوری زندگی میں ایک تخیلی مگر حقیقی وجود سے کہیں طاقت ور اور غارت گر وجود کا سامنا کرتے ہیں۔ مثلاً نو آبادیاتی عہد میں یورپ اور صنعتی سرمایہ دارانہ عہد میں ٹیکنا لوجی ہمارا 'غیر' بنتے ہیں۔ ہم ان کے ذریعے اور ان کے مقابلے میں خود کو پہچانتے ہیں، ان کے سبب خود کو روشن خیال اور ترقی یافتہ تصور کرتے ہیں اور انھی کو اپنے لیے غارت گر بھی پاتے ہیں۔ بنت لمحات میں شامل نظم 'سبزہ، بیگانہ' اس حقیقت کو عمدگی سے پیش کرتی ہے۔ کلاسیکی شاعری میں سبزہ، بیگانہ 'مابعد الطبیعیاتی وجودی' مفہوم رکھتا تھا۔ مثلاً غالب کہتے ہیں:

چمن دہر میں ہوں سبزہ، بیگانہ اسد
وائے اے بے خودی و تہمت آرامیدن

مگر اختر الایمان کی نظم میں سبزہ، بیگانہ ایک طرف سیاسی، ثقافتی بے دخلی کا مفہوم رکھتا ہے، اور دوسری طرف 'لاشعوری در بدری' کا۔ اس نظم کا تناظر عالمی، سرد جنگ ہے۔ یہ ایک کرداری نظم ہے۔ نظم کا پیراڈاکس یہ ہے کہ نظم ایک کردار کے گرد گھومتی ہے، مگر وہ کبیری کردار ہونے کے باوجود کسی بھی طرح کی شناخت نہیں رکھتا۔ وہ مکمل جلاوطن کردار ہے۔ نظم کا آغاز ہی اس کردار کی تاریخ، حسب نسب اور وطن سے جلاوطن ہونے کے ذکر سے ہوتا ہے:

حسب نسب ہے نہ تاریخ وجائے پیدائش
کہاں سے آیا تھا، مذہب نہ ولدیت معلوم

وہ ایک مریض ہے جسے ایک مقامی چھوٹے سے خیراتی ہسپتال میں لایا گیا تھا۔ ہسپتال کے ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ راتوں کو چلایا کرتا تھا کہ اس کے اندر ایک زخمی پرندہ مقید ہے، جس کی رہائی کی وہ دہائی دیتا ہے۔ یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ زخمی پرندہ کس کی قید میں ہے۔ خود مریض کے اندر ایک تخیلی غیر ہی نے اس پرندے کو زخمی کیا ہے، اور قید کر رکھا

ہے۔ روایتی طور پر پرندہ روح کی علامت ہے، لیکن یہاں زخمی پرندہ انسانی آزادی۔ اختیار اور تخلیقی قوت کی علامت ہے ، جسے سرد جنگ، چھوٹے ملکوں پر مسلط کردہ جنگوں، صنعتی آلودگی، سرمایہ داریت کی چھوٹے ملکوں کے وسائل پر قبضے کی ہوس جیسے غیر نے محال بنادیا ہے۔ غیر کے یہ سب بھیانک روپ کس طرح انسانی لاشعور یعنی ہستی کی عمیق سطحوں پر استعماری اجارہ داری حاصل کرلیتے ہیں، اور اسے خود اپنی ہستی کے مرکز سے بے دخل کردیتے ہیں، یعنی اسے سزرہ ء بیگانہ بنادیتے ہیں، اسے شاعر نے فنی مہارت کے ساتھ نظم میں پیش کیا ہے۔

مریض چیختا ہے، درد سے کراہتا ہے
یہ ویت نام، کبھی ڈومنیکن، کبھی کشمیر
زر کثیر، سیہ قومیں، خام معدنیات
کثیف تیل کے چشمے، عوام، استحصال
زمیں کی موت، بہائم، فضائی جنگ، ستم
اجارہ داری، سبک گام، دل ربا، اطفال
سرود و نغمہ، ادب، شعر، امن، بربادی
جنازہ عشق کا، دف کی صدائیں، مردہ خیال
ترقی، علم کے گہوارے، روح کا مدفن
خدا کا قتل، عیاں زیر ناف زہرہ جمال
تمام رات یہ بے ربط باتیں کرتا ہے

یہ بے ربط باتیں، مرکزی کردار کی حقیقی داخلی صورت حال سے گہرا ربط رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر اس کا علاج نہیں کر پاتے تو اسے ماہرینِ نفسیات کے پاس بھیجتے ہیں، جو اسے ذہنی مریض قرار دیتے ہیں۔ ان کی توجیہات کا ذکر نظم میں کیا گیا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اس نے کبھی پرندہ پالا ہوگا، جو عدم توجہی سے مر گیا تو اس کا احساسِ جرم اس کے تحت شعور میں اتر گیا ہے، اور وہ خود کو قاتل و مجرم سمجھتا ہے۔ ایک کی یہ رائے تھی کہ یہ پس ماندہ، سیاہ قوم کا فرد ہے، اور یہ احساس ٹیبو کی صورت اس کے لاشعور میں اتر گیا ہے۔ کوئی یہ کہتا تھا کہ اس کے مرض کا باعث حبِ وطن ہے، اور وہ چاہتا تھا اس کی قوم خود کفیل ہو۔ کسی کی توجیہ یہ تھی کہ مریض شاعر ہے، اور وہ شہرت، شہوت اور دولت کا جویا تھا۔ ان میں ناکامی نے اسے مریض بنادیا۔ بالآخر مریض مر گیا، لیکن شفاخانے کے در و دیوار سے اسیر زخمی پرندے کو بچانے کی فریاد آج بھی گونجتی ہے۔ ان توجیہات کا ذکر کرکے شاعر اس مضحکہ خیزی کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں، جس کا مظاہرہ سماج کے بااثر، ماہرین کرتے ہیں، اور اس لیے کرتے ہیں کہ وہ انسانی ہستی کی عمیق سطحوں سے لاتعلق ہوتے ہیں، اور اس بنا پر 'غیر' کی غارت گری سے بھی ناآشنا ہوتے ہیں۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہے کہ مریض اپنے ہی سماج میں بے دخل، جلاوطن اور اجنبی رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں 'غیر' کی عدم پہچان کا عمل 'غیر' کے کردار کو مزید مستحکم کرتا ہے۔ بہرکیف ماہرین کی مضحکہ خیزی کو پہچاننے کے بعد نظم کا قاری ، مریض کی بے ربط باتوں کی تعبیر پر مائل ہوتا ہے۔ ان بے ربط باتوں سے ایک مکمل، مربوط کہانی مرتب ہوتی ہے۔ ویت نام، ڈومنیکن اور کشمیر میں بے گناہ لوگ مارے گئے۔ کہیں اس خدشے سے کہ اشتراکی حکومتیں نہ قائم ہوجائیں، اور کہیں اس خوف سے کہ لوگ اپنا حق خود اختیاری نہ استعمال کریں۔ ایشیائی و افریقی سیاہ قوموں پر سرمایہ دار ملکوں کا تسلط وہاں کی خام

معدنیات اور خام تیل کے چشموں پر قبضے کی خاطر ہے۔ ترقی کے نام پر اندھادھند صنعتیں قائم کرنا زمین کی موت کے مترادف ہے۔ صنعتی سرمایہ داریت وصارفیت نے انسانوں کو خدا کے قتل پر مائل کیا ہے۔ یہاں 'خدا کے قتل' کا مفہوم فلسفیانہ نہیں، جسے جدیدیت نے پیش کیا۔ خدا کے قتل سے مراد اس مرکزی طاقت کو اپنی ہستی سے بے دخل کرنا ہے، جو عشق ورفعت وتخلیق سے آدمی کو وابستہ کرتی ہے۔ جدیدیت نے انسانی ہستی میں دیوتائی عنصر کا اقرار کیا تھا، یعنی باہر کے دیوتاؤں اور خداؤں کا انکار کیا تھا، مگر آدمی کے اندر دیوتائی تخلیقی صلاحیت کا یقین دلایا تھا۔ صنعتی سرمایہ داریت نے انسان کو ایک صارفی شے میں بدل دیا ہے۔ اس کے اندر سے سرودونغمہ، ادب، شعر، امن کو جلاوطن کردیا ہے۔ یہی خدا کا قتل ہے، انسانی وجود کی اساسی تخلیقی جہت کی بے دخلی ہے، اور اس کے نتیجے میں آدمی زہرہ جمالوں کے زیرناف سے آگے کی دنیا، عشق وتخلیق کی دنیا کی طرف نگاہ نہیں اٹھاتا۔ نظم 'میری آواز' جو لگتا ہے نظم 'سبزہ ء بیگانہ' کے مریض کی آواز ہی کی بازگشت ہے، میں ایک بار پھر اسی طرف اشارہ ہے:

تمام مسئلے بے جان ہیں سوا اس کے
جو چائے خانوں سے چھوٹیں تو بھوکی آنکھوں سے
زنانِ شہر کے پستان ناپیں یا اپنے
اکیلے بیٹھے ہوئے زیرناف بال گنیں

نظم 'سبزہ ء بیگانہ' کا مریض جس اسیر زخمی پرندے کی آزادی کے لیے چیختا ہے، وہ ایک طرف انسانی آزادی کی علامت ہے، اور دوسری طرف عشق وتخلیق کے بشری، مگر دیوتائی خصوصیات کے حامل عنصر کی علامت ہے۔ یہی عنصر زخمی ہے، اسیری کی حالت میں ہے، یعنی جلاوطن ہے۔ نظم 'میری آواز' میں ایک بار پھر 'سبزہ ء بیگانہ' کے مریض کی آواز سنائی دیتی ہے۔

ملائکہ مری آواز سن رہے ہو تم
خدا نے چھین لیں بیساکھیاں بھی انساں سے
پیمبر اب نہیں آتے، زمین بانجھ ہوئی
تمام سلسلے تہذیب وضبط کے جو تھے
وہ سارے ٹوٹ گئے، زندگی تڑپتی ہے
اک ایسے درد سے جو دردِ زہ نہیں شاید!

نظم کا متکلم فرشتوں سے مخاطب ہے، تاکہ اس کی آواز خدا تک پہنچ سکے۔ پہلے وہ پیمبروں کے ذریعے خدا تک رسائی حاصل کرلیتا تھا، مگر اب پیمبر زمین پر نہیں آتے۔ انسان کے پاس یہ ایک بڑی بیساکھی تھی، جسے اس نے چھین لیا ہے۔ (بیساکھی میں جو پیراڈاکس ہے، وہ توجہ طلب ہے) پیمبر کیوں نہیں آتے؟ اس کا جواب نظم میں غیر واضح ہے۔ 'پیمبر اب نہیں آتے، زمین بانجھ ہوئی' اس مصرعے میں ایک طرف اس مفہوم کا قرینہ ہے: چوں کہ پیمبر نہیں آتے، اس لیے زمین بانجھ ہوچکی ہے، دوسری طرف اس مفہوم کی طرف بھی اشارہ ہے کہ چوں کہ زمین بانجھ ہے، اس لیے پیمبر نہیں آتے۔ گویا پیمبر زمین کی زرخیزی وتخلیقیت کا ثمر اور علامت ہیں، اور زمین ان سے خالی ہے۔ زمین اب اور طاقتوں کی دسترس میں ہے، جنھوں نے اسے رہنے کے قابل نہیں رہنے دیا۔ زمین پر زندگی درد سے تڑپ رہی ہے، لیکن افسوس کہ یہ دردِ زہ

نہیں؛ دردِزہ تخلیق کی بشارت بن کر وارد ہوتا ہے، مگر اب صرف محض درد ہے؛ اپنے خالی پن کا، زوال کا، جلاوطنی کا۔

☆☆☆

جدیدیت ماضی وحال کے بیچ، روایت وانفرادیت، تاریخ ولمحہء حاضر اور سماج وفرد کے درمیان ایک رخنے کو نمودار ہوتا ہوا دیکھتی ہے۔ جدید شاعری اس رخنے کا سامنا کرنے، اور اس کے علامتی امکانات کی دریافت سے عبارت کہی جاسکتی ہے۔ کوئی جدید شاعر ایسا نہیں، جسے سماجی سطح پر اجنبیت وتنہائی، سیاسی سطح پر جلاوطنی، وجودی سطح پر بیگانگیت، جذباتی سطح پر گھاؤ، لاشعوری سطح پر لخت لخت ہونے اور کائناتی سطح پر لاتعلقی کا تجربہ نہ ہوا ہو۔ اس تجربے کی شدت، یا اس کی تہوں میں فرق ہوسکتا ہے، مگر جدید شاعر اپنا دامن اس سے بچا نہیں سکتا۔ بہت سے جدید شاعر اس لیے ناکام ہوئے کہ انھوں نے اس تجربے کی آنچ محسوس کرتے ہی مفاہمت ومطابقت اختیار کرلی؛ انھوں نے ایک تنہا وجود کے طور پر اپنی تقدیر کا سامنا کرنے....اور اپنی بشریت کی حدوں میں کسی کے سہارے کے بغیر سفر پیا ہونے سے معذوری ظاہر کردی۔ ان کی ناکامی اس میں ہے کہ وہ 'غیر منقطع ماضی' کی اس دنیا میں پلٹ گئے جو حقیقتاً خواب وخیال ہے؛ انھوں نے روایت کے وحدانی تصور سے شدت پسندانہ وابستگی میں پناہ ڈھونڈ لی۔ ثقافتی سطح پر ان کا یہ عمل احیا پسندانہ تھا، سیاسی معنوں میں قدامت پسندانہ تھا، جب کہ جمالیاتی ولسانی سطحوں پر ان کا یہ عمل کلیشے کو قبول کرنے سے عبارت تھا۔ جدیدیت نے ماضی وحال، یا روایت وانفرادیت میں جس خلا کا احساس دلایا، وہ ماضی وروایت کی نئی تعبیروں کی راہ تو بلاشبہ کھولتا ہے، مگر ان کی اوّلین غیر منقطع صورت کا واپس نہیں لاسکتا۔ آدمی کھوئی ہوئی جنت کی طرف واپس نہیں جاسکتا، البتہ جنت بدری کی حالت میں ایک نئی جنت ضرور خلق کرسکتا ہے؛ ہوسکتا ہے، یہ جنت پرانی جنت کے مقابلے میں کم حسین ہو، یا سرے سے حسین ہی نہ ہو، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ایک جہنم ہو، مگر یہ بہ ہر حال آدمی کا اپنا بنایا ہوا ہے؛ جدید آدمی اس کی ملکیت تسلیم کرتا ہے۔ جدید آدمی اپنی اس تقدیر سے نہیں بھاگ سکتا کہ اسے ایک جلاوطن، لخت لخت زندگی بسر کرنی ہے۔

اختر الایمان کے یہاں جدیدیت کی جلاوطنی کی کچھ صورتیں ظاہر ہوئی ہیں۔ بہ طور نظم نگار ان کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کے یہاں جدیدیت اور استعماریت کی مسلط کردہ جلاوطنی میں حدِ فاصل بالعموم موجود نہیں۔ ان کی نظموں میں فلسفہء جدیدیت اور استعماری تاریخی تجربہ، جلاوطنی کی صورت ایک مشترک نکتہ دریافت کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے اختر الایمان کی نظموں کا ایک اور امتیاز یہ ہے کہ وہ فرد وسماج، یا لاشعور وتاریخ کی اس ثنویت کو تحلیل کرتی محسوس ہوتی ہیں، جسے ترقی پسندوں اور جدیدیت پسندوں نے اپنی اپنی شعریات میں مرکزی حیثیت دے کر شدت سے ابھارا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں نہ خالص وجودی تنہائی موجود ہے، نہ مطلق سماجی بیگانگیت۔ وہ جلاوطنی میں خود اپنی نظم کو وطن بنانے کی سعی کرتے ہیں۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ ان کی بعض نظموں میں ایک طرح کی اجنبیت ومہاجرت، دوسری طرح کی بے دخلی وبیگانگیت پر حاوی ہوگئی ہے۔

اس سلسلے میں ان کی پہلی اہم ترین مثال نظم 'مسجد' ہے۔ محمد حسن (جنھوں نے بلاشبہ اختر الایمان پر اب تک سب سے اچھی تنقید لکھی ہے) نے اس نظم کا تقابل اقبال کی نظم 'مسجد قرطبہ' سے کیا ہے، اور ایک اہم نکتہ یہ دریافت کیا ہے کہ دونوں میں ویرانی مشترک ہے، تاہم اقبال کی نظم کے پیچھے قرطبہ کی تاریخ، مسلمانوں کے عظیم ماضی کی وراثت، اور مربوط فلسفہء حیات ہے، جب کہ اختر کی نظم کے پیچھے دردمندی ہے[6]۔ محمد حسن نے شاید اس نظم کے تعلق سے دردمندی کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ متکلم کا لہجہ اس طرح شوخ اور بلند آہنگ باغیانہ نہیں، جس طرح راشد کے متکلم کا ہے۔ راشد کے یہاں 'خدا کا جنازہ

لیے جارہے ہیں فرشتے' جیسا چیختا ہوا، شوخ مصرع ملتا ہے، لیکن اختر دھیمے، دردمندانہ اور قدرے افسردہ لہجے میں اسی کو موضوع بناتے ہوئے لکھتے ہیں: ''طاق میں شمع کے آنسو ہیں ابھی تک باقی /اب مصلے ہے نہ منبر، نہ مئوذن نہ امام''۔ دردمندی کے علاوہ، نظم کے ضمن میں اہم ترین بات 'جلاوطنی' ہے۔ یہ مسجد انسانی آبادی سے دور ایک ندی کے کنارے واقع دکھائی گئی ہے۔ اس کی ویرانی اور تنہائی سے یہ تاثر شدت سے ابھرتا ہے، جیسے یہ مسجد انسانی دنیا سے جلاوطن ہوگئی ہے۔ اسی طرح نظم کا متکلم بھی اس دنیا سے خود کو جلاوطن محسوس ہوتا ہے، جو مسجد کی دنیا ہے، یا جس کی نمائندگی مسجد کرتی ہے۔

اختر الایمان نے اس نظم کے بارے میں لکھا ہے کہ ''مسجد مذہب کا علامیہ ہے، اور اس کی ویرانی عام آدمی کی مذہب سے دوری کا مظاہرہ ہے''[7]۔ شاعر اپنی شاعری کی وضاحت اور دفاع کرتے ہوئے کس قدر بھٹک سکتا ہے، اس کی مثال یہ رائے بھی ہے۔ 'عام آدمی کی مذہب سے دوری' اس نظم کا موضوع ہی نہیں۔ 'عام آدمی کی مذہب سے دوری' کا مطلب یہ ہے کہ مذہب موجود ہے، مگر کسی وجہ سے عام آدمی اس سے دور ہوگیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ نظم، وقت کے ہاتھوں مسجد کے تباہ ہونے، اور علامتی طور پر مذہب کے انحطاط پذیر ہونے، اور نتیجتاً مذہب کی دنیا سے جدید آدمی کے جلاوطن ہونے کو موضوع بناتی ہے۔ مذہب سے دوری اور مذہب کی دنیا سے جلاوطنی میں جو فرق ہے، وہ محتاج وضاحت نہیں۔ اس ضمن میں ایک اہم بات یہ ہے کہ شاعر نے نظم میں مذہب کے انحطاط کے اظہار کے لیے کشف یعنی Epiphany کو ایک تکنیک کے طور پر استعمال کیا ہے، جو مذہب سے مخصوص ہے۔ مثلاً یہ بند:

فرض جاروب کشی کیا ہے سمجھتا ہی نہیں
کالعدم ہوگیا تسبیح کے دانوں کا نظام
طاق میں شمع کے آنسو ہیں ابھی تک
اب مصلے ہے نہ منبر نہ مئوذن نہ امام

آچکے صاحب افلاک کے پیغام و سلام
کوہ ودر اب نہ سنیں گے وہ صدائے جبریل
اب کسی کعبہ کی شاید نہ پڑے بنیاد
کھوگئی دشت فراموشی میں آوازِ خلیل

تسبیح کے دانوں کے نظام کا کالعدم ہونا، ایک ایسا کشف ہے جو ماضی وحال کے درمیان ایک رخنے کے پیدا ہونے کی خبر دیتا ہے؛ جیسے ایک رواں خط اچانک ٹوٹ جائے، اور خالی جگہ منھ پھاڑے نظر آنے لگے۔ ماضی وحال کے بیچ رخنے کا ذکر نظم 'واپسی' میں بھی ملتا ہے۔ نظم کے متکلم کو ماضی خاموش اور گنگ محسوس ہوتا ہے۔ یہ مصرعے دیکھیے:

دروازوں پہ دے رہا ہوں آواز
خاموش ہے گنگ ہے سیہ پوش
ماضی کے محل کی کہنہ دیوار
پھیلائے ہوئے زمیں ہے آغوش

نظم 'مسجد' میں بھی ظاہر ہونے والی انسانی آواز ایک ایسے شخص کی آواز ہے، جس نے نہ صرف یہ رخنہ دیکھ لیا ہے ،اور ٹوٹی ہوئی لکیر سے پیدا ہونے والی خالی جگہ مشاہدہ کر لی ہے، بلکہ اسے اپنے اندر دور تک وار کرتے ہوئے بھی دیکھ لیا ہے۔اس کے نتیجے میں وہ اجنبی، مانوس پرانی دنیا سے 'باہر' اور 'بے خانماں' ہو گیا ہے، یعنی جلا وطن ہو گیا ہے؛ وہ مسجد اور اس کی دنیا سے بے دخل ہو گیا ہے۔ نظم کا مئوقف یہ ہے کہ یہ بے دخلی اور جلاوطنی وقت کی مسلط کردہ ہے۔ وقت بھی ایک استعارہ ہے۔ نظم میں ندی وقت کی علامت ہے، جو مسجد کو ہڑپ کرنے پر تلی ہے۔ (یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہاں وقت کی تباہ کن طاقت، در اصل اس جدید بشر مرکز انسانی علم کی طاقت ہے، جو عقائد کی بنیادوں پر وار کرتی ہے)۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ 'مسجد قرطبہ' میں بھی آبِ روان کبیر کا ذکر ہے، اور اختر کی نظم کی مسجد بھی دریا کنارے ہے، مگر اقبال قرطبہ کی مسجد کے ساتھ بہنے والے دریا کے کنارے ایک نئے زمانے کا خواب دیکھتے ہیں، جب کہ اختر کی نظم کا متکلم ندی یعنی وقت کے ایک تباہ کن قوت ہونے کی شہادت دیتا ہے۔ وقت مسجد کے گنبد و مینار کو بھی فنا کرنے چلا ہے۔ 'مسجد قرطبہ' کے آغاز میں بھی وقت کو نقش گر حادثات، اور اصل حیات و ممات کہا گیا ہے، مگر قرطبہ کی مسجد کو ایک عظیم فن پارے کی حیثیت میں وقت کی دست برد سے محفوظ دکھایا گیا ہے۔ جب کہ اختر کی نظم کی مسجد نہ تو تاریخی حیثیت رکھتی ہے، نہ آرٹ کا نمونہ دکھائی گئی ہے۔ لہٰذا اس کا مقدر معلوم!

تیز ندی کی ہر اک موج تلاطم بردوش
چیخ اٹھتی ہے وہیں دور سے ،فانی فانی
کل بہا لوں گی تجھے توڑ کے ساحل کی قیود
اور پھر گنبد و مینار بھی پانی پانی

جدیدیت کا ایک اہم تصور یہ تھا کہ وقت ابدی ہے، تباہ کن طاقت کا حامل ہے، اور اس کے مقابلے میں انسانی دنیا کی ہر شے فنا پذیر ہے۔ مسجد بھی انسانی تعمیر ہونے کے ناتے وقت کی دست برد سے محفوظ نہیں۔ بایں ہمہ مسجد و گنبد و مینار کو فانی قرار دینے کی جدید شاعر کی یہ جسارت، کلاسیکی شاعر کی اس جرأت سے کافی مختلف ہے، جس کا مظاہرہ وہ زاہد، و شیخ و ملا جیسے چند مذہبی کرداروں کو ملامت کا نشانہ بنانے کی صورت کرتا تھا۔ کلاسیکی شاعر، ظاہر پسندوں کے مذہب پر طنز کرتا تھا ،مگر جدید شاعر خود مذہب کے خاتمے کا بیانیہ منظوم کرتا ہے۔ اس بیانیے کا تعلق ایک طرف بیسویں صدی کے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے مذہب کو خیر باد کہنے سے ہے تو دوسری طرف خود جدید نظم سے ہے۔ جدید نظم، تخلیق کے خدائی سر چشمے کے سوکھ جانے کے یقین کے نتیجے میں لکھی جاتی ہے۔ جدید شاعر، آسمانی روایتوں کی دنیا سے بے دخل وجود ہے۔ وہ ایک نیا آدم ہے، جس کے ہاتھ میں مذہب و روایت سے جنت بدری کا حکمنامہ ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل سے اردو نظم میں عمارتیں قومی مذہبی علامت کے طور پر ظاہر ہونے لگی تھیں۔ شبلی کی مسجد کان پور اس کی غالباً پہلی مثال ہے۔ اس کے بعد اقبال کے یہاں مسجد قرطبہ، ساحر کے یہاں تاج محل اور مجید امجد کے یہاں مقبرہ جہانگیر قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں اختر کی نظم کا اس سلسلے کی دیگر نظموں سے تقابل مقصود نہیں بلکہ یہ ظاہر کرنا مطلوب ہے کہ وہ مسجد کو مذہبی علامت کے طور پر ہی پیش نہیں کرتے، بلکہ اسے 'آج، اس لمحے' کی حقیقت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اگر اختر الایمان بس یہیں تک محدود رہتے تو وہ صفِ دوم کے شاعر ہوتے۔ مسجد، مندر، گرجا سامنے کی مذہبی علامتیں ہیں۔ اگر کوئی انھیں صرف اسی مفہوم میں اپنی نظم میں پیش کرتا ہے تو وہ محض شاعر ہے، اور اگر کوئی انھیں اپنے زمانے کے علمی ،تہذیبی بیانیے سے جوڑ کر پیش کرتا ہے تو وہ جدید شاعر ہے۔ جو چیز اختر الایمان کو صفِ اوّل کا جدید شاعر بناتی ہے، وہ مسجد

کی وساطت سے حقیقت کا آرکی ٹکچرل تصور وضع کرنا ہے، مگر اس پر گفتگو آگے ہوگی۔

اخترالایمان سمیت تمام جدید شعرا کے لیے ماضی ایک بے حد پیچیدہ اور معمائی حقیقت ہوتا ہے۔ چوں کہ وہ ماضی وحال میں رخنہ دیکھتے ہیں، اس لیے وقت کی رو میں بے خبر ہیے چلے جانا ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ ان کی حالت اس مسافر کی سی ہوتی ہے جو قافلے سے بچھڑ گیا ہے۔ وہ اس رخنے کے کنارے یعنی حال کے لمحے پر ایستادہ ہو کر ماضی پر نگاہ کرتے ہیں، یا کارواں کے نقوش دیکھتے ہیں: ماضی کو کھنگالتے ہیں، اس سے اپنے ٹوٹے ہوئے جذباتی، تعقلی اور ثقافتی رشتے کو نئے سرے سے جوڑنے کی سعی کرتے رہتے ہیں، یعنی خود کو مسلسل شناخت کے بحران، یا بے دخلی کی حالت میں مبتلا محسوس کرتے ہیں، اور اس سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ شناخت کا بحران، یا جلاوطنی کا احساس آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی شخصی یادداشت (گھر) کے راستے سے اپنی اجتماعی، تاریخی، ثقافتی یادداشت (وطن، قوم) تک پہنچے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ایک طرف یادداشت اور آرزو میں رشتہ قائم ہوتا ہے، اور دوسری طرف شخصی ماضی وثقافتی ماضی کی سرحدیں پگھلنے لگتی ہیں۔ شناخت کے بحران سے نکلنے کی آرزو ہی یادداشت کی طرف، جو بہ ہر حال ماضی کی دنیا میں وجود رکھتی ہے، لے جاتی ہے۔

اخترالایمان اور ان تمام جدید شعرا کے یہاں شخصی یادداشت اور ثقافتی یادداشت سے تعلق قائم کرنے کی کوشش ملتی ہے، جو شناخت کے بحران کو محسوس کرتے ہیں۔ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یادداشت گزرے واقعات کی ہو بہو نقل ہے۔ اس سے زیادہ گمراہ کن بات کوئی اور نہیں ہوسکتی۔ یادداشت، گزرے واقعات کو مسلسل نئے سرے سے ترتیب دیتی رہتی ہے۔ چناں چہ ہم گزرے واقعات کو یاد کرتے ہوئے، انھیں ٹھیک اسی طرح نہیں دہراتے، جس طرح واقع ہوئے تھے، بلکہ انھیں لمحہ، حاضر کی مخصوص جذباتی حالت کے زیر اثر ایک نئی ترتیب میں پیش کرتے ہیں۔ بڑی حد تک یہ عمل ماضی کی ایک نئی تعمیر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس میں اچنبھا نہیں ہونا چاہیے کہ جدید شاعر کا ماضی کے سلسلے میں ایک طرف تنقیدی رویہ ہوتا ہے، تو دوسری طرف وہ اپنی پرانی شناخت کا احیا نہیں کرتا، ایک نئی شناخت کی تلاش میں ہوتا ہے۔

اخترالایمان بار بار شخصی اور اجتماعی یادداشت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ شخصی یادداشت کی طرف رجوع کے سبب ان کی نظم میں ناسٹلجیا، باقاعدہ ایک رجحان کے طور پر ظاہر ہوا ہے۔ اس سلسلے کی نظموں میں 'یادیں'، 'ایک لڑکا'، 'دلی کی گلیاں' اور 'ڈاسنہ سٹیشن کا مسافر' قابل ذکر ہیں۔ بعض لوگ شخصی یادداشتوں کے تحت لکھی گئی نظموں کو معمولی سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر سے ایک یہ بات اوجھل رہتی ہے کہ یادداشت، شخصی ہو یا اجتماعی، وہ ماضی کو نئے سرے سے تعمیر کرتی ہے، دوسری یہ بات کہ نظم بننے کے بعد کوئی یادداشت شخصی نہیں رہ جاتی؛ وہ 'اصل' کی طرف پلٹنے کا استعاراتی عمل ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے، کوئی شاعر 'اصل' تک رسائی حاصل نہ کرسکے، اور اس عمل کو استعاراتی نہ بنا سکے، مگر یہ ناکامی شاعر کی ہے، شخصی یادداشت کی نہیں۔ اصل تک رسائی کو استعاراتی بنانے کا مفہوم یہ ہے کہ ایک ایسی دنیا کی تخیلی تعمیر کی جائے، جس میں گھر اور وطن جیسی Stability کی کیفیت ہو، اور جس میں بچپن کی حیرت، آرٹ کی حیرت میں بدل جائے۔ اختر کی نظم 'ڈاسنہ سٹیشن کا مسافر' اس کی مثال ہے۔ نظم جوانی کے سفر کی یادداشت پر مبنی ہے۔ سرسری پڑھیں تو نظم ڈاسنہ سٹیشن کے تعلق سے قیصر (محبوبہ) کی یادوں کو تحریک دیتی محسوس ہوتی ہے، جن سے بٹوارے کی یاد بھی ابھرتی ہے، لیکن غور کریں تو ریل گاڑی، ڈاسنہ، سفر، قیصر، بٹوارہ اور مسافر سب استعاراتی مفہوم اختیار کرلیتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر خود نظم گھر یعنی اصل کا استعارہ بنتی محسوس ہوتی ہے۔ ریل گاڑی وقت کا، ڈاسنہ زندگی کے ایک پڑاؤ کا، قیصر جنت کا، بٹوار، جنت سے نکلنے کا، اور مسافر آدم کا استعارہ ہے۔ اس رائے کی روشنی میں ذرا ان مصرعوں کو پڑھیے:

ڈاسنہ تو تھا ہی وہ/میرے ساتھ قیصر تھی
میں نے چونک کر پوچھا/آسماں محل تھا اک/سیدوں کی بستی میں/"آسمان ہی نہیں صاحب/اب محل کہاں ہوگا؟"
ملک کا یہ بٹوارا/کہاں لے گیا اس کو/ردیوڑھی کا سناٹا/اور ہماری سرگوشی/"مجھ سے کتنے چھوٹے ہو"
بھورے بادلوں کا دل/دوڑتا جاتا ہے/پیڑ پر کہیں بیٹھا/اک پرندگاتا ہے/"چل چل" اک گلہری کی/کان میں کھٹکتی ہے/ریل چلنے لگتی ہے/راہ کے درختوں کی/چھاؤں ڈھلنے لگتی ہے/"مجھے سے کتنے چھوٹے ہو"/اور میری گراں گوشی/ردیوڑھی کا سناٹا/اور ہماری سرگوشی/رہے رقم کہاں وہ سب؟

شخصی یادداشت واقعات کی صورت ہوتی ہے تو اجتماعی یادداشت، علامتوں اور نشانات میں مضمر ہوتی ہے، اور اس میں مذہبی و دنیوی یا سیکولر دونوں طرح کی علامتیں شامل ہیں۔ مسجد مسلم ثقافت کی مذہبی علامت ہے، اور پرانی فصلیں اور آثار قدیمہ اجتماعی یادداشت کا سیکولر عنصر ہیں۔ وقت مذہبی علامتوں کا لحاظ کرتا ہے، نہ سیکولر علامتوں کا۔ تباہ ہونا، یادداشت کا حصہ بننا سب کا مقدر ہے۔ شاعر اجتماعی ثقافتی یادداشت کے سیکولر عناصر کو یاد کرتا ہے۔ نظم 'مسجد' کی طرح ان سیکولر علامتوں کے سلسلے میں بھی شاعر کا رویہ تنقیدی ہے۔ یہ ایک دل چسپ حقیقت ہے کہ شخصی یادداشتوں کی طرف شاعر کا رویہ شاید ہی تنقیدی ہوتا ہو! اسی بنا پر جسے ہم ناسٹلجیا کہتے ہیں، وہ شخصی یادداشتوں کو جنسی لذت جیسی کیفیت کے ساتھ دہرانے کا نام ہے۔ بہ ہر کیف، اختر الایمان کا شعری تخیل مذہبی و دنیوی دونوں علامتوں سے 'اجنبی و باہر' محسوس کرتا ہے۔ دونوں طرح کی ثقافتی علامتیں معانی کی جس دنیا کی نمائندگی کرتی ہیں، شاعر اس سے اندھی مطابقت اختیار نہیں کر سکتا۔ وہ کہیں ان معانی کی مرگ کا اعلان کرتا ہے، اور کہیں انھیں از سر نو خلق کرتا ہے۔ نظم 'کرمِ کتابی' کے یہ مصرعے دیکھیے، جن میں قدیم ثقافتی علامتوں سے شاعر 'فاصلہ' محسوس کرتا ہے:

اوسائرس ، نہ زیس ، آج کوئی زندہ نہیں
وہ روزنامچہ مردوں کا ، وہ عمل نامہ
جسے خداؤں نے لکھا تھا کھوگیا ہے کہیں
منو سمرتی ، نہ توریت ، سب وہ ہنگامہ
بگولہ بن کے اٹھا تھا جو سوگیا ہے کہیں
میں ڈھونڈتا ہوں کہیں ٹکسلا نہ پاٹلی پتر
موہن جو دارو، کہیں قرطبہ ، نہ غرناطہ
نہ نینوا ہے ، نہ بابل ، نہ آج اندر پرستھ
یہ سب ہیں میرے لیے گویا خواب کی باتیں

گویا یہ علامتیں اور متون اجتماعی یادداشت میں موجود ہیں، مگر 'اجنبی' کی صورت؛ ان کے معانی خواب و خیال ہیں، وہ 'آج، اس لمحے' کی حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتے۔ دوسرے لفظوں میں جدید عہد کا آدمی اس پرانی دنیا سے 'جلا وطن' ہو چکا ہے؛ جلاوطن آدمی کی طرح وہ اس قدیم دنیا کو یاد کر سکتا ہے، مگر اس کی طرف پلٹ نہیں سکتا۔ کتابی کیڑے یعنی قدیم متون پر تحقیق کرنے والے لوگ قدیم دنیا کا مثالی تصور قائم کرتے ہیں، اور اس کے سلسلے میں آرزومندانہ جذبات رکھتے ہیں۔ نظم 'کرمِ کتابی' میں چوں کہ شاعر کتابی کیڑے کو سمجھانے کی مشقت کر رہا ہے کہ اصل حقیقت زندہ لوگ

ہیں، ماضی بعید کے کردار، متون اور آثار نہیں، اس بنا پر نظم مناظرانہ اور خطابیہ رنگ اختیار کر گئی ہے۔ جدید شاعر آرکائیو کی تنقید اور اس کی آرزو بہ یک وقت کرتا ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اختر الایمان کی بعض نظموں میں ماضی کی تنقید پر ترقی پسندانہ تناظر اس قدر حاوی ہو گیا ہے کہ نظمیں خطابیہ ہو گئی ہیں۔ تاہم نظم 'آثارِ قدیمہ' استثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں انھوں نے ایک طرف ثقافتی ورثے اور نئے زمانے میں اسی فاصلے، اجنبیت اور بیگانگیت کو موضوع بنایا ہے، جن کا تجربہ آدمی جلاوطنی کی حالت میں کرتا ہے، اور دوسری طرف نئے زمانے سے بھی خود کو اجنبی اور جلاوطن محسوس کیا ہے۔ اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ترقی پسندانہ تناظر اور جدید حسیت یک جا ہیں۔ شاعر آثار قدیمہ پر تنقید کرتا ہے، اور معاصر دنیا پر طنز کرتا ہے۔ نظم کا ابتدائی حصہ دیکھیے:

برتن، سکّے، مہریں
بے نام خداؤں کے بت ٹوٹے پھوٹے
مٹی کے ڈھیروں میں پوشیدہ چکّی چولھے
کند اوزار زمینیں جن سے کھودی جاتی ہوں گی
کچھ ہتھیار جنھیں استعمال کیا کرتے ہوں گے مہلک حیوانوں پر
کیا بس اتنا ہی ورثہ ہے میرا
انسان یہاں سے جب آگے بڑھتا ہے کیا مر جاتا ہے؟

یوں نظم ثقافتی و تاریخی ورثے کے حوالے سے یہ سوال اٹھاتی ہے کہ ان کی 'انسانی معنویت' کیا ہے؟ حیوانوں کو ہلاک کرنے والے ہتھیار ہوں، یا کند اوزار ہوں، یا ٹوٹے پھوٹے بت، یہ سب 'آج' کے انسان کے لیے کیا معنی رکھتے ہیں؟ اس سوال کی تہ میں ایک طرف ماضی و حال میں وجود میں آنے والا وہی رخنہ موجود ہے، جس کا تجربہ جدید انسان قدم قدم پر کرتا ہے، اور جس کا ذکر ہم گزشتہ صفحات میں کر آئے ہیں، اور دوسری طرف معروف ترقی پسندانہ تناظر ہے۔ ترقی پسند تناظر بتوں اور ہتھیاروں کو قدیم عہد کے مقتدر طبقوں کی یادگار سمجھتا ہے۔ چوں کہ نظم میں ترقی پسند اور جدید تناظر یک جا ہوئے ہیں، اس لیے نظم کا متکلم یہ سوال قائم کرنے میں کامیاب ہوا ہے کہ 'کیا بس اتنا ہی ورثہ ہے میرا'۔ اس سوال کی تہ میں کچھ اور سوال بھی مضمر ہیں جو نظم کو اہم بناتے ہیں: کیا مجھ تک یہی ورثہ پہنچا ہے، یا ورثے میں اور بھی بہت کچھ تھا، مگر مجھ تک بس یہی پہنچایا گیا ہے؟ کیا یہ بت، ہتھیار، اوزار ورثہ کہے جانے کے لائق ہیں؟ کیا میں اس دنیا کو اپنا ورثہ کہہ سکتا ہوں، جس سے میں بے دخل ہو چکا ہوں، یا جس کی کوئی معنویت میرے لیے نہیں؟ ان سوالوں کی اہمیت یہ ہے کہ یہ ماضی کو مسلسل الٹتے پلٹتے رہتے ہیں، اور اس کے کسی ایک تصور کی اجارہ داری کی راہ مسدود کرتے ہیں۔

ترقی پسند تناظر نظم کے اگلے حصے میں بھی نظر آتا ہے، جس میں معاصر دنیا کے جنگی تاجروں کا ذکر ہے۔ نظم کے درمیان میں دو ہمسائیوں کی دشمنی پر زبردست چوٹ ہے:

برق صفت طیاروں کی ایجاد بھی کام نہیں آئی کچھ
دلی سے لاہور کے بازاروں کا فاصلہ پہلے سے کچھ اور بڑھا ہے

یہ فاصلہ اس لیے بڑھا ہے کہ جابر بادشاہوں کے تابوت خاک ہوگئے، مگر ان کی روحیں دوسرے جسموں میں آ گئی ہیں۔صاف لفظوں میں نوآبادیاتی عہد ختم ہوا، مگر نیا نوآبادیاتی عہد شروع ہوگیا؛ نوآبادیاتی عہد میں ہندو مسلم، ہندی اردو کی تفریق تھی، جو نئے نوآبادیاتی عہد میں مسلمان ملک اور ہندو ملک کی دشمنی میں بدل گئی۔ نیز اسلحہ ساز کارخانے جب تک موجود ہیں، دلی اور لاہور میں فاصلہ، اجنبیت اور دشمنی بڑھے گی، گھٹے گی نہیں۔نظم کے آخر میں متکلم نے خالص جدید شاعر کی حسیت کا مظاہرہ کیا ہے، اور اس معاصر صنعتی دنیا پر زوردار طنز کیا ہے، جو انسان کو محض ایک صارفی شے میں بدل دیتی ہے، یعنی اس سے بنیادی انسانی صفت چھین لیتے ہیں:

خوش قامت، بانکے، چھیلا، سب ایک مجسم شہوت بنتے جاتے ہیں
اور حسینوں کے اندام بھی فضلے کے ڈبوں کی صورت کھلے ہوئے ہیں

نظم کی ان لائنوں کو طنزیہ گروٹیسک کے سوا کیا نام دیا جا سکتا ہے!نظم کی آخری لائنوں میں اس دنیا ہی سے نہیں، انسانی دنیا بھی سے شاعر کی جلاوطنی کا واضح اظہار کیا گیا ہے:

ہم کو زندہ رہنا ہے، جب تک موت نہیں آتی اک زہر پیے جانا ہے
آؤ کتوں کا دربار سجائیں، کوّوں کی بارات نکالیں

یہ دونوں مصرعے جلاوطنی کے بدترین کرب کا طنزیہ اظہار ہیں۔جس دنیا میں شہوت اور فضلہ ہو، اس سے نکل کر حیوانی دنیا میں پہنچنا ہی بہتر ہے۔شاعر نے کتوں اور کووں کا ذکر کر کے انسانی دنیا پر معکوس طنز کیا ہے۔

ماضی و حال دونوں دنیاؤں سے آدمی کی جلاوطنی کا موضوع جس طرح اخترالایمان کے یہاں ظاہر ہوا ہے، شاید ہی کسی دوسرے جدید شاعر کے یہاں ظاہر ہوا ہو۔رفتہ رفتہ جلاوطنی ایک لاشعوری احساس اور ان کے شعری تخیل کا مستقل حصہ بنی ہے۔انھوں نے ۱۹۷۷ء میں شایع ہونے والے اپنے مجموعے نیا آہنگ (جسے ان کا سب سے اچھا مجموعہ کہا جا سکتا ہے) میں ایک نظم 'جلاوطن' کے عنوان سے شامل کی ہے۔اس نظم میں جلاوطنی کا وہ تجربہ سمٹ کر آ گیا ہے جو کہیں لخت لخت حالت میں اور کہیں بالواسطہ ظاہر ہو رہا تھا۔پہلے نظم دیکھیے:

یہ ہم اپنے کاندھوں پہ خود اپنی لاشیں اٹھائے کہاں جارہے ہیں
کوئی شہرِ نو، کوئی موعودہ جنت بنائی گئی ہے کہیں پر کہ ہم کو
نکالا ملا ہے، یونہی صرف معمول ہیں، ہم پہ تاریخ نشتر چلاتی ہے اپنا
نہاں خانہ دوش وامروز میں قید کر کے، گلا گھونٹ کر مار دے گی
نہ فریاد جس کی، نہ داد وستائش، کوئی محتسب ہے، نہ منصف ہے کوئی
مکافات، کفارہ، سودوزیاں، بانجھ الفاظ ہیں سب سراسر
ہر اک بیتا لمحہ ہماری نئی قبر ہے جس میں ہم سو گئے اپنا ماضی گلے سے لگائے
مجاور ہیں ہم، اپنے ہی نوحہ خواں ہیں، خود اپنی قبروں پہ بیٹھے ہیں مشعل جلائے
گدائی کا کاسہ لیے ہاتھ میں اپنے ہی اشک چنتے ہیں اور اس میں بھرتے ہیں ایسے
کہ جیسے یہی اپنا مقسوم تھا، زندگی کا یہی کہنہ دستور ہے اور رہے گا!

آپ نے ملاحظہ کیا، شاعر نے جلاوطنی کو تاریخ اور وقت کا لکھا ہوا حکم نامہ خیال کیا ہے؛ اس کی فریاد کہیں نہیں کی

جا سکتی۔ چوں کہ ان کی جلاوطنی استعاراتی ہے، اس لیے کوئی جنتِ موعود نہیں۔ حقیقی جلاوطنی میں چھوڑا ہوا وطن، جنت نشان بن کر تخیل میں ظاہر ہوتا رہتا ہے، اور جلاوطنی کے ختم ہونے کی نوید دیتا رہتا ہے۔ نیز حقیقی جلاوطنی میں ایک ایسا 'غیر' باہر حقیقت میں موجود ہوتا ہے، جس کے خلاف آدمی غصہ و رنج ظاہر کر سکتا ہے، لیکن استعاراتی طور پر جلاوطن ایک ایسا شخص ہے، جس کا 'غیر' تخیلی ہے، اس کے اندر کہیں مضمر ہے، جو اسے ایک زندہ لاش میں بدل دیتا ہے؛ آدمی خود ہی اپنا نوحہ خواں ہوتا ہے۔ یہ اپنے اندر جنگ کی حالت ہے، جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ جدید انسان کی جلاوطنی کی یہ کربناک کیفیت اختر کی نظم کو انفرادیت بخشتی ہے۔

جدید شاعر ثابت و سالم حقیقت کا تصور نہیں رکھتا۔ اس کا سامنا جس حقیقت سے ہے، وہ شکستہ، ویران، کٹی پھٹی، جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی ہے۔ اس ضمن میں جدید شاعروں کے دو گروہ بنے ہیں۔ ایک وہ جو اپنی نظموں میں بھی اسی شکستگی کو پیش کرتے ہیں، جسے وہ حقیقت میں دیکھتے ہیں، اور دوسرے وہ جو نظم کو شکستہ و پارہ پارہ حقیقت کو جوڑنے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ وہ اس خسارے کی تلافی نظم میں کرتے ہیں جسے وہ حقیقت میں دیکھتے ہیں۔ (تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ رویہ اپنی اصل میں کلاسیکی ہے، کیوں کہ خسارے کے ساتھ جینا لمحہ، حال میں جینا ہے، جب کہ خسارے کی تلافی کرنا، خسارے سے قبل کی اسی مستحکم حالت کی طرف لوٹنا ہے، جو کلاسیکیت کی پہچان ہے)۔ وہ اپنی متخیلہ کو حقیقت کے جبر کا شکار ہونے سے بچانے کے لیے اپنی تخیلی تعمیری قوت کو بروئے کار لاتے ہیں۔ حقیقت کے متوازی، ایک نئی، تخیلی حقیقت خلق کرتے ہیں۔ اختر الایمان کا تعلق اسی دوسرے گروہ سے ہے۔ لہٰذا شمس الرحمٰن فاروقی کی یہ رائے درست معلوم نہیں ہوتی کہ اختر الایمان کی نظم رائے لکسٹنسٹائن کی مصوری کی طرح ہے۔ دونوں اپنے فن کو جدید حقیقت، جو کھردری ہے، سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۸۔ خود اختر الایمان نظم کو ایک عمارت کی طرح سمجھتے تھے، یعنی اسے حقیقت کی نقل کی بجائے حقیقت کی تعمیر تصور کرتے تھے۔ جدید نظم پر ایک مباحثے میں انھوں نے رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا:

> نظم کی بنیادی صفت اس کا تعمیری پہلو ہے۔ ہر نظم اپنی جگہ پر ایک عمارت ہوتی ہے۔ جس طرح کسی عمارت میں ایک اینٹ اپنی جگہ پر کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اسی طرح نظم کا ایک مصرع یا ایک شعر اپنی جگہ پر علاحدہ سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا ۹۔

نظم کو عمارت سمجھنا، صرف تیکنیک کا معاملہ نہیں، بلکہ تیکنیک اور تصورِ حقیقت کا بہ یک وقت معاملہ ہے۔ اختر الایمان کے یہاں عمارت ایک ایسی علامت ہے، جس کی خصوصیات قطبینی بھی ہیں، اور ایک دوسرے کا تکملہ کرنے والی بھی۔ کہیں تو وہ ماضی کا تصور ایک عمارت کے طور پر کرتے ہیں، جس کی مثال نظم 'مسجد' کے علاوہ 'پرانی فصیل'، 'آمادگی' اور 'واپسی' جیسی نظمیں ہیں، اور کہیں وہ نظم ہی کو 'عمارت' سمجھتے ہیں۔ دونوں جگہ عمارت کا مفہوم الگ الگ لیتے ہیں۔ جب وہ ماضی کو عمارت تصور کرتے ہیں تو اس کی کہنگی اور وقت کے آگے اس کی بے ثباتی و بے محلیت پر زور دیتے ہیں، اور جب نظم کو عمارت قرار دیتے ہیں تو اس کی تعمیری خصوصیت کو پیش کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں پہلے مفہوم میں عمارت حقیقت کی شکستگی کی علامت ہے، اور دوسرے مفہوم میں عمارت حقیقت کے متوازی ایک نئی حقیقت کی تعمیر کی علامت ہے؛ وہ نظم کی صورت ایک نئی عمارت تعمیر کر کے، اس حقیقت کا متبادل پیش کرتے ہیں، جو شکستہ ہے، اور ڈھے جانے والی ہے۔

چوں کہ وہ نظم کو عمارت تصور کرتے ہیں، اس لیے وہ نظم میں ان رخنوں کو پیدا نہیں ہونے دیتے، جسے انھوں نے حقیقت میں مشاہدہ کیا ہے۔ ان کی نظم میں نہ صرف ہر لائن اگلی لائن سے اینٹ کی طرح جڑی ہے، بلکہ رن آن لائن کا

اہتمام بھی جگہ جگہ کرتے ہیں۔ انھوں نے اگر زیادہ تر پابند نظمیں لکھی ہیں تو اس کا سبب بھی یہی ہے کہ وہ ان رخنوں، شکستگیوں، فاصلوں کو نظم میں پیدا نہیں ہونے دیتے، جسے وہ حقیقت میں دیکھتے ہیں (اپنی اصل میں یہ کلاسیکی شعریات کی خصوصیت ہے)۔ آزاد نظم کی ہیئت میں جا بجا خالی جگہیں بے وجہ نہیں پیدا ہوتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آزاد نظم کو عمارت کی طرح تعمیر کرنا بے حد مشکل ہے۔ یہ مشکل کام اختر الایمان نے ایک نظم میں کیا ہے، یعنی 'کالے سفید پروں والا پرندہ اور میری ایک شام' میں۔ اس نظم میں انھوں نے چھوٹی بڑی کہانیوں کو لکھا ہے، اور ایک کثیر منزلہ عمارت تعمیر کی ہے۔ پابند نظموں کو وہ ایک منزلہ عمارت کی مانند تعمیر کرتے ہیں، یعنی اس میں ایک مرکزی موضوع ہے، جو نسبتاً تفصیل اور تسلسل سے ظاہر ہوتا چلا جاتا ہے۔ یوں بھی نظم کے مصرعوں کو اینٹ کی طرح تصور کرنے سے نظم میں وہی تفصیل اور تسلسل پیدا ہوتا ہے، جو بیانیہ کی صفات ہیں۔ ان کی اکثر نظمیں طویل، اور بیانیہ ہیں تو اس کی بڑی وجہ نظم کو عمارت کی طرح تعمیر کرنا ہے۔ واضح رہے کہ عمارت کا عمومی تصور ان کے پیش نظر رہتا ہے۔

نظم کو عمارت سمجھنا، اسے گھر تصور کرنا بھی ہے۔ ماضی، تاریخ، ثقافت سے جلاوطن شاعر خود نظم کو 'گھر اور وطن' بناتا ہے۔ نظم کو گھر بنانے کا ایک مطلب ہے، بے دخلی و مہاجرت و جلاوطنی کی کہانی نظم میں لکھنا، اور اس طرح شکستہ حقیقت کی متبادل حقیقت خلق کرنا، اور دوسرا مطلب ہے، نظم میں حسی تمثالوں کو زیادہ سے زیادہ اور گہری انسیت کے ساتھ پیش کرنا۔ گھر: چیزوں اور زمین سے گہری انسیت کے سوا کیا ہے؟ اختر الایمان نے نظموں میں نہ تو نامانوس زبان برتی ہے، نہ اجنبی علامتیں استعمال کی ہیں، اور نہ تمثالوں، مصرعوں، بندوں میں وقفے اور خلا رکھے ہیں۔ ان کی نظموں میں غیر معروف تاریخی و اساطیری عناصر کی طرف اشارے بھی کم سے کم ہیں۔ 'آج، اس لمحے' میں جو درپیش ہے، اسے زیادہ سے زیادہ روزمرہ کی زبان میں ظاہر کیا ہے۔ ابتدا میں ان کی نظموں پر کتابی زبان، یعنی فارسی کی تراکیب، غزل کی مانوس لفظیات کا غلبہ تھا، مگر رفتہ رفتہ وہ نظم کو بول چال کی 'زندہ' زبان میں نظم لکھنے لگے؛ اس سے ان کی نظم، نثر کے قریب محسوس ہوتی ہے، مگر اس میں نثریت کہیں نہیں۔ نامانوس زبان اگرچہ نئے خیال، نئے احساس کی ترسیل کی ضرورت ہے، مگر اسے ایک شاعرانہ چال کے طور پر آسانی سے استعمال کیا جاسکتا ہے؛ خالی نامانوسیت، اس حیرت کا شائبہ پیدا کرتی ہے جو آرٹ سے مخصوص ہے۔ چناں چہ بعض نام نہاد جدید شاعر نامانوس زبان کو شاعرانہ چال کے طور پر استعمال کرتے ہیں؛ ان کی زبان کا گہرا رابط ان کے پیچیدہ لاشعوری احساسات سے نہیں ہوتا۔ دوسری طرف روزمرہ، بول چال کی زبان میں اچھی شاعری تخلیق کرنا بے حد مشکل ہے۔ بول چال کی زبان زیادہ سے زیادہ شفاف بننے کی کوشش کرتی ہے، اور کسی بات کی ترسیل کرنے کے بعد صَرف ہو جانے کا میلان رکھتی ہے۔ یہ خصوصیت، شاعری اور شعری زبان کی خصوصیت کے برعکس ہے؛ شاعری زبان کی صارفی قدر کے خلاف باقاعدہ احتجاج کا درجہ رکھتی ہے، اور شعری زبان شفاف نہیں ہوتی۔ لہٰذا بول چال کی زبان میں شاعری، دشمن کو رام کرنے کے مترادف ہے، یا ایک جلاوطن کے اس جگہ کو گھر بنانے کے مساوی ہے، جو 'غیر' کی جگہ ہے۔ اختر الایمان نے اپنی مختصر نظموں میں عام طور پر دشمن کا رام کرنے کا یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ صرف ایک نظم 'خلا' دیکھیے:

خلا کیوں پر نہیں ہوتا
پرندوں کے ہزاروں رنگ
آموں سے بھری ڈالی
لسوڑوں کے ہر خوشے

لٹکتی جامنیں کالی
میں بھولا تو نہیں پھر کیوں
مسلسل کرب رہتا ہے
خلا کیوں پر نہیں ہوتا

آٹھ مصرعوں کی یہ نظم عام بول چال کی زبان میں، کم سے کم الفاظ میں لکھی گئی ہے۔ پرندوں، آموں، لسوڑوں کی تمثالیں بھی مانوس ہیں۔ اس غیر شاعرانہ مواد و اسلوب کے باوجود، مگرانھی کی مدد سے شاعر نے ایک اہم نظم لکھی ہے۔ نظم کی جان یہ مصرع ہے: 'خلا کیوں پر نہیں ہوتا'، اس استفہامیہ مصرعے میں وہ کرب سمٹ آیا ہے، جس کا سامنا 'وطن میں جلاوطن شخص' کو ہوتا ہے۔ شاعر نے دوسرے تا پانچویں مصرعے میں وہ سب چیزیں گنوائی ہیں، جو 'خلا' کو بھرنے والی ہیں۔ پرندوں کے ہزاروں رنگ، خالی، بے رنگ دنیا کو آباد کرتے ہیں۔ آموں سے ڈالی بھری ہوئی ہے۔ لسوڑے سے خوشے ہرے ہیں۔ کالی جامنیں لٹک رہی ہیں، یعنی لذتِ کام و دہن کا سامان موجود ہے۔ اور سب سے بڑھ کر متکلم کا حافظہ ان سب نعمتوں کی یاد سے خالی نہیں۔ 'باہر' کے جمال کی یاد 'اندر' موجود ہے۔ اس کے باوجود (اندر کا) خلا نہیں بھرتا۔ کیوں؟ یعنی آدمی وطن میں رہتے ہوئے آخر کیوں جلاوطنی کا دکھ سہتا ہے، یا گھر میں بے گھری کا عذاب کس لیے جھیلتا ہے؟ ہماری رائے میں اس سوال کا جواب جس دن مل جائے گا، آدمی شاید پر سکون ہو جائے، مگر شاعری سے اس کی روح رخصت ہو جائے گی؛ آدمی شاعری کو اپنا گھر بنانا ترک کر دے گا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

حوالہ جات

۱۔ اختر الایمان، کلیات، آج، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۲۲
۲۔ محمد حسن، ''اختر الایمان'' مشمولہ معیار، اختر الایمان نمبر، (ترتیب شاہد ماہلی)، دہلی، ۲۰۰۰ء، ص ۱۳۰
۳۔ ایڈورڈ سعید، Representations of the Intellectuals، ونٹاژ بکس، نیویارک، ۱۹۹۴ء، ص ۵۲
۴۔ اختر الایمان، اس آباد خرابے میں، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۳۹
۵۔ ناظم حکمت، محبت، جلاوطنی اور حراست کی نظمیں (ترجمہ و تعارف فاروق حسن)، قوسین، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۲۹۔۳۰
۶۔ محمد حسن، ''اختر الایمان'' مشمولہ معیار، اختر الایمان نمبر، محولا بالا، ص ۱۳۰
۷۔ اختر الایمان، کلیات، محولا بالا، ص ۲۲
۸۔ شمس الرحمان فاروقی، ''اختر الایمان... ایک مختصر محاکمہ''، مشمولہ معیار، محولا بالا، ص ۱۵۸
۹۔ اختر الایمان، ''جدید نظم: ہیئت و تشکیل، ایک مباحثہ، مشمولہ سہ ماہی ذہن جدید، جدید نظم نمبر ۲، دہلی، مارچ مئی ۱۹۹۶ء، ص ۵۸

[نوٹ: اس مضمون میں اختر الایمان کی نظموں کے تمام اقتباسات ان کے کلیات، مطبوعہ آج، کراچی سے لیے گئے ہیں۔]

قرۃ العین حیدر کا اِک افسانہ ''تار پر چلنے والی''

ڈاکٹر رئیس فاطمہ

اردو کے ادیبوں میں قرۃ العین حیدر کا وجود وہ دمکتا ستارہ ہے۔ جس نے کسی اور ستارے کی روشنی مستعار لئے بغیر قلم بالکل منفرد رکھا۔ بھلا کون ہے، جوان کی عظمت سے انکار کرلے......؟ یہ اور بات ہے کہ جب وہ اپنی والدہ کے ساتھ پاکستان آئیں، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہنے کے لئے، تو کچھ ''نیبو نچوڑ'' ٹائپ کے سرکاری افسران اور موقع پرست ادیبوں نے ان کے خلاف حکومت کے کان بھرنا شروع کردیئے۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ موقع شناس اس مملکت خداداد سے مخلص تھے، بلکہ اصل حقیقت یہ تھی کہ انہیں قرۃ العین حیدر کے فن کے سامنے اپنے قد بہت چھوٹا نظر آنے لگا تھا۔

بہرحال بات ہو رہی تھی قرۃ العین حیدر کے فن کی......تو مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی تھی کہ کیا انڈیا، کیا پاکستان......دونوں ملکوں کے ادیبوں اور نقادوں نے ان کے ناولوں کو زیادہ اہمیت دی......اور تان صرف ''آگ کے دریا'' پرآ کرٹوٹتی تھی......جن دنوں میں انجمن ترقی اردو، پاکستان کے زیر اہتمام قرۃ العین حیدر کے افسانوں پہ کام کر رہی تھی......تو مختلف تحریریں پڑھتے ہوئے بار بار یہ احساس ہوا کہ بیشتر لکھنے والوں نے محض مکھی پہ مکھی ماری ہے، جو ایک نے لکھ دیا، اسی کی نقل الفاظ کے ردوبدل کے ساتھ دوسروں نے بھی اپنالی......صرف اور صرف تقلید، یا یوں کہیے کے کاربن کاپی......اسی لئے سب سے زیادہ تعریفی اور تنقیدی مضامین کا انبار ''آگ کا دریا'' ہی ہے۔ ''گردش رنگ چمن''...... ''آخر شب کے ہم سفر''''اگلے برس مو ہے بیٹھانہ کیجو''، ''دلربا'' اور ''چائے کے باغ''...... پر نقادوں اور تجزیہ کاروں نے کچھ زیادہ خامہ فرسائی نہ فرمائی......وجہ یہ تھی کہ ان ناولٹ پہ لکھنے کے لئے پہلے ان کتابوں کو پڑھنا پڑتا......اور پڑھنے کا عمل احتشام حسین، وقار عظیم، ڈاکٹر عبارت بریلوی، علی سردار جعفری، ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور دیگر جینوئین نقادوں تک آ کر رک گیا۔ اب جو کچھ بھی ہے وہ انہی جیسے صف اول کے تنقید نگاروں کی تحریروں کا چربہ ہے۔

رہا سوال یہ کہ افسانوں کے مقابلے میں قرۃ العین حیدر کے ناولوں پر زیادہ کیوں لکھا گیا......؟ تو اس کا بھی سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ 'جہاں تک ان کے افسانوں کا تعلق ہے' وہ بہت مختلف، منفرد اور اچھوتے موضوع اور اسلوب کے حامل ہیں، جو ہر کسی کی سمجھ میں آسانی سے نہیں آسکتے...... بالکل اسی طرح جیسے غالب کے اشعار کی معنویت کئی تہوں میں چھپی ہوئی ہے۔ ان کو سمجھنے کے لئے قاری کی ذہنی سطح یعنی I.Q کا بلند ہونا بھی ضروری ہے۔ یہی بات قرۃ العین حیدر کے بیشتر بڑے افسانوں پر بھی صادق آتی ہے......انہیں سمجھنے کے لئے ان کو ''ڈی کوڈ'' کرنا ضروری ہے...... ''فقیروں کی پہاڑی''...... ''کہرے کے پیچھے''...... ''روشنی کی رفتار''...... ''لکڑ بگھے کی ہنسی''...... ''یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے''...... اور ''تار پر چلنے والی''......ایسے ہی افسانے ہیں......جو بہت مختلف ہیں۔ خاص کر ''یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے''...... جس زمانے میں لکھا گیا، اس وقت خودکش بمباروں کا تصور تک نہیں تھا......لیکن ہجرت کا کرب اور بے خانماں بربادی کا المیہ انہوں نے بھی محسوس کیا تھا۔ وہ اس تجربے سے گزرنے والوں کا حال نہ صرف جانتی تھیں بلکہ ان پر خود بھی یہ قیامت گزری تھی، برسوں کے لئے بسے بسائے گھروں کو چھوڑنے والوں کے دل پہ کیا گزرتی ہے، جب وہ مہاجر کہلاتے ہیں۔

اس افسانے کے دو کردار تمارا اور دکتوریہ شریفاں نصرت الدین امام قلی۔ اس افسانے میں الجزائر اور فلسطین کے باشندوں کی جدوجہد آزادی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کیونکہ تمارا اور نصرت دونوں بڑی عالمی طاقتوں کا دکھ جھیلے ہوئے ہیں اور دونوں جلاوطن ہیں۔ یہ افسانہ 1980ء سے پہلے لکھا گیا تھا۔ آپ قرۃ العین حیدر کی دور بینی اور بصیرت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

لیکن اس وقت میں جس افسانے سے آپ کا تعارف کروا رہی ہوں، وہ بہت سادہ اور پر اثر ہے، نام ہے اس کا ''تار پر چلنے والی''......ہم سب نے اپنے اپنے بچپن اور لڑکپن میں سرکس دیکھے ہیں۔ 'لکی ایرانی سرکس' کی بھونڈی نقل پاکستان کے مختلف علاقوں میں آج بھی نظر آتی ہے۔ کبھی سرکس ایک رومانس ہوا کرتا تھا۔ اسٹیج پہ گھوڑا دوڑاتی لڑکیاں، ہنٹر والی، جھولوں پہ گروپ کی شکل میں تماشا دکھانے والی خوبرو حسینائیں جن کے بدن کا لوچ بتاتا تھا کہ ان کے بدن میں ہڈیاں نہیں بلکہ اسپرنگ لگے ہیں، جبھی تو وہ دونوں ٹانگوں کو 180 ڈگری کے زاویے پر کھول لیتی ہیں، تو کبھی 90 ڈگری کے زاویے پر ایک پیر سے کھڑی ہو جاتی ہیں اور کبھی اپنے لوچ دار بدن کو کچھوے کی طرح سمیٹ لیتی ہیں، اور کبھی ایک جھٹکے سے گھڑی لے کر پھرکی کی طرح لہرا کر سیدھی کھڑی ہو جاتی ہیں۔ کبھی یہ اسٹیج پہ تنی رسی پر ایک ڈنڈا ہاتھ میں لے کر توازن برقرار رکھتے ہوئے نپے تلے قدم اٹھاتی چلی جاتی ہیں۔ بالکل ایسے جیسے بتاشوں پہ چل رہی ہوں......اور جونہی آخری سرے پر پہنچتی ہے تو ہاتھ میں پکڑی لکڑی کو کھول کر خوشنما چھتری بنا دیتی ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ تار پر چلنے والیاں، شیروں کے پنجرے میں گھس کر کمالات دکھانے والے، جمناسٹک کرنے والے اور تار پر سائیکل چلانے والیاں، جن کے ہوش اڑا دینے والے کرتب دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ سرکس یوں تو ساری دنیا میں مقبول ہے، لیکن روسی سرکس اپنی ترجیحات کی بناء پر پسندیدگی کے لحاظ سے سرفہرست ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے شہروں اور دیہاتوں میں مچھلی کے دھڑ اور انسانی چہرے والی عورت تو کبھی کو یاد ہوگی، سر پر تاج لئے، آنکھوں میں گہرا کاجل، اپنے جسم کو ایک خاص زاویے سے سکیڑنے والی دوشیزہ کو دیکھ کر بچے تالیاں بجاتے تھے اور بڑی حیرت کا اظہار کرتے تھے، گو کہ سب کو معلوم ہوتا تھا کہ دوشیزہ کا نچلا دھڑ مچھلی کا نہیں ہے، پھر بھی یقین کرنے کو جی چاہتا تھا کہ ایسا ہی ہے، کبھی کبھی دل کو دھوکہ دینا اور عقل سے نظریں چرا لینا بھی اچھا لگتا ہے۔

''تار پر چلنے والی''......بھی دراصل سرکس میں کام کرنے والوں کی زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ ان بے وقعت لوگوں کی زندگی کی کہانی ہے، جنہیں لوگ عزت نہیں دیتے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ''لارا'' ہے، وہ ہے تو ٹائٹ روپ ڈانسر، لیکن اندر سے شاعرہ بھی ہے اور افسانہ نگار بھی......اور وہ خوبصورت بھی تو ہے، شاید یہی اس کا المیہ ہے......!! مگر لارا کا اصل کیا ہے؟ وہ تار پر چلنے والی کیسے بنی؟ ایک اخباری رپورٹر، جو شہر کی کلچرل رپورٹنگ کرتا ہے، ایک دن سوچتا ہے کہ وہ سرکس میں کام کرنے والوں کی زندگی پر ایک فیچر بنائے اور بتائے کہ یہ لوگ کتنے گنی ہیں۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ دوسری مہذب اور تعلیم یافتہ اقوام میں سرکس والوں کی اور ان کے فن کی عزت کی جاتی ہے۔ انہیں اعزاز و انعام دیئے جاتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں تو کوئی عزت دار انہیں منہ بھی نہیں لگاتا، اعزاز و اکرام تو دور کی بات ہے۔ اس کلچرل رپورٹر کو جو کہ ایک بہت بڑے اخبار سے وابستہ ہے، سرکس والوں سے ایک ہمدردی محسوس ہوتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اپنے بوس کو نیویارک جانے سے پہلے ایک سرپرائز دے اور اپنی تنخواہ میں اضافہ کروالے، کیونکہ اب تک کسی انگریزی اخبار میں سرکس پہ کوئی فیچر شائع نہیں ہوا تھا، یوں یہ ایک خاصے کی چیز بن جاتی۔ چنانچہ یہی سوچ کر وہ سرکس میں جا گھستا ہے اور اپنا مقصد بتاتا ہے، تو سرکس کے مالک اسے چند لڑکیوں سے ملواتے اور بتاتے ہیں کہ

"یہ شیر کے پنجرے میں جاتی ہیں، تار پر چلتی ہیں، آگ میں کودتی ہیں، ان کو معمولی مت سمجھئے گا، جناب والا! ...... مگر یہ آپ کو انٹرویو نہیں دے سکیں گی...... یہ صرف ملیالم جانتی ہیں اور ان پڑھ ہیں۔ کیرالا کے افلاس زدہ دیہات میں ان کے فاقہ کش والدین چھ چھ سات سات سال کی عمروں میں ان کو سرکس والوں کے حوالے کر دیتے ہیں...... یہ لڑکیاں سرکس میں کام کر کے اپنے والدین کی کفالت کرتی ہیں...... کوئی انشورنس، سوشل سکیورٹی، طبی امداد، پنشن، ان کو سرکس کی طرف سے نہیں ملتی۔ جوانی ڈھلنے پر سرکس آرٹسٹ کرتب دکھانے کے قابل نہیں رہتا، تب یہ سب اپنے اپنے گاؤں کو واپس چلی جاتی ہیں۔ شام کو یہی بے چاریاں جگمگاتے کپڑوں میں پریوں کی طرح تیرتی اور فضاء میں قلابازیاں کھاتی نظر آئیں گی...... پیٹ بہت مشکل سے پلتا ہے، حضور والا...... اور یہ بھی نہ بھولئے گا کہ ان فنکاروں کا دنیا کے بہترین آرٹسٹوں سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔"

کلچرل رپورٹر کو دکھ ہوتا ہے یہ سن کر اور جان کر محض غربت کی بناء پر ان سرکس آرٹسٹوں کی کوئی قدر ہندوستان میں نہیں ہے...... پھر اس کی ملاقات سرکس کے مالک لارا سے کرواتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ "لارا بہت پڑھی لکھی لڑکی ہے، اور اس کا وطن اصل میں فرانس ہے، وہ انگریزی بھی فر فر بولتی ہے...... لیکن وہ بھی کسی کو انٹرویو نہیں دیتی، پتہ نہیں وہ فرانس سے ہندوستان کیوں اور کیسے آئی۔ یہ بات آج تک کوئی نہیں جان سکا...... لیکن یہ حقیقت ہے کہ لارا کے آنے کے بعد سرکس میں تماشائیوں کا بہت اضافہ ہوا ہے۔ اسی لئے ہم اس کا خیال بھی رکھتے ہیں۔"

سرکس کے مالک کی بات سن کر رپورٹر کو لارا سے ملنے اور اس کے حالات جاننے کا اشتیاق ہوتا ہے۔ اور وہ بے دھڑک لارا کے خیمے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور اپنے سامنے ایک ایشیائی حسین اور پرکشش لڑکی کو ٹائٹ روپ ڈانسر کے طور پر دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ رپورٹر کو دیکھ کر مس لارا اچانک کھڑی ہو جاتی ہے اور رپورٹر کو حیرت سے تکنے لگتی ہے اور پھر روہانسی ہو کر پوچھ بیٹھتی ہے۔

"کیا تمہارا نام پال ہے؟...... نفی میں جواب سن کر بھی اسے رپورٹر سے ایک قلبی لگاؤ محسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ رپورٹر بالکل اس کے چھوٹے بھائی پال سے مشابہہ ہے۔ وہ اسے بیٹھ جانے کو کہتی ہے اور بتاتی ہے کہ وہ فرانس کی رہنے والی ہے۔ جہاں پانڈیچری میں اس کے والد ایک جج تھے۔ اس کا اصل نام کیتھرین وڈپال ہے۔

اب رپورٹر کے چونکنے کی باری تھی...... فرانس کے ایک جج کی بیٹی کیتھرین وڈپال سرکس گرل میں لارا کیسے بن گئی اور ہندوستان کیونکر آ گئی۔

مس لارا کو رپورٹر میں اپنا مرحوم بھائی نظر آتا ہے، جس کی موت کے بعد وہ مصیبتوں کا شکار ہوگئی، وہ رپورٹر کی طرف دیکھے بغیر بتاتی ہے کہ پانڈیچری کے جس کالج میں پال پڑھتا تھا، وہاں ایک ہندوستانی پروفیسر بھی پڑھاتا تھا۔ پھر وہ ہسٹریائی انداز میں کھڑی ہو جاتی ہے اور رپورٹر سے کہتی ہے۔

"...... اور کان کھول کر سنو......!! آج دنیا کو معلوم ہونا چاہئے کہ کیتھرین وڈپال مس لارا کیسے بنی؟...... وہ ہسٹریائی انداز میں ہنسنے لگی...... ہندوستانی شہزادہ...... عاشق جاں نثار...... وہ مجھ سے کہتا تھا...... مجھ سے شادی نہیں کرو گی تو میں مر جاؤں گا......"

"وہ کہتا تھا کہ وہ میرا پہلا اور آخری عاشق صادق ہے...... ہم دونوں پیرس جائیں گے...... وہاں میں مشہور مصنف بنوں گا، تم نامور بیلے ڈانسر بننا...... اور پھر بلاوجہ...... بلاوجہ وہ کلکتہ بھاگ گیا اور وہاں جا کر ایک بنگالی لڑکی سے

شادی کرلی......!!......!!

پال مرا...... پاپا مرے......غریبی چھائی...... اوبار نحوست مسلسل افلاس سے تنگ آ کر ماما نے سرکس کے ایک فولادی آدمی سے شادی کرلی......!!...... یہ نہ پوچھو کہ وقت کس طرح بدلتا ہے......اور خدا سے ڈرتے رہو، وقت کسی گھڑی بھی بدل سکتا ہے...... مصیبت کسی گھڑی بھی آ کر دبوچ سکتی ہے۔"

رپورٹر چپ چاپ کہانی سنتا رہتا ہے اور پھر لارا سے اس ہندوستانی پروفیسر کا نام پوچھتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندوستانی شہزادہ جس کی بے وفائی نے ایک جج کی بیٹی کیتھرین وڈ پال کو سرکس گرل بنادیا، وہ اسی کے بڑے انگریزی اخبار کا ایڈیٹر ہے، جو آئندہ چند روز بعد خوب رو اور چنچل مس سروجنی گپتا کے ساتھ نیویارک جارہا ہے۔ اور جس کی ایک عدد بنگالی بیوی بھی ہے......

مس لارا پر جب یہ ہولناک انکشاف ہوتا ہے تو وہ سرکس کے اختتام پر رپورٹر سے کہتی ہے۔ یاد رہے کہ رپورٹر اس کے بھائی پال کا ہم شکل ہے)

"پال...... اپنے محترم بوس کو کہہ دینا کہ سرکس کی ایک گمنام، بے عزت، بے تکی، ٹائٹ روپ ڈانسر نے انہیں معاف کردیا۔"

قاری پر جب یہ انکشاف ہوتا ہے کہ اخبار کے ایڈیٹر اور سابق پروفیسر ہی کی وجہ سے فرانس کے ایک جج کی بیٹی ٹائٹ روپ ڈانسر بنی تو ذہن کو دھچکا سا لگتا ہے۔ لارا بھی بے وفائی کا دکھ سہہ کر زندگی کی صلیب کاندھوں پہ اٹھائے تنی ہوئی رسی پر چل رہی ہے اور دل توڑنے والے کو معاف بھی کردیتی ہے۔ تو قاری کے دل میں سرکس میں کرتب دکھانے والیوں اور تار پر چلنے والیوں کے لئے ایک کرب، ایک درد اور ایک دکھ ضرور محسوس ہوتا ہے...... کہ بے وفائی کی صلیبیں ہمیشہ اکیلے ہی اٹھانی پڑتی ہیں۔!!

منشایاد کے افسانوں کا ایک ضمنی موضوع

محمد حمید شاہد

منشایاد کے افسانوں میں جنس اور عورت کو تلاش کرتے ہوئے مجھے عین آغاز میں ہی منٹو یاد آ گیا ہے۔ اب اگر میں یہ کہوں کہ جنس منٹو کا مرغوب موضوع تھا' آپ ایک لمحے کا توقف کیے بغیر' ترت مان لیں گے۔ اس کا سبب اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ منٹو کا نام آتے ہی اس کے بہت سارے جنسی چٹخارہ چھوڑتے کردار سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ ویسے بھی جنس' فحاشی' لذت پرستی اور سنسنی خیزی کو منٹو سے متھ بنا کر یوں نتھی کر دیا گیا ہے کہ ادھر اس کا نام سوچا ادھر لب ریز لذت کے چھینٹے اڑے' کچھ اور سوجھتا ہی نہیں۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جنس سے باہر رہ جانے والے منٹو کو دریافت نہ کر کے ہم زیادتی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ تاہم اس کا کیا کیجئے کہ خود منٹو نے ہمیں کسی اور طرف ملتفت ہونے ہی نہیں دیا۔ مثلاً اس کا فرائیڈن تھیوری پر یوں ایمان لانا: ''اور سچ پوچھیے تو فی زمانہ مرد اور عورت کا پریم ہوتا ہی جنسی ہے'' ہمیں کہیں اور کیسے جانے دے گا۔

منٹو کے ہاں یہ جنس مرد سے کہیں زیادہ عورت کے راستے سے آتی رہی ہے۔ جنس کی نمائندہ عورتیں ہی اس کی پسندیدہ عورتیں ہیں اس کا کہنا ہے کہ چکی پیسنے والی عورت جو دن بھر کام کرتی ہے اور رات اطمینان سے سوجاتی ہے اس کے افسانوں کی عورت نہیں ہوسکتی۔ خود منٹو کے الفاظ میں:

''میری ہیروئن چکلے کی ایک ٹکیائی رنڈی ہوسکتی ہے جو رات کو جاگتی ہے اور دن کو سوتے میں کبھی کبھی یہ ڈراؤنا خواب دیکھ کر اٹھ بیٹھتی ہے کہ بڑھاپا اس کے دروازے پر دستک دینے آیا ہے۔ اس کے بھاری بھاری پپوٹے جن پر برسوں کی اُچٹتی ہوئی نیندیں منجمد ہوگئی ہیں' میرے افسانوں کا موضوع بن سکتے ہیں۔ اس کی غلاظت' اس کی بیماریاں' اس کا چڑ چڑا پن' اس کی گالیاں' یہ سب مجھے بھاتی ہیں۔ میں ان کے متعلق لکھتا ہوں اور گھریلو عورتوں کی شستہ کلامیوں' ان کی صحت اور ان کی نفاست پسندی کو نظرانداز کر جاتا ہوں۔''

منٹو پتی ورتا استریوں اور نیک دل بیویوں کے بارے میں لکھنا اس لیے فضول گردانتا تھا کہ بقول اس کے اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا تھا مگر لطف دیکھئے کہ منشایاد کو وہ عورتیں قطعاً نہیں بھاتیں جو منٹو کو مرغوب تھیں۔ وہ پتی ورتا استریوں اور نیک دل بیویوں کی دنیا میں رہتا ہے اور اس کی پروا کیے بغیر کہ ان پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے' ان کے خدوخال یوں اجالتا ہے کہ وہ ہر بار نئی جمالیاتی جھلک دے جاتی ہیں۔ پھر یوں بھی ہے کہ منشا کو عورت اور جنس پر براہ راست لکھتے ہوئے بہت لاج آتی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اس گوں کا آدمی ہے ہی نہیں کہ منہ اٹھائے اور کوٹھے کی سیڑھیاں پھلانگتا طوائف کے گھٹنوں سے گھٹنا جوڑ کر بیٹھ جائے۔ وہ ایسا کیوں نہیں ہے؟ آپ جاننا چاہیں تو میں آپ کو اس کا بچپن یاد دلاتا ہوں۔ خود ہی قیافہ لگائیں کہ جس کی ماں بیٹے کو ننگے سر ماموں کے سامنے نہ جانے دیتی ہو اور جس کی سینما دیکھنے پر پیشی ہو جاتی ہو' وہ بڑا ہو کر بے ایمان بنے گا بھی تو کتنا۔ چاہے جتنا کھل کھیل لے' منٹو کی مرغوب عورت کی تلاش میں اپنی لاج کا دائرہ توڑ کر کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھے تو کیسے؟...... لیجئے' آگے بڑھنے سے پہلے ہی ہم اس سوال سے بھی نپٹ چکے کہ جنس اور عورت منشایاد کے افسانوں کا بنیادی حوالہ بنتے ہی نہیں ہیں۔

اچھا صاحب' قرینے سے چلتے ہیں۔ جس ترتیب سے منشایاد کو دیکھا جا سکتا ذرا اس کی ترتیب بناتے ہیں۔ یہ وسط سے اسے دیکھنا' یا آدھے دھڑ سے اسے جانچنا مجھے خود بھی کھلنے لگا ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ:

☆...... جس دور میں منشایاد نے شناخت پائی وہ دور علامت نگاری اور تجرید کے نرغے میں تھا۔ ایسا زمانہ کہ منٹو اور روایت سے جڑی ہوئی کہانی' دونوں کو بہ سہولت گالی دی جا سکتی تھی' اور منہ بھر کر گالی دی جا رہی تھی۔ ایسے میں منشایاد نے بھی علامتی کہانیاں لکھیں' ہوا جو چل نکلی تھی...... اور اسی لہر میں قلم سے اس قبیل کی کئی باکمال کہانیاں بھی نکل گئیں...... مگر لطف یہ ہے کہ شناخت بیانیہ کہانی ہی سے بنی۔

☆...... منشایاد کا دوسرا حوالہ اسی سے مخصوص دیہات نگاری بنتا ہے۔ وسطی پنجاب والا دیہات' اس کے میلے ٹھیلے' اس کے وسنیک اور اس کی مٹی سے اُگ آنے والی دانش۔

☆...... منشا کے افسانوں کی تیسری شناخت طبقاتی تفاوت اور تضاد پر اس کا شدید ردعمل بنتا ہے۔ اس موضوع پر لکھتے ہوئے وہ معاشرے کے پسے ہوئے کرداروں کو اٹھاتا ہے اور انہیں مراعات یافتہ طبقے کے مقابل لا کر یوں نمایاں کرتا ہے کہ قاری خود بخود کمہاروں' فقیروں' ترکھانوں' تیلیوں' موچیوں' اور زمین پر رزق کے لیے رینگنے والے کیڑوں جیسے انسانوں کے ساتھ جا کھڑا ہوتا ہے اور انہیں باوقار بنا دیتا ہے۔

☆...... منشایاد کی کہانیوں کی چوتھی شناخت اس کا مضبوط اور تخلیقی رس سے بھرا ہوا بیانیہ بنتا ہے' شگفتگی اور دیہی دانش کا امتزاج اس کے بیانئے کو نکھارتا ہے اور اس کا اپنا خلوص پوری کہانی کے بیان کو اتنا خالص اور پاکیزہ بنا دیتا ہے کہ ہر جملہ قاری کے قلب تک رسائی پا لیتا ہے۔

☆...... عصری آگہی اور سیاسی شعور منشایاد کا پانچواں اختصاص ہے' تاریخ کیسے مسخ ہوتی ہے اور عام آدمی سیاست کے ہاتھوں کیسے مار کھاتا ہے' جمہوری آوازیں کیسے دبا دی جاتی ہیں اور سامراج کے دروغے کیسے قوموں کو تذلیل سے دوچار کرتے ہیں اس کی کہانیوں کا موضوع بنتے رہتے ہیں......'

صاحب' اگر میں یوں ہی گنواتا گیا تو عورت اور جنس کا نمبر آئے گا ہی نہیں...... اور آ بھی گیا تو بہت ہی بعد میں آئے گا...... مگر میرے اندر کا ٹیڑھ دیکھئے کہ اوپر والی ترتیب سے آگے بڑھ ہی نہیں پا رہا ہوں اور دل ہے کہ منشا کی معدودے چند عورتوں اور ان سے تشکیل پانے والی جنسی حسیت ہی کی طرف مچلنے لگا ہے۔

ہم طے کر چکے کہ پورے سماج کے اعصاب پر بری طرح سوار عورت اور سارے بدن پر حکومت کرنے والے اول نمبر کی جنس منشایاد کے مہذب معاشرے میں وکٹری اسٹینڈ پر نہیں ہے' وہ جنس جو اچھلتی کودتی ہے' اور اس عورت کے بدن سے پھوٹتی ہے جسے عریاں ہونے میں باک نہیں ہے' کوسوں کمانوں کی نمائش سے اشتہا پیدا کرنا جسے مرغوب ہے' اس سے منشایاد کی کہانی کی کوئی نسبت نہیں ہے۔ اب آپ پوچھ سکتے ہیں تو باقی کون سی جنس رہ جاتی ہے؟ اور میرا کہنا یہ ہے کہ وہ جو چپکے چپکے میٹھے سروں کی طرح بدن بیچ بہتی ہے اور دیمک کی طرح اندر ہی اندر سے چاٹتی رہتی ہے' لباس میں چھپی ہوئی اور تہذیب کی خوشبو میں بسی ہوئی۔ ہاں' یہی تو منشایاد کے ہاں ہے۔ چھپی ہوئی یہ جنس اور مستور عورتیں جہاں جہاں اس کی کہانی کے باقی حوالوں کے اندر سے جھلک دیتی ہیں' ہماری اپنی زندگی کی تفسیر بن جاتی ہے۔

عشق محبت اور جنس' تینوں کو ایک ہی معنی کے سلیقے میں نہیں سمیٹا جا سکتا۔ تینوں کا ذائقہ جدا ہے...... مگر یوں ہے کہ میں نے ایک لفظ جنس لکھ کر دونوں دوسرے جذبوں کو ان میں یوں بریکٹ کر لیا ہے کہ میرے موضوع میں ایسا عشق اور

ایسی محبت آئے گی جو بہرحال جنسی جذبے کے ساتھ کسی نہ کسی سطح پر جڑ جاتی ہے۔ منشایاد کے ہاں جنس کہیں محبت کے زیراثر رہتی ہے اور کہیں عشق بن کر بھڑک اٹھتی ہے تاہم ایسا بہت کم کم ہوتا ہے کہ وہ فقط لذت بن گئی ہو۔ اور شاید یہی سبب ہے کہ وہ محض جنسی کجی کو موضوع نہیں بناتا اسے سماجی اور تہذیبی مسئلہ کے طور پر کہانی کے اندر یوں نہاں کر دیتا ہے جیسے بدن کے وسط میں اسے قدرت نے رکھ دیا ہے۔ بات وسط تک پہنچ گئی ہے تو لازم ہو گیا ہے کہ منشایاد کی کہانیوں اور چند نسوانی کرداروں کو سامنے رکھ کر دیکھا اور سمجھا جائے۔

اس موضوع کی ایک بہترین مثال اس کا افسانہ ''بند مٹھی میں جگنو'' بنتا ہے۔ یہ افسانہ جہاں ہماری جمالیات کو تسکین پہنچاتا ہے' وہیں بہت معنی خیز بھی ہے۔ تاہم عین آغاز ہی میں آپ کو چوکنا کر دوں کہ اس کہانی کو سیدھے سبھاؤ سمجھنے کی غلطی ہرگز ہرگز نہ کیجئے گا کہ پہلے اس تنہائی اور یکسانیت کو سمجھا جانا بہت ضروری ہے جو کالج کی ایک لڑکی کے اندر جنسی گھٹن کا سبب بن گئی تھی۔ افسانے کے اندر اس فضابندی کا فن کارانہ اہتمام ملتا ہے:

''وہ کتابوں اور رسالوں سے اکتا گئی تھی......''

''تھوڑی دیر پہلے روٹی لے کر کھیتوں کو جاتے وقت' پھوپھی اس پر تنہائی کا ٹوکرا رکھ گئی تھی''

''تنہائی کے ٹوکرے کے نیچے پڑے پڑے اسے بدبو کے بھبوکوں نے گھیر لیا تھا......''

ان جملوں میں تنہا اور اکتائی ہوئی لڑکی کا تصور تو ابھرتا ہے مگر یہ تنہائی اس کے وجود کے اندر اُتری ہوئی دکھائی نہیں دیتی ہے۔ منشایاد جیسا افسانہ نگار اتنے پر اکتفا کیسے کر سکتا تھا لہٰذا آگے چل کر وہ ان محرکات کو سامنے لاتا ہے جنہوں نے لڑکی کا باطن تشکیل دیا تھا:

☆...... ''بچپن میں اس کا خیال تھا کہ آسمان پر ہزاروں لاکھوں سورج ہیں اور ہر روز نیا سورج طلوع ہوتا ہے۔ وہ ایک عرصہ تک یہی سمجھتی رہی کہ ہر شام ایک سورج بجھ جاتا ہے اور اگلی صبح ویسا ہی یا موسم کے لحاظ سے چھوٹا بڑا سورج طلوع ہو جاتا ہے۔''

☆...... ''مگر اب اسے پتہ تھا کہ ایک ہی پرانا سورج اور ایک ہی تھکا ہارا چاند ہر روز استعمال ہوتے ہیں...... پرانی چیزوں سے اس کا جی اوبھ جاتا تھا''

☆...... ''تازگی کا عالم گیر قحط پڑا ہوا تھا۔ ہر صبح بوسیدگی کی دبلی گائیں تازگی کی فربہ گایوں کو ہڑپ کر جاتی تھیں۔''

☆...... ''تازگی کو سورج کی شعاؤں سے بچا کر فریج میں کئی کئی دن تک رکھا جاتا تھا۔ تازگی آٹھ آٹھ دن کی مری ہوئی مچھلیوں کی صورت بکتی تھی''

☆...... ''جسموں کی بوسیدگی کو ڈھانپنے کے لیے نئے فیشن ہوتے تھے اور آؤٹ آف ڈیٹ نظریات پر لفظوں کا ملمع چڑھایا جاتا تھا۔''

☆...... ''ٹیلی ویژن اور فلموں کی نقلی لڑائیاں' سنے سنائے لطیفوں کی طرح بور لگتی تھیں''

آپ نے دیکھا کہ ایک اکتائی ہوئی لڑکی ایک مختلف منظرنامے میں اپنی مکمل نفسیات کے ساتھ اس تجربے سے گزرنے کے لیے بالکل تیار ہو گئی ہے جس سے افسانہ نگار نے اسے گزارنا ہے۔ یہی پوری طرح اندر سے اکتائی ہوئی لڑکی

آخری سیڑھی پر بیٹھ جاتی ہے لمبا سانس لیتی ہے اور نظارہ کرتی ہے۔ اس کے سامنے لڑنے والی بھی عورتیں ہیں۔ یہ منشا یاد کی عورت کا ایک اور روپ ہے مگر ہمیں سیڑھی پر بیٹھی لڑکی کی بات کو آگے بڑھانا ہے جس کے اندر ابھی تک جنس کے جرثومے نے آنکھ نہیں کھولی۔ لڑنے والی عورتوں کے چہروں پر آگ کے شعلے تو ہیں' مگر نفرت نہیں۔ ان کی آوازوں میں بجلی کی کڑک ہے مگر سانسوں میں سانپوں کی پھنکار نہیں۔ شریفاں اور نوراں جنہیں وہ پہلے سے جانتی ہے اس نظارے میں پھپھے کٹنیاں بن کر سامنے آتی ہیں۔

یہیں' کچھ آگے چل کر منشا یاد نے اکتائی ہوئی لڑکی کے لیے چار الگ الگ سطروں میں چار کیفیات درج کر کے آگے سوالیہ نشان ڈال دیے ہیں۔

''خواب؟
معدے کی گرانی؟
واہمے؟
لاشعور میں چھپی ہوئی خواہشات؟''

اور اس کے بعد اس نے لکھا ہے:

☆......''ایک بار اس نے دیکھا وہ چائے بناتے بناتے خود کیتلی میں بند ہوگئی ہے' وہ چیختی چلاتی ہے مگر کوئی ڈھکنا نہیں اُٹھاتا یہاں تک کہ اس کا دم گھٹ جاتا ہے اور وہ مرجاتی ہے۔''

☆......''بھرے پرے گھر میں بھی اس پر اداسی اور تنہائی کے تنبو ہر وقت تنے رہتے۔ کبھی کبھی وہ اپنے جسم کی ان پڑھی کتاب کھول کر خود ہی تصویریں دیکھنے بیٹھ جاتی' پھر میلی ہونے کے ڈر سے بند کر کے ایک طرف رکھ دیتی۔

☆......''اسے ہر چیز باسی محسوس ہونے لگتی۔ اسے اپنا جسم' جس پر اسے خود سونے کا پانی چڑھا ہوا لگتا تھا' سوکھا چمڑا نظر آنے لگتا۔ پسینے سے مردہ مچھلیوں کی بدبو آتی اور کتاب یا رسالہ کھول کر بیٹھتی تو جگہ جگہ مری ہوئی مکھیاں چپکی ہوئی دکھائی دیتیں۔ بیٹھے بٹھائے اس کے ذہن میں سوچ کی مکروہ چمگادڑ چکر لگانے لگتی اور اسے ہر چیز سے گھن آتی۔ موسیقی مردہ کوے کی لاش پر سینکڑوں کوؤں کی کائیں کائیں معلوم ہوتی۔ انڈوں سے برادے اور سالن سے مردہ گوشت کی سڑاند آتی...... اس کا جی متلانے لگتا اور وہ قے کرنے لگتی۔''

گویا اس جنس کا وہ جرثومہ جس نے ابھی تک آنکھیں کھول کر ادھر ادھر منہ نہیں مارا تھا' اپنی نفسیات میں مکمل تھا۔ مکمل بھی اور کارگزاری دکھانے کے لیے بے کل بھی۔ یہی سبب ہے کہ آخری سیڑھی پر بیٹھی لڑکی کے اندر کھد بد ہونے لگتی ہے۔ پھپھے کٹنیاں اپنی جون بدل کر لچیاں اور لفنگیاں ہو جاتی ہیں' آنکھ مٹکا کر باتیں کرنے اور کسی کے ساتھ ادھل جانے والیاں۔ ادھل جانے کا ارمان بھی لڑکی پر جست لگا چکا ہے۔

میں نے ابھی یہ نہیں بتایا کہ لڑنے والیوں کے اب تک دو گروپ بن چکے تھے۔ افسانہ نگار نے انہیں جیٹھانی اور دیورانی گروپ کا نام دے کر دیہی معاشرے کی روایتی مگر پر خلوص لڑائیوں کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ افسانے میں بتایا گیا

ہے' جیٹھانی کو رنج تھا کہ اس کی مرغیاں دیورانی کے گھر انڈے دیتیں اور کڑکڑ کرنے اپنے گھر آ جاتی تھیں جبکہ دیورانی کا کہنا تھا کہ وہ مرغیاں فاحشہ تھیں۔ اپنے بانجھ پن کو چھپانے کے لیے کڑکڑانے والیاں اور انڈے دینے کی بجائے مرغوں کی طرح بانگیں دینے والیاں۔

ایک ایسی شہری لڑکی جس کے گھر والے اس کے سامنے محتاط ہو کر بات کرتے رہے اس کے لیے جیٹھانی اور دیورانی گروپ کی اس لڑائی میں لذت بھر گئی جاتی ہے۔ کہانی ہمیں بجھاتی ہے کہ وہ یہاں تک پہنچتے پہنچتے کس طرح ادھل جانے کے رومان اور مرغیوں کی فحاشی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ لڑائی آگے بڑھی اور پچھلی سات پشتوں کے گڑے مردوں کو اکھاڑا گیا اور ان کے بدنوں کے کفن نوچ لیے گئے تو اس کی آنکھوں کے سامنے قبرستانوں میں راتوں کو الاؤ کے گرد ناچتی عورتیں گھوم گئیں۔ جھجک جھجک کر بدن کی کتاب جھانک لینے والی لڑکی اب ننگی گالیاں اور پوشیدہ انسانی اعضا کے نام سن رہی تھی' اس کے ذہن کے پنجرے میں قید بے شمار چڑیاں یکبارگی پھر سے اُڑ گئی تھیں اور اس کے بدن سے چمٹی ہوئی جونکیں ایک ایک کر کے جھڑنے لگی تھیں۔

جنس کے جرثومے کی آنکھیں پوری طرح کھل چکی تھیں اب افسانے کی لڑکی اکتائی ہوئی نہ رہی تھی' بالکل بدل گئی تھی' اس کا سارا جسم دہکنے لگا تھا۔ اس کے اندر سے جو نیا سورج اُگنے لگا تھا اُس نے اس کے رخساروں کو اپنی لذیذ گرمی سے دھکا دیا تھا۔ لڑکی پسینے میں بھیگ گئی تھی اور اس کا بدن ہلکا ہو کر زمین سے اوپر ہی اوپر اٹھنے لگا۔ کہانی کے آخر میں غلیظ مکھیاں پھر بھنبھنانے لگتی ہیں' چربی جلنے کی سڑاند ہر طرف پھیل جاتی ہے اور لڑکی قے کر دیتی ہے...... کیسے؟ یہاں جنس کا ابال' کڑھی کے ابال کا سا ہو جاتا ہے جو اپنے تئیں الگ سے توجہ چاہتا ہے۔

اب تک منشا یاد نے شہری زندگی کے حبس زدہ سکون اور مضمحل کر دینے والی یکسانیت کے مقابلے میں دیہی زندگی کی کشادگی اور بے ساختگی کو رکھ کر جنسی جذبے کی نمود اور بالیدگی کو دکھایا ہے۔ اور صاحب' اگر آپ نے دیہی اور شہری زندگی' دونوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے تو ماحول' لہجہ اور لغت کی تبدیلی کا یہ موٹیف آپ کو ایک اور ہی دنیا میں لے جائے گا۔ شہری لڑکی کے لیے جو جو الفاظ فحش تھے دیہی زندگی میں معمول کا حصہ ہو جانے کی وجہ سے فحش نہیں رہے تھے فقط گالی جیسے ہو گئے تھے۔ وہ جو پوشیدہ اعضائے انسانی کے نام دوسروں کو برا بھلا کہنے' دبکانے' طعنے دینے یا اکسانے کے لیے سرعام لیے جا رہے تھے وہ شہری لڑکی کے اندر ابال لا رہے تھے مگر دیہی عورتیں انہیں یوں اگل رہی تھیں جیسے ان کے کوئی معنی نہ تھے یا وہ گوشت پوست کے اعضا نہ تھے' پتھر تھے' جن سے مقابل کو زخمی کیا جا سکتا تھا یا پھر لیروں اور ٹاکیوں کے ایسے کھدو تھے جن کے ذریعے بکنے والیوں کے منہ بند کیے جا سکتے تھے۔ لڑکی کے اندر بپا تبدیلی کو افسانہ نگار نے مثبت دکھایا ہے مگر اس کے بعد یہی دیہی موٹیف اس کے جذبوں کو اوندھا کر رکھ دیتا ہے۔ اور یہ تب ہوتا ہے جب بپھری عورتوں میں بیچ بچاؤ کی نیت سے آگے آنے والا ستر سال کا ایک باوقار نظر آنے والا شخص ناکام ہو جاتا ہے اور چھوٹے قد کے مریل سے شخص کی فحش گالیاں سن کر سب لڑنے والیاں ادھر ادھر کھسک جاتی ہیں۔ اب یہ فحش الفاظ' جو اس کے اندر ابال پیدا کر رہے تھے' ابکائی پر مجبور کر دیتے ہیں۔

جنس کا ایک اور انداز سے مطالعہ منشا یاد کے افسانے ''پانی میں گھرا پانی'' میں ملتا ہے۔ ایک لمحے کو رک کر صرف اس کے نام ہی کا لطف لے لیجیے...... پانی میں گھرا پانی۔ آپ کو قائل ہونا پڑے گا کہ منشا کہانی کا نام رکھنے کے حوالے سے' نام میں کیا رکھا ہے' کو نہیں مانتا اس پر بہت غور کرتا ہے اور سوچ سمجھ کر نام رکھتا ہے۔ ہاں تو ہم منشا کے ہاں عورت اور جنس کو ایک اور پہلو سے دیکھنے چلے تھے اور اس کے لیے میں نے جو افسانہ چنا ہے اس میں شہر اور شہری زندگی کا کوئی حوالہ نہیں ہے'

اس کی کہانی کے تمام لوازم دیہات ہی کی سوندھی مٹی سے پھوٹتے ہیں۔اوپر جس کہانی کی تفہیم کی کوشش کی گئی ہے اس میں مرد کہانی کے آخر میں آتے ہیں مگر زیرِ نظر کہانی کے آغاز میں ہی ایک مرد آ گیا ہے...... کہانی کی عورت میرے اس جملے کو پڑھ کر شاید کھلکھلا کر ہنس دے یا پھر شاید رو دے اور ممکن ہے کچھ بھی نہ کرے۔ جس ماحول سے اس کہانی کا تانا بانا بنا گیا ہے اس میں ایک عورت آخر کر بھی کیا سکتی ہے؟۔ کہانی کا مرد تپتی دوپہروں میں چکنی مٹی سے گھوڑے' بیل اور بندر بناتے بناتے ایک روز آدمی بناتا ہے۔اور اسے سوکھنے کو رکھ دیتا ہے۔

یہاں بات روک کر ذرا اس منظر نامے سے مانوس ہو لیں جس میں مٹی کا باوا بنانے والے مرد کو دکھایا جا رہا ہے۔ ویران اور کلر زدہ زمین' دور دور تک کسی چرند پرند کا نشان تک نہیں' کھڑی دوپہر میں شرینہہ کے درخت جھلس رہے ہیں اور ہر طرف ہو کا عالم ہے۔اسی منظر نامے میں ایک عورت کے نام کو بھی شامل کر لیجیے جو ابھی تک باوا بنانے والے مرد کے لیے روٹی لے کر نہیں آئی ہے تاہم افسانہ نگار نے اس کی طرف اشارہ کر کے اسے اس ماحول کا حصہ بنا دیا ہے۔ افسانہ نگار نے یہ بھی بتایا ہے کہ مٹی سے گھوڑے بیل بنانے والے کے ذہن میں بہت سی متاثر کرنے والی شکلیں اور قامتیں محفوظ تھیں انہیں توڑ کر' جوڑ کر اور مٹی میں گوندھ کر ایک ایسا مرد بنانا چاہتا تھا جو مکمل ہو اور جسے دیکھ کم از کم زیناں ضرور دنگ رہ جائے۔

ایک مکمل مرد' کہانی کے مرد یعنی دتے نے بنا لیا اور اسے سوکھنے کے لیے دھوپ میں رکھ کر بہت کچھ سوچ لیا تو زیناں بھی آ گئی۔ دتے کے روٹی کھا چکنے کے بعد اور زیناں کے جانے سے پہلے دونوں کے بیچ کا مکالمہ جس مشاقی سے منشا نے لکھا ہے اس کا لطف غارت کرنے کو تلخیص نہیں کروں گا' عین مین نقل کر رہا ہو کہ اس میں سمجھنے کو بہت کچھ ہے:۔

''زیناں' میں نے آج ایک کمال کی چیز بنائی ہے۔''

کیا؟''

''بوجھو تو''

''مرتبان'' وہ بولی ''تم نے اچھا کیا جب بھی لسی مانگنے جاتی ہوں' چودھرانی مرتبان کا ضرور پوچھتی ہے''

''وہ بھی بنا دوں گا لیکن یہ ایک دوسری چیز ہے''

''اچھا اچھا'' وہ ہنس پڑی ''مجھے پتا چل گیا' جھانواں''

وہ ہنس پڑا' کہنے لگا ''جھانواں تو نہیں پر ایک لحاظ سے جھانواں ہی سمجھو کیوں کہ اس میں عقل تمیز نہیں ہے...... میں نے باوا بنایا ہے''

''باوا؟''

''ہاں باوا' اور ایسا بنایا ہے کہ بس جان ڈالنے کی کسر رہ گئی ہے' تم دیکھو گی تو حیران رہ جاؤ گی کہ دنیا میں تم سے زیادہ خوب صورت چیزیں بھی ہیں یا بنائی جا سکتی ہیں''

''اچھا' چلو دکھاؤ'' وہ اشتیاق سے بولی۔

وہ اسے لے کر وہاں آیا جہاں اس نے ساری چیزیں دھوپ میں سوکھنے کے لیے رکھی تھیں مگر یہ جان کر پریشان ہو گیا کہ گھوڑے' بیل بندر اور دوسری سب چیزیں جوں کی توں پڑی تھیں مگر وہاں آدمی نہ تھا۔ آدمی نہ آدم زاد''

باقی کی کہانی میں اسی گم ہو جانے والے آدمی کی ڈھنڈیا رہتی ہے۔ زیناں کو وسوسے اُٹھتے ہیں جیسے یہ آدمی بنایا ہی نہیں گیا تھا اور دتے کو یقین ہے کہ اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ زیناں کا دتا کئی پشتوں سے نفرتوں کا ستایا ہوا اور

محبتوں کا ترسا ہوا تھا اور جو کچھ اب ہو رہا تھا وہ اسے اسی کا شاخسانہ سمجھ رہی تھی۔ دونوں کا مکالمہ ایک بار پھر:

''میری طرف دیکھو...... میں بھی تو ہوں...... تم تو پھر دن بھر کھلونوں سے کھیلتے رہتے ہو''

''اور تم نے جو اتنے سارے گھگھو گھوڑے پڑچھتی پر سجا رکھے ہیں؟''

''ہاں رکھے تو ہوئے ہیں مگر کیا فائدہ؟''

''لیکن تمہیں رب نے اتنا حسن دے دیا ہے کہ تم محض شیشہ دیکھ کر بھی وقت گزار سکتی ہو''

یہاں زیناں کے مخمصے کی وجہ سے مکالمہ رُک جاتا ہے۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا کہ وہ دتے کی بات پر روئے یا اترائے۔ اس کے بعد کہانی اپنے عنوان سی جڑ جاتی ہے۔ زیناں کی زباں سے دبیز جملے نکلتے ہیں:

''دتے تم پانی میں گھرے ہوئے پانی ہو اور میں آگ میں گھری ہوئی آگ۔ تمہیں کیا پتہ آگ کیا ہوتی ہے؟ تم آوی میں چیزیں پکاتے ہو لیکن تم نے خود آوی میں پک کر نہیں دیکھا''

اب دتے کی باری ہے زیناں سے حد درجہ مرعوب دتا' جس نے بہت خوب صورت باوا بنایا اور دھوپ میں سوکھنے کو رکھ دیا مگر جسے تپتی دھوپ نگل گئی تھی۔ کہنے لگا:

''میں تو پہلے ہی تمہیں ناری سمجھتا ہوں''

زیناں اس کے بعد جو کہنے والی ہے اس مرحلے تک افسانہ نگار سج سج چلا ہے' سلیقے سے' جملے جملے کو جوڑتے اور رمز کو معنی میں تحلیل کرتے ہوئے۔ اگلا جملہ اور پھر اس سے اگلے جملے ایسے ہیں کہ دتا ننگا ہو جاتا ہے اور خود زیناں کا کرب چیختا چنگھاڑتا قاری کے اندر گھس بیٹھتا ہے۔ زیناں دتے کے جواب میں کہتی ہے:

''نہ اڑیا...... مجھے خاکی ہی رہنے دے...... میں تو ایک بھینس اور ایک گدھی کے عوض......''

دتا اس جواب پر جھینپتے ہوئے زیناں کو بھینس اور گدھی کا ذکر بار بار کرنے سے منع کرتا ہے اور اپنی محبت کا یقین دلانے کے لیے کہتا ہے کہ اگر اس کے پاس قارون کا خزانہ ہوتا تو اسے دے کر بھی وہ زیناں کو حاصل کر لیتا۔ مگر وہ دتے کی اس بات کو کوئی وقعت نہیں دیتی اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے پہلے سے بھی زیادہ سفاک جملے بولتی ہے:

''ذکر کیوں نہ کروں...... بھینس اب تیسرے چوتھے سوئے میں ہوتی اور گدھی......''

اجازت دیجئے صاحب کہ کہانی کو یہاں روک کر آپ کو یاد دلا دوں کہ دتے نے مٹی کا آدمی بنایا تھا' زیناں جیسا خوب صورت بلکہ اس سے بھی زیادہ خوب صورت۔ مکمل آدمی۔ جسے دیکھ کر زیناں کو حیران ہونا تھا...... مگر یہ آدمی دتے کو قاری کے سامنے عریاں کرنے کے بعد اور زیناں کی نظر میں آنے سے پہلے ہی کھسک گیا تھا۔ اگر کہانی میں دتے کے علاوہ کوئی اور آدمی تھا تو وہ رجا تھا۔ گاؤں بھر کے مردوں میں سے افسانہ نگار نے الگ کر کے اس اکیلے رجے کو اس لیے کہانی کے اندر گھسنے دیا تھا کہ بس وہی تو تھا جو دتے کو آدمی سمجھتا تھا۔ ہاں یہ بات الگ رہی کہ وہ ایسا صرف زیناں کی وجہ سے سمجھتا تھا۔

کہانی آخر تک پہنچتے پہنچتے بہت لطیف ہو جاتی ہے۔ باوا گم ہونے کی وہ خبر جو زیناں نے رجے کو سنائی تھی پورے گاؤں میں گونج گئی پھر لوگ اسے بھول گئے۔ آوی دہکتی رہی' گھگھو گھوڑے بنتے اور پکتے رہے حتیٰ کہ بہت سا وقت گزر گیا اور کہانی کے نیا موڑ کاٹنے کا مرحلہ آ گیا۔ 'بند مٹھی میں جگنو' میں کہانی نیا موڑ کاٹنے یا پھر یوں کہہ لیجئے کہ پلٹا کھانے کے لیے اتنے وقت کی ضرورت نہ تھی آناً فاناً سب کچھ ہو گیا تھا مگر یہاں کہانی نے لمبا موڑ کاٹا ہے دھیرے دھیرے آگے بڑھی ہے حتیٰ کہ ان کے گھر کے آنگن میں ایک ننھا سا شرینہہ اُگ آتا ہے۔ شرینہہ نہ کہیں ایک نئی امید کہیں۔ ایسی

اُمید جس نے زیناں کے بیمار بدن کو توانا کر دیا تھا۔ اب وہ دتے کو بھی حوصلہ پکڑنے کو کہہ رہی تھی اور دتا اس سے حیران ہو کر پوچھ رہا تھا" تمہیں یقین ہے وہ باوا میں نے ہی بنایا تھا۔ زیناں کا جواب تھا:

"ہاں مجھے یقین ہے کہ پورے گاؤں میں ایک ہی ایسا آدمی ہے جو ان چیزوں سے محبت کر سکتا ہے جو اُس نے نہ بنائی ہوں۔"

کہانی یہاں ایک اور سمت کو جست لگاتی ہے۔ اور یہ سمت بھی جنس کے حوالے ہی سے بامعنی بنتی ہے۔ قاری کو اس سمت لے جانے کے لیے کہانی کے اس حصے میں رتوں کے بدلنے کا تذکرہ ہوا ہے' بادلوں کے امنڈ امنڈ کر برسنے' سیلاب آنے اور کلرا ٹھی زمینوں پر سبزہ اگ آنے کی بات ہوئی ہے اور اس خدشے کو بھی متن کا حصہ بنا دیا گیا ہے کہ شرینہہ کا بیج زیناں کی کھاری' چنگیر یا جوتے کے تلوے سے چپک کر گھر میں آ گیا ہوگا۔ بیج کہیں سے بھی آ سکتا تھا اور یہ واقعہ تھا کہ امید کا بیج ان کے گھر میں آ گیا تھا اور اُگ بھی گیا تھا۔ جب کہ زیناں کو یقین تھا کہ ایک دتا ہی تھا جو اپنی نہ بنائی ہوئی چیزوں سے بھی محبت کر سکتا تھا۔ واہ' واہ' واہ۔ رک جایئے صاحب رک جایئے' یہاں رک جایئے کہ مجھے دل کھول کر' بھولپن سے کہانی بننے والے منشایاد کی فنکارانہ عیاری اور چالاکی کی داد دینا ہے۔ اور کہنے دیجئے کہ جو افسانہ نگار ایسی عیاری اور مکاری متن میں نہیں رکھ سکتے انہیں جنسی نفسیات کے افسانے لکھنے کا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ مگر یہ بات ان جنس نگاروں کو کیوں کر سمجھ آئے گی جو اس جذبے کے تلذذ سے اپنے اعصاب بھی توڑتے ہیں اور اپنے قاری کا جی کچا کرنے کے اتنے حیلے کرتے ہیں کہ انہیں پڑھتے ہوئے متلی آ جاتی ہے۔

اور اب تھوڑا سا وقت "جیکو پچھے" کے ساتھ۔ منشایاد اگر چاہتا تو اس افسانے کا عنوان پنجابی کی بجائے اردو میں یوں بھی رکھ سکتا تھا " اگر کوئی پوچھے" مگر صاحب وہ ایسا کیوں کرتا کہ اس طرح تو پورا افسانہ اس تہذیبی روایت سے کٹ جاتا جس روایت میں یہ سوال زندگی کی تفہیم کا استعارہ بنتا ہے۔

"جے کو پچھے' تو بندہ کس دا ہیں؟' توں آکھ جی' اللہ تعالیٰ دا۔"

تو یہ جو اللہ کی مخلوق ہے اس میں سے منشایاد کی نظر انتخاب' اس کہانی کے لیے' خواب دیکھنے والی اس لڑکی پر پڑی ہے جو پڑھائی کے بعد بی بی جی کے گھر کا کام کاج کر دیا کرتی تھی۔ اور ایک روز یوں ہوا تھا کہ بی بی جی نے جاتے ہوئے اس لڑکی کو کچھ پرانے کپڑے بھی دے دیئے تھے۔ ان کپڑوں میں زہرہ مہرہ رنگ کا ایک مردانہ کرتہ بھی تھا۔ یہ کرتا اس نے خود مانگا تھا اور بی بی جی نے کہا تھا' ہاں لے جاؤ تمہارا بھائی پہن لے گا۔ منشایاد کی کہانیوں کی یہ خوبی مجھے بہت بھاتی ہے کہ وہ منظر نگاری کے لیے لمبا چوڑا تردد نہیں کرتا چپکے سے سارا ماحول قاری کی آنکھوں اور دل پر کھول دیتا ہے۔ اس کہانی کا منظر نامہ بھی قاری پر عین آغاز ہی میں پوری طرح کھل جاتا ہے بلکہ کہنے دیجئے کہ ابتداء ہی سے وہ اس لڑکی کے ساتھ ہو لیتا ہے جو بی بی جی سے مردانہ کرتہ لے کر اپنے گھر پہنچی اور اسے دھونے بیٹھی تو اس کے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی تھی۔ یہی بجلی قاری کے بدن میں بھی دوڑتی ہے اور وہ چوکنا ہو کر کہانی میں معنی کے رمزی بہاؤ پر توجہ مرکوز کر دیتا ہے۔

"جے کو پچھے ایہہ خزانہ کتھوں لبھا؟' توں آکھ جی' بی بی جی دتا"

لڑکی کی ماں جو بی بی جی کی اس فیاضی پر انہیں ڈھیروں دعائیں دے رہی تھی بیٹی کے اصرار پر یہ مردانہ کرتہ سلوا کر بیٹی کو پہن لینے کی اجازت دے دیتی ہے۔ کرتہ دھوتے ہوئے جس کے بدن میں بجلی دوڑتی تھی' اسے پہن کر اس پر کیا بیتتی ہوگی اس کا اندازہ خود لگا لیجئے۔ یہ کرتہ' جس کی اترن ہے وہ بہت جلد شہر سے آ کر اس کہانی میں نمودار ہوتا ہے۔ بی بی جی کا

بیٹا' جس کے کپڑے دھونے میں اس لڑکی کو بہت مزا آتا ہے۔ وہ بی بی جی سے سبق لینے آتی تھی اور ان کے کام کاج کرنے کے لیے رک جایا کرتی تھی۔ جب ان کا بیٹا آتا تو وہ اور بھی دیر تک دوسرے کاموں یا پھر کپڑے دھونے میں مصروف رہتی۔

"وہ ان کپڑوں پر صابن رگڑتی تو اسے لگتا وہ خود بھی کھرنے لگی ہے۔ لذت کی جھاگ سے اس کے ہاتھ لتھڑ جاتے۔ کپڑوں کو دھو اور نچوڑ کر رسی پر لٹکاتی تو اسے لگتا اس کی اپنی روح کا میل بھی اُتر گیا ہے اور وہ دھل کر نکھر گئی ہے۔ سب کچھ اجلا اجلا اچھا لگنے لگتا۔"

جی آگے بڑھنے سے پہلے میں دو عدد لمحات آپ کی یادداشت پر چپکانا چاہتا ہوں۔ پہلا وہ لمحہ جب "بند مٹھی میں جگنو" کی شہری لڑکی آخری سیڑھی پر بیٹھی اس کیفیت کو پہنچی تھی جس میں اس کے گال تمتما اُٹھے تھے اس کا بدن ہلکا ہو کر فضا میں اوپر اُٹھتا جا رہا تھا۔ دوسرا وہ لمحہ جب "پانی میں گھرا ہوا پانی" کی زیناں کی چیخیں اور دتے کے گھر چلم کے لیے جلائے گئے اپلوں کا دھواں ایک ساتھ بلند ہوا تھا۔ اور شاید یہ یاد کرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ پہلی صورت میں شہری لڑکی کے گال فحش گالیاں سن کر اور مستور اعضاء کے برسر عام نام لئے جانے پر دہکنے لگے تھے جب کہ زیناں یہ سوچ کر ہلکی پھلکی اور ٹھیک ٹھاک ہو گئی تھی کہ اس کا دتا ان چیزوں سے محبت کر سکتا تھا جو اس نے نہ بنائی ہوں۔ یوں اس سے یہ سہولت یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ عمومی زندگی کا منفی رویہ ایک سطح پر جا کر مثبت ہو جاتا ہے اور یہی سماجی سطح پر قابل گرفت رویہ جنسی آسودگی کا ذریعہ ہو کر فرد کو اندر سے مستحکم کر سکتا ہے۔ لگ بھگ آسودگی اور لطف کی اسی کیفیت کو پہنچی ہوئی اس افسانے میں بی بی جی کی شاگرد پر یہ لمحہ بہت جلد بیت گیا۔ محبت سے اس کی پیشانی چومنے والی بی بی جی نہیں جانتی تھی کہ اس کے اندر کیسا تنور دہک رہا تھا:

"جے کو پچھے تیرے اندر کیہ اے؟ تو آکھ جی' تنور"

بی بی جی کے ہاں ان کے بیٹے کی شادی کی تیاریاں تھیں اور وہ اس سب سے بے تعلق کر دی گئی تھی۔ اس کے لیے وہاں کوئی کام نہ تھا' یا جو کام تھا وہ ختم ہو گیا تھا لہٰذا اس نے جو تصور باندھے اس کی گھگھی بندھ جانے پر ختم ہوئے اور جو گماں قائم کئے' بی بی جی کے جواب دیتے ہی ڈھ گئے۔ اب وہ یوں تھی کہ اس کے سامنے کچھ بھی نہیں تھا اور اتنی حیرتیں تھیں کہ جن سے اس کی بکل بھر گئی تھی۔

جے کو پچھے اس کہانی چ کیہ اے' تو آکھ جی' حیاتی دیاں رمزاں...... تے انہاں رمزاں دیاں رمزاں...... تے رمزاں وچ چھپیاں حیرتاں' تے حیرتاں حیرانیاں وچ چھپیاں ہوئیاں ہور رمزاں۔

"جیکو پچھے" کے آخر تک پہنچتے پہنچتے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ رگڑ رگڑ کر کپڑے دھونے اور مردانہ کرتہ پہننے والی لڑکی کے جذبات کو جنس کی نفسیات سے جوڑا جائے یا ان جذبات کو اسی کے ہاتھ میں جھاگ ہو جانے والے صابن سے دھل جانے والی صاف ستھری محبت مان لیا جائے' یہ جانتے بوجھتے کہ لڑکی راتوں کو اپنی سیڑھیوں پر بی بی جی کے بیٹے کے قدموں کی آہٹیں سنتی تھی اور چپ چاپ لیٹے ہوئے اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ دیر تک چادر کے کونے کو پکڑ کر کھینچتا اور ستاتا تھا' تاہم "تیرہواں کھمبا" "سارنگی" اور "نظر آ لباس مجاز میں" جیسے دیگر افسانے عورت اور مرد کے تعلق کے افسانے ہوتے ہوئے بھی جنس کے موٹیف کو کہیں بہت نیچے دبا دیتے ہیں اور اجلی محبت کا ایک نیا روپ ہر بار جھلک دے جاتا ہے۔ "سزا اور بڑھا دی" اپنی ٹریٹمنٹ کے اعتبار سے بہت چست کہانی ہے اس میں بے وفائی کی صورت میں جنس اپنا کام دکھاتی ہے اور عمر بھر کا پچھتاوا بن جاتی ہے مگر میں اسے بھی جنسی نفسیات کے خانے میں اس لیے نہیں ڈال سکتا کہ افسانہ نگار نے ان لمحوں کو' کہ جب صباحت جنسی طور پر پھسلی اور بے وفائی کی مرتکب ہو رہی تھی' کہانی کے اندر مخفی رکھ چھوڑا ہے۔

کچھ اسی طرح کا معاملہ ''کچی پکی قبریں'' جیسے اپنے اپنے موضوعات کے کامیاب افسانوں کا بھی ہے انہیں بھی جنسی نفسیات والی کہانیوں میں رکھنا مشکل ہو جاتا ہے اس کے باوصف کہ ان میں اس طرح کے مقامات بھی آتے رہتے ہیں:

''...... وہ ایک ایک کر کے کپڑے اتارتی اور نہر کے سبز رنگ پانی میں نہانے کے لیے اترتی ہے۔ وہ کالو اور ڈبو کو منہ دوسری طرف کر لینے کی ہدایت کرتا ہے لیکن خود آنکھیں پھاڑے نہر کے اس پار اسے پانی میں اترتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے۔ وہ سنہری مچھلی کی طرح تیرتی ہوئی نہر کے وسط میں آ جاتی ہے اور اپنا عریاں بدن چھپانے کے لیے غوطہ لگا کر تہہ میں چلی جاتی ہے۔ اور وہ اس کے اوپر آنے کا انتظار کرتا رہتا ہے۔''

یہ اقتباس منشا یاد کے مقبول افسانے ''کچی پکی قبریں'' کا ہے۔ نہر میں غوطہ لگانے والی نوراں ہے چوہدری بخشے کی خوب صورت بیٹی۔ یہ جب سے جوان ہوئی ہے گاؤں بھر کے گبھروؤں کا کام کاج میں جی نہیں لگتا۔ سب کا دھیان اسی کی طرف لگا ہوا ہے اور ان کی بنسریوں اور لبوں پر دردیلی دھنیں' ماہیئے ٹپے اور گیت ہیں۔ کوڈو جو قبرستان کی ایک جھونپڑی اور افلاس میں پلا بڑھا ہے ان سب نوجوان عاشقوں سے اس لیے خوش نصیب ہے کہ وہ چوہدری بخشے کی حویلی پر روزانہ بھیک مانگنے جاتا ہے تو اسے نوراں کا دیدار نصیب ہوتا رہتا ہے۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ جب وہ ساوی چڑھالیتا ہے تو اس کے عریاں نہر میں اترنے کا نظارہ بھی کر لیتا ہے۔ جو کوڈو دیکھتا تھا' کچھ نہ تھا فقط وہم تھا اور بہکا ہوا دھیان نظر کا دھوکا ہو جاتا تھا۔ اس کے باوجود کہ یہ ایک کامیاب افسانہ ہے' اسی دھیان دھوکے کے سبب اسے جنسی نفسیات کا افسانہ نہیں کہا جا سکتا تاہم ''نظر کا دھوکا'' اور ''ساجھے کا کھیت'' جیسے افسانوں کو جنسی موٹیف کے کامیاب اور قابل ذکر افسانوں کی ذیل میں رکھا جائے گا۔ لہٰذا اجازت صاحب کہ دو اڑھائی باتیں ان افسانوں کے باب میں:

جی' تو پہلے ''ساجھے کا کھیت''۔ یہ کہانی بھی ہمارے ہاں کے محترم رشتوں کے درمیان سے جنسی حسیت کی طرف آتی ہے۔ ''نظر کا دھوکا'' جس کی طرف میں بعد میں آؤں گا' میں ماں اور بیٹی کا رشتہ مستحکم ہے مگر افسانہ ''ساجھے کا کھیت'' میں' اس رشتے میں بھی دراڑیں پڑی ہوئی ہیں تاہم دونوں افسانوں میں' جہاں اس معاشرتی بگاڑ کا سبب پیسہ اور جنس بنتی ہے وہی مرد کا مکروہ کردار بھی سامنے آتا ہے' اتنا مکروہ کہ ان کرداروں سے نفرت یقینی ہو جاتی ہے۔ ''ساجھے کا کھیت'' میں کہانی کے نقوش یوں بنتے ہیں (معذرت کہ کہانی کا خاکہ آپ کو منشا کی نثر کے رس کے بغیر پڑھنا پڑے گا):

۔ ایک مسکین سا آدمی ہے' موجو موچی۔ اتنا مفلس اور اتنا اکیلا کہ اس کے گھر میں چوہے بھی بھوکوں مرتے تھے۔ اس نے مختلف ہاتھوں میں بکتی ہوئی عورت تانی قسطوں میں خرید لی۔

۔ بیچنے والا تھا چوہدری شریف۔ اپنی رکھیل عورت بیچنا نہ چاہتا مگر مجبوری یہ آن پڑی تھی کہ اس کی بیوی اور برادری کا دباؤ اس پر بڑھ گیا تھا۔

۔ چوہدری شریف نے' اس خدشے کے پیش نظر کہ کہیں تانی بھوکوں نہ مر جائے یا پھر کسی کام کی نہ رہے' اسے جہیز میں کھیت حصے پر دے دیا تھا۔

۔ کھیت کا ایک حصہ موجو کے پاس تھا مگر زمین اتنی زرخیز نکلی کہ موجو کے بھاں بھاں کرتے خالی بھڑولے بھر گئے۔

۔ چوہدری شریف چوں کہ آدھے کا مالک تھا لہٰذا اس کا کھیت کو چکر لگتا رہتا تھا کہ کہیں موجو پورے کا ملک نہ بن بیٹھے۔

۔ تانی کی تین بیٹیاں ہوئیں بڑی منجھلی اور چھوٹی۔ جب وہ بڑی ہوئیں تو انہوں نے خوب رنگ روپ نکالا۔

۔ بہانے بہانے سے پہلے اس کے ہاں کھرلوں کا جواں بیٹا ادریس آیا اور پھر موجو کو یوں لگنے لگا جیسے شہر اور

گاؤں کے سارے اچھے اچھے لوگ اس کے گھر میں جمع ہو گئے تھے۔ یوں' جیسے وہ ایک پیر تھا اور سب اس کے مرید۔
۔ گویا موجو عزت دار ہو گیا تھا اور واقعہ یہ تھا کہ اس کے گھر معزز مہمانوں اور روپے پیسے کی فراوانی ہو گئی تھی۔ لڑکیاں شہر بھی جانے لگی تھیں۔

۔ کہانی میں چوہدری شریف دل گرفتہ ہوتے دکھایا گیا ہے۔ اسے کھرلوں کے بیٹے نے دھمکا کر ادھر آنے کو روک دیا تھا اور یہ بھی کہہ دیا گیا تھا کہ اگر وہ چاہے تو اپنی زمین واپس لے لے مگر اس نے آئندہ موسموں میں اچھی فصل کی امید پر زمین واپس لینا پسند نہ کی تھی۔

۔ اتنے سارے مال دار لوگوں اور جواں گھبروؤں کے مقابلے میں چوہدری شریف کی کوئی وقعت نہ تھی مگر وہ دست بردار نہ ہونا چاہتا تھا۔ آخر ایک روز تانی نے اس کی درخواست قبول کر لی اور اسے ملاقات کا وقت دے دیا۔

۔ تانی اسے اطمینان سے سنتی رہی اور پھر وہ بات کہی جسے ہو بہو درج کرنے کے لیے میں اوپر کہانی کی تلخیص کا کھیکھن کر آیا ہوں:

"تمہیں یاد ہے چودھری تم میرے ساتھ کیا سلوک کرتے تھے۔ کیسی کیسی غلیظ خواہشیں...... اور کیسے رکھتے تھے مجھے۔ جیسے میں عورت نہیں کتیا تھی۔ چودھری میں بھی کسی کی بیٹی تھی مگر تم نے اور تمہارے جیسوں نے میرے ساتھ جو سلوک کیا وہ تمہیں معلوم ہے۔ میں تو بڑی معصوم اور پاک تھی۔ صرف کمزور اور غریب تھی۔ گھر سے اپلوں کے لیے گوبر جمع کرنے کو نکلی تھی' تم لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی اور مجھے گوبر سے بھی بدتر چیز بنا دیا گیا۔ اور تمہیں منجھلی کا نام لیتے ہوئے شرم آنی چاہیے' وہ تمہاری بیٹی ہے۔ بڑی ساتھ والے گاؤں کے ذیلدار کی اور چھوٹی کا مجھے خود صحیح اندازہ نہیں' تمہاری ہے یا کس کی۔ مگر دیکھو میں نے چودھریوں' ذیلداروں کی بیٹیوں کو کتنے اچھے طریقے سے رکھا ہوا ہے"

افسانے میں بتایا گیا ہے کہ تانی کی یہ بات سن کر کچھ دیر سناٹا رہا اور پھر جب چودھری شریف نے موجو کی بابت سوال کیا تو تانی نے کہا تھا:

"اس بیچارے کا کیا ہے؟ وہ تو میرا نوکر اور تمہارا مزارع ہے' سب کچھ میرے ہاتھ میں ہے' اس کے اپنے پاس تو آج بھی بیج کے پیسے نہیں ہیں۔"

کہانی اس کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔ مگر ختم کہاں ہوتی ہے صاحب' چوہدریوں اور ذیلداروں کے اس سماج میں موجو بن جانے والے بے چاروں کی مسکین صورتیں نظر کے سامنے سے ایک ایک کر کے گزارنا شروع کر دیتی ہے۔

اس ضمن کی دوسری کہانی ہے "نظر کا دھوکا"۔ اب یہ بات کیا دہرانا لازم ہے کہ منشا یاد کے ہاں افسانوں میں زمین پر کیڑے مکوڑوں کی طرح زندگی بسر کرنے والے گرے پڑے انسانوں کی کہانیاں بڑی تعداد میں مل جاتی ہیں۔ میلے ٹھیلے بھی اس کا محبوب موضوع ہیں اور سچ پوچھئے تو دیہی زندگی کے انہی مظاہر نے اس کے افسانوں میں ایک جادو' عجب اور بھید سا رکھ دیا ہے۔ "نظر کا دھوکا" بھی اسی دیہی زندگی اور میلے ٹھیلے کی فضا سے پھوٹا ہے۔ کہانی کی لڑکی شیداں' اس کی ماں کے بیان کے مطابق بڑی ہو چکی تھی۔ اتنی بڑی کہ اسے بیٹی کو کھیل دکھانے کے لیے میلے پر بھیجتے ہوئے ہول آنے لگے ہیں ۔ مگر شیداں کے باپ اور بھائی کو لڑکی کی نہیں لومڑی کی فکر تھی کہ لڑکی گھر کی تھی اور لومڑی کرائے پر بھی نہ مل رہی تھی۔ شیداں اپنے باپ اور بھائی کو اس مشکل میں پا کر بہت خوش تھی کہ اُسے اس سال تماشا نہیں بننا پڑے گا۔

"وہ برسوں سے تماشا بن رہی تھی۔ اس کے چہرے کے ساتھ کئی طرح کے دھڑ لگتے رہے تھے' کبھی ناگن کا'

کبھی بکری کا' اور کبھی لومڑی کا۔ ایک ہی پوز میں پہروں بیٹھے بیٹھے اس کی کمر دُکھنے لگتی۔ ٹانگیں شل ہو جاتیں۔"

حیف کہ اس کی خوشی بہت جلد ختم ہو گئی' ابھی میلے کو تین چار روز رہتے تھے کہ ابا منہ مانگے دام دے کر لومڑی خرید لایا۔ ماں اپنے خاوند اور بیٹے کو روکتے' ان کو غیرت دلاتے' بلکتے جھکتے نڈھال ہو گئی مگر باپ بیٹا "نظر کا دھوکا" دکھانے شیداں اور لومڑی کو لے کر میلے میں پہنچ گئے۔ منشا یاد نے یہاں تک پہنچتے پہنچتے اپنے پر لطف بیانیے اور جزرسی سے اپنے قاری کے اردگرد ایک بھرپور میلہ بسا دیا ہے۔ وہی میلہ جس میں بے پناہ حبس اور گرمی تھی' ہر کہیں لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے تھے مگر لومڑی عورت کے انکلوژر کی طرف اکا دکا لوگ ہی آ رہے تھے' باقی سارا وقت انکلوژر خالی پڑا رہتا' اتنا خالی کہ باپ بیٹے کو لومڑی پر لگی ہوئی رقم ڈوبتی نظر آنے لگی تھی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں کہانی پلٹا کھاتی ہے۔ منشا یاد نے اس پلٹے کے لیے بڑی مہارت سے متن تشکیل دیا ہے:

"سہ پہر کے قریب جب حبس بڑھ گیا تھا اور سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا ٹکٹ تیزی سے بکنے لگے۔ اور پھر اس میں برابر اضافہ ہوتا چلا گیا۔ پہلے تو وہ بہت خوش ہوا مگر پھر یہ دیکھ کر چونکا کہ اندر جانے والے باہر آنے کا نام نہیں لیتے اور جن کو رش کی وجہ سے فیکا باہر نکلنے پر مجبور کر دیتا ہے وہ نیا ٹکٹ خرید کر اندر آ جاتے ہیں۔"

اس مقام پر شیداں کے بھائی کا مکرہ چہرہ دکھایا گیا ہے جو باپ کے پوچھنے پر رش بڑھنے کی وجہ نہیں بتاتا' معنی خیز ہنسی ہنس سارا معاملہ پی جاتا ہے۔ مچان پر بیٹھے ٹکٹ بیچتے باپ کو کرید ہوئی' وہ اترا اور خود دیکھنے اندر تماشائیوں کے پاس پہنچ گیا۔ پھر جو دیکھا اس کے اوسان خطا کرنے کے لیے کافی تھا:

"پردہ سرک جانے کی وجہ سے لومڑی کے ساتھ ساتھ لڑکی کا اوپر کا دھڑ بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ پہلے تو اسے شبہ ہوا کہ وہ تماشائیوں ہی سے نہیں کرتے سے بھی بے نیاز ہو کر بیٹھی ہے مگر پھر فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ باریک کرتہ بھیگ کر اس کے جسم سے چپک گیا اور جلد کی رنگت اختیار کر گیا ہے۔"

دوسرے معنوں میں یوں کہیں' وہ ننگی ہو گئی تھی اور لوگ لومڑی عورت کا تماشا نہیں دیکھ رہے تھے ایک ایسی ننگی لڑکی کو دیکھ رہے تھے جس کے جوان ہونے پر اس کی ماں کو ہول آنے لگے تھے۔ یہی ہے وہ نظر کا دھوکہ جو افسانہ نگار ہمیں دکھانا چاہتا تھا رزق کے حصول اور فن کے نام پر آج کی عورت ننگی ہو رہی ہے۔ جس عورت کو لومڑی جیسا چالاک بنا بنا کر دکھایا جاتا ہے وہ اتنی چالاک ہے نہیں' تبھی تو نظر باز مردوں کا تماشا بنتی ہے اور ہر بار رسوا ہوتی ہے۔ کہانی آخری جملوں میں پہنچ کر تہذیبی اور اخلاقی اقدار سے دامن گریز اں معاشرے کے رخسار پر طمانچہ ہو جاتی ہے۔ بے غیرتی سے ہنستے بھائی کا چہرہ تو آپ نے دیکھ ہی لیا اب ذرا پیسے بٹورنے والے باپ کا روپ بھی دیکھ لیں جو میری نظر میں 'مارکیٹ اکانومی' والی جدید ترین سوچ اور مالی آسودگی کے لیے 'روشن خیالی' کا نعرہ لگانے والی بیمار ذہنیت کا مظہر کردار بن گیا ہے:

"اسے فیکے پر غصہ آیا۔ وہ جلدی سے واپس اپنی جگہ پر آیا کہ فیکے کو ڈانٹ کر پردہ ٹھیک کرنے کو کہے اور خود شو بند کرنے کا اعلان کرے مگر پھر اس کی نظر تماشائیوں کی لمبی قطار پر پڑی اور وہ جلدی جلدی ٹکٹیں بیچنے لگ گیا۔"

وہ پردہ جو باپ اور بھائی نے برابر کرنا تھا' برابر نہ ہوا تو لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی بہت یاد آئے' کیوں؟ میں نہیں جانتا' اور ان کا یہ شعر بھی ذہن میں گونجنے لگا ہے حالاں کہ بظاہر یہاں اس کا کوئی محل نہیں ہے:

پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

لائن لگی ہوئی ہے، لمبی لائن ...... ٹکٹ بک رہے ہیں اور دھڑ ادھڑ بک رہے ہیں۔ اکبر نے بہت عرصہ پہلے جس نئی تہذیب کے انڈوں کو گندا کہا اور انہیں اٹھا باہر پھینکنے کا مشورہ دیا تھا وہ تہذیب اب انفارمیشن ٹیکنالوجی اور مارکیٹ اکانومی کی چہیتی ہو کر ہر کہیں یوں دندنا رہی ہے کہ انسانیت، تہذیبی اقدار اور رشتے ناطے، سب ہی کچھ متروک ہو گیا ہے...... کہیئے صاحب، کیا بدلتے ہوئے تناظر میں یہی نظر کا دھوکا نہیں ہے؟۔

لیجئے، اس موضوع کے ضمن میں، مجھے منشا یاد کے جن افسانوں کی طرف اشارے کرنے تھے، کر دیئے ہیں اور اب ان نشتروں کی سمت نگاہ اٹھتی ہے جو اس جنسی حسیت کی جراحی میں کام آئے۔ یہ تعداد میں شاعری کے بہتر نشتر نہ سہی مگر اتنے کم اور اتنے غیر اہم بھی نہیں ہیں کہ ادھر کو دیکھا ہی نہ جائے۔ ویسے آپس کی بات ہے شاعری کے بہتر نشتر گننے نکلو تو گنتی ہاتھ کی دو انگلیوں سے آگے نہیں چلتی۔ جی تو میں یہ فہرست یوں بنا پایا ہوں۔

☆...... شہری اور دیہی زندگی کا تفاوت: ایسا زیرِ نظر موضوع کے بس ایک آدھ افسانے میں ہوا۔ تاہم منشا یاد نے دیگر موضوعات کے افسانوں میں بھی یہ حربہ کامیابی سے استعمال کیا ہے۔

☆...... دیہی زندگی کے اندر سے پھوٹتے مناظر اور مظاہر: ایسا ہم سب افسانوں میں دیکھ آئے ہیں۔

☆...... زبان کا فن کارانہ اور دوہری سطح پر استعمال: لگ بھگ ہر افسانے کے متن میں معنیاتی سطح پر لہریں بھنور اور مسلسل بہاؤ ملتا ہے۔

☆...... روزمروں، کہاوتوں، ماہیوں، ٹپوں اور دیہی دانش کے ذریعے معنوی دبازت کا لتزام اور اس کا اہتمام کہ یہ سب اوپر سے چپکا ہوا نہ لگے متن میں تحلیل ہو جائے۔

☆...... یکسانیت، اکتاہٹ اور کسالت منشا یاد کے خاص حربے بنتے ہیں۔ جنسی حسیت کی تعمیر تطہیر اور تعمیر کے علاوہ دیگر افسانوں میں بھی انہیں کامیابی سے استعمال میں لایا گیا ہے۔

☆...... تخلیقی اور تیکنیکی دونوں سطح پر چوکس رہ کر بیانیے کی تعمیر، کہیں تصویریں بنتی ہیں، کہیں شعور کی رو متحرک ہوتی ہے، کہیں مکالمہ چلتا ہے، کہیں مونولاگ ہے اور کہیں ان سب عناصر کی چاپ اور دھندلکا، جس کے اندر سے کہانی کے کامل استعارے یا متن سے مربوط علامتیں پھوٹتی ہیں۔

☆...... کہانی کی تعمیر کا مرحلہ وار اور نفیس التزام مگر یوں کہ نہ تو منصوبہ بندی نظر آتی ہے اور نہ ہی پڑھتے ہوئے چونکاتی ہے بلکہ لگتا ہے کہ عمومی زندگی میں بھی یوں ہی ہوتا ہے، ہوسکتا ہے یا پھر ہونا چاہیے۔

☆...... صورتحال کے بیان میں کچھ exaggeration اور magnification تاہم یہ کیفیت کائی کا پہاڑ یا پنکھ کا پکھیرو نہیں بناتی بلکہ ڈرامے کا وہ hyperbole بناتی ہے جس میں کہانی کا تنازع اور تناظر گونج پیدا کر کے ادبی ہال کی آخری نشست پر براجماں قاری تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ ☆...... کہانی میں کم از کم معنیاتی سطح پر ایک اور کہانی کا التزام۔ یہی سبب ہے کہ چنے گئے افسانوں کو ہم محض جنسی نفسیات کے مطالعے قرار نہیں دے سکتے۔ بات الجھ رہی ہے لہذا دو مثالیں دوں گا۔

ا۔ افسانہ ''بند مٹھی میں جگنو'' ...... کہانی میں بظاہر شہری لڑکی کا باطن کھنگالا جا رہا ہے مگر جب ایک باوقار نظر آنے والا شخص، کمی کمین ہونے کی وجہ سے آپس میں الجھتی اور لڑتی بھڑتی عورتوں کی صلح میں ناکام ہو جاتا ہے اور ایک مریل سے شخص کی فحش گالیاں اس لیے کامیاب ہو جاتی ہیں کہ وہ گاؤں کی دوتہائی زمین کا مالک ہے تو کہانی معاشرے کے کھوکھلے

پن کو بھی کھول کر رکھ دیتی ہے۔

۲۔اسی طرح افسانہ ''پانی میں گھرا ہوا پانی''......نشاندھی ہو چکی کہ زیناں ایک بھینس اور ایک گدھی کے عوض دتے کے گھر آئی تھی اور اس سانحے نے دونوں کے بیچ جنسی سطح پر عدم شراکت کے علاوہ بھی معنی کا دائرہ بنا دیا ہے۔

ذرا چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہیئے کہ کیا دل سے آہ نہیں نکلتی اور کیا اسے انسانوں کا معاشرہ کہا جا سکتا ہے جو کام کرنے والے کو کمی سمجھے اور کمین کہے۔ مادی حیثیت اور طاقت کو تو دیکھے مگر انسان اور انسانیت کو نہ دیکھے۔ یہی وہ دوسری سطح پر موجود معنیاتی نظام ہے جو لگ بھگ منشایاد کی ہر کہانی اپنے ذہین قاری کے لیے متن میں نہاں رکھے ہوئے ہوتی ہے۔

☆......سماجی اقدار کی پابندی' احترام' یا پھر انہیں روندنے کچلنے اور جان بوجھ کر نظر انداز کرنے سے احتراز۔ یوں کہہ لیں کہ منشایاد کی کہانیوں کا دیدہ سفید نہیں ہوا۔ اس نے ارنڈی کا تیل دے کر کہانی کے بطن سے غیرت نہیں بہائی' اور اس کی آنکھوں کا پانی سلامت رہنے دیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس کے کردار جنسی سطح پر اتنے عملی اور فعال نہیں جتنے نفسیاتی اور حسیاتی سطح پر ہیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہ جنس کو برتتے ہوئے کہیں بھی لذت اخذ نہیں کرتا' پٹھوں کو بھینچنے اور اعصاب کو تانت دینے کے جتن نہیں کرتا......' اور...... میں قلم روک رہا ہوں کہ لگتا ہے صاحب اس باب میں گنتی سچ مچ بہتر کو جا پہنچے گی۔

اب فوراً ہی مجھے رخصت ہونا ہے......اپنی بات ادھوری چھوڑ کر...... کہ من بہت کچھ کہنے کا تقاضا کئے جاتا ہے 'جب کہ بات پہلے ہی بہت طول کھینچ چکی ہے۔ تاہم آخر میں' یہ بتائے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں جب بھی اور جہاں بھی عصمت چغتائی کے ''لحاف'' محمد حسن عسکری کے '' پھسلن'' سعادت حسن منٹو کے ''ٹھنڈا گوشت'' آغا بابر کے ''خالہ تاج'' رحمان مذنب کے ''پتلی جان'' ممتاز مفتی کے ''جھکی جھکی آنکھیں'' قدرت اللہ شہاب کے ''شلوار'' سلیم اختر کے ''جلے پاؤں کی بلی'' وغیرہ جیسے افسانوں کی بابت سوچتا رہا ہوں' منشایاد کے جنسی حسیت کے یہ افسانے بھی دھپ سے میرے دھیان کی چھت اُترتے رہے ہیں۔ یہ افسانے زیر نظر موضوع کے حوالے سے یوں بھی لائق اعتنا ہیں کہ صنفی اشتہا انگیزی میں طاق اور جنسی گمرہی سے لذت گیری کے حصول میں مگن نہ ہوتے ہوئے بھی یہ تخلیقی اور تیکنیکی سطح پر اتنے اہم ہو گئے ہیں کہ فکشن کا قاری ان سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔ منٹو نے احمد ندیم قاسمی کو ایک خط میں بتایا تھا کہ وہ جب بھی عشق و محبت کی بابت سوچتا تھا تو اسے شہوانیت ہی نظر آتی تھی۔ مگر منشایاد نے عورت کو شہوت سے الگ دیکھا ہے اور الگ کر کے دکھایا بھی ہے۔ یہیں محمد حسن عسکری کی ایک بات بھی یاد کر لیتے ہیں۔ فرماتے تھے: ''گندی سے گندی بات اچھا ادب بن سکتی ہے مگر جنسیت سے مغلوب ہو کر بڑا ادب پیدا نہیں کیا جا سکتا''۔ میں نہیں جانتا عسکری کی اس بات میں سچ کتنا ہے کہ کہنے والوں نے منٹو کو' لذت گیر' کہا مگر کون ہے جو اس کی کہانی کو بڑی کہانی نہیں کہے گا۔ یہ کچھ ایسی بات ہے جس پر سیدھا سادا فتویٰ کام نہیں آتا۔ کہانی کے اپنے بھید ہیں اور ان بھیدوں کے عقدے بہر حال منٹو پر پانی تھے۔ بعد میں جس نے منٹو کا سا وتیرہ اپنایا' وہ منہ کے بل گرا۔ منشایاد کی خوبی یہ ہے کہ اس نے اس باب میں بھی اپنی الگ راہ بنائی ہے۔ وہ کہیں بھی جنسیت سے مغلوب نہیں ہے......ہاں' وہ عسکری والی بات منشایاد کے حوالے سے ضرور بامعنی ہو جاتی ہے اور دل کو لگتی بھی ہے۔ اللہ حافظ' مگر یاد رکھیئے گا کہ یہ موضوع منشایاد کا صرف اور محض ضمنی حوالہ ہے۔

شاہ تراب علی قلندر اور ان کی اُردو شعری کائنات

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاؔد

شاہ تراب علی قلندر کا شمار اپنے عہد کے اربابِ فضل اور اصحابِ کمال میں ہوتا ہے۔ وہ تیرھویں صدی ہجری کے سربرآوردہ صوفی، عالم اور شاعر تھے۔ حیرت اس امر پر ہے کہ انھوں نے اُردو اور فارسی کے دو ضخیم اور قابلِ قدر دیوان، اُردو اور فارسی کی مثنویاں اور کئی کتبِ علمیہ یادگار چھوڑیں مگر ان کا تذکرہ خال خال ہوا؛ علما اور صوفیہ کے تذکروں میں اُن کے احوالِ حیات اور افکار و نظریات کا مختصر ذکر دیکھنے کو پھر بھی کہیں نہ کہیں مل جاتا ہے مگر اُردو کی بیش تر تاریخیں اور تذکرے اُن کے حالات و کمالاتِ شعر و ادب سے خالی نظر آتے ہیں۔ اُن کا اُردو دیوان ہندوستان کے مشہور طباعتی ادارے منشی نول کشور کے اہتمام سے کئی بار شائع ہوا اور اس کے نسخے یہاں وہاں مختلف کتب خانوں میں موجود رہے مگر اربابِ تحقیق کی نگاہ اس پر نہ پڑ سکی۔ جن تذکروں اور تاریخوں میں شاہ تراؔب کا ذکر ملتا ہے وہاں بھی نہایت سرسری اور اجمالی ہے۔ ان اجمالی تراجم سے اُن کی ہمہ رنگ شخصیت پوری طرح ظاہر نہیں ہوتی اور ان کے کمالاتِ شعر و ادب اور فضائلِ سلوک و تصوف پر کچھ روشنی نہیں پڑتی۔ اُردو کے چند تذکروں میں شاہ تراب کا جو اجمالی ذکر ہوا ہے، اس میں سے چند تراجم ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

سیّد محسن علی موسوی نے **تذکرۂ سراپا سخن** میں شاہ تراب کا تعارف یوں پیش کیا ہے:

''حضرت تراب علی شاہ تراؔب خلف اور سجادہ نشین حضرت شاہ کاظم علیہ الرحمۃ کے باشندۂ کاکوری توابع لکھنؤ، صاحبِ دیوان:

جو مال چاہے تو راضی رکھے امیر کا دل — کمال چاہے تو بس میں کرے فقیر کا دل
دلِ شکستۂ فقرا میں گھر ہے مولا کا — حقیر جانیو مت بندۂ حقیر کا دل
سمجھ کے زلفِ گرہ دار میں لگا کنگھی — کہ ہر گرہ میں پھنسا ہے ترے اسیر کا دل'' (۱)

سعادت خاں ناصر کے تذکرے **خوش معرکہ زیبا** میں شاہ تراؔب کا ذکر اس طرح آیا ہے:

''سرمایۂ توکل اسے دستیاب، تراب شاہ تخلص تراب، پسر شاہ کاظم۔ من کلامہٗ:

جب تیرا وصل ہو وہی ساعت سعید ہے — جس دن گلے لگے تو وہی روزِ عید ہے
رات اُس نے سُن کے میری کہانی کہا تراب — یہ داستانِ تازہ، یہ قصہ جدید ہے

لوگ کہتے ہیں جنھیں آرامِ جاں — کھونے والے ہیں وہی آرام کے'' (۲)

گارسین دتاسی نے البتہ اپنی تاریخ میں قدرے زیادہ معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ وہ شاہ تراؔب کے ترجمے میں رقم طراز ہیں:

''وہ ایک پرہیزگار ہندوستانی شاعر تھے اور حضرت شاہ کاظم کے بیٹے اور سجادہ نشین تھے۔ تراؔب

لکھنؤ کے قریب کاکوری میں پیدا ہوئے لیکن دہلی اور بعدازاں کلکتہ میں مقیم رہے۔ جن دنوں باطن اپنا تذکرہ لکھ رہے تھے، تراب کی عمر تقریباً پچاس سال تھی۔ اکرام علی خان ان کے بھائی تھے جن کا ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ تراب کا انتقال ۱۲۳۵ھ/۲۰-۱۸۱۹ء میں ہوا ہے۔ انھوں نے بڑے شگفتہ متصوفانہ اشعار کہے ہیں جو کلیات کی شکل میں مرتب کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب کان پور سے ۱۸۶۴ء میں چھوٹی تقطیع کے ۳۵۰ صفحات پر شائع ہوئی ہے۔ اس کے ہر صفحے میں ۱۹ سطریں ہیں۔'' (۳)

شاہ تراب کے سالِ وصال کے علاوہ گارسین دتاسی کی فراہم کردہ معلومات درست ہیں۔ شاہ تراب کا سالِ وصال ۱۲۳۵ھ نہیں بلکہ ۱۲۷۵ھ ہے، تفصیل آگے آتی ہے۔

میرزا کلب حسین خاں نادر نے **تذکرۂ نادر** میں ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''شاہ تراب علی ولد شاہ کاظم قدس سرہ سجادہ نشین کاکوری:

مل گیا اغیار سے مجھ سے جدائی کر گیا — بے وفا تھا تب تو ایسی بے وفائی کر گیا

کوئی اس نا آشنا سے آشنائی کیا کرے — آشنا سے اپنے جو ناآشنائی کر گیا

آنکھ اوروں سے لڑائی، پھیر لی مجھ سے نگاہ — صلح جا دشمن سے کی مجھ سے لڑائی کر گیا

ہم نہیں کرنے کے اس کی خیر خواہی میں قصور — کیا ہوا گر ہم سے وہ ظالم بُرائی کر گیا

جیتے جی تو وہ کبھی دل سے نہ بھولیں گے تراب — چلتے چلتے یار جو مجھ سے رکھائی کر گیا (۴)

شاہ تراب علی قلندر ۱۱۸۱ھ بہ مطابق ۶۸-۱۷۶۷ء میں کاکوری میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والدِ گرامی شیخ محمد کاظم علوی کاکوروی [پ: ۱۱۵۸ھ] اپنے وقت کے معروف عالم، صوفی اور عارف تھے۔ صاحب نزہتہ الخواطر کے بہ قول ان کا تعلق شیخ نظام الدین بھیکہ کی نسل سے تھا۔ (۵) شاہ تراب کے والد مطالعے کے بہت شوقین تھے اور اکثر اکابر صوفیہ وعرفا کی کتبِ تصوف ان کے مطالعے میں رہتیں۔ وہ خود بھی بھاشا میں شاعری کرتے تھے۔ مجموع الابیاتان کے منتخب اشعار کا مجموعہ ہے؛ ان کی دیگر تصانیف میں نغمات الاسرار اور معمور داشتن اوقات شامل ہیں۔ شیخ محمد کاظم سلسلۂ قلندریہ میں سید باسط علی الٰہ آبادی کے دست گرفتہ اور خلیفۂ مجاز تھے۔ طریقۂ نقش بندیہ کی تعلیم انھوں نے شیخ احمدی بن محمد نعیم کرسوی سے حاصل کی۔ آپ کا وصال ۹ ربیع الثانی ۱۲۲۱ھ میں ہوا۔ (۶)

شاہ تراب علی قلندر نے عربی وفارسی کی تعلیم جن اساتذہ سے حاصل کی ان میں قدرت اللہ بلگرامی، معین الدین بنگالی، شیخ حمید الدین کاکوروی، قاضی نجم الدین اور مولانا فضل اللہ شامل ہیں۔ انھوں نے تصوف کی تعلیم اپنے والدِ گرامی شیخ محمد کاظم علوی کاکوروی سے حاصل کی۔ مولوی رحمان علی نے اپنی معروف تالیف تذکرۂ علمائے ہند میں انھیں علم وفضل کے باعث ''معدنِ تہذیب واخلاق'' قرار دیا ہے۔ (۷) شاہ تراب علی اپنے والد کے خلیفۂ مجاز اور جانشین تھے۔ والدِ گرامی کے علاوہ انھیں شیخ مسعود علی قلندر الٰہ آبادی اور دوسرے شیوخ سے بھی اجازت حاصل تھی۔

شاہ تراب علی فارسی، اُردو اور بھاشا کے قادر الکلام اور صاحبِ طرز شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی روحانی کیفیات اور عارفانہ واردات کو اشعار کے قالب میں ڈھال کر اہلِ ذوق کے قلوب واذہان کو منور اور معطر کیا۔ ان کی شاعری مجاز کے

پردے میں حقیقت کا اظہار یہ ہے۔ شاعری کے علاوہ انھوں نے کئی کتب بھی تصنیف کیں جن میں المقامات الصوفیہ، مطالبِ رشیدی، اصول المقصود، تعلیم الاسما، شرائط الوسائط اور اسناد المشیخہ شامل ہیں۔ شاہ تراب علی قلندر نے چورانوے سال کی طویل عمر پائی؛ ان کا وصال ۵ رجمادی الاوّل ۱۲۷۵ھ بہ مطابق ۱۸۵۸ء میں ہوا۔ (۸) ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے تعلیقاتِ تذکرۂ علمائے ہند میں ان کا قطعۂ تاریخِ انتقال یوں درج کیا ہے:

از وجودِ پاک آن قطبِ زمان
بر فلک گویا دماغِ ہند بود
نورِ او با نورِ حق واصل شدہ
سالِ تاریخش "چراغ ہند بود" (۹)

۱۲۷۵ھ

شاہ تراب علی قلندر نے اپنے والدِ گرامی کی مسندِ ارشاد سنبھالی تو قرب و جوار کے تشنگانِ حق کو معرفتِ الٰہیہ کا گویا چشمہ میسر آ گیا۔ خلقِ خدا اُن کی مجالس سے مستفید رہی اور اہلِ علم ان کے کلامِ معرفت نشان سے سلوک وتصوف کے موتی چنتے رہے۔ شاہ تراب فارسی اور اُردو کے قادر الکلام شاعر تھے۔ دونوں زبانوں میں ان کے کلیات ان کی قدرتِ کلام کے گواہ اور ان کی بلند فکری کے شاہدِ عادل ہیں۔ شاہ تراب کا اُردو کلیات معروف طباعتی ادارے نول کشور کے اہتمام سے کئی بار شائع ہوا۔ راقم کے پیشِ نظر کلیات کا جو نسخہ ہے وہ حضرت امیر مینائی کے شاگرد حامد علی خاں حامد (مصحح مطبع) کا تصحیح شدہ ہے جو پہلی بار ۱۸۹۲ء میں مطبعِ نامی نول کشور کان پور سے شائع ہوا۔ مصحح نسخہ حامد علی خاں حامد کلیات کے خاتمے پر رقم طراز ہیں:

"الحمد للہ والمنۃ کہ مجموعۂ نوادر وانتخاب المشہور بہ کلیاتِ شاہ تراب غفران مآب جس میں کتبِ ذیل شامل ہیں۔ اوّل دیوان جس میں ردیف وار غزلیں ایک سے ایک عمدہ مرقوم ہیں۔ ہر غزل مضامینِ توحید اور عرفان سے بھری ہے، بول چال سے لذتِ طریقت وحقیقت حاصل ہوتی ہے۔ دوسرے مثنوی عاشق وصنم کہ بہ ظاہر ایک افسانہ ہے مگر حقیقت میں حالِ حقیقت قالب مجاز میں جلوہ گر ہے۔ تیسرے ٹھمریوں کا رسالہ بھاشا زبان برج کی بولی کا قابلِ وجد ہے۔ چوتھے شجرۂ پیرانِ حضرت قادریہ چشتیہ وغیرہ بہ تنظیم نام پیرانِ طریقت بہ سلسلۂ مراتب بیعت الغرض یہ وہ مجموعۂ کثیر النفع ونادر الوجود ہے جس کی شان تعریف کی حدِ بیاں سے باہر ہے، لاریب کیوں نہ ہو کہ یہ کلامِ برکت نظام قدوۃ السالکین، زبدۃ العارفین، شمعِ بزمِ ارشاد، قطب ہمائے ہدایت، بدرِ سپہرِ حقیقت، غواصِ محیطِ طریقت، شاہِ اقلیمِ قناعت وعزلت گزینی حضرت شاہ تراب علی کاکوروی قدس سرہ ہے جو تمامی عالم کو مرغوب ہے سارے جہاں کا مطلوب ہے اور اس سے پیش تر یہ مجموعۂ نادر چند بار مطبع اودھ اخبار واقع لکھنؤ مملوکۂ مفتخرِ روزگار عالی جناب معلی القاب منشی نول کشور صاحب سی آئی ای دام اقبالہم میں چھپا اور اب حسبِ اصرار شائقینِ با تمکین شاخ مطبع موصوف واقع کانپور ماہ نومبر ۱۸۹۲ء میں بار اوّل طبع ہوا۔

قطعۂ تاریخِ طبع:

بحمد اللہ شد مطبوع حامد
کلامِ پیشوائے اہلِ عالم
بمنقوطہ نوشتم سالِ طبعش
مذاقِ مقتدائے اہلِ عالم (۱۰)

۱۳۱۰ھ

حضرت شاہ تراؔب کا تعلق لکھنؤ کی قریبی بستی کاکوری سے ہے مگر ان کا شعری مذاق لکھنؤ کے شعری مذاق سے بالکل الگ ہے۔ سلوک و معرفت کا رنگ ان کے کلام میں رچا بسا ہے، جس کی وجہ سے ان کی غزلیں، ٹھمریاں، مثنوی غرض سارا کلام عشق و مستی اور جذب و کیف کی پاکیزہ اور وجد آفریں فضا تخلیق کرتا ہے، غزلوں میں حقیقت و معرفت کا رنگ دیکھیے:

روح آ کے بدن میں ہوئی یوں اصل سے غافل
جس طرح مسافر کوئی بھولے وطن اپنا

☆

گر وہ نہ دکھاتا تو اسے دیکھتے کیا ہم
اس نور کو ہم نے تو اسی نور سے دیکھا

☆

ہستیِ حق کے سامنے ہیں نیست
دیکھ پڑتے ہیں جو بہ صورتِ ہست

☆

ہرگز ثبات ہستیِ موہوم کو نہیں
اک دم میں کالعدم ہے وجودِ حباب صاف

☆

تراؔب اُس کی تجلّی دیکھتا ہے
ہمیشہ دل کے اندر بے تکلف

☆

عرفانِ حق سے جس کی ہوئی ہے نظر بلند
ہفت آسمان پست ہیں اُس کی نگاہ میں

☆

تراؔب اُس کو نہ باہر آپ سے دیکھ
نہ آئے جو ترے وہم و گماں میں

☆

صورت پرست کہیے اُسے یا خدا پرست
صورت میں جس کو عین مصوّر کی دید ہے

☆

متصوفانہ رنگ اگرچہ ان کے دیوان کا غالب رنگ ہے مگر مجازی رنگ سے بھی صرفِ نظر نہیں کرتے۔ محبوبِ مجازی کا سراپا، اس کے عشوہ وغمزہ کا بیان، اس کی کج ادائی اور بے وفائی اور عاشق کا اضطراب وشوق جیسے موضوعات غزلوں میں جا بہ جا نظر آتے ہیں، یوں شاہ ترابؔ کی شاعری حقیقت سے مجاز اور مجاز سے حقیقت کی طرف رواں دواں رہتی ہے۔ مجازی رنگ کے چند اشعار دیکھیے:

عشق کی بات کس طرح ہو تمام
رات چھوٹی ہے اور کہانی بڑی

☆

رُخ کیا یار نے صحرا کی طرف بہرِ شکار
کیسے میدان میں وحشت زدہ آہو نکلے

☆

عشق میں گرچہ قیس ہے اُستاد
میرے نزدیک طفلِ مکتب ہے

☆

جب سے عالم ترا نظر آیا
اُٹھ گیا دل تمام عالم سے

☆

راہ و رسمِ وفا وہ کیا جانے
منتخب ہو جو بے وفائی میں

کلیات میں شامل رسالہ **ٹھمریاں شاہ ترابؔ** کی کیفیتِ باطن اوراحوالِ دروں کا آئینہ خانہ ہے۔ شاہ ترابؔ کی ٹھمریاں بھی ان کے عشق ہمہ رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ زبان وبیان کی چاشنی اورشوقِ بے پایاں کی جلوہ گری نے ان نغموں میں دل پذیری کے ایسے رنگ اجاگر کیے ہیں جن کی مثالیں کم کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ٹھمریوں میں سوز وگداز اور یادِ محبوب کی وارفتگی دیدنی ہے۔ ہجر وفراق کے موسم میں عاشق جن کیفیتوں سے دوچار ہوتا ہے، اس کا بیان ان ٹھمریوں کے رنگ رس میں اضافہ کرتا ہے۔ ٹھمریوں کا رنگ دیکھیے:

لگتے ہی ساون ماس سکھی ری — آئے پیا مورے پاس سکھی ری
کیسے میں وا سنگ جھولوں ہنڈولا — نانوں دھرت ہی ساس رکھی ری
کیا کیا رو رو پیار کرت ہے — جب میں ہوت اوداس سکھی ری
عطر لگو نہیں مورے بس ماں — بھل ہے پیو کی باس سکھی ری(۱۱)

یاد کر اپنی رادھا جی کو بھول گئی جو من سے تورے
توری پریت کا کون بھروسا ایک سو تورے ایک سو جورے
پیت کی ریت تراب سو سیکھے جیت مرت جر کبھوں نچھوڑے(۱۲)

شاہ تراب کی مثنوی **عاشق وصنم** ان کے عارفانہ جذب وشوق کا شاہ کار ہے۔ مثنوی کے اشعار کی کل تعداد ۱۳۲۲ ہے، مثنوی بحرِ ہزج مسدّس محذوف رمقصور [مفاعیلن مفاعیلن فعولن رفعولان] میں ہے جو اپنی غنایت، نغمگیت اور روانی کے باعث شعرا کو ہمیشہ مرغوب رہی ہے تاہم اُردو اور فارسی کے بڑے مثنوی گو شعرا نے اس بحر کو مثنوی کے لیے کم کم استعمال کیا ہے۔ شاہ تراب کی یہ مثنوی ۱۲۱۸ھ بہ مطابق ۱۸۰۳ء کی تخلیق ہے۔ شاہ تراب نے اس کو دس بارہ سال پہلے تخلیق کرنا شروع کیا تھا مگر چند اوراق لکھنے کے بعد مصروفیات نے انھیں اس کی تکمیل کا موقع نہیں دیا تاہم اس کی تکمیل کا خیال انھیں برابر ستاتا رہا، وہ رقم طراز ہیں:

برس دس ایک اس عرصے کے آگے کیا تھا مثنوی کا قصد میں نے
شروع قصہ سابق جو کیا تھا کہیں دو اک ورق لکھا پڑا تھا
نہیں ملتی تھی آگے اتنی فرصت کہ کیجے اس کہانی کی کتابت
ولے رہتا تھا یہ مذکورِ خاطر کہ اس آغاز کو کرنا ہے آخر(۱۳)

مثنوی میں بیان کردہ قصہ نہایت معمولی نوعیت کا ہے۔ چوں کہ شاعر کا مطمحِ اوّلی حسن وعشق کی حقیقت، ہجر ووصال کی کیفیت اور مجاز وحقیقت کی اصلیت کو بیان کرنا تھا اس لیے قصّے کے پلاٹ پر خصوصی توجہ نہیں دی۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ جوارِ لکھنؤ میں ایک جوان تھا جو سراپا عاشق تھا۔ نظر بازی کا شوق اس پر اس قدر غالب تھا کہ ہر وقت حسن کی تلاش میں سرگرداں رہتا اور جہاں کسی اہلِ حسن کو دیکھتا، جان ودل سے اس پر نثار ہو جاتا۔ اس کے لبوں پر ہمیشہ گل رخوں کا ذکر رہتا۔ وہ اپنی اس وارفتگی اور سرشاری کے باعث بچپن ہی سے ''عاشق'' کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ تلاشِ روزگار اسے لکھنؤ لے گئی۔ ایک روز اتفاقاً آصف گنج سے اُس کا گزر ہوا وہاں بازار میں ایک پری صورت ہندو لڑکے کی دکان تھی۔ عاشق اس لڑکے کا جمال دیکھ کر اس پر فدا ہو گیا۔ وصل ودید کی لذت میں وہ سیرِ بازار کا بہانہ کر کے روزانہ اس دکان کے گرد منڈلانے لگا۔ رفتہ رفتہ اس نے راہ ورسم پیدا کر لی۔ آٹھوں کے میلے میں اسے اپنے محبوب کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ہندو لڑکا کسی کام سے دوسرے شہر چلا گیا، جدائی میں عاشق کی حالت ماہیِ بے آب کی سی ہو گئی۔ شدتِ اضطراب میں اس نے معشوق کو نامۂ شوق بھیجا، جواب آنے پر اس کی تسلی ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد اسے وصل نصیب ہوا۔ دید ووصل میں وہ مجاز سے حقیقت کا مسافر ہو گیا۔ شاہ تراب نے حسن وعشق کی حقیقتِ اصلی اور مجاز وحقیقت کی کیفیت کو نہایت شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثنوی کے آغاز میں حمد ونعت کے مروجہ طریق سے صرفِ نظر کرتے ہوئے انھوں نے عشق اور اس کی کیفیات ہی کو نظم کیا ہے۔ مثنوی کی ابتدا دیکھیے:

خدا گر عشق کو پیدا نہ کرتا تو بندہ حسن پر کاہے کو مرتا
نہ ہوتے گرم معشوقوں کے بازار نہ ہوتا گر کوئی عاشق خریدار

نہ لکھتا میں صنم کا تازہ مضموں اگر عاشق نہ ہوتا اس پہ مفتوں
اگر مجنوں نہ ہوتا اس پہ شیدا تو لیلیٰ کو بھلا کوئی جانتا کیا(۱۴)

نعتیہ مضمون کا حامل صرف ایک ہی شعر ہے جو اس طرح ہے:

کیا معشوق حق نے مصطفیٰ کو نہ کہیے کس طرح عاشق خدا کو(۱۵)

حسنِ معشوق کی تعریف میں البتہ شاہ ترابؔ نے کئی شعر کہے ہیں۔ پری پیکر، یوسف جمال ہندو لڑکے کا سراپا، اس کے خال و خط اور اس کے ناز و ادا کا نقشہ نہایت عمدہ ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

کہوں کیا حال اس رشکِ پری کا قیامت تھا وہ لڑکا کھتری کا
ملاحت سے تھی پُر اس کی صباحت رکھے ہے ماہ کچھ جس کی شباہت
نہ کہیے چاند کو کیوں اس سے تھوڑا کوئی بھی کھتری سا ہو ہے گورا
لبوں کی اس کے کیا کیجے بڑائی کہ اعجاز اُس کی لیتا تھا دُہائی
تبسم کا جو عالم زیرِ لب تھا قیامت تھا، بلا تھا کیا غضب تھا
مقابل اُس کے گر آئینہ آتا تو اپنے منھ کی خوبی دیکھ جاتا
برس چودہ کا اس کا سال و مہ تھا بہ خوبی رشکِ ماہِ چار دہ تھا
عجب روپ اُس کا دکھلاتے کڑے تھے جو اس کے نرم ہاتھوں میں پڑے تھے
وہ چھب تختی کہوں یا قدِ بالا سراپا تھا غرض سانچے میں ڈھالا
عجب تھی حق نے اس کی چھب بنائی تھی اس پر ختم شانِ میرزائی(۱۵)

قصے کا پلاٹ اگرچہ ڈھیلا ڈھالا اور نہایت سادہ ہے تاہم شاعر کو جہاں کہیں موقع ملا ہے وہاں انھوں نے منظر کشی اور جزئیات نگاری کی تکنیک سے قصے کو جاذبِ توجہ بنانے کا جتن کیا ہے۔ ''آٹھوں کے میلے'' کا بیان کئی اشعار میں ہوا ہے، شاعر نے میلے کی گہما گہمی اور سج دھج کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے کہ پڑھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے میلے کا پورا منظر سج جاتا ہے؛ چند اشعار دیکھیے:

کہوں تعریف کیا میں اس مکاں کی کہ خوبی سب پہ ہے ظاہر وہاں کی
عجب باغ و عجب تالاب تھا وہ پسندِ خاطرِ نواب تھا وہ
برائے سیر اِک عالم وہاں تھا عجب میلے کے دن عالم وہاں تھا
ہزاروں اہلِ حرفہ اہلِ بازار وہاں بیٹھے تھے کس ساماں سے تیار
خلائق کا ز بس انبوہ واں تھا کہے تو اس جگہ تھا حشر برپا
ہر اِک اپنی صدائیں بولتے تھے کوئی کچھ بیچتے کچھ تولتے تھے(۱۶)

مثنوی کے دو مرکزی کردار عاشق اور صنم ہیں۔ ان کرداروں کی پیش کش فطری اور حقیقی رنگ کی حامل ہے۔ عاشق اور معشوق کی نفسی کیفیات کو شاعر نے نہایت عمدگی سے پیش کیا ہے۔ پوری مثنوی واقعیت اور حقیقت کے رنگ

میں رنگی ہوئی ہے۔ مبالغہ کہیں کہیں اپنی نمود کرتا ہے مگر کہیں بھی غلو اور اغراق کی حدوں میں داخل نہیں ہوتا۔ مثنوی کی تکنیک میں دوسری اصناف سخن کے رنگ و روغن سے استفادہ اس کی تاثیر میں اضافے کا موجب ہے۔ شاہ ترابؔ نے عاشق کی فراقیہ کیفیت کو کہیں ریختے کی صورت میں پیش کیا گیا ہے اور کہیں غزل کے رنگ میں۔ ان ریختوں اور غزلوں میں سوز بھرا ہوا ہے جو عاشق کی کیفیتِ فراق کا عمدہ اظہاریہ ہے۔

شاہ ترابؔ کی اُردو شعری کائنات ہمہ رنگ اور متنوع صفات ہے۔ فکر کی گیرائی اور فن کی رعنائی کے دل کش نمونے ان کی تخلیقات میں جا بہ جا ستاروں کی طرح چمکتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی غزلیں، مثنوی اور ٹھمریاں اپنے زمانے کے مروجہ اسالیب بیان کی پوری پاسداری کرتے ہوئے بھی حسنِ بیان کے بعض اُن منطقوں میں جانکلتی ہیں جہاں نئے موسموں کی بشارت ان کا مقسوم ٹھہرتی ہے۔

حوالہ جات:

(۱) **تذکرۂ سراپا سخن** [مرتبہ: ڈاکٹر سیّد سلیمان حسین]؛ لکھنؤ: نایاب بک ڈپو؛ س ن؛ ص ۵۶۔

(۲) **تذکرۂ خوش معرکہ زیبا** (جلد دوم) [مرتب: مشفق خواجہ]؛ لاہور: مجلس ترقی ادب؛ مارچ ۱۹۷۲ء؛ ص ۴۹۸۔

(۳) **تاریخ ادبیاتِ اُردو** [ترجمہ: لیلیان سیکستن نازرو، مرتب: ڈاکٹر معین الدین عقیل]؛ کراچی، پاکستان اسٹڈیز سنٹر، جامعۂ کراچی؛ فروری، ۲۰۱۵ء؛ ص ۲۴۷۔

(۴) **تذکرۂ نادر** [مرتب: سیّد مسعود حسن رضوی]؛ لکھنؤ: کتاب نگر؛ ۱۹۵۷ء؛ ص ۴۶۔

(۵) **نزہۃ الخواطر** (جلد ہفتم)؛ مترجم: انوار الحق قاسمی؛ کراچی؛ دار الاشاعت؛ اپریل ۲۰۰۶ء؛ ص ۵۷۱۔

(۶) ایضاً: ص ۵۷۱۔

(۷) **تذکرۂ علمائے ہند**: (مترجم: ڈاکٹر محمد ایوب قادری)؛ کراچی؛ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی؛ دوم، ۲۰۰۳ء؛ ص ۱۴۱۔

(۸) **نزہۃ الخواطر** (جلد ہفتم)؛ ص ۱۹۰۔

(۹) **تذکرۂ علمائے ہند**: ص ۵۰۱۔

(۱۰) عبارتِ خاتمہ از حامد علی خان حامد مشمولہ **دیوانِ شاہ تراب**؛ کان پور؛ مطبع نامی منشی نول کشور؛ ۱۸۹۲ء؛ ص ۳۵۰۔

(۱۱) **ٹھمریاں شاہ تراب کی**؛ ص ۳۴۱۔

(۱۲) ایضاً: ص ۳۴۳۔

(۱۳) **عاشق وصنم**؛ ص ۳۲۸۔

(۱۴) **ایضاً**؛ ص ۲۹۸۔

(۱۵) **ایضاً**؛ ص ۲۹۹۔

(۱۶) **ایضاً**؛ ص ۳۰۴۔

☆☆☆

''لی ساؤ'': کلاسیکی چینی شاعری کی شاہکار نظم

ڈاکٹر عابد سیال

میں آ کھڑا ہوا ہوں
خطرے کی چٹان پر
جب سوچتا ہوں کہ میں یہاں کیوں پہنچا
تو بھی پچھتا تا نہیں ہوں
ایک ٹیڑھے اوزار کو سیدھا دستہ لگانا.......
اس 'جرم' میں مارے گئے
اگلے وقتوں کے کئی لائق لوگ

یہ اقتباس ہے ''لی ساؤ'' کے اردو ترجمے سے جسے چین کی کلاسیکی شاعری کی ایک شاہکار نظم ہونے کا مرتبہ حاصل ہے۔ اس مختصر اقتباس کی سطریں اس نظم کے شاعر کی اس داخلی کیفیت کو بخوبی بیان کرتی ہیں جو نہ صرف اس نظم کو کئی حوالوں سے چین کے شعری ادب میں اولیت کے درجے پر فائز کرتی ہے بلکہ اخلاص اور دیانتداری کے پیکر اس کے شاعر کو بھی گمنامی کی اس گرد میں کھو جانے سے بچاتی ہے جو اس سے پہلے کے بے شمار شاعروں کا مقدر ٹھہری۔

O

چینی شاعری کی سب سے پہلی معلوم کتاب کا عنوان شیہ چنگ (Shih-ching) ہے جس کا لفظی معنی 'گیتوں کی کتاب' ہے۔ یہ کتاب کنفیوشس نے مرتب کی۔ 305 گیتوں یا نظموں پر مشتمل یہ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ 160 گیتوں پر مشتمل پہلا حصہ لوک گیتوں پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے میں 105 گیت ہیں جن کا تعلق شاہی دربار اور اس کے متعلقات سے ہے۔ تیسرے حصے میں 40 گیت ہیں جن کی حیثیت روحانی، اخلاقی اور مذہبی شاعری کی ہے۔ قدیم چینی شاعری کا تعارف پہلے پہل اسی کتاب کا مرہونِ منت ہے۔ دوسری کتاب جو چین کی کلاسیکی شاعری میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے اس کا عنوان چُھو زُو (Chu Zu) ہے جس کا مطلب ہے چُھو کے گیت۔ اس کتاب کا سب سے نمایاں حصہ وہ نظمیں ہیں جو چُھو یوآن کی تخلیق ہیں، چُھو یوآن جو بعض ناقدین کی رائے میں بابائے شاعری ہے اور بعض ناقدین کے نزدیک اسے چینی شاعری کا پہلا غیر گمنام شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ چُھو یوآن کی کئی نظمیں اس مجموعے کا حصہ ہیں لیکن سب سے معروف نظم کا عنوان ''لی ساؤ'' ہے۔

چُھو نام کی ریاست چاؤ دور کی جاگیرداری ریاستوں میں سے ایک تھی۔ یہ ریاست یانگ زی نامی وادی میں تھی اور ان سب ریاستوں کی جنوبی سرحد پر واقع تھی جو مجموعی طور پر شمالی چین کی چاؤ دور کی ریاستیں ہیں۔ یوں یہ ریاست شمالی چین کی ریاستوں میں شامل ہونے کے باوجود اپنے محلِ وقوع کی وجہ سے سہ جہتی ثقافتی امتیاز رکھتی ہے۔ یہاں کی ثقافت میں شمالی چین کے عناصر بھی موجود تھے جو چینی ثقافت کے مرکزی دھارے کے عناصر ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ علاقہ

چین کا قلبی علاقہ تھا اور ثقافتی امتزاج کے عناصر کا امین تھا۔ مزید برآں چھو یوآن نے زیرِ نظر نظم میں ایسی امیجری اور ثقافتی نشانات استعمال کیے ہیں جو روایتی طور پر جنوبی چین کی ثقافت میں شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چھو یوآن کی اس نظم کو جہاں جنوبی چین کے ادب میں ممتاز ترین مقام حاصل ہے وہیں چین کے کلاسیکی ادب کے مرکزی دھارے میں بھی نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔

O

لی ساؤ نہ صرف چھو یوآن اور چینی ادب بلکہ بعض ناقدین کے نزدیک دنیا کی بڑی نظموں میں سے ایک ہے۔ چھو یوآن کی شخصیت سے متعلق حقائق بھی اور اس نظم کا اس سے انتساب بھی تاریخی اعتبار سے کسی حد تک دھندلاہٹ کا شکار ہے۔ غالب خیال یہ ہے کہ اس دوران لکھی گئی جب اس کا شاعر چھو یوآن جو بادشاہ کا مصاحب تھا، غیظِ شاہی کا شکار ہو دریائے یانگ سی کے جنوب میں جلاوطنی کے دن گزار رہا تھا۔ چھو یوآن ایک عالی ہمت اور انسانی شرف کا پاسدار شخص تھا۔ وہ شمالی حکمرانوں کی سخت گیری اور استحصالی رویوں کے خلاف برسرِ پیکار رہا۔ اس کے ہاں انسان دوستی اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کے فروغ کی خواہش نظر آتی ہے۔

اگر چہ ساری نظم کا محور چھو یوآن کی زندگی اور افکار ہی ہیں تاہم اس میں اس کی ذاتی زندگی کے واقعات اور اس کی دلچسپیاں ایسے دلکش پیرائے میں بیان ہوئی ہیں جن سے اس نظم کا شاعر ایک رومانوی اور اساطیری شخصیت کے روپ میں نظر آتا ہے۔ نظم کے آغاز ہی میں وہ اپنی پیدائش کا تذکرہ اس انداز سے کرتا ہے جس سے ایسا لگتا ہے کہ یہ وقت بہت سعادت کا تھا۔ نظم میں جہاں وہ اپنے خاندان کی شرافت و نجابت کا تذکرہ کرتا ہے وہیں دیوتاؤں کی مہربانی کے سعد سائے میں خود کو پروان چڑھتا دیکھتا ہے۔ جہاں دنیاوی اعتبار سے اپنی سیاسی آئیڈیل شخصیات کا تذکرہ کرتا ہے وہیں اساطیری کرداروں کے حوالے بھی شامل کرتا ہے۔ جہاں جنگلی پھولوں، مختلف جڑی بوٹیوں، درختوں اور روزمرہ زندگی کے دیگر عناصر کا ذکر کرتا ہے وہیں روحانی، مذہبی اور ثقافتی کرداروں کو بھی ان کی خاص استعاراتی کیفیت کو اجاگر کرتے ہوئے شامل کرتا ہے۔ یوں یہ نظم ایک سیاسی اور سماجی شخصیت کی عملی زندگی اور اس کے آدرشوں کا منظر نامہ ہوتے ہوئے بھی ایک اساطیری رنگ اختیار کر جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے ادوار میں چھو یوآن کو ایک اساطیری کردار کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس کے نام کا مندر بھی ہے اور اس کا دن بھی منایا جاتا ہے۔ مندر کا نام 'چھو یوآن کا مندر' ہے لیکن اسے 'شہید کا مندر' بھی کہا جاتا ہے جو صوبہ ہُوبے کے ایک قصبے زی چھوئی میں سیانگ چیاپنگ کے مقام پر واقع ہے اور قدرتی مناظر کی خوبصورتی کے باعث ایک معروف اور دلکش سیاحتی مقام ہے۔ چھو یوآن کی یاد میں 5 مئی کو اساطیری اژدر کی کشتی کا جشن (dragon boat festival) منایا جاتا ہے۔ اس دن روایتی طرز کا کھانا پکا کر دریا میں پھینکا جاتا ہے، روایت کے مطابق جس کا مقصد یہ ہے کہ مچھلیاں اس خوراک کو کھائیں اور چھو یوآن جس نے دریا میں ڈوب کر خودکشی کر لی تھی، اس کا جسم مچھلیوں سے کھائے جانے سے محفوظ رہے۔

O

تین سو ستر (370) سے زائد مصرعوں پر مشتمل اس نظم میں تقریباً 2400 تصویری اشکال جنھیں جدید دور میں کریکٹر کہا جاتا ہے، استعمال ہوئی ہیں۔ چینی نظمیں مختصر ہوتی ہیں اور عام طور پر آٹھ دس یا زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ لہٰذا اس طوالت کے باعث بعض روایتوں میں اسے چینی کلاسیکی شاعری کی روایت میں طویل

ترین نظم قرار دیا گیا ہے۔ غیر معمولی طوالت اور موضوع کے اعتبار سے اسے چینی رزمیہ بھی کہا جاتا ہے، اگر چہ اس میں اس طرح کے عناصر موجود نہیں جو دنیا کے عظیم رزمیہ ادب میں ملتے ہیں۔

مزاج کے اعتبار سے لی ساؤ ایک نوحہ ہے۔ لہٰذا اس میں شاعری کے وہ عناصر جن کا تعلق گہرے دکھ اور غم سے ہے، نمایاں ہیں۔ لی ساؤ کا سب سے زیادہ مقبول انگریزی متبادل Encountring Sorrow استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ بعد ازاں اسے Sorrow after Departure یا Sorrow at Parting یعنی مجہوری کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ موجودہ دور کے علمائے ادب میں سے چند ایک نے اسے Sorrow in Estrangement کے طور پر لیا ہے جس کا مفہوم مجہوری کے بجائے غیریت اور اجنبیت سے قریب ہے۔ تاہم بعض ناقدین اب بھی سمجھتے ہیں کہ یہ ایک خاص طرز کی موسیقی کا نام ہے۔ یہ ایک طویل غنائیہ نظم ہے جو شدید صدمے کی زد میں آئی ہوئی ایک ایسی روح کا تصوراتی سفر جو سچائی کی جویندہ اور آدرشوں کے ٹوٹنے پر رنجیدہ ہے۔

نظم میں کئی باتیں قابل توجہ ہیں جو اسے ایک اعلیٰ ادبی شاہکار کا درجہ دیتی ہیں۔ بھرپور تمثال کاری، ہنرمندانہ تشبیہات جیسے اسلوبیاتی خصائص کے ساتھ ساتھ فکری اعتبار سے یہ نظم حب الوطنی اور مجہوری کے غم کا دل میں اتر جانے والا اظہاریہ ہے۔ کئی تاریخی حوالے، تلمیحات اور اساطیر اس طرح کام میں لائی گئی ہیں کہ قدیم چینی دور کے ریاستی نظام کی پیچیدگیوں اور اس دور کی سماجی زندگی کا بالواسطہ اور بلاواسطہ اظہار ہوتا ہے۔ فرد اور حاکم اشرافیہ کے درمیان تنازعہ اس نظم کا بنیادی موضوع ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شاعر کا حق اور انصاف کے لیے لڑنے کا عزم، اپنے ملک کو بچانے کی تمنا اور اپنے لوگوں کے لیے اس کے دل میں جاگزیں محبت کا اظہار اس نظم کو جلال اور دوام عطا کرتے ہیں۔

O

نظم اپنے آغاز میں شاعر کی شرافت و نجابت، اس کی خاندانی عظمت، اس کے عظیم باپ کے تذکرے، اس کے باسعادت نام، اس کی پیدائشی صلاحیتوں، اور خداداد قابلیت کا تعارف بڑے دلفریب انداز میں پیش کرتی ہے۔

اپنے جدِ امجد کاؤیانگ کے خاندان کے چشم و چراغ
پو ینگ میرے والد تھے
شی ٹی کی کہکشاں کے ستارے
جب پہلی کے چاند کے گھر رونق افروز ہوئے
کینگ ین کے دن
میں نے اس دنیا میں قدم رکھا
میرے والد نے میری پیدائش کی علامات وآثار دیکھتے ہوئے
میرے لیے پاک ترین خوش بختی کا نام تجویز کیا
انھوں نے مجھے 'مثالی خودداری کا پیکر' کے نام سے نوازا
اور مجھے 'روحانی توازن' کا لقب عطا کیا گیا

نظم کے آغاز کی یہ صورت قدیم چینی ثقافت میں خاندانی نجابت وعظمت کی اہمیت کی غماز ہے۔ یہ صورت آج بھی چین میں دیکھی جا سکتی ہے جہاں کسی شخص کو اس کے ذاتی نام کے بجائے اس کے خاندانی نام سے پکارنا زیادہ مستحسن

اور اظہار تکریم کا طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ جاہلی دور کے عرب کلچر میں بھی رجز خوانی کی صورت کچھ ایسی ہی تھی جہاں اپنے خاندان، قبیلے اور نسل کو فضیلت اور برتری کے معیار کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ شاعر اپنی ذات سے وابستہ خوش بختی اور سعادت کا تذکرہ بھی اعتماد اور یقین کامل کے ساتھ کرتا ہے۔ یہ انداز ایک طرف تو اس بات کا اظہار ہے کہ آگے چل کر وہ جس موضوع کو نظم میں بیان کرنے والا ہے اس میں وہ خود کو، اپنے افکار کو اور باطل قوتوں کے خلاف لڑنے کے اپنے عزم کو حق پر سمجھتے ہوئے خود کو خیر کی کائناتی قوتوں کا نمائندہ سمجھتا ہے۔ دوسری طرف یہی اعتماد اور اس کے افکار میں سچائی، پاکیزگی اور دیانتداری کے اوصاف اسے ایک ایسا رومانوی اور داستانوی روپ دیتے ہیں جو اس کی تاریخی حیثیت کے گرد ایک اساطیری ہالہ تخلیق کر کے اس کی شخصیت کو ایک علامتی حیثیت بھی عطا کرتے ہیں۔ آگے چل کر نظم چھو یوآن کی سیاسی زندگی اور اس عہد کے سیاسی ماحول کو پورے سماجی شعور کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ بقول لیوؤ وچی:

> ''یہ نظم اس (چھو یوآئن) کی سیاسی زندگی کی داستان بیان کرتی ہے؛ شہنشاہ اور ریاست کو راہِ راست پر رکھنے کی اس کی کوششیں؛ درباری معاملات میں اس کی تگ ودو اور مخالفین سے شکست کھانا، اس کی دیانتداری اور وفاداری جو اسے دنیاداری کے پُر پیچ اور کج نہاد طریقوں کے لیے غیر موزوں بناتی ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود پرانے اطوار پر کاربند رہتے ہوئے وہ انسانی ہمدردی اور اپنے کردار کی پاکیزگی کو برقرار رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنی عزت و وقار کی بالیدگی کی کوشش جاری رکھتا ہے؛ جسے نظم میں ان پھولوں کے حسن اور خوشبو کی علامتوں کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے جنھیں وہ آرائش کے لیے استعمال کرتا ہے''

O

''لی ساؤ'' میں شاعر نے اپنے اس سیاسی مؤقف کا اظہار کیا ہے کہ وہ کبھی باطل قوتوں کے ساتھ سمجھوتا نہیں کرے گا۔ اسے محکم یقین ہے کہ وہ چُھو کی ریاست میں راست عملی کا احیاء کر کے رہے گا خواہ اسے (قدیم چینی محاورے کے مطابق) نو (9) مرتبہ بھی مرنا پڑے۔ اس نظم میں شاعر اپنی سیاسی آئیڈیل شخصیات کا ذکر بھی کرتا ہے، ایسے بادشاہ جو اپنے اپنے عہد میں سچائی، عدل و انصاف اور اعلیٰ انسانی اقدار کے خوگر تھے۔ اور ان کے مقابلے میں وہ جنھوں نے غلط راستوں کا انتخاب کیا، ان سے نفرت کا اظہار بھی کرتا ہے۔

کتنی اچھی تھی 'تین قدیم بادشاہوں' کی یہ صفت
کہ ان کے پاس جو کچھ تھا
اس سے مہکار آتی تھی
چھوٹی دارچینی میں ملائی ہوئی شان کی مرچیں
بہترتھیں
کئی سدابہار پودوں سے
اور یاؤ اور شن زیرک اور دھن کے پکے،
انھوں نے تاؤ کی تکریم کی اور سیدھی راہ پر چلے

لیکن چاؤ اور چیہہ
بھگدڑ مچاتے ہوئے دوڑے
جنگلی انداز میں
بیچ کے چور راستے ڈھونڈتے،
کھائیوں میں لمبے لمبے ڈگ بھرتے،
پُرخوف سایہ دار اندھیرے رستوں سے عشرتیں سمیٹتے

چھویوآن اپنے آقاؤں کی بے حسی پر مایوسی اور جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے ہاں ایک اور قابلِ توجہ نکتہ اس کا جمود اور ٹھہراؤ، جسے معاصر سیاسی اصطلاح میں 'سٹیٹس کو' کہا جا سکتا ہے، کی مخالفت ہے۔ حکمرانوں کی بے حسی اور عوام کی حالتِ زار سے لاپرواہی اس کے لیے سیاسی نعرے کی بجائے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔

میں نے سخت نفرت کی
پارسائی کا لبادہ اوڑھے اپنے آقا کی متلوّن مزاجی سے
جس نے کبھی کوشش نہیں کی
اپنے لوگوں کے دل کی بات سمجھنے کی

اس کی بہت سی بیویاں مجھ سے کینہ رکھتی ہیں
میری خوبصورتی کی وجہ سے
اور باہم سرگوشیاں کرتی ہیں
کہ میں اپنے ہنر سے آقا کو مطیع کرنا چاہتا ہوں
چونکہ فریبی ہیں
وہ اور اس زمانے کے سب بے ہودہ لوگ
پیمانہ و مسطر لے کر
چیزوں کو غلط طور پر سیدھا کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں
چاک کی لکیر کی طرح
منحنی شکلیں بناتے ہوئے
فریبی 'چاؤ' کے طور طریقوں کو اپنے لیے نمونہ بنائے ہوئے ہیں

اس ٹھہری ہوئی حالت میں مَیں مایوسی اور عدمِ یقین کا شکار ہوں
کیا صرف میں ہی ہوں جو محسوس کرتا ہوں آجکل کی زندگی کی سختی کو؟
کاش میں یہاں کھڑے ہو کر یہ سب کچھ دیکھنے کی بجائے
مر جاتا...... وطن سے دُور کہیں بھٹکتے ہوئے

غالب نے کہا تھا

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دُور
میرے خدا نے رکھ لی مری بے بسی کی شرم

لیکن غالب کے ہاں یہ بات تخیل کی حد تک رہی جبکہ چھو یوآن نے اس صورت حال سے دل برداشتہ ہو کر دریائے میلیو (Miluo) میں ڈوب کر واقعتاً خودکشی کر لی۔ اس کے لیے اس نے احتجاجاً خودکشی کرنے کے روایتی طریقے کو اپناتے ہوئے اپنے جسم کو ایک بھاری پتھر سے باندھا اور اس پتھر سمیت خود کو دریا میں ڈبو لیا۔

O

''لی ساؤ'' کو فنی اعتبار سے دائمی عظمت بخشنے میں ایک بڑا کردار اس میں پیش کی گئی امیجری کے منفرد ہونے کا ہے۔ یہ اس طرز کی امیجری پیش کرنے والی چینی شاعری کی پہلی نظم ہے۔ اس نے پھولوں، جڑی بوٹیوں اور دیگر قدرتی نباتات کی تمثالوں کو لوگوں کے رویوں اور ان کی سرشت کے اظہار کے لیے بہت کامیابی سے اور ایسے انداز میں پیش کیا ہے کہ اس سے پہلے ایسی مثالیں معروف نہ تھیں اور اس کے بعد زندگی کے مظاہر کو بیانیہ طرز کی شاعری میں پیش کرنے کی روایت کا آغاز ہوا۔

میں نے سوچا کہ مجھے 'پھول' پر بھروسہ کرنا چاہیے
لیکن اصلیت کچھ بھی نہیں اس کے آرائشی چہرے کے پیچھے
وہ حسن ہے جسے ہجوم نے ٹھکرا دیا ہے
کیا میں اسے دوبارہ معطر اشیا میں جگہ دلا سکتا ہوں؟
اور 'مرچ' خوشامدی اور شوخ و گستاخ ہے
وہ اپنا عطردان گھٹیا جھاڑی دار بیری کے پھل سے بھرتے ہیں
اور ہلکان ہوتے ہیں
صرف آگے نکلنے اور مراعات حاصل کرنے کی تگ و دو میں
کیا مجھے ان کا کہا ماننا چاہیے؟
یہی وہ رستہ ہے جس پر میری دنیا کے لوگ چلتے ہیں......
اور کون ہے جو یہاں رہ سکتا ہے...... خود کو بدلے بغیر؟
اگر 'پھول' اور 'مرچ' اس طرح کے ہیں
تو کارٹ ہالٹ اور آبی ساج تو اور بھی بڑھ کر ہوں گے

میری نسل اپنے رویے چھپانے میں
بڑی پُرکار ہے
ان میں سے کون ہے جو فیصلہ کر سکے
میرے اچھے یا بُرے ہونے کا

عام لوگوں پر اچھائی اور بُرائی عیاں ہے
صرف مقتدر طبقہ یہ فرق کرنے سے عاری ہے
وہ اپنے کمر بند سجاتے ہیں
بدبودار جڑی بوٹیوں سے
اور کہتے ہیں کہ پھول مناسب نہیں ہوتے پہننے کے لیے
جو فرق نہیں کر سکتے...... شگوفے اور بدبودار کائی میں
وہ نگینوں کے جوہری کیسے ہو سکتے ہیں؟
لبریز کر کے اپنے عطر دانوں کو...... غلاظت سے
وہ کہتے ہیں کہ سیاہ مرچیں خوشبودار نہیں ہوتیں

لی ساؤ نہ صرف اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک شاہکار کا درجہ رکھتی ہے بلکہ اسلوبیاتی زاویے سے جدید طرز کی شاعری ہونے کے ساتھ ساتھ فنی حوالے سے بھی بلحاظ ہیئت ایک نئی صنف کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ یہ نئی صنف فُو (fu) کے نام سے معروف ہوئی جو شاعری اور نثر کے عناصر کے امتزاج سے تشکیل پاتی ہے۔ اس کی تشکیل ہان دور (206 ق م تا 220 عیسوی) میں ہوئی جو چھو یوآن کی وفات (278 ق م) سے کافی بعد کا دور ہے تاہم اس صنف کی بنیاد لی ساؤ کے ہیئتی نظام پر ہی رکھی گئی۔ اس سے پہلے کی شاعری کی معروف صنف ساؤ (sao) تھی جس میں داخلیت اور غنائیت کے عناصر حاوی تھے۔ اس کے مقابلے میں فُو میں بیانیہ پیرایہ اور خارجیت کے عناصر نمایاں تھے جو دراصل لی ساؤ کی عطا تھے۔ فُو کا نظامِ قوافی بھی ساؤ کی نسبت کم پابندیوں کا حامل تھا۔ لہٰذا یہ صنف اپنے آہنگ اور برتاؤ میں تو شاعری ہے لیکن ہیئتی اعتبار سے نثر کے قریب بھی ہے۔

چھو یوآن کی المناک موت کے بعد وسیع پیمانے پر اس کے طرزِ کلام کی پیروی کی گئی اور آئندہ تقریباً پانچ صدیوں تک شاعری اس کے اعجازِ سخن کی اسیر رہی اور اس کے بعد لکھی جانے والی نظمیں 'لی ساؤ نظمیں' کہلاتی رہیں۔ ''لی ساؤ'' کی درج ذیل سطروں میں اس نے اپنی پیش روی کی بات اگرچہ اپنی نظم کے فکری تناظر میں کہی تھی لیکن اس کے بعد کی شعری روایت کو دیکھیں تو ادبی حوالے سے بھی اس کا کہا درست معلوم ہوتا ہے:

بوڑھا ہونے سے ڈرتے ہوئے
عمرِ طبعی کے پورا ہونے سے نفرت کرتے ہوئے
شاید میں نے یہ راہ ابھی تھوڑی سی طے کی ہے؟
میں عمدہ ترین راہواروں پر زین ڈال کر دور تک جاؤں گا
آؤ، میرے قدموں کے نشانوں پر قدم رکھتے
میں تمھیں سب سے آگے موجود ملوں گا

OOO

اردو غزل اور ہندی تہذیب

ڈاکٹر عبدالواجد تبسم

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد نے ہندی تہذیب کو نئے تحرک سے آشنا کیا اور اس کے نتیجے میں ایک نئی تہذیب پروان چڑھی جسے ہند اسلامی تہذیب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ تہذیب خالصتاً اسلامی ہے نہ ہندی بلکہ اس میں ہر دو اقوام کے مشترک اجزا ہیں جو باہم اس قدر شیر و شکر ہو چکے ہیں کہ انھیں علیحدہ علیحدہ کرنا ناممکن ہے۔

غزل اسلامی معاشروں میں تخلیق ہوتی رہی اور اسے پروان چڑھانے میں بھی اسلامی ممالک نے بنیادی کردار ادا کیا لہٰذا اسے اسلامی تہذیب و تمدن کا عکاس تصور کیا جانے لگا۔ حالاں کہ اسلامی حکومت کے پھیلاؤ کے نتیجے میں جو جو تہذیبی منطقے اس کے زیرِ نگیں آتے رہے ان کا تہذیب و تمدن، زبان، رسم و رواج، بو باس اور ذائقے اس میں ضرور شامل ہوتے رہے ہیں۔ عربی میں یہ عرب، فارسی میں ایرانی اور ہندوستان میں یہ ہندی اثرات کے زیرِ اثر رہی ہے۔ جن کی نوعیت بیک وقت تہذیبی، لسانی، تاریخی، مذہبی اور اساطیری اور جغرافیائی ہے۔

غزل کا ابتدائی عہد جو رسخنوں کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے صوفیہ کے مرہونِ منت ہے۔ انھوں نے اپنی تعلیمات کو ہندو سماج کی مختلف تمثیلوں کے روپ میں پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں جو رسم و رواج، تلمیحات، اصطلاحات اور فضا ملتی ہے وہ ہندی تہذیب کی عکاس ہے۔ اس روایت کے زیرِ اثر شاعر کبھی عورت کے روپ میں محبوبِ ازلی کی محبت کے گیت گاتا ہے اور کبھی برہمن کے گیت الاپتا ہے۔ اس ابتدائی عہد میں جو شاعری پروان چڑھتی ہے وہ ہندی آمیز ہے اور اس میں ہندی روایات کا معتدبہ حصہ ہے۔ اس کی بنیادی وجہ بھگتی تحریک کے بھگتوں کے دوہے اور گیت ہیں، جنھوں نے عشق و محبت اور انسان دوستی کی آفاقی اقدار کو اپنے کلام کا حصہ بنایا ہے۔ مسلمان صوفیہ کی تعلیمات کے پسِ پردہ بھی چوں کہ یہی حقیقت کارفرما تھی لہٰذا انھوں نے ان اثرات کو قبول کرتے ہوئے وسیع تر انسانیت کا درس دیا۔

گجرات میں قدیم اردو کے نمونے صوفیہ کے ملفوظات اور شاعری کی صورت میں ملتے ہیں۔ اس عہد کے نمایندہ شعرا میں شیخ بہاؤالدین باجن، قاضی محمود دریائی، شاہ علی محمد جیو گام دھنی اور شیخ خوب محمد چشتی کا نام ملتا ہے۔ ان شعرا نے فارسی اور سنسکرت کی ادبی روایت سے انحراف کرتے ہوئے ہندوستان کی مقامی روایت کو اپنایا اور بھجن کی طرز پر ہندوستانی موسیقی کے مخصوص راگ، راگنیوں کو اپناتے ہوئے اردو میں شعر کہے۔ یہ ہندی روایت نویں اور دسویں صدی تک اپنا رنگ جمائے رکھتی ہے تاوقت کہ گیارھویں صدی میں مغل گجرات کو زیرِ نگیں نہیں کر لیتے۔

بہمنی اور عادل شاہی دور کو گذشتہ شعری ادب کی روایت کی توسیع قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس عہد کے شعرا کے ہاں دکنی معاشرت اور تہذیب کے ساتھ ساتھ غزل کا فارسی رنگ بھی نظر آتا ہے۔ اس عہد کا نمایندہ غزل گو حسن شوقی ہے۔ جس کے ہاں ہندی روایت کے تحت سراپا نگاری، ہندی دیومالا اور زبان کو خوبصورتی سے برتا گیا ہے۔ حسن شوقی کے بعد اردو غزل کو روایت آشنا کرنے میں قلی قطب شاہ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کی غزل پر ہندی اثرات کا جائزہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد پیدا کرنے کے لیے ہندی رسومات کو اپنا لیا تھا۔ جس سے ان کا اردو کلام

ہندی آمیز ہوا۔ ان کے انداز بیان، الفاظ، تشبیہات، استعارات غرض ہر ایک پر ہندی اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔

اردو غزل کے اس ابتدائی عہد کے جائزے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہندی اثرات ابتدا ہی سے اس پر غالب رہے ہیں اور انھوں نے زبان و بیان اور ہندی دیومالائی اشاروں کی صورت میں اس پر انمٹ اثرات مرتب کیے ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ کے بعد اردو غزل کو ہندی رنگ سے آشنا کرنے میں ولی نے اہم کردار ادا کیا۔ اس کی غزل میں موجود دیومالائی اشاروں میں شیو، کرشن، رام، لچھمن، ارجن اور اجودھیا کے ذکر کے علاوہ موسیقی کے سازوں میں بانسری، طنبورہ، جھانجھر، تال، منڈل، رام کلی اور بھبھاس، ہندوستانی زیورات میں بچھوا، چوڑی، ٹیکا، ہنسلی، پھولوں میں چمپا اور کنول کے علاوہ دریاؤں میں گنگا اور جمنا کا ذکر ان کی غزل میں ہندی رنگ بھرتا ہے۔

ولی کے ہاں محبوب کا تصور اور سراپے کا بیان بھی ہندی آمیز ہے۔ مضامینِ تصوّف میں دنیا کو واہمہ، فریب اور دھوکا جاننا بھی ہندی فکر کا نتیجہ ہے۔ ولی کا اسلوب بیان بھی ہندی آمیز ہے۔ انھوں نے فارسی اور ہندی عناصر کی آمیزش سے ایک ایسی زبان کو وجود دیا ہے۔ جو غزل کے لیے انفرادیت کا باعث بنی۔ ولی کے بعد سراج دکنی اور پھر ان کے تتبع میں ایہام گویوں کے ہاں بھی ہندی اثرات کی مختلف صورتیں نظر آتی ہیں۔

شمالی ہند میں اردو غزل کی نشاۃ الثانیہ ولی کی بدولت ممکن ہوئی چنانچہ اس کے تتبع میں شعرا نے غزلیں کہیں اور اپنے دیوان ترتیب دیے۔ اس عہد کے شعرا میں سے حاتم، سودا اور میر تک ہندی رنگ کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ سودا کے ہاں یہ ہندی دیومالا، مقامی لہجہ، ذخیرۂ الفاظ کی صورت میں نمود کرتا ہے جبکہ درد کے ہاں صوفیانہ فکر، وحدت ادیان اور ہندی مسلم تہذیب کے امتزاج کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ میر کے ہاں یہ مذہبی رواداری اور بے تعصبی، زبان اور بحور کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ لکھنوی عہد میں ہندی اثرات ابتدا میں مصحفی، جرأت اور انشا کے ہاں نظر آتے ہیں، پھر آگے چل کر آتش اور ناسخ کی غزل میں بھی ان کی مختلف صورتیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ دبستان دہلی کی بزمِ آخر کے شعرا میں، شاہ نصیر، ذوق، ظفر، مرزا غالب، مومن اور شیفتہ کے ہاں بھی ہندی تہذیب اور مظاہر کا ذکر کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔

نظیر اکبر آبادی نے دبستان دہلی اور لکھنؤ سے الگ تھلگ رہتے ہوئے ہندوستانی عوام کے میلوں، ٹھیلوں میں حصہ لیا اور اس میں کسی مذہب کی قید روا نہ رکھی، چنانچہ ان کے ہاں ہندی رنگ ہندوؤں کے میلوں، ٹھیلوں اور تہواروں کی منظر کشی سے تشکیل پاتا ہے۔

دبستانِ رام پور کے شعرا میں سے داغ دہلوی، امیر مینائی، جلال لکھنوی اور مظفر علی اسیر کے ہاں بھی ہندی دیومالا کا رنگ کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔

اردو غزل کو جدت سے ہم کنار کرنے والے شعرا میں سے حالی کے ہاں مذہبی بے تعصبی اور رواداری کا درس ملتا ہے جبکہ ان کے معاصر اکبر الہ آبادی ہندوؤں کو زُنار اور اشنی اور مسلمانوں کو سُبحہ سے اپنا تعلق استوار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

بیسویں صدی کے اولین غزل گوؤں میں سب سے معتبر نام علامہ اقبال کا ہے۔ ان کے ہاں ہندی اثرات خود کو اصل کا سومناتی اور آباء کو لاتی و مناتی اور برہمن زاد کہنے کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے ''اسرار خودی'' کے

دیباچے میں ہندی اور مسلم تصوف کے اشتراک کی پہلوؤں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ انا کی تحقیق وتدقیق میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی تاریخ میں انھیں ایک طرح کی مماثلت نظر آتی ہے۔ اقبال کی ابتدائی دور کی نظموں میں بھی وحدت ادیان کا تصوّر ملتا ہے۔ ان کی ابتدائی شاعری پر ویدانتی اثرات بھی نظر آتے ہیں جو اقبال کی سوامی رام تیرتھ سے دوستی کا نتیجہ ہیں مگر یہ تصوّرات ابتدائی ادوار تک ہی محدود ہیں جو اقبال کی شاعری میں بعدازاں امت مسلمہ کے مسائل کے بیان کے ساتھ معدوم ہوتے گئے:

میں اصل کا خاص سومناتی
آبا مرے لاتی ومناتی
تو سید ہاشمی کی اولاد
میری کف برہمن زاد
ہے فلسفہ میرے آب وگل میں
پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں

عبوری دور کے غزل گوؤں میں سے حسرت، فانی، یگانہ، اصغر اور جگر کے ہاں بھی ہندی اثرات نظر آتے ہیں۔ یہ شعرا مذہب عشق کے قائل ہیں اور ان کے نزدیک شیخ وبرہمن اہمیت نہیں رکھتے۔ وحدت الوجودی فکر ان شعرا کے ہاں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ اسی فکر کے تحت ان کے ہاں جبر کا تصور نظر آتا ہے اور کہیں کہیں ویدانتی اثرات کے تحت دنیا کو موہوم اور بے حقیقت کہنے کا رویہ بھی ان کے ہاں پایا جاتا ہے۔ ہندی شاعری کے تصور عشق کی جھلک بھی ان شعرا کی غزل میں نمایاں ہے۔ وحدتِ ادیان کا تصور بھی ان کے ہاں کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ ہندی دیومالائی اور تہذیبی اشارے ان کے ہاں موجود ہیں جو ان شعرا کی غزل میں ہندی رنگ رس پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً:

مذہب عشاق ہے بیگانۂ قید رسوم
ہاں نہیں حسرت بکھیڑا سُبحہ و زُنار کا
(حسرت)

برہ کی رین کٹے نہ پہاڑ
سونی نگریا پڑی ہے اجاڑ
(ایضاً)

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں
(فانی)

کہتے ہیں جسے عشق وہ ایمان ہے اپنا
کچھ دیر سے مطلب نہ ہمیں کام حرم سے
(ایضاً)

دیکھیے انجام کیا ہو ہستی موہوم کا
پڑ گیا ہے اختلاف اس خواب کی تعبیر میں
(یگانہ)
دیر و حرم ایک ہیں سالک کے واسطے
منزل کی دھن میں ہوش کہاں امتیاز کا
(ایضاً)
یہیں پر ختم ہو جاتی ہیں بحثیں کفر وایماں کی
نقاب اس نے الٹ کر یہ حقیقت ہم پر عریاں کی
(اصغر)
یہ محفلِ ہستی بھی کیا محفلِ ہستی ہے
جب کوئی اٹھا پردہ میں خود ہی نظر آیا
(جگر)
آپس میں الجھتے ہیں عبث شیخ و برہمن
کعبہ نہ کسی کا ہے، نہ بت خانہ کسی کا
(ایضاً)

تلامذۂ داغ میں سے سیماب کے ہاں ہندی اثرات ویدانتی فکر، دیر وحرم کے ایک ہونے، مذہب عشق اور ہندی دیومالائی اشاروں کی صورت میں سامنے آتا ہے:

ایک لفظ ہو ادا کرنے کے سو انداز ہیں
نالۂ ناقوس ہے گویا اذانِ برہمن
(سیماب)
بت میں بھی دیکھتا ہوں اس خود نما کو میں
اب سجدہ برہمن کو کروں یا خدا کو میں
(ایضاً)

عبوری دور کے غزل گوؤں کی طرح متاخرین دور کے لکھنوی شعرا میں سے صفی، عزیز، ثاقب لکھنوی، اثر لکھنوی اور آرزو لکھنوی نے بھی اردو غزل میں ہندی رنگ پیدا کیا ہے۔ یہ شعرا وحدت الوجودی فکر کے حامل ہیں۔ اور ویدانتی فکر کے اثرات کے تحت دنیا کو موہوم، خواب وخیال، افسانہ طلسمات اور تلوّن کا کھیل سمجھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کے ہاں کثرت میں وحدت پرستی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ یہ مذہبِ عشق کے قائل ہیں اور ان کے نزدیک دیر وحرم، کعبہ وبت خانہ اور شیخ وبرہمن کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس تصور نے ان کے ہاں مذہبی رواداری کو جنم دیا ہے۔ ہندی دیومالائی اشارے اور مذہبی تلمیحات جو اردو غزل کی روایت کا اب تک حصہ بن چکے ہیں، ان شعرا کے ہاں بھی نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں ہندی تہذیبی مظاہر اور ہندی زبان کے اثرات بھی واضح ہیں۔ ان شعرا میں سے آرزو لکھنوی نے اردو غزل کو الگ

زبان دی ہے جو سنسکرت اور عربی کے ثقیل الفاظ سے پاک ہے اور اسے وہ خالص اردو قرار دیتے ہیں۔ ان شعرا کا تصورِ عشق بھی ہندی ہے۔ مجموعی حوالے سے ان شعرا کی غزل ہندوستانی مٹی کی بو باس رکھتی ہے:

کفر کی شرکت سے کب اسلام خالی ہے صفی
دخل جب تسبیح کے دانوں میں ہے زُنار کا
(صفی)

رونق افروز ہیں کعبے سے نکالے ہوئے بت
آ گئی دیر کے قبضے میں حرم کی میراث
(ایضاً)

نہ پوچھو دل سے اس کی راہ کا حال
سوائے عشق مذہب کچھ نہیں ہے
(ثاقب)

نظر کر غور سے آئینۂ اسرارِ ہستی پر
جسے تو زندگی سمجھا ہے وہ دھوکا ہی دھوکا ہے
(ایضاً)

یا پردۂ اسرارِ حقیقت سے نکل آ
یا کعبہ کو پھر سے صنم خانہ بنا دے
(عزیز)

دیر و کعبہ میں فرق کیا ہے عزیز
صرف پابندیاں ہیں مذہب کی
(ایضاً)

مجھ کو مرنے دو چپ کھڑے کیوں ہو
جاؤ تم بیچ میں اڑے کیوں ہو
(آرزو لکھنوی)

کیسا گانا، ناچ کیسا، اب نہ کوئل ہے نہ مور
ہو گئی ساری سبھا بھر بھنڈ جب کھٹکا ہوا
(ایضاً)

کوئی اس طرح ساون گا رہا ہے
دلِ ناشاد اُمڈا آ رہا ہے
(اثر لکھنوی)

مبتلا ہوں ترا جب سے صنم کفر فروش
زلف تا دوش نہ تھی، دوش پہ زُنار نہ تھا
(ایضاً)

تلامذۂ داغ میں سے بیخود دہلوی اور نوح ناروی نے اردو غزل کی کلاسیکی روایت کے ساتھ ساتھ ہندی رنگ رس کو برقرار رکھا ہے۔ یہ شعرا وحدت الوجودی فکر سے متاثر ہیں اور پیکرِ انسانی کو موہوم خیال کرتے ہیں۔ ویدانتی اثرات کے تحت ان کے ہاں برہما اور آتما کے ایک ہونے کی جھلک بھی نمایاں ہے۔ وحدتِ ادیان، مذہب عشق، ہندی دیو مالائی اشارے اور ہندی مظاہر ان کی غزل میں مختلف انداز سے جلوہ گر ہیں:

دربار کیجیے آپ دوالی منایئے
جلنے کو ہم ہیں سرو چراغاں کے سامنے
(بیخود دہلوی)

مجھ کو صیاد کی مٹھی سے رہائی نہ ملی
طائر رنگِ حنا بن کے گرفتار رہا
(ایضاً)

دریا میں موج، باغ میں گل، انجمن میں شمع
ڈھونڈھا اسے نظر نے جہاں وہ وہیں ملا
(نوح ناروی)

عشق کہتا ہے بڑھے یوں کفرودیں کا اتحاد
دیر میں مسجد رہے کعبے میں بت خانہ رہے
(ایضاً)

امیر مینائی کے شاگردوں میں سے ریاض خیرآبادی کے علاوہ رضا علی وحشت کلکتوی کے ہاں بھی ہندی رنگ نظر آتا ہے:

میں طلسمِ ہستیِ موہوم ہوں
بے خبر انجام سے آغاز سے
(ریاض)

سنے ہیں نغمۂ ناقوس دیر میں ہم نے
اثر فریب یہ رنگینیاں اذاں میں نہیں
(ایضاً)

رکھا ہے پان دان تو اتنا نمایشی
لیکن نہ اس میں پان نہ کتھا نہ چھالیا
(ایضاً)

تری فریاد نے کھینچا دلِ شیخ و برہمن کو
طلسمِ تازہ باندھا وحشت جادو بیاں تو نے
(وحشت)

بیدم شاہ وارثی جو سلسلۂ آتش کے ممتاز شاعر نثار اکبرآبادی کے شاگردوں میں سے ہیں کہ ہاں ہندی اثرات زیادہ واضح ہیں۔ وحدت الوجود کے ساتھ ویدانتی اثرات کے تحت برہما اور آتما کے ایک ہونے کا تصور، وحدت ادیان، مذہب عشق، ہندی تلمیحات اور تصورات ان کی غزل میں ہندی رنگ رس پیدا کرتے ہیں:

سب نقش خیالی ہیں کعبہ ہو کہ بت خانہ
تو مجھ میں ہے میں تجھ میں اے جلوۂ جانانہ
یاں کافر ومومن کی تفریق ہے لا حاصل
سب یار کے جلوے ہیں اپنا ہے نہ بیگانہ
(بیدم)

تقسیم ہند کے بعد فراق گورکھ پوری نے اردو غزل کی کلاسیکی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اسے جدت سے ہم کنار کیا۔ انھوں نے ابتدا ہی میں اردو، انگریزی اور ہندی شعرا کے اثرات قبول کیے مگر ان کا رنگِ سخن ہندی کے قریب ہے۔ ان کے ہاں ہندی تہذیب کے چند عناصر ہی نہیں بلکہ ساری ہندوستانی تہذیب سے رشتہ استوار کرنے کی شعوری کوشش نظر آتی ہے۔ انھوں نے اردو غزل میں ہندی تہذیب کی روح کو سمونے کی کوشش کی ہے تاکہ یہ ایک نئی صورت میں ڈھل سکے۔ ویدانتی اثرات کے ساتھ، مذہبِ عشق، ہندی دیومالا، ہندی زبان، ہندی تصورِ عشق، ہندی تشبیہات اور بحور کا استعمال ان کی غزل میں ہندی رنگ پیدا کرتا ہے:

سب سنتے ہی آئے ہیں سب کہتے ہی آئے ہیں
افسانۂ ہستی کا آخر ہے نہ اوّل ہے
(فراق)

لٹکے لٹکے کالے گیسو، گورے گورے لمبے بازو
مل کے رواں ہیں گنگ و جمن، ساتھ خراماں رام و لکھن
(ایضاً)

برہ کی یہ راتیں ہیں کتنی سہانی
اب ایسے میں روٹھے پیا کو منا لے
(ایضاً)

یہ مست ادائیں ہیں کہ کعبے پہ گھٹا چھائی
یہ موجِ تبسم ہے کہ مندر میں چراغاں
(ایضاً)

ترقی پسند تحریک ادب کو حقیقت سے آشنا کرنے اور کچلے ہوئے طبقے کی نمایندگی کے طور پر سامنے آئی تھی۔ اس

نے اندھی تقلید کو قدامت پرستی قرار دیا۔ فکر و نظر کے نئے زاویے تراشے گئے۔ سیاست، ادب اور معاشرت میں ایک طرح کا انقلاب برپا ہوا۔ اس تحریک سے وابستہ شعرا نے اگرچہ نظم کو اظہار کا وسیلہ بنایا تاہم غزل کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ اس تحریک سے وابستہ غزل گوؤں میں جان نثار اختر، احمد ندیم قاسمی، جمیل ملک، ظہیر کاشمیری اور ادا جعفری ایسے شعرا کی صورت میں سامنے آتے ہیں کہ جن کے ہاں ہندی رنگ بھی مختلف صورتوں میں اپنا رنگ دکھاتا ہے۔ ان شعرا کے ہاں ہندی دیومالائی اشارے بھی ہیں اور ہندی مظاہر بھی۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں ہندی رنگ پیدا کرنے کے لیے ہندی الفاظ سے بھی کام لیا ہے:

اجڑی اجڑی ہوئی ہر آس لگے
زندگی رام کا بن باس لگے
ایک اک لہر کسی یگ کی کتھا
مجھ کو گنگا کوئی اتہاس لگے
(جاں نثار اختر)

ہنسی آتی ہے مجھ کو امتیازِ دشت و گلشن پر
گھٹا کعبے سے اٹھتی ہے، برستی ہے برہمن پر
(احمد ندیم قاسمی)

کون سے گھاٹ اترتے ہیں یہ رمتے جوگی
کس کو ملنے کے لیے نیل کنول جاتے ہیں
(جمیل ملک)

مٹا سکا ہے بھلا کوئی تاجدار اسے
جمیل دل سے بڑا سومنات کوئی نہیں
(ایضاً)

دونوں میں صرف لمس و تصور کا فرق ہے
جب ذکرِ بت کیا ہے تو ذکرِ خدا نہ کر
(ظہیر کاشمیری)

ناگ برہ کا ڈس لے گا
ڈھونڈو گے چاہت کی چھاؤں
(ایضاً)

میں تھی فرازِ کوہ سے پاتال تک ادا
سایہ مرا گلی میں مجھے ڈھونڈتا رہا
(ادا جعفری)

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اردو غزل کو ہندی سانچے میں ڈھالنے کا تجربہ جمیل مظہری نے کیا۔ انھوں

نے اپنے مجموعۂ کلام ''فکرِ جمیل'' میں ''پریم گیتا'' کے عنوان کے تحت غزلیں کہیں جو ہندی آمیز تھیں۔ ان غزلوں کی فضا، رنگ رس، دیو مالا اور اسلوب ہندی شاعری کی یاد دلاتے ہیں۔ اس تجربے کے دوررس اثرات مرتب ہوئے اور ان کے تتبع میں حلقہ اربابِ ذوق کے شعرا میں سے قیوم نظر، میراجی اور اختر ہوشیار پوری نے کچھ اسی طرح کے تجربات کیے۔ ان شعرا کے ہاں ہندی تصورِ عشق، ہندی دیو مالا اور تہذیبی مظاہر، وحدت ادیان اور اسلوب بیان پر ہندی زبان اور شاعری کے اثرات نظر آتے ہیں:

مسجد سے جمیل آیا ہے یہاں گانے دے پجاری گانے دے
یہ اپنے من کا روگی ہے، لیکن گھنشام کا جوگی ہے
(جمیل مظہری)

سوتے میں چونک اٹھتی ہیں سکھی ''اندر والا'' گھبراتا ہے
اٹھ اٹھ کر آدھی راتوں کو یہ بنسی کون بجاتا ہے
(ایضاً)

جیون جیوتی جاگ رہی ہے، چھوڑ بہانے، چھوڑ بہانے
تن من دھن کی بھینٹ چڑھا دے کیوں سپنوں کے تانے بانے
ناامیدی کے آکاش پر چمکا ہے آشا کا ستارہ
مندر میں اک دیو داسی سج کے آئی ناچ دکھانے
(میراجی)

ماتھے پر ٹیکا صندل کا اب دل کے کارن رہتا ہے
مندر میں مسجد بنتی ہے مسجد میں برہمن رہتا ہے
(قیوم نظر)

رُت بیت چکی ہے برکھا کی اور پیت کے مارے بیٹھے ہیں
روتے ہیں، رونے والوں کی آنکھوں میں ساون رہتا ہے
(ایضاً)

قیامِ پاکستان کے بعد حلقہ اربابِ ذوق کے پلیٹ فارم سے ابھرنے والے شعرا میں شہرت بخاری، حفیظ ہوشیار پوری اور انجم رومانی قابلِ ذکر ہیں۔ ان شعرا کے ہاں ہندی دیو مالائی اشارے، ہندی تصورِ عشق، ہندی مظاہر اور ہندی زبان کے اثرات قابلِ ذکر ہیں:

اپنا ہی عکس دیکھتا ہوں میں
آنکھ پڑتی ہے اب جہاں میری
(شہرت بخاری)

اگر طلسم نہیں زندگی تو پھر کیا ہے
گھٹا کا نام نہیں اور مینہ برستا ہے
(ایضاً)

جس کے ہاتھ میں راجا کھیلے پرجا اس کی داسی
تو نے جس کا ساتھ دیا ہے ، اس کے ساتھ خدائی
(ایضاً)

حرم ہو ، دیر ہو ، راہیں ہیں ایک منزل کی
کوئی ادھر سے تو کوئی ادھر سے گزرا ہے
(حفیظ ہوشیارپوری)

جنوں میں شیخ و برہمن ہیں کس قدر کامل
ہزار قافلۂ بے نشاں و بے منزل
(ایضاً)

رات گنوائے کھیل کر من مورکھ کے سنگ
دن کو مادھو پوتی ڈالے ، رنگ میں بھنگ
(انجم رومانی)

قیام پاکستان کے بعد اردو غزل میں جو سب سے منفرد اور توانا آواز ابھری وہ ناصر کاظمی کی تھی۔ ناصر کی غزل میں ماضی کی یادیں، تہذیب وتمدن کی تباہی، ہجر کی تخلیاں اور شکستہ خواب اپنے اردگرد پھیلے مظاہر سے نئے علامتی مفاہیم تراش لیتے ہیں۔ ناصر کی غزل میں ہندی رنگ، ہندی شاعری بالخصوص ہندی دوہے اور میر وفراق کے گہرے مطالعے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں سورداس، میرابائی اور کبیر سے ان کے ذہنی ربط کو' نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی غزل کے ہندی رنگ میں ہندی دیومالا، ہندی الفاظ کا ورتارا اور ہندی گیتوں کی نرمی اور گھلاوٹ قابل ذکر ہے:

کس دیوی کی ہے یہ مورت
کون یہاں پوجا کرتا تھا
کس گوری کے ہیں یہ کنگن
یہ کنٹھا کس نے پہنا تھا
(ناصر)

موہنے لبھانے والے پیارے پیارے لوگ
دیکھنا چمن چمن بسنت آ گئی
(ایضاً)

جدید غزل میں مجید امجد، ابن انشا، شان الحق حقی، صبا اکبرآبادی، سید عابد علی عابد، سید عبدالحمید عدم، جمیل الدین عالی، آنند نرائن ملا، ساغر نظامی، افقر موہانی، ہادی مچھلی شہری، تابش دہلوی اور کرم حیدری کے ہاں بھی ہندی اثرات واضح ہیں۔ فکری اعتبار سے یہ وحدت الوجود کے قائل ہیں اور حرم و دیر کو فسانہ قرار دیتے ہیں۔ ہستی کی حقیقت کو بھی کسی افسانے سے بڑھ کر نہیں جانتے، ویدانتی اثرات کے تحت برہما اور آتما کے ایک ہونے کا تصور بھی ان کے ہاں موجود ہے۔ عشق کو مذہب کا درجہ دینے کا رویہ بھی ان کے ہاں نظر آتا ہے۔ وحدتِ ادیان کا تصور جو اب تک اردو غزل کی روایت کا

حصہ بن چکا ہے ان کے ہاں بھی نظر آتا ہے۔ ان شعرا کے ہاں ہندی دیو مالا، ہندی کی شعری روایت، ہندی تصورِ عشق اور ہندی الفاظ کا ورتارا بھی نظر آتا ہے جو ان کی غزلوں میں ہندی رنگ رس پیدا کرتا ہے:

حرم و دیر فسانہ ہے ، یہی جلتی سانس زمانہ ہے
یہی گوشۂ دل ناصبور ہی کنجِ باغِ نعیم ہے
(مجید امجد)

یہ چھیل چھبیلا کون پھرے اس متھرا کی نگری میں سکھیو
سبھی باتیں کہ اپنے شیام میں تھیں اب دیکھو تو اس منموہن میں

کبھی من کے اجنتا میں آؤ وہ مورتیں تم کو دکھلائیں
وہ صورتیں تم کو دکھلائیں ہم کھو گئے جن کے درشن میں
(ابن انشا)

ہستی میں حقیقت کا کیا کھوج لگا چاہے
کچھ دیر میں ہستی خود افسانہ ہوا چاہے
(شان الحق حقی)

دعوتِ حق تھی فقط کفر کی ضد پر گویا
صوتِ ناقوس نہ آئی تو اذاں بھی نہ ہوئی
(ایضاً)

اپنے عکسِ ذات ہی کو دوسرا سمجھے تھے ہم
وہ ہمیں خود تھے جسے اپنے سوا سمجھے تھے ہم
(صبا اکبر آبادی)

کب تک اسیرِ وہم و عقائد رہے گی عقل
ٹوٹے گا دامِ سبحہ و زُنار دیکھنا
(ایضاً)

صندلی ماتھے کی بُندی ، ناخنوں کا سرخ رنگ
سر سے لے کر پاؤں تک وہ سندرتا یاد آ گئی
(سید عابد علی عابد)

بتوں کی جبینوں پہ قشقہ ہے عابد
کہ روشن چراغِ حرم دیکھتے ہیں
(ایضاً)

میں تیرے روپ منڈل کا جوگی
تو مرے دل کے مندر کی رانی
(عدم)

ایسی گیان اور دھیان کی باتیں ہم جانے پہچانوں سے
تو آخر بھولا ہی کیا تھا تجھ کو کیا یاد آئے گا
(جمیل الدین عالی)

میں فقط انسان ہوں ہندو مسلماں کچھ نہیں
میرے دل کے درد میں تفریقِ ایماں کچھ نہیں
(آنند نرائن ملا)

مرے من کے بہروپ مت پوچھ ساغر
کبھی ہے کنھیا کبھی بنسری ہے
(ساغر نظامی)

تمھارے ہی جلوؤں کی ہم روشنی کو
تجلیٔ دیر و حرم جانتے ہیں
(افقر موہانی)

ساٹھ کی دہائی اردو غزل کی تشکیل نو کے حوالے سے اہمیت کی حامل ہے۔ اس عہد میں ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کے نتیجے میں غزل میں ایمائی رنگ ابھرا اور شعرا نے تمثالوں اور استعاروں کے ذریعے سماجی گھٹن کا اظہار کیا اور بیان کے نئے نئے قرینے تراشے۔ اس عہد میں چند ایسے غزل گو سامنے آئے جنھوں نے اردو غزل کی لسانی تشکیل کی اور ہندی اثرات بھی قبول کیے۔ ان شعرا میں شیر افضل جعفری، ناصر شہزاد اور عبدالعزیز خالد کا نام سرِفہرست ہے۔ شیر افضل جعفری نے پنجاب کی تہذیب و ثقافت کے پردے میں ہندی دیو مالائی علامات، ہندی تصورِ عشق اور ہندی الفاظ کو بھی برتا ہے جبکہ ناصر شہزاد کے ہاں غزل اردو رسم الخط میں لکھی ہوئی ہندی شاعری ہے۔ جس کی مجموعی فضا ہندی اور ہندوستانی ہے۔ عبدالعزیز خالد کے ہاں ہندی علائم و رموز اور الفاظ ساری ہندی فضا کے پس منظر کو سامنے لاتے ہیں جو ان کی اس تہذیب سے آگاہی کا منہ بولتا ثبوت ہیں:

مری بات میں بانسری کے ترانے
یہ دنیا مجھے کرشن گردانتی ہے
(شیر افضل جعفری)

آرتی کرنے کو چونچال پجارن کی طرح
من کے مندر میں جلاتی ہے دیا موجِ شراب
(ایضاً)

رنگ سے ڈھنگ تک مختلف میں
مجھ کو اردو سمجھ لو کہ بھاشا
(ناصر شہزاد)

چھتیس سال کا کبھی سنیاس چھین کر
یہ کون لے گیا مرا بن باس چھین کر
(ایضاً)

بھوگنا پڑتا ہے ہر انسان کو کرموں کا پھل
بے وفا کو بے وفائی کی سزا مل کر رہے
(عبدالعزیز خالد)

مینکا کھنڈت میں ڈالے جاپ وشوامتر کا
زندگی بھر کی کمائی پل میں ماٹی میں ملے
(ایضاً)

ظفر اقبال اور سلیم احمد نے ساٹھ کی دہائی کی لسانی تشکیلات کی تحریک کو عملی جامہ پہنایا اور اردو غزل کے روایت شکنوں کے روپ میں سامنے آئے تاہم ان کے ہاں ہندی رنگ بھی کسی نہ کسی صورت میں ضرور جھلکتا ہے۔ ظفر اقبال نے تو بطورِ خاص ''ہنومان'' جیسا مجموعۂ کلام پیش کر کے ایک طرف نئی معنوی فضا اور دوسری طرف ہندی تہذیب کی عکاسی کی ہے۔

منیر نیازی نے نئی لسانی تشکیل کے برعکس غزل کی تخلیق کی طرف توجہ کی اور اس کے دامن میں بعض اہم گل بوٹے کھلائے مگر ہندی رنگ ان کے ہاں بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود رہتا ہے۔ وزیر آغا کی غزل میں دھرتی کی بوباس، رنگ، تہذیب الارواح، زرعی نظام، موسم اور مٹی کی تاثیر رچی بسی ہے۔ جس کے رنگ انھوں نے ہندی دیومالا اور زبان سے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے:

تم شہروں کے عطر گلال
ہم مورکھ بن باس بھرے
کیسا ہے انصاف ترا
کرے بھگت اور داس بھرے
(وزیر آغا)

جدید تر اردو غزل میں احمد فراز، جون ایلیا، حبیب جالب، شہزاد احمد، قتیل شفائی اور عزیز حامد مدنی کے ہاں ہندی رنگ اردو غزل کے کلاسیکی رنگ کے پردے میں نمود کرتا ہے۔ اس ضمن میں ان کے ہاں مذہبی رواداری، دیر و حرم سے ماورا انسانی عظمت، ہندی لفظیات، تشبیہات اور استعارات کے استعمال کی صورت نظر آتی ہے:

جانے یہ پیار سکھاتے ہیں کہ انکار فراز
ہم پہ بت خانہ و کعبہ و کلیسا نہ کھلے
(احمد فراز)

ہم کشمکشِ دیر و حرم سے ہیں بہت دور
انسان کی عظمت پہ نظر اپنی رہی ہے
(جالب)

دل میں آوارہ ہے یوں بیتے ہوئے لمحوں کا خوف
جس طرح مُردوں کی روحیں رات کو شمشان کریں
(شہزاد احمد)

بابا ذہین شاہ تاجی کی غزل اردو غزل کی صوفیانہ روایت کا حصہ ہے۔ وجودِ حقیقی محیط کل ہے، حرم، دیر، دنیا اور دین میں وہی جلوہ نما ہے:

حرم میں دیر میں دنیا و دیں میں
تمھیں تم ہو یہاں کیا ہے وہاں کیا
(ذہین)

جدید تر غزل کے نمایندوں میں احمد مشتاق، فرید جاوید، ساقی فاروقی، اقبال ساجد، اسلم انصاری، غلام محمد قاصر، قمر جمیل، انور شعور، خالد احمد، نجیب احمد، جمال احسانی، علی اکبر عباس، سلیم کوثر، غلام حسین ساجد، ظہیر فتح پوری، شاہدہ حسن، خورشید رضوی، ثروت حسین، افضل پرویز، پروین شاکر، صابر ظفر، حافظ لدھیانوی، تاج سعید، پرتو روہیلہ، حفیظ الرحمان احسن، رام ریاض، اختر احسن اور ڈاکٹر سفیان صفی کے ہاں بھی ہندی اثرات نظر آتے ہیں۔

۸۰ اور ۹۰ کی دہائی کی غزل کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اردو غزل جو فارسی کے زیر اثر پروان چڑھی ہے۔ اس نے جدید تر عہد میں اپنے لیے ایک نیا علامتی نظام تخلیق کر لیا ہے جو اس بات کا غماز ہے کہ اردو غزل اس خطے کی بو باس اور ذائقوں سے آشنا ہو چکی ہے اور اس میں جو رنگ پیدا ہو چکا ہے وہ اس کا اپنا ہے۔ جدید عہد میں اردو غزل کو اس رنگ سے آشنا کرنے میں کئی غزل گوؤں نے حصہ لیا ہے۔ ان شعرا میں احسان اکبر، نذیر تبسم، شبنم شکیل، فرحت عباس شاہ، ثمینہ راجہ، ایوب خاور، سلیم بے تاب، سعد اللہ شاہ، نوشی گیلانی، اقبال حسین، قمر رضا شہزاد، سعود عثمانی، افضال نوید، عباس تابش، اکبر معصوم، مقصود وفا، انجم سلیمی، آفتاب حسین، ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر ضیاء الحسن، طارق ہاشمی، رؤف امیر، شعیب آفریدی، احمد حسین مجاہد، اصغر عابد، ڈاکٹر عابد سیال، علی زریون، طاہر شیرازی، شاہین عباس، انعام ندیم، اختر عثمان، شناور اسحاق، نوید رضا، احمد فرید، حسن عباسی، ادریس بابر، محسن چنگیزی، خورشید ربانی، ارشد نعیم، محمد حنیف، احمد ادریس، اقبال حسین، ظہور چوہان، اختر رضا سلیمی، پرویز ساحر اور شہاب صفدر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ساٹھ کی دہائی میں ہندوستان میں پروان چڑھنے والی غزل کے نمایندوں میں سے جگن ناتھ آزاد، شاذ تمکنت، آزاد گلاٹی، شہریار، مغنی تبسم، بانی، خلیل الرحمان اعظمی، صادق دہلوی، ندا فاضلی، شجاع خاور اور زبیر رضوی نے بھی اردو غزل کے ہندی رنگ کو برقرار رکھا ہے۔

اردو غزل کے اس مختصر سے جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو غزل نے ہندوستان میں آمد کے بعد ہندی اثرات قبول کیے جو مذہبی، تہذیبی، دیومالائی، فکری اور لسانی حوالے سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔

ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا: اردو ترجمے کی ایک منفرد مثال

(پرورشِ لوح وقلم: فیض حیات اور تخلیقات، ایک تحقیقی وتنقیدی جائزہ)

ڈاکٹر رحمت علی شاد

ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا نے ماسکو کے علم شرقیات کے ادارے کی فرمائش پر یہ کتاب ''فیض احمد فیض: حیات اور تخلیقات'' ۲۰۰۱ء میں اردو ادب کے روسی طلبا کے لیے روسی زبان میں تصنیف کی اور جب اس کتاب کا اردو ترجمہ اسامہ فاروقی نے ماہنامہ ''سب رس'' حیدرآباد میں قسط وار شائع کرنا شروع کیا تو پتا چلا کہ یہ کتاب اردو قارئین کے لیے پوری طرح مفید اور دلچسپ ہے۔ قدرت کی ستم ظریفی کہ ابھی اس کی نو اقساط ہی اردو میں ترجمہ ہو پائی تھیں کہ اسامہ فاروقی کا انتقال ہو گیا بقیہ پانچ ابواب کا نہایت عمدہ اردو ترجمہ خود ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا نے بڑی محنت اور توجہ سے کیا اور اب یہ مکمل تصنیف بعنوان ''پرورشِ لوح وقلم: فیض حیات اور تخلیقات'' اوکسفرڈ یونیوسٹی سے شائع ہو چکی ہے اس کتاب میں فیض کو ایک نئے تناظر میں پیش کیا گیا ہے جو ان کے ذہنی وتخلیقی سفر کو سمجھنے میں مشعل راہ کا کام دے گی۔ یہ فیض کی زندگی اور ان کے ادبی کارناموں کی جامع تفصیل فراہم کرتی ہے جس میں ان کے نظریاتی اور اسلوبی پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس میں فیض کی شخصیت وفن کے وہ پہلو بھی شامل ہیں جن سے صرف ان کے روسی میزبان ہی واقف تھے۔

مذکورہ کتاب میں ایک نہایت اہم ادبی شخصیت کی زندگی اور ادبی کارناموں کا بھرپور علمی طریقے سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں نقد ونظر کا آفاقی معیار اور ساتھ ہی اندازِ بیان ایسا ہے کہ یہ یکساں طور پر اردو قارئین کے لیے بھی مفید اور دلچسپ ہوگی اس کے مطالعے سے فیض کی شخصیت اور ان کی شعری فنی وفکری پختگی نمایاں ہوتی ہے، اس میں چند باتیں ایسی آ گئی ہیں جو خود اردو قارئین کے لیے بھی نئی ہیں اور اس طرح روسی ماخذ بھی اچھوتے ہیں۔ اس تصنیف کی خوبصورتی یہ ہے کہ ان میں فیض کی ذات اور ان کی شخصیت اور حالاتِ عصر کو اس طرح گوندھا گیا ہے کہ یہ سب ایک وحدت، ایک اکائی بن گئے ہیں۔ اس طرح فیض کی غزلوں کے اشعار کا تجزیہ وتشریح خصوصاً فیض کی غزلوں کے روایتی رموز وکنایات، عصری مزاج اور خود فیض کی زندگی کے واقعات سے اس طرح پیوست ہیں کہ ظاہری طور پر کوئی سماجی اور سیاسی پہلو نہ ہونے کے باوجود شعر کا سیاسی رنگ نمایاں رہتا ہے، اس کی کچھ مثالیں اسیری کے کلام کے مطالعے میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اسیری کے کلام کے ارتقا کے حوالے سے ڈاکٹر لدمیلا نے ایک نکتہ یہ بھی بتایا ہے۔ لکھتی ہیں:

> ''اس کلام کو پڑھتے ہوئے آپ محسوس کریں گے کہ نظم، غزل کی طرف اور غزل، نظم کی طرف بڑھی ہے فیض کی بعض نظموں کے اشعار غزل کی طرح معلوم ہوتے ہیں اور اس طرح غزل کا شعر آسانی سے ایک پوری نظم میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔[1]

روس میں فیض احمد فیض کا نام سوویت زمانے سے مشہور ہے اور آج بھی ان کا کلام یہاں کے مشرقی شاعری کے شائقین میں مقبول عام ہے۔ روسی زبان میں فیض صاحب کے تقریباً پورے کلام کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان کے شعری مجموعے کم از کم دس ہزار کاپیوں کی تعداد میں شائع ہوتے تھے اور ہاتھوں ہاتھوں بک جاتے تھے۔ سوویت روس میں یہ شہرت وعزت اور یہ مقبولیت شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے حصے میں آئی ہو۔ ''پرورشِ لوح وقلم: فیض حیات اور تخلیقات''

مندرجہ ذیل چودہ ابواب پر مشتمل ہے۔ جن کے نام یہ ہیں:

(۱)۔افسانہ اور حقیقت (۲)۔لڑکپن (۳)۔جوانی (۴)۔آغازِ سفر
(۵)۔اپنے پرائے (۶)۔ایلس (۷)۔نقشِ فریادی (۸)۔فوج
(۹)۔راولپنڈی سازش کیس (۱۰)۔صلیبیں مرے دریچے میں (۱۱)۔اسیری کا کلام
(۱۲)۔منٹگمری سے ماسکو تک (۱۳)۔فیض احمد فیض اور سوویت یونین
(۱۴)۔مرے دل مرے مسافر

اب مذکورہ بالا چودہ ابواب کا ایک ایک کر کے مختصر تعارف اور مختصر تبصرہ اور تجزیہ پیش کیا جاتا ہے کہ ان ابواب میں ڈاکٹر لُد میلا وسیلیوا نے فیض کی شخصیت اور فن کو کس انداز سے دیکھا اور پرکھا ہے؟ علاوہ ازیں ڈاکٹر لدمیلا کو فیض کے بہت قریب رہ کر ان کی شخصیت اور ان کے کلام کو سمجھنے کا موقع ملا، اس پر مستزاد یہ کہ فیض صاحب کی مترجم کی حیثیت سے انہوں نے ان کی ہمراہی میں سابق سوویت یونین کے متعدد سفر بھی کیے ہیں۔

پہلے باب افسانہ اور حقیقت میں ڈاکٹر لُد میلا نے یہ بتایا ہے کہ فیض احمد فیض کو ان کی زندگی ہی میں ایک مستند شاعر اور کلاسیک کا درجہ حاصل ہو گیا تھا، یہ الگ بات ہے ان کی زندگی میں بدخواہی کے طوفان آئے اور تنقید کے جھکڑ بھی چلے لیکن ان تمام مسائل نے ان کی قوتِ ارادی میں مزید پختگی پیدا کی۔ فیض کے والد سلطان محمد خاں غیر معمولی شخصیت کے حامل ایک وکیل تھے۔ فیض سیالکوٹ سے تھوڑے ہی فاصلے پر واقع ایک گاؤں کالا قادر میں ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ فیض کی قسمت میں شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے وطن کو چار دانگ عالم میں دوبارہ شہرت دینے والا شاعر بننا لکھا تھا۔ مذکورہ باب میں مصنفہ نے فیض کی شخصیت، خاندانی پس منظر، قسمت، بحیثیتِ شاعر جائزہ لینے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔

دوسرا باب لڑکپن کے عنوان سے ہے۔ جس میں فیض کی ابتدائی مذہبی، روایتی تعلیم، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں سے واقفیت کی مکمل تفصیل ملتی ہے۔ اس کے بعد فیض نے کلاسیکی شاعری کی طلسماتی دنیا اپنے لیے اس وقت دریافت کی جب وہ دسویں جماعت کے طالب علم تھے۔ فیض خود بتاتے ہیں:

''جب دسویں جماعت میں پہنچے تو ہم نے تک بندی شروع کر دی اور ایک دو مشاعروں میں شعر پڑھ دیئے''۔۲

منشی سراج الدین کے کہنے پر فیض نے شعر کہنا ترک کر دیا مگر یوسف سلیم چشتی نے فیض کو شاعری کی طرف پھر لگا دیا۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے بعد فیض کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۹۲۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں بھیج دیا گیا۔ اس باب میں ڈاکٹر لُد میلا نے فیض کی پیدائش، بچپن، مسلمان گھرانوں میں رائج دستور کے مطابق مذہبی تعلیم، فیض پر والدین کے اثرات، لڑکپن میں تھیٹر اور ڈرامہ نگاری کا شوق، مشن سکول اور مرے کالج میں تعلیم، شاعری کی طرف رجحان، مشاعروں میں ابتدائی شرکت، پروفیسر یوسف سلیم چشتی اور مولانا میر حسن جیسے اساتذہ سے حصولِ علم اور اعلیٰ تعلیم کے لیے گورنمنٹ کالج کا انتخاب جیسے معاملات زیرِ بحث لائے ہیں۔

تیسرا باب '' جوانی '' کے عنوان سے ہے۔ تقریباً تمیں سال کے فرق سے جہاں علامہ اقبال نے تعلیم حاصل کی تھی وہاں یعنی گورنمنٹ کالج لاہور میں ہی فیض نے بھی تعلیم حاصل کی۔ فیض کے والد سلطان خاں، علامہ اقبال کے دوستوں میں سے تھے۔ فیض کو علامہ اقبال کی ہم نشینی کا موقع بھی کئی بار ملا۔ گورنمنٹ کالج کے اساتذہ کا طلبہ کے ساتھ مستقل ربط و ضبط وہاں کا معمول۔ تھا پروفیسر احمد شاہ پطرس بخاری انگریزی زبان و ادب پڑھاتے تھے۔ علاوہ ازیں صوفی تبسم کا شمار فیض کے اولین اساتذہ فن میں ہوتا ہے بعد میں ان سے گہرے دوستانہ مراسم بھی قائم ہو گئے۔ صوفی تبسم شاگردوں میں ہر دل عزیز اور مہمان نواز بھی تھے۔ ان کے گھر میں اکثر علم و ادب کی محفلیں منعقد ہوا کرتیں۔ صوفی تبسم

کے گھر میں ہی فیض، ڈاکٹر محمد دین تاثیر سے متعارف ہوئے۔ لاہور کے ایک کالج میں پرنسپل کے عہدے پر فائز بھی رہے اور ان کی شادی ایک انگریز خاتون کرسٹابل سے ہوئی تھی۔ تکمیلِ تعلیم کے چند سال بعد فیض، ڈاکٹر تاثیر کے ہم زلف بن گئے تھے۔ اس دور میں لاہور کے نوجوانوں کے حلقوں، محفلوں اور قہوہ خانوں میں فیض کے نام کی گونج سنائی دینے لگی تھی۔ فیض کو شعر خوانی کا گر نہیں آتا تھا۔ وہ دیگر شعرا کے برعکس جب اپنا کلام پیش کرتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے وہ اپنی ذات میں مستغرق ہوں اور انہیں سامعین سے کوئی واسطہ نہ ہو۔

ہمیں فیض کی زندگی میں ایک گمنام اور ناکام عشق کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ غمِ دل کے اس پہلے نجی تجربے نے شاعر کے ذہن کی قلب ماہیت کر دی، اس طرح ان کی شاعری ان کے دکھ درد کی آئینہ دار بن گئی اور اس سے ان کا لہجہ اور اسلوب اور بھی پر درد، پرزور اور پر اعتماد ہو گیا۔ اس باب میں مصنفہ نے فیض کی جوانی کے حالات، علامہ اقبال سے ملاقاتیں، گورنمنٹ کالج کے اساتذہ سے روابط، مشاعروں میں ابتدائی شرکت، فیض کے گمنام اور ناکام عشق کے احوال، کساد بازاری اور اقتصادی بحران کے دور کا ذکر اور ملازمت کے حصول کی تفصیل بھی نہایت عمدگی کے ساتھ بیان کی ہے۔

چوتھے باب کا عنوان آغازِ سفر ہے، جس میں ان کی عملی زندگی کا ذکر اور ذہنی تبدیلیوں کی بات کی گئی ہے۔ ایم اے او کالج امرتسر میں فیض ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۰ء تک بطور لیکچرر رہے، اس دوران ان کی عادات و میلانِ طبع میں ناقابل شناخت حد تک تبدیلیاں آ گئیں۔ اس شہر میں دراصل ایک نئے فیض نے جنم لیا جو دنیا کو دوسرے ہی زاویہ نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ اس دور میں مذکورہ کالج کے پرنسپل محمود الظفر اور ان کی اہلیہ رشیدہ جہاں دونوں میاں بیوی پر جوش سوشلسٹ تھے مزید برآں رشیدہ کمیونسٹ پارٹی کی ممبر بھی تھیں۔ محمود الظفر نے ایک چھوٹے سے مارکسی حلقے کی بنیاد ڈالی۔ جس کے شرکا میں کچھ مزدور شامل تھے۔ اس حلقے میں بنیادی طور پر مارکس اور لینن کی ان تصانیف اور روس کے سوشلسٹ انقلاب کے بارے میں ان کتابچوں پر تبادلہ خیال کیا جاتا جن پر غیر قانونی ہونے کی وجہ سے پابندی عائد تھی۔ فیض یکا یک خود اپنی توقع کے برخلاف سماجی اور سیاسی زندگی میں پوری طرح ڈوب گئے، اس کے بعد ڈاکٹر رشید جہاں نے فیض کو کارل مارکس کی ایک کتاب کمیونسٹ مینی فسٹو پڑھنے کے لیے دی اس کتاب نے فیض کو ہلا کر رکھ دیا۔ فیض کہتے ہیں کہ میں نے اس کتاب کو دو تین بار پڑھ ڈالا اور اس کتاب کو پڑھنے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا کہ کسی نے اس پورے خزینہ اسرار کی کنجی میرے ہاتھ میں تھما دی ہے۔ فیض اس کتاب کے متعلق بتاتے ہیں:

''انسان اور فطرت، فطرت اور معاشرہ، معاشرہ اور طبقات، طبقے اور ذرائع پیداوار کی تقسیم، ذرائع پیداوار اور پیداوری رشتے، پیداواری رشتے اور معاشرے کا ارتقا۔ انسانوں کی دنیا کے بیچ در بیچ اور تہہ بہ تہہ رشتے، ناطے، قدریں اور فکر و عمل سے متعلق اسرار و رموز تھے''۔ ۳

فیض کے رشحاتِ قلم میں پرزور آہنگ، کھنکھناتے قافیے، وطن اور دوستی، تنہائی اور انتظار جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین میں سرگرم شرکت کے دوران لکھی جانے والی فیض کی نظمیں مثلاً مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ، بول سیاسی لیڈر کے نام، متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے، صبحِ آزادی اور طوق دار کا موسم، اردو سماجی شاعری کے عمدہ نمونوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

پانچویں باب کا عنوان اپنے پرائے ہے۔ جس کے آغاز میں مندرجہ ذیل شعر درج ہے۔

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

فیض نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام میں اہم کردار ادا کیا۔ اس حوالے سے خلیق انجم لکھتے ہیں:

''ابتدا ترقی پسند تحریک نے اگر فیض کی شہرت اور مقبولیت میں اہم کردار ادا کیا ہے تو آج برصغیر

میں فیض کی شاعری کی وجہ سے ترقی پسند تحریک کی آبرو قائم ہے"۔۴

ترقی پسند مصنفین تحریک کا مرکزی گروہ پنجاب کے اردو ادیبوں فیض احمد فیض، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی ساحرلدھیانوی، مرزا ادیب، رہبر، اپندر ناتھ اشک وغیرہ پر مشتمل تھا۔ سجاد ظہیر سے ملاقات فیض کی زندگی میں ایک اہم سنگ میل ثابت ہوئی۔ جب چند ایک ترقی پسند مصنفین اعتدال سے شدت کی طرف چلے گئے تو فیض اس تحریک سے پیچھے ہٹتے چلے گے۔ ظلم و استحصال کا بالکل دوٹوک انداز میں پردہ فاش کرنے والے اور اس دورِ پرآشوب سے ہم آہنگ فیض کے اشعار بھی اعلیٰ شاعری کی خصوصیات سے متصف ہیں۔

چھٹا باب ایلس کے نام سے ہے۔ ۲۱۔ اپریل ۱۹۳۸ء کو علامہ اقبال کا انتقال ہوا۔ فیض نے اس نقصان کو بڑی گہرائی سے محسوس کیا۔ علامہ اقبال کے جانے سے وہ رشتے ٹوٹ گئے جن کے سرے ان کے لڑکپن۔ نوجوانی اور والد کی یادوں تک پہنچتے تھے۔ اقبال کی وفات کے متعلق رابندر ناتھ لکھتے ہیں:

"سر محمد اقبال کی موت اردو ادب کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اس اندروناک زخم سے نبٹنے کے لیے اسے بہت عرصہ درکار ہوگا"۔۵

۱۹۳۸ء کے آخر میں ایلس کیتھرین امرتسر آئیں اور محمد دین تاثیر کے گھر کچھ دن کے لیے مہمان ٹھہریں وہ ڈاکٹر تاثیر کی اہلیہ کی چھوٹی بہن تھیں۔ ایلس غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل نوجوان خاتون تھیں۔ انہیں نہ صرف فرانسیسی اور ہسپانوی زبانوں پر قدرت حاصل تھی بلکہ فن ادب مصوری اور موسیقی سے بھی شغف تھا۔ ڈاکٹر تاثیر کے ہاں شام کی محفلوں، چائے نوشی اور ررات کی دعوت طعام کا اہتمام اکثر ہوتا تھا جن میں کافی لوگ اکٹھے ہوتے تھے۔ ایلس کی توجہ ایک سادہ مزاج، حیرت انگیز طور پر کم سخن نوجوان کی طرف مبذول ہوئی جو تاثیر اور اس کے مہمانوں میں تقریباً ہمیشہ شامل رہتا تھا۔ وہ فیض تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے متعارف ہوئے اور اچھے دوست بن گے حالاں کہ ایلس اور فیض ظاہری شکل وصورت اور مزاج دونوں ہی اعتبار سے ایک دوسرے کے بالکل برعکس تھے۔ ایلس دراز قد اور نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والی لڑکی تھی جبکہ فیض سانولے رنگ، میانہ قد، بھوری مائل آنکھوں اور کالے بالوں والے آدمی تھے۔ مزاج کے اعتبار سے ایلس بائیں بازو کی سرگرم رکن وہ لوگوں سے باآسانی بے تکلف ہو جاتی تھیں اور ایک اعتبار سے انتہا پسند بھی تھیں۔ اس کے برعکس فیض مجمع دوستاں میں خاموش بیٹھنے والے کم گو اور سنجیدہ انسان تھے۔ بہر حال دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ایلس کی محبت فیض کے لیے شاعرانہ وجدان ثابت ہوئی۔ ۱۹۴۱ء کے نصف آخر کے دو واقعات یعنی ان کی شادی اور ان کے پہلے شعری مجموعے کی اشاعت فیض کی زندگی میں خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ساس نے ایلس کا نام کلثوم رکھا دونوں کی شادی اکتوبر ۱۹۴۱ء، بمقام سری نگر اسلامی شریعت کے مطابق ہوئی اور نکاح خواں شیر کشمیر شیخ عبداللہ تھے۔

باب نمبر سات نقش فریادی کے نام سے ہے۔ ۱۹۴۱ء کے آخر میں جب فیض اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ واپس لاہور آئے تو انہیں آتے ہی ان کا پہلا شعری مجموعہ کلام "نقش فریادی" تازہ بہ تازہ مطبع سے موصول ہوا۔ فیض کے کلام کی خوبیوں میں لفظوں کے تخلیقی استعمال، توانائی اور دل کش تمثالوں میں بلا کی انفرادیت اور تازگی کی نشان دہی کی گئی۔ درحقیقت یہی مجموعہ بحیثیت شاعر فیض کی شہرت کا سنگِ بنیاد بنا۔ اس مجموعے کے پہلے حصے کا بیشتر کلام عاشقانہ شاعری ہے۔ جس کے محرکات ادبی موضوعات اور عہد جوانی کے سپنے اور جذبات تھے۔ اس بارے ن۔ م راشد لکھتے ہیں:

"فیض کی اس زمانے کی نظمیں خواب سے چور اور لذت سے سرشار تصویروں سے بھری پڑی ہیں۔
ان نظموں میں شاعر خود اپنے ساتھ سرگوشی کرتا سنائی دیتا ہے۔ "تنہائی" میں یہی سرگوشیاں زیادہ پراسرار، زیادہ فریب انگیز ہوگئی ہیں۔۶

مذکورہ مجموعے کے دوسرے حصے میں فیض کی شاعری میں حیرت انگیز تبدیلی نظر آتی ہے۔ان کی شاعری، ان کی ذات اوران کے زمانے دونوں کا پتہ دیتی ہے۔شاعر کے ذہن میں دو اصولوں اور دو مختلف آوازوں کی کشمکش کا اظہار ملتا ہے۔ایک آواز مثالی ورومانی عشق کی طرف اور دوسری زندگی کی تلخ حقیقت کی طرف،لیکن خیالات کا یہ سلسلہ غم عشق سے شروع ہو کر غم جہاں تک پہنچتا ہے۔فیض روایتی مضامین کو نیا مفہوم دیتے ہیں اور پرانے استعاروں کی ماہیت تبدیل کر دیتے ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا نظم تنہائی کے حوالے سے بتاتے ہیں:

''میں نے نظم تنہائی کا مطالعہ شروع کیا تو پہلی ہی لائن نے جیسے مجھے پکڑ لیا، پھر جیسے جیسے میں آگے بڑھا ایک عجیب پُراسراری کیفیت نظم سے برآمد ہو کر مجھے اپنے طلسمی ہالے میں جکڑتی چلی گئی۔نظم ختم ہوئی تو میں بالکل تبدیل ہو گیا تھا''۔ ۷

نظم تنہائی ۱۹۳۶ء کے بعد تخلیق ہوئی۔اس نظم میں موجود محدود شعری فضا میں ٹوٹتی ہوئی امید اور تنہائی کے المیے کی پوری کہانی سما گئی ہے۔انتظار کے اس جذبے نے تاروں سے لے کر زمین تک ساری کائنات کو اپنی گرفت میں لیا ہے۔صرف دو اشعار بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

پھر کوئی آیا دل زار! نہیں کوئی نہیں
راہ رو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ

مذکورہ کتاب کے آٹھویں باب کا عنوان ''فوج،، ہے۔۱۹۴۰ء کی دہائی میں یورپ میں دوسری جنگ عظیم کی شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ہٹلر قیادت میں نازی جرمنی نے سوویت یونین پر حملہ کر دیا تھا۔۱۹۴۲ء میں فیض کو میجر اور پھر ۱۹۴۴ء میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ملازمت سے واپس گھر آ کر فیض گھریلو ماحول میں پوری طرح ڈوب جاتے۔۱۹۴۲ء میں بیٹی سلیمہ پیدا ہوئی، جسے گھر میں چھمی کے نام سے پکارا جاتا تھا اور دوسری بیٹی منیزہ ۱۹۴۵ء میں پیدا ہوئی جسے میزو کہہ کر پکارا جاتا تھا۔فیض کی شاعری نہایت دل کش، خوش آہنگ، جاذب توجہ، استعاروں اور انوکھی تشبیہات سے بھری پڑی ہے۔۱۹۴۰ء کی دہائی میں ہندستان کے ترقی پسند شعرا کی تخلیقات میں مستعمل ان استعاروں اور علامات کا براہ راست تعلق ملک کی تحریک آزادی سے ہوا کرتا تھا۔شام وسحر، سرخ وسیاہ، چشم اشک بار اور زنجیر کی جھنکار جیسی علامات اور یہ سارا ذخیرہ الفاظ ۱۹۵۰ء کی دہائی کے انقلابی رومان پسندوں کی اور ترقی پسندوں کی شاعری کے لیے مخصوص تھا۔

ایک خصوصی حکم نامے کے ذریعے فیض کی ترقی ہوگئی۔اس عہدے کا نام Chief Advisor ISMD یعنی محکمے کا مشیر اعلیٰ تھا۔نئے تقرر کے چند ہی دنوں بعد کسی وضاحت کے بغیر لیفٹیننٹ کرنل فیض احمد فیض نے رخصت کی درخواست دے دی اور روزنامہ پاکستان ٹائمز کے مدیر اعلیٰ بن گئے۔چھمی اور میزو کے ساتھ ایلس کچھ دن بعد فیض کے ساتھ لاہور منتقل ہوگئیں۔

باب نمبر نو ''راول پنڈی سازش کیس'' کے آغاز میں یہ شعر درج ہے۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا — وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

پاکستان ٹائمز کو صحافت میں ایک مستحکم مقام حاصل ہو چکا تھا اور اس کا سہرا سب سے بڑھ کر مدیر اعلیٰ کے سر جاتا تھا۔ایلس نے گھریلو تمام ذمہ داریاں بخوبی سنبھال لی تھیں۔ جب فیض پابند سلاسل ہوئے تو ایلس نے اخبار کی باقاعدہ ملازمت اختیار کر لی۔دگرگوں حالات میں فیض کی انگریز بیوی کے لیے آسائشوں کے فقدان کا خود کو عادی بنا لینا کتنا دشوار

رہا ہوگا۔ اپنے بوسیدہ کرائے کے مکان کے متعلق ایلس بتاتی ہیں:

''جس کرائے کے مکان میں ہماری رہائش تھی کافی بوسیدہ تھا۔ اس کی دراڑوں میں بچھو اور حشرات الارض رہتے تھے۔ اپنے ماں باپ کو میں نے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ وہ احتیاط سے کام لیں۔ بڑی دراڑوں والی دیوار کے پاس نہ بیٹھیں۔ ننگے پاؤں نہ چلیں وغیرہ وغیرہ''۔۸

نئی مملکت کے قیام کو چار برس ہو چکے تھے۔ ملک میں ہر طرف افراتفری کا راج تھا۔ فیض کی گرفتاری کے دن وزیراعظم پاکستان کا بیان کہ ملک کے ایک بیرونی طاقت کے ایجنٹوں کی سرکردگی میں ایک سازش کا پردہ فاش ہوا، جس کا مقصد حکومت کا تختہ الٹنا، موجودہ نظام سیاست کا بدلنا اور کمیونسٹ طرز کی حکومت کی تشکیل ہے، اس لیے اصل گناہ گار کمیونسٹ قرار دیئے گئے اور فیض کا شمار صفِ اول کے سازشیوں میں تھا اور ان کو ایک عرصے سے پاکستان کی سب سے زیادہ خطرناک بائیں بازو کی شخصیت سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ۹۔ مارچ ۱۹۵۱ء کی صبح کم و بیش بارہ مسلح پولیس والوں نے فیض کو پکڑ کر جیل میں بند کر دیا۔

ملک میں چاروں طرف ایک دہشت اور سراسیمگی کی فضا تھی۔ گرفتاریوں کی ایک لہر دوڑ گئی نہ صرف راولپنڈی کے شرکا جیل میں پہنچ گئے بلکہ متعدد دوسرے افراد جو ''پاکستان ٹائمز'' اور ''امروز'' کے کارکن تھے ان کو بھی جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ ایک عرصے تک حکام ان گرفتاریوں کا کوئی قانونی جواز پیش نہیں کر سکے۔ کئی دنوں بعد اطلاع ملی کے میجر جنرل اکبر خاں وغیرہ کی گرفتاری ''سازشِ بنگال'' کی بناپر ہوئی ہے اور یہ سب مضحکہ خیز دکھائی دیتا تھا چنانچہ قومی مجلس مقننہ کو حکم بابت راولپنڈی سازش کیس نام کی ایک نئی قرارداد منظور کرنا پڑی اور بات کا بتنگڑ بنایا گیا۔ مقدمے کے آغاز تک تین ماہ فیض قید تنہائی میں رکھے گئے۔ پہلے سرگودھا پھر لائل پور کی جیل میں۔ فیض کو ملاقات کی اجازت نہ تھی اور نہ ہی خط و کتابت کی۔

دسویں باب ''صلیبیں میرے دریچے میں''۔ میں ڈاکٹر لدمیلا بتاتی ہیں کہ گرفتار شدگان پر کیا بیتی؟ اس بارے میں مکمل لاعلمی کے تین مہینوں کے دوران فیض اور ایلس دونوں کی تشویش اور ذہنی اذیت کا بس اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔ ایک طرف ننھی منھی دو بیٹیوں کی دیکھ بھال اور دوسری طرف سیاسی مجرم کی بیوی ایلس اور ان کا گھر خفیہ پولیس کی کڑی نگرانی میں تھا اس سب کے باوجود ایلس نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ خطوط جو فیض نے ایلس کو ایامِ اسیری میں لکھے وہ ۱۹۷۲ء میں'' صلیبیں مرے دریچے میں'' کے عنوان سے شائع ہوئے۔ عالمی تہذیب کی انتہائی اہم علامتوں میں سے ایک اہم علامت صلیب ہے جو صدیوں سے لوگوں کے شعور میں اذیت اور موت کے پیکر خیال سے جڑی ہوئی ہے۔ بیوی کے بارے میں مستقل فکر اور تشویش بھی فیض کی بڑی حد تک یورپی تہذیب کے بعد مخصوص صلیب کی علامت کا خیال دلا سکتی ہے۔

فیض کے پاس اپنے دکھوں کا مداوا یہ خطوط اور شعر گوئی ہی تھا، جس سے وہ اپنا کتھارسز کر لیا کرتے تھے۔ راولپنڈی سازش کیس کے متعلق حکام کسی بھی طرح کا ثبوت فراہم نہ کر سکے۔ مگر اس کے باوجود معاملے نے خطرناک صورت حال اختیار کر لی اور ملزموں پر عمر قید یا سزائے موت منڈلانے لگی تھی۔ فیض نے جیل میں رہ کر اپنے روسی اور دینی مطالعے کو بہت وسیع کر لیا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں جولائی کے تپتے ہوئے ایک دن فیض بہت خوش تھے کہ ان کے بڑے بھائی طفیل ان کو ملنے آ رہے تھے لیکن یہ ملنا مقدر میں نہ تھا جیل کے دروازے تک پہنچے ہی تھے ان کو دل کا دورہ پڑا اور وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ بھائی کی موت کا صدمہ کتنا اذیت ناک تھا جو بیان سے باہر ہے لیکن فیض کا رنج اور غم بھائی کے مرثیے میں سمو گیا۔

فیض کی دوسری کتاب ''دستِ صبا'' دسمبر ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی۔ ایک ہفتے بعد سازش کیس فیصلہ میں قید چار سال رہ گئی پھر ان کو ساہیوال کی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ سگریٹ بہت زیادہ پینے لگ گئے اور رہائی کی شدید خواہش پیدا ہو گئی پھر آخر کار ۱۹۵۵ء میں فیض رہا ہو کر ایلس اور اپنی دونوں بیٹیوں کے ہمراہ لاہور اپنے گھر واپس آ گئے۔ فیض کی اسیری کے مجموعے دستِ صبا اور زنداں نامہ کے ساتھ ۱۹۶۵ء میں دستِ تہِ سنگ سے فیض کو اردو کے صفِ اول کے شاعر کا رتبہ ملا۔

باب نمبر گیارہ ''اسیری کا کلام'' کے عنوان سے ہے۔ فیض کی اسیری کے چار برس کے اندر اندر ان کے دو مجموعے دست صبا اور زندان نامہ شائع ہوئے۔ قید خانے میں جتنے اشعار لکھے گئے ہیں ان کی تعداد فیض کی ساری زندگی کے پورے کلام کے تقریباً دو تہائی کے برابر ہے۔ دست صبا فیض نے ایلس کلثوم کے نام منسوب کیا۔ اسیری کے برسوں میں فیض کی شاعری کا معنویاتی نظام بنیادی طور پر بن چکا تھا۔ فیض نے اپنے خصوصی طرز کو تراشا۔ بعض نئے شعری طور طریقے ایجاد کیے۔ اپنی پسندیدہ لفظی ترکیبوں، شعری پیکروں، تشبیہوں اور استعاروں کو نمایاں کیا اور اپنی شاعری کو زندگی کے نئے تجربوں سے مالا مال کیا۔ انہی نظموں اور غزلوں میں فیض کا منفرد خصوصی رنگ نکھر گیا ان پر جو مہر لگی وہ آئندہ بھی فیض کی شاعری کی شناخت ثابت ہوئی۔ بقول شاعر:

ہم نے جو طرز فغاں کی ہے قفس میں ایجاد — فیض گلشن میں وہی طرز بیاں ٹھہری ہے

فیض کے کلام کی جو اہم خصوصیت ہے وہ دو بنیادی جذبات کے امتزاج سے منسلک ہے جن میں سے ایک تو اسیری کا رنج و غم ہے اور دوسرا حب الوطنی کا شدید جذبہ۔ اسیری کی ان پہلی چھ تخلیقات میں جن موضوعات، لفظیات اور شعری پیکروں کا ایک استوار دائرہ بنا تھا یہ سب بعد کی شاعری میں بھی فیض کے کلام کی خصوصیات کی حیثیت سے پہچانی جانے لگیں۔ ان کی لفظیات اور صنعتیں جو بنیادی طور پر کلاسیکی شعری تصوف میں رہیں انہوں نے جدید ماحول کے اور دور حاضر کے عناصر کو اس قدر جذب کیا کہ خود غزل کے اصطلاحی نظام میں تبدیلی رونما ہوئی۔ فیض کی اسیری کی پہلی تخلیق ''طوق و دار کا موسم'' ہے پہلا شعر ملاحظہ فرمائیں:

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم — نہیں ہے کوئی بھی موسم، بہار کا موسم

اس کے بعد فیض کی ایک اور غزل کا مطلع دیکھیے جس میں انتظار کے ساتھ دل کی کیفیت اور ماحول کی تصویر کشی بھی ملتی ہے۔

تم آئے ہو نہ شب انتظار گزری ہے — تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے

فیض کی حبسیات میں معاشرہ، سماج اور سیاسی زندگی سے وابستہ موضوعات، انسانی جذبات کے آئینے میں منعکس ہوتے ہیں واقعات اور امر خصوصی شکلیں بناتے ہیں۔ روایتی کلاسیکی موضوعات، استعارے اور اصطلاحات لے کر ان کو عصری شاعری کا جزو بنانا اور اس کے ساتھ ساتھ نئے تازہ پیرائے اور طریق اظہار ڈھونڈنا شاعر کا بنیادی مقصد ہوتا ہے۔ شاعر نے ناکامیوں سے کام لے کر جیل خانے کو اپنی شعری تجربہ گاہ میں تبدیل کیا۔ جب مقید شاعر کے اشعار جیل سے باہر نکل کر عوام تک پہنچ جاتے تھے تو وہ ان کو اس بات پر غور کرنے کی دعوت دیتے تھے کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے؟ فیض کی شاعری انسان کو اپنے گھر کی چار دیواری سے نکل کر دنیا کے غموں کی بھی فکر کرنے پر مجبور کرتی تھی۔

مذکورہ کتاب کا بارھواں باب بعنوان ''منٹگمری سے ماسکو تک'' ہے۔ فیض کی اسیری کے دوران ملک میں کئی سرکاری بحران یکے بعد دیگرے آئے۔ ۱۹۵۵ء میں منٹگمری جیل سے رہائی کے بعد جب فیض لاہور لوٹ آئے تو پھر سے وہ پاکستان ٹائمز میں کام کرنے لگے وہ پہلے کی طرح اخبار کے مضامین میں دوٹوک انداز میں سرکاری سیاست کے خلاف آواز اٹھاتے تھے ۱۹۵۶ء میں ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین نے دلی میں ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس کا انعقاد کیا۔ پہلا دعوت نامہ فیض کے نام بھیجا گیا۔ یہ آزاد ہندوستان کا ان کا پہلا دورہ تھا۔ اب دلی میں فیض، سجاد ظہیر، ملک راج آنند، کرشن چندر اور دوسرے سب یار پھر سے اکٹھے ہو گئے۔ ۱۹۵۸ء میں پاکستان میں مارشل لا نافذ ہوا اور ہر شعبہ حیات میں سختیاں بڑھنے لگیں تو اس طرح سارا اقتدار ملک کے نئے سربراہ جنرل ایوب خاں کے ہاتھوں میں مرکوز ہو گیا۔ حسب معمول فیض پھر سے جیل میں بھیج دیئے گئے۔ اس دور کی نظموں میں اڑے اڑے رنگوں، مبہم سے کنایوں اور دھواں دھواں سے پیکروں کی

بدولت ادھورے پن کا اور راز بھرا ماحول پیدا ہو جاتا ہے اور اشعار کا صوتیاتی حسن تاثیر میں اضافہ کر دیتا ہے۔

اس بار فیض جب رہا ہوئے تو بائیں بازو کی سبھی تنظیمیں جن سے فیض کا گہرا تعلق تھا بند ہو چکی تھیں۔ پاکستان امن کونسل مزدوروں کی ٹریڈ یونین اور ترقی پسند مصنفین کی انجمن، ان سب کی سرگرمیوں پر پابندی عائد ہو چکی تھی۔ فیض کو ان ناگوار حالات کا شدید احساس ہوا۔ اسی دور میں ان کو لینن امن ایوارڈ سے بھی نوازہ گیا، مذکورہ ایوارڈ کے دیئے جانے کے بعد بین الاقوامی میدان میں فیض کا وقار اور زیادہ بڑھا۔ سوویت یونین میں فیض کا سب سے پرخلوص، سب سے گرم جوش اور پرتپاک استقبال کیا جاتا تھا۔

تیرھواں باب ''فیض احمد فیض اور سوویت یونین'' کے نام سے ہے۔ فیض احمد فیض کی باشعور زندگی کا زیادہ تر حصہ سوویت یونین سے وابستہ رہا۔ فیض جیل میں ہی تھے کہ ماسکو میں سوویت اخبار نے فیض کے متعلق لکھا کہ سامراج کے خلاف دلیر مجاہد، جو اپنے ترقی پسند خیالات کی وجہ سے جیل میں مصیبتیں جھیل رہا ہے۔ ۱۹۶۲ء کے بعد فیض کی نظموں اور غزلوں کے تراجم کے پورے مجموعے نکلنے لگے۔ صرف روسی زبان میں فیض کی کتابوں کی تعداد اشاعت ۲ لاکھ، ۱۰ ہزار کاپیوں سے زیادہ ہوئی اشاعت کی خاصی بڑی تعداد کے باوجود فیض کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ بک جاتی تھیں۔ ۱۹۶۲ء میں ہی فیض کو جب لینن امن کے انعام سے نوازا گیا تو سوویت ماس میڈیا میں فیض کی وسیع ترین پبلسٹی ہوئی تھی۔

ایک نامور انشا پرداز اور مترجم مریم سالگانیک دراصل وہی خاتون ہیں جنھوں نے فیض کو روسی قارئین سے روشناس کرایا اور پاکستانی شاعر کو اپنے سوویت اہل قلم برادران سے ملایا۔ مریم سالگانیک نے روسی زبان میں فیض کی اردو اور انگریزی نظموں اور نثر کا ترجمہ کیا اور روس کے اہم ترین اخباروں اور رسالوں کے لیے فیض کے انٹرویو لیے۔ جیل کے زمانے میں شہرہ آفاق کلام کے بعد فیض کے قلم سے جتنی بہترین نظمیں اور غزلیں تخلیق ہوئیں ان میں سے متعدد ماسکو ہی میں وجود میں آئیں۔ ان میں رومانی طرز کی تخلیقات کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ سوویت ملک اور پاکستان کے عوام کے درمیان باہمی مفاہمت اور دوستی بڑھانے کی خاطر فیض احمد فیض کی مسلسل کوششوں کو دونوں ممالک کی قوموں کی دوستی استوار کرنے میں ان کے کردار کی جتنی بھی قدر کی جائے وہ ناکافی ہی ہوگی۔ فیض کے اعزاز میں منعقدہ ایک جلسے میں ماسکو میں مقیم پاکستانی سفیر جناب افتخار علی نے اپنی استقبالیہ تقریب میں کہا تھا:

> ''میں نہیں بلکہ فیض صاحب روس میں میرے ملک کے اصلی سفیر ہیں کیوں کہ وہ حکومت کے نہیں بلکہ پاکستانی عوام کے سفیر ہیں''۔ ۹

مذکورہ کتاب کا آخری اور چودھواں باب ''مرے دل مرے مسافر'' ہے۔ جس کے آغاز میں مندرجہ ذیل شعر درج ہے۔

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں ۔۔۔ جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

ستر کی دہائی میں بہت سے ایسے اہم واقعات رونما ہوئے جن سے فیض احمد فیض کی زندگی بہت متاثر ہوئی۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان تقسیم کے المیے سے گزرا۔ جس نے پھر سے خوف ناک سنگ دلی اور خونریزی کے واقعات کی بدولت تقسیمِ ہند کی یاد دلا دی۔ دسمبر ۱۹۷۱ء میں پاکستان میں فوجی نظام ختم ہوا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے لیڈر ذوالفقار علی بھٹو کو ملک کا اقتدار سونپا گیا اور انہوں نے صدر پاکستان کی ذمہ داری اٹھائی۔ حکمران پارٹی نے اپنے عملی پروگرام کے تین بنیادی اصولوں کا اعلان کیا اسلام، جمہوریت اور سوشلزم۔ سوشلسٹ اصلاحات کے ذریعے انصاف کے سماج کی تعمیر کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ پاکستان میں شہری حکومت کی تشکیل ہوئی اور اصلاحات ہونے لگیں۔ فیض صاحب کو وزارت تعلیم کے ثقافتی امور کے مشیر کا عہدہ دے دیا گیا۔ اگست ۱۹۷۷ء میں بھٹو کا دور جو فیض کے لیے نسبتاً خوشگوار تھا ختم ہو گیا۔ پاکستان میں ایک بار پھر فوج کی مطلق العنانی قائم ہوئی۔ ایک اور آمر، جنرل ضیاء الحق برسرِ اقتدار آ گیا۔ حکومت اور

آئین ساز ادارے برخاست کر دیے گئے۔ مارشل لاء نافذ کیا گیا۔ پابندیاں، تلاشیاں اور گرفتاریاں ہونے لگیں۔ خود بھٹو کو اور دیگر سابق اعلیٰ عہدے داروں کو جیل میں بند کر دیا گیا۔

فیض کے مکان کے دروازے پر مسلح سپاہی صبح سے شام تک پہرہ دیتے تھے۔ فیض جہاں جہاں جاتے ایک سپاہی ان کے تعاقب میں رہتا۔ فیض پر ان ساری باتوں کا بہت ناگوار اثر پڑ رہا تھا۔ ان کو کسی وقت بھی مقید کیا جا سکتا تھا۔ ۱۹۷۸ء کے اوائل میں فیض نے ملک چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے عملی جامعہ پہنانے میں کوئی دیر نہ لگی۔ ایک صبح فیض ہاتھ میں سگریٹ لیے گھر سے نکلے پہرہ دینے والے سپاہی نے سوچا ہوگا کہ فیض حسب معمول چہل قدمی کرتے جا رہے ہیں ابھی آ جائیں گے۔ وہ فیض کے پیچھے نہیں گیا اپنی جگہ پر بیٹھا رہا لیکن اب کی بار چہل قدمی کرتے کرتے فیض ہوائی اڈے پر پہنچے، ہوائی جہاز میں بیٹھے اور ملک سے باہر چلے گئے۔ بقول فیض احمد فیض:

''یہ خود اختیار جلا وطنی تھی۔ ماسکو میں اپنے دوستوں کو انہوں نے دل کھول کر بتایا تھا کہ گرفتاری کا بہت خطرہ تھا جب کہ جیل میں رہنے کی اب عمر نہیں رہی''۔۱۰

فیض اپنے ملک سے سیدھا بیروت پہنچے اور چند دنوں کے بعد ماسکو چلے گئے۔ جلد ہی ایلس بھی فیض کے پاس روس پہنچ گئیں سوویت یونین کے ٹوٹ جانے کے ساتھ ہی افروایشیائی ادیبوں کی تحریک اور اس کی انجمن اپنے ترجمان رسالہ ''لوٹس'' کے ساتھ نیست و نابود ہو گئیں۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اب اکثر فیض کو وطن لوٹنے کا خیال آتا تھا۔ اب انہیں اپنے وطن میں خطرہ درپیش نہیں تھا۔ موسم خزاں میں فیض کو پھر اپنے گاؤں جانے کا، گاؤں والوں سے ملنے کا اور اپنی بنوائی ہوئی مسجد میں نماز ادا کرنے کا اشتیاق ہوا۔ کالا قادر سے لاہور لوٹنے کے بعد فیض کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر کے مشورے پر گھر والے ان کو ہسپتال لے گئے۔ ہسپتال سے فیض گھر نہیں لوٹے۔ چہتر سال کی عمر میں ۲۰۔ نومبر ۱۹۸۵ء کو دوپہر کے وقت فیض صاحب وفات پا گئے۔ یہ خبر شعلے کی طرح اٹھی، پاکستان اور پاکستان سے باہر ساری دنیا میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ فیض کے متعلق ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''فیض کی موت ایک ایسا سانحہ ہے، جس کا غم ہماری نسل کو ہمیشہ اسی طرح یاد بن کر ستاتا رہے گا جس طرح خود فیض صاحب کے اہل خاندان کو''۔۱۱

فیض کے آخری دور کے کلام کا ایک گہرا انفرادی رنگ ہے جو شاعر کی ذہنی کیفیت کا آئینہ دار ہے بہر حال یہ ایک تسلیم شدہ بات ہے کہ علامہ اقبال کی طرح فیض بھی اردو کے نظریاتی شاعر تھے اور وہ اپنے آخری دم تک شاعر کا فرض نبھاتے رہے یعنی ''پرورش لوح و قلم'' کرتے رہے۔

مذکورہ کتاب ''پرورش لوح و قلم: فیض حیات اور تخلیقات'' میں ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا نے فیض احمد فیض کے دور اور خود ان کی زندگی کے واقعات کے پس منظر میں ان کے کلام کا تجزیہ کرنے کی عمدہ سعی کی ہے۔ ڈاکٹر لامیلا نے فیض احمد فیض کی شخصیت اور فن کو ایک کتاب کی صورت میں چودہ ابواب میں ایک خاص ربط اور تسلسل کے ساتھ اس طرح منقسم کیا ہے کہ گویا ان کی سوانح عمری بیان کی جا رہی ہو اور یہ سب فیض سے گہری وابستگی اور ان کے کلام کے گہرے مطالعے اور اثرات کی بدولت ہی ممکن ہے۔ مصنفہ نے مذکورہ کتاب کو روسی زبان میں تحریر کیا تھا۔ جناب اسامہ فاروقی اس کتاب کے ابھی نو ابواب ہی اردو ترجمہ کر پائے تھے کہ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے پھر بقیہ پانچ ابواب کا اردو ترجمہ خود مصنفہ نے بڑی عرق ریزی سے کیا۔ ترجمہ کرتے وقت دونوں زبانوں پر مکمل گرفت ہونا ضروری ہے۔ دونوں زبانوں کی ثقافت و تہذیب ، اصطلاحات اور ضرب الامثال وغیرہ سے بھی واقفیت ہونا بھی ضروری ہے لیکن اس سب کا اندازہ ان کے خوب صورت ترجمے سے ہوتا ہے علاوہ ازیں وہ ماسکو کی رشین اکیڈمی آف سائنس کے انسٹیٹیوٹ آف اوری اینٹل اسٹڈیز کے مشرقی

ادب کے شعبے میں سینیئر ریسرچ ایسوسی ایٹ بھی رہیں اور انہوں نے ماسکو اسٹیٹ یونیورسٹی سے اردو اور ہندی ادب میں ایم اے لسانیات اور سویت یونین کی اکیڈمی آف سائنس سے اردو لٹریچر میں پی ایچ ڈی بھی تھیں۔ ان کی دیگر تصانیف میں حالی پر ایک کتاب، اردو اور روسی زبان کے وقیع جرائد میں متعدد مضامین شامل ہیں۔ انہوں نے روسی سے اردو اور اردو سے روسی زبان میں تراجم بھی کیے۔ یہ تراجم ان کے وسیع مطالعے اور دونوں زبانوں سے مکمل آگہی کے دال ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ جمیل جالبی۔ ڈاکٹر۔ ''پرورشِ لوح وقلم: فیض حیات اور تخلیقات'' ۲۶۔ اگست ۲۰۰۰ء (پیش لفظ)

۲۔ لُد میلا، ڈاکٹر۔ ''پرورشِ لوح وقلم: فیض حیات اور تخلیقات'' مترجم اسامہ فاروقی آکسفرڈ یونیورسٹی پریس ۲۰۰۲ء ص: ۱۱۲

۳۔ لدمیلا ڈاکٹر۔ ''پرورشِ لوح وقلم: فیض حیات اور تخلیقات'' مترجم: اسامہ فاروقی آکسفرڈ یونیورسٹی پریس ۲۰۰۲ء ص: ۴۸

۴۔ ایضاً ص: ۵۴

۵۔ ایضاً ص: ۸۴

۶۔ ایضاً ص: ۱۱۲

۷۔ ایضاً ص: ۱۲۸

۸۔ ایضاً ص: ۱۵۴

۹۔ ایضاً ص: ۲۳۲

۱۰۔ ایضاً ص: ۲۳۷

۱۱۔ ایضاً ص: ۲۵۱

چاہیے ہے جگر، داد و تحسین کے لیے
(شخصیات/کتب)

جلیل عالی کا فنّی و فکری اجتہاد

فتح محمد ملک

آج کی اُردو شاعری میں جلیل عالی کا فنی اور فکری اجتہاد اپنی مثال آپ ہے۔ تیس بتیس برس پیشتر اُن کے پہلے مجموعہء کلام ''خواب دریچہ'' کے پیش گفتار میں احمد ندیم قاسمی نے اُردو دُنیا کو ان کے 'لسانی اجتہاد' کی جانب متوجہ کیا تھا۔ اسی زمانے میں خوش گفتار شاعر اور نقاد انور مسعود نے اپنے مضمون بعنوان ''جلیل عالی کا خواب دریچہ'' میں عالی کی ترکیب سازی کی تحسین میں لکھا تھا کہ:

> ''عالی زبان کو بت نہیں سمجھتا۔ اسے ترسیلِ معانی کا وسیلہ خیال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ الفاظ کی ایسی تراش خراش کا قائل ہے جو زبان میں سہولتیں فراہم کرتی ہے۔ اس نے بعض فارسی مصادر اور الفاظ کو اُردو مصادر میں ڈھال لیا ہے۔ اگر فارسی والوں نے عربی کے الفاظ فہم اور طلب سے فہمیدن اور طلبیدن بنا لیے ہیں تو پھر شمارنا، شکارنا اور تنویرنا بنا لینے کا بھی پورا جواز موجود ہے۔ اس ضمن میں تلاشنا اور تراشنا کے افعال پہلے ہی رائج ہو چکے ہیں۔ عالی نے غزل میں ترکیب سازی، الفاظ کی کفایت شعاری اور مصدر سازی کے جو تجربات کیے ہیں وہ خاصے سنبھلے ہوئے ہیں اور زیادہ تر حدِ اعتدال میں ہیں۔''[1]

احمد جاوید نے ''جلیل عالی کی غزل'' کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے وقت کیا خوب لکھا ہے کہ: ''عالی کی پہلی شناخت تو وہ لسانی اجتہاد ہے جسے اُس کے نقادوں نے ہمیشہ دلچسپی کی نگاہ سے دیکھا ہے اور تحسین بھی کی ہے۔ اضافت اور حروف اضافت کو ترک کرنا اور حسبِ ضرورت مصادر و افعال تخلیق کرنا عالی کا مرغوب طریق کار ہے۔ بظاہر یہ عمل لسانی اجتہاد سے زیادہ نہیں مگر درحقیقت یہ عمل اس کے ہاں اپنے مخصوص تشخص کو تلاش کرنے کا عمل ہے جب بھی وہ کوئی ترکیب وضع کرنے کی کوشش کرتا ہے یا علامت بناتا ہے تو دراصل ایک ایسا لحن تشکیل دینے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے باطنی آہنگ کو سامنے لا سکے۔''[2] احمد جاوید نے بڑی خوبی کے ساتھ عالی کے اس لسانی اجتہاد کو اُس کے ''باطنی آہنگ'' سے کچھ اس طرح مربوط کر دیا ہے کہ ہم اُس کے لسانی اجتہاد کے روحانی محرکات کی جانب متوجہ ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے استدلال کو آگے بڑھاتے ہوئے ہمیں جلیل عالی کی باطنی واردات کی جانب متوجہ کرتے ہیں:

> ''عالی کے لیے باطنی وارداتوں کی اہمیت بہت زیادہ ہے وہ خارج کا ادراک لہو میں سرسراتی ہوئی سرگوشیوں سے ہی کرتا ہے وہ خواب جو ازل سے آنکھوں پر تحریر ہیں اُن کی تعبیر کی طرف سفر کرتے رہنا ہی عالی کا مقسوم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض الفاظ اس کے ہاں ایسے منتخب ہوئے ہیں جن کے نئے معانی کی دریافت ہی اُسے کسی لسانی تجربے کی طرف مائل کرتی ہے۔ خیال ستارا، درد ثمر، خواب کھنڈر، خواب سمندر، نشاط لمحے، شوق شجر، سوچ ہوائیں، شوق جزیرے، شوق سفر، خواب

دریچہ، سوچ کنارہ۔ ان ترکیبوں پر غور کیجئے (اگر یہ ترکیبیں) تو یہ سمجھنے میں دشواری نہیں ہوگی کہ اس کے ہاں یہ عمل کس طرح کے لفظوں سے پیدا ہوا ہے۔ سوچ، شوق اور خواب اس کے پسندیدہ الفاظ ہیں۔ سوچ کا لفظ اس کے ہاں کبھی باطن، کبھی فکر اور کبھی فکرمندی کے معانی میں آیا ہے۔ خواب سے اُس نے قومی ضرورتوں کا ادراک بھی کیا ہے مگر دوسری طرف تصوف کی سریّت کا بھید پانے کی بھی کوشش کی ہے۔"۳

درج بالا سطور میں احمد جاوید نے ہمیں وہ کلید مہیا کر دی ہے جس سے ہم جلیل عالی کے بابِ سخن کو کھول سکتے ہیں ۔باطنی آہنگ اور تصوف کی سریّت کی تلاش و جستجو ازاوّل تا ایں دم جلیل عالی کے فکر و فن کا جلی عنوان ہے۔ درج ذیل اشعار عالی کے 'درد و داغ و سوز و ساز و جستجو و آرزو' کے سچے ترجمان ہیں:

منکشف کر سوچ سے پہلے کی بات
لفظ سے آگے رسائی دے مجھے
لامکاں بھی آنکھ پتلی میں کھلے
وُہ نگاہِ ماورائی دے مجھے

زور کرتا ہے بہت شور و شرِ دہر و لے
دل کے حجرے میں بدستور اذاں ہوتی ہے

یہ دید تو روداد حجابات ہے عالی
وہ ماہِ مکمل نہ گھٹا ہے نہ بڑھا ہے

عشق خود سکھاتا ہے ساری حکمتیں عالی
نقدِ دل کہاں دینا بارِ سر کہاں رکھنا

یا رب ہنرِ شعر میں اقبال کے صدقے
رکھنا میرے لکھے ہوئے الفاظ کی شر میں

جلیل عالی کی یہ تمنا بہت معنی خیز ہے کہ اقبال تک پہنچتی ہوئی اور اقبال کے ہاں عصرِ حاضر اور عصرِ آئندہ کے رہنگ و آہنگ میں ڈھلتی ہوئی ہماری اپنی ادبی روایت کو یوں اپنایا، نکھارا، سنوارا جائے کہ مکاں اور لامکاں، آس پاس کی دُنیا اور ماورا کے جہاں کے فاصلے مٹ کر رہ جائیں۔ اگر عصری تناظر میں دیکھا جائے تو جلیل عالی اس تمنّا کی صورت گری میں یکہ و تنہا نظر آتے ہیں۔ ہماری حالیہ ادبی تاریخ میں یہ زمانہ غالب فراموشی اور اقبال شکنی کا زمانہ ہے۔ سیاسی طور پر آمریت و استبداد اور تہذیبی طور پر مغربی دُنیا کی نقالی کے زیرِ اثر بے معنویت اور لایعنیت، ابہام اور عدمِ ابلاغ اور علامت و تجرید کے سے ادبی فیشن، مقصدیت پسندی اور عصری معنویت کو ادب کی قلمرو سے خارج کر بیٹھے تھے۔ ایسے میں غالب اور اقبال سے عصرِ حاضر تک پہنچتی ہوئی ہماری اپنی ادبی روایت سے منسلک ہو کر شاعری کرنا جلیل عالی کا نمایاں کارنامہ ہے۔

فروزاں تھے لہو میں درد کے مہتاب جتنے
سب اس کے عکس تھے کس سے کسے ممتاز کرتے

یہ کہہ کے پھینک دیے اہلِ کارواں نے چراغ
ہمیں تو شہر میں ہونا ہے شام سے پہلے
آسماں جانے کہاں لے کے چلا ہے مجھ کو
اوپر اٹھتا ہے برابر مری پرواز کے ساتھ
طلسمِ عکس وصدا سے نکلے تو دل نے جانا
یہ حرف کچھ کہہ رہے ہیں عرضِ ہنر سے آگے

وہ اپنے سوانحی مضمون ''میرا فکری وتخلیقی عمل'' میں لکھتے ہیں کہ:

''میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے یہ بنیادی سوال میرے اندر کلبلاتا رہتا ہے کہ مجھے ہونے کے اس عذاب میں کیوں ڈالا گیا ہے؟ ایک ڈھلا ڈھلایا جواب ملتا ہے کہ یہ ایک امتحان ہے، اس میں کامیابی دائمی نشاط وانبساط کا پروانہ ہوگی۔ وجودی کرب پھٹ پڑتا ہے۔ ''میں نے اس امتحان میں بیٹھنے کی کب درخواست دی تھی! کیا یہ امتحان میرا آزاد انتخاب ہے! ہرگز نہیں!'' اس بنیادی سوال کے جواب کی تلاش اور اس ابتلا سے نجات کی کوشش مجھے اکثر معلوم وموجود سے آگے کے علاقوں میں سرگرداں کر دیتی ہے۔ حیرت واستعجاب کے دوران کبھی کبھی ایک عجیب طمانیت کا احساس ہوتا ہے اور موجود ومعلوم کو ایک ایسے جمالیاتی فاصلے سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے کہ جس سے موضوع و معروض کی تفہیم کے کئی نئے گوشے روشن ہونے لگتے ہیں۔..... فلسفے کے استادِ گرامی ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے میری شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کیے اور مجھے ایک صوفی مجاہد کے تصور سے آشنا کیا۔.....

اقبال کے سنجیدہ مطالعے نے میری ڈانواں ڈول مذہبیت کو سہارا دیا۔ کلامِ اقبال سے نصب العینی سطح پر جینے کی تحریک ملی اور فکری اعتبار سے اُس کے لیکچرز کا یہ جملہ میری رُوح کی گہرائیوں میں اُتر گیا کہ خدا اور کائنات روح اور مادہ لازم وملزوم ہیں۔ کسی ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ایک کا استرداد دوسرے کو رد کر دینے کے مترادف ہے۔''[۴۰]

یہاں صوفی مجاہد کے ذکر پر مجھے نقشبندی صوفیاء کا 'خلوت در انجمن' کا تصور یاد آتا ہے۔ نقشبندی صوفیاء نے ہمیں ترکِ دُنیا کے بجائے ترکِ ترک کی تلقین کی ہے۔ یہ صوفیاء دُنیا ترک کر دینے کی بجائے دنیاوی مشاغل میں بھرپور حصہ لے کر دُنیا کو اپنے روحانی تصورات کے عکس پر ازسرِ نو تعمیر کرنے کے داعی ہیں۔ یہ مشن سیاسی عمل سمیت مادی زندگی کی تمام تر سرگرمیوں میں ایسا قائدانہ کردار سرانجام دے کر ہی ادا کیا جا سکتا ہے کہ دل ذکر اذکار میں منہمک رہے اور ہاتھ روحانی تصورات کی روشنی میں دُنیاوی مشاغل میں مصروف رہیں۔ نقشبندی مسلک کے ثناخواں اقبال کے قول: Action is the best form of contemplation کے مصداق عالی بھی بندۂ عمل مست کے متلاشی ہیں:

''مجھے بلند کرداری بہت انسپائر کرتی ہے۔ مجرد افکار ونظریات کی اپنی قدر و قیمت کے باوجود میرے نزدیک معاشرے کی حقیقی تعمیر وتہذیب میں انسانی کردار وعمل ہی کو بنیادی اہمیت حاصل

ہے۔ اپنے فکر و نظر اور آدرش سے ہم آہنگ زندگی کرنے والے لوگوں کو میں لائق صد احترام سمجھتا ہوں۔ میرے خیالات اور زاویہء نگاہ کے بالکل برعکس نظریات رکھنے والے افراد کی بھی یہ خوبی میری نظروں میں ان کا مقام بہت بلند کر دیتی ہے۔''۵

اپنی قومی زندگی میں بھی اُنھیں بلند کردار شخصیات انسپائر کرتی ہیں۔ اپنی نظم ''صبح انا کا سورج'' میں اُنھوں نے قائداعظم محمد علی جناح کی شخصیت و کردار کے لازوال محاسن اور اُن کے سیاسی فیضان کو بڑے منفرد انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ نظم کے ابتدائی بند میں عالی نے تحریکِ پاکستان میں قائداعظم کے کردار کو یوں متعارف کرایا ہے:

وہ سب کی آنکھوں سے دیکھتا تھا
سب اُس کی آنکھوں سے دیکھتے تھے
وہ دشتِ جاں میں
کرشمہء خونِ دل سے
شرحِ وفا کی فصلیں اُگا رہا تھا
غمیں نگاہوں میں
شوق باغوں کے خواب آباد کر رہا تھا
جب اس کی رس گھولتی صدا کان میں اترتی
تو پنچھیوں کے پروں میں
پروازِ مشترک کی ہزار بےتابیاں مچلتیں
وہ اپنے ہاتھوں پہ کل کا سورج اُٹھا کے نکلا
تو عہدِ نو کی بشارتوں سے
دمکتے چہروں کا اک سمندر تھا ساتھ اس کے
جو حرف اس کے لبوں پہ آئے
ہماری پہچان بن گئے تھے
دلوں کے ارمان بن گئے تھے

قیامِ پاکستان کے بعد جب ہم نے بانیانِ پاکستان کی سیرت و کردار کی روشنی میں اپنے قومی سفر کو جاری رکھنے کی بجائے اُن کی دکھائی ہوئی راہ سے انحراف شروع کر دیا تو ہمارا زوال شروع ہو گیا۔ اسلام کی جو تفسیر و تعبیر بانیانِ پاکستان نے پیش کی اُسی سے ہماری اسلامی شناخت پیدا ہوئی تھی۔ صدر ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں اسلام کے نام پر ملوکیت اور مُلّائیت کے اصول و اقدار کی ترویج کے زیرِ اثر ہمارے لبرل دانشوروں نے مُلّائیت کو رد کرنے کی بجائے سرے سے اسلام ہی کو رد کر دیا۔ ایسے میں عالی نے اقبال اور جناح کی اُس تعبیر کو اپنا سرچشمہء فیضان بنایا جس کے زیرِ اثر ایک اسلامی عوامی جمہوری تحریک نے پاکستان قائم کر دکھایا تھا۔ عالی کے خیال میں اسلام کی اسی تعبیر کو پھر سے اپنانے کی ضرورت ہے:

کہا جو اس نے
کیا جو اس نے

وہ جب بھی منشور تھا ہمارا
وہ اب بھی منشور ہے ہمارا
کہ ایک اک عکسِ خواب اس کا
کہ ایک اک نقشِ تاب اس کا
لہو میں ہلچل مچا رہا ہے
کہ اپنی صبحِ انا کا سورج
اُسی طرح جگمگا رہا ہے
کہ آج بھی ہم
رہِ وفا میں قدم قدم پر
اُسی کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں
جو سب کی آنکھوں سے دیکھتا تھا
(صبح انا کا سورج: قائداعظم کے لیے)

سچ کہتے ہیں جلیل عالی، اسلام کو مُلائیت کی ناپاک گرفت سے آزاد کر کے ہی پاکستان کو تحریکِ پاکستان کے خواب وخیال کا پاکستان بنایا جا سکتا ہے۔ ہمیں اسلام کو مُلائیت سے آزاد کرانا ہے۔ مسجد میں بیٹھے ہوئے مُلاّ کو مسلمان بنانا ہے نہ کہ اسلام کو ترک کر دینا ہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

بیا تا کارِ ایں اُمّت بسازیم
قمارِ زندگی مردانہ بازیم
چُناں نالیم اندر مسجدِ شہر
کہ دل در سینہء گدازیم

جلیل عالی نے اپنے بائی پاس آپریشن کے تجربے سے گزرنے کے فوراً بعد گیارہ حصوں پر مشتمل اپنی طویل مختصر نظم ''قلبیہ'' کے چھٹے بند میں صوفی مجاہد اقبال کو بڑے عاشقانہ انداز میں یاد کیا ہے:

عبث تاریخ کے دریا میں
ابھری اور ڈوبی
بے وقر لہریں نہ گنواؤ
وقوعوں کے گھنے جنگل کے بیچوں بیچ
جس صورت
مشیّت راستہ اپنا بناتی ہے
اسے دیکھو
بڑی نظمیں پڑھو اقبال کی
یہ ایسی نظمیں ہیں

پہاڑ اوپر اترتیں تو
لرز کر وہ بھی رہ جاتا
دلوں اندر جنوں کی آگ بھڑکاتی
ہوا کا رُخ بدلتی
سوچ کے آفاق پھیلاتی
فلک تسخیر امکانات کے در کھولتی نظمیں
"غلامی میں نہ کام آتی ہیں
تدبیریں نہ شمشیر"
یہ سمجھاتی،
لہو میں بولتی نظمیں

وہ شاعر
جس نے اپنے خواب سارے
قائداعظم کو سونپے
اور یہ کہہ کر ہوا رخصت
کہ موسم آ گیا ہے اب
الگ اپنے وطن کی مانگ کرنے کا
جو اقبال اور قائد کی نہیں سنتے
تو گاندھی کی کسک سے ہی بصیرت لو
جو کہتا تھا
زمیں کے ایک ٹکڑے کا نہیں قصہ
کہ یہ دنیا کے نقشے پر
نئے اک سلسلے کی ابتدا ہوگا
اسے ہونا تھا سو ہو کر رہا آخر
یہ ارضِ پاک! پاکستان!
صدیوں اور نسلوں کے
سجل سپنوں کا گہوارہ ہے
اپنا عشق ہے
اور کچھ نہ کچھ ہوتے چلے جانے کا
زندہ استعارہ ہے
سرِ پرچم، ہلالی قوس میں

جس شان سے تارا دمکتا ہے
مرے سینے کے بکسے میں نہیں
آنکھوں میں میرا دل دھڑکتا ہے!(قلبیہ 6)

پاکستانی قومیت اور اسلامی آفاقیت سے پھوٹنے والے موضوعات پر عالی کی شاعری کی تحسین میں خاور اعجاز نے درست لکھا ہے کہ: ''اُن کے موجودہ مسائل پر تبصرے اور گزرے ہوئے کل سے اخذ وکشید کیے ہُوئے نتائج کا اس عہد پر انطباق اور اس آئینے میں آنے والی کل کی منظر کشی ایسے جاندار طریقے سے ہُوئی ہے کہ شعر کی دل آویزی کے ساتھ ساتھ مناظر کی جاذبیت بھی بالکل منفرد انداز اختیار کر گئی ہے۔ اُن کی اپنی ذات اور ذات کے حوالے سے اپنے ارد گرد اور ماضی سے جو وابستگی ہے وہ کسی قسم کی سودے بازی یا لالچ سے مبرا ہے۔ کسی منصب کی ہوا سے اُن کی انا کی پتنگ جھوک نہیں کھاتی۔ وہ بے حکمت کماندار کے سپاہی نہیں ہو سکتے۔ وہ اپنے ہی خواب دریچے کی ہوا میں سانس لیتے ہیں اور اپنے ہی شوق ستارے کی دکھائی ہوئی راہ پر سفر کرتے ہیں۔ اُن کی تخلیقی توانائی کے یہ دوماً خذ اس قدر باتوقیر ہیں کہ اُنھیں کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔۶'' عالی کی حمدیہ اور نعتیہ شاعری بھی حمد و نعت کے عنوان سے رسمی شاعری ہر گز نہیں۔ اقبال ہی کی روایت میں وہ اپنے گرد و پیش میں بکھرے ہوئے موضوعات پر لکھتے لکھتے بیساختہ خداوند کریم اور رسول اکرم ﷺ کی حمد و ثنا کرنے لگتے ہیں۔ اُن کی ایک نعتیہ نظم کا فقط ابتدائی بند پیش خدمت ہے:

وہ دل زمینوں میں
فصلِ صدق و صفا اُگاتا ہوا تکلم

میانِ غیب و حضور
بابِ مکالمت کھولتی خموشی

وجود اور ماورا کو
اک دوسرے میں پہچانتی نگاہیں
()

سانحہ، کربلا کو یوں پیش کرتے ہیں جیسے یہ ہمارا ماضی بھی ہو، ہمارا حال بھی اور ہمارا مستقبل بھی۔ نظم ''القلم'' کا درج ذیل حصہ اس حقیقت کے احساس سے تھرتھرا رہا ہے کہ دُنیائے اسلام آج بھی کرب و بلا میں مبتلا ہے:

.... یہاں کربلا ہے وہاں کربلا ہے
مگر
یہ بھی سیلِ زماں کی
کسی مختلف موج کا معجزہ ہے
کہ اس کھو کھلے بے جہت عہد کی

مصلحت گامیوں، عافیت بافیوں کے ہوس زار میں
خیر خوابوں کے راہی
وفا کے سپاہی
اجل ہار پہنے، ابد گیت گاتے
گنہ زاد فوجوں کے
مذموم رستوں کی دیوار ہونے
قطاروں قطاروں چلے آ رہے ہیں

یزیدی ستم ہوں
کہ فرعونیت کے شکنجے
کہ زریں طلسمات ہوں سامری کے
کوئی جبرِ شاہی
کوئی دامِ دانش فروشاں
مجھے دستِ ظلمت کی بیعت پہ تیار کر لے
یہ ممکن نہیں
میرے پندار کے
سر کشیدہ علم کو گرانے کی سب خواہشیں
وہم ہیں، خواب ہیں
نقش بر آب ہیں (القلم)

حق کی سربلندی کی خاطر جبر و استبداد کی مزاحمت میں یہ ثابت قدمی ہمارے ماضی کو ہی ہمارا مستقبل بنا دیتی ہے۔ صرف اس اُمید کے ساتھ کہ ماضی میں جس طرح ملوکیت اور مُلّائیت کی قوتیں غالب آ ئی تھیں مستقبل میں یہ مغلوب ہو کر رہ جائیں گی۔ ایک ایسے زمانے میں جب ہمارے ہاں مادی ہمہ اُوست کی پرستاری میں راسخ دانشور فقط حاضر و موجود کے طلسم میں اسیری پر نازاں ہیں عالی زندگی کی آئندہ جلوہ گاہ کی جانب بڑی اُمید بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں:

کسی معصوم سے جھونکے کی اک ہلکی سی دستک پر
انہی پتھر پہاڑوں سے کوئی چشمہ ابلنا ہے

ادھر بھی تو اسے اک دن اٹھانی ہیں نگاہیں
ہمیں بھی تو کبھی ہونے کا ہے احساس ہونا

اک حیرتِ جاں تاب کہ جاگے گی نظر میں
اک بابِ گراں خواب کہ وا ہو کے رہے گا

یہ دل شب و روز اس کی گلیوں میں گھومتا ہے
وہ شہر جو بس رہا ہے دشتِ نظر سے آگے

فرازِ وقت سے اس کو صدا دیے تو دے عالی
ہوا پھر دیکھ دیواروں میں کتنے در بناتی ہے

تم
اس کو
موت کہتے ہو
یہ کیسا
خوف طاری ہے
نکل کر
باغِ دنیا سے بھی
اپنی سیر جاری ہے
(عدم آباد سے ایک پیغام)

جلیل عالی، بے شک اس گماں آباد سے عدم آباد اور اُس سے بھی آگے تک کے جہانوں کی سیر کا رسیا ہے، مگر اس سے یہ گمان ہرگز نہ کیجیے گا کہ اپنے گرد و پیش کی دُنیا کی مادی زندگی کے مصائب کی جانب اُس کی توجہ کم کم ہے۔ نہیں، ہرگز نہیں! وہ اقوامِ غالب کی نوسامراجی انسان دشمن حکمتِ عملی کے مغلوب اقوام پر انسانیت کُش اثرات و نتائج کا جیتا جاگتا احساس و ادراک رکھتا ہے۔ ۲۰۰۶ء کی ایک نظم ''اجارہ'' ہم مجبور و محکوم ملکوں سے بہت کچھ کہتی ہے۔

تمہاری سرزمینوں پر
ہمارے ٹینک جب یلغار کرتے ہیں
انھیں نفرت سے پتھر مارتے ہو تم
یہ دہشت گردیاں بربادیوں کا پیش خیمہ ہیں
ہماری قدرت و قوت کا اندازہ نہیں تم کو
قیامت بانٹتے ہیں، امن کا بیوپار کرتے ہیں
گرا دیتے ہیں ہر چھوٹی بڑی دیوار

اپنا راستہ ہموار کرتے ہیں
تمھاری حیثیت کیا ہے
یہی ہوگا کہ آخر کو
اُسی قیمت پہ عافیت خریدو گے
جو ہم چاہیں گے، مانگیں گے

اب سُنیے کہ نظم ''مارکیٹ اکانومی'' ہمیں کس ابلیسی انداز میں چیلنج کرتی سُنائی دیتی ہے:

مَیں ہی مَیں سر بہ سر
مجھ سے کس کو مفر
مجھ سے بڑھ کر زمیں پر ہے کس کا اثر
کون حیلہ مرے سامنے کارگر
میری نظریں غضب
میرے اپنے ہی ڈھب
جانتی ہوں میں سب
کتنے داموں بکاؤ ہے کس کی زباں
کس کا آدرش، کس کا قلم، کس کا فن
کس کا نام و نسب
کس کا دِیں، کس کا رب!

مقامِ شکر ہے کہ ''قلبیہ'' کا شاعر نئی زندگی پا کر ایک صوفی مجاہد کے انداز میں ہمارے تہذیب و فن کو سرسبز و شاداب رکھنے میں پھر سے مصروفِ عمل ہے۔ ہم اُس کے فنی و فکری مجاہدے کے تازہ تر ثمرات کے منتظر ہیں!

☆☆☆

حواشی

۱۔ تقریب، انور مسعود، لاہور، ۱۹۹۷ء، صفحہ ۱۳۵۔
۲۔ رسالہ ارتقاء، کراچی، اکتوبر ۲۰۰۴ء، صفحہ ۲۱۸۔
۳۔ ایضاً۔
۴۔ عرضِ ہُنر سے آگے، جلیل عالی، لاہور، ۲۰۰۷ء، صفحات ۱۱۔۱۲
۵۔ ایضاً، صفحہ ۸
۶۔ لفظ مختصر سے مرے، انتخاب کلامِ جلیل عالی، خاور اعجاز، اسلام آباد، 2015ء، صفحہ ۱۱

”محبت کی کتاب“

شمس الرحمٰن فاروقی

ایوب خاور کی یہ طویل تحریر”محبت کی کتاب“ ایک ذرا روایتی انداز بلکہ یوں کہیں کہ نہایت ہلکے پھلکے انداز میں شروع ہونے والی مختصر داستان اپنے ہر نئے منظر کے ساتھ پیچیدگی، کچھ تجسّس، کچھ اضطراب پیدا کرتی ہے لیکن یہ سب بہت جلد ایوب خاور کی نظم کے بہاؤ میں کھو جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ٹی وی پر اور شاید اسٹیج پر بھی”محبت کی کتاب“ کو نہایت عمدگی اور کامیابی سے پیش کیا جا سکتا ہے لیکن ہم جو اسے اپنے ہاتھوں میں لیے چپ چاپ کسی کمرے یا کتاب خانے میں پڑھ رہے ہیں، ہمیں ہر منظر کسی طویل نظم کے بند جیسا لگتا ہے اور اگر چہ کہانی بھی ہمیں اپنی گرفت میں لینے لگتی ہے لیکن جو چیز ہمارے احساس پر سے اپنی گرفت ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ڈھیلی کرتی وہ”محبت کی کتاب“ کی شاعری ہے۔ اگر میں نے اپنی آنکھوں سے اسے نہ دیکھا ہوتا اور اپنے کانوں سے نہ سُنا ہوتا تو میں یقین نہ کرتا کہ منظوم ڈرامے کی صنف میں آج ایسی شاعری ہو سکتی ہے۔ اس ڈرامے میں شاعری کا وفور کتنا ہے، اس بات کا کچھ اندازہ آپ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ اس کی اسٹیج ہدایات بھی منظوم ہیں۔

دوسری بات جو اس نظم/ ڈرامے میں فوری طور پر توجہ کو کھینچتی ہے وہ اس میں انگریزی الفاظ کی کثرت ہے لیکن یہ الفاظ ایسے نہیں ہیں جو بھاری بھرکم، مشکل اور ہمارے اوپر کچھ علمیت اور کچھ اردو زبان کی نام نہاد کم مائیگی ظاہر کرنے کے لیے لائے گئے ہوں۔ ہماری طرف کے ایک افسانہ نگار نے لکھا ہے کہ”Casual جان پہچان“ کا تصور ظاہر کرنے کے لیے اردو میں کوئی لفظ نہیں ہے لہٰذا وہ اپنے افسانے میں”Casual جان پہچان“ جیسا فقرہ استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔ ایک اور صاحب نے جو نام خدا نقاد ہیں، لکھا ہے کہ وہ اپنے خیالات کو page پر pour کر دیتے ہیں۔ انھیں بھی اردو میں کوئی ایسا لفظ نہیں ملا جو صفحے پر اپنے خیالات کے pour کر دینے کا مفہوم ظاہر کر سکے۔

ایوب خاور کی نظم/ ڈرامے میں اس طرح کی انگریزی ہوتی تو میں اس کی دو سطریں بھی نہ پڑھ سکتا اور انھیں سلام کر کے ان کا مسودہ واپس کر دیتا لیکن یہاں جو انگریزی ہے اس کے دو وصفات ہیں: ایک تو یہ کہ اس کا تعلق موبائل فون اور ڈراما اور ٹی وی سے ہے اور دوسری اور زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انگریزی کے یہ الفاظ ہیں جنھیں آج ملک کے نوعمر لڑکے لڑکیوں کا بہت بڑا حصہ عام طور پر اپنی گفتگو میں بروئے کار لاتا ہے۔ انگریزی یا انگریزیت سے یہ لگاؤ اچھی بات نہیں ہے اور مجھے تو اس سے سخت چڑ ہے لیکن وہ الگ بات ہے۔ یہ زبان ایسی ہے جو ایوب خاور کے کرداروں کی ذہنی کیفیات اور روزمرہ زندگی اور معمولات کو پوری کامیابی سے ظاہر کرتی ہے۔ یہ اس طبقے کی زبان ہے جس کی زندگی کا بڑا حصہ موبائل فون کے ذریعہ بسر ہوتا ہے۔ اب یہ اتفاق ہے کہ اس تحریر کے دونوں خاص کردار موبائل فون کے علاوہ ادب اور شعر اور علم سے بھی معاملہ رکھتے ہیں اور جیسے جیسے ڈراما آگے بڑھتا ہے، ہمیں ان کے کردار میں ایسی صفات بھی نظر آتی ہیں جو انھیں آج کل کے نوعمر لڑکے لڑکیوں سے ممتاز بھی کرتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ محض فیشن ایبل کپڑے پہننے والے اور موبائل کے سہارے سطحی زندگی گزارنے والے بچے نہیں ہیں۔ ان کی ایک داخلی اور بہت گہری، بہت متلاطم زندگی بھی ہے۔

میں نے شروع میں ''محبت کی کتاب'' کو ''تحریر'' کہا تھا پھر میں نے اس کے لیے نظم/ڈراما، یا محض ڈراما، یا منظوم ڈراما کی اصطلاحیں استعمال کیں۔ ''محبت کی کتاب'' کو پڑھتے پڑھتے کبھی کبھی میرا جی چاہا کہ اسے منظوم ناول کہہ دوں کہ اس میں ناول کا سا پھیلاؤ ہے اگرچہ وہ سطح پر نظر نہیں آتا۔ مجموعی حیثیت سے فی الحال میں اسے ''منظوم ٹی وی ڈراما'' کہہ کر کام چلانا چاہتا ہوں۔ میں اس ڈرامے کا پلاٹ بیان کر کے آپ کا وقت ضائع نہ کروں گا۔ ویسے میرا ہمیشہ سے خیال رہا ہے کہ کسی بیانیے کا پلاٹ وہی بیان کرتا ہے جسے اس بیانیے کے بارے میں کہنے کے لئے کچھ اور نہ ہو۔

کوئی بیانیہ جب ویلن ٹائن ڈے جیسی غیر ملکی بات سے شروع ہو جو ہمارے لیے نہ صرف اجنبی ہے بلکہ ہماری تہذیب سے بالکل متغائر بھی ہے تو ہمیں اس بیانیے سے کچھ خاص امیدیں وابستہ کرنے کی تحریک نہیں ہوتی لیکن یہ ڈراما کچھ ایسے مترنم انداز میں شروع ہوتا ہے اور اس میں ہمارے تجسس کو بیدار کرنے کی بھی کچھ ایسی صفت ہے کہ ہم پڑھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

رات کے گہرے گھنے بستر میں
سنبل افراز نے جب اپنی اک نظم
فائنل کر کے سرہانے رکھی
اس کے سیل فون پہ بیدار ہوئی میسج ٹون
اس نے ان باکس کو کھولا
دیکھا
کسی نے اس کے لیے ایک غزل بھیجی تھی

کسی اجنبی کا سیل فون کے ذریعہ کسی اجنبی لڑکی کو ویلن ٹائن ڈے کے بہانے سے ایک پوری غزل بھیج دینا کچھ عجب سا لگتا ہے پھر یہ بھی ہے کہ مغرب میں ویلن ٹائن ڈے پر لڑکی اپنے مطلوب لڑکے کو (یا محض کھیل کھیل میں مطلوب لڑکے) کو پیغام بھیجتی ہے کہ ''کیا تم میرے ویلن ٹائن بنو گے؟'' لیکن یہاں الٹی گنگا بہ رہی ہے کہ کوئی لڑکا کسی لڑکی کو پیغام محبت بھیج رہا ہے لیکن اوپر نقل کردہ آغازی مصرعے بے حد رواں اور دلچسپی انگیز ہیں۔ سنبل افراز کہیں کی طالبہ ہوگی یا شاید کوئی کل وقتی شاعرہ ہو یا شاید کہیں کام کرتی ہو اور فرصت کے وقت یعنی رات کے وقت شعر کہتی ہو۔ بنیادی بات یہ ہے کہ سنبل افراز نوعمر ہے، موبائل فون سے اسے اس قدر لگاؤ ہے کہ رات بہت جا چکی ہے، نظم کہتے کہتے وہ تھک گئی ہے لیکن فون پر پیغام کا اشارہ ملتا ہے تو وہ اپنا ان باکس فوراً کھولتی ہے کہ دیکھیں کس نے کیا لکھا ہے لیکن سنبل افراز رات کو دیر تک جاگ کر نظم بھی کہتی ہے لہٰذا وہ محض خالی الذہن، موبائل فون کی عاشق لڑکی نہیں ہے۔ ہمیں فوراً سنبل میں اور اس غزل میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے جو کسی نادیدہ چاہنے والے نے اسے بھیجی ہے۔ غزل تو نہایت عمدہ ہے اگرچہ اس میں ذرا نوعمری کی لٹک بھی ہے۔ معلوم نہیں جب عمر پختہ ہوگی وہ کس طرح کے شعر کہہ سکے گا لیکن غزل کے کچھ شعر تو فوراً متاثر کرتے ہیں......

سات سروں کا بہتا دریا تیرے نام
ہر سر میں ہے رنگ دھنک کا تیرے نام
جنگل جنگل اُڑنے والے سب موسم
اور ہوا کا سبز دوپٹہ تیرے نام

تیرے بنا جو عمر بتائی بیت گئی
اب اس عمر کا باقی حصہ تیرے نام
آخری شعر کی معصومیت اور چلبلا پن دل کو کھینچتا ہے لیکن اب اسٹیج ہدایت اور اس کے بعد کا بیانیہ دیکھئے۔
سنبل اپنے فون کی
اسکرین پر نظریں جمائے دیر تک بیٹھی رہی
پھر بند کر کے سائڈ ٹیبل کے کنارے رکھ دیا
کلام کی موزونیت اور اس کی سادگی اور روانی لائق داد ہیں۔ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ہم اب بھی نظم پڑھ رہے ہیں اور لطف یہ کہ ایک لفظ بھی غیر ضروری نہیں، ایک بھی لفظ برائے بیت نہیں لایا گیا ہے۔ اس کے بعد بیانیہ:
غزل تو اس نے پڑھ لی
اور اچھی بھی لگی
کسی نے اپنی باقی عمر اس کے نام کی تھی
مگر غصہ بہت آیا تھا اس کو
اسی غصے میں وہ کچھ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگ گئی
موزونیت اب بھی موجود ہے۔ روانی بھی ویسی ہی ہے۔ اب سنبل کی بڑبڑاہٹ سنئے۔ وہ بھی وزن میں ہے:
کون تھا؟
کس نے اسے یہ حق دیا؟
کم بخت
گھٹیا
چھچھورا
عشق کا مارا
آخری سے پہلی سطر میں مکمل رکن (فاعلاتن) نہیں ہے۔ کیوں نہ ہو، آخر وہ غصے میں بڑبڑا رہی ہے۔ اس کے بعد تین سطروں کا بیانیہ:
اسی غصے میں
اپنے آپ سے کچھ دیر تک الجھی رہی
اور پھر اپنی ہتھیلی پر گل رخسار رکھا، سو گئی
یہاں تک آتے آتے مجھ جیسا قاری جسے آج کل کی اکثر ''نوعمر'' شاعری ایک آنکھ نہیں بھاتی ''محبت کی کتاب'' کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ افسانے میں کوئی دم نہیں لیکن شاعری میں بہت دم ہے:
اور پھر اپنی ہتھیلی پر گل رخسار رکھا سو گئی
داد سے مستغنی سطر ہے۔ ابھی تک ہم نے ''محبت کی کتاب'' کے بہ مشکل دو صفحے پڑھے ہیں لیکن سنبل افراز کے کردار میں ہمیں کچھ گہرائی، کچھ معصومیت نظر آتی ہے اور شاعر نے اس کی تصویر کشی کسی ماہر مصور کی طرح قلم، روشنائی اور

ایک دورنگوں سے بنائے ہوئے زندہ خاکے کی طرح کردی ہے۔ شعر کی موسیقی اپنا جادو الگ جگا رہی ہے۔ ہمیں بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ بھیجنے والے کا پیغام محض اتفاقیہ سنبل افراز تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے کئی اجنبی نمبروں پر اپنے پیغام بھیجے تھے اور ان میں سے ایک وہ تھا جس کے بارے میں ہم پڑھ رہے ہیں۔ یہ ذرا انہونی بات معلوم ہوتی ہے لیکن ہم اسے نظرانداز کردیتے ہیں۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بھیجنے والے نے یہ پیغام دانستہ بھیجا تھا لیکن تب تک ہم یہ فروعی باتیں یا پلاٹ کی اس کم زوری کو نظرانداز کر چکے ہوتے ہیں۔

محبت پروان چڑھتی ہے۔ کہیں کہیں جمیلہ ہاشمی کے مختصر ناول "تلاشِ بہاراں" کا سا رنگ جھلک اٹھتا ہے لیکن شاعری اپنی سحر طرازی سے باز نہیں آتی۔ سنبل افراز اردو غزل کی کلاس میں ہے لیکن سبق کی طرف اس کی توجہ نہیں، وہ نظم کہہ رہی ہے۔ پہلے اسٹیج ہدایت، یا بیانیہ سنئے:

کلاس روم میں سنبل افراز
خودکلامی کو
اپنی اک نظم کے مصرعوں میں بُنے جاتی تھی
اور مس آصف
میر کے شعر کی تشریح کیے جاتی تھی

یہ بیان خود ہی نظم ہے، صرف منظوم کلام نہیں اور اب سنبل افراز کی نظم:

یہ خواب ہے سراب
کیا ہے؟
محبتوں کو دلوں کی مٹی میں
کون، کب، کس طرح سے بوتا ہے
کونپلیں سی
ہزار رنگوں کی کونپلیں سی
مرے مساموں کی کوکھ سے پھوٹنے لگیں کیوں؟
بہار کیا جسم و جاں کے اندر سے پھوٹتی ہے؟
یہ پھول، پودے، شجر، گلی، صحن اور در و دیوار دریچے
ہر ایک شے میں
گلاب و سرو سمن مجھے کیوں دکھائی دینے لگے ہیں؟
کیا یہ بہار ہے
یا مرے حیادار آتش آثار عارضوں پر
دھڑک رہی ہے
مری محبت

اب اس کے آگے کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔ اتنے کم لفظوں اور اتنے کم وقوعوں کے باوجود مجھے سنبل افراز کا

کردار کسی مشاق ناول نگار کا بنایا ہوا بھرپور کردار لگتا ہے۔

اوپر میں نے کہا تھا کہ میں ''محبت کی کتاب'' کو منظوم ٹی وی ڈراما کہتا ہوں لیکن ڈراما انجام تک پہنچتا ہے تو Resolution کا تقاضا کرتا ہے۔اس سے میری مراد یہ نہیں کہ ڈراما ان مسائل کے حل کا تقاضا کرتا ہے جو اس میں بیان ہوئے ہیں۔اسی لیے میں نے لفظ ''حل'' نہیں استعمال کیا۔ناول میں حل یعنی Solution کا امکان رہتا ہے۔ڈرامے میں مسائل حل نہیں ہوتے لیکن تمام کردار اپنے اپنے ٹھکانے پہنچ جاتے ہیں۔ہم جانتے ہیں کہ ''محبت کی کتاب'' میں سنبل افراز اور ظفر کے عشق کا انجام اچھا نہ ہوگا۔ہمیں ان کی گتھی کے حل کی توقع نہیں لیکن گرہوں کے کھل جانے کی توقع ہم ضرور رکھتے ہیں۔یعنی Resolution ہم ایسا چاہتے ہیں جو تسلی بخش ہو۔''محبت کی کتاب'' جب تمام ہوتی ہے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے یہ کوئی بہت اچھا Resolution نہیں کہ سنبل افراز اور ظفر دہشت گردوں اور حفاظتی دستوں کی کارروائی کے درمیان آ جائیں۔یہ آج کے حالات کو دیکھتے ہوئے ناممکن نہیں بلکہ یوں کہیں کہ بڑی حد تک متوقع ہے لیکن سنبل افراز اور ظفر کی زندگیوں کی گتھیاں اس وقوعے سے سلجھتی نہیں ہیں۔

مگر یہ بھی ہے کہ میں بتانے سے قاصر ہوں کہ اس ڈرامے کا بہترین یا سب سے زیادہ تسلی بخش Resolution کیا ہونا چاہیے تھا۔لہٰذا میں ایوب خاور کی ہی بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ جو ہوا اس سے بہتر ممکن نہ تھا۔

''محبت کی کتاب'' غیر معمولی کتاب اور مدتوں تک یاد رکھنے کے لائق کارنامہ ہے۔

ممتاز مفتی۔ جنس اور ناجنس نگار

ڈاکٹر احسان اکبر

ڈرامہ ہو یا مضمون، سب ریڈیو کا حصہ تھا اور ریڈیو تو روز کا فیچر تھا۔ مگر خالص ادبی اصناف میں بھی ممتاز مفتی کی مصروفیت مسلسل تھی۔ ان کے پاس جو اسلوب ہے پھر اس اسلوب میں جس قدر صنفی تنوع ان کے ہاں ملتا ہے وہ عام قلمکار کے بس کی بات نہیں۔ خاکہ، سفرنامہ، رپورتاژ، ناول، خودنوشت، انشائیہ، سٹیج/ ٹی وی ڈرامہ یہ سب وہ خارجی آفاق ہیں جن سے ممتاز مفتی کے تخلیقی پھیلاؤ کا ہم احاطہ کرتے ہیں۔ جتنے کردار اکیلا ''علی پور کا ایلی'' سامنے لے آتا ہے اتنے کردار کسی اور ناول میں ہمارے سامنے کبھی نہیں آئے۔ ''ایلی اور الکھ نگری'' الگ سے ایک نصف صدی کا قصہ ہے۔ مفتی صاحب کے رپورتاژ اپنا جداگانہ طلسمات بناتے ہیں جبکہ حقیقت میں وہ بھی حقائق پر تبصروں سے لبریز ہوتے ہیں کیونکہ وہ حقیقی زندگی کا سفرنامہ بھی سنا رہے ہوتے ہیں۔ خاکہ میں یہ کمال کہ خاکہ نگار خود آرزو کرے کہ ممتاز مفتی اس کا خاکہ لکھیں۔ افسانے میں مفتی اپنی جگہ صاحب اسلوب۔ وہ ایسا جھنجھنا بجاتے ہیں کہ قاری بچے کی طرح لپکے۔ رہا ''لبیک'' تو اس کا اسلوب سادہ لفظوں میں عہد آفریں اسلوب ہے۔ انشائیہ نگاری میں وہ سب سے پرانے قلمکار تھے جن کے لکھے ہوئے مضامین personal essay کے معیار پر پورے اترتے ہیں مگر ہم آپ نے ممتاز مفتی کو کبھی دو ان کی لیتے نہیں دیکھا کہ ''صاحب! ہماری اساولین انشائیہ نگاروالی حیثیت کا احترام کیا جائے۔'' وجہ یہ کہ وہ صرف ایک کارکن، کارندے اور کاتے تھے۔ ادبی تخلیق روز کا کام تھا۔ یہ اصناف ان کی تھیں اور ان سبھی اصناف میں وہ کسی نہ کسی حوالے سے نمایاں بلکہ بے حد نمایاں رہے۔ ان کی تسکین کو یہی کیا کم تھا؟

تاہم افسانہ ان کی پہلی پسند تھا اور پہلی تخلیق بھی۔ ان کے ہاں دیگر اصناف میں ان کا مسلک بھی جھلک سکتا ہے اور ملک بھی۔ مگر ان کا افسانہ اپنی جدا سی اُڑان رکھتا ہے۔

جنس وہ قاتل قلو پطرہ ہے مفتی صاحب جس پر سارا افسانہ نچھاور کردیں۔ یہاں افسانہ جنس کی تاثیر سے کیسے چمکایا ہے یہ انہی کا ہنر ہے، ملاحظہ کیجئے۔

سمرت ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ''پریم تو ہے مہاراج، پر تو جھولن نہیں۔''

''جھول جزیرے میں جھولن نہیں؟'' ''اج مہاراج نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں مہاراج۔'' سمرت بولی۔ ''پریم چکر سمان چلتا ہے جھولن سمان نہیں ......''

''جھولن سمان کیوں نہیں چلے ہے؟'' کیتو نے پوچھا۔

''مہاراج!'' سمرت نے کہا۔ ''جھولن سمان تو تبھی چل سکے ہے جب بڑھے' رکے' مڑے اور پھر سے بڑھے جیسے لہر چلے ہے مہاراج۔''

''سچ کہتی ہے۔'' چندر بولے۔ ''جو چکر سمان چلتا ہی جاوے ہے کشٹ بن جاوے ہے۔ جو رک رک کر لہر سمان چلے، سوآنند۔''

''مہاراج۔'' سمرت نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''اس پریم چکر نے میری سدھ بدھ ماردی ہے اور مہاراج جب سدھ

بدھ ہی نہ ہو تو آنند کیسا؟''

''سچ ہے۔'' اج مہاراج بولے۔ ''تُو تُو'' کہنے والے کو جب ''میں'' کی سدھ نہ رہے تو پھر جان لو کہ نہ تُو رہا نہ میں رہی۔''

''تو نہیں بولتا' سانورد؟'' کیتو نے پوچھا۔

''یہ کیوں بولے گا مہاراج؟'' سمرت بولی۔ یہ تو میرا ''تُو'' ہے اور اپنے کارن نرا ''میں'' ہی ''میں'' ہے اور مہاراج جو ''میں'' ہی میں ہوا اسے پریم سے واسطہ؟......''

''جا تیری اکشا پوری ہوگی۔ پریم چکر پریما جھولن میں بدل جائے گا۔ جب پریم ہلارے اتنے بڑھ جائیں گے کہ دم گھٹے گا تو بھونچال آ جائے گا۔ لاوا بہہ نکلے گا اور تُو شانت ہو جائے گی''۔۔۔۔ارج مہاراج نے تالی بجائی' ارد اور رت ہاتھ باندھے آ کھڑے ہوئے۔ ''یہ تمہارے بردے ہیں۔ سمرت! رت تیری باندی ہے۔ سانورد! ارد تیرا بردا ہے۔ جب پریم کشٹ بن جائے تو ارد اور رت آ جایا کریں گے۔ یہ پریم یدھ ناچیں گے پھر کشٹ آنند میں بدل جائے گا۔۔۔ پر ایک بات کا دھیان رکھنا۔۔ان بردوں ۔۔۔ کا اپمان نہ کرنا۔۔۔ان کو لوبھ کے لیے برتو گے تو ان کا اپمان ہوگا۔ اب ایسا ہوا تو ارد میں اچھل نہ رہے گی۔ اس کا سر نیچا ہو گیا تو پریم جھولن ٹوٹ جائے گا اور لوبھ چکر چل پڑے گا۔۔۔''

☆

نیویارک کی نیوڈ کلب میں ہال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔۔۔تماشائیوں کے جسم لٹے پٹے تھے۔ جذبۂ محبت شہوت کے گاڑھے ملبے کی دلدل میں بدل چکا تھا۔ آخری سین ارد اور رت کا ناچ تھا۔ سٹیج پر اندھی رت انگڑائیاں لے لے کر اپنی ہڈیاں توڑ رہی تھی۔۔۔۔ ارد کی چنگھاڑ سنائی دی۔۔۔ پھر کوڑوں کی آوازیں۔۔۔ دو چار۔۔۔ سات اور آخر گونگا ارد چیختا چلاتا سٹیج پر آ کھڑا ہوا۔ اس کے آبنوسی جسم پر کوڑوں کی شنگرفی دھاریں پڑی ہوئی تھیں جن سے خون رس رہا تھا۔ ارد نے رت کی طرف دیکھا اور جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔

''تڑاخ۔'' ونگ سے ایک ہنٹر لہرایا۔

ارد درد سے بلبلا اٹھا۔ ایک جست بھری لیکن اس میں اچھل پیدا نہ ہو سکی اور وہ منہ کے بل گر گیا۔ تماشائیوں کی غیض و غضب بھری آوازیں بلند ہوئیں۔۔۔ ہم نے کوڑے لگائے تھے سر! کوڑے بجلی کے' رنگ ماسٹر نے جواب دیا۔ منیجر نے جواب دیا۔ ''اونہوں۔'' اب کوڑے کام نہیں آئیں گے۔ ڈاکٹر کہاں ہے۔ اسے بلاؤ۔ بولو ڈبل انجکشن دے دے۔

اپ مین اپ' وہ بولا۔ ''دی شو مسٹ گو آن۔'' (کہانی ''اپمان۔اپ مین اپ'' مطبوعہ ''سے کا بندھن'')

ممتاز مفتی کی ۳۵ء کی لکھی ہوئی ذاتی ڈائری کے مطابق جنس ممتاز مفتی کی شخصیت کا ہالہ ہے:

> ''میری شخصیت پر عورت کا عنصر وضاحت کے ساتھ غالب ہے۔ میں خدا سے ڈرتا ہوں اور اسی لیے اس کی شان میں گستاخی کرنے سے مجھے تسکین ملتی ہے۔ عورت سے ڈرتا ہوں اس لیے کہ اس کی جانب کھنچا جاتا ہوں...... میری محبت کی گاڑی شک اور کمتری کے پہیوں پر چلتی ہے۔۔۔ میری طبیعت میں بنیادی طور پر جو جذبہ کارفرما ہے وہ جھجک اور کمتری ہے۔'' ('سورما' از احمد بشیر)

ان حوالوں سے بنی شخصیت اگر یونگ' فرائڈ اور ایڈلر میں دلچسپی نہ لیتی تو حیرت ہوتی۔

مسعود قریشی کے خیال میں:

''مفتی لاشعور کا دیوانہ ہے۔۔۔کم از کم شعور کو اتنی اہمیت نہیں دیتا۔اس کے خیال میں بات کا اصل مطلب ظاہر الفاظ سے ہٹ کر ہوتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ باقی لوگ بھی یہ سمجھتے ہوں گے کہ وہ کہی سے زیادہ ان کہی پر توجہ دیتا ہے۔۔۔وہ غور اس بات پر نہیں کرے گا جو آپ لفظوں کے قالب میں اس تک پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بلکہ اس کی توجہ اس حصہ پر ہو گی جو آپ حذف کر رہے ہیں۔ (مضمون ''او نہیں جی'' از مسعود قریشی مشمولہ ''او کھے لوگ'')

مسعود قریشی کہتے ہیں ان کی بہترین تخلیق ''آپا'' (جو سات زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے) بھی ایسے ہی حوالے رکھتی ہے۔ بھائی جان باتیں کرتے ہیں ''بدو'' سے مگر مخاطب ''آپا'' ہوتی ہے۔ یوں کیرم کی بازی لگتی ہے جبکہ حقیقت میں محبت کی بازی لگ چکی ہوتی ہے۔ بطور اسلوب یہ مفتی صاحب کا خوبصورت انداز بھی ہے۔ احمد بشیر نے اس موضوع سے زیادہ دلچسپی لی۔

مفتی صاحب جنسیات کے غوطہ خور ہیں تو نفسیات کے تیراک بھی ہیں۔ ان جیسا شخصیت کو کون سمجھے گا؟ ان کے ناقد جب ان کے بارے میں اعتراض کرتے ہیں کہ وہ موضوع کو اپنی ہی عینک سے دیکھتے ہیں تو اس پر وہ کہتے ہیں۔

''میں خدا نہیں بندہ ہوں۔ میں صرف وہ کچھ دیکھتا ہوں اور لکھتا ہوں جو مجھے دکھتا ہے۔ میں نے کبھی حتمی سچائی کو پیش کرنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ میں نے ہمیشہ ''اپنا سچ'' پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے سچ میں کبھی ڈنڈی نہیں ماری۔۔۔عام نارمل فرد کی شخصیت مٹی کے مترادف ہوتی ہے۔ لیکن تخلیقی فرد کی شخصیت سیال ہوتی ہے اس میں حسیات کی لہریں چلتی ہیں۔۔۔۔مدّ و جزر ہوتی ہے۔۔۔

''میں اردو ادب کے بندھے ٹکے اصولوں کا پابند نہیں ہوں۔ میں تخلیق کار ہوں۔ میں اصولوں پر چلتا نہیں، اصول بناتا ہوں۔'' (ممتاز مفتی ''۳۰۳'' مشمولہ ''او کھے اولڑے'')

ایک اور بار یوں کہا۔

''پرانے قلم کار بڑے سیانے تھے۔ وہ شخصیت کی بھول بھلیوں میں قدم نہیں رکھتے تھے۔ اس 'پرزم' کی ہفت رنگی کی بات نہیں کرتے تھے بلکہ باہر کھڑے ہو کر جائزہ لیتے تھے۔ جبھی انہوں نے شخصیت کو خاکہ نگاری کا نام دے رکھا تھا کہ قد کیسا ہے، جسم بھرا بھرا ہے یا سکڑا۔ قلم کون سی جیب میں رکھتے ہیں۔ ڈیسک پر بیٹھ کر لکھتے ہیں یا میز پر۔۔۔'' (ممتاز مفتی ''مونچھ مروڑ'')

مفتی صاحب خاکہ نگاری میں آدمی کے خارج و داخل کو دیکھنے کی سعی کرنا چاہتے ہیں۔ عورت کی ذات کو جیسا انہوں نے سمجھا، وہ انہی کا حصہ تھا۔ کہتے ہیں۔

''ناموافق حالات کے تحت مرد بجھ جاتا ہے، عورت نہیں بجھتی۔ بظاہر وہ راکھ بن جاتی ہے، لیکن موافق ہوا کا جھونکا آئے تو راکھ اڑ جاتی ہے اور نیچے دبا ہوا انگارہ باہر نکل آتا ہے۔''
(ممتاز مفتی۔ ''گوریلی'')

احمد بشیر کا تجزیہ دیکھیے۔

''ممتاز مفتی نے اپنے گرد و پیش کی ہر ایک چیز میں ایک عجیب سی دورخی کی شدت سے محسوس کیا۔ وہ

اس بات کو جان کر حیران ہوا کہ آدمی کے دل میں بیک وقت مختلف اور متضاد خواہشات اور رجحانات موجود ہوتے ہیں۔۔۔۔ممتاز مفتی کو آج تک اپنی تحریروں کے متعلق یہ یقین پیدا نہیں ہوا کہ وہ ان کہی باتوں کا اظہار کامیابی سے کر سکا ہے یا نہیں۔۔'' (''سورما'' از احمد بشیر)
دوسرے دوست کہتے ہیں۔۔۔۔
''یہ بات مفتی میں کمال کی ہے بلکہ اب تو اس کی فطرت کا جزو بن چکی ہے کہ بات ہو یا افسانہ روایت سے بغاوت ضرور کرے گا۔ایسی بات کہنے میں تو اسے خاص لطف آتا ہے جو غیر متوقع ہو۔''

(''اونہیں جی'' از مسعود قریشی)

شہاب صاحب پر لکھتے ہوئے مفتی صاحب نے ادیب کی شخصیت کی نقاب کشائی خود کی۔
''ادیب کی شخصیت فقیر خانے کے مصداق ہوتی ہے۔ جہاں معذور شہنشاہ بستے ہیں۔ جہاں گونگے بولتے ہیں۔اندھے دیکھتے ہیں۔لنگڑے دریاؤں پر چلتے ہیں۔اپنے دکھ کو بھلانے اور دوسروں کو توجہ اپنی طرف منعطف کرنے کے لیے مختلف قسم کے ہتھکنڈے عمل میں لائے جاتے ہیں۔۔۔قدرت میں نمائش تھی نہ شدت نہ تضاد اس کی تحریر میں چونکا دینے والی کوئی بات نہ تھی۔ اس کے جملوں میں توجہ طلبی کا عنصر نہ تھا''۔(قدرت اللہ شہاب)
یہیں مفتی صاحب نے کہا تھا کہ
''اوصاف ہمیں ایک دوسرے کے قریب نہیں لاتے کمزوریاں لاتی ہیں''۔مفتی صاحب پاکستانی افسروں کے عین برعکس مزاج رکھتے ہیں لیکن ان افسروں کی طرح اپنی اُردو دانی کی کمزوری کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔اس کمزور اُردو کے باوجود حال یہ ہے کہ بے حد عمدہ لکھا۔ بے شمار اصناف میں لکھا اور بے قیاس کامیابیاں پائیں۔
''کہتا ہے مجھے زبان پر قدرت نہیں اور یہ کہنے کے باوجود اظہار کے لطیف اور نازک پہلو پیش کرتا ہے۔اس کا انداز اس قدر منفرد ہے کہ کسی افسانے سے بھی ایک ٹکڑا اٹھا کر پڑھ لیجیے، یقینی طور پر کہا جا سکے گا کہ یہ مفتی کا ہے۔اردو کے شاعروں اور مزاح نگاروں میں تو چند باکمالوں کو اسلوب کی یہ انفرادیت حاصل ہے لیکن افسانہ نگاروں میں مفتی کے سوا کسی کو یہ امتیاز حاصل نہیں۔
(''اونہیں جی'' از مسعود قریشی)

ممتاز مفتی کا یہ منفرد اسلوب دھماکوں سے عبارت ہے۔ پروین عاطف کہتی ہیں۔
''لوگ بیچارے تو کب سے توبۃ النصوح' منشی پریم چند' راشد الخیری بغلوں میں داب مزے مزے زندگی کاٹ رہے تھے۔اردو ادب بیٹیوں کے جہیزوں کی زینت تھا۔باغی کو یہ بات کب پسند تھی۔ اس نے رنگ رنگیلی ریڑھی پر مسالے دار چاٹ لگائی اور چوک میں کھڑے ہو کر ہانکے دینے شروع کر دیئے۔'' (''پائیڈ پائپر'' از پروین عاطف)
مفتی صاحب کو بغاوت بھی آتی تھی۔ چونکانا بھی آتا تھا۔غیر متوقع آغاز' توجہ طلب اسلوب' لذیذ لہجہ پھر انسان کی تہ در تہ نفسیات' شخصیت کا دوسرا رنگ' گلیشئر کا دبا ہوا پہلو۔''ان کہی''،''چپ'' مغربی تنقیدی اصطلاحات میں بہت ہی

اہم شخصیت پیا ہیں۔ Suggestiveness جسے سید عابد علی عابد نے خیال افروزی کہا ہے، وہ شے مفتی صاحب کے ہاں کہے ہوئے لفظ سے ہمیشہ ایک قدم آگے بڑھ کر ابلاغ کرتی رہی۔ ''آپا'' سے ''اسمارائیں'' تک، ''علی پور'' سے ''الکھ نگری'' تک اسرار تھا۔ جوان نسوانی جسم کا، عنفوان شباب کا، غرض ایک پورا طلسم۔

خود اپنے آپ پر لکھا تو خود کو ''چھوٹا'' کہہ کر پکارا۔ انہیں ہر عورت سے ہر لحاظ کے بغیر عشق ہے۔ خصوصاً سفید رنگ پر عاشق ہیں۔ پہلی محبوبہ سوتیلی ماں تھیں، مفتی فطری لحاظ سے خواب خیال کی دنیا کا فرد ہیں۔ تنہائی پسند، شرمیلے، احساس کمتری کی نشانی۔ عورت کے تصور تک سے انہیں محبت ہے۔ مگر دراصل محبت کرنے کے عمل سے محبت ہے شاید محبوبہ سے نہیں۔ محبوبہ عجیب تر ہے۔ عمر رسیدہ مٹیار جو ہرجائی ہو، بے کردار بلکہ بدکردار ہو تو کیا کہنے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ محبوبہ میں ماں متا کا ہونا بھی ضروری ہے۔ ''ممتا بھرے لگاؤ کے ساتھ بے وفائی کی دھونس'' غرض ''طوائف قسم کی عورت سے بڑی دلچسپی ہے۔'' (''چھوٹا'' از ممتاز مفتی مشمولہ ''اور اوکھے لوگ'')

جو تخت پر بٹھا کر مور چھل بھی کرے، پھر لات مار کر گرا بھی دے۔ آخر کار زندگی سے نکل جائے۔ مگر ''وہ آفت دل عاشقاں''۔ امرتا پریتم صرف اس لیے پسند کر لی تھی کہ وہ ایک زمانے کی محبوبہ تھی۔ ۱۹۳۰ء کے قیام ملتان کے زمانے میں ممتاز مفتی نے ڈائری میں لکھا۔

> ''مرا ذہن قومی، مذہبی، خاندانی اور رسمی تعصبات سے خالی ہے۔ میں عزت اور خودداری کے جذبات سے قطعی کورا ہوں۔'' مگر بعد میں یہی قومی حوالے انہیں شہاب تک لے گئے، ''لبیک'' لکھوا دی۔

مفتی صاحب کی تحریر انہی پر گئی ہے۔ ان کی زبان ذاتی ہے۔ ان کی اردو پردیسی لونڈیا نہیں لگتی۔ مثلاً بعض جملے دیکھیے:

> ''گھر میں سات جی تھے۔۔۔۔ لیکن روٹی کا فکر صرف مودی پر طاری رہتا۔''
> ''یہ پاگل پنا میں ان کے گھر لایا تھا۔''
> ''گوریلہ گروپ نے مجھے ایسا چھاما را کہ انہی کا ہو رہا۔''
> ''سوچوں کا مارا ہوا دانا پردانا۔''

غلط زبان کا لکھنا ان کے دائیں ہاتھ کام کا تھا لیکن غلط پر اتنا اصرار کرنا کہ پروین عاطف بھی تحریر میں ویسا ہی کرنے لگے، ان کے بائیں کا کھیل تھا، وہی جسے میر حسن نے یوں کہا تھا کہ ''گئی بائیں کی آسماں تک گمک۔''

اتنے اصرار سے لکھا کہ خود ابدال بیلا سوڈے کی طرح شوں شوں لکھنے لگ گیا تب کہیں آرام آیا۔

اب اگر طبلہ اور ہارمونیم آپ کے دھیان میں آ گئے ہوں تو مفتی صاحب اس میں بھی بند نہیں تھے۔ میوزک سیکھا یا نہ سیکھا، تخلیق و تحریر کے دو مختلف لہجے، دونوں حیران کن اور دونوں میں حیرت انگیز کمال اظہار۔ یہ ہیں ممتاز مفتی۔ نغمہ اور الاپ، ساز اور آواز سب سرتیوں، سمرتیوں، مرکیوں، پھرکیوں سمیت جانتے تھے۔ تبھی وہ اس طرح کی بات کہہ سکے کہ۔

> ''عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ گانے کو گلے سے تعلق ہے۔ یہ خیال درست نہیں۔ بنیادی طور پر گانے کو کان سے تعلق ہے۔۔ کچھ لوگوں میں سنی ہوئی چیز کو یادداشت میں محفوظ کر لینے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں میں گائک بننے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔''
> ''تال جسم پر اثر کرتی ہے، سُر روح پر۔''
> ''موسیقی سے شدت کے ساتھ متاثر ضرور ہوتا ہوں۔''

مفتی صاحب کے ہاں تاثر کی تخلیق کی دو مختلف و متضاد صورتیں دیکھیے۔ کیا دو الگ الگ شبیہیں نہیں بنتیں؟

''اس روز میں نے طفیل کی دھن اور بولوں میں بلا کی ہم آہنگی محسوس کی۔ اس ہم آہنگی نے میرے اندر ایک کیفیت پیدا کر دی۔ ایک سرشاری یوں جیسے مٹی کا باوا کسی کے دوار پر کھڑا ہاڑے کر رہا ہو۔۔۔طفیل کے اندر کا حبشی گا رہا تھا۔ میں اکیلے میں سُن رہا تھا۔ میرے اندر کا انسان میرے سامنے آ بیٹھا تھا''۔ (بیراگی)

لگتا ہے جیسے دکھ کے پانیوں میں گھرا ہوا ایک سرسبز جزیرہ ہو۔ لیکن اس کی آنکھ میں ایسی نگاہ بھی ہے جو چلتی آندھیوں کو باندھ سکتی ہے، دریا کا رخ موڑ سکتی ہے۔ پھول پر شبنم کے قطرے دیکھ کر کبھی کبھی شک پڑتا ہے کہ دُکھ ایک سنگار بھی ہے۔ ایک انوکھا مگر زوداثر کاسمیٹک۔'' (شہزادی)

نثر نگار ممتاز مفتی کی کچھ شاعروں کے حوالے سے شخصی تصویر کشی ملاحظہ ہو:

''مزاحیہ شاعروں کے راستے میں ایک سخت مقام آ جاتا ہے۔ بہت جلد انہیں احساس ہو جاتا ہے کہ ہمارے ہاں قاری اور سامع میں' مزاح کی لطافت کا احساس بہت کم ہے لیکن طنز پر واہ واہ ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ فن کو چھوڑ کر واہ واہ کی جانب چل پڑتے ہیں۔ (ست رنگا)

وہ کیفیت جسے ''ہپی نیس'' کہا جاتا ہے صرف ''میڈیا کرز'' کو نصیب ہے۔ لگتا ہے قدرت نے شعراء کو سکھی زندگی بسر کرنے کے لیے پیدا نہیں کیا۔ وہ جو زندگی کی ''انڈر بیٹ'' کو سننے کی حس سے نوازے جاتے ہیں' انہیں ذاتی زندگی بسر کرنے سے محروم کر دیا جاتا ہے۔'' (شہزادی)

''وہ تو شاعر اور عالم کی مداح تھی لیکن شادی ادب سے نہیں ہوتی' بندے سے ہوتی ہے۔ ادیب اور ہوتا ہے، بندہ اور۔'' (کومل)

تینوں تحریروں میں درآنے والے یہ تجزیے صرف ادب کی سطح کی چیز نہیں رہ گئے۔ یہ دانشور والی نگاہ کے تجزیے ہیں، مفتی صاحب ایسے ہی دانشور تھے۔ حقیقت تو یہ بھی کہ ان کی تحریر کا ایک رخ بھی عام تھا نہ عامیانہ۔ اب اس سب کے ہوتے ہوئے کون ممتاز مفتی کا انکار کرے گا؟ مگر نہیں ''چھوٹا'' لکھ کر ممتاز مفتی نے خود ممتاز مفتی کا انکار کیا۔ احمد بشیر، مسعود قریشی، پروین عاطف سب ''مفتیات'' میں یہی راہ چلے۔ اشفاق احمد' بانو قدسیہ سب نے عام نظر سے ہی دیکھا۔

تاہم یہ عام ہونا ہی مفتی صاحب کا خواب تھا۔ آج کا عہد، امریکہ' خواص اور آسودگی کا عہد ہے۔ وہ زمانہ عوام الناس کی مفلوک الحالی اور ادباء کی بے پروبالی کے باوجود عوام کی اہمیت اور ادب کی عوام دوستی کا تھا۔ مختار صدیقی کو سکھانے والے نکتہ وراس کے زمانے کے بعد تک نہ جیے، جس نے کہا تھا:

نکتہ وروں نے ہم کو سکھایا' خاص بنو اور عام رہو
محفل محفل صحبت رکھو' دنیا میں گمنام رہو

مفتی صاحب نے بھی ایسا ہی کیا۔ خصوصی ملبوس کبھی نہ پہنا۔ اونچے ہو کر کبھی نہ بیٹھے۔ بولے تو عوام کی زبان میں' لکھا تو سادگی سے' آسان' چھوٹے جملوں میں۔ قوافی یا ہم صوت لفظیات کو جھوٹوں بھی منہ نہ لگایا۔ شاعروں کو نثر نگاروں پر فوقیت دی۔ شاعری کی قدر کی مگر نثر کے عیوب چھپانے کے لیے شعر کا سہارا کبھی نہ لیا۔ میر نے کہا تو تھا

؎ شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

پر ظالم نے عوام کا تو کبھی سلام بھی نہ لیا تھا، مفتی صاحب دفتر کے سربراہ کے ہمراہ چلتے ہوئے بھی چپراسیوں، نائب قاصدوں اور ڈی۔آر۔ سے علیک سلیک کرتے جاتے۔ وہ جو کسی نے کہا تھا۔

خیال خاطر احباب اور کیا کرتا

انہوں نے عموماً عامی لہجے میں بات کی مگر معنی دُور کا نکالا۔ گئے گذرے حسن کا قدردان۔ تھوڑی سی توقعات والا قانع کردار آج ہمارے اردگرد اور کون ہے؟

لیو ٹالسٹائی ان کے پسندیدہ مصنفوں میں سے تھا۔ نقاد کے بارے میں جو ٹالسٹائی کا خیال تھا کہ ''تنقید نگار وہ مکھی ہے جو گھوڑے کو کام کرنے سے روکتی ہے۔'' وہی نقطہ نگاہ مفتی صاحب کا رہا۔ حد تو یہ ہے کہ وہ جمیل جالبی صاحب جیسے محقق کو تحقیق و تنقید سے تخلیق کی طرف لانے کی سعی کرتے رہے۔ وقار بن الٰہی جیسے تارک الحکایت کو جو تیس سال سے لکھنا چھوڑے ہوئے تھا، مفتی صاحب دوبارہ افسانہ نگاری میں گھیر کر لے آئے۔

مفتی صاحب کی طرح ہمارے بہت سے تخلیق کار تنقید پر تخلیق کو ترجیح دیتے مگر جہاں اپنی ذات کا سوال آتا ہے یا اپنے مرتبہ کا تعین درپیش ہو، ان کے اندر کا خفتہ اور خفیہ تنقید نگار اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ یہیں ادبی تفہیم کے راستے میں رکاوٹوں کے پہاڑ کھڑے ہو جاتے ہیں مگر مفتی صاحب اس بابت پورے سچے آدمی تھے۔ تنقید کو ناپسند کیا تو انشائیہ ہو، افسانہ نگاری ہو، خاکہ نگاری ہو، رپورتاژ کی دنیا ہو، انہوں نے کسی حوالے سے اپنی بڑائی ثابت کرنے کی مجبوری سے تنقید کا ترازو نہیں پکڑا۔ وہ سارا وزن تخلیق اور مسلسل تخلیق کے پلڑے میں ڈالتے رہے۔ ہر صنف میں اپنے مقام کا تعین آنے والے وقت کے سپرد کئے رکھا۔

افسانہ نگاری، جیسا کہ بیان ہوا، ان کی بنیادی شناخت رہا ہے اور فکشن سارے میں ان کہی ان کا وسیلۂ اظہار رہا۔ مسعود قریشی تو کہتے ہیں کہ عام گفتگو میں بھی کہنے والے نے جو بات کہنے سے روک لی ہو، مفتی صاحب اسی کو اصل گفتگو سمجھتے۔ آیئے ان کے کہے اور لکھے میں سے بعض ان کہی' اور ان لکھی صداقتوں کی تلاش بھی کریں، جن صداقتوں کا اظہار خود مفتی صاحب جیسے حقیقت نگار کے منصوبے کا بھی حصہ نہ تھا۔

یہاں سے ہمیں مفتی صاحب کے زمانے کا پاکستان اپنی حقیقی تصویر دکھا سکتا ہے۔ دیکھتے ہیں کہ عیسیٰ خیلوی کا زور آور گانا ''تینوں لے کے لے جانا اے میانوالی'' آیا واقعی اس معاشرے کا بھی کلچر بن چکا ہے یا نہیں۔ وہی معاشرہ جس میں ہم اور مفتی صاحب سانس لیتے رہے ہیں۔

> ''گٹ اسائیڈ'' وہ چلائی۔ نوجوان نے اس کی کلائی پکڑ کر دھکا دے کر کرسی پر بٹھا دیا۔ نمانہ چیخی چلائی تو وہ بولا: ''یہاں آپ کی مدد کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔ چپ چاپ چائے بنایئے۔'' یہ کہہ کر وہ اس کے مقابل کی کرسی پر جا بیٹھا۔ نمانہ چپ چاپ غصے میں اُبلتی ہوئی چائے بنانے لگی۔
>
> ''......میں نے تو صرف یہ ریکوئسٹ کی تھی کہ میرے ساتھ بیٹھ کر ایک پیالہ چائے پی لیں۔ اس سے میرا کوئی مقصد نہ تھا۔ معمولی سی کرٹسی۔'' ''تھینک یو' اس نے چائے کا پیالہ پکڑ کر کہا۔''
>
> (''مانا نمانہ'' از ممتاز مفتی)

ٹھیک اسی طرح کی فرمائشی کرٹسی کی توقع غلام محمد کو اپنے زمانے کی اسمبلی سے تھی جسے اُسے پھر خواستہ و ناخواستہ برخواست کرنا پڑا۔ اسی فرمائشی خوش خُلقی کی توقع ہر زمانے کا چیف آف سٹاف اپنے وزیراعظم سے رکھتا رہا۔ کرٹسی کی یہی توقع ہمارے مرد اداکار کے ادا کیے ہوئے جملوں سے بھی ظاہر ہوتی رہی ہے جب وہ ہمارے ٹی وی پر اپنی منسوبہ یا نکاح

یافتہ محبوبہ سے dialogue بول رہا ہوتا ہے۔ طاقت کا یہ کلچر ہمارے روزمرہ کا اتنا قدرتی حصہ ہے کہ مفتی صاحب جیسے باریک بین کو بھی عجیب نہیں لگا۔ ان کا کردار کہتا ہے۔

''...... یہاں ہر لڑکی خود کو ہر وقت لڑکی سمجھتی ہے...... کبھی بھول بھی جایا کریں کہ آپ لڑکی ہیں...... خدا حافظ۔'' (مانا نمانہ)

یہاں کی لڑکی بھی لڑکی ہونا بھول کر دکھا سکتی ہے مگر کیا چھ سالہ لڑکی پر جنسی تشدد کرنے والا ہمارا مرد یہ کبھی بھولتا ہے کہ یہ لڑکی ابھی بچہ ہے، لڑکی نہیں بنی۔ حضرت عیسیٰ نے کہا تھا۔

بھیڑیوں کے لیے ان کے غار اور بھٹ سب سلامت ہیں
پر ابن آدم کی خاطر کہیں سر چھپانے کی صورت نہیں

(ابھی سورج نہیں ڈوبا)

یونہی مقبوضہ کشمیر میں B.S.F والے جب خانہ تلاشی میں گھروں سے مردوں کو نکالتے ہیں تو کئی مرد مرنے مارنے پر اُتر آتے ہیں حالانکہ یہ جہاد اور لڑائی کا موقع نہیں ہوتا، صرف عورتوں کی تلاشی لینے کا مرحلہ ہوتا ہے۔ ہمارے پاکستان میں بھی ڈاکو جب رات کو عورتوں سے کھانے پکوا کر کھانے کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں تو گھر کی چابیاں سپرد کر دینے والے مرد بھی عورتیں سپرد نہیں کرتے۔ وہ بھی سوچتے ہیں کہ گھر لٹنے کے وقت بھی لڑکی، لڑکی اور عورت عورت رہتی ہے۔

''نمانہ گھر پہنچی تو یوں تنی ہوئی تھی جیسے سارنگی کے تار۔ تاؤ ذرا کم ہوتا تو لذت کی ایک رَو جسم میں دوڑ جاتی...... ماں نے کہا ''بیٹی تیرے لیے ایک رشتہ آیا ہے...... تیری مرضی...... یہ لڑکے کی تصویر ہے'' تصویر کو دیکھ کر نمانہ چونکی۔ آنکھیں غصے سے اُبل آئیں۔ (''مانا نمانہ'' از ممتاز مفتی)

افسانے ہی کا حصہ نیچے کا نوٹ ہے جس میں اُنہوں نے پوچھا ہے کہ کردار واقعات کی روشنی میں قاری بتائے کہ نمانہ نے رشتہ پسند کیا ہوگا یا کہ ٹھکرایا۔ مفتی صاحب کے قاری جانتے ہیں کہ ان کے کردار لذت اور لُطف کی ناقدری نہیں کرتے۔ ان کا پیش کردہ معاشرہ لطف لذت اور جسمانیت ہی کے دائرے میں رہتا ہے۔ سو جواب ظاہر ہے۔

جنس پر لکھنے والوں کے اپنے احوال و مقامات ہوں گے۔ مفتی صاحب نے لکھا اور بہت لکھا مگر منٹو کی طرح نہیں کہ پکڑائی دے دیں۔ مفتی صاحب کی نگاہ میں جنس نوجوان پڑھنے والوں اور والیوں میں مقبول تھی سو لکھا۔ خدا سے ڈر تھا سو خدا کے خلاف زبان و قلم کو حرکت دی مگر قوم کے حوالے سے ''شدید'' ہونا پسند ہی نہ کیا۔ قیام پاکستان تک تو ہندو مسلم کی تخصیص کو بھی گناہ سمجھا، پاکستان بننے کے بعد کہیں جا کر پاکستانی ہوئے۔

حیرت ہوتی ہے کہ مولائے دو جہاں کے پاس حاضری ان کے لیے کتنی آسان ہوگئی۔ ''لبیک'' لکھنا کیسے ممکن ہوگیا۔ ''لبیک'' کی مقبولیت؟ یہ سب کسی حج مبرور کے بغیر کیسے ممکن تھا؟ پھر جو ''بابے'' انہیں نصیب رہے عزیز ملک کی ہمراہی، پھر قدرت اللہ شہاب کا سنگ۔ سبحان اللہ، سب کتنی سہولت سے ہوا۔

میں نے مفتی صاحب کی وفات سے ٹھیک ایک سال پہلے ہونے والی ان کی خصوصی سالگرہ کی نشست میں مذکورہ حوالوں سے اپنے تحیّر کا ذکر کیا اور سوچا کہ ان کے لیے سارے مراحل کیسے آسان کر دیئے گئے۔ خود لکھنے کا عمل۔ ان کے لیے کتنا آسان تھا کہ پنسل سے فل سکیپ پر لکھتے، غلط ہو جاتا تو ربر سے مٹا کر لکھتے چلے جاتے یوں پہلا پروف ہی فول پروف ہوتا۔ عنوان چُننا ان کا مسئلہ نہ بنا، نہ ہی کبھی انہوں نے نام کا وہم کیا۔ ''اپمان، ہندی لفظ کے ساتھ up man

انگریزی ملادیا اور نام رکھ دیا۔ مانہ نمانہ، بھی کوئی نام بنتا ہے؟ نہ بنے ان کی بلا سے، انہوں نے بنا دیا۔ بلکہ ''مانہ نمانہ'' دونوں کی املا 'نشانہ' کے وزن پر کر دی۔ کرلو جو کرنا ہے۔ غلط زبان لکھی اور مکمل بے خوفی سے لکھتے رہے۔ عام بول چال ہی کی سطح کو مضمونوں خاکوں میں برت لیتے۔ ''صاحبو'' کہا اور بات شروع۔ افسانہ خاص ''مفتیانہ'' آغاز رکھتا۔ مگر یہ آغاز خصوصی ہوتے ہوئے بھی کبھی مشکل پسند یا محدود نہ بنا۔ خود سب کے بن کے رہے کسی کے لیے دوستی کو بھی محدود نہ کیا۔ احمد بشیر۔ پروین عاطف۔ مسعود۔ اشفاق۔ عمار۔ عمر۔ بانو۔ شہاب تو ایک طرف کہ ان کے ساتھ عمروں کا سنگ تھا، میں، جلیل عالی، رشید امجد، ابدال بیلا، بلقیس محمود کسی کو یہ گمان نہیں رہا کہ اس کے ساتھ ان کا تعلق کم تر تھا۔

ہر اک کو یہ گماں کہ مخاطب ہمیں رہے

ان کی زندگی تحریر و تخلیق سادگی، سہل الحصولی اور ہمہ دوستی تھی۔ یوں پوری زندگی بے تکلفی کی ایک ایسی سیدھ میں آ گئی تھی جسے ''چھڈ یار'' (یعنی چھوڑ یار جوان کا تکیہء کلام تھا) کے سوا اور کچھ کہنا ناموزوں ہو۔ پچھلے برس میں نے یہ باتیں کیں تو آنکھوں میں چمک آ گئی، کہنے لگے یہ سب مجھے لکھ کے دے سکتا ہے؟ میں نے اقرار کیا تو دوبارہ وعدہ لیا۔ بولے ''اتنا کچھ تو میرے بارے میں کبھی کسی نے نہیں کہا''۔ کوئی مانے گا؟ اتنا بڑا ادیب اور اتنا عجز۔۔۔!

حوالہ جات

۱۔ ممتاز مفتی: ''سے کا بندھن'' کہانی ایمان، ''آپ مین آپ''، مطبوعہ فیروز سنز لاہور طبع اول ۱۹۸۶ء، ص ۱۷۲۔۱۷۵

۲۔ احمد بشیر ''سورما'' بشمولہ ''اوکھے لوگ'' از ممتاز مفتی، یونیورسل بکس، اُردو بازار، لاہور، طبع اوّل، ۱۹۸۶ء، ص ۲۷۶

۳۔ مسعود قریشی۔ ''او نہیں جی'' مشمولہ ''اوکھے لوگ''، ایضاً، ایضاً، ایضاً، ایضاً ص ۲۸۸

۴۔ ممتاز مفتی: مشمولہ ''اوکھے اولڑے'' فیروز سنز، لاہور، طبع اول ۱۹۹۵ء، ص ۱۰۱۔۱۰۲

۵۔ ایضاً: ''مونچھ مروڑ'' ایضاً

۶۔ ایضاً: ''گوریلی''، ایضاً

۷۔ بحوالہ ''اوکھے لوگ'' از ممتاز مفتی۔ مضمون ''چھوٹا'' مطبوعہ فیروز سنز، لاہور، طبع اوّل، ص ۵۔۳۱۶

۸۔ ''اوکھے لوگ'' از ممتاز مفتی، مضمون ''سورما''، از احمد بشیر، یونیورسل بکس، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۲۷۷

۹۔۱۰۔۱۱، ممتاز مفتی: ''اوکھے اولڑے'' فیروز سنز، لاہور، طبع اول ۱۹۹۵ء

۱۲۔ ممتاز مفتی، ''سے کا بندھن'' (افسانے)، مطبوعہ فیروز سنز لاہور، طبع اوّل، مارچ ۱۹۸۶ء

سعود عثمانی اور معجزۂ رنگِ نمو

انور مسعود

ایک مرتبہ عمرے کی سعادت حاصل کرتے ہوئے میں سعود عثمانی کا ہمسفر تھا۔ ہم نے کئی صبحیں اور شامیں حرمین شریفین میں اکٹھے گذاریں۔ بیت اللہ کے طواف کے دوران میں اُسکا والہانہ پن ایسا دیدنی تھا کہ کوئی کیمرہ اُسکی تصویر کشی نہیں کرسکتا۔ اس کیفیت کے زیر اثر اظہارِ تشکر میں بھیگے ہوئے جو وجد آفریں اشعار اُس نے کہے تھے میں اُن کا پہلا سامع تھا۔ سعود نے اپنی شعری مجموعے "بارش" کا آغاز انہی اشعار سے کیا ہے۔ دو شعر ملاحظہ فرمایئے۔

کھڑا ہوں اپنے ہی سائے کی جانماز پہ میں
نمازِ شکر میں دل کو امام کرتا ہوا

ترے حضور مجھے لے کے آن پہنچا ہے
یہ سجدہ مجھ میں مسلسل قیام کرتا ہوا

قدرت کے جلال و جمال کی جملہ کارفرمائیاں سعود کی نگاہ کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ اُسکی خدا پرستی اُسکے تجربات و مشاہدات میں طرح طرح سے اپنی جھلک دکھاتی ہے

ہے ایک دستِ حفاظت مجھے سنبھالے ہوئے
سمیٹ لیتا ہے جب بھی کوئی بکھیرتا ہے

بارگاہِ رسالت مآب میں اُسکی عقیدت اور احترام کے اظہار کا ایک پیرایہ دیکھئے

میں نعت کہتا ہوں اور دل میں ڈرتا رہتا ہوں
کہیں گرفت کسی بات پر نہ ہوجائے

اُسکی غزلوں کے اندر بھی نعتیہ مفاہیم کے اشعار موجود ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے کہ اس شعر میں قرآن کریم کے پس منظر میں حضورؐ کی ذاتِ گرامی اپنی تجلی دکھا رہی ہے۔

ایک کتاب سرہانے رکھدی، ایک چراغ ستارہ کیا
مالک اس تنہائی میں تو نے کتنا خیال ہمارا کیا

اسلامی تہذیبی روایت سے سعود کی وابستگی بہت گہری ہے۔ اُسکے نزدیک یہ سبز شاخ ایسی ہے جو نامساعد آب و ہوا میں بھی نمو پذیر رہتی ہے۔ اُمتِ مسلمہ کے زوال کے دور میں بھی اُسکے تہذیبی جوہر کی توانائی مسلسل اپنا اثر دکھا رہی ہے۔ تاہم اُسے اس بات کا بہت دکھ ہے کہ کئی صدیاں اکارت چلی گئی ہیں اور ہمارے قدم آگے نہیں بڑھ سکے۔ مدتوں سے ہماری تاریخ بے ثمر ہے۔۔۔

ہمارا کرب کبھی رفتگاں سے پوچھیئے گا
ہزار شب ہے مگر ایک بھی کہانی نہیں

اُسکی تہذیبی روایت سے وابستگی کی بنا پر قدرت نے اُسے سلامت روی اور توازن کی بڑی دولت عطا فرمائی ہے ۔ جذبہ واحساس کی انتہائی شدتوں میں بھی وہ اعتدال کا دامن نہیں چھوڑتا۔ اُسے سخت سے سخت بات بھی ملائم لہجے میں کہنے کا ہنر آتا ہے لیکن جب ظلم، استبداد اپنی انتہا کو پہنچ جائے تو اُس پر نرم مزاج شاعر بھی چیخ اُٹھتا ہے۔

قاتلو ! خون پہ تم کتنی ہی مٹی ڈالو
پھر بھی مٹی سے صدا آتی ہے قاتل قاتل

اُسکی نظم لینڈ سلائیڈ میں اُسکے LOUD ہونے کی خوبصورت توجیہ سامنے آتی ہے جس میں اُس نے یہ بیان کیا ہے کہ پیہم زخم لگنے اور غم کے جمع ہوتے رہنے سے درد سنبھالے نہیں سنبھلتا اور ضبط کے بندھن آخر ٹوٹ جاتے ہیں ـــ

گیلی مٹی رفتہ رفتہ حوصلہ چھوڑتی جاتی ہے
اور پھر اک دن
خاک کا تودہ چلتا ہے
منظر رنگ بدلتا ہے
دل ٹوٹے تو پھر کب جسم سنبھلتا ہے۔

سعودؔ نے کتاب کے آغاز میں حضرت علامہ اقبالؒ کا بہت خوبصورت شعر درج کیا ہے

پیش تو نہادہ ام دل خویش
شاید کہ تو ایں گرہ کشائی

(میں نے اپنا دل تیرے آگے رکھدیا ہے۔ شاید کہ تو اس گرہ کو کھول دے)

دل کی گرہ میں سعودؔ نے جو واردات باندھ رکھی تھیں، جو لطیف جذبات واحساسات جمع کر رکھے تھے انکو بڑے سلیقے سے بارش کے اوراق پر ثبت کر دیا ہے۔

زندگی ملنے اور بچھڑنے سے عبارت ہے۔ سعودؔ کی شاعری میں بچھڑنے کے منظر بھی موجود ہیں مگر جتنا تنوع ملاپ کی کیفیات میں ظاہر ہوا ہے وہ فراق میں دکھائی نہیں دیتا۔ وہ ایک ملنسار آدمی ہے اور یہ غمگساری اُسکی شخصیت کا جزو اعظم ہے۔ چنانچہ ملنے کے لفظ کے مختلف اشتقاقات اُسکے اشعار میں کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ اُس نے کتاب کے پس ورق کے لئے اپنا جو شعر منتخب کیا ہے یہ لفظ اُس میں بھی موجود ہے

ہوائے شب تجھے آئندگاں سے ملنا ہے
سو تیرے پاس امانت ہے گفتگو میری

اُس نے تو اپنی ایک غزل بھی "ملتی ہے" کی ردیف سے سجا رکھی ہے۔

تری شبیہ جو ملتی نہیں کسی سے کبھی

کبھی کبھی کسی چہرے سے جا بھی ملتی ہے

ے میں اک شجر سے لپٹتا ہوں آتے جاتے ہوئے
سکوں بھی ملتا ہے مجھکو دعا بھی ملتی ہے

اس حوالے سے اُسکی دوسری غزلوں کے بھی ایک دو شعر ملاحظہ فرمایئے

ے اُس آنکھ سے بس آنکھ ملانے کی دیر تھی
پھر جیسے چل پڑی مری تنائی میرے ساتھ

ے حیرت سے تکتا ہے صحرا بارش کے نذرانے کو
کتنی دور سے آتی ہے یہ ریت سے ہاتھ ملانے کو

سعودؔ کی غزل محبت کی مہک کے ساتھ ساتھ سیاسی، تاریخی اور سماجی شعور سے بھی مالا مال ہے ہمارا معاشرہ جن مصائب و مسائل سے دوچار ہے سعودؔ کی شاعری اُس سے بے تعلق نہیں ہے۔ یہ صورت حال اُسکے لئے بہت اذیت ناک ہے۔ وہ بڑی دردمندی سے کہتا ہے

ے قصہ یہ ہے کہ ریت کی اوقات بھول کر
ٹیلوں کو ہم نے اپنا ہمالہ بنا لیا

ے لگی ہوئی ہے کوئی آگ جسکو پھونکنے میں
ہر ایک دوست ہر اک محترم لگا ہوا ہے

ے میں آندھیوں کے مقابل کھڑا ہوا ہوں سعودؔ
پڑی ہے فصلِ محبت کٹی کٹائی ہوئی

سعودؔ سمجھتا ہے کہ سیاسی منظرنامے کی بازی گری میں جو اداکاریاں چل رہی ہیں اُن سے حق و باطل کا امتیاز بہت دشوار ہوگیا ہے۔ اس بات کو اُس نے کتنا خوبصورت شعری جامہ پہنایا ہے۔

ے دھواں سا کچھ تو میاں برف سے بھی اُٹھتا ہے
سو دل جلوں کا یہ ایسا کوئی پتا بھی نہیں

کمرشلائزیشن نے انسان کو ایک خریدنی اور فروختنی شے بنا کر رکھ دیا ہے۔ کثیر قومی کمپنیوں کے تجارتی مفادات اخلاقی اور روحانی قدروں کو بُری طرح پامال کر رہے ہیں۔

ے ہر شخص وہاں بکنے کو تیار لگے تھا
وہ شہر سے بڑھ کر کوئی بازار لگے تھا

مگر ان انتہائی تشویشناک اور دلآزار احوال کے باوجود وہ مایوس نہیں ہوتا۔

ے اسے شکست نہ سمجھو، اسے فنا نہ کہو
بکھرتا پھول نئے پھول ہی بکھیرتا ہے

سعود کے نزدیک اسی مادی دنیا کے اندر روحانی سطح بھی موجود ہے

؎ تو جانتا نہیں مٹی کی برکتیں کہ یہیں
خدا بھی ملتا ہے خلقِ خدا بھی ملتی ہے

سعود براہ راست اظہار کے بجائے اشارے اور کنائے سے بات کرتا ہے۔ بیان کی لطافت اور نفاست اُسکا طرہ امتیاز ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ حسن نقاب داری میں مضمر ہے۔ اسی سلیقہ کا فیضان ہے کہ اُس نے کلاسیکی روایت سے وابستہ رہتے ہوئے ایک منفرد انداز اختیار کیا ہے اُسکی غزل صنفِ غزل کے بارے میں ایک اعتماد اور اعتبار کا سندیسہ ہے۔"بارش" میں سعود کی قوس ایک خوشنما قوس قزح کی صورت اختیار کرگئی ہے۔ اُسے شعر کو سجانے کے قرینوں سے زبردست آگاہی حاصل ہے۔ اظہار کی شائستگی کے اعتبار سے وہ مجھے اعلیٰ ترین شعراء کے قبیلے کا فرد معلوم ہوتا ہے۔

اگر چہ سعود کے شعری اظہار کا بنیادی پیرایہ غزل ہے تاہم کتاب میں موجود نظموں میں بھی اُسکی قلبی واردات کا انعکاس موجود ہے اور ان میں اُسکے خاص موضوعات کے ساتھ اُسکے کلیتہً ذاتی احوال کے اشارے بھی ملتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ اس صنف میں اُسکے جوہر کا بھرپور اظہار اُسکی اُس نظم میں ہوا ہے جس کا عنوان اُس نے ادھوری نظم رکھا ہے۔ اپنے علاقے، افراد، اور رہائشگاہوں سے فطری وابستگی نے اس نظم میں آفاقیت کی روح پھونک دی ہے اگر چہ اسکی بہت روایتی قطعہ بندی ہے لیکن تشبیہوں اور استعاروں نے اسے زندہ و تابندہ بنادیا ہے

؎ کسی تفکرِ حیران میں غرق وہ طوطا
جو بھائی جان کے قدموں کی چاپ جانتا تھا

؎ نہ جانے کیوں اُسے ہر آئینے سے وحشت تھی
یہ اُسکے بھید تھے ان کو وہ آپ جانتا تھا

؎ میں جب بھی گاچنی ملتا تو میری تختی پر
ہتھیلیوں سے لکیریں سی پڑنے لگتی تھیں
اور اسکے بعد کسی گرم خشک جھونکے سے
سلیٹی رنگ کی پوریں اکڑنے لگتی تھیں

اس کے علاوہ اُسکی نظم "وہ جو مٹی میں محبت کا اثر رکھا تھا" بھی نہایت قابل ذکر ہے اس میں تقسیم، ہجرت، چھوڑے ہوئے گھر کی یادوں اور سرزمین پاکستان میں وارد ہونے کی پُرنشاط کیفیات کا بیان سعود کے ذاتی حالات کے ساتھ ساتھ اُسکی حب الوطنی کے جذباتی اور نظریاتی پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔

؎ جلتے دیکھے تھے وہ خودسوز محلے جن میں
جانے کب سے کوئی خوابیدہ شرر رکھا تھا
چوڑیاں ٹوٹ کے بکھری ہر اک آنگن میں
اک کنواں تھا کہ تمناؤں سے بھر رکھا تھا

اور پھر

اک حسیں چاند تھا اک سبز میں یہ روشن
اک ستارے کو بھی آغوش میں بھر رکھا تھا
چشم بینا میں وہ منظر ابھی تازہ ہے سؔعود
میرے آباء نے جب اس خاک پہ سر رکھا تھا

میں سمجھتا ہوں کہ "قوس" کے بعد "بارش" سؔعود کے ایک ORIGINAL شاعر ہونے کی دوسری معتبر گواہی ہے۔ میرے دوست پروفیسر جلیل عالی کا خیال ہے کہ اگرچہ معمولی سی اہلیت بھی عطائے ربی اور تائیدایزدی کے بغیر ممکن نہیں مگر ایک اچھے شاعر کو قدرت کی طرف سے کچھ غیر معمولی اشعار خصوصی طور پر عطا ہوتے ہیں۔ مجھے عالی کی اس بات سے صد در صد اتفاق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ "بارش" کا شاعر ایک ایسا ہی خوش نصیب شاعر ہے۔ مناسب ہوگا کہ اپنے اس مختصر تاثراتی مضمون کے اختتام پر سؔعود کے ایسے چند ایک نوادرات پیش کر کے آپ سے اجازت چاہوں۔

ے اک جسم میں رہتے ہوئے ہم دور بہت تھے
آنکھیں نہ کُھلیں مجھ پہ نہ آنکھوں پہ کُھلا میں

ے اُس اک گلاب کو جی بھر کے دیکھنا ہے مجھے
یہ کام زندگی مختصر میں کیسے ہو؟

ے وہ دن گذر گئے وہ کیفیت گذرتی نہیں
عجیب دھوپ ہے دیوار سے اُترتی نہیں

کیسا لاجواب شعر ہے

ے اُس ہجر میں اک معجزہ خو رنگِ نمو تھا
جس طرح کٹے پیڑ سے ٹہنی نکل آئے

اور اس شعر کی تو کیا ہی بات ہے!

ے زمین شرق سے سورج نکلتے دیکھتی تھی
یہی چلن تھا مگر ایک بار ایسا ہوا!

کنجری کا پُل ...... مخصوصوں کی عکاسی پر مبنی ناول

ڈاکٹر ممتاز احمد خان

عجیب بات ہے کہ 1899 میں جب کہ مرزا ہادی رسوا کا ناول ''امراؤ جان ادا'' آیا تھا اس وقت سے لے کر اب تک ایک سو تیرہ سال میں دنیا کے قدیم ترین پیشے عصمت فروشی سے متعلق عورت کو موضوع کے اعتبار سے دوام حاصل ہے۔ ناول میں یہ ٹھکرائی ہوئی عورت اپنی مختلف نفسیاتی جہات کے ساتھ پڑھنے والوں کو متاثر کرتی رہی ہے۔ اس کی پژمردہ اور اداس زندگی ان سے زبردست ہمدردی حاصل کر رہی ہے۔ بادی النظر میں عیش و عشرت میں مبتلا یہ عورت خوش نظر آتی ہے لیکن اس کے اندر کی عورت کی روح پر مرتسم زخم اسے جہنم کی دنیا کی شہری ہونے کا حقیقی تاثر عطا کرتے ہیں۔ اس کی زندگی کا ہولناک پہلو اس کے ماں باپ سے جدا کر کے اس کو گناہ کی دلدل میں دھکیل دینے کا المیہ ہے جہاں سے واپسی ناممکن ہے۔ خودکشی کی موت یا سسکتے ہوئے مرجانا۔ یہ اس کا انجام ہے۔ ہاں اگر قسمت مہربان ہو تو کسی مرد سے وابستہ ہو کر بقیہ زندگی اپنے بچوں کے درمیان گزارنے کی راحت سے سرفراز ہو جاتی ہے بشرطیکہ بچے اور رشتے دار سب کی زندگی اجیرن نہ کر دیں۔ قرۃ العین حیدر نے بھی اپنے ناول ''گردش رنگ چمن'' میں اس موضوع کو برتا ہے مگر عندلیب کی صاحبزادی عنبرین بیگ جو سولی پر لٹکی ہے اس کو کچوکے لگانے کا سبب بنتی ہے۔ عندلیب کا سلسلہ نسب بھی عصمت فروشی سے تعلق رکھتا ہے حالاں کہ ان کی ماں نواب بیگم آخری زمانے میں مذہبی ہوگئی تھیں مگر عندلیب ردِّ عمل میں مذہب سے دور ہو چکی تھیں۔ عندلیب کی پہلی شادی پینٹنگ (مصوری) کے استاد ماسٹر شکور حسین سے ہوئی تھی مگر طلاق ہوئی۔ پھر انہیں خان بہادر امبا پرشاد نے اپنے یہاں ایک ہزار روپے ماہانہ پر رکھ لیا تھا۔ وہ ڈانسر کی حیثیت سے معروف ہوا کرتی تھیں۔ ان کی لڑکی عنبرین بیگ جو اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی اپنے اس تشخص کے دکھ میں مبتلا تھی: اس کے متعلق بتایا گیا ہے:

''اسے یہ بھی دکھ ہے کہ اس کا سلسلہ نسب طوائفوں کے ادارے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک اعلیٰ نسبی کا نہ ہونا زندگی میں سب سے بڑی محرومی کا درجہ رکھتی ہے۔ ایک دن وہ بڑے دکھ سے ڈاکٹر کاشغری کو بتاتی ہے کہ ایک سے ایک نامعقول لوگوں کی ناجائز اولاد ہونا میری قسمت میں لکھا تھا۔''[1]

گو کہ ''گردش رنگ چمن'' کی عنبرین پڑھی لکھی ہے اسی لئے تشخص کے بحران میں مبتلا ہے تاہم کم پڑھی لکھی یا ناخواندہ طوائف بھی کم درجے میں اسی ذہنی بحران میں مبتلا ہو سکتی ہے۔ اگر اغوا کر کے لائی گئی ہے تب بھی گھر والوں کی یاد اسے بے چین کئے رکھتی ہے۔ ''امراؤ جان ادا'' کا یہی کیس ہے۔ وہ ایک جذباتی منظر میں اپنے گھر بھی پہنچ جاتی ہے۔ اس موقع پر اس کی ماں کی تڑپ اور نفسیاتی ہیجان قابلِ دید ہے مگر اس کا بھائی جو اپنی روایت کا اسیر ہے اسے نکال کر دم لیتا ہے کہ خاندان میں ناک کٹ جانے کی اذیت وہ برداشت نہیں کر سکتا لیکن ناول ''کنجری کا پل'' جدید دور کی امیر کبیر طوائفوں زہرہ مشتاق، فیروزہ یا فیروزے اور صبا زادی کی داستان سناتا ہے۔ یونس جاوید ناول کے شروع میں کہتے ہیں:

''مجھے ہر روز کہانی کی جستجو رہتی ہے۔ میں آج بھی کہانی کی تلاش میں یہاں تک آ گیا ہوں۔ یہ چوراہا امارات کی ریاستوں میں مزدوری کرنے والوں سے منسوب ہے۔''[2]

یہ اقتباس ان حرماں نصیب طوائفوں کے کمزور پس منظر کی عکاسی کے ضمن میں پیش کیا گیا ہے۔ زہرہ مشتاق کا شوہر مشتاق عرب امارات سے واپسی پر زہرہ کا عجیب نقشہ دیکھتا ہے۔ فوجیوں کی تربیت ہو رہی ہے، ماڈلنگ، کیٹ واکنگ Cat Walking اور بدن کی مالش۔ سب جدید مشاغل انجام پا رہے ہیں وہ قسمت کا لکھا سمجھ کر خاموش ہو رہا۔ فہمیدہ فیروزے کو ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور کا گن مین تین ہزار روپے فی کلو تلوا کر لایا تھا۔ وہ بھی زہرہ مشتاق کی مانند ماڈرن طوائف بنی۔ جام مصدق، سردار رند، زبیر چانڈیو وغیرہ اس کے عاشق تھے۔ صبا زادی کو گندل خان خرید کر لایا تھا۔ اس کا بھی یہ ہی نصیب تھا مگر حشر بہت دردناک۔ فیروزے کا بھی یہ ہی انجام ہوا۔ صرف زہرہ مشتاق ضمیر کے قیدی کی حیثیت سے معاشرے کے سامنے کھڑی رہی۔ اس کا مارا جانا ناول کے تار و پود بکھیر دیتا اور اس کے عنوان ''کنجری کا پل'' کی ماجرائی معنویت بھی غارت ہو جاتی۔ یونس جاوید با کمال ڈرامہ نگار کے ساتھ ساتھ قابلِ ذکر افسانہ نگار بھی ہیں۔ معاشرے کے تمام ناسوران کی گرفت میں رہے ہیں نیز وہ اپنے ڈرامے اور افسانے کے میڈیم میں بے نقاب کرتے رہے ہیں۔ ''اب کنجری کا پل'' میں انہوں نے ہماری دنیا کے قدیم ترین ادارے کا ایک ایسا تناظر فکشن کے آئینہ میں پیش کیا ہے جس میں ہمارے جاگیردار، وڈیرے، عوامی نمائندے، جھوٹے پیر، صنعت کار اور عام امیر کبیر لوگ اپنی شہوت کی آگ کو بجھاتے نظر آتے ہیں کہ اس کے بغیر ان کی دولت اور جنسی تمناؤں کے مقاصد پورے ہوتے نظر نہیں آتے! لیکن اصل سزا تو عورت ہی کو ملتی ہے جو یقیناً مظلوم ہے کہ اس کی حالتِ زار جب سننے کا حوصلہ ہو تو پورے ادارے کی اصلاح تو بہت دور کی بات ہے اس کی ضربوں کو انہی کو برداشت کرنا پڑے گا۔ اس کے نتیجے کے طور پر ان سب کو محض قانون و مذہب کے راستے آئی عورت ہی پر اکتفا کرنا پڑے گا۔

اب آیئے...... ان تینوں کے انجام پر غور کرنے کے بعد ان مخصوص Dilemmas سے بھی جو ہیں جنہیں اس ناول نے تخلیق کیا ہے۔

زہرہ مشتاق زندہ رہتی ہے لیکن غور طلب بات یہ ہے آیا کہ اس کو زندوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ناول کا خاتمہ اسی کے حوالے سے ہے۔ وہ اس ماڈرن طوائف کا روپ ہے جسے اپنی آخرت پیاری ہے، وہ نجات چاہتی ہے۔ اس لئے دین کا سہارا لیتی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے معافی مل جائے۔ اس کے لئے مولوی عطار تک اس کی رسائی ہو جاتی ہے۔ مولوی عطار کے توسط سے اس کی خواہش کے مطابق مسجد تعمیر کر دی جاتی ہے، اس میں مدرسہ بھی ہے جس میں دینی تعلیم کے علاوہ کمپیوٹر کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ شروع میں عطار اس مکروہ و گھناؤنے دھندے کی دولت سے مسجد کی تعمیر کی مخالفت کرتا ہے لیکن مجبور ہو جاتا ہے اور اسے دینی تعلیمات سے بہرہ مند کرتا رہتا ہے اور مسجد تیاری کے مرحلے سے گزرتی رہتی ہے۔ وہ زہرہ سے کہتا ہے:

''ویسے بھی دلیل اور فلسفیانہ مکالموں سے اس کے احکامات میں دراڑیں ڈالنا کفر ہے زہرہ بی بی۔ انسان کے ذہن میں جمی کائی اور آنکھوں کے غلاف سے اٹھتی گرد، اسے اشرف المخلوقات سے حقیر کیڑے میں بدل دیتی ہے اور زوال کا یہ سفر پاتال میں جا اترتا ہے اور تم اکیلے، تمہارے اپنے قول کے مطابق کہ تم پہلے ہی پاتال کی گہری ترین تہوں میں دبی ہو۔

''کیا وہ نیتوں کے بھید نہیں جانتا؟ سب جانتا ہے۔ وہ علیم و خبیر ہے تو پھر ہم لوگ کس کو دھوکہ دیتے ہیں دکھاوا کر کے؟ اسے نا خود کو؟ ہم نے سنا ہے کہ تم نے خود پہلی چھوٹی مسجد بنوا کر......''

واضح رہے کہ زہرہ مشتاق نے ابتدا میں چھوٹی سی ایک مسجد بنوا کر اس پر ''مسجد ظہرہ'' کا بورڈ لکھوایا تھا۔ مولوی عطار کے نزدیک یہ نمائش تھی اور اللہ کو راضی کرنے کی ایک ناکام کوشش...... زہرہ مشتاق کہتی ہے کہ اپنی عظیم الشان مسجد اور مدرسے پر وہ اپنی تختی نہیں لگوائے گی اور یہ معاملہ اس کے، ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہوگا۔ اس مسجد کا نام ''مسجد العظمت'' طے ہوتا ہے۔ اس عرصے میں جب مولوی عطار کو پتہ چلتا ہے کہ اس کا شوہر آٹھ سال سے زیادہ عرصہ غائب رہنے کے بعد لوٹ آیا ہے جب کہ نکاح فسخ ہو چکا ہے تو حلالے کے بغیر وہ مشتاق کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ اور پھر وہ اپنے آپ کو حلالے کے لئے پیش کرتا ہے جسے وہ دل کو مضبوط کر کے مسترد کر دیتی ہے اور یہ دلیل پیش کرتی ہے کہ وہ اس کے مرشد اور ولی ہیں اور وہ ان کی مریدنی ہے۔ مولوی عطار کو یہ سن کر سخت دھچکا لگتا ہے۔ اس کے بعد مسجد و مدرسے کا افتتاح ہوتا ہے۔ وہ دور کھڑی یہ منظر دیکھتی ہے۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ مسجد تھوڑی دیر بعد ڈھادی جائے گی کیوں کہ لوگوں کو علم ہو چکا تھا کہ وہ ایک طوائف/کنجری کی دی ہوئی رقم سے تعمیر ہوئی ہے۔ زہرہ نے دیکھا کہ ایک ہجوم مسجد کی جانب بڑھ رہا ہے، نعرے بازی ہو رہی ہے اور ایک شخص چیختے ہوئے پوچھ رہا ہے:

''شراب سے وضو جائز ہے...... بولو بولو؟؟''

ہجوم نے پورے پھیپھڑوں کا زور لگا کر جواب دیا۔ ''نہیں...... نو...... نو......''

کیا سور کے گوشت سے روزہ افطار کیا جاسکتا ہے؟

ہجوم نے جواب میں کہا...... حرام...... حرام۔''

''صاحبو۔ حرام کی کمائی سے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟''

لوگ پکارے...... نہیں۔ نہیں۔''

پھر سوال اٹھایا گیا...... کیا جسم فروشی کی کمائی سے اللہ کا گھر تعمیر کیا جاسکتا ہے؟ ہجوم زور سے چلّایا استغفر اللہ! استغفر اللہ۔ نمبر ۵

اس کے بعد بھی مقابلہ ہوتا رہا اور مسجد کے حوالے سے اسے فتنہ، دھوکا اور عذاب کی دعوت قرار دیا گیا۔ زہرہ کے بدن میں سنسنی پھیلی اور پھر اس نے دیکھا کہ ہجوم ڈنڈوں، لاٹھیوں اور کدالوں کے ساتھ مسجد پر پل پڑے۔ اسے برباد کر دیا گیا حتیٰ کہ زہرہ کے ڈرائیور کو بھی مار دیا گیا' کار برباد کر دی گئی۔ اتفاق سے پولیس آ گئی اور سفید چادر میں لپٹی زہرہ مشتاق کو ''حفاظت'' کے قانون کے تحت بچا کر لے گئی۔

یہ معاملہ ظاہر ہے کہ ہجوم کی پُر تشدد ذہنیت سے تعلق رکھتا ہے اور اس ہجوم کے پیچھے عطار بھی ہو سکتا تھا جس نے پکارے جانے کے باوجود زہرہ کے قریب آنا گوارا نہیں کیا حلالے سے انکار نے زہرہ کے نیک عمل کو غارت کر دیا تھا۔ اسے فلمی منظر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ جب تشدد اور غارت گری کے پیچھے حد سے بڑھتی جذباتی طاقت ہو تو ہر منطق ناکام ہو جاتی ہے۔ عام طور پر تو چندے کی اپیل کے جواب میں جو رقوم آتی رہیں ان کے ذرائع کے بارے میں نہیں پوچھا جاتا لیکن چوں کہ یہاں اس کے ذریعہ سے مولوی واقف تھا اس لئے اس افسوس ناک انجام سے زہرہ کو دوچار ہونا پڑا۔

لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ایک کنجری کے تعمیر کرائے ہوئے پل کو مسمار نہیں کیا گیا اور لوگ اس سے فیض یاب ہوتے رہے۔ صالحہ ایک نیک دل کنجری تھی۔ 1939 میں اس نے لاہور میں برٹش پولیس کے ہاتھوں انہیں چھپا کر مرنے سے بچایا تھا اور باغبان پورہ میں عوام الناس کی سہولت کے لئے ایک پل بھی تعمیر کرایا تھا تا کہ وہ ایک جگہ سے دوسری

جگہ جانے کے لئے لمبی مسافت سے بچ جائیں۔ اس نے یہ سب کچھ اپنی نجات کے لئے کیا تھا وہ سمجھتی تھی کہ اس صدقہ جاریہ کے ذریعے اس کی توبہ قبول کر لی جائے گی۔ اسے یونس جاوید کی جانب سے طنز بھی سمجھ لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر ایک طرف زہرہ مشتاق کی جانب سے تعمیر کرائی گئی مسجد ڈھا دی جاتی ہے اور وہ خود بھی قتل ہونے سے بچ جاتی ہے تو دوسری جانب صالحہ کو ہجوم کی سفاکی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا اور نیکی کے جذبے سے تعمیر کردہ پل پر عوام الناس کی مسافت جاری رہتی ہے۔ یونس جاوید نے کہیں وثوق کے ساتھ نہیں بتایا کہ دونوں کی نجات ہوئی کہ نہیں؟ انہوں نے دونوں کنجریوں کے دلوں میں نیکی اور خیر کے بہتے ہوئے سمندر کی عکاسی کر دی ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ معاشرے کے ارزل ترین طبقے میں بھی انسانیت کے جراثیم ہوتے ہیں اس طبقے کو جنہیں ہم کنجری یا طوائف کے نام سے یاد کرتے ہیں قرۃ العین حیدر ''زمین کی تلچھٹ'' Scum of the earth کے عنوان تلے ''گردش رنگ چمن'' میں یاد کرتی ہے۔ اتفاق سے یونس جاوید اور قرۃ العین حیدر اس طبقے کے حوالے سے کہیں بھی اسے گلیمرائز Glamourize نہیں کرتے، صرف ان کی زندگی کے پس منظر کے معروضی بیان کے ذریعے ہمارے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ ''گردش رنگ چمن'' 1987 میں منظر عام پر آیا تھا جبکہ ''کنجری کا پل'' 2011 میں پیش ہوا۔ ان دونوں کی اشاعت کے درمیان 24 سال کا عرصہ حائل ہے۔ یونس جاوید کے ناول میں ایک خاص قسم کی ہولنا کی ہے جس کی وجہ سے یہ جدید دور کے المیہ کے طور سے سامنے آیا ہے اور یہ ہولنا کی پورے ماجرائی منظرنامے کے توسط سے محرمات سے جسمانی تعلق Incest دردناک انداز سے مارے جانے یا ضمیر کے بوجھ تلے خودکشی کی موت قبول کرنے اور زندگی میں ہی اپنے آپ کو زندہ درگور تصور کرنے کی اذیت جیسے عذابوں کا گہرا تاثر قبول کرنے سے ہے۔

ان عذابوں کے لئے ناول کے ماجرے کو مزید کھنگالنا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر صبا زادی کے انجام پر غور کیا جائے۔ یہ Incest کا معاملہ تھا۔ کاشف اسے اسلام آباد سے لاہور کے ایک ہوٹل میں لے کر آیا تھا جہاں دوران گفتگو یہ راز کھلا کہ وہ دونوں ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں اور جب اسے گاہک کاشف کے ساتھ اب تک کے گھناؤنے ترین و ناقابل برداشت تعلق کا علم ہوا تو وہ ہوش و حواس کھو بیٹھی اور ہوٹل کے کمرے سے برہنہ حالت میں بھاگ نکلی۔ کاشف جسے صبا زادی سے اپنے حقیقی خونی رشتے کا علم نہ تھا اسے کمرے میں لے جانے کی کوشش کرتا ہے، خود ہوٹل کا اسٹاف بھی اسے اندر لے جانا چاہتا ہے لیکن وہ اوپر بھاگ کر جاتی ہے اور نویں منزل سے کود کر جان دے دیتی ہے کیوں کہ اسی طرح وہ پہاڑ جتنے بھاری گناہ کے بوجھ سے نجات حاصل کر سکتی تھی۔ دوسری طرف فیروزے بھی بدترین انجام سے دوچار ہوئی۔ اس کے گاہکوں میں جاگیردار اور وڈیرے شامل تھے۔ یہاں ایک نیا رخ سامنے آتا ہے یعنی مخالف کو فیروزے کے ذریعے طبی بنیاد پر ختم کرانا۔ جام مصدق ایک شاطر گاہک ہے۔ اس نے کئی حریف ختم کرائے آخیر میں سردار رند کو اس نے ختم کرایا۔ طریقہ واردات یہ تھا کہ شراب میں فیروزے مخصوص دوا ملا دیتی تھی جس کی افادیت اور تاثیر پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کے مضر اثرات بالکل واضح تھے...... فیروزے کی یہ بدقسمتی تھی کہ وہ مسلمان گوہر جیسے مرد پر عاشق تھی جو سیکس کا سمبل تھا مگر راستہ پُرخطر تھا۔ جام مصدق اس کا حریف تھا۔ وہ اسے بھی اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا ہے۔ یہاں فیروزے نے اپنی محبت سے مجبور ہو کر مزاحمت کی، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن اس کی لاش بوری میں ملی اور خود فیروزے کی لاش فلیٹ میں کئی دن بعد ملی جس میں کیڑے چل رہے تھے...... یونس جاوید نے اپنے اس معاشرے کی نمائندگی کی ہے جہاں یہ شب و روز ہو رہا ہے اور اس کا اجتماعی ضمیر یوں محسوس ہوتا ہے کہ محوِ خواب ہے۔ صبا زادی اور فیروزے کی دردناک خاتمے سے

قاری میں یقیناً خوف و دہشت کے جذبات پیدا ہوتے ہوں گے اور شاید یہ ہی یونس جاوید کا تحریری مقصد ہوگا۔

یہ ناول محض دو سو آٹھ صفحات پر مشتمل ہے لیکن واقعات کی سرعت رفتاری کا کمال یہ ہے کہ زہرہ مشتاق، صبا زادی اور فیروزے کی زندگیوں کے خوشی، غم اور المناک انجام کے تینوں انفرادی منظر نامے اپنے مکمل تاثر کے ساتھ ہمارے سامنے مصوّر شکل میں رقصاں نظر آتے ہیں۔ یقیناً سب کچھ مصنف کے اچھے اسلوب کی کیفیت ہے۔

اکثر یہ ہوتا ہے کہ کوئی ایک چبھتا ہوا سوال ناول کی قرات کے بعد قاری کا پیچھا کرتا ہے بلکہ ایک عرصے تک پیچھا کرتا رہتا ہے اور وہ بھاگتے زمانے کے ساتھ نئے نئے پہلوؤں سے اس پر غور و فکر کرتا ہے اور یوں ایک دوست کی مانند وہ خلوت اور جلوت میں اس کے ساتھ محوِ سفر رہتا ہے، کچوکے بھی لگاتا ہے اور کسی نئی حقیقت یا سچائی سے بھی آگاہ کرتا ہے۔ ہمارے کئی ناول مثلاً ابن الوقت، امراؤ جان ادا، گریز، ایسی بلندی ایسی پستی، آگ کا دریا، شام اودھ، آنگن، اداس نسلیں، علی پور کا ایلی، فائر ایریا، غلام باغ، دائرہ، کاغذی گھاٹ، دیوار کے پیچھے، خوشیوں کا باغ، راکھ، خس و خاشاک زمانے، قلعہ جنگی، آگے سمندر ہے، چانگلوس، خون جگر ہونے تک، نادید ''گردش رنگ چمن'' کئی چاند تھے سرِ آسمان، راستہ بند ہے وغیرہ۔ الیاس احمد گدّی کے ناول ''فائر ایریا'' میں ''کنجری کا پل'' سے ایک رابطہ اس لحاظ سے پیدا ہوتا ہے کہ کوئلے کی کان میں کام کرنے والی مجبور و بے کس عورتوں کو کان کنی کی کمپنی کا عملہ اور چند نام نہاد مزدور لیڈر خوب خوب کنجری کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ ''گردش رنگ چمن'' میں قرۃ العین حیدر نے نواب بیگم (جسے طوائف بننے پر مجبور ہونا پڑا) کو عنبرین بیگ تک توسیع دی ہے۔ نواب بیگم کو امبا پرشاد کی اگر داشتہ یا رکھیل بننا پڑا تو یہ کلچر کا حصہ تھا۔ راقم الحروف نے اپنے ایک مضمون میں مندرجہ ذیل تبصرہ کیا تھا:

''قرۃ العین حیدر نے گردش رنگ چمن میں اس تلچھٹ کے کئی رنگ دکھا کر عالمانہ سطح پر فکشن میں طنز کی وہ لکیر کھینچی ہے جس کے آر پار کھڑے قارئین اور نقادوں کو ذہنی جھٹکے لگنا ضروری ہیں اور پھر یہ ناول عمرانی اور سماجیاتی تاریخ کے اسکالرز کے لئے عورت کے مقدرات کے حوالے سے مزید تحقیق کے دروازے کھولنے پر بھی مجبور کرتا ہے اس لئے بات انسان کے اختیار تک پہنچتی ہے کہ کیا وہ اپنا مقدر بنانے پر قادر ہے کہ نہیں؟ اور یہ کہ اسے لازمی طور پر زندگی کے تیز و تند دریا میں بپھرتی موجوں کے ساتھ نامعلوم منزلوں تک پہنچنا ضروری ہے خواہ حسب و نسب مٹ جائے اور ذلت کے ٹوکرے کو سر پر تاج کی مانند سجانا ضروری ہو جائے۔ رنگ چمن کی گردش اسی کو کہتے ہیں۔''

لیکن یونس جاوید جیسا کہ ان کے ناول کے ماجرے کا تعلق ہے جدید دور میں طوائف یا کنجری کے مقدّرات کے حوالے سے بہت آگے چلے گئے ہیں۔ عمرانی اور سماجی ماہرین کے لئے تحقیق کا یہ موضوع ان مخمصوں پر روشنی ڈال کر انسانی تاریخ کے قدیم ترین طبقے کے لئے ایسے حل Solution کی جانب راغب کرتا ہے جو سب کے لئے قابلِ قبول ہو خواہ اس کے لئے ایک ہمہ گیر انقلاب برپا کرنا پڑے جو انقلاب فرانس، انقلاب رُوس یا انقلاب ایران کے مماثل ہو۔ کیا ایسا ممکن ہے؟ مغرب نے تو کنجروں کو سیکس ورکر Sex Worker کی حیثیت سے سرٹیفکیٹ یا لائسنس دے کر مسئلے کا خاتمہ ہی کر دیا ہے! چلیے کنجری کے معاشی و حیاتیاتی تسکین کا سامان ہو گیا، اوباش و عیاش مرد بھی خوش ہو گئے کہ ان کے پاس دل بہلانے کے لئے کئی سماجی و خانگی دلائل ہیں۔ ہمارے اودھ اور دیگر علاقوں میں نوابوں اور مالی وسائل کے حامل حضرات گانے والیوں سے لے کر نامی گرامی طوائفوں سے جو فیض اٹھاتے تھے اس پر یہاں روشنی ڈالنا تضیع اوقات ہوگا۔ کیوں نا ان مخمصوں پر غور کریں جو اپنے ناول میں یونس جاوید نے ابھار دیئے ہیں۔

پہلا مخمصہ یہ ہے کہ ہمارے سماج کے مخصوص طبقات زہرہ مشتاق، فیروزے اور صبا زادی کے بغیر نہیں رہ سکتے گو کہ کنواروں کو چھوڑ کر بیوی بچے والے بھی گناہ کے اس جوہڑ میں برضا ورغبت کود جاتے ہیں۔ اور کبھی اخبارات اور رسائل والے انگڑائی لے کر دو چار کہانیاں شائع کر دیں تو دروغ برگردن راوی پولیس والے بھی اپنی کارکردگی کی آڑ میں بہتی گنگا میں ہاتھ دھو کر خوش ہوتے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ ریاست ظاہر ہے کہ اپنی زیادہ ضروری سیاسی ذمہ داریوں کی وجہ سے خاموش رہتی ہے اور اس کے کارندے بشمول قانون ساز اس معاملے میں دلچسپی نہیں لیتے۔ خود ہماری مذہبی جماعتیں جن کی اسمبلیوں میں نمائندگی بھی ہے اس مکروہ وغلیظ مسئلے پر لاتعلقی کا شکار ہیں جب کہ دیگر فروعی معاملات پر ان کی سرگرمیاں دن رات منظر عام پر آتی رہتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سرطان زدہ مسئلے کو آناً فاناً ختم کرنا ناممکن ہے لیکن اس کے لئے سب مل کر ایک ورکنگ پیپر Working Paper تو تیار کر سکتے ہیں اور پارلیمنٹ ایسی قانون سازی کر سکتی ہے کہ مسئلے کا سدّ باب ہو جائے۔ خود کنجری کا پل، ایسے ورکنگ پیپر کی بنیاد بن سکتا ہے اس ناول کو ہم علامتی طور پر ایک ایسے "توجہ دلاؤ نوٹس Notice" سے تعبیر کر سکتے ہیں جس کی گونج نقادوں کے توسط سے عام قاری اور ان کے توسط سے ریاست کے ایوانوں میں سنائی دے سکتی ہے۔ انگلستان میں کئی ناول اصلاحات کا محرک بنے ہیں۔ چارلس ڈکنس کے ناولوں سے معاشرے میں اس احساس نے جنم لیا تھا کہ بچوں پر ظلم نہیں ہونا چاہیے، لوگ ان سے منصفانہ سلوک کریں، فیکٹریوں میں کام کے اوقاتِ کار کم کئے جائیں اور سہولیات اور اجرتوں میں اضافہ ہو۔ یہ سلسلہ اتنا آگے بڑھا کہ تعلیمی اداروں اور کتب خانوں کا جال پھیلنے لگا، عورتوں کے حقوق کا تحفظ بھی ہوا۔ گویا ناول جو سماج کا آئینہ ہے سماج میں موجود گھناؤنے رویوں کا سدباب کر سکتا ہے بشرطیکہ حکمرانوں سے لے کر عام حساس آدمی دانشوروں کی بات کو سنجیدگی سے لے رہا ہو۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ اچھا ناول نگار دانشور ہی ہوتا ہے، معاشرہ اگر اس کے خیالات پر کان نہ دھرے تو اس کا اپنا ہی نقصان ہے کہ کیوں کہ زیادہ مصائب مظلوم طبقات ہی کو بھگتنا پڑتے ہیں۔

اگر مخمصوں کے سلسلے کو آگے بڑھائیں تو ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ شادی شدہ لوگ بھی اس گناہ میں برابر کے شریک ہیں وہ عجیب منطق پیش کرتے ہیں کہ اپنی بیگمات سے ان کے تعلقات کشیدہ ہیں، لڑائی جھگڑے رہتے ہیں، وہ اغماض برتتی ہیں، تعاون نہیں کرتیں، یہ مسئلہ ایک سے زیادہ شادیوں تک جاتا ہے جس کی پہلی بیوی مخالفت کرتی ہے اگر چھپ کر ایسا ہو جائے تو راز کھلنے پر پہلی کی اولادیں سخت ردِّ عمل دکھاتی ہیں کیوں کہ جائداد کی تقسیم کے معاملات جھگڑوں کو جنم دیتے ہیں مگر جاگیردار، وڈیرے، پیر و فقیر، متمول عرب مزے میں رہتے ہیں۔ مغرب میں ایک کے بعد ایک بیوی سے علاحدگی ہوتی ہے اور دوسری آسانی سے مل جاتی ہیں۔ ان کے یہاں کنجریوں کے پاس سیکس ورکر کی حیثیت سے لائسنس ہیں لہٰذا ان کا روزگار قانونی دائرے میں قائم و دائم رہتا ہے۔ ویسے بھی یہ مغرب کا کلچر ہے جہاں مذہب ان پر روک ٹوک نہیں لگاتا اور چرچ قانون سازی کے معاملے میں کمزور ہے، آواز اٹھاتا بھی ہے تو غیر موثر۔ مثال کے طور پر اسقاطِ حمل Abortion اور شادی کے بغیر سالہا سال تک ساتھ رہنا یعنی Co-Habitation جو اخلاقی اور مذہبی طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کے بھی خلاف ہے۔ مگر ہم دوسروں پر کیا انگشت نمائی کریں ہمارے یہاں تو قرآن اور حدیث میں عورت کی عزت اور تکریم کے بارے میں بہت کچھ پڑھنے کو ملتا ہے۔ ایک جگہ آنحضرت محمدؐ نے فرمایا: "عورتوں کے حقوق کے سلسلے میں اللہ سے ڈرو۔ اس بارے میں تم سے سوال کیا جائے گا۔" اسلام میں عورتوں کے حقوق کا باب وسیع وعریض ہے لیکن جو موضوع زیر بحث ہے اس کے حوالے سے عورتوں کو اس جہنم میں پہنچا دینے والوں کا کیا حشر ہوگا؟ یہ حدیث اس لئے یہاں

پیش کی گئی ہے کہ جس ملک میں ہم اور یونس جاوید رہتے ہیں وہاں دین کا بہت چرچا ہے اور اُن جیسا ناول نگار اپنی سفاک سماجی حقیقت نگاری کے توسط سے اس سلگتے موضوع پر روشنی ڈال کر یقیناً سرخرو ہو گیا۔

اس ناول میں نفسیاتی طور پر دہشت انگیز اور خوفناک ترین پہلو جس کا ابتدا میں تذکرہ کیا جا چکا ہے محرمات سے جسمانی تعلق Incest سے ہے، جس کے باعث صاحبزادی نے علم ہوتے ہی جنونی حالت میں ہوٹل کی نویں منزل سے کود کر جان دے دی اور اس کے بچھڑے ہوئے سگے بھائی کو پتہ بھی نہ چل سکا کہ جس کھلونے کو وہ اسلام آباد سے لایا تھا وہ اس کی سگی بہن تھی۔ دوسرا واقعہ زہرہ مشتاق سے تعلق رکھتا ہے لیکن وہ خودکشی بھی نہ کر سکی محض مسجد ''العظمت'' بنوا کر اس کے انہدام کا منظر دیکھ کر اپنی نظروں میں مزید ذلیل ہوئی۔ دراصل دیوان عاشق حسین سے زہرہ مشتاق کے دو بچے ہوئے تھے۔ لڑکے کو وہ بہت پہلے لے گیا تھا اور لڑکی جس کا نام مہرالنسا رکھا گیا بعد میں پیدا ہوئی جب وہ ایک عرصے بعد پھر سے نمودار ہوا تو نوخیز مہرالنسا کو دیکھ کر دنگ رہ گیا اور اسے اپنے پاس داشتہ کی حیثیت سے رکھنے کا مطالبہ کیا۔ زہرہ جسے علم تھا کہ مہرالنسا کی رگوں میں اس کے سابقہ گاہک دیوان عاشق حسین ہی کا خون گردش کر رہا ہے اس مطالبے پر یوں محسوس کرتی ہے گویا اس پر ایٹم بم گرا دیا گیا ہو۔ کنجری کتنی ہی ذلیل یا کمینی ہو، جان پر کھیل جائے گی مگر اس گھناؤنے ترین منصوبے کا حصہ نہیں بنے گی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے سابقہ بدمعاش، زور آور و کمینے عاشق کے ظلم، سفاکی اور دہشت گردی کا شکار ہو، مہرالنسا کو تعلیم کے لئے اپنی ایک سہیلی کی مدد سے اس نے برطانیہ بھجوا دیا لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ وہاں دیدار حسین جو عاشق حسین کا لڑکا اور مہرالنسا کا خون کے اعتبار سے بھائی تھا اس پر ریجھ گیا۔ مہرالنسا نے زہرہ مشتاق سے رابطہ کیا، اس نے اسے شدت سے منع کیا کہ وہ اس سے شادی نہ کرے۔ لیکن برطانیہ کا آزاد ماحول، لڑکے اور لڑکی خودسری کے پیکر۔ نتیجہ یہ کہ Incest سے معمور یہ رشتہ ہو کر رہا۔ زہرہ گناہ کی دلدل میں تو پھنسی ہوئی ہی تھی، ضمیر کے جہنم کی آگ میں اس کے وجود کو جھلسانے لگی۔ مولوی عطار سے رابطے، مسجد اور مدرسے کی تعمیر میں گہری دلچسپی اور ذہنی بوجھ میں کمی مسجد اور دلی تسکین کے لئے ان کے دینی، مذہبی اور اصلاحی خیالات سے باقاعدگی سے استفادے کی ماجرائی داستان نے ایسے ہی واقعات سے جنم لیا تھا! تو کیا زہرہ شکست سے دوچار ہو گئی؟ اس کی جانب سے تعمیر کرایا گیا مدرسہ اور مسجد مسمار کر دیے گئے، مولوی عطار کی اس سے حلالے سے انکار کی بنا پر ناراضی اور رابطے کے خاتمے اور بخشش بعد از موت کی اُمید کے ابہام کا شکار ہو جانے پر اس کی حالتِ زار ایک بڑے مخمصے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ گناہ گار انسان کی پناہ مذہب ہے اور عذاب قبر سے بچ نکلنے کے لئے وہ کئی سمتوں میں چل پڑتا ہے اور صدقہ جاریہ اس کے لئے سکون کی نوید ہے۔ اگر زہرہ کنجری کا پیشہ ترک کرے تو اس سے کون نکاح کر کے آسودہ کرے گا؟ کیا معاشرہ اسے قبول کر لے گا یا اتنا تنگ کرے گا کہ وہ سابقہ پیشے کی طرف لوٹ جائے گی؟ ہوسکتا ہے اِکا دُکا سر پھرے ایسا کر گزریں مگر سب کنجریوں کی سماجی وخانگی بحالی (Settlement) کس طرح ممکن بنائی جائے گی؟ حال ہی میں نیشنل جیوگرافک چینل نے امریکی کنجریوں پر ایک پروگرام پیش کیا جس میں ایک تجربہ کار کنجری نے روتے ہوئے بتایا کہ گاہک کی تلاش میں اسے اور دوسری کنجریوں کو ذلت اور اذیت کے تجربے سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس نے واشگاف الفاظ میں یہ کہا کہ اس ذلت انگیز پیشے سے Incest سے بچنا بہت مشکل ہے۔ اس طرح گویا اس نے اپنے اور پوری دنیا کی کنجریوں کے دل پر لگے ہوئے زخموں کو آشکار کر دیا۔ ایک زمانے میں بیروت کی کنجریوں کا بڑا شہرہ تھا اب لوگ تھائی لینڈ، فلپائن اور نہ نا معلوم کہاں کہاں کا رُخ کرتے ہیں۔ ٹورزم سے آمدنی میں کنجریوں کے کردار سے سب واقف ہیں۔ سیاحوں کا کنجریوں سے رابطہ کرانے میں Pimps (دلالوں) کا

گھناؤنا کردار درندگی سے کم نہیں۔ نیشنل جیوگرافک چینل ہی نے ایک بار نیپالی غریب کم عمر لڑکیوں کو کنجری بنانے کے لیے انڈیا میں انسانی ٹریفک کا خاصا چرچا کیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک خاص عمر کے بعد ان کی زندگی دوزخ بن جاتی ہے۔ یہ پوری دنیا میں ہوتا ہے۔ مرد جاتی اور ریاست دونوں اس مذموم کاروبار کے ذمہ دار ہیں جنہیں کھلی چھٹی ملی ہوئی ہے کہ اسے فروغ دیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس کا تدارک ناممکنات میں سے ہے اور متذکرہ مخمصے Dilemmas ماؤنٹ ایورسٹ سے بلند اور سمندروں سے زیادہ گہرے ہیں؟ یعنی عورت جسے قدرت کی حسین اور کومل مخلوق کہا جاتا رہا ہے ذلّت اور اذیت کے اس اتھاہ غار سے نکل پائے گی؟ یہ ایک حقیقی مخمصہ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ناول میں چند ادیبوں کی آراء بھی ان مخمصوں کی جانب اشارہ کرتی ہیں لیکن ڈاکٹر سلیم اختر نے پیش لفظ میں بہت سے اہم نفسیاتی و جنسی پہلو از سر نو دریافت کئے ہیں۔ خاص طور پر وہ کنجریوں کی حرماں نصیبی کو اپنے خیالات کے دائرے میں لائے ہیں اور بہت گہرائی میں جانے کے بعد انہوں نے اس کا نچوڑ خوب پیش کیا ہے۔ جس سے کسی کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا:

''اداس کر دینے والا یہ ناول لکھ کر یونس جاوید نے ہمیں احساس کرانے کی کوشش کی ہے کہ ہمارا معاشرہ جنگل میں تبدیل ہو چکا ہے۔ حسن کے شکاری مرد اور شکار بننے والی ''وہ عورتیں'' جنہیں ہر ممکن طریقے سے سنگسار کر لیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے اداس کر دینے والا ناول کہا ہے لیکن محسوس ہوتا ہے کہ یہ اس سے بھی بڑھ کر اندوہ ناکی اور نسوانی المیہ کا احساس دلاتا ہے، خاص کر جب کہ زہرہ اپنی جانب سے اپنی اصلاح کی صدقِ صد کوشش کرتے رہنے کے باوجود اپنے آپ کو جہنمی محسوس کرے! یعنی اس کے اور اس جیسی دوسری ٹھکرائی ہوئی عورتوں کے لئے کیا تمام راستے بند ہیں؟ جی نہیں۔ زہرہ خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہے۔

آخیر میں دکھایا گیا ہے کہ وہ ہر نوچندی جمعرات کو مسمار شدہ مسجد کے دروازے کی نچلی سیڑھی پر موم بتیاں جلاتی رہتی ہے اور خود کو بحال کرنے کی کوشش میں آنکھیں بند کر کے اپنے رب سے ہولے ہولے سرگوشیوں میں کچھ کہتی ہے...... جو شاید اس کا دل ہی سن سکتا ہے۔ ہر نوچندی جمعرات اس کے لئے خود کو ''بحال'' کرنے کی شام ہوتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ خالق کائنات اس کی شہ رگ سے قریب ہے اور وہ پکارنے والے کی سنتا ہے۔ (بے شک) وہ سربسجود جھکی رہتی ہے، محض ایک گنہگار اور قابل سنگسار۔[8]

یہ ناول کے چند آخری الفاظ ہیں۔ اس کے بعد کی صورتِ حال قاری اور اس کے دل پر زوردار دھچکا لگنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ہماری زندگی میں بھی فنتاسی Fantasy کا دخل ہوتا ہے۔ ناول نگار حقیقت کو اس میں گوندھ کر زیادہ بڑی حقیقت Reality کا احساس دلاتا ہے۔ زندگی میں انسانی اعمال کی مضحکہ خیزی کی سرحد فنتاسی سے جا ملتی ہے۔ دکھایا گیا ہے کہ 1939 میں موجود انسانیت پرست کنجری صالحہ کی جانب سے تعمیر کرائے گئے پل پر آمد و رفت جاری ہے۔ اب 2022 ہے یعنی آج سے دس سال بعد کا یہ منظر نامہ ہے۔ اس دو سو تین صفحات پر مشتمل مختصر ناول میں واقعات کی برق رفتاری میں قابلِ ذکر ہے جس میں دنیا کے قدیم ترین گھناؤنے پیشے کے حوالے سے انسان کی قابلِ مذمت بے حسی، شقاوتِ قلبی ظلم، درندگی، اسے جاری و ساری رکھنے کے جدید ترین ثقافتی حیلے و بہانے، ایڈز Aids اور دوسری بیماریوں سے اغماض کے علاوہ کنجری ذات کے باطن میں اٹھنے والے نفسیاتی طوفانوں کا ہمیں عکس نظر آتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس میں جا بجا سماج پر طنز کی جو بوچھاڑ کی گئی ہے اس نے اس تحریر کو اس خاص موضوع کے ضمن میں نہ بھلائی جانے والی دستاویز بنا دیا ہے۔ دستاویز اس اعتبار سے کہ یہ تحقیقی کام نظر آتا ہے جس کے پیچھے مشاہدہ، معاشروں کی پرانی تاریخ، ایسی حرماں

نصیب عورتوں کے مقدرات، کنجری کی حیثیت سے اپنے گاہکوں کو رجھانے کے زبردست آ سن جن کی تفصیل میں جانے سے قلم عاجز ہے اور ان کے مختلف پُر الم انجام جن میں ان کے لرزہ خیز قتل وغیرہ شامل ہیں ان سب کو ایک دوسرے سے جوڑ کر دیکھنے سے ان سب کی جنم کنڈلی کا احساس واگزار ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ لڑکی میں قدرت نے حیا اور شرم کا جذبہ رکھا ہے جسے ماحول تباہ کر دیتا ہے اور جب اسے کنجری بنایا جاتا ہے تب ابتدا میں یہ زندگی اس کے لئے یقیناً ایک ڈراؤنا خواب ہوتی ہے پھر وہ اس کی عادی ہو جاتی ہے لیکن اس کے اندر اس غیر اخلاقی زندگی سے باہر نکل جانے کی خواہش ضرور بیدار ہوتی ہے کیوں کہ اسے دھونس، زبردستی، اغوا، دباؤ، زیادتی کے ذریعہ اس جہنم میں دھکیلا جاتا ہے جس کے لئے مرد جاتی ہی کو ذمہ دار قرار دیا جائے گا۔ اگر وہ اپنی اصلاح اور نجات کی راہ پر چل پڑے تو اس کے آگے رکاوٹیں کھڑی کرنا بھی گناہ ہی ہوگا اور اگر کوئی سمجھتا ہے کہ اسے سیکس ورکر کی حیثیت سے تسلیم کرلیا جائے جس کے لئے اس کے پرس میں اجازت نامہ Lkense ہو تب یہ اس سے بھی بڑا گناہ ہی ہوگا کیوں کہ یہ پھر امٹ رجحان یا کلچر میں تبدیل ہو جائے گا۔ بہر صورت اس ناول نے بحث کے بہت سے دروازے کھول دیئے ہیں۔

حواشی وحوالا جات

1۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان۔ مضمون۔ گردش رنگ چمن۔ جدید فسانہ عجائب۔ مشمولہ۔ ''اُردو ناول کے چند اہم زاویے۔'' انجمن ترقی اردو کراچی 2002، صفحہ 84

2۔ مصنف: یونس جاوید۔ ناول: کنجری کا پل۔ ناشر جمہوری پبلکیشنز، 2۔ ایوان تجارت روڈ۔ لاہور جولائی 2011، صفحہ 21

3۔ ایضاً...... صفحہ 70

4۔ ایضاً...... صفحہ 73

5۔ ایضاً...... صفحہ 185

6۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان۔ مضمون: ''گردش رنگِ چمن۔ جدید فسانہ عجائب'' مشمولہ۔ ''اردو ناول کے چند اہم زاویے۔'' انجمن ترقی اردو کراچی۔ صفحہ 82

7۔ ڈاکٹر سلیم اختر پیش لفظ۔ مشمولہ کنجری کا پل۔ صفحہ 16

8۔ کنجری کا پل۔ صفحہ 203

ظفر اقبال کا شعری بیانیہ اور غالب

الیاس بابر اعوان

اردو شعری منظر نامہ اپنی روایتی جمالیات اور لسانی جبر تلے ایک مدت سانس لیتا رہا۔ بلاشبہ روایت کا فقیرانہ تتبع محض اسٹیس کو ہی سمجھا جائے گا۔ ممکن ہے آج سے سو دو سال بعد کوئی غیر متعصبانہ تجزیہ یہ طے کر پائے کہ اردو غزل کے منظر نامے پر دو شاعر حاوی رہے ایک غالب دوسرے ظفر اقبال۔ غالب سے متعلق، غالب، شمس الرحمن فاروقی اور ظفر اقبال کی ایک مثلث بنتی ہے۔ اس مثلث میں ایک بات تو طے ہے کہ فاروقی جیسے بڑے نقاد کا تنقیدی اور شعری پینڈولم غالب اور ظفر اقبال کے درمیان ہی گھومتا دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے ہاں اردو تنقیدی روایت میں Comparative analysis میں دو تخلیق کاروں کے ہاں تخلیقی انضمام تلاش کیا جاتا ہے۔ یہ ایک نہایت بُودا طریقہ کار ہے۔ سماجی علوم میں کوئی بھی بیانیہ حتمی تصور کیا جانا اپنے معنوی اعتبار سے انفرادی یا اجتماعی جبر ہے، اور جبر کا اختراعی متن از خود اپنے معنی متعین کرتا ہے یعنی اسی لفظ میں اس کا دوسرا معنی موجود ہے یعنی خوف۔ سماجی اکائیاں کسی بیانیے، شخصیت اور تخلیق کو مہابیانیے کا درجہ اُس وقت دیتے ہیں جب ان کے ہاں خوف کا عنصر نمو پذیر ہوتا ہے۔ (یاد رہے اس بحث کا تعلق آفاقی آدرش سے نہ جوڑا جائے، میں من وعن اُسے صدقِ دل سے تسلیم کرتا ہوں) یہی صورتِ حال غالب اور اقبال کے ساتھ بھی رہی۔ ان دونوں شعرا کا شعری قد و کاٹھ ایک طرح سے Political constructs ہیں۔ اس عمل کی ایک تفہیم یہ بھی ہے کہ اس سے کسی بھی تخلیقی جوہر کی ممکنہ تفہیم اور معنویت کو پابند کیا جاتا ہے۔ کوئی بھی تخلیقی متن بقول بارتھ The message of the Author-God) نہیں ہوتا۔ بارتھ اپنے مضمون "The death of the Author" میں لکھتا ہے:

"Writing ceaselessly posits meaning, ceaselessly to evaporate it, carrying out a systematic exemption of meaning. "

Barthes, The death of Author, p147

ساختیاتی مباحث اور لسانی تشکیلات کی ذیلی روایتی جگہ تاہم معنوی سطح پر متن کا آفاقی آدرش سے انسلاک ایک لحاظ سے غیر تنقیدی رویہ ہے۔ اور ہمارے ہاں بدقسمتی سے کسی ادبی تخلیق پر تنقیدی نظر کرنا تو درکنار اس سے اختلاف کی گنجائش نکالنا بھی ادبی گستاخی تسلیم کی جاتی ہے۔ ظفر اقبال کے شعری قد کاٹھ کا تعلق غالب سے جوڑنا ایک طرح سے ظفر اقبال کے اپنے شعری قد کو کم کرنا ہے، حالانکہ ظفر اقبال خود اپنے ایک انٹرویو جو انہوں نے ادبی دنیا بلاگ کو دیا تھا غالب کے بارے درج ذیل اظہار فرما چکے ہیں:

۲۔ "فاروقی میرے لیے سند کی حیثیت نہیں رکھتے، اور اُن کے کہنے سے میں غالب سے بڑا شاعر نہیں بن سکتا۔ میں تو اپنے آپ کو غالب کی خاکِ پا کے برابر بھی نہیں سمجھتا جس کی انگلی پکڑ کر میں نے قدم قدم چلنا شروع کیا"

حوالہ:

http://www.adbiduniya.com/2015/02/zafar-iqbal-10-questions.html: دو فروری

یہاں ایک بات واضح ہوجاتی ہے کہ وہ خود کو غالب سے بڑا شاعر نہیں سمجھتے ،لیکن ایک بات جو اس بیانیے کے اندر ہی موجود ہے کہ اُس کے مقابلے کے شاعر ضرور ہیں ۔ یہ بات وقت اور نقاد نے طے کرنے کی کوشش کرنی ہے نہ کہ تخلیق کار نے خود جیسا کہ انکساری سے ظفر اقبال نے خود کو غالب سے بڑا شاعر ہونے سے معذوری ظاہر کی ۔لیکن فاروقی، ظفر اور غالب کی تخلیقی اور تنقیدی مثلث میں غالب کے ساتھ ظفر اقبال کا نام ہی کیوں؟ ناصر کاظمی ،عرفان صدیقی ،شکیب ،احمد مشتاق یا فاروقی کے پسندیدہ بانی کیوں نہیں؟ اس سوال کا جواب ادبی جدلیات کے معنی کا تعین کرے گا۔ غالب نے لسانی اور معنوی جمالیات کی ترتیب رکھی اور ایک زمانے تک اس کی شعری نوآبادیات قائم رہی تا ہم ظفر اقبال وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اردو شعری نوآبادیات سے غالب کو دیس نکالا دیا۔ یہ کام کوئی غیر شعوری نہیں تھا، نئی لسانی اور جمالیاتی ترتیب کی بنیاد رکھنے والے کا اپنا شعری وژن کیا ہے اس پر ظفر کا ایک تاثر سامنے آتا ہے، جو انہوں نے اپنے ایک مضمون بعنوان ''جون ایلیا کی شاعری'' میں بیان کیا ہے:

> ۳۔ ''شعر بنیادی طور پر سمجھنے یا مکمل طور پر سمجھنے کی چیز ہی نہیں ہوتی کہ اس سے تو صرف لطف اندوز ہُوا جا سکتا ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ آپ کی سوچ کی لہروں میں ہلکا سا تموج پیدا کر دے اور بس''
>
> حوالہ: ''بیادِ جون ایلیا'' سوونیر اشاعت بہ اہتمام انجمن سادات امروہہ کراچی سن ۲۰۰۳

http://thekhichdiblog.blogspot.com/2015/04/blog-post.html

''شعر کی بظاہر یہ سادہ سی تعریف اتنی سادہ بھی نہیں ہے۔ ولیم ورڈز ورتھ نے انیسویں صدی میں Preface to Lyrical Ballads میں شاعری بارے کہا تھا کہ

> "Poetry is the spontaneous overflow of powerful feelings; it takes its origin from emotion recollected in tranquility"

ظفر اقبال کا شعری رویہ اور شعری تفہیم اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، اور ورڈز ورتھ کی اس جامع تعریف سے مغائرت برتنا ممکن بھی نہیں دکھائی دیتا۔ اب ہم اس نکتے پر آ پہنچے ہیں جہاں ہمیں ظفر اقبالی رویے اور اس کا ان کی شعری تخلیق پر اطلاق کرنے سے الگ کچھ دیکھنا ہوگا۔ غالب بنیادی طور پر مشکل پسند شاعر تھے، اس کی ایک وجہ اس عہد کا جیو پولیٹکل منظر نامہ بھی ہو سکتا ہے اور لسانی ٹرانسفورمیشن بھی، لیکن ایک بات تو طے ہے کہ غالب کو اپنے شعری اظہار کے خلاف اتنی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا جتنا کا ظفر اقبال کو اپنے اوائلِ شعری ہی سے کرنا پڑا۔ غالب زبان ساز تھے تو ظفر اقبال نے نہ صرف اردو شعری روایت کو غالب کی زبان سے علاحدہ کیا بلکہ نئی لسانی جمالیات بھی اختراع کی۔ جو ایک لحاظ سے غالب سے کچھ آگے کی بات بھی کہی جا سکتی ہے۔ آج ہم ظفر اقبال کو جس یک طرفہ رویے کی وجہ سے ناپسند کرتے ہیں اس کی سب سے اعلیٰ مثال یاس یگانہ چنگیزی کی صورت میں اردو ادب پر وارد ہو چکی ہے۔ یاس یگانہ چنگیزی خود کو اپنے تئیں توپ سمجھتے تھے اور اپنے علاوہ ہندوستان میں کسی کو شاعر تسلیم نہیں کرتے تھے۔ یاد رہے کہ یاس یگانہ چنگیزی کی پیدائش ۱۸۸۴ اور وفات ۱۹۵۶ کی ہے۔ ان بہتر برس کا شعری منظر نامہ سامنے رکھا جائے تو یاس کی اپنے تئیں یہ خود ساختہ شعری تشکیل کتنی بودی دکھائی دیتی ہے، اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے، دوسری طرف بی بی سی میں انور سن رائے کو انٹرویو دیتے ہوئے ظفر اقبال نے اپنی شاعری کو منسوخ کرنے کا بھی اعلانیہ اظہار کیا ہوا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ: ۴: مرزا یاس یگانہ چنگیزی کو اپنی بدتہذیبی اور دوسری بدخصلتوں کی بنا پر آخری عمر میں گدھے پر بٹھا کر منہ کالا کر کے پھرایا گیا تھا

اور مرزا نے اپنی کتاب بھی چنگیز خان کے نام معنون کی تھی"۔

حوالہ: مرزا یاس یگانہ چنگیزی عرف غالب شکن: از ڈاکٹر ظہور احمد اعوان

http://www.urduweb.org/mehfil/threads/.31121

چنگیزی کو اردو ادبی شعری حوالے سے اتنی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا جتنا کہ ظفر اقبال کو، اس کی ایک ہی وجہ سمجھ آتی ہے کہ چنگیزی نے محض اپنی شخصی کمزوری کے تحت غالب کو تسلیم نہیں کیا جب کہ ظفر اقبال نے اپنی شعری تخلیقیت سے غالب کا اثر زائل کیا اور نئے شعری Narrative کو تشکیل کیا۔ ظفر اقبال کے ہاں ناصر کاظمی کی طرح کی محض سہل پسندی نہیں بلکہ ان کے ہاں ایک متن کا معنوی انسلاک انفرادی اور کلی شعری حسیات اور شعوری تجربے سے دکھائی دیتا ہے۔ غالب کے پیچھے بیدل، عرفی، نظیری اور میر کی روایت تھی جس کے مقابل غالب نے اپنی خود ساختہ مشکل نگاری سے اپنا ایک ہیولہ اور تاثر قائم کرنے کی کوشش کی۔ ان کے مقابل سہل پسندی ایک مشکل عمل تھا۔ عمومی طور سے کہا جاتا ہے آسان بات کو مشکل پیرائے میں بیان کرنا ایک نفسیاتی عُجب ہوتا ہے جب کہ مشکل ترین بات کو آسان پیرائے میں بیان کرنا ایک کامیابی۔ ظفر اقبال کے ہاں متن اور اس میں در آنے والے علامتیں اپنے جوہر میں کثیر المعنوی ہو جاتی ہیں، علامت گرچہ ایک سے زیادہ معنوی تفہیم کی ہی صورت ہوتی ہے تاہم اس سے بیک وقت رومانی اور پولیٹکل بیانیہ کشید کرنا ناپید ہوتا ہے ظفر کے ہاں صورت اس سے مختلف دکھائی دیتی ہے:

ہزار سایہ ہوا دار بھی گھنا بھی ہے
مگر جو بات تھی دیوار میں شجر میں نہیں

غالب کے ہاں مشکل پسندی ممکن ہے ایک ایجاز ہو تاہم ان کے ہاں شعری رعایت اور اس کا اظہار یہ اُسے اپنے عہد سے کچھ اس راسخ طور سے جوڑے رکھے گا جو بعد ازاں اپنے منطقی دائرے میں چھنتے چھنتے شاید نصف سے بھی کم رہ جائے غالب کا یہ شعر دیکھیے:

بر شگالِ گریہء عاشق بھی دیکھا چاہیے
کھِل گئی مانندِ گُل سو جا سے دیوارِ چمن

ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے:

ہوگئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرے اُس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

غالب کے ہاں Christopher Marlowe کی طرح کی Mighty Lines تو وارد ہوتی ہیں تاہم Milton کی طرح کا متنی ارتفاع تواتر سے زیادہ نہیں، اس کا مطلب یہ ہرگز نہ لیا جائے کہ غالب کے ہاں جو سہل پسندی اور میر سا شعری آہنگ ہے وہ متروک تصور کیا جائے گا؟ نہیں بلکہ غالب کے ہاں لسانی جمالیات کے ایک غیر حقیقی تصور نے بالآخر تنقید نگاروں کو مجبور کیا کہ غالب کی اگر کوئی مجموعی شعری تصویر بنتی ہے تو وہ ہے اس کی مشکل پسندی۔ غالب کی وفات ۱۶ فروری ۱۸۶۹ میں ہوئی جب کہ ظفر اقبال کی پیدائش ۱۹۳۲ میں ہوئی۔ قیاس کرتے ہیں ظفر اقبال کا شعری منظر نامہ غالب کے سو سال بعد تشکیل پایا۔ ان سو سالوں میں اپنے عہد کے تنقیدی رویوں اور ادبی ڈسکورس پر بلاواسطہ یا بالواسطہ ہر دو طرح سے غالب کی شعریات غالب رہیں، لیکن یکدم سے ایک اچھلن ایک اڑکن سماجی ادبی بیانیوں میں در

آتی ہے جسے ابتدا میں قبول ہی نہیں کیا گیا۔ رفتہ رفتہ ظفر اقبال کے نئے شعری بیانیے نے پچھلے پچاس برس میں قدیم شعری اظہار کے مقابل ایک ایسی شعری روایت قائم کر دی ہے جس نے قدیم شعری روایت کی عمارت میں نہ صرف دراڑیں ڈال دی ہیں بلکہ اپنے شعری بیانیے سے اپنے بعد کی نسلوں کو متاثر کیا۔ ظفر اقبال کا متن اپنے لسانی ڈسکورس کو خود وضع کرتا ہے، لازم نہیں کہ اس کے ہاں کوئی تعقل، منطق یا کوئی نمائندگی کی نوآبادیاتی جبلت موجود ہو۔ ظفر اقبالی متن سے متعلقہ معاصر خرابے کا تعلق دراصل مفہوم کا تعلق ہے۔ سوسیور کے نزدیک ''زبان ایک من مانا اور تفریقی نظام ہے، جس میں اجزا کی کوئی مثبت اور خود مکتفی شناخت نہیں ہوتی۔'' ۵

حوالہ: تحریر اساس تنقید، مصنف قاضی افضال حسین

ظفر اقبال کے ہاں زبان کا وہی من مانا نظام موجود ہے، گویا ان پر لسانی تشکیلات اور زبان کے بگاڑ سے متعلق اعتراضات کرنے والے دراصل زبان کے نظام سے آشنا نہیں ہیں اور ڈاکٹر تحسین فراقی نے لاتنقید میں ظفر اقبال کے حوالے سے لکھ رکھا ہے ''کہ معنی آفرینی نئی زبان کے استعمال کے بغیر ناممکن ہے، اور یہ بھی کہ بڑا شاعر وہ ہے جو زبان کو نیا آہنگ دیتا ہے نیز یہ کہ زبان آسمان سے نہیں اتری''۔ ٦

حوالہ: لاتنقید، صفحہ ۱۰

ظفر اقبال زبان کو بطور ایک مہابیانیہ تصور نہیں کرتے یعنی اس کے مروج قواعد وضوابط اور لسانی معنوی نظام کے دروبست کو شاعر کا استحقاق تصور کرتے ہیں۔ زبان کے حوالے سے ایسا برتاؤ کس سطح پر قابلِ قبول ہے، اس کا کوئی معیار متعین کیا جانا اپنی ذات میں خود ایک جبر ہے جبکہ تخلیق ایک آزاد فکری عمل ہے زبان کو اس کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہیے، سوال یہ ہے کہ زبان کے ساتھ عام معنوں میں یہ ''کھلواڑ'' کرنے والے دیگر تخلیق کار خود ظفر اقبال کیوں نہ بن سکے۔ ظفر خود کہتے ہیں؛

زباں کو سر پہ اٹھائے بھی ہم پھرے ہیں ظفر
سخن کیا ہے زباں پر سوار ہو کر بھی

گویا زبان کے حوالے سے ظفر اقبال کا بیانیہ بہت واضح ہے۔ متن کے حوالے سے نیا آہنگ ایک ہی لسانی اکائی میں موجود ''تضاد، تشکیک، عُجب، توسیع، اختلاف، یا گنجائش'' دریافت کرنا اور اختراع کرنا کہلائے گا۔ ایسے ہی شعر کو آفاقی آدرش سمجھنے والوں نے اُسے ایک فاصلے سے دیکھنے کی چیز سمجھ اور بنا لیا ہے، جب کہ ایسا نہیں ہے۔ ادب زندگی کی جمالیاتی تشکیل اور تفہیم کا نام ہے، تاہم جو زندگی اور سماج ہمارے ہاں ادب میں نظر آتا ہے وہ ایک ایسا ''آئیڈیئل'' ہے جس کا حصول ناممکن بنا دیا گیا، ہم جو زندگی بسر کر رہے ہیں وہ اپنے تمام تہذیبی لوازمات کے ساتھ من وعن ہمارے ادبی تخلیقی تجربے میں آنی چاہیے، غالب کے ہاں ایک ایسا ہی ''آئیڈیئل'' ہے جو اس کی غزل کو مہابیانیہ بنا دیتا ہے، محض پوجنے کی چیز، جب کہ ظفر اقبال کے ہاں ایسا نہیں ہے، ظفر نے نہ صرف موضوعاتی تنوع کو اپنے ہاں جگہ دی بلکہ زبان کی گرہیں کھولیں۔ اپنی شاعری بارے ان کا کہنا ہے:

''شاعری میں مزاح، شگفتگی اور پھکڑ پن بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ زندگی بہت متنوع ہے۔ اس لیے جیسی زندگی ہے شاعری بھی ویسی ہی ہونی چاہیے۔ زندگی کے جتنے رنگ ہیں اتنے رنگ شاعری کے بھی ہونے چاہئیں''۔ ۷

حوالہ: http://www.dunya.com.pk/index.php/special-feature/2012-10-23/159#.Vq7vXk8Ujcs

ریحانہ قمر اور سرور ارمان کو دیے گئے ایک اخباری انٹرویو سے اقتباس

گویا تخلیق کار کے ''افکار عالیہ'' دراصل اس کی ایک سماجی اور فکری اختراع ہیں جو ایک لحاظ سے سماجی اکائیوں سے منفرد اور ارفع ہونے کی ایک خُو ہے، یہ ایک لحاظ سے احساسِ کمتری ہے، زندگی اپنے تمام تر پھکڑ پن کے ساتھ تخلیق کار کی تخلیق میں نمایاں ہونی چاہیے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تخلیق کار کا تعلق اپنے زمینی سماج سے ہے اور اس کا برتا ہوا لفظ کسی آفاقی مخلوق کے لیے نہیں ہے، تب ہی تخلیق کردہ لفظ کو سماجی بیانیوں کے تناظر میں دیکھا جا سکے گا۔ زبان کے حوالے سے کوئی بھی ماورائی طاقت اپنا حصہ بطور جبر نہیں ڈالتی بلکہ یہ ایک انفرادی اور سماجی آزادی کا نام ہے جو عام انسان سے لے کر تخلیق کار کے ہاں ایک جیسی آزادی کا قائل ہے۔ لیکن زبان سمیت ادب کو آفاقی آدرش بنانے پر نجانے کیوں ہمارا روایتی اردو نقاد سر توڑ کوششیں کر رہا ہے۔ یہ اپنے تئیں طاقت کے حصول کی کوشش ہے۔ زبان کو سائنسی تناظر میں دیکھنا اور اسے ایک آفاقی آدرش بنانا۔ لیوٹارڈ نے کہا تھا ''سائنس دان، مکینک، اور ٹولز کسی سچ کی تلاش کے لیے نہیں، بلکہ طاقت کے حصول کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں''۔۸

حوالہ: لیوٹارڈ: دا پوسٹ ماڈرن کنڈیشن: اے رپورٹ آن نالج۔ امریکہ: یونیورسٹی آف منی سوٹا پریس: ۱۹۸۴

ظفر اقبال کے ہاں اسکیپ ازم کا سماجی پرتو بھی ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً یہ شعر دیکھیے:

کانوں سے انگلیاں نہ نکالو تو کچھ نہیں
سنتے رہو تو روز نئی داستان ہے

اس شعر میں ہمارے ہاں کا بورژوا سماج اور جیو پولیٹکل منظر نامہ واضح ہوتا ہے، جو اپنے فکری دریافت سے دور ہے۔ غالب کے ہاں معروض کی ایک غیر متعین شکل کو تجسیم کرنے کی کوشش ہے، لیکن جیسا کہ ظفر اقبال خود اس بات کا اظہار کر چکے ہیں کہ زندگی کا تنوع تخلیق میں در آنا چاہیے۔ ایسے ہی اس شعر میں واضح ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں کی سماجی فراریت کی کئی صورتیں ہیں، مثلاً ادب کی ہی ایک ارفع اختراعی صورت، میڈیا پر پیش کیا جانے والا ہائپر منظر نامہ، حتیٰ کہ ہمارا تہذیبی منظر نامہ جو کہ خالصتاً سماجی اور اجتماعی ہے کو بھی ایسے پیش کیا جاتا ہے کہ وہ بورژوا سماج کی بنیادی اکائیوں کو سماجی حرکت میں اِن وے لڈ کر دیتا ہے۔ پاکستان کا تہذیبی اور سیاسی منظر نامہ ہمارے سامنے ہے، اس پر مذکورہ بالا شعر کتنا صادق آتا ہے۔ غالب کا تخلیقی پینڈولم محبوب اور مابعد الطبیعات کے کہیں بیچ اٹک کے رہ گیا۔ حالانکہ اس دور کی سماجی بافتوں کو گوناں مسائل کا سامنا تھا۔ غالب کا اسکیپ ازم دیکھیے:

قرض کی پیتے تھی مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

غالب کے حوالے سے ایک کتاب ''غالب شناسی اور نیاز و نگار'' مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر نے احتشام حسین کے حوالے سے لکھا ہے:

''غالب کا زمانہ عام انسانوں کے لیے تقلید اور روایت پسندی کا زمانہ تھا۔ اور حساس انسانوں کے لیے تشکیک کا۔ غالب بھی شک کا شکار تھے۔ لیکن شکوک کو روندکر آگے بڑھنا چاہتے تھے۔''۹

حوالہ: غالب شناسی اور نیاز و نگار: ڈاکٹر سلیم اختر صفحہ نمبر ۹

یہیں مزید ایل آر گوردن پونکایا کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"غالب نے اپنے اشعار میں ہمیشہ بدلتی ہوئی دنیا کا تصور پیش کیا، جن میں مخالف عناصر کا اتحاد اور متناقض دونوں موجود ہیں۔ غالب جدھر نگاہ اٹھاتے ہیں انہیں ضدین کا یہ اتحاد و تناقض نظر آتا ہے۔"۱۰

حوالہ: غالب شناسی اور نیاز و نگار: ڈاکٹر سلیم اختر صفحہ ۱۰۔

اگر مذکورہ بالا تنقیدی متن کو دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ غالب کا عہد ایک فکری "ٹرانسفورمیشن" کا عہد تھا۔ اس کے ہاں کوئی کلی منظر نامہ زمینی حقائق کی سطح پر متشکل نہیں ہونا چاہیے۔ حالانکہ اردو ادب میں مابعد جدیدیت کی رو شاید اپنی کلی صورت میں اب بھی وقوع پذیر نہیں ہو سکی۔ اب واقعتاً غالب کا عہد تہذیبی، سماجی اور فکری انتشار کا عہد تھا تو جو سماج اس کی شاعری میں متشکل ہوتا ہے وہ زمینی حقیقتوں سے ارفع اور آئیڈیل محسوس ہوتا ہے گویا غالب کا سماجی منظر نامہ ایک اختراعی منظر نامہ تھا اور ایک طرح سے یہ ایک فرد کا فکری تضاد اور فرار ہے۔ ایسے ہی جو پولیٹکل سماج سے اقبال بھی دوچار تھے تاہم ان کے ہاں آفاقی آدرش سے تعلق اور وفا کی صورت ان کے لسانی اور تخلیقی تجربے کا حاصل دکھائی دیتی ہے، تاہم ساتھ ساتھ وہ تہذیبی ریاضتیں جو اس عصر کی دسترس میں نہ ہو پائی تھیں ان کا رونا انہوں نے معاصرین کی نسبت بہت ارفع جمالیاتی سطح پر رویا ہے۔ ظفر اقبال نے اپنے عصر کی تہذیبی دریافت کا در اپنی لسانی تشکیل سے وا کیا ہے۔ اور وہ نہ صرف ایسا کرتے ہیں بلکہ اس کا دفاع بھی کرتے ہیں۔ اس دفاع کا ایک معنی یہ بھی نکلتا ہے کہ یہ تمام اضطراری عمل دراصل دانستہ عمل تھا۔ کرافٹ اور شعری رو کے درمیان سے جمالیات کشید کرنا اور وہ ایک اور قسم کی "ٹرانسفورمیشن" میں رہتے ہوئے جب آپ ایک ایسی تہذیب کا حصہ ہوتے ہیں جہاں زمینی وابستگی ایک طرف اور آفاقی آدرش ایک طرف کرتے ہوئے ایک تہذیبی بحران کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جب آپ ایک آزاد وطن میں اپنی شناخت کے حصول کے لیے سانس تو لیتے ہیں لیکن نئی شہریت اور عالم کاری کے ہاتھوں آپ اپنی اصل شناخت سے بھی محروم ہو جاتے ہیں، تو کیا یہ سب عوامل آپ کی شاعری میں در نہیں آنے چاہئیں؟ کیا ظفر اقبال کے علاوہ کسی اور معاصر نے یہ سماجی عُجب اس شد و مد کے ساتھ محسوس کیا اور کیا وہ ان کو اپنی تخلیقی سرگرمیوں میں جمالیاتی سطح پر لا سکے، اس کا جواب یقیناً مشکل نہیں ہے تاہم ہمارا روایتی نقاد شترمرغ کی طرح ریت میں گردن دابے رومانی تنقید سے نکل ہی نہیں پاتا۔ ظفر اقبال کلی طور پر محض کلیشے کی سطح پر سماجی بیانیوں سے انحراف نہیں برتتے؛ درج ذیل شعر دیکھیے:

اک ہوا اس طرح سے پابند رکھتی ہے مجھے
خاک سے ہوتا ہے جیسے ہر شجر باندھا ہُوا

یعنی زمین اور روایت سے جڑ کر نمویاب ہونا اور اپنی شاخوں کو جس جگہ جہاں چاہے لے جانا ہی نئی شعری تہذیبی دریافت ہے، اس سے ظفر اقبال پر یہ اعتراض بھی اِن وے لڈ ہو جاتا ہے جو ان کے بارے عام طور سے ہوتا ہے کہ ظفر اقبال نے غزل کو ہی اپنا شعار بنایا اور مستزاد یہ کہ وہی روایتی بحور اور نظامِ عروض ان کے ہاں ہے، غزل کی ہیئت تک کو تو تبدیل کر نہیں سکے، لیکن ایسا نہیں ہے، ظفر اقبال کے ہاں دیگر زبانوں کے الفاظ کا بطورِ خاص ردیف کے طور پر استعمال ہوا، اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ مابعد ظفر اقبالی منظر نامے پر جس تواتر سے شعرا ایسے لسانی تجربے سے گزر رہے ہیں وہ بے مثل ہیں اور کئی کے ہاں ظفر اقبال کی اس لسانی توسیعت نے بہت منفرد ذائقہ پیدا کیا ہے۔ ظفر اقبال کے ہاں اپنے اور ہمارے عہد کی زبان ہے، وہ انداز، وہ اطوار، وہ زندگی۔ وہاب اشرفی عالم کاری سے متعلق اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"گلوبلائزیشن کے اس زمانے میں جہاں ادب آفاقی نظر آتا ہے وہاں اس امر کو رد نہیں کیا جا

سکتا کہ اس کے مضمرات میں اپنے ملک کے حوالے بہ ہر طور موجود ہوتے ہیں۔ آداب زندگی، طور طریقے یہاں تک کہ مجلسی زندگی کا انداز بھی اسی کا حصہ ہے، جو ہم جیتے رہتے ہیں اور جو ہماری اپنی مٹی کا خمیر رکھتا ہے۔''۱۱

ظفر اقبال کا عہد کاسپولیٹن ازم اور گلوبلائزیشن کا عہد ہے، یہ وہ عہد ہے جب سماجی علوم پہ انگشت اٹھائی جا رہی تھی، سماج فکری سطح پر دولخت تھا، سماجی اکائیاں نئے بیانیوں کی زد پر تھیں، اس عہد کو ظفر اقبال نے اپنے ہاں مجسم کیا، ہمارا طرزِ حیات، ہماری نئی فکری روایت اور تہذیبی تصادم کے ساتھ ساتھ لسانی نئے پن کو ظفر اقبال نے نہ صرف شاعری بلکہ نثر میں بھی مجسم کیا۔ ظفر اقبال نے محض لسانی تبدیلی سے مصرع کی ہیئت کو تبدیل نہیں کیا بلکہ وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ مصرع معنوی لحاظ سے بھی بے عیب ہونا چاہیے۔ گویا غالب کے تتبع میں لکھنے والے جو دانستہ یا غیر دانستہ کوئی معنوی یا لسانی کڑی چھوڑ دیتے ہیں، یا کوئی ابہام چھوڑ دیتے ہیں، ظفر اقبال اس کی نفی کرتے ہیں، شعر جب تک قاری کے ذہن کو لسانی، جمالیاتی یا معنوی سطح پر مس نہ کرے وہ محض کرافٹ کا نمونہ ہے۔ مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ظفر اقبال کا شعری بیانیہ مابعد ظفر اقبال شاعری کے لیے مہابیانیہ ہے، اور جو شاعری اس سے ہو رہی ہے بھلے وہ معنوی لحاظ سے ارفع نہ ہو، تاہم اس میں نئے معنی اور استعارے کی تلاش کی سعی ضرور نظر آتی ہے جس کا سارا کریڈٹ ظفر اقبال کو جاتا ہے اور یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔

حوالہ جات

۱۔ بارتھ، رولاں۔ (۱۹۶۷) مصنف کی موت۔ مضمون

http://www.adbiduniya.com/2015/02/zafar-iqbal-10-questions.html-۲

۳۔ ''بیادِ جون ایلیا'' سوینیر اشاعت بہ اہتمام انجمن سادات امروہہ کراچی سن ۲۰۰۳

http://thekhichdiblog.blogspot.com/2015/04/blog-post.html

۴۔ اعوان، ڈاکٹر ظہور احمد۔ (۲۰۱۰ء) ''مرزا یاس یگانہ چنگیزی عرف غالب شکن'':

http://www.urduweb.org/mehfil/threads/.31121

۵۔ حسین، قاضی افضال۔ (۲۰۱۱) ''تحریر اساس تنقید''؛ فیصل آباد: مثال پبلیکیشنز

۶۔ حوالہ: اقبال، ظفر۔ (۲۰۱۴ء) ''لاتنقید''۔ لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، صفحہ ۱۰

http://www.dunya.com.pk/index.php/special-feature/2012-10-23/159#.Vq7vXk8Ujcs-۷
ریحانہ قمر اور سرور ارمان کو دیے گئے ایک اخباری انٹرویو سے اقتباس

۸۔ لیوٹارڈ۔ (۱۹۸۴) دا پوسٹ ماڈرن کنڈیشن: اے ریپورٹ آن نالج۔ امریکہ: یونیورسٹی آف منی سوٹا پریس:

۹۔ اختر، ڈاکٹر سلیم۔ (۱۹۹۸) غالب شناسی اور نیاز و نگار۔ لاہور: الوقار پبلیکیشنز۔ صفحہ نمبر ۹

۱۰۔ اختر، ڈاکٹر سلیم۔ (۱۹۹۸) غالب شناسی اور نیاز و نگار۔ لاہور: الوقار پبلیکیشنز۔ صفحہ ۱۰۔

۱۱۔ اشرفی، وہاب۔ (۲۰۰۷ء) ''مابعد جدیدیت: مضمرات و ممکنات''۔ اسلام آباد: پورب اکادمی۔ صفحہ ۲۴۵

مشرف عالم ذوقی کے ناول ''نالۂ شب گیر'' پر ایک نظر

عمران عاکف خان

'پروفیسر ایس کی عجیب داستان'، 'لے سانس بھی آہستہ' اور 'آتش رفتہ کا سراغ' کے بعد مشرف عالم ذوقی کا ایک اور شاہ کار ناول 'نالۂ شب گیر' منظر عام پر آ گیا حالانکہ ابھی سابقہ ناولوں کا خمار سروں میں سمایا ہوا ہے اور ان کا حصار ذہنوں کے ارد گرد باقی ہے۔ نالہ شب گیر ------ بالکل انوکھے انداز، نادر خیال، انجان موضوع اور اجنبی تعبیرات و تلمیحات پر مبنی ناول ہے۔ گو اسے انجان اور اجنبی نہ کہا جائے اس لیے کہ عورتوں سے متعلق منٹو، عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، رشید جہاں ، واجدہ تبسم، ممتاز شیریں، کشور ناہید (بری عورت کی آتم کتھا) تہمینہ درّانی، رضیہ سجاد ظہیر، صالحہ عابد حسین، جیلانی بانو وغیرہم نے خوب لکھا اور اپنے ناولوں میں عورتوں کے درد و کرب، ان کی کمزوری، مرد سماج کے خلاف بغاوت اور اس کی طاقت کو بیان کیا ہے اور تا ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ مگر پھر بھی عورت کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ 'نہیں! ابھی بات نہیں بنی، ابھی اس کے درد کا بیان اس طرح نہیں ہوا جس طرح ہونا چاہیے تھا------' اس کے لیے ایک مرد کی ضرورت ناگزیر ہوئی ایسے مرد کی جو گلوبلائزیشن کے دور میں اس کی آواز کو ہمدوش ثریا کر دے اور اس کا 'نالہ' آسماں گیر کر دے۔ چنانچہ مشرف عالم ذوقی نے عورتوں کی دیرینہ تمناؤں کو پورا کرنے کے لیے گلوبلائزیشن اور صنعتی کشاکش کے عہد میں عورت کردار اور اس کی عالمی مقبولیت، مردوں سے ہر میدان میں بازی لے جانے اور ان کے مقابلے میں ایک چٹان کی حیثیت سے کھڑا کر دیا۔ عورت کس طرح صدہا برس کی بے بسی اور سماج و معاشرے کے مظالم کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی ہے اور اپنا چہرہ نمایاں کرنے میں کامیاب ہوئی۔ کس طرح ہمارے عہد کی کوئی صفیہ، کوئی ناہید ناز صدیوں سے بلکہ اسٹون ایج سے صدمے اٹھاتی آ رہی ہیں اور ان کے کلیجے ناپسندیدہ باتیں، طعنے اور کوسنے سن کر چھلنی ہیں ......اس کے بعد وہ ان تمام خلیجوں، رکاوٹوں اور بندھنوں کو توڑ کر جو سماج نے اس کی راہ میں حائل کی ہیں، پھلانگ کر اور وقت کو اس کے ہی گھن چکر میں الجھا کر میدان میں آ گئیں اور لوہا بن کر لوہے کا مقابلہ کرنے لگیں------- 'نالۂ شب گیر' اس کا بیان ہے۔

جب کبھی مرد اور عورت کو جاننے اور اس کی حقیقت سمجھنے کی طرف ذہن جاتا ہے تو دو سوال سامنے آتے ہیں عورت کیا ہے؟ مرد کیا ہے؟ ان سوالوں کی وجہ شاید یہ ہے کہ چونکہ عورت قرن ہا قرن اور برس ہا برس سے مرد کے مظالم، زیادتیوں اور مردانہ سماج کی نابرابریوں کی شکار ہوتی رہی ہے اور مرد نے ہمیشہ اس کے اوپر اپنی حاکمیت کے علم بلند کیے ہیں۔

سیمون دابوانے (دی سکنڈ سیکس) کی تحقیق کرتے ہوئے خود سے پوچھا تھا کہ عورت کیا ہے۔ اس کا ایک دوسرا پہلو ہے کہ مرد کیا ہے۔ اس لیے کہ جب عورت یہ سوچتی ہے کہ عورت کیا ہے تو یہ محض سوال نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے صدیوں کا ظلم بھی ہوتا ہے اور ظاہر ہے اس کے پیچھے ایک مرد ہوتا ہے اور شاید اسی لیے سیمون کو یہ سوال کرنا پڑا۔

is subject The woman. on book a write to hesitated have I time long a FOR''
spilled been has ink Enough new. not is it and women; to especially irritating,
is It it. about more no say should we perhaps and feminism, over quarrelling in
the during uttered nonsense voluminous the for however, about, talked still
is all, After problem. the illuminate to little done have to seems century last
Most really? women, there Are it? is what so, if And problem? a there

will who adherents its has still feminine eternal the of theory the assuredly other and women\'; are still women Russia in \'Even :ear your in whisper is \'Woman :sigh a with say - same very the sometimes - persons erudite will they if exist, still women if wonders One lost.\' is woman way, her losing they place what should, they that desirable is it not or whether exist, always of become has \'What be. should place their what world, this in occupy "magazine. ephemeral an in recently asked was women?\'

(Beauvoir de Simone) Sex Second The

1949 میں سیمون عورت کے وجود کو تلاش کرتی ہوئی نئے سوالوں میں گم تھیں۔ غور کریں تو 1949 سے آج تک 66۔65 برسوں میں ایک مکمل دنیا تبدیل ہو چکی ہے۔ سیمون کو ممکن ہے عورت اتنی کمزور لگتی ہو کہ انہیں یہ کہنا پڑا، عورت پیدا نہیں ہوتی بلکہ بنائی جاتی ہے۔ مگر 74 برسوں کے بعد بدلی ہوئی دنیا میں اردو کا ایک فنکار عورت کو اس کمزور اور بے بس دنیا سے باہر نکال کر ایک ایسی دنیا میں پہنچا دیتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ یہاں جان بوجھ کر میں مکمل کہانی کو سامنے نہیں رکھ رہا تھا۔ اس لیے کہ یہ ناول نہ صرف پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے بلکہ ناول کے اندر پوشیدہ اسرار ورموز کو سمجھنے کے لیے اسے بار بار پڑھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ عورت کیا ہے اور مرد کیا ہے، ان سوالوں پر غور کرتے ہوئے آج کے، اکیسویں صدی کے پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے اسی ناول سے یہ دو اقتباس دیکھیے۔

'کمال نے غور سے میری طرف دیکھا 151 y2k کے بارہ برس بعد۔۔۔ یعنی ہندوستانی تاریخ میں وہ سال جب عصمت دری کے واقعہ کو لے کر ایک انقلاب برپا ہوا تھا اور دوسری طرف میڈیا یہ دیکھنے میں مصروف تھا کہ کیا سچ مچ قیامت آئے گی اور دنیا ختم ہو جائے گی۔۔۔ اور ناہید کے لفظوں میں صرف عورتیں زندہ رہیں گی۔ مرد مارے جائیں گے۔۔۔' کمال نے مسکرانے کی کوشش کی۔۔۔ قیامت نہیں آئی مگر آپ دیکھیں تو y2k کے بارہ برسوں، یعنی دلی، انڈیا گیٹ میں انقلاب کی نئی دستک تک، اگر کوئی بڑی تبدیلی آئی تھی تو وہ صرف عورتوں میں آئی تھی۔۔۔ اور مجھے اپنے دوست نرمل کی بات یاد آ رہی تھی۔۔۔ یعنی اگر بدلی تھی تو عورت۔ باغی ہوئی تھی تو عورت۔۔۔ دوسری طرف اس کے رد عمل بھی تھے۔ یعنی سہمی ہوئی تھی تو عورت۔'

'سہمی ہوئی۔۔۔' اس بار میں نے چونک کر کمال کی طرف دیکھا۔۔۔ چلو۔۔۔ کچھ دیر اس موضوع پر ٹھہرتے ہیں۔۔۔ 'قدیم مایا تہذیب کے لوگوں کو علم وفنون پر بھروسہ تھا۔ وہ ستاروں پر نظر رکھتے تھے اور مستقبل کا حال کہہ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنی تہذیب کے خاتمہ کے بارے میں بھی پیشین گوئی کی تھی کہ سمندر کی طرف سے حملہ ہوگا اور ان کی تہذیب سمندر کی نذر ہو جائے گی۔۔۔ اور جیسا جیسا انھوں نے کہا، غور کریں تو ہر دور میں وہی ہوتا گیا۔۔۔ ڈائنا سورس آئے اور پہلے دور کا خاتمہ ہو گیا۔ طوفانی ہوائیں چلیں، طوفان اٹھے اور دوسرا دور بھی ختم ہو گیا۔ تیسرا دور شعلوں کی نذر ہوا۔۔۔ چوتھا سیلاب اور پانچواں دور۔۔۔'

کمال کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔۔۔ y2k کے ان چودہ برسوں میں یہ دنیا آہستہ آہستہ ہلاکت کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اور اس باران کے پیچھے نہ گرم ہوائیں ہیں، نہ طوفان، نہ شعلے، نہ آندھی۔۔۔ اس باران کے پیچھے بلی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔۔۔ چوہوں کو کھانے کے بعد وہ آرام سے اپنی راہ چل دی۔ یا غائب ہو گئی۔' وہ آہستہ سے بولا۔۔۔ میں اب اس تصویر کا مفہوم سمجھ چکا ہوں۔

'تو تم مانتے ہو کہ۔۔۔'

'ہاں۔y2k کے بعد کی یہ دنیا عورتوں سے منسوب ہے۔اور ہم صرف مہرے۔اور اسی لیے اپنی نئی زندگی کا تعاقب کرتا ہوں تو ایک بڑی لکیر۔۔۔' وہ مسکرا رہا تھا151 یہ آپ ہی نے کہا تھا کہ اس سے چیزوں کے سمجھنے کا راستہ آسان ہو جاتا ہے۔مگر اسی واقعہ کی کڑی ناہید کا وہ بیان بھی تھا۔یعنی جو بیان اس نے مایا کلینڈر کو لے کر دیا تھا۔۔۔ کچھ عورتیں فاتح ہوں گی اور کچھ۔۔۔جن میں مردوں کی کچھ خصوصیات باقی رہ جائیں گی۔۔۔وہ سہمی ہوئی ہوں گی۔'

نالہ شب گیر کیا ہے------؟ ان جواں ہمت اور عالی حوصلہ عورتوں کی کہانی جو ثریا اور مریخ کی باشندہ نہیں بلکہ ہماری ہی زمین اور ہمارے ہی عہد کی جیتی جاگتی ہستیاں ہیں جو بقول نعمان شوق اس ناول میں خود چل کر آئی ہیں۔وہ سب ایسی عورتیں جنھوں نے اپنے اپنے مقامات کی عظمت و شان میں اپنی جدوجہد سے چار چاند لگائے ہیں۔یہ ہر اس عورت کی داستان ہے جو دنیا کے کسی بھی حصے میں ظلم تشدد، جنسی زیادتی اور مردوں کی جھوٹی انا کی خاطر قربان ہوتے ہوتے تنگ آ چکی ہے۔یہ عورتیں اب اپنے گندے ماضی سے لڑنے کے لیے برسرپیکار ہیں۔شاہ بانو، عمرانہ، ساوتری، دامنی، اور ہزاروں گمنام ہر دن مرد کی ہوس کی شکار ہونے والی عورتیں نالہ شب گیر کا حصہ ہیں اور اس کے صفحات نے ان کی ہم نوائی کی ہے۔

ایک سچی بات یہ ہے کہ قرنہا قرن سے عورتوں کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا گیا ہے وہ غیر مناسب رہا ہے اور مردوں نے اس کے جواز میں یہ بات کہی کہ عورت کمزور پیدا کی گئی ہے لہٰذا اسے طاقتور بننے اور ابھرنے کا کوئی حق و اختیار نہیں ہے۔نہ وہ حاکم بن سکتی ہے اور نہ ہی حکم دینے یا اپنے اوپر عائد کردہ پابندی، حکم اور فرمان کے خلاف احتجاج کرنے کی مجاز ہے۔حالانکہ عورت کی کمزوری کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سماج میں اس کی حیثیت مفلوج پہلو کی سی مان لی جائے۔کیا عورت کو طاقتور ثابت کرنے کے لیے یہ حقیقت کافی نہیں ہے کہ عورت وہ ہے جس کے بطن سے آسمان و زمین کو تعمیر کرتے انسانوں نے جنم لیا۔نبیوں، ولیوں، رشیوں اور منیوں کو عورتوں نے پیدا کیا ہے۔آسمان و زمین کے رازداران، اونچے اونچے پہاڑوں کو کاٹنے والے، آسمان سے باتیں کرتیں چوٹیوں کو سر کرنے والے اور اتھاہ سمندروں کا سینہ چیرنے والے بھی عورتوں نے دیے۔

عورتوں کی ان عظیم الشان خدمات اور مسلسل کوششوں کو دیکھ کر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ عورت کمزور ہے اور سماج کا مفلوج پہلو ہے اور تا حال وہ مردوں کے شانہ بشانہ نہیں چل سکتی۔ایسی سوچ نہ صرف متعلقہ ادیان و مذاہب اور مشنوں کی تعلیمات کے خلاف ہے بلکہ مذہب انسانیت کے بھی سخت خلاف ہے۔

ہم مان سکتے ہیں کہ عورت کمزور ہے مگر ان معنوں میں کہ اس کے دل میں رحم، ممتا، شفقت، اپنوں کے تئیں محبت اور آخر تک الفت ہوتی ہے جب کہ مرد ان صفات سے عاری ہوتا ہے یا ان میں خلوص نہیں ہوتا بلکہ سیاست ہوتی ہے۔جب کہ عورت خلوص اور بے لوثی سے ان فرائض کو انجام دیتی ہے۔یہ ہے عورتوں کی کمزوری۔یہ ہے عورتوں کا مردوں کے مقابلے میں کمزور پہلو۔مگر مردوں نے عورتوں کا راستہ ہی کاٹ دیا۔اس سلسلے میں مغرب نے تو انتہا ہی کر دی اور اسے حیوان سے بھی بدتر زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا۔اس کے بعد جب پاپو کا گھڑا ابھرا اور اسلام عرب کے ریگستانوں میں نمودار ہوا تو عورت کو نہ صرف زندگی ملی بلکہ اس کے وجود کو معراج بھی حاصل ہوئی۔

یوں تو مشرف عالم ذوقی نے اپنے تمام افسانوں اور ناولوں میں اس درد کو کہیں اجمالاً اور کہیں تفصیلاً بیان کیا ہے مگر اس کو کیا کہیے کہ انھوں نے ایک مکمل اور کامیاب ناول ہی عورتوں کے نام وقف کر دیا اور پھر اس کو خاطر خواہ مقبولیت بھی حاصل ہوئی ہے۔اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ پوری دنیا میں اس کی پذیرائی ہوئی۔اس ناول کو آنکھوں اور

دلوں سے لگانے والوں کا سلسلہ نئی دہلی، کلکتہ، پاکستان، لندن، جرمنی، کناڈا، کوپن ہیگن، ڈنمارک اور خلیجی ممالک تک کے محسنین اردو شامل ہیں۔

ذوقی کی اس نئی پیش کش کو سلام کرتے ہوئے نئی دہلی سے نعمان شوق کہتے ہیں:

'ذوقی کا ناول پڑھا------- میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ دنیا کے اچھے فکشن کا بہت کم حصہ میں نے پڑھا ہے۔ میرا ماننا ہے کہ عورت کے لیے آج کا فکشن نامحرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ منٹو اور عصمت جیسی چند مثالوں کو نظر انداز کر دیں تو ہر جگہ عورت لائی گئی ہے------- لیکن نالہ شب گیر میں عورت خود چل کر آئی ہے۔'

'گویا عورت آج بھی اس بات کی خواہش مند ہے کہ اس پر مزید سے مزید لکھا جائے اور ناولوں وافسانوں میں اب مجھے خود آ کر اپنی آب وتاب دکھانی ہے۔ پھر اس کی آرزو پوری ہوئی اور ذوقی کے قلم نے گمنام واندھیروں میں رہنے والی عورت کو تابناکی بخش دی۔ اس طرح انھوں نے اپنے پس رووں کو بھی راستہ دکھا دیا کہ عورت بھی ناولوں اور افسانوں کا دل چسپ موضوع بن سکتی ہے۔

مشرف عالم ذوقی نے اپنے تمام سابقہ ناولوں افسانوں اور بالخصوص نالہ شب گیر کے ذریعے یہ بات ذہنوں میں بٹھادی کہ حالات وواقعات، حادثات اور وقت کی نبضوں پر ان کی گرفت مضبوط ہے۔ وہ صرف ہمارے عہد کے ایسے شناور ہیں جن پر ہمارے عہد اور اردو دنیا کو فخر وناز ہے۔ ان کا اسلوب نگارش اس قدر آسان اور سہل ہے کہ قاری ان کے ناولوں میں طوالت واختصار کی پروا کیے بنا کھو جاتا ہے۔ اس کی نگاہیں اسی وقت ہٹتی ہیں جب وہ ختم ہوجاتے ہیں۔ پھر ایک امنگ، ترنگ، نیا احساس زندگی اور حیرت انگیز انکشافات کے بعد آ گاہی اور اس کے انگ انگ اور رگ رگ میں بھر جاتی ہے۔

نالہ شب گیر کو بعض نقادوں نے اکیسویں صدی کا نمائندہ ناول قرار دیتے ہوئے اسے سند کامیابی عطا کی ہے۔ چنانچہ نئی دہلی سے انوار الحق لکھتے ہیں:

'نالہ شب گیر اکیسویں صدی کا نمائندہ ناول ہے------- جو شائع ہونے سے پہلے ہی سرخیوں میں ہے اور قارئین اپنی بے بہا اور قیمتی آرا سے نواز رہے ہیں۔ کسی ناول کی کامیابی کی دلیل یہی ہے کہ اس ناول پر بالاستیعاب مکالمہ اور مذاکرہ ہو------- نالہ شب گیر ایسا ہی ناول ہے جس پر مکالموں کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔'

ذوقی کے ناولوں اور افسانوں کی زندگی اور مقبولیت کا راز یہ ہے کہ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کے مالہ وماعلیہ کا تجزیہ کسی ماہر نفسیات کی طرح کرتے ہیں۔ اس کے ایک ایک جز، ایک کُل، ایک ایک نکتے پر اس طرح بحث کرتے ہیں کہ بقول نایاب (پاکستان) یہ سوال سامنے آ کھڑا ہوتا ہے کہ 'کیا اب بھی کچھ اور باقی رہ گیا؟' اور جواب یقیناً 'نا' میں ہوتا ہے۔ بلکہ قاری اس سے بھی آگے بڑھ کر 'ہرگز نہیں' کہہ اٹھتا ہے۔

ویسے بھی دیکھا جائے تو ایک کامیاب فن کار اور شاہ کار وہی ہوسکتا ہے جو اپنے موضوع سے پورا پورا انصاف کرے اور قارئین کی آسودگی کے ساتھ ساتھ بگڑے حالات کے زخموں پر مرہم پٹی کر کے انھیں زندگی عطا کر دے------- اور مشرف عالم ذوقی کے یہاں اس چیز کا آخری حد تک اہتمام ہے

غزل، شاعری ہے، عشق ہے، کیا ہے؟

(غزلیات)

انور شعور

کیا کوئی ضروری ہے رہ و رسم بھی ہونا
کافی ہے شعور ان سے دلی دوستی ہونا
اچھے بُرے اندازِ تصرف پہ ہے موقوف
دنیا میں کسی چیز کا اچھی بُری ہونا
اظہارِ حقیقت میں اثر کے لیے حضرت
اندازِ بیاں چاہیے افسانوی ہونا
کرنے نہیں دیتا ہمیں حل مسئلہ کوئی
درپیش بیک وقت مسائل کئی ہونا
کرتے ہیں بسر لوگ یہاں زندگی ایسی
ہے روز کا معمول کوئی خودکشی ہونا
سج بن کے نکلنا نہیں پڑتا مجھے گھر سے
اس شہر میں اچھا ہے مرا اجنبی ہونا
سوچا کرو انجام کسی کام سے پہلے
بے فائدہ ہے بعد میں شرمندگی ہونا
کیا قدر ہے گلشن میں چہکنے کی ہمارے
یہ بات بتاتا ہے سُنی ان سُنی ہونا
لے اُڑتی بھلا کیوں نہ تمھیں وہ پری پل میں
تم بھی تو شعور آخرِکار آدمی ہو نا

اِدھر دوست ہیں اور اُدھر دوست ہیں
سفر میں کبھی ہمسفر دوست ہیں
مرے ساتھ اٹھاتے ہیں آوازِ حق
جو میری طرح کے نڈر دوست ہیں
فرشتوں سے میرے مراسم کہاں
بشر ہوں لہٰذا بشر دوست ہیں
ملاقات سب سے ہے لیکن قریب
فقط صاحبانِ نظر دوست ہیں
مجھے جن کی جانب سے خطرہ ہے وہ
مخالف نہیں، بیشتر دوست ہیں
جو سکتے نہیں آپ کا کچھ بگاڑ
وہی آپ کے بے ضرر دوست ہیں
مجھے صبر کی دے رہے ہیں صلاح
مرے درد سے بے خبر دوست ہیں
شعور ان کا کم عمر ہم عمر ہے
جو اس سے بڑے ہیں مگر دوست ہیں

سحر انصاری

جاں دے کے کہا میں نے وفا ہے کہ نہیں ہے
انصاف سے یہ جُرم بڑا ہے کہ نہیں ہے

جب بنتے ہیں انسان ہی سفّاک درندے
ہم سوچتے رہتے ہیں خدا ہے کہ نہیں ہے

اب خون سے دنیا اسے کیوں کہتی ہے تعبیر
ہاتوں پہ ترے رنگِ حنا ہے کہ نہیں ہے

بُلبُل کی چہک سے تو ہے آسودہ سماعت
غنچے کی چٹک کو بھی سُنا ہے کہ نہیں ہے

دشنام سے بڑھ جاتی ہے توقیر تو کچھ اور
یہ حرف مرے حق میں دُعا ہے کہ نہیں ہے

ہر روز کسی شاخ پہ اُٹھی ہیں نگاہیں
پھر آج کوئی پھول کھلا ہے کہ نہیں ہے

کیوں قتل ہی ٹھہرائی ہے قیمت مرے سر کی
کچھ اور مرا نرخ بڑھا ہے کہ نہیں ہے

دیوان جو دیکھا تو سحرؔ اُس نے یہ پوچھا
مجھ پر بھی کوئی شعر لکھا ہے کہ نہیں ہے

گزر رہے ہیں بلندی کے ہر نشان سے ہم
اب اس زمیں کو گزاریں گے آسمان سے ہم

بساطِ زیست کے بھی طے شدہ اصول نہیں
کبھی یقین سے جیتے، کبھی گمان سے ہم

کھلا کہ وہ تو کسی اور ہی کی تھی جاگیر
بہت زیادہ تھے مانوس جس مکان سے ہم

کشاں کشاں لیے پھرتی ہے تجربوں کی لگن
نکل کے دُھوپ میں آئے ہیں سائبان سے ہم

وہ دیکھنے میں فقط تیری آزمائش تھی
گزر رہے تھے کسی اور امتحان سے ہم

کدھر ہے، کون ہے، اپنا ہدف نہیں معلوم
کھنچے ہیں تیر کی صورت کسی کمان سے ہم

سحرؔ یہ بات بھی سچ ہے کسی کی نظروں میں
چڑھے تو صرف محبت کے نردبان سے ہم

خورشید رضوی

شبِ غربت میں جو خوشبوئے وطن پاس آئی
دیر تک سانس نہیں، صرف تری باس آئی
جب نوشتوں میں متاعِ دو جہاں بٹتی تھی
میرے حصے میں یہی شدتِ احساس آئی
دلِ برباد ہوا بیم و رجا سے آزاد
اب نہ آس آئی ہے اس میں، نہ کبھی یاس آئی
جب بھی آئی ہے کبھی اس نگہِ ناز کی یاد
شیشۂ دل کے لیے صورتِ الماس آئی
تو اسی گوشۂ عزلت میں پڑا رہ خورشید
تجھ کو کب صحبتِ ابنائے زماں راس آئی

جم کر شفق پہ ابر بے تاب سو گیا ہے
یا رنگ میں ٹھہر کر سیماب سو گیا ہے
میں آنکھ بند کر کے اس کو جگا رہا ہوں
میرے کنارِ دل میں جو خواب سو گیا ہے
اک سمت عیشِ ساحل، اک سمت قعرِ دریا
حیرت میں ہے سفینہ، گرداب سو گیا ہے
دنیا ہے اس سے آگے، بے صوت نغمگی کی
مدھم سروں پہ آ کر، مضراب سو گیا ہے
آ اس گھڑی جہاں سے باہر نکل چلیں ہم
گردش تھمی ہوئی ہے، ڈولاب سو گیا ہے

خورشید رضوی

تھا درد کا درماں، نہ کسی بات کا حل تھا
کیا زیست کی بنیاد میں خود کوئی خلل تھا
ظاہر پہ نہ جا، کوہکن و قیس تھے ہم بھی
باطن میں وہی سلسلۂ دشت و جبل تھا
ہر چند کہ سو جاں پہ گزر جائے خرابی
دل کا اسی آئینِ شکستہ پہ عمل تھا
خاموش دلِ زار جہانِ گزراں میں
جو کچھ کہ کہا اس کے نہ کہنے کا محل تھا
اترا ہی نہیں دل پہ کوئی آیۂ محکم
ہر سانس میں اک مخمصۂ ردو بدل تھا
کیا راز ہے تاثیرِ سخن کا تری خورشید
نے رنگ قصیدے کا نہ اندازِ غزل تھا

غمِ زمانہ سہو، جورِ مہرباں کی طرح
یہ سود وہ ہے کہ لگتا ہے جو زیاں کی طرح
کبھی جو ترکِ وفا کا خیال گزرا ہے
نگاہِ دوست اُٹھی تیغِ بے اماں کی طرح
وہ یاد دل میں جو رہتی تھی زخم کی مانند
وہ یاد آج بھی ہے زخم کے نشاں کی طرح
ترے فراق میں کاٹے ہیں کس طرح مت پوچھ
یہ چند روز کہ تھے عمرِ جاوداں کی طرح
تری گلی کے تصور میں ڈوب کر اکثر
ہم اپنے گھر میں اترتے ہیں مہماں کی طرح
جھکے تو خاک نشیں ہو گئے مثالِ اُفق
بہت بلند ہوئے تھے ہم آسماں کی طرح
تمہارے بعد نہ دیکھی کہیں وہ برقِ ادا
کہ شاخِ دل پہ پڑے طرحِ آشیاں کی طرح
کہاں ہے تو کہ پھر اک بار کاروانِ بہار
گزر رہا ہے مری عمرِ رائگاں کی طرح

سید نصرت زیدی

سورج ڈوب گیا ہے چپ کی مہر کو توڑوں بتلاؤ
اپنی کہانی کا اب رشتہ چاند سے جوڑوں بتلاؤ
تیز ہوا کے جھونکے سے مٹی کا برتن ٹوٹ گیا
ٹھیکریاں ہری جھولی میں کیسے کیسے جوڑوں بتلاؤ
مرے پاؤں کے تلووں پر تو آبلوں کے مشکیزے ہیں
صحرا کے کانٹوں کو پیاسا کیسے چھوڑ دوں بتلاؤ
شیخ مگن مے خانے میں ہے اور برہمن مسجد میں
میں دونوں کے بیچوں بیچ ہوں کس کو چھوڑوں بتلاؤ
کل کی بات ہے نصرت جس نگری سے برہنہ آیا تھا
آج اس نگری واپس جاتے چادر اوڑھوں بتلاؤ

احسان اکبر

مسلسل اشک افشانی کا کوئی مدعا بھی ہو
خبر جو ہے سو ہے کچھ اس خبر کا مبتدا بھی ہو
دلِ سادہ کی خوش فہمی کا پھر کوئی ٹھکانہ ہے
جب اس کا رُوٹھنے والا پلٹ کر دیکھتا بھی ہو
فقط اچھا برا کیا آدمی صد رنگ ہوتا ہے
خود اپنے آپ کو دیکھو رسا بھی نارسا بھی ہو
کسے معلوم وہ خلوت کو ویرانہ بنا دے گا
جو ویسے سب سے ملتا سب سے ہنستا بولتا بھی ہو
وہ اپنی موج میں آتا ہے باتوں میں نہیں آتا
طلب کو حوصلہ درکار، تم میں حوصلہ بھی ہو
بیانوں میں نہیں انسان برتاؤ میں کھلتا ہے
سلوک رہروی گوہر ہے راہوں میں پڑا کیوں ہو
کنارہ گیر ہو دل گیر ہو احساںؔ کئی دن سے
چھلک پڑتے ہو ناحق کسی نے کچھ کہا بھی ہو

روحی کنجاہی

خلاؤں میں تو نوا اٹکی ہوئی ہے
کہاں جا کر دعا اٹکی ہوئی ہے
ہوائیں ہچکیاں سی لے رہی ہیں
کہاں آہ و بکا اٹکی ہوئی ہے
سنائی دیتی ہیں دن رات چیخیں
نگر میں ہر بلا اٹکی ہوئی ہے
ہے کیسے حادثے کا پیش خیمہ
گلے میں اک صدا اٹکی ہوئی ہے
ہوا جاتا ہے چہرہ چہرہ تصویر
نگہ میں ہر نگہ اٹکی ہوئی ہے
تکے جاتے ہیں اک دوجے کا منہ سب
کہیں سب کی انا اٹکی ہوئی ہے
مچا رکھا ہے ہر سو جھوٹ نے شور
کہاں حق کی صدا اٹکی ہوئی ہے
بچاری ڈھونڈتی پھرتی ہے رستہ
درختوں میں ہوا اٹکی ہوئی ہے
سمجھ میں کچھ نہیں آتا کسی کی
سوئی اب کس جگہ اٹکی ہوئی ہے
ہے بہتات اس قدر کانٹوں کی روحی
کہ ہر گُل کی ردا اٹکی ہوئی ہے
نہ اگلی اور نہ نگلی جائے ہے آج
دوائے بے دوا اٹکی ہوئی ہے

زمین آگے ہے یا آسمان آگے ہے
غبار سامنے ہے اور نشان آگے ہے
چلے تو کیسے چلے ایسا تیر آخر کار
جو خود ہے پیچھے بہت اور کمان آگے ہے
شکاری اتنا اناڑی نہیں ہوں میں لیکن
شکار پیچھے ہے میرے مچان آگے ہے
ملاحظہ کریں انداز ترجمانی کا
مرے بیاں سے مرا ترجمان آگے ہے
بیان ٹھیک سے ہوں کس طرح دلی جذبات
ہر ایک لفظ ہے پیچھے زبان آگے ہے
پتہ چلے کسی کو تو بتا ہی ڈالے کوئی
ابھی یقین سے کتنا گمان آگے ہے
دھکیلتی ہے شکستہ پری مجھے پیچھے
دباؤ اتنا ہے میری اڑان آگے ہے
یہ آنکھ بھر ہے جہاں اس کی حیثیت ہی کیا
جہاں بھی جاؤں یہ لاگے جہان آگے ہے
یہ پوچھتی ہیں زماں و مکاں کی سرحدیں
زمان آگے ہے یا کچھ مکان آگے ہے
بتاؤں کیا کہ ہوں کس کس کے پیچھے اور کتنا
کہ مجھ سے میرا ہر اک مہربان آگے ہے
ہر امتحان پہ کھلتا ہے اک یہی عقدہ
کہ یہ تو کچھ بھی نہ تھا' امتحان آگے ہے
چلیں کسی بھی طرف سے کسی بھی جانب کو
یہی لگا ہے ابھی درمیان آگے ہے
میں جا رہا ہوں کدھر کچھ خبر نہیں روحی
یہ بے خیالی میں بھی مجھ سے دھیان آگے ہے

سرمد صہبائی

راکھ سے بال و پر بناتا ہے
دل بھی کیا کیا ہنر بتاتا ہے
خواہشِ جسم و جاں جلاتی ہیں
اور غم چشمِ تر بناتا ہے
وہ نکلتا ہے چاند کی صورت
خواب کو نامہ بر بناتا ہے
ایک جھونکا ہوا کا باغوں میں
پھول، پتے، شجر بناتا ہے
رنج کا بھی کوئی شمار کرے
وہ جو جان و جگر بناتا ہے
ساتھ چلتا ہے لے کے تنہائی
دل عجب ہم سفر بناتا ہے
کھینچ کر ایک نقش نظارہ
وہ نگارِ نظر بناتا ہے
آنکھ میں بوند سی لرزتی ہے
یہ ستارہ سحر بناتا ہے

دُھند میں لپٹے ہوئے اسرار کو چھوتے ہوئے
سائے ہیں کب سے رواں دیوار کو چھوتے ہوئے
ایک سرگوشی میں لرزاں ہو رہی ہے خامشی
حرف بکھرا ہے لبِ اظہار کو چھوتے ہوئے
سیڑھیوں پر لڑکھڑاتی ہے ہوا جیسے کوئی
خواب اترتا ہے شبِ بیدار کو چھوتے ہوئے
دیکھتے ہی سایۂ زر آنکھ گہنائی گئی
بجھ گیا دل رونق بازار کو چھوتے ہوئے
ہر نئے دن کربلا آتی ہے کوئی شہر میں
خوف آتا ہے ہمیں اخبار کو چھوتے ہوئے
گم ہوئے جاتے ہیں گردِ راہ میں شام و سحر
وقت رُکتا ہے مری رفتار کو چھوتے ہوئے
ساز دل خاموش تھا اک عمر سے لیکن ابھی
یاد گزری ہے تری ہر تار کو چھوتے ہوئے
تیرے بالوں سے لپٹ کر سرمئی ہوتی ہے شام
صبح آتی ہے ترے رخسار کو چھوتے ہوئے
دامنِ کہسار میں عریاں ہے کوئی جل پری
سو رہا ہے چاند جوئے بار کو چھوتے ہوئے
ہم بھی سرمد سیرِ وحشت میں ہیں جانو ہم تلک
یہ سخن آتا ہے میر خوار کو چھوتے ہوئے

جلیل عالی

لا نہ سکتا تھا جسے کوئی لبِ اظہار پر
جا بجا لکھا گیا وہ شہر کی دیوار پر

بِک رہے تھے ہر طرف انساں کھلونوں کی طرح
اور ہم خوش ہو رہے تھے رونقِ بازار پر

ایک ہی منظر تھا صدیوں سے نگاہوں سامنے
رینگتی تھیں روز یکساں سرخیاں اخبار پر

جو کسی منظر نظر آیا نہ پورے کھیل میں
منحصر ساری کہانی تھی اسی کردار پر

ہم نے پائی ہے نمو آب و ہوائے عشق سے
تو پرکھتا ہے ہمیں کس مطلبی معیار پر

شکستگی سے سفر کے ہنر نکالتے ہیں
کہ خاکِ خواب سے خوابِ دگر نکالتے ہیں

ہمارے حوصلے دیکھو قدم قدم کیسے
تمہارے قامتِ قسوت سے سر نکالتے ہیں

گرا گرا کے وہ بارود ہار جائے گا
ہم اک نگاہ میں ملبے سے گھر نکالتے ہیں

کس اوجِ شوق سے زیرِ زمیں اترتے ہیں
اور اپنی خاک سے شمس و قمر نکالتے ہیں

سخن کے شبنمی قطروں سے سنگ سینوں میں
کٹھن ہے راہ نکلنا مگر نکالتے ہیں

کھلے فضا میں جو شیریں صدا پرندوں کی
شجر بھی شہد سے میٹھے ثمر نکالتے ہیں

وہ دل جو عشق بہاؤ بہیں وہی عالی
بھنور کے گھاٹ اترنے کا ڈر نکالتے ہیں

محمد اظہار الحق

اک اور بھی آئے گا زمانہ
کہلائے گا جو مرا زمانہ
کیا سچ ہے زمانہ ہی خدا ہے
کیا سچ ہے کہ ہے خدا زمانہ
کیا ہو گا زمانہ دیکھ لے گا
اک بار جو مل گیا زمانہ
کیا میرے لیے ہی رہ گیا تھا
بوسیدہ، پھٹا ہوُا زمانہ
ہشیار! کہ پیرِ تسمہ پا ہے
یہ ضعف سے کانپتا زمانہ
بچوں کے لیے ہی چھوڑ جاتے
اک سبز ہرا بھرا زمانہ

کیسا تھا یہ سلسلہ مرے ساتھ
ہر لحظہ رہا خدا مرے ساتھ
کیا یار بھی پھر اٹھیں گے میرے؟
انصاف! مرے خدا! مرے ساتھ
افسوس! بریدہ پا زمانہ
مشکل ہی سے چل سکا مرے ساتھ
کیا اس سے بھی بے وفائی کی ہے
روتی ہے بہت ہوا مرے ساتھ
کب تک آخر رہے گا مامور
یہ بدرقہ عمر کا مرے ساتھ
ہوتا رہا طے وصال کی شب
اک اور معا ملہ مرے ساتھ
مٹی کی بنی ہیں ڈھیریاں دو
دونوں کی رہی دعا مرے ساتھ

سلیم کوثر

کچھ بھی تھا سچ کے طرف دار ہوا کرتے تھے
تم کبھی صاحب کردار ہوا کرتے تھے

کیا کوئی دور یہاں ایسا بھی گزرا جس میں
حق انہیں ملتا جو حق دار ہوا کرتے تھے

تجھ کو بھی زعم سا رہتا تھا مسیحائی کا
اور ہم بھی ترے بیمار ہوا کرتے تھے

اک نظر روز کہیں جال بچھائے رکھتی
اور ہم روز گرفتار ہوا کرتے تھے

ہم کو معلوم تھا آنا تو نہیں تجھ کو مگر
تیرے آنے کے تو آثار ہوا کرتے تھے

عشق کرتے تھے فقط پاسِ وفا رکھنے کو
لوگ سچ مچ کے وفادار ہوا کرتے تھے

آئینہ خود بھی سنورتا تھا ہماری خاطر
ہم ترے واسطے تیار ہوا کرتے تھے

کوچۂ میر کی جانب نکل آتے اکثر
وہ جو غالب کے طرف دار ہوا کرتے تھے

ہم گلِ خواب سجاتے تھے مکانِ دل میں
اور پھر خود ہی خریدار ہوا کرتے تھے

رات جس جا بھی گزرتی ہو مگر صبح کو
تیرے پہلو ہی سے بیدار ہوا کرتے تھے

میرے بہتے ہوئے دریاؤں کے دونوں جانب
دور تک سایۂ اشجار ہوا کرتے تھے

میرے ٹھہرے ہوئے پانی سے مہک اٹھتی تھی
مشک بو کیا درو دیوار ہوا کرتے تھے

جن سے آمادگیِ شب کا بھرم تھا وہ لوگ
اس بھرے شہر میں دوچار ہوا کرتے تھے

کس قدر جبر کے پہرے تھے تمہیں کیا معلوم
سانحے کیا پسِ دیوار ہوا کرتے تھے

یہ جو زنداں میں تمہیں سائے نظر آتے ہیں
یہ کبھی رونقِ دربار ہوا کرتے تھے

میں سرِ دشتِ وفا اب ہوں اکیلا ورنہ
میرے ہمراہ مرے یار ہوا کرتے تھے

وقت رک رک کے جنہیں دیکھتا رہتا ہے سلیم
یہ کبھی وقت کی رفتار ہوا کرتے تھے

سلیم کوثر

ہماری یادوں کے سائبانوں میں کون ہو گا
جو ہم نہ ہوں گے تو ان مکانوں میں کون ہو گا
کسی نے تقریب میں بلایا تو ہے ہمیں بھی
مگر نہیں علم میزبانوں میں کون ہو گا
زمیں فرشتہ صفات لوگوں سے بھر گئی ہے
میں سوچتا ہوں کہ آسمانوں میں کون ہو گا
صبا نہ ہوگی تو کون روداد گل کہے گا
ہوا نہ ہوگی تو بادبانوں میں کون ہو گا
وہ جن کی محنت کی آگ سے چمنیاں ہیں روشن
سوائے مزدور، کارخانوں میں کون ہو گا
سب اپنی اپنی کہانیوں کے حصار میں ہیں
زباں زد عام داستانوں میں کون ہو گا
ہمارے قدموں میں گردشیں رقص کر رہی ہیں
ہمارے جیسا بھی نوجوانوں میں کون ہو گا
میں وقت کی دھوپ کا مسافر یہ سوچتا ہوں
تمہارے ہمراہ شامیانوں میں کون ہو گا
وہ جن کا سرمایہ اور اثاثے ہوں سب وطن میں
اب اتنا اچھا بھی حکمرانوں میں کون ہوگا
میں سب کا ہم عصر ہو کے بھی سب سے مختلف ہوں
سو میرے جیسا نیا پرانوں میں کون ہو گا

صابر ظفر

بچھڑتے رنگوں کی ہیں خود نمائیاں کیا کیا
مگر اِن آنکھوں نے دیکھیں جُدائیاں کیا کیا
جو آج تک نظر آیا نہیں کہیں بھی ہمیں
اُس اجنبی سے رہیں آشنائیاں کیا کیا
ہم اپنے آپ سے باہر نکل نہیں پاتے
ہوئی ہیں ہم پہ مسلّط خُدائیاں کیا کیا
وہ مار دیتے ہیں زندوں کو اپنے ہاتھوں سے
پھر اُن کی کرتے ہیں مدحت سرائیاں کیا کیا
ہمارے لکھے پہ کالک جو ملتے رہتے ہیں
وہ پیش کرتے ہیں ہم کو صفائیاں کیا کیا
وہ ساتھ ہیں تو اُلجھنے کے واسطے ہیں فقط
رہیں وگرنہ گریزاں اکائیاں کیا کیا
ہم اپنے آپ پہ اس واسطے ہنسیں نہ ظفر
کہ ہو رہی ہیں یہاں جگ ہنسائیاں کیا کیا

نجیب احمد

کچھ ایسے سحرِ زر پھونکا گیا ہے
کہ اب فنکار تک پتھرا گیا ہے
پرندے لوٹ کر آئے نہیں ہیں
درختوں میں ثمر تک آ گیا ہے
مری خواہش کا آوارہ بگولا
تجھے چھو کر مجھے جھلسا گیا ہے
گئے موسم کے زینے سے اتر کر
سوا نیزے پہ سورج آ گیا ہے
یہاں تو زندگی دشوار تر تھی
مجھے کیوں دار پر کھینچا گیا ہے
جہاں دم سادھ لیں چلتی ہوائیں
نجیب اس شہر میں تنہا گیا ہے

ہم نے دم دم منافقت کی ہے
زندگی سے بنا کے رکھی ہے
اے دل آرا کوئی چراغ ملا
تیرے گھر آ کے رات ٹھہری ہے
زحمتِ فکر ماہرِ تعمیر
گھر کی دیوار گرنے والی ہے
ریزہ ریزہ رخِ حیات ہوا
آئنہ کرچیوں کی بستی ہے
بادشہ تم ہو، ہم رعایا ہیں
بات اتنی سمجھ میں آئی ہے
بات ساری ہے تجربے کی نجیب
ورنہ دنیا بری نہ اچھی ہے

ابرار احمد

خود پہ کچھ اختیار ہے، جو ہے
بس یہی ایک حصار ہے، جو ہے

تو کہیں میرے آس پاس نہیں
پھر یہ کیسا خمار ہے، جو ہے

سامنے ہے کہیں نہ نقشے میں
نیند میں اک دیار ہے، جو ہے

اب یہاں سے کدھر کو جانا ہے
کس کا یہ انتظار ہے، جو ہے

ہے رعونت نہ انکسار تو پھر
کیا کوئی اعتبار ہے، جو ہے

بڑھتے جاؤ کہ تا بہ حد نظر
صرف گرد و غبار ہے، جو ہے

منزلیں کانپتی، لرزتی ہیں
راہ میں شہ سوار ہے، جو ہے

لڑکھڑانے کو پھر ہو آمادہ
کس پہ اب انحصار ہے، جو ہے

بہ رنگِ بوئے پریشاں، یہاں وہاں ہو گا
تو میرے پاس ہی ہوگا، مگر کہاں ہوگا

دمِ وصال جو ہے رنگِ عالمِ دنیا
بچھڑتے وقت بھی شاید یہی سماں ہو گا

وہ راستہ ابھی بھولا نہیں ہے، سو یہ فقیر
تو جب کہے تری جانب رواں دواں ہو گا

یہاں سے اب ہمیں کچھ بھی سجھائی دیتا نہیں
اگر یہ ابر نہیں ہے تو پھر دھواں ہو گا

اب ایسے عالمِ تنہائی میں یہ کیا دیکھیں
کہ تو نہیں تو کوئی دوسرا کہاں ہوگا

کہیں پہ ہیں کہ نہیں ہم، یہ کیا سوال ہوا؟
تمہیں یقیں نہیں ہے تو پھر گماں ہو گا

نہیں کہیں پہ بھی یک جائی کی کوئی صورت
ہم ایک ہو بھی گئے کوئی درمیاں ہوگا

میں خواب ہجر سے جاگا تو ڈھونڈ لوں گا تجھے
تو اس نواح میں ہو گا مگر کہاں ہو گا

کہ اب جو مجھ میں شباہت کی چھوٹ پڑتی ہے
یہ میں نہیں ہوں، کوئی رنگ رفتگاں ہو گا

لیاقت علی عاصم

یہ دردِ دل عدم آثار تھا مگر ایسا
میں پہلے بھی ترا بیمار تھا مگر ایسا
یہ انتہائے خموشی ہے ابتدا ہی سے
ترا سلوک دل آزار تھا مگر ایسا
اذاں ہوئی بھی نہیں اور میں نے سن بھی لی
مجھے خدا سے سروکار تھا مگر ایسا
سزائے قیدِ نفس میں اضافہ چاہتا ہوں
میں زندگی کا گنہگار تھا مگر ایسا
کہاں کی بزم کہ خلوت بھی چھوڑنا چاہوں
میں ہجرِ یار کا حقدار تھا مگر ایسا

نہر پر ناؤ بناؤں گا چلا جاؤں گا
میں ترے شہر میں آؤں گا چلا جاؤں گا
تختِ لاہور سے آگے ہے مرا تاج نگیں
اپنے لشکر کو بتاؤں گا چلا جاؤں گا
موسم سرد میں تو ڈھونڈتے رہنا مجھ کو
ہر طرف آگ جلاؤں گا چلا جاؤں گا
چار جانب سے پڑے گی مری آواز کی دھوپ
ترے سائے کو ستاؤں گا چلا جاؤں گا
ہیر رانجھا ہیں جہاں دفن بیک جسم و جاں
میں وہاں شمع جلاؤں گا چلا جاؤں گا
صاف اِک چاہ زنخداں ہے ترے چہرے پر
اہلِ کنعاں کو بتاؤں گا چلا جاؤں گا
وہ ستارہ جو مرے ساتھ چلا آیا ہے
ساتھ اس کا میں نبھاؤں گا چلا جاؤں گا

خالد اقبال یاسر

شاید اس عشق میں کھویا کم تھا
کم تھا سیلاب کہ رویا کم تھا

پھیکی پھیکی تھی مری گل کاری
مو قلم خوں میں ڈبویا کم تھا

کم نگاہی کی شکایت کیسی
میں بھی تو وصل کا جویا کم تھا

خال وخد ہی تھے سراپا تحریر
حسن لفظوں میں پرویا کم تھا

بات بنتی بھی تو بنتی کیسے
درد لہجے میں سمویا کم تھا

رستا رہتا ہے وہ قطرہ قطرہ
میں نے جس زخم کو دھویا کم تھا

بڑھ گیا اور بھی رفتہ رفتہ
میں نے جس بوجھ کو ڈھویا کم تھا

چھدری چھدری ہے وفا کی کھیتی
پیار کا بیج ہی بویا کم تھا

کچھ نہ کچھ تو نکل آیا یاسر
میں نے پانی ہی بلویا کم تھا

سینچی ہے میں نے کتنی زمینیں نئی نئی
پھوٹیں سخن کے پیڑ سے شاخیں نئی نئی

یونہی بدل نہیں رہی شعری لطافتیں
سیکھی ہیں مہ رخوں نے ادائیں نئی نئی

مومن بھی تازہ تازہ ہوئے وارد بہشت
غلمان بھی نئے نئے حوریں نئی نئی

دیکھا جو اس کرّے کو نکل کر مدار سے
پیدا ہوئیں بیان میں رمزیں نئی نئی

رسم و رواج اور ہیں اب دید و عید کے
راتیں وہیں گھنیری ہیں گھاتیں نئی نئی

پہلے بھی کم نہیں تھے نگہدار دمدمے
اٹھتی ہی جا رہی ہیں فصیلیں نئی نئی

میداں میں فیصلے ہوا کرتے تھے تیغ پر
اب اور اور پینترے چالیں نئی نئی

گرچہ ہیں آزمودہ شہ وقاضی و وزیر
باندھی ہیں ان سے امیدیں نئی نئی

پیدا کرو مطابقت ان سے کسی طرح
یاسر نیا زمانہ ہے سوچیں نئی نئی

شاہدہ حسن

پا بہ جولاں چلی، اس طرف جس طرف، لے گئی زندگی لے گئے راستے
میں نے سوچا نہیں جا رہی ہوں کدھر، وقت کی تیز لہروں پہ بہتے ہوئے
کیا ضرر کیا زیاں، کیا یقیں کیا گماں، کوئی کیا دے سکا ہے کسی کو یہاں؟
پھر بھی رکھی ہیں میں نے بچا کر کہیں چند انمول خوشیاں تمہارے لیے
روز لکھتی رہی، روز پڑھتی رہی، زندگانی کو میں اس کہانی کو میں
رایگاں ہی گئے سب سوالات بھی اور سارے جوابات تشنہ رہے
بد نما منظروں میں گرفتار ہے اس خرابے میں دل میرا بیزار ہے
کیسے دیکھوں میں جلتی ہوئی بستیاں، کیسے دیکھوں میں انسان مرتے ہوئے
سب سے احوال اپنا چھپاتی رہی، درد اوڑھے ہوئے مسکراتی رہی
ایک دن جب بہت مضطرب ہوگئی میں نے سب اپنے دکھ اپنی ماں سے کہے
یاد ہے مجھ سے تم منہ کو موڑ آئے تھے، مجھ کو تنہا کہیں جا کے چھوڑ آئے تھے
میرے پیروں میں تھیں وقت کی بیڑیاں، میرے چاروں طرف خوف کے دائرے
خاک میں ایک چہرہ ملا آئی ہوں، قبر پر ایک کتبہ لگا آئی ہوں
دفن کر آئی ہوں اپنی آنکھیں وہاں، ہاتھ رکھ آئی ہوں پتھروں کے تلے
اب کوئی بھی نہیں اور یوں بھی اگر، مجھ کو کچھ بھی نہیں آ رہا ہے نظر
میں نے دیکھا کہ بس صرف تم ہو وہاں، جس طرف میرے دل کے دریچے کھلے

باقی احمد پوری

آندھیوں سے نہ ڈر' چراغ جلا
جا رہا ہے کدھر' چراغ جلا
غیر کی فکر بعد میں کرنا
پہلے تو اپنے گھر چراغ جلا
آج تو چاند بھی نہیں نکلا
آج تو ہم سفر چراغ جلا
ساری دنیا میں روشنی بھر دے
اس نگر' اس نگر چراغ جلا
اشک پلکوں تلک تو آنے دے
اے مری چشم تر چراغ جلا
ظالموں کو یہی تو ڈر ہے کہ لوگ
دیکھ لیں گے اگر چراغ جلا
اب تو بجھنے کا وقت ہے باقی
رات بھر اس قدر چراغ جلا

کسی طرح یہ ستارے بہم نہیں ہوں گے
اگر ہوئے بھی تو سارے بہم نہیں ہوں گے
بہت ہیں یوں تو زمانے میں غمگسار اپنے
پڑا جو وقت سہارے بہم نہیں ہوں گے
سمندروں میں گریں گے تو چین آئے گا
کہ اس سے پہلے کنارے بہم نہیں ہوں گے
ستم گروں کا ہے آپس میں اتفاق بہت
مگر یہ درد کے مارے بہم نہیں ہوں گے
ہوا کا کام یہی ہے ہوا سے کیا الجھیں
جو اڑ گئی وہ غبارے بہم نہیں ہوں گے
کوئی نہ کوئی ہمیں روز چھوڑ جاتا ہے
جو لوگ ہم کو تھے پیارے بہم نہیں ہوں گے
الگ الگ ہیں مقدر' جدا جدا قسمت
کبھی یہ بخت ہمارے بہم نہیں ہوں گے
کتابِ حال کو پڑھ لو تو ٹھیک ہے باقی
گئے دنوں کے شمارے بہم نہیں ہوں گے

نسیمِ سحر

تعمیرِ نو کی تب کہیں بُنیاد ہووے گا
پہلے یہ شہر اَور بھی برباد ہووے گا
لائے گا میرے نام جو مژدہ رہائی کا
وہ اِک نئی قبیل کا صیاد ہووے گا
انکار کی مجال کہاں، تاب ہی کہاں !
تعمیل ہی کروں گا، جو اِرشاد ہووے گا
بے فِکر ہوں، وہ یاد دِلا دے گا سب مُجھے
بھُولا ہوُا ہوں مَیں جو، اُسے یاد ہووے گا
دُہرا رہے ہیں اپنا ہی آموختہ ابھی
کب جانے ہم کو اپنا سبق یاد ہووے گا
جو تیرے ساتھ ساتھ رہا ہے نفَس نفَس
مَیں ہی تو تھا، یا پھر مِرا ہمزاد ہووے گا
جو رحم کی اپیل کا کرتا ہے فیصلہ
شائد گئے جنم میں وہ جلّاد ہووے گا
کیا حشر ناقدین کریں گے ترا نسیم
اپنی جگہ پہ چاہے تُو اُستاد ہووے گا

یہ ابتدائے عشق ہے یا انتہائے عشق !
وحشت میں چاک کرنے لگا ہوں قبائے عشق
دونوں ہی مرحلوں کا نتیجہ ہے ایک سا
مَیں عشق میں سماؤں کہ مُجھ میں سمائے عشق
رُتبے میں کم نہیں وُہ کسی شہنشاہ سے
اُن ﷺ کی گلی میں جا کے ہوُا جو گدائے عشق
باقی تھے جتنے کام، ضرورت کے تحت تھے
پیشِ نظر مِرے تھے فقط کار ہائے عشق
جو بھی عطا ہو عشق زدوں کو، قبول ہے !
عبرت سرائے دہر، کہ حیرت سرائے عشق
یہ انکشاف مجھ پہ بڑی دیر سے ہوُا
مَیں تو ازل سے قبل بھی تھا مُبتلائے عشق
اب تک جلا رہا تھا مجھے تیز دھوپ میں
لے کر چلا ہے آج مُجھے سائے سائے عشق
حیرت سے دیکھتا ہے مِری جاں سپردگی
شمشیر لے کے میرے مقابل جب آئے عشق
میرے قدم جہاں پہ بھی پڑتے گئے نسیم
ہر گام پر ہیں ثبت وہاں نقشِ پائے عشق

ممتاز اطہر

یہ جو اک حیرت سرا موجود ہے
خواب ہی کا سلسلہ موجود ہے
اپنے ہونے کا کریں کیونکر گماں
جو بھی ہے،وہ بھی تو ناموجود ہے
اس تعلق کو بھلا کیا نام دیں
قربتوں میں فاصلہ موجود ہے
خشک پتوں میں بھری ہیں آہٹیں
اور ہوا کا نقشِ پا موجود ہے
آنکھوں سے بیریاں تو کٹ گئیں
پھر بھی چڑیوں کی صدا موجود ہے
اک مکاں تھا ، دیر گزری ڈھے چکا
اک دریچہ اور دیا موجود ہے
دھیان سے اس خاک داں میں دیکھئے
جو بھی ہے موجود ، کیا موجود ہے ؟
اس کو اطہر پھر سے ڈھونڈیں دہر میں
جس کا سنتے ہیں ، سدا موجود ہے

زندگی کے گمان کا کریں کیا؟
ان کہی داستان کا کریں کیا؟
دل کو تم ہی مکاں بنائے رہے
اب اجڑتے مکان کا کریں کیا؟
پھر ہمیں کھینچتا ہے تیری طرف
اس دلِ خوش گمان کا کریں کیا؟
ایک بھی نقش پا نہیں رہا ہے
اب ہوا کے نشان کا کریں کیا؟
اپنے ترکش میں کوئی تیر نہیں
اور خالی کمان کا کریں کیا؟
آسماں تو ابھی کھلا نہیں ہے
ہم پرندے ، اڑان کا کریں کیا؟

انوارفطرت

بونوں کے درمیاں میں کسی پر نہیں کھلا
قد کے سوا مرا کوئی جوہر نہیں کھلا
آنکھوں پہ حیرتوں کی چقیں ہیں تنی ہوئی
کھل کر ابھی حجابِ سراسر نہیں کھلا
مصلوب کر! کہ مجھ پہ بھی کچھ انکشاف ہو
مجھ پر ابھی حیات کا مصدر نہیں کھلا
اندر کسی کٹاؤ کا اِک سلسلہ سا ہے
لیکن کہاں ہے رَو میں سمندر نہیں کھلا
تیروں کی باڑ پر ہوں بس اتنا ہی علم ہے
کس سمت ہے غنیم کا لشکر نہیں کھلا
ہر شخص اپنے خوف کی مٹھی میں بند ہے
کوئی دریچہ شہر کے اندر نہیں کھلا

انوارفطرت

میں رات اس کی نیند کے آثار میں رہا
خوابِ عجیب دیدۂ بیدار میں رہا
ہر بھید بے لباس کیا میں قمر زدہ
عالم تمام شب مرے آزار میں رہا
اِک ہول تھا کہ رات کے بازو کھلے ہوئے
میں اِک دیا سا طاقِ ہوادار میں رہا
اِک منظرِ دواں تھا کہ آتا نہ تھا نظر
زنجیر کوئی دشت ِ نمودار میں رہا
سایہ تھا میں کسی بدنِ تاب دار کا
اس پار کا رُکا ہوا اس پار میں رہا
سارا سریرِ سن سا تھا، سانسیں اسیر سی
میں سرسراتے سانپ کے اسرار میں رہا
اِک پل رہا میں اس کے طلسمی بیان میں
اِک حرفِ خشک عرصہء نم دار میں رہا
سب لین دین یوں مرا بے کار میں رہا
میں ساری عمر خواب کے بازار میں رہا

منظر بھوپالی

صبر تو دیکھو آنکھ میں دریا رکھا ہے
پھر بھی ہم نے خود کو پیاسا رکھا ہے
کہتا ہے اس پار سے کوئی آئے گا
بیچ میں لیکن آگ کا دریا رکھا ہے
ہم کانٹوں پر چل کر منزل پائیں گے
نظروں میں وہ پھول سا چہرہ رکھا ہے
کس بستی میں کیا کیا کام دکھائے گی
اُس نے ہوا کو سب کچھ سمجھا رکھا ہے
عظمت اور بزرگی اُس نے پائی ہے
جس نے بھی کردار پہ پہرا رکھا ہے
ساری سزائیں نام ہمارے لکھ دی ہیں
اُس کے سامنے جب آئینہ رکھا ہے
انسانوں سے پیار ہمارا مسلک ہے
ہم نے سب سے درد کا رشتہ رکھا ہے
ہم نے بچا کر منظؔر اس پیشانی پر
اُس کے لیے اِک آخری سجدہ رکھا ہے

صدا دیتی ہے خوشبو، چاند تارے بول پڑتے ہیں
نظر جیسی نظر ہو تو نظارے بول پڑتے ہیں
تمہاری خوش لباسی سے فضا رنگین ہوتی ہے
تمہارے جسم پر تو رنگ سارے بول پڑتے ہیں
مہک جاتے ہیں گل جیسے صبا کے چوم لینے سے
اگر لہریں مخاطب ہوں کنارے بول پڑتے ہیں
زباں سے بات کرنے میں جہاں رُسوائی ہوتی ہے
وہاں خاموش آنکھوں کے اشارے بول پڑتے ہیں
چھپانا چاہتے ہیں ان سے دل کا حال ہم لیکن
ہمارے آنسوؤں میں غم ہمارے بول پڑتے ہیں
تری پابندیوں سے رُک نہیں سکتیں یہ فریادیں
اگر ہم چپ رہیں تو زخم سارے بول پڑتے ہیں

جاوید احمد

رازِ حیات ہے یہی تو پھر اسی ادا میں رہ
دل میں فضائے عشق رکھ روئے خرد فزا میں رہ

موجِ صدائے نو بہ نو گنبدِ قلب و جاں میں رکھ
حرف کی جستجو لیے بندشِ دلربا میں رہ

نکلا ہے کس قطار سے پھرتا ہے بے زمان کیوں
جبلِ وفا سے دل کو باندھ عشق گرہ کشا میں رہ

رد و قبول سے وراء دستکِ سدرۂ سخن
معنیٔ بیکراں میں جا نقطہ ء نارسا میں رہ

سطوتِ منہدم کا نقش دل سے ابھی مٹا نہیں
اے مرے طبلِ آرزو نوبتِ بے صدا میں رہ

تو ہے گرفتِ خاک میں تیرا نصیب خاکداں
مٹی مہر و مہ اُٹھا خاکِ فلک نما میں رہ

دل کے چمن میں نغمہ ریز طائرِ نخلِ آئندہ
شانِ نمودِ تاکِ نو میرے سخن صبا میں رہ

راہِ وفا قدم قدم سازشِ دُشمنِ وفا
دِل کو ابھی مٹا کے چل گردِ رہِ وفا میں رہ

سامنے دلبروں کے ہے گوہرِ مُدعا زبوں
دل کو سمیٹ اشک میں گریہ ء بے صدا میں رہ

عالمِ قدس میں کہاں طرز و طریقِ دلبری
رُوحِ بریں صفات ابھی اور بدن سرا میں رہ

اس دلِ تشنہ کام پر آتا رہے سخنِ سحاب
نشہء نشور و ارتقا میرے نم و نشا میں رہ

وفا چشتی

ایسا کیا ہے سحر نہیں آتی
جھانکتی ہے ' مگر نہیں آتی

سیڑھیاں چڑھ رہی ہے صدیوں سے
زندگی بام پر نہیں آتی

برق رفتار شہسواروں کے
ساتھ گرد سفر نہیں آتی

بے فنا صفحۂ وجود کی دھوپ
روزنِ جاں سے در نہیں آتی

زیست وہ صورتِ عدم ہے کہ جو
ہر کسی کو نظر نہیں آتی

روشنی کیا عجب تماشا ہے
تیرہ بختوں کے گھر نہیں آتی

جانے کیا بات ہے 'مری آواز
دور سے لوٹ کر نہیں آتی

عجز ' وہ شہرِ نور ہے کہ جہاں
کوئی ظلمت زبر نہیں آتی

دانہ و دام کے اسیروں میں
شوکتِ بال و پر نہیں آتی

دشتِ امکان کے دھندلکوں سے
کل کی کوئی خبر نہیں آتی

ذات کی آگہی وفا چشتی
بے غمِ ذات بر نہیں آتی

اختر شمار

بیٹھے تری دہلیز پہ جانے کے نہیں ہم
پتھر سے ہیں بھاری کہ اٹھانے کے نہیں ہم
ہم تلخیِ حالات کی تصویر بھیانک
افسوس! ترے گھر میں سجانے کے نہیں ہم
ہم شغل میں شعلوں کے جو مصروف بہُت تھے
اب آگ لگی ایسی بجھانے کے نہیں ہم
پلکوں پہ نہ لانا ہمیں اے چشمِ محبت!
رکھ دِل میں کہ اوروں کو دکھانے کے نہیں ہم
مت چھوڑنا دُنیا کے ہمیں رحم و کرم پر
ہیں تیرے طرفدار زمانے کہ نہیں ہم

چھپ جاتے ہیں جورات کی رانی میں کہیں ہم
ملتے بھی تو ہیں صبحِ سہانی میں کہیں ہم
سینے سے لگا رکھی ہے اِک عمر کی ہجرت
مر جائیں نہ اس نقل مکانی میں کہیں ہم
یہ دِل کا غُبار اور پھر آنکھوں کی زُبانی
بہہ جائیں نہ اشکوں کی روانی میں کہیں ہم
ہم خاک بسر خاک سے پہلے بھی کہیں تھے
تھے آگ ہَوا اور نہ پانی میں کہیں ہم
محور ہیں ہمی ہر کس و کردار میں لیکن
موجود نہیں اپنی کہانی میں کہیں ہم
نایاب ہیں جس وقت سے ہم دھڑکا لگا ہے
ستے میں نہ بک جائیں، گرانی میں کہیں ہم
دِل جھاڑ ذرا اور ہمیں ڈھونڈنے والے
ہوں گے کسی تصویرِ پُرانی میں کہیں ہم
ہر سمت شمار آئیں نظر غور سے دیکھو!
بکھرے ہوئے ہر ایک نشانی میں کہیں ہم

حسن عباس رضا

شہرِ نا مہرباں سے نکلوں گا
یوں میں تیری اماں سے نکلوں گا

لینے آئے گا خود مکاں مجھ کو
جب بھی میں لامکاں سے نکلوں گا

ساتھ ہو گا ہجومِ دل زدگاں
جس گھڑی خاکداں سے نکلوں گا

فتح کر لوں گا جب میں عشق آباد
تب میں تنہا وہاں سے نکلوں گا

پہلے تیرا ہدف بنوں گا میں
پھر میں تیری کماں سے نکلوں گا

مل نہ پائے گا پھر سرا تجھ کو
یوں تری داستاں سے نکلوں گا

جنتری دیکھ کر بتاؤ کہ میں
کب حصارِ زیاں سے نکلوں گا

مار دے گا مرا یقین مجھے
جب میں تیرے گماں سے نکلوں گا

اسمِ اعظم کا ورد کرتے ہوئے
میں حسنؔ شہرِ جاں سے نکلوں گا

محبوب ظفر

خدا کا شکر ہے گرداب سے نکل آیا
میں اُس کے حلقۂ احباب سے نکل آیا

سجی ہوئی تھیں دکانیں منافقت کی جہاں
میں ایسے قریۂ بے خواب سے نکل آیا

بہت دنوں سے حصارِ طلسمِ خواب میں تھا
طلسم ٹوٹ گیا خواب سے نکل آیا

عطا ہوئی ہے محبت کی سلطنت جب سے
میں شہرِ دیدۂ خوں ناب سے نکل آیا

کبھی گلاب سے آنے لگی مہک اُس کی
کبھی وہ انجم و مہتاب سے نکل آیا

انا کی ناؤ جہاں ڈولتی پھرے محبوبؔ
میں اُس فریب کے سیلاب سے نکل آیا

اعتبار ساجد

ہم اپنے عہد کے، اپنے زمانے والے ہیں
ہمارے بعد بھی کچھ لوگ آنے والے ہیں
ہمی تھے چند، جنہیں دیمکوں نے ڈھونڈ لیا
سو، ہم بھی صحنِ گلستان سے جانے والے ہیں
چھٹے گی بھیڑ تو کھڑکی میں ہاتھ ڈالیں گے
کہاں قطار میں لگنے لگانے والے ہیں
سُنا ہے روز نیا پیرہن بدلتا ہے
مگر مزاج تو اس کے پُرانے والے ہیں
ہمیں تو نسبتِ سادات روکتی آئی
رہی یہ شرم کہ ان کے گھرانے والے ہیں
ہمارا بازی گروں سے رہا ہے اِک ہی سوال
اب اور کون سا منظر دکھانے والے ہیں
غمِ حیات، تعاقب سے باز آ جائے
ہم اعتبار کہیں اور جانے والے ہیں

مکاں کو دیکھ کے ویران روتے رہتے ہیں
ہوئے جو بے سر و سامان روتے رہتے ہیں
تمہیں تو رنج نہیں شہر کے اُجڑنے کے
ہمی اکیلے مری جان روتے رہتے ہیں
بھٹک رہی ہے کہاں، فصلِ گل، اب آ بھی چکے
پرند باغ میں ہر آن روتے رہتے ہیں
یہ کاغذات کہیں دیمکیں نہ کھا جائیں
گھروں میں صاحبِ دیوان روتے رہتے ہیں
پلٹ سکیں تو پلٹ آئیں، رفتگاں سے کہو
کہ ان کے سوگ میں دالان روتے رہتے ہیں
سُنا کہ اب انہیں آتے ہی یاد ہم، پیہم
ہمارے زُود پشیمان روتے رہتے ہیں
سُنا ہے روئے تھے جس دن جنم لیا ہم نے
اِس عمر میں بھی مری جان روتے رہتے ہیں

سعود عثمانی

زرد ، شہابی ، عنبری ، برگِ خزاں بکھر گئے
اشک بہائے پیڑ نے ، روح سے بوجھ اتر گئے

ایک ہی شب میں کٹ گئی ، خواب کی اصل زندگی
آنکھ لگی تو جی اُٹھے ، جاگ گئے تو مر گئے

مسکنِ بے پناہ میں ، عشق کی خانقاہ میں
درد فروش کیا ہوئے ، دل زدگاں کدھر گئے

آتشِ غم میں تھے رواں ، کارِ جہاں و کارِ جاں
نقش میں رنگ کیا میاں ، رنگ میں نقش بھر گئے

باغ تھا اور ہمیشگی ، ہم نے ادھر نگہ نہ کی
ایک درخت منع تھا اس لیے ہم ادھر گئے

نکالتے رہے یہ لوگ خامیاں مجھ میں
اور اس کے بعد بچیں صرف خوبیاں مجھ میں

سنا نہیں تھا کہ پت جھڑ بھی سبز ہوتی ہو
مگر یہ پھول کھلا اور ناگہاں مجھ میں

طلوع ہوتا ہے سورج غروب ہوتے ہوئے
یہ رات جلنے لگی ہے یہاں وہاں مجھ میں

میں ایک عمر تلک جس مکاں میں رہتا رہا
اب ایک عمر سے رہتا ہے وہ مکاں مجھ میں

سفر سے آتا ہوا بکریاں چراتا ہوا
سعود کوئی گڈریا ہے نغمہ خواں مجھ میں

ریحانہ روحی

اپنی خبر ملے تو کوئی بات ہم کریں
پھر اس کے بعد خود سے ملاقات ہم کریں

اس کو ہماری شربتی آنکھیں پسند ہیں
اب اور اس پہ کتنی عنایات ہم کریں

اس شہر میں ہے سب کو یہ دھڑکا لگا ہوا
دن خیر سے گزر چکے تو رات ہم کریں

جو فیصلے سے قبل سناتے ہیں فیصلہ
تبدیل ان کے کیسے خیالات ہم کریں

جتنا شدید وار مرے دوست نے کیا
ممکن نہیں کہ ایسی کوئی گھات ہم کریں

تنہائیوں کی کوئی تو حد ہونی چاہیے
کب تک کہ روحیؔ نفیِ جذبات ہم کریں

سوچنا ہے جاگنا ہے شاعری ہے عشق ہے
بس یہی کُل ماجرا ہے شاعری ہے عشق ہے

ہم بہت آگے نکل آئے ہیں وصل و ہجر سے
اب تو بس اک سلسلہ ہے شاعری ہے عشق ہے

سب کو خوش رکھنے کی کوشش میں اکیلے رہ گئے
بس یہی اپنی خطا ہے شاعری ہے عشق ہے

مُڑ کے دیکھا تو وہیں پتھر کے ہو جائیں گے ہم
پھر بھی مڑ کر دیکھنا ہے شاعری ہے عشق ہے

اِک طرف دیوانِ غالبؔ اک طرف دیوانِ میرؔ
بیچ میں دل مبتلا ہے شاعری ہے عشق ہے

عمر ساری دوسروں پر خرچ ہو جانے کے بعد
روحیؔ اب جو کچھ بچا ہے شاعری ہے عشق ہے

افضال نوید

مکاں اکیلا رہا عمر بھر نہیں آیا
بنا تھا جس کے لیے اپنے گھر نہیں آیا
دھوئیں سے جنگ کے خود میں شجر نہیں آیا
پپیہا بولا نہیں اور ثمر نہیں آیا
مغالطہ ہی رہا آنکھ سے حقیقت تک
مجھے تلاش نہیں تھی نظر نہیں آیا
چمن تھا جامۂ عطّارِ بے خودِ اشجار
جو پھڑپھڑاتا رہا شاخ پر نہیں آیا
بحور سے مری تفصیل اُٹھتی رہتی ہے
مَیں منسلک ہُوں کوئی مختصر نہیں آیا
اٹھا کے چلنا سرِ آگہی غنیمت ہے
کہ یہ بھی سہرا کسی اور سر نہیں آیا
ابھی تو رونقِ اثبات سے فروزاں ہُوں
ابھی تو رخنۂ شام و سحر نہیں آیا
چلا گیا وہ مجھے ڈھونڈتا ہُوا شاید
جدھر مَیں آیا ہُوا تھا اُدھر نہیں آیا
گیا ہوا تھا بتقریبِ محفلِ مہتاب
وہاں سے نکلا نہ جب تک نکھر نہیں آیا
بچھی ہُوئی ہے نوید اندرُوں میں دھوپ اُس کی
نہیں کہ سایۂ دیوار و در نہیں آیا

سیکھے بغیر ہم جو سکھانے میں لگ گئے
جلتے ہوئے چراغ بجھانے میں لگ گئے
اپنے لہو کی بوند بھی ہم پر نہ کُھل سکی
ہم دوسروں کا خون بہانے میں لگ گئے
میں دیکھتا ہی رہ گیا افلاک کی طرف
آئینے میرے آئینہ خانے میں لگ گئے
گھومی ہوئی زمین ملی ہم کو اور ہم
آئے اور اس کو اور گھمانے میں لگ گئے
میں جس میں سانس لے سکوں بس اپنا ایک سانس
افلاک میرا لمحہ بنانے میں لگ گئے
آئے تو تھے سمجھنے تگ و تازِ زندگی
ہنگامہ دیکھ پینے پلانے میں لگ گئے
پیوستِ وقت کر دیا ہر لختِ وجد کو
مجھ پر جو جسم و جان زمانے میں لگ گئے
آواز کوئی پڑتی رہی دور سے کہیں
کتنے مکان چھوڑ کے جانے میں لگ گئے
بھڑکا خلا چراغ سا پروانہ گیری سے
انجم خمیرِ ذات اٹھانے میں لگ گئے
معنی سے اور معنی نکلتے رہے جو ہم
لکھنے کے ساتھ ساتھ مٹانے میں لگ گئے
تاخیر سے وہ آئے تو آنے کے ساتھ ہی
تاخیر کا جواز بتانے میں لگ گئے
اُس کی گلی پہ کاہکشاں آ کے جھک گئی
ہم بھی نوید سر کو جھکانے میں لگ گئے

غضنفر ہاشمی

کچھ اس طرح ہو، حرف کی لَو میں کمی نہ ہو
ایسی غزل کہوں جو کسی نے کہی نہ ہو
دنیا میں ساتھ چلنے کو تیار ہوں مگر
اِک شرط ہے کہ تجھ سے مری دوستی نہ ہو
آتی نہیں ہے راس مسلسل کوئی خوشی
ایسا ہو، وصلِ یار ہو اور دائمی نہ ہو
لاحق ہو ہجر ایسا کہ خود بھی ہوں بے خبر
آنکھوں میں درد ہو تو ہو لیکن نمی نہ ہو
اِک شام صحنِ چشم میں آ کر رُکی رہے
اِک یاد کنجِ شب میں اُتر کر گئی نہ ہو
تا عمر خاک چھانتے رہیے اور اس کے بعد
اِک شہرِ آرزو ہو اور اُس میں وہی نہ ہو
سوچوں تو ہر زمانہ لگے میرا ہم نفس
دیکھوں تو میری دنیا ابھی تک بنی نہ ہو
تُو مجھ کو اختیار نہیں دے رہا، نہ دے
لیکن یہ آرزو ہے فقط بے بسی نہ ہو

نعمان شوق

دار و مدار سارا کہانی پہ رکھ لیا
پھر مجھ کو اس نے زورِ بیانی پہ رکھ لیا
خوش میں ہوں اور وہ ہے پریشان ہجر میں
کس مسخرے کو مرثیہ خوانی پہ رکھ لیا
پہلے تو اس کے ہونٹوں پہ ٹھہری رہی نگاہ
پھر دھیان سارا مطلعِ ثانی پہ رکھ لیا
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کرتا تھا بات سو
آتش کدہ سنبھال کے پانی پہ رکھ لیا
اس میں مروّتیں تھی محبت بھلے نہ ہو
میرا خیال ایک نشانی پہ رکھ لیا

نصرت مسعود

رات نہ جانے اہلِ چمن پہ سانحہ کیا گزرا
میں نے دیکھا ہر پتے کی آنکھ میں آنسو تھا
ہوا کے ساتھ سفر کی ضد نے رُکنے نہیں دیا
پھول کا ہاتھ چھڑا کر خوشبو چلی گئی تنہا
وقت نے اپنا جال بچھا کر، پھر اِک چال چلی
دلِ نادان ہمیشہ جیسا، جال میں آن پھنسا!
پہلی بوند نے موج اُبھاری ٹھہرے پانی پر
شور اُٹھا اور سب نے دیکھا منظر بدل گیا
جانے ہم کس بات پہ اُلجھے اور پھر رُوٹھ گئے
میں نے بھی آواز نہیں دی وہ بھی نہیں ٹھہرا
اِک ٹیلے پر سوئے ہوئے گھر اور سُوکھے پتے
شام اکیلی اور اٹکھیلی کرتی ہوئی ہوا
خواب کی آنکھ میں چند اشارے غیر مکمل ہے!
رات کے دل میں ہول اُٹھاتی اِک بے چین صدا

تری ہنسی میں کھنکتے حسین شام کے رنگ
کشید کرنے ہیں ان سے مجھے کلام کے رنگ
نظر میں رنجش رفتہ کی لَو لرزتی ہوئی
بتا گئے ہیں کبھی کچھ ترے سلام کے رنگ
کہاں کہاں نہیں پایا نشانِ حُسنِ ازل
کہاں کہاں نہ ملے حُسنِ انتظام کے رنگ
چھڑک گئی تھی صبا پتّیوں پہ تیرا خیال
گلوں سے میں نے چُنے آج تیرے نام کے رنگ
وہی قدم بہ قدم خوشبوؤں کا پیراہن
چلی چُرا کے صبا میرے خوش خرام کے رنگ
گلاب ہو کہ دھنک، چاند ہو کہ تارے ہوں
تمہارے سامنے پھیکے ہیں ان تمام کے رنگ
جو تم نہیں تو مجھے سیرِ گل سے کیا لینا
نہ خوشبوؤں کی ضرورت نہ میرے کام کے رنگ

محمد ندیم بھابھہ

ہمارے حافظے بے کار ہو گئے صاحب
جواب اور بھی دُشوار ہو گئے صاحب
اسے بھی شوق تھا تصویر میں اترنے کا
تو ہم بھی شوق سے دیوار ہو گئے صاحب
ہم ایسے خواب میں چیخے کہ جاگ اُٹھا کمرہ
اور ایسے روئے کہ بیدار ہو گئے صاحب
ترے لباس کے رنگوں میں کھو گئی فطرت
یہ پھول شول تو بے کار ہو گئے صاحب
ہماری رُوح پرندوں کو سونپ دی جائے
کہ ہم بدن کے گنہ گار ہو گئے صاحب
اب اپنے آپ کو ہی کاٹنا پڑے گا ہمیں
ہمارے ہاتھ جو تلوار ہو گئے صاحب
نظر ملائی تو اِک آگ نے لپیٹ لیا
بدن جلائے تو گلزار ہو گئے صاحب
نہ آگ کھینچتی ہے اور نہ پھول چاہیے ہیں
کہ ہم تو عشق سے بے زار ہو گئے صاحب
ہمارے دُکھ پہ کوئی شخص رونے والا نہیں
سو آپ اپنے عزادار ہو گئے صاحب
کسی نے دفن کیے تھے چراغ قبروں میں
ندیمؔ چاندنمودار ہو گئے صاحب

خرد برائے جہاں اور دل برائے عشق
اذاں کے ساتھ ہمیں دی گئی صدائے عشق
تجھے جلانا نہیں اور تجھ میں جلنا نہیں
کہ دیکھنا ہے تجھے ہو کے ماورائے عشق
ہمارا کعبہ و قبلہ ہے خوش خرامئ دوست
نمازِ دائمی قائم زمین جائے عشق
یہ واعظوں کے یا سجادگاں کے بس کا نہیں
خدا زمین پر آ کر ہمیں سکھائے عشق
خدا کرے کہ بلندی سے کوئی بھی نہ گرے
خدا کرے کہ کسی کو نہ آزمائے عشق
اِک ایسا مصرعہء تر ہو کہ جس سے خوں ٹپکے
اِک ایسا شعر جسے دل سے گنگنائے عشق
کچھ ایسا ہو کہ اسے چھو کے مجھ کو آگ لگے
کچھ ایسا ہو کہ گلے سے مجھے لگائے عشق
ندیمؔ عشق میں لالچ ہے چاہنا ایسا
کہ ہم سے روشنی پھوٹے ہمیں جلائے عشق

یشب تمنا

عشق آزار تو نہیں ہے میاں
درد بے کار تو نہیں ہے میاں
تم سے کہنی تھی بات کہہ دی ہے
اُس پہ اصرار تو نہیں ہے میاں
عشق سے کیا حذر کہ ناکامی
باعثِ عار تو نہیں ہے میاں
اِک سرائے سمجھ کے رہتے ہیں
دنیا گھر بار تو نہیں ہے میاں
ہوسِ عشق کے مرض میں کہیں
تُو گرفتار تو نہیں ہے میاں
سچ کی تبلیغ ایسے موسم میں
تُو سرِ دار تو نہیں ہے میاں؟
اس قدر جی حضوریاں اس کی
دل ہے دربار تو نہیں ہے میاں

افضل گوہر

یہ کس کے نقشِ پا کا ایسا سلسلہ چراغ تھا
مجھے لگا کے جیسے سارا راستہ چراغ تھا
ذرا سی دیر میں ہی خدوخالِ شب بدل گئے
نہ شکل کوئی چاند تھی نہ آئنہ چراغ تھا
سوال یہ ہے روشنی وہاں پہ روک دی گئی
جہاں پہ ہر کسی کے ہاتھ میں نیا چراغ تھا
بہت سے ہاتھ صبح کی دعا ہی کرتے رہ گئے
میں پُر امید تھا کہ میرا حوصلہ چراغ تھا
کہیں کہیں سے جھڑ رہی تھی بھربھری سی روشنی
ہوائے شب کے غم میں کیسا مبتلا چراغ تھا
ذرا سی کیا ہوا چلی کہ لوگ سٹپٹا گئے
وہی گنوا دیا گیا جو رات کا چراغ تھا

شہناز مزمل

عشق کی دیکھی جلوہ آرائی
میں تماشا ہوں وہ تماشائی
چھید سینے میں اس کے ہے لیکن
گیت گاتی ہے پھر بھی شہنائی
رازداں ہے یہ میری ہمدم ہے
ضربِ وحشت یہ کربِ تنہائی
ایک پل بھی جو مجھ سے دُور نہیں
ڈھونڈنے اس کو کیوں چلی آئی
کیف نشہ ہے ایک مستی ہے
عشق کرنے میں کب ہے رُسوائی

ہمرہی کا ہنر نہیں آیا
لوٹ کر ہمسفر نہیں آیا
اپنے اندر کی بھیڑ میں گم تھی
کچھ بھی باہر نظر نہیں آیا
پا بجولاں چلی تھی ننگے سر
رہگزر میں شجر نہیں آیا
خستہ دیوار و در تنے جالے
کوئی بھی کیا ادھر نہیں آیا
نکلی باہر تو تھک کے ٹوٹ گئی
کوئی رستے میں گھر نہیں آیا
کیسا نشہ ہے کیف مستی ہے
وہ تو اندر اتر نہیں آیا

شہناز پروین سحر

خود بنا لیتی تھی میں تو اپنی سب گڑیوں کے گھر
مجھ سے۔۔ میرا ہی گھروندا۔۔۔ بن نہ پایا عمر بھر
سانس کی حدت سے رخ کی چاندنی سنولا گئی
سانپ کی۔۔ پھنکار سی ہے۔۔ زندگی کی رہگزر
زندگی کو یوں۔۔ ہوائیں تھام کر۔۔۔ چلنا پڑا
باندھ کر آنکھیں چلے رسی پہ جیسے بازیگر
کانچ کا ناطہ چیخ جانے سے پہلے توڑ دے
اس ابھرتے نقشِ منفی کو۔۔۔ مٹا دے نقش گر
خاک سے میرا وجود، خاک پر میرے تجود
زندگی لکھی ہوئی ہے خاک کے اوراق پر
آنسوؤں کی سرد شبنم۔۔۔۔ تا سحر گرتی رہی
لوٹتے قدموں سی چاپ آتی رہی ہے رات بھر
کس قدر۔۔ آسودگی سے۔۔ آ گئی۔۔ اتنی دراڑ
تو بھی مجھ سے بے خبر اور میں بھی تجھ سے بے خبر
دل کے شیشے پر نہیں ہے اب کسی خواہش کی دھول
بے سبب۔۔ مکڑی نے۔۔ جالا بن دیا۔۔ دیوار پر
تم نے تو لوہے کے پیڑوں پر کھلے دیکھے تھے پھول
تم سے کیوں اک موم کا پتھر نہیں پگھلا سحر

حجاب عباسی

میں آنکھوں سے درو دیوار پر منظر بناتی ہوں
کبھی پاؤں، کبھی صحرا، کبھی اک گھر بناتی ہوں
بنانا خوش بہت آتا ہے مجھ کو ہجر لمحوں کا
کبھی تو بھول جاتی ہوں کبھی اکثر بناتی ہوں
چیخ جائے نہ آنکھوں کی تپش سے خواب کی دنیا
میں چشم نم کے سائے میں ترا پیکر بناتی ہوں
دھنک رنگوں سے پھر آراستہ کر کے ترا پیکر
کبھی آنکھوں، کبھی دل کی جگہ پتھر بناتی ہوں
میں اپنے درد کا درماں کیا کرتی ہوں یوں اکثر
بنا کے سنگِ در اپنا کسی کا سر بناتی ہوں
بڑھا دیتا ہے قامت روز وہ دیوارِ زنداں کی
میں کشفِ ذات سے جب بھی کہیں اک در بناتی ہوں
نبھاتی ہوں میں اس انداز سے رسمِ زباں بندی
بناتی ہوں قفس کاغذ پہ پھر کچھ پر بناتی ہوں
کسی پر کیوں کھلے رودادِ دردِ دل حجاب اپنی
سو ہونٹوں پر ہنسی کے ساتھ چشمِ تر بناتی ہوں

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد

چار سو جشنِ افتخارِ خاک
ہے محیطِ مکاں ، غبارِ خاک
تجھ سے قائم نگار خانۂ ہست
شاد و آباد اے دیارِ خاک
محفلِ کُن کی ہا و ہُو تجھ سے
چشمِ بد دُور ، اے نگارِ خاک
نقشِ کوزہ گراں ہوئے معدوم
ہاں! سلامت ہے اعتبارِ خاک
چار اطراف حیرتی اس کے
ہے مگر کون رازدارِ خاک
ہر چمن زار غیرتِ ارژنگ
دیدنی ہے بہت بہارِ خاک
ہفت افلاک اس کے حلقہ بہ گوش
دیکھو! کیا کیا ہے اختیارِ خاک

ارشد ملک

آج بختِ رسا نے حد کر دی
یعنی تیری عطا نے حد کر دی
تیری خوشبو اُڑا کے لے آئی
آج بادِ صبا نے حد کر دی
دشت میں آ گیا سمندر آج
ایک پیاسی صدا نے حد کر دی
تاسحر رقص میں رہا وہ بھی
رات اِک پارسا نے حد کر دی
ہم نے اِک بات کی جدائی کی
اور اُس بے وفا نے حد کر دی
سب ستارے بھی ہو گئے مدھم
آج اُس کی ضیاء نے حد کر دی
فرش سے عرش کر دیا ارشدؔ
اُس جمالِ ورا نے حد کر دی

صغریٰ صدف

کیا ضروری ہے کہ ہر بات اُچھالی جائے
خامشی سے کوئی حسرت تو چھپا لی جائے

ایک دُنیا جو محبت کی زباں کاٹتی ہے
چھوڑ کر اُس کو نئی دُنیا بسا لی جائے

کوئی منظر کسی کاغذ پہ سجا کر اِک روز
زندگی کرنے کی اِک راہ نکالی جائے

ایک مصرعے کو تراشیں کبھی ہم تم دونوں
اِک غزل سانس کی سرگم سے اُٹھا لی جائے

دُکھ کی آغوش میں دُبکے ہوئے افسانے کی
زندگی ایک نئی طرز میں ڈھالی جائے

ایک دیوانگی میں ڈھال کے پیکر اپنا
حُسنِ جذبات کی توقیر سنبھالی جائے

چاند بھی دیکھتا رہتا ہے جسے حیرت سے
اپنی آنکھوں میں وہ تصویر سجا لی جائے

اپنے خوابوں میں صدفؔ روز ہی میں سوچتی ہوں
اِسی وادی میں کوئی بستی بنا لی جائے

آنکھوں میں ایک خواب سی صورت اتار کر
کہتا ہے کوئی دشتِ تمنا کو پار کر

کل شام مُجھ کو پگلی ہوا چومتی رہی
خوشبو ترے وجود کی دل میں اتار کر

میں نے کہا کہ دید کو مدت گزر گئی
آئی صدائے شوق ابھی انتظار کر

دل ہے کسی جمال کی مستی میں دم بخود
اے دوست اسے شاملِ رقصِ بہار کر

وہ کم سخن جو دل کی گرہیں کھولتا نہیں
خود پر نہ اس کی یاد کو اتنا سوار کر

کیوں رولتی ہے یاد کی تسبیح صبح و شام
اب کیا ملے گا روگ پرانے شمار کر

میں بُوند بُوند ترے تصرف میں آئی ہوں
اے عشقِ بے پناہ! مجھے آبشار کر

یہ عمر کٹ نہ جائے سوال و جواب میں
اے صاحبِ گمان مرا اعتبار کر

میں کوچۂ بے نام میں پھرتی ہوں در بدر
مجھ کو لگا لے انگ مجھے باوقار کر

صغرا صدفؔ یہ ہجر تری جان لے گیا
اب شاعری میں دردِ ہُنر آشکار کر

احمد عطاء اللہ

روایتوں کے اجالوں میں رکھنے والا ہوں
غزل تجھے میں غزالوں میں رکھنے والا ہوں
یہ سانس لیتا، دھڑکتا، یہ میرے ہاتھ کا پھول
یہ پھول میں ترے بالوں میں رکھنے والا ہوں
ہوس کی لو جو مرے دل میں ٹمٹماتی ہے
چراغ وہ ترے گالوں میں رکھنے والا ہوں
جو زرد روسی ہے شہزادی جھیل ڈل کے پاس
اسے میں سرخ سی شالوں میں رکھنے والا ہوں
یہ عشق ، وشق کی لے کر رعایتیں واپس
میں حسن چبھتے سوالوں میں رکھنے والا ہوں
اسے میں ہجر کی دنیا سے چوری کر کے عطا
ابھی سے وصل کے تالوں میں رکھنے والا ہوں

اپنے سب مسائل کا عشق آخری حل ہے
میں بھی نا مکمل ہوں تو بھی نا مکمل ہے
شام سیر پر نکلو حسن زاد میرے ساتھ
میں تمہیں دکھاؤں گا جو جہان اوجھل ہے
اس نے اوڑھ رکھے ہیں گاؤں کے سبھی موسم
دھوپ جیسی لڑکی ہے جس کے سر پہ بادل ہے
گاؤں کے کنارے تک سب کی جان کو خطرہ
اس سے آگے سب اچھا اس سے آگے جنگل ہے
جنگ اور محبت میں اس لیے ہے سب جائز
کھل کے یہ بتا پائے کون کتنا پاگل ہے

اشرف سلیم

سب سے رشتہ ایک سا رکھتا ہوں میں
خود سے لیکن فاصلہ رکھتا ہوں میں

لے اڑوں گا تجھ کو اب سوئے فلک
ایک طوفانی ہوا رکھتا ہوں میں

ٹوٹنے دیتا نہیں میں دل کوئی
سامنے اک آئنہ رکھتا ہوں میں

مجھ کو جانا ہے پلٹ کر ایک دن
رفتگاں سے رابطہ رکھتا ہوں میں

دیکھتا ہوں دور تک جاتے ہوئے
کب تجھے دل سے جدا رکھتا ہوں میں

آج بھی اپنی رہی ہے جستجو
آج بھی دل گم شدہ رکھتا ہوں میں

کیوں ڈراتی ہے عذابِ ہجر سے
زندگی یہ تجربہ رکھتا ہوں میں

وقتِ رخصت مُڑ کے دیکھا تک نہیں
دیکھ کتنا حوصلہ رکھتا ہوں میں

ٹوٹ جاؤں یا سنبھل جاؤں سلیم
عشق کا پتھر نیا رکھتا ہوں میں

خرم منور

یوں بچھڑنے کا جو امکان نہیں تھا پہلے
شعر کہنا بھی تو آسان نہیں تھا پہلے

اب تو دیکھو جسے ملتا ہے اسی رستے پر
راستہ عشق کا آسان نہیں تھا پہلے

جس جگہ آتے ہو تم مجھ سے ملاقاتوں کو
اے مری جان یہ زندان نہیں تھا پہلے

تم تو پہلے بھی کئی بار ہوئے مجھ سے جدا
دل مگر اتنا پریشان نہیں تھا پہلے

یاد ہے زندگی بے جان ہوا کرتی تھی
جب وہ اک شخص تری جان نہیں تھا پہلے

آج تو ہنستے ہوئے اس نے مجھے دیکھا ہے
مجھ پہ اے دوست یہ احسان نہیں تھا پہلے

پرویز ساحر

کبھی ترا خیال آ گیا تو پھر
کہ پھر سے مجھ کو حال آ گیا تو پھر
ابھی تو بد گُماں نہیں ہے دل مِرا
جو آئنے میں بال آ گیا تو پھر
ابھی مَیں اُس کو سوچ کر نڈھال ہوں
وہ جانِ خوش جمال آ گیا تو پھر
ابھی تو خالی ہے یہ جیب دل مِری
کبھی زرِ ملال آ گیا تو پھر
ابھی تو صِرف آپ ہی ہیں مشتعل
مجھے بھی اِشتعال آ گیا تو پھر
اب اِس قدر بھی مت ستایئے مجھے
فقیر کو جلال آ گیا تو پھر
کمالِ بے کمالی کہتے ہیں جسے
مجھے بھی یہ کمال آ گیا تو پھر
کسی سے کچھ جواب بن پڑے گا کیا؟
جو لب پہ اک سوال آ گیا تو پھر
کریں گے کیا ہم اہلِ عشق اُس گھڑی
وہ زلزلہ مثال آ گیا تو پھر

ہے صُبح دُکھ اَور شام دُکھ ہے ' تمام دُکھ ہے
نصیبِ انساں مُدام دُکھ ہے ' تمام دُکھ ہے
مَیں قطرہ قطرہ ہی پی رہا ہُوں کہ جی رہا ہُوں
یہ زندگانی کا جام دُکھ ہے ' تمام دُکھ ہے
نہ سُن سکو گے مِری کہانی ' مِری زبانی
تمام دُکھ ہے ' تمام دُکھ ہے ' تمام دُکھ ہے
مَیں اپنے ہونے پہ کب سُکھی ہُوں بہت دُکھی ہُوں
نہ خاص دُکھ ہے ' نہ عام دُکھ ہے ' تمام دُکھ ہے
جو سچ کہوں تو یہ کارِ اُلفت ' ہے کارِ وَحشت
شرُوع دُکھ ' اِختتام دُکھ ہے ' تمام دُکھ ہے
اِسی لیے چُپ ہُوں مَیں مسلسل ' یہاں ہر اک پَل
کہ اِنتہائے کلام دُکھ ہے ' تمام دُکھ ہے
ہم اہلِ دِل پر یہ عُقدہ آخر ' کُھلا ہے ساحر !
یہاں پسِ ہر نظام دُکھ ہے ' تمام دُکھ ہے

راحت سرحدی

لفظ کلہاڑی بنے اور بات آری ہو گئی
مجھ سے کل بے ساختہ تخریب کاری ہو گئی

ہاتھ آخر آ گیا اپنے گریباں تک مرا
خود کلامی میں عجب وحشت سی طاری ہو گئی

اپنے گم ہونے کا خود اعلان کرنا پڑ گیا
آئنے سے شکل میری اشتہاری ہو گئی

ایسے منظر بھی دکھائے گردشِ خیالات نے
عقل جن سے دنگ اور بینائی عاری ہو گئی

پہلے دل ٹوٹا کسی آئنہ خانے کی طرح
پھر مری پلکوں سے خوں کی نہر جاری ہو گئی

خشک سالی سے لپٹا جسم بنجر ہو گیا
سنگ ان آنکھوں کی خوئے اشکباری ہو گئی

آسماں کو خاک کہتا ہے زمیں کو عرش تو
کیا تری راحت کسی پاگل سے یاری ہو گئی؟

مسندِ عرشِ عقیدت سے اتارے ہوئے لوگ
کم نہیں شہر میں حالات کے مارے ہوئے لوگ

اپنے انجام کو پہنچے سرِ منزل نہ سہی
ہم لگاتار سرابوں سے گزارے ہوئے لوگ

گفتگو کرتے سنا ہے کبھی آئینوں کو
تم نے کیا دیکھے ہیں اشکوں سے نکھارے ہوئے لوگ

کھیلتے کھیلتے پڑ جاتی ہیں چالیں الٹی
دیکھتے دیکھتے اٹھ جاتے ہیں ہارے ہوئے لوگ

پوچھتے خود نہ اگر لوٹ میں شامل ہوتے
کیسے اک رات میں ذروں سے ستارے ہوئے لوگ؟

صبح آئی تو نشاں بھی نہ ملے گا ان کا
روشنی تک ہیں یہ ظلمت کے ابھارے ہوئے لوگ

ہم زمیں بوس ہوئے جب تو یہ دیکھا راحتؔ
گر پڑے وہ بھی ہمیں جو تھے سہارے ہوئے لوگ

عابد سیال

ہزار طرح سے لے لے کے تیرا نام پھرے
ہوا ، جو شہر کی گلیوں میں بے لگام پھرے
سلیقہ مانگتی تھی اس گلی کی آمد و رفت
بہ التزام گئے ہم ، بہ اہتمام پھرے
لگے گا کیسے تماشائے شعر و شب گردی
اگر دماغ نہ اپنا بوقتِ شام پھرے
گرا دیے گئے تھے عشق و حسن و ناز کے بھاؤ
مگر ہم آئے تو جنسِ جنوں کے دام پھرے
ترے قدم پہ قدم رکھتی جائے فصلِ بہار
کہ جیسے شاہ کے پیچھے کوئی غلام پھرے
تمھارے شہر کی ان خوش مزاج گلیوں میں
جو ایک شب کے لیے آئے تھے ، مدام پھرے
اسے بھی ایک اچٹتی نظر کی فرصت تھی
سو ہم بھی پھینک کے اُڑتا ہوا سلام ، پھرے

جو میسر ہے یہاں ، اتنا بھی اُس پار نہ ہو!
ایسی جلدی میں اُدھر جانے کو تیار نہ ہو!
دیکھ سوداگریِ دنیا کہ کچھ دیر کے بعد
تُو طلب گارِ تماشا ہو تو بازار نہ ہو
پیچ پڑتا ہے ابھی ریت میں اور پاؤں میں
جس کنارے پہ لگا ہوں ، کہیں منجدھار نہ ہو
سرخیِ صبح سے سہائے گئے خواب اور اَب
آنکھ بیدار نہ ہو ، صبح نمودار نہ ہو
یہ عجب لوگ ہیں ، دیتے ہیں تو اتنی تکریم
کچھ کو منظور نہ ہو ، کچھ کو سزاوار نہ ہو
یوں اتاریں تجھے دل سے کہ ترے جانے کے بعد
آنکھ بوجھل نہ رہے ، دل پہ کوئی بار نہ ہو
ایک سے ایک یہاں حلقۂ زنجیرِ لطیف
پہلی ہی نرم کلائی کا گرفتار نہ ہو
چھوڑ رغبت کی اداکاری ، یہ ممکن ہی نہیں
طبعِ شاعر کی ہو ، موجود سے بیزار نہ ہو !

رحمان حفیظ

ہوئے ہجرت پہ مائل پھر مکیں آہستہ آہستہ
بہت سی خواہشیں دل سے گئیں آہستہ آہستہ

ہوا اس سانحے میں غیر جانبدار نکلی، سو
دھوئیں کی ایک دو موجیں اٹھیں آہستہ آہستہ

مجھے ماہِ منور نے بہت الجھائے رکھا ، اور
سمندر کھا گئے میری زمیں آہستہ آہستہ

بڑی تیزی سے آتا جا رہا تھا اپنی جانب میں
کہیں سے اک صدا آئی نہیں ! آہستہ آہستہ

مری آنکھیں گماں کے سحر میں ہی تھیں مگر دل میں
نمو پاتا گیا کوئی یقیں آہستہ آہستہ

میں اب آئندہ کے پھیلاو کو ترتیب دینے کو
ہوا جاتا ہوں خود میں تہہ نشیں آہستہ آہستہ

میں آخر کار اپنے آپ پر ایمان لے آیا
جھکائی اپنے قدموں میں جبیں آہستہ آہستہ

نئی تعمیر کا دیرینہ فسوں ٹوٹ گیا
بن سنور جانے کی خواہش میں دروں ٹوٹ گیا

ہم تو ہر دور میں ہی خاک فتادہ تھے مگر
تیرا پندار ترے شہر میں کیوں ٹوٹ گیا؟

دیر تک اب کسی تنظیم کا امکان نہیں
آج یوں سلسلہ صبر و سکوں ٹوٹ گیا

پوچھتے ہیں ترے پیمانِ وفا کا احباب
سوچتا ہوں، انہیں کس منہ سے کہوں ! ٹوٹ گیا!

ایسے جاں بخش حوادث بھی ہوا کرتے ہیں !
چھت کی تعمیر سے پہلے ہی ستوں ٹوٹ گیا

جس پہ رکھی تھی بنا ایک نئے عالم کی
کیا قیامت ہے اسی غم کا فسوں ٹوٹ گیا

کوہ کن ورنہ کہاں لوٹ کے آتا تھا حفیظ
تیشہ ٹوٹا کہ نہیں ، زورِ جنوں ٹوٹ گیا

خورشید ربانی

زرد پتے اڑا رہی ہے وہ
کوئی حسرت مٹا رہی ہے وہ
پیڑ گاتے ہیں جھوم جھوم کے گیت
اس خوشی میں کہ آ رہی ہے وہ
سر خوشی سے چھلک پڑا دریا
ایک کشتی میں جا رہی ہے وہ
آ گئی ہے مرے خیالوں میں
کوئی مصرع بجھا رہی ہے وہ
ساتھ رہتی ہے پیرہن جیسے
مجھ سے لیکن جدا رہی ہے وہ
عمر گذری ہے باغ میں لیکن
رنگ و بو سے سوا رہی ہے وہ
وجد طاری ہے سارے جنگل پر
ان کہا گیت گا رہی ہے وہ
سن رہا ہوں میں پھر وہی آواز
دیپ کوئی جلا رہی ہے وہ
بجھتا جاتا ہے میرا دل خورشید
میری بستی سے جا رہی ہے وہ

خواب پھولوں کے دیکھتی دیوار
اس کے گھر تک پہنچ گئی دیوار
پوچھتے ہو کہ ان کہی کیا ہے
تم نے دیکھی نہیں کبھی دیوار!
تُو نہیں ہے تو اب تری تصویر
دیکھتی ہے گھڑی گھڑی دیوار
اپنی قسمت پہ ناز کرتی ہے
اس کی دیوار سے ملی دیوار
بات ایسی کوئی تو ہے اس میں
اس سے مل کے چمک اٹھی دیوار
کوئی تھامے کھڑا ہے مدت سے
خامشی سے بھری ہوئی دیوار
کون آیا اجاڑ آنگن میں
جی اٹھی ہے گری پڑی دیوار
در بنایا گیا تھا اس کے لیے
اور در کے لیے بنی دیوار
آنے والا ہے کیا کوئی مہماں
میں نے پوچھا تو ہنس پڑی دیوار
جانے کس کی ہے منتظر خورشید
یہ دریچوں سے جھانکتی دیوار

عنبرین حسیب عنبر

پل گھڑی بھر کا ہے مہمان چلا جائے گا
کچھ بھی کر دیکھیے قربان چلا جائے گا

وسعتِ ہجر کو ناپے گا کہاں تک آخر
موسمِ خواب ہے حیران چلا جائے گا

کوئی آہٹ سی اُبھرتی ہے حقیقت کی جہاں
سانس رُکتی ہے کہ امکان چلا جائے گا

ہے یہ اخلاص و وفا صرف ہمی تک، یعنی
اگلے وقتوں میں یہ سامان چلا جائے گا

راہِ پُر خار پہ پھر پاؤں دھرے ہیں میں نے
ہے خبر جادۂ آسان چلا جائے گا

کج کلاہانِ زمانہ میں ذرا دیر تو بیٹھ
دل سے اندیشۂ نقصان چلا جائے گا

ایک سجدہ ترے قدموں میں پڑا ہوگا وہیں
خُلد سے جب ترا انسان چلا جائے گا

رابطہِ دل بھی فقط مشغلہ رہ گیا
خواب رُخصت ہوئے رت جگا رہ گیا

دیکھ لی وہ نظر ہم نے بدلی ہوئی
دیکھنے کے لیے اور کیا رہ گیا

میرا چہرہ ، مرے خال و خد اوڑھ کر
اُس کے ہم رہ کوئی دوسرا رہ گیا

بزم ہی پر منحصر نہیں، آج کل
خلوتوں میں بھی حائل گلہ رہ گیا

رقص کرتی رہیں گھر میں پرچھائیاں
اور دھرا کا دھرا آئینہ رہ گیا

عمر بھر ہم تذبذب کے رستے چلے
درمیاں میں کہیں فیصلہ رہ گیا

اے زمیں آسماں تم پہ گزری تھی کیا
درمیاں جب فقط اک خلا رہ گیا

وقتِ رخصت انا اور محبت کے بیچ
ایک آواز کا فاصلہ رہ گیا

فہیم شناس کاظمی

باہوں کے حلقے میں وہ پری زاد ہووے گی
پھر اس کے بعد زندگی دل شاد ہووے گی
جس کی طلب میں اس قدر آگے نکل گئے
دنیا، ارے یہ دنیا تو برباد ہووے گی
جب اک ہجوم دل میں سمیٹے ہوئے ہو تم
پھر اُس کی یاد کس طرح آباد ہو وے گی
کیا سوچنا کہ کھول دو گھر کے تمام در
کیا دیکھنا کہ پھر کوئی اُفتاد ہووے گی
پھر کس کے ساتھ شہر کے رستوں پہ بھٹکے گی
گر اس زمیں پہ رات مرے بعد ہووے گی
عشاق ہم سے کتنے ہی برباد ہوگئے
تم ہی بتاؤ کیا وہ گلی شاد ہووے گی
پھر اس کے بعد راستہ ملتا نہیں کوئی
لا حاصلی جو حاصلِ ایجاد ہووے گی
دستاریں رنگ رنگ کی دیکھوں تو ہو گماں
کیا ساری کائنات ہی بغداد ہووے گی
اب ہم بھی خود کو بھولے سے آتے نہیں ہیں یاد
سو تم کو کوئی بات، کہاں یاد ہووے گی

خالد ملک ساحلؔ

زوالِ عمر کا طُرفہ بہاؤ تھا مجھ میں
مرے وجود سے پہلے کٹاؤ تھا مجھ میں
میں چشم دید گواہوں کو ساتھ لایا ہوں
تری زمین کا پہلا پڑاؤ تھا مجھ میں
ہوا ہوں راکھ میں دو چار دن کی تلخی سے
وہ کیسی آگ تھی کیسا الاؤ تھا مجھ میں
نہیں نہیں تری باتوں سے میں نہیں ٹوٹا
ترے سوال سے پہلے تناؤ تھا مجھ میں
نجانے کون سے لہجے میں کھو گئی ہے زباں
رچے بسے ہوئے گھر کا رچاؤ تھا مجھ میں
ترا طلسم ترا حسن بھی حرام گیا
ترے خیال سے گہرا وہ گھاؤ تھا مجھ میں
میں صبر و ضبط کی حد سے نکل گیا ساحلؔ
میں پھٹ گیا کہ بہت ہی دباؤ تھا مجھ میں

شہاب صفدر

گزر گئے مرے دن، میں مگر وہیں پر ہوں
اس آسماں کے تلے اور اسی زمیں پر ہوں
حسیں پرندہ محبت کے گیت گاتا تھا
لگائے کان اُس آواز دلنشیں پر ہوں
کوئی اُتارنے احسان کب نکلتا ہے
نگاہ رکھے ہوئے اپنی آستیں پر ہوں
پلٹ کے آئے گا سرشاریوں کا موسم پھر
گماں کی زد میں بھی قائم خطِ یقیں پر ہوں
برا ہے خوف سرا میں بہت جگہ ہونا
کہیں کہیں پہ نہیں ہوں کہیں کہیں پر ہوں
دُعا ہے ضد میں نہیں صبر میں ہو اس کا شمار
ڈٹا ہوا سرِ میداں میں جس نہیں پر ہوں

سوہن شہلا نرگس نام کی نو رس کلیاں رہتی تھیں
ایک گلی تھی جس میں کچھ مصری کی ڈلیاں رہتی تھیں
باہر خاک اڑاتے پھرتے تھے یا اندر اڑتی دھول
ہم گلیوں میں رہتے تھے یا ہم میں گلیاں رہتی تھیں
کافیوں میں ہیں خواجہ کی اب روہی' تھل' دامان میں جو
نازک نازک جٹیاں اور مکھنوں کی پلیاں رہتی تھیں
منتیں اور مرادیں مانگنے والیاں، آتیں چار پہر
شہ عیسٰی کے دروازے کی بجتی ٹلیاں رہتی تھیں
چشمہ روڈ پہ چشمک ہوتی ہرنی جیسی آنکھوں سے
چورا ڈھکی جائی کوٹ کہ سیّد علیاں رہتی تھیں
جانتی تھیں بگڑے بچوں کا ہوگا کیسا مستقبل
ماؤں سی سرکاریں دیتی طفل تسلیاں رہتی تھیں
نانیوں دادیوں کے جب دوھترے پوترے آتے گاؤں شہاب
مچی زنانے مردانے میں کیا کھل بلیاں رہتی تھیں

نجیبہ عارف

نہ شرطِ زندگی ہو تم
نہ وجہ بے دلی ہو تم
جو خواب میں ملا مجھے
وہ لمسِ دوستی ہو تم
کبھی کبھی لگا ہے یوں
ابھی بھی اجنبی ہو تم
وصالِ ہجر ہی نہیں
فراقِ وصل بھی ہو تم
گئے جنم کی میں صدا
ازل کی ان کہی ہو تم
میں چیخ ایک کونج کی
جوابی خامشی ہو تم
فشارِ لازوال سے
بچی کھچی خوشی ہو تم
جسے بھلا دیا ہے اب
وہ گمشدہ ہنسی ہو تم
بہت مہیب رات ہے
دیے کی روشنی ہو تم
فریبِ روشنی بھی کیوں
ازل سے جب بجھی ہو تم
کہیں کہیں، کبھی کبھی
ذرا سا جی اٹھی ہو تم
کہیں نہیں وہ ایک پل
کہ پھول سی کھلی ہو تم
کسی قدیم عکس پر
غبار سی پڑی ہو تم
اتھاہ رات میں کہیں
صلیب سی گڑی ہو تم
یہ خواب یا سراب ہے
کبھی ہوں میں، کبھی ہو تم

جنید آذر

کس عرصۂ حیات میں رکھا گیا مجھے
دن رات سانحات میں رکھا گیا مجھے
ہرگام زیب دار ہوا ہے مرا وجود
ایسے بھی التفات میں رکھا گیا مجھے
خوشبو کے نام پر مری سانسیں کشید کیں
موسم کے انحطاط میں رکھا گیا مجھے
دے کر فریبِ قرب مجھے فاصلے دیئے
ترکِ تعلقات میں رکھا گیا مجھے
پہلے مری فنا پہ لئے میرے دستخط
تب جا کے ممکنات میں رکھا گیا مجھے
روتا رہا لپٹ کے مرے ساتھ تیرا وصل
جب ہجر کی قنات میں رکھا گیا مجھے
اترا کبھی نہ مجھ پہ تسلی کا ایک حرف
جب زندگی کی گھات میں رکھا گیا مجھے

نور کی ہر اُمید کو زندہ رکھتی ہے
ایک کرن خورشید کو زندہ رکھتی ہے
دن میری تصدیق میں حرفِ آخر ہے
رات مری تردید کو زندہ رکھتی ہے
روشن رہتی ہے میری آواز کی لَو
جو حرفِ تائید کو زندہ رکھتی ہے
جانتا ہوں میں وصل کی آنے والی رُت
ہجر کی ہر تجدید کو زندہ رکھتی ہے
ایک روایت سانس لے میرے سینے میں
جو نقشِ تقلید کو زندہ رکھتی ہے
لمحہ لمحہ ڈوبتی صدیوں بوڑھی آنکھ
خوابوں کی تجرید کو زندہ رکھتی ہے
کیسے بھولوں اُس لہجے کی شیرینی
جو حسنِ تاکید کو زندہ رکھتی ہے
حد سے بڑھ کر ہو توصیف جو حرفوں کی
کب ذوقِ تنقید کو زندہ رکھتی ہے

قاسم یعقوب

ڈر کے، کسی زیاں کے سبب سے، الگ تھلگ
رہتا ہوں اپنے آپ میں سب سے الگ تھلگ

ویسے معاشرت کی نفی سے ہُوا ہوں میں
پیغمبرِ معاش سے، ربّ سے الگ تھلگ

اِک واقعے کے بعد میں پورا بدل گیا
کچھ خواب دیکھتا ہوں میں تب سے الگ تھلگ

کل یوں اندھیرا میرے بدن سے لپٹ گیا
کچھ ہونا ہی پڑا مجھے سب سے الگ تھلگ

گھر میں یہی جگہ ہے جہاں روشنی ہے کچھ
بیٹھے ہیں ماں کے پاس ادب سے، الگ تھلگ

میری یہاں کسی سے طبیعت نہیں ملی
دنیا سے دُور، شور و شغب سے الگ تھلگ

کیوں اتنا وقت صرف ہُوا یہ بتانے میں
میں فطرتاً ہوں حسب و نسب سے الگ تھلگ

یہ راہِ مستقیم کہاں آ پڑی مجھے
میں راہِ منحرف پہ تھا کب سے الگ تھلگ

ہم چپ ہوئے تو ماں نے سنانی شروع کی
ایک طاقچے میں تُو نے کہانی شروع کی

جب سیدھے تھے تو سر کو جھکائے کھڑے رہے
کبڑے ہوئے تو پُشت اُٹھانی شروع کی

آہستہ تھی تو شور بہت تھا ٹرین میں
دُھن سی پھر اُس کی لے نے بنانی شروع کی

مزدوری کچھ تو ملتی مجھے محنتوں کی یار!
چھوٹی سی عمر میں ہی جوانی شروع کی

بیٹھک میں سارے لوگ ہی سکتے میں آ گئے
جب میں نے اپنی بات بتانی شروع کی

کل میں نے اُن کو کاندھوں سے نیچے اتار کے
تقدیرِ خودنوشت لکھانی شروع کی

عنبرین صلاح الدین

نیلے منظر کو کھوجتی ہوئی شام
دِن کے دالان میں پڑی ہوئی شام
میرے سائے پہ پاؤں دھرتی ہوئی
شب کے رستے پہ بھاگتی ہوئی شام
ہو گئی تیز پھر خیال کی لو
جل اُٹھی پھر کوئی بجھی ہوئی شام
تیرے آنے سے سرمئی ہوئی صبح
تیرے جانے سے ملگجی ہوئی شام
سارا دن کھڑکیوں سے جھانکتی ہے
تیرے دن سے کوئی بچی ہوئی شام
کوہساروں سے سر پٹختی صدا
اور وادی میں گونجتی ہوئی شام

سجاد بلوچ

زندگی کی آرزو مجھ میں اگر زندہ نہیں
پھر خیالِ یار ، تُو اُس کا نمائندہ نہیں
بے خطر جو ہنستا گاتا اڑ رہا ہے دیر سے
یہ پرندہ شاید اس بستی کا باشندہ نہیں
تو نے جانا ہے تو جا، پر یاد رکھنا ،اب مرے
حال اور ماضی ہیں تیرے، لیکن آئندہ نہیں
ہجرتوں کی دھول پھیلی ہے فلک کے پار تک
اب ہمارے پاس کوئی خوابِ تابندہ نہیں
سانس اب تسبیحِ وصلِ رفتگاں ہے دوستو
تم سمجھتے ہو تو سمجھو میں مگر زندہ نہیں
میں تو ان خوابوں ہی سے کرتا ہوں اپنا دن کشید
اے نظامِ ظلمتِ شب تیرا کارندہ نہیں

رضیہ سبحان

خیال وخواب کی دنیا بسائے رکھتی ہوں
میں اپنی آنکھوں میں منظر چھپائے رکھتی ہوں
وہ قربِ دوست میں گزری ہوئی حسیں یادیں
جو سو چکی ہیں انہیں کو جگائے رکھتی ہوں
کچھ نا تمام امیدیں تو کچھ ادھورے خواب
میں ان کے بوجھ سے خود کو تھکائے رکھتی ہوں
پڑی ہے لذتِ آزار کی جو عادت سی
خوشی میں بارِ غم دل اٹھائے رکھتی ہوں
کسی کی یاد کا روشن سا اک دیا دل میں
شبِ فراق میں اکثر جلائے رکھتی ہوں
خلاء میں یوں تو خلاء کے سوا کچھ اور نہیں
خلاء میں کس لیے نظریں جمائے رکھتی ہوں
میں جان بوجھ کے دانستہ اور قصداً بھی
کسی کی یاد کو ہر دم بھلائے رکھتی ہوں
بدن پر اطلس و کمخواب و زر سجائے ہوئے
میں عیب روح کے اپنے چھپائے رکھتی ہوں

شائستہ مفتی

تشنہ لب آرزو کریں گے ہم
آرزو کا لہو کریں گے ہم
نیند جنگل سے ہو کے آئی ہے
خواب کی آرزو کریں گے ہم
تم کو دیکھا تھا گزرے وقتوں میں
یاد پھر ہو بہو کریں گے ہم
آپ ہی بھول کر چلے آئے
آپ سے گفتگو کریں گے ہم
عشق چڑھتی ندی کی چھایا ہے
حسن کے روبرو کریں گے ہم
شبنمی یاد کا جو موسم ہے
اشکِ تر سے وضو کریں گے ہم
آج پھر چھو گئی ہے بادِ بہار
زندگی مشکبو کریں گے ہم
چند سانسوں کی یہ کہانی ہے
ذکر یہ کوبکو کریں گے ہم

افراسیاب کامل

حصارِ گل ہے رعنائی بہت ہے
صبا شبنم میں اترائی بہت ہے

بلندی جھانک کر کہتی ہے مجھ سے
تری پستی میں گہرائی بہت ہے

کہانی پُرتشدد زندگی کی
دکھائی کم ہے فلمائی بہت ہے

یہ منظر خواب سے پہلے کا منظر
یہاں تک ضعفِ بینائی بہت ہے

وہ کہتی ہے یہ کیسے مرد ہو تم
میں کہتا ہوں کہ رسوائی بہت ہے

اندھیرا اور اجالا دونوں حیرت
دیے نے آنکھ جھپکائی بہت ہے

شریکِ ذات کا کیا کرنا کسی کو
اگر پندار یکتائی بہت ہے

مالِ عشق ہے وہ رن کہ جس میں
فقط لمحے کی پسپائی بہت ہے

برہنہ مت ہو اے حاجت روا بس
عروسِ شان زیبائی بہت ہے

لمحوں کے ساتھ ساتھ روانی کا ہو گیا
میں نقشِ ناگزیر تھا پانی کا ہو گیا

تلوار کیا تھما دی مصنف نے ہاتھ میں
کردار خونخوار کہانی کا ہو گیا

رکھا ہے کس طلسم سرا میں ترا وجود
چھونے سے میرا جسم بھی پانی کا ہو گیا

اک وعدہ وصال یونہی بات بات میں
موقع نصیب یاد دہانی کا ہو گیا

سایہ سمجھ رہے تھے زمیں پر اسے مگر
وہ داغ تھا جو نقل مکانی کا ہو گیا

اس موجِ کن فکان سے جوہر کو سینچ کر
اوّل جو نقش تھا وہی ثانی کا ہو گیا

حیرت مجھے ہے میری محبت نئی میں بھی
وارفتہ امتزاج پرانی کا ہو گیا

دو دن کی زندگی کا خسارہ وہ ہوں کہ میں
عالم میں آ کے عالمِ فانی کا ہو گیا

کامل ابھی جو کام کی امید کچھ پڑی
ویزہ ہی ختم ملکِ جوانی کا ہو گیا

نعمان فاروق

یہ الگ بات کہ ہم سا نہیں پیاسا کوئی
پھر بھی دریا سے تعلق نہیں رکھا کوئی

میرے مکتب کو دھماکے سے اُڑایا گیا ہے
اب کہ ہاتھوں میں کتابیں ہیں نہ بستہ کوئی

جانے کس اور گیا قافلہ اُمیدوں کا
دل کے صحرا میں نہیں آس کا خیمہ کوئی

کس عجب دھن میں یہاں عمر گنوائی ہم نے
قرض مٹی کا اتارا نہ ہی اپنا کوئی

پیاس کے ہاتھوں میرا قتل ہوا ہے نعمان
دوست دریا تھے مگر پاس نہ آیا کوئی

جب رکھے پاؤں اُس نے پانی میں
آ گئی موج بھی روانی میں

سارے مضمون تھے بلاغت کے
ایک کم سن کی بے زبانی میں

اک نیا ذائقہ جنم لے گا
پیاس دیکھو ملا کے پانی میں

غم نہ دیکھا کوئی بڑھاپے کا
مر گئے شکر ہے جوانی میں

آج روٹھی ہے سانولی مجھ سے
کہہ دیا جانے کیا روانی میں

افتخار حیدر

اس مشقت میں بہت وقت گزر جاتا ہے
جاتے جاتے ہی کہیں موت کا ڈر جاتا ہے
ایک دوگانہ اذیت ہے محبت کا سفر
روح تک آبلہ پائی کا اثر جاتا ہے
عشق بیداد پہ دیتا ہے دہائی کوئی
کوئی چپ چاپ ہی دنیا سے گزر جاتا ہے
کیسے تقدیر کے لکھے سے مفر ممکن ہو
ناؤ جاتی ہے جدھر ساتھ بھنور جاتا ہے
خامشی جان کا آزار بنی جاتی ہے
بات کیجے کہ ذرا وقت گزر جاتا ہے
دل کی تعمیر میں ہے کوئی خرابی شامل
بعض اوقات جو پٹڑی سے اُتر جاتا ہے
دل اتنی محنت سے اکٹھا کیا جاتا ہے وجود
اور پھر ایک ہی ساعت میں بکھر جاتا ہے

گزشتہ شب جو اتنی روشنی تھی
تمہاری یاد کی جادو گری تھی
فضا میں گنگناہٹ تھی عجب سی
ہوا پتوں سے باتیں کر رہی تھی
غزل جیسا سراپا تھا کسی کا
کوئی صورت مکمل شاعری تھی
ترے الفاظ نشتر بن گئے تھے
محبت انتہا پر آ گئی تھی
سنا ہے بعد میرے کچھ دنوں تک
وہ مٹی پر لکیریں کھینچتی تھی
وہ گاہے اب پلٹ کر دیکھتی ہے
کوئی اک بات کہنا رہ گئی تھی
وہی ہم ہیں وہی تیرہ شبی ہے
محبت چار دن کی چاندنی تھی
لبوں پر قہقہے ہی قہقہے تھے
کوئی لڑکی تھی یا وہ پھلجھڑی تھی
کوئی دل میں اچانک آ بسا تھا
محبت کی نہیں تھی، ہو گئی تھی

جبار واصفؔ

جوکل زمیں "پر" پڑے ہوئے تھے جواب زمیں "میں" پڑے ہوئے ہیں
نجانے قبروں پہ اُن کی ہم کیوں چراغ لے کر کھڑے ہوئے ہیں

تُو روز جن کو عبادتوں کے صلے میں یزداں سے مانگتا ہے
کسی کے تاجِ عمل میں دیکھو! وہ سب نگینے جُڑے ہوئے ہیں

نہ رُوح کو ہے پتہ ہمارا، نہ جسم ہی ہم کو جانتا ہے
ہم ایک صحرائے اجنبیت میں گردنوں تک گڑے ہوئے ہیں

ہوائے تازہ ہماری بستی کے موسموں کی بھی کچھ خبر لے
یہاں کے انسان، پیڑ، پودے گلے ہوئے ہیں، سڑے ہوئے ہیں

ہمیں تو محرومیوں کے لشکر کی پیش قدمی کا ڈر نہیں ہے
ہم اپنے بچپن میں مُفلسی کی تمام جنگیں لڑے ہوئے ہیں

کچھ اس لئے بھی دِیے جلانے سے عشق سا ہم کو ہو گیا ہے
ہم اِس نگر کی اندھیری گلیوں کی ٹھوکروں میں بڑے ہوئے ہیں

ہمارے مابین اب جدائی کا فیصلہ وقت کر چکا ہے
محبتوں کے شجر سے دو پات اِس لئے تو جھڑے ہوئے ہیں

تمہی بتاؤ کہ اب تعلُّق کی ناؤ کیسے بچے گی واصفؔ
تم اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہو، ہم اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں

وہی مُسافر مُسافرت کا مجھے قرینہ سکھا رہا تھا
جو اپنی چھاگل سے اپنے گھوڑے کو آپ پانی پلا رہا تھا

دُکھوں کے گارے میں ہاتھ لتھڑے ہوئے تھے میرے، ہنر کے لیکن
میں روتے روتے بھی مسکراتا ہوا کوئی بُت بنا رہا تھا

کچھ اِس لئے بھی مری صدا پر ہر اک سماعت کو تھا بھروسہ
گماں کے صحرا میں بیٹھ کر میں یقین کے گیت گا رہا تھا

سنا ہے کل رات مر گیا وہ برہنہ درویش جھونپڑی میں
فنا کے بستر پہ جو بقا کی حَرِیص گدڑی بچھا رہا تھا

مری نظر میں وہ طِفل مسجد کے پیشوا سے بھی محترم ہے
جو احتراماً گلی سے گندم کے بکھرے دانے اُٹھا رہا تھا

بہت مُقدّس تھے اُس سپاہی کی دونوں آنکھوں کے سُرخ ڈورے
جو سوئی مخلوق کی حفاظت میں خواب اپنے گنوا رہا تھا

تمام شب اُس کے بھوکے بچّوں نے جاگ کر ہی گزار دی تھی
خُودی کے فُٹ پاتھ پر جو غُربت تھپک تھپک کر سُلا رہا تھا

وہ میری برسی پہ میری میّت کے نام شامِ غزل تھی واصفؔ
میں اپنی تُربت میں لیٹے لیٹے کلام سب کو سُنا رہا تھا

احمد شہریار

سامنے تھا، لگا نہیں موجود؟
یا میں دراصل تھا نہیں موجود؟
سنگ اٹھاتا ہوں، یعنی دیکھ تو لوں
آئینہ ہے بھی یا نہیں موجود؟
میں عدم ہوں، عدم ہوں میں، یعنی
کوئی میرے سوا نہیں موجود
اپنی دانست میں ہوا معدوم
ورنہ وہ شخص تھا نہیں موجود
فرض کرتے ہیں اپنے آپ کو ہم
فرض کیجئے تو کیا نہیں موجود
زندگی بھر یہ فیصلہ نہ ہوا
میں نہیں یا خدا نہیں موجود
جسم بھی کیا ضرور تھا احمد
جبکہ میری صدا نہیں موجود

سکوتِ رنگ ہے نقشِ ورائے نقش و نگار
یہ شکل ہے اور ہے نا مبتلائے نقش و نگار
ابھر رہا ہے اندھیروں سے نوحہِ درو بام
سسک رہی ہے فضا میں صدائے نقش و نگار
نہ رنگ میں وہ تپش ہے، نہ ہاتھ میں وہ سکت
نہ کینوس ہے مناسب برائے نقش و نگار
نہ سطحِ آب مہیا، نہ موجِ ریگ بہم
کہاں چلائی گئی تو !ہوائے نقش و نگار
یہ رہ گزار، یہ آئینہ خانۂ دنیا
ہے عکس خیز، یہ غفلت سرائے نقش و نگار
بدن کی خاک تو کب سے ہے صرف روغن و رنگ
میں چاہتا ہوں لہو بھی بنائے نقش و نگار
خموشیوں سے نمو یاب ہو رہی تھی صدا
اور اس صدا سے ہوئی ابتدائے نقش و نگار

مصداق اعظمی

آہٹیں سن کر ہی مر جاتی ہے صحراؤں کی خاک
اب تری وحشت سے ڈر جاتی ہے صحراؤں کی خاک
اس جنون عشق کی ٹھوکر میں آجانے کے بعد
آسمانوں میں بکھر جاتی ہے صحراؤں کی خاک
کون خیمہ زن کہاں ہے ڈھونڈیئے کیونکہ یہاں
پل میں سب کچھ خاک کر جاتی ہے صحراؤں کی خاک
انگلیاں تیری پکڑ کر سن لے اے باد صبا
اب تو گلشن سے گزر جاتی ہے صحراؤں کی خاک
خوشنما منظر بھی سب دھندلے نظر آتے ہیں یار
جب دلوں میں بھی اتر جاتی ہے صحراؤں کی خاک
پاؤں پھیلاتی ہے یہ صحرا نوردی جب مری
کوبکو مصداق پھر جاتی ہے صحراؤں کی خاک

اطہر جعفری

شعور ہے تو یہاں آگہی بھی ہو گی کہیں
کر احتیاط کہ پھر بے خودی بھی ہو گی کہیں
ستارے دیکھ کے جلتے ہوئے یہ لگتا ہے
کہ آگ ہے تو وہاں زندگی بھی ہو گی کہیں
بس ایک ہم ہی نہیں ہجر کی اذیت میں
ہمارے ساتھ یہیں بے بسی بھی ہو گی کہیں
سکوت ہے جو رگ و پے میں وہ ہے نوحہ کناں
کہ شورِ دل میں نہاں خامشی بھی ہو گی کہیں
کوئی بھی شخص جو راضی نہیں یہاں ہم سے
ہماری خاک میں کچھ خود سری بھی ہو گی کہیں
کنارِ آب سے لوٹے نہیں جو تشنہ دہن
کنارِ آب پڑی تشنگی بھی ہو گی کہیں
وہ اپنی بزم میں غافل نہیں رہا ہم سے
کہ شوقِ دید تھا' تو بے رخی بھی ہو گی کہیں
ستارے ٹوٹ کے گرنے سے کیا ملا اطہر
کہ راکھ ہی تھی ذرا سی 'پڑی بھی ہو گی کہیں

زاہد سعید زاہد

چاند باقی، نہ ستارہ باقی
اک دیا، ہجر کا مارا باقی

بجھ گئی ساری گلی کی رونق
اب وہ کھڑکی، نہ اشارہ باقی

میں نے کچھ وقت، گزارا ہے یہاں
وقت نے مجھ کو گزارا باقی

اب کہیں اس کو خیال آیا میرا
اب نہ دریا نہ کنارا باقی

خواب ٹوٹا ہے تو جوڑوں کیسے
آنکھ میں گرد ہے نہ گارا باقی

کیا کریں اس کے نگر میں جا کر
اب وہاں کون ہمارا باقی

میرا دامن ہے دریدہ زاہد
آسماں ہے سارے کا سارا باقی

پھول پتھر سے بنایا میں نے
ہاتھ دشمن سے ملایا میں نے

کون نکلا ہے مرے کمرے سے
جاتے دیکھا، کوئی سایا میں نے

تیری بابت، میں پریشان سا تھا
سو، کبوتر کو اڑایا میں نے

ہو گئی شام ہے خالی کاسہ
اپنے ہاتھوں کو اٹھایا میں نے

عشق نے کر دیا تقسیم مجھے
خود کو کھویا، کبھی پایا میں نے

درد بے تاب تھا، چہرے کے لیے
اشک مشکل سے چھپایا میں

راستہ بھول چکا تھا گھر کا
نیند سے خود جگایا میں نے

صغیرانور

میں نے یہ کب کہا تھا کہ سارا اُدھیڑ دے
جتنی بنت خراب ہے' اتنا ادھیڑ دے
ان کا نصیب بس وہی صحرا کی خاک ہے
جن کو فراقِ یار کا لمحہ ادھیڑ دے
ممکن ہے اب کی بار میں آدھا دکھائی دوں
ممکن ہے تیرا ہجر ہی چہرہ ادھیڑ دے
ممکن ہے میری آنکھ پہ منظر نہ کھل سکے
ممکن ہے کوئی خواب کا بخیہ ادھیڑ دے
ممکن ہے تیرے پاس نہ ملنے کا عذر ہو
ممکن ہے کوئی شہر کا رستہ ادھیڑ دے
انور کہا تھا عشق نے چمڑی ادھیڑ دوں؟
میں نے بھی کہہ دیا ہے کہ اچھا ادھیڑ دے

یقین مانو جو ہم تمہارے نہیں ہوئے ہیں
ہمیں فلک سے ابھی اشارے نہیں ہوئے ہیں
تو کس طرح سے ہماری حالت سمجھ سکے گا
کہ تو نے ہجراں میں دن گزارے نہیں ہوئے ہیں
ابھی حسینوں کے جمگھٹے میں کھڑا ہوا ہوں
ابھی مسخر' یہ چاند تارے نہیں ہوئے ہیں
ہمارا ظاہر' ہمارے باطن کا آئینہ ہے
تمہارے مانند روپ دھارے نہیں ہوئے ہیں
اب اس کی خاطر یہ چاہتا ہوں غزل میں لاؤں
ہنوز' شامل جو استعارے نہیں ہوئے ہیں
صغیر انورؔ یہ نا سمجھ ہیں' انہیں بتائیں
محبتوں میں کبھی خسارے نہیں ہوئے ہیں

خالد سجاد احمد

بس اپنی دھن میں دریا زندگی کا بہتا رہتا ہے
بشر تھک جاتا ہے لیکن زمانہ چلتا رہتا ہے

اجالے بھیجتا رہتا ہے جو بلواسطہ مجھ تک
یقیناً سامنے گھر میں کوئی آئنہ رہتا ہے

جبیں سجدے سے اٹھتی ہے تو دل حسرت سے کہتا ہے
تری دہلیز پر مولا ابھی اک سجدہ رہتا ہے

ہمیشہ تاج اک پہنے ہوئے گھر سے نکلتا ہوں
مقدر بن کے ماتھے پر جو ماں کا بوسہ رہتا ہے

ابھی اک اشک آنکھوں سے بہا اور کہہ اٹھی دنیا
کہ آدھا ہو گیا ہے واقعہ اور آدھا رہتا ہے

دلاسہ دے رکھا ہے مفلسی کو اک حفاظت کا
بھلا کیا ٹاٹ کے پردے سے کوئی پردہ رہتا ہے

خدا جانے نظر پڑتی نہیں کیوں اس طرف اُس کی
خبر تو ہے اسے بھی اس جگہ اک بندہ رہتا ہے

تمہاری زندگی ہے تم گزارو اپنی مرضی سے
مگر کچھ دوستوں کا ساتھ پھر بھی اچھا رہتا ہے

خدا سے پہلے دنیا کے خدا جس پر مسلط ہوں
قضا سے بڑھ کے خالد زندگی سے ڈرتا رہتا ہے

کسی کا ہاتھ مرے ہاتھ سے جو چھوٹ گیا
بس اتنی بات پہ سارا جہان روٹھ گیا

نجانے کیسے کسی آنکھ سے گرا آنسو
کہ اس کے بعد ستارہ فلک سے ٹوٹ گیا

کھڑی ہوئی ہے وہ دیوار تو یونہی لیکن
میں اپنے آپ سے ٹکرا کے ٹوٹ پھوٹ گیا

تو آج اپنی جوانی کو رونے آئے ہو
ذرا سی دیر کا میلہ تھا کوئی لوٹ گیا

نجانے ایسے لگی کس کی بد نظر خالد
کہ میرے ہاتھ سے گر کر سبُو ہی ٹوٹ گیا

نوید حیدر ہاشمی

عشق کے ہاتھ پہ بیعت کرو، تعظیم کرو
جاؤ ایمان سے بڑھ کر اُسے تسلیم کرو

جمع تفریق سے آگے کی کہانی ہے، یہ عشق
دشت کی شے ہے، اسے ہجر پہ تقسیم کرو

عشق درویش ہے، خود اجر نہیں مانگے گا
تُم پہ واجب ہے کہ اس ذات کی تکریم کرو

پیش ہونا ہے "الف لام" کی خدمت میں مجھے
منتظر لفظ کو تُم حُکم دو اور "میم" کرو

طشت میں پیاس، جنوں، ہجر پڑا ہے اے عشق
اس تبرّک کو مُریدین میں تقسیم کرو

قیس کے بعد کوئی ہے تو وہ میں ہوں صاحب
جاؤ اب عشق کے آئین میں ترمیم کرو

عین ممکن ہے مری ذات پرندہ بن جائے
بس مجھے ہاتھ سے چُھو کر مری تنویم کرو

عشق نکلا ہے محبت کا مبلّغ بن کر
اس کی تبلیغ تو لاریب ہے، تعمیم کرو

میں وہ مے ہوں جسے لجپال پیا کرتے ہیں
اس لئے سوچ سمجھ کر مری تحریم کرو

اب سرِ خاک مجھے ڈھونڈتے پھرتے ہو نوید
میں نہ کہتا تھا مرے عشق کی تعظیم کرو

مُضطرب خاک ہوں میں، نُور کا پیکر تم ہو
جسم میرا ہے مگر جسم کے اندر تم ہو

دینِ عشاق پہ قائم ہوں یہی مسلک ہے
میرا ایمان ہے صحرا کے قلندر تم ہو

اور کیا چاہئیے اس عہدِ منافق سے مجھے
بس یہی کافی ہے مُرشِد! مرے سر پر تم ہو

ہم ہیں ساداتِ محبت، مگر اے خاک نشیں
مُلکِ عُشاق کے بے تاج سکندر تم ہو

میری آنکھوں کی تو حد دیکھنا ہے، دیکھتا ہوں
اُس سے آگے مری بینائی کے رہبر تم ہو

یہ کوئی اور نہیں آگ پہ رقصاں مجھ میں
میں تو باہر ہوں مری ذات کے اندر تم ہو

ہم تمہیں ذات میں محدود نہیں کر سکتے
حضرتِ عشق! دو عالم کے برابر تم ہو

بند آنکھوں سے تمہیں دیکھ رہی ہے دنیا
میں تو اک مخفی خزانہ ہوں، اُجاگر تم ہو

دل کے صحراؤں میں رہتے ہو اماموں کی طرح
پھر بھی دنیا تمہیں کہتی ہے کہ بے گھر تم ہو

حضرتِ قیس مجھے خواب میں ملنے آئے
اس کا مطلب ہے کہ اب میرا مقدر تم ہو

ہاشمی، دشت میں روحوں کا یہ سودا کیسا
صاحبِ عشق نہیں ہو، نہ بہتر تم ہو

ڈاکٹر خالدہ انور

دن کسی طور سے کٹ جاتا ہے
رات کا حشر تو ڈٹ جاتا ہے
سوا نیزے پہ جو سورج آئے
خوف سے سایہ لپٹ جاتا ہے
دل کا رشتہ تو ہے نازک اتنا
اک ذرا بات سے کٹ جاتا ہے
منزلِ شوق جب آتی ہے قریب
راستہ اشکوں سے اٹ جاتا ہے
عمر پر خار کا لمبا یہ سفر
ہم سفر ساتھ ہو گھٹ جاتا ہے
جب کبھی دید کا سورج ہے اگا
ابرِ غم زیست سے چھٹ جاتا ہے
جمع کرتے ہیں جتن سے کتنے
وہی ترکہ کہ جو بٹ جاتا ہے
نظر آتی ہے حقیقی دنیا
پردہ جب آنکھ سے ہٹ جاتا ہے
میری جیتی ہوئی بازی کو کوئی
آنِ واحد میں الٹ جاتا ہے
کیوں سرِ شام یہ صحرائے وجود
درد کی دھول سے اٹ جاتا ہے
میرے صدمات کا قصہ سن کر
دلِ صد چاک بھی پھٹ جاتا ہے
موسمِ ہجر ہی ٹھہرا ورنہ
وقت کوئی بھی ہو کٹ جاتا ہے

فرحت زاہد

کس قدر ستاتی ہیں گرمیوں کی دوپہریں
مجھ میں چلچلاتی ہیں گرمیوں کی دوپہریں
یاد آنے والوں کو، یاد تک نہیں کرتے
پھر بھی دل دکھاتی ہیں، گرمیوں کی دوپہریں
لوٹ کر اگر آؤ، تم اسی طرح آنا
جیسے گل کھلاتی ہیں گرمیوں کی دوپہریں
چھت پہ جو کبوتر تھے، وہ نہیں رہے ہیں اب
مجھ میں مرتی جاتی ہیں، گرمیوں کی دوپہریں
جوڑتے ہوئے سانسیں، کاڑھتے ہوئے ریشم
ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں، گرمیوں کی دوپہریں
وقت کے جزیروں پر، دھوپ جب اترتی ہے
ایڑیاں جلاتی ہیں، گرمیوں کی دوپہریں

الماس شمی

اس جبیں پر جو بل پڑے شاید
یہ کلیجہ نکل پڑے شاید
سانس رکنے لگی ہے سینے میں
تم کہو گے تو چل پڑے شاید
ضبط سے لال ہو گئیں آنکھیں
ایک چشمہ ابل پڑے شاید
ایک بجھتا دیا محبت کا
تیرے ملنے سے جل پڑے شاید
بات اب جو تمہیں بتانی ہے
دل تمہارا اچھل پڑے شاید
آنسوؤں سے دھلی ہوئی آنکھیں
دیکھ کر وہ مچل پڑے شاید

ایسے ہجر مسلسل کر دوں
آخر ہو پھر اول کر دوں
تو جو آنکھ سے اوجھل ہو تو
چشمِ نم سے جل تھل کر دوں
پل میں توڑ دوں سناٹے کو
ہنستے لبوں سے ہلچل کر دوں
تو جو ملے تو سچ کہتی ہوں
میں تو عشق مکمل کر دوں
پہلے ٹانکوں پیار کے تارے
پھر میں رات کو آنچل کر دوں
بن کے مور تو پنکھ پسارے
آ میں خود کو جنگل کر دوں
رِکن مِن کن من برسوں تجھ پر
تپتی دھوپ کو بادل کر دوں
عشق وظیفہ پاس ہے میرے
جس کو چاہوں پاگل کر دوں

عمران عامی

باتوں باتوں میں چلی بات، ترے آنے کی
ساری ترتیب اُلٹ دی گئی مے خانے کی

عشق انسان کو دیمک کی طرح چاٹتا ہے
کیسے اُمید دلائیں تمہیں، بچ جانے کی

زندگی تیری طرح کون جیے، کون مرے
رونقیں کون بڑھائے رکھے ویرانے کی

دل بھی خاطر میں نہیں لاتا ہماری باتیں
ہم بھی کوشش نہیں کرتے اُسے سمجھانے کی

پہلے محسوس کرو دل کی سماعت عامی
اور خاموشی سنو پھر کسی ویرانے کی

کون سے وقت پہ لے آئے ہو مرہم عامی
عمر ہوتی ہے کسی زخم کے بھر جانے کی

قریہ چشم میں اک خواب پڑا رہتا ہے
کوئی موسم ہو مرا زخم ہرا رہتا ہے

لاکھ تاویلیں کرے پیش یہ دریا لیکن
خون کا ذائقہ پانی سے جدا رہتا ہے

یہ پرندے مجھے تنہا نہیں ہونے دیتے
ایک میلہ سا مرے گرد لگا رہتا ہے

سانس بھر رکتا نہیں، ٹھیک سے چلتا بھی نہیں
مسئلہ دل کا مرے ساتھ بنا رہتا ہے

آپ آرام کریں دور سے آئے ہوئے ہیں
اس محلے میں تو کہرام بپا رہتا ہے

اور لوگوں کی بھی ہوتی ہے پرستش عامی
دل کی مسجد میں کہاں، صرف خدا رہتا ہے

خالد ندیم شانی

زباں کی نوک پہ رکھا سوال بتلاؤں
میں اپنے عہد کے گھاؤ کا حال بتلاؤں
یہ بدنصیبی کی حد ہے کہ اپنی نفرت پر
پھلاؤں فخر سے سینہ...... کمال بتلاؤں
گھرا ہوا ہے درندوں میں شہر، ایسے میں
تجھے میں شعروں میں حسن و جمال بتلاؤں؟؟
جو زہر بانٹتے پھرتے ہیں میری دھرتی پر
میں ان کو کیسے بھلا خوش خیال بتلاؤں
غبارِ مقتلِ ہستی جو اُڑ رہا ہے یہاں
اسے بھی رقص بتاؤں دھمال بتلاؤں
ہزار سال سے میرا صفر نہیں گزرا
تجھے میں کیسے محرم شوال بتلاؤں
تجھے بھی شرم دلاؤں اے حضرتِ آدم
تجھے بھی تیرے عروج و زوال بتلاؤں
زمانہ چھیڑے محبت کے ساز گر خالد
تو زندگی کو بھی جینے کی تال بتلاؤں

ماجد جہانگیر مرزا

دلِ ناداں یقیں کر لے محبت اب نہیں ہو گی
قیامت آ چکی ہم پر قیامت اب نہیں ہو گی
جسے اپنا بنایا تھا جو رگ رگ میں سمایا تھا
بہت بے درد نکلا وہ سو چاہت اب نہیں ہو گی
مرا بے سود ہے جینا جہانِ درد میں تنہا
مجھے سانسوں کی اے ہمدم ضرورت اب نہیں ہو گی
مجازی عشق میں کھو کر حقیقت بھول بیٹھا تھا
خدایا درگزر کرنا شکایت اب نہیں ہو گی
مذاہب کے تصادم نے خدا تقسیم کر ڈالا
کہیں مندر کہیں گرجا عبادت اب نہیں ہو گی
بیاں ایسے نہ کر ماجد زمانے کی حقیقت کو
وگرنہ جان کی تجھ سے حفاظت اب نہیں ہو گی

سعید شارق

نظر کی شاخ سے ہر پات جھڑنے والا ہے
نہالِ خواب، سرِ شب اُکھڑنے والا ہے

تمام دن مری ٹھوڑی پکڑ رہی تھی وہ دھوپ
اب ایک سایہ مرے پاؤں پڑنے والا ہے

سفالِ چشم یونہی بھربھری نہیں ہوتی
ضرور کوئی شجر جڑ پکڑنے والا ہے

ہر ایک بند شکستہ تھا شام سے پہلے
اور اب تو رات کا دریا بھی چڑھنے والا ہے

جہانِ مرگ و فنا کا وہ جوہری، شارق
گہر گہر مرے سینے پہ جڑنے والا ہے

کوئی بہانہ تراشوں کہ چپ رہا جائے
اسے تو مجھ سے محبت ہے کیا کیا جائے

کھنڈر میں کیسے بدلتا ہے جگمگاتا مکاں
جسے بھی دیکھنا ہو، مجھ کو دیکھتا جائے

اُجڑ چکے ہیں جو باغ اور کس طرح اجڑیں
وہ شخص جا تو چکا ہے اب اور کیا جائے

درونِ چشم وہ عالم ہے بے یقینی کا
جو خواب آئے نظر، نیند بوکھلا جائے

میں آج سب کو بھلانے کی ٹھان بیٹھا ہوں
بس ایک بار مجھے کوئی یاد آ جائے

چہار سمتوں سے گھیرے ہوئے ہے کوئی خلا
کبھی پکار بھی لیں تو کہاں صدا جائے

یہ بوجھ کم ہے جو آنکھوں پہ رکھ سکوں شارق
یہ شور کچھ بھی نہیں ہے اگر سنا جائے

جواد شیخ

ایک تصویر کہ اوّل نہیں دیکھی جاتی
دیکھ بھی لوں تو مسلسل نہیں دیکھی جاتی

دیکھی جاتی ہے محبت میں ہر اِک جنبشِ دل
صرف سانسوں کی ریہرسل نہیں دیکھی جاتی

اِک تو ویسے بڑی تاریک ہے خواہش نگری
پھر طویل اتنی کہ پیدل نہیں دیکھی جاتی

ایسا کچھ ہے بھی نہیں جس سے تجھے بہلاؤں
یہ اُداسی بھی مسلسل نہیں دیکھی جاتی

سامنے اِک وہی صورت نہیں رہتی اکثر
جو کبھی آنکھ سے اوجھل نہیں دیکھی جاتی

میں نے اِک عمر سے بٹوے میں سنبھالی ہوئی ہے
وہی تصویر جو اِک پل نہیں دیکھی جاتی

اب مرا دھیان کہیں اور چلا جاتا ہے
اب کوئی فلم مکمل نہیں دیکھی جاتی

اِک مقام ایسا بھی آتا ہے سفر میں جوادؔ
سامنے ہو بھی تو دلدل نہیں دیکھی جاتی

یہ وہم جانے میرے دل سے کیوں نکل نہیں رہا
کہ اُس کا بھی مری طرح سے جی سنبھل نہیں رہا

کوئی ورق دِکھا جو اشکِ خوں سے تربتر نہ ہو
کوئی غزل دِکھا جہاں وہ داغ جل نہیں رہا

میں ایک ہجرِ بے مُراد جھیلتا ہوں رات دن
جو ایسے صبر کی طرح ہے جس کا پھل نہیں رہا

تو اب مرے تمام رنج مستقل رہیں گے کیا؟
تو کیا تمہاری خامشی کا کوئی حل نہیں رہا؟

کڑی مسافتوں نے کس کے پاؤں شل نہیں کیے؟
کوئی دِکھاؤ جو بچھڑ کے ہاتھ مَل نہیں رہا!!

شبیر نازش

کان پڑتی ہے اِک صدا میرے
کون موجود ہے ہَوا میرے
مَیں تری جستجو میں نکلا تو
چاند بھی ساتھ چل پڑا میرے
جو نہ ملتے تھے، تجھ تعلق سے
ہو گئے وہ بھی آشنا میرے
مَیں جہاں بھی گیا، جہاں بھی رہا
تُو ہی پیشِ نظر رہا میرے
راہ تکتے ہیں میری دیر و حرم
ناز اُٹھاتا ہے میکدہ میرے
تُو ہنسا تو مسرّتی ہالہ
چار سُو پھیلتا گیا میرے
دیکھ پایا نہ مَیں نظر بھر کے
آڑے آتی رہی حیا میرے
مِلنا مشکل ہے گر سرِ راہے
سنگ دل! خواب میں تو آ میرے
چھوڑنا ہے تو دل سے درد نکال
خط مرے سامنے جلا میرے
چل مری خوبیاں نہ ظاہر کر
کم سے کم عیب تو چھپا میرے
آ کسی دن یہ دیکھنے کے لیے
زخم تیرے ہرے ہیں یا میرے

پاؤں پڑتے ہیں خشک پتّوں پر
پاؤں پڑتی ہے اِک ندا میرے
میرے دُشمن کو دُکھ یہ مار گیا
کیوں نشانے ہُوئے خطا میرے
تیرگی لے گئی پسِ پردہ
کر گئی گُل دیے ہَوا میرے
زندگی ہے غزل، ردیف ہیں دُکھ
تنگ ہے سُکھ کا قافیہ میرے
گو نہیں مانتے مجھے شاعر
شعر پڑھتے ہیں برملا میرے
ہے دُعا اُس کو بھی کہ جو نازشؔ!
حق میں کرتا نہیں دُعا میرے

منیر فیاض

اہلِ دنیا کہ پئے داد و درم بولتے ہیں
ہم ترے بولنے والے ہیں سو کم بولتے ہیں
ایک خاموشی ازل تا بہ ابد پھیلی ہوئی
وقفۂ دہر میں رکھے ہوئے ہم بولتے ہیں
خاص نسبت ہے مجھے رفتہ و آئندہ سے
میرے ہونے میں ہر اک عہد کے غم بولتے ہیں
پھر وہی تال مری عمرِ زوال آمادہ
جس کی سنگت میں کئی بود و عدم بولتے ہیں
گفتگو کرنے لگے آج ستارے مجھ سے
کہ مری خاک میں جاگے ہوئے نم بولتے ہیں
ایک خاموش سمندر مری منزل فیاضؔ
ریگِ ساحل پہ مرے نقشِ قدم بولتے ہیں

ناز بٹ

غبارِ شب کی مسافت فریب دیتی رہی
خیال و خواب کی ہجرت فریب دیتی رہی
قدم قدم پہ یقیں کر رہے تھے ہم اس کا
قدم قدم پہ محبت فریب دیتی رہی
ہم اپنی سادہ دلی کے سبب ہوئے رسوا
ہمیں تو عشق کی بیعت فریب دیتی رہی
کسی کے وعدۂ خوش کن کا پاس تھا ہم کو
کسی کی چشمِ عنایت فریب دیتی رہی
کہاں گئے مری گمنامیوں کے اچھے دن
قدم قدم مجھے شہرت فریب دیتی رہی
ہمیں تو مار دیا وضع داریوں نے نازؔ
ہمیں تو خوئے مروت فریب دیتی رہی

ناہید عزمی

یہاں جذبوں کی قلت ہو گئی ہے
جدائی ہی ضرورت ہو گئی ہے
سنو تلخی کے دو اک گھونٹ پی کر
مجھے جینے سے رغبت ہو گئی ہے
بہت رنگین تھا تیرا فسانہ
اب اس میں اور جدت ہو گئی
ہمیں معتوب کر کے رکھ دیا ہے
بھلا عورت علامت ہو گئی ہے
سمندر تو انہیں کی زندگانی
جسے کشتی کی حاجت ہو گئی ہے
مرا دل بانجھ ہوتا جا رہا ہے
تمہاری یاد رخصت ہو گئی ہے
ہوا کے زخم سی کر رکھ دیئے جب
دیئے کو کیوں شکایت ہو گئی ہے
چلو دنیا کو اب آزاد کر دیں
مکمل اس کی عدت ہو گئی ہے

قدسیہ ندیم لالی

درد اِک ایسا ہے دل میں جس کا درماں کچھ نہیں
اور کوئی پوچھ لے تو اس کا عنواں کچھ نہیں
ہجر میں دیکھو تو میری بے سروسامانیاں
اس قدر لمبی مسافت اور ساماں کچھ نہیں
نیند کا عالم بھی اب بے فائدہ لگنے لگا
اب کوئی خواب، حسیں خواب، پریشاں کچھ نہیں
جانے کیوں یک دم یہ دل ویران اتنا ہو گیا
عشق کی بے چینیاں شوق فراواں کچھ نہیں
زندگی لالی گذاری ہم نے اپنی اس طرح
اب نظر کے سامنے کوئی بھی طوفاں کچھ نہیں

شبین سیف

عمر بھر بوجھ اُٹھایا تو نہیں جا سکتا
ہر تعلق کو نبھایا تو نہیں جا سکتا
آپ اس بار بھی دیوار میں چُنوا دیں مجھے
اب کے بھی سر یہ جھکایا تو نہیں جا سکتا
روز مرنے کا ہنر جس نے سکھایا ہے مجھے
اُس کا احسان بھلایا تو نہیں جا سکتا
چشمِ بینا ہے، مگر عقل سے نابینا ہیں
آئینہ اُن کو دِکھایا تو نہیں جا سکتا
تُم نے اِک عمر مرے دل پہ حکومت کی ہے
تُم کو پل بھر میں بھلایا تو نہیں جا سکتا
جن کو الفاظ سے ڈسنے کا ہُنر آتا ہے
ہاتھ اب اُن سے ملایا تو نہیں جا سکتا
جس قدر سنگ زنی چاہیے کر لیں مجھ پر
سنگ زادی کو رُلایا تو نہیں جا سکتا
ہوں مکیں جن میں کئی سال سے زندہ لاشیں
اُن مکانوں کو سجایا تو نہیں جا سکتا
جس کی خاموشی میں آسیب سکوں کرتے ہوں
ایسا ویرانہ بسایا تو نہیں جا سکتا
تُو بُتِ عشق نہیں، تُو تو خُدا ہے میرا
اب تجھے ہاتھ لگایا تو نہیں جا سکتا

سبیلہ انعام صدیقی

منافقوں کے شہر میں، عداوتوں کے زہر میں
بدلنا ہے فضا کو اب خلوص و امن و مہر میں
نظر کو میری بھا گیا وہ ایک سادہ بات سے
وفا کی ہی اُمنگ ہے، یہ دل جلوں کے شہر میں
نہ ہمسفر نہ ہمنوا مگر مرا ہے مہرباں
وہی رفیق و رازداں حکایتوں کے قہر میں
رواں ہے بہتے پانی میں عجب سی قدرتِ خدا
کہ لمحہ لمحہ رونما ہے انقلاب نہر میں
ہے زیست اس مقام پر کہ ڈھونڈتی ہے خامشی
مرا وجود کھو گیا ہے دل خراش جہر میں
سبیلہ میرے پاس صرف نعمتِ خلوص ہے
محبتیں ہی بانٹتی ہوں میں نظامِ دہر میں

سید علی سلمان

مگر ہمیشہ ہم اک امتحاں میں رہتے ہیں
کہ گھر کے ہوتے ہوئے بھی مکاں میں رہتے ہیں
ہم اہلِ عشق ہیں بس عشق سے ہے کام ہمیں
نہ فکرِ سود نہ رنجِ زیاں میں رہتے ہیں
جو تیری سمت مسلسل سفر میں رہتا ہے
ترے فقیر اسی کارواں میں رہتے ہیں
زمیں بھی ان کو میسر نہ آ سکی دیکھو
جنہیں یہ زعم تھا ہم آسماں میں رہتے ہیں
وہ نور بن کے اترتے ہیں جب کبھی دل میں
تو لفظ بن کے ہم ان کے بیاں میں رہتے ہیں
جدا وہ جب سے ہوئے ہیں تو دیکھئے سلمان
کہ فصلِ گل ہے مگر ہم خزاں میں رہتے ہیں

جنید عطاری

یوں تو وہ چہرہ دار بلا عیب رنگ تھا
شیشہ سمجھ لیا تھا حقیقت میں سنگ تھا
اس آستاں کو چھوڑے جدھر بھی گیا یہ دل
مسجد میں بت کدے میں کلیسا میں تنگ تھا
دنیا سقوطِ ذات کی آماجگاہ تھی
میں بر سرِ شکست بھی مصروف جنگ تھا
قصہ ترا چھڑا جو ہمیں یاد آ گیا
اک دور میں ہمارا بھی دل پر امنگ تھا
اور عار مت دلا میں دل آشوب ہوں بہت
یہ طورِ بے دماغی فقیروں کا ڈھنگ تھا
سرمست ہی رہا وہ زمانوں کی دوڑ میں
جو آئینۂ حیرت افزا میں دنگ تھا
جس کے حضور جھکتے تھے سر پر کبھی کبھی
آج اس فقیر کے لیے ہر دست سنگ تھا
کہتے ہیں اگلے وقتوں میں گزرا کوئی جنید
کافر تھا ظاہراً مگر اصلاً ملنگ تھا

قرطاس پہ ہیں جہانِ دگر

(تراجم)

ہمارے ہونٹوں پر مہریں لگائی جاسکتی ہیں اور ہاتھ باندھے جاسکتے ہیں

صدف مرزا

Man binder os på mund og hånd

1940

Poul Henningsen

1894- 1967

پاؤل ہنگسن (ڈینش تلفظ : پھاؤل) کا یہ معروف گیت جب پہلی مرتبہ تحریر کیا گیا تو جرمن سنسر نے اسے بیک جنبش قلم مسترد کر دیا۔ پاؤل نے اسے دوبارہ ایک شادی بیاہ کے گیت کی طرز پر لکھا جس میں شادی اور اس کی مقدس رسومات کو تنقید کا ہدف بنایا گیا تھا۔ بظاہر اس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ شادی کے ذریعے ایک دوسرے کے جسم پر تسلط جمایا جاتا ہے اور شادی کے عہد کے ذریعے ایک دوسرے پر حکومت حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جبکہ محبت اور شادی کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہوتا اور طویل شادی میں ایک دوسرے کی کشش اور چاہت کے جذبات ویسے بھی ختم ہو جاتے ہیں اور جماہیاں لیتی ہوئی اکتاہٹ طاری ہو جاتی ہے۔ دلوں میں محبتوں کے جذبات مر جائیں تو شادی کا بندھن دلوں کو ایک ساز پر دھڑکنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔

بظاہر ان موضوعات کی عکاسی کرتے حروف بین السطور قوم کو پیغام دیتے ہیں کہ جب تک ہمارے افکار آزاد ہیں ہمیں معاہدوں کے ذریعے کوئی غلام نہیں بنا سکتا اور آزادی کا دن بہت قریب ہے۔ اس نغمے کی وجہ سے وہ جرمن پولیس کو بھی مطلوب تھا اور ڈینش نازی پارٹی کی فہرست میں بھی اس کا نام درج تھا۔ اسے ان خطرات سے بچنے کے لئے سویڈن فرار ہونا پڑا۔

گیت کا تیسرا بند جو کہ سنسر کی قینچی کی نذر ہو گیا تھا ترجمے میں شامل کیا جا رہا ہے۔ جنگ کے بعد جب ان گیتوں کو یکجا کیا گیا تو اخبارات نے باقاعدہ ان لوگوں سے رابطہ کیا جو ان دنوں یہ گیت گایا کرتے تھے۔ کئی دنوں ایک ایک لفظ کی صحت پر اخبارات میں گفتگو ہوتی رہی اور پھر قارئین کے خطوط پر متنازع الفاظ کے بارے میں فیصلہ کیا گیا۔

اس نظم کو فیض کے قطعے، ''زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے۔ ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے'' کے ساتھ موازنے سے دیکھا جائے تو ترجمے کو بہتر انداز میں سمجھا جا سکتا ہے۔

اس گیت کو کثیر الثقافتی میوزک گروپ "آوٹ لینڈش" نے ایک نئی تزئین کے ساتھ پیش کیا جس میں علامتی انداز واضح ہے کہ دنیا میں کوئی بھی کسی کو غلام نہیں رکھ سکتا تسلط خواہ ڈنمارک پر ہو یا دنیا کی کسی بھی قوم پر دائمی نہیں ہوگا۔

ہمارے ہونٹوں پر مہریں لگائی جاسکتی ہیں اور ہاتھ باندھے جاسکتے ہیں

دلکش چیزوں کو اپنی دسترس میں کرنے کی تمنا
ہر ننھے حریص بچے کے دل میں ابھرتی ہے
دوسروں کو ایک حلقے سے باندھ دینا
انسان اپنے تجربات سے ہی مستفید ہوتا ہے

سوچو کہ انسان کہیں کسی کے ساتھ کھڑا
کھڑکی کے شیشے سے باہر مشترکہ جنت دیکھتا ہے
مسرور ہوتا ہے کہ یہ میرا ہے
اور زندگی اسی طور گزرتی جاتی ہے

ہمارے ہونٹوں اور ہاتھوں کو تو عادات کی
کسی ہوئی ڈوری کے ساتھ باندھا جاسکتا ہے
خود کو آزاد کروالینا بہت مشکل لگتا ہے
ہم اس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں
جسے بخوبی خبر ہے
وہ ہمیں تنہائی کا ڈراوا دے سکتا ہے
دلکش معاہدوں کے ذریعے ہم تھپکیاں دے کر سلاتے رہتے ہیں

اگر ہم صرف تین الفاظ ''میں تم سے وعدہ کرتا ہوں'' کی خلاف ورزی کرسکیں
تو ہم محبت کو زیادہ دیانت دارانہ طریقے سے سمجھ سکتے ہیں
وہ الفاظ جن کی قسمیں ہم ہونٹوں اور ہاتھوں سے کھاتے ہیں
(لبوں سے قسم کھانا اور ہاتھوں سے معاہدے پر دستخط کرنا)
وہ سب صرف لمحاتی ہوتا ہے
جب تک خوشی دور ہو جاتی ہے اور سب ختم ہو جاتا ہے

محبت اور شادی۔۔۔۔!
بھلا ان دونوں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟
اکتاہٹ بھری جماہیاں یہاں تک کہ جبڑے کی ہڈی کھسک جائے

محبت ایک جنگلی پھول ہے
باغبان کے ہاتھوں میں مرجھا جاتا ہے
تحفظ کرتے ہاتھوں میں یہ بکھر جاتا ہے
مگر طوفان اور بادوباراں میں جوبن پر ہوتا ہے

ہمارے ہونٹوں پر تو مہریں لگائی جا سکتی ہے اور ہاتھ باندھے جا سکتے ہیں
عادات کی کسی ہوئی ڈوریوں سے
لیکن کوئی ہمیں اپنی ملکیت نہیں بنا سکتا
ہم ان پابندیوں سے آزاد ہو جائیں گے

محبت بھرا ایک فرار، سرخ حسیات کا وحشی فرار
جبری فرائض کے گھسے پٹے راستے سے فرار
تم مجھے اپنی ملکیت مت بناؤ، میں تم پر قبضہ نہیں جماتا
میرے ہر بوسے کا مطلب
محض ہاں اور صرف نہیں ۔۔۔ ہی نہیں ہو سکتا
وہ الفاظ جن کی قسمیں ہم ہونٹوں اور ہاتھوں سے کھاتے ہیں
یہ صرف ڈگمگاتے لمحات تک قائم رہتی ہیں
تم جو بوسے مجھے دیتی ہو مجھے بہت پسند ہیں

(تیسرا بند جرمن نشرواشاعت پر کڑی پابندی کی نذر ہو گیا لیکن اسے ترجمے میں شامل کیا جا رہا ہے)

جہازوں کے جہاز غرق ہوتے جا رہے ہیں
ملکوں کے ملک صفحۂ ہستی سے مٹتے جا رہے ہیں
انسان دیانت دارانہ تجارت کرے
اور ہر کوئی اپنے خدا سے ملتجی ہو
امن کے معاہدے اور دوستی کے عہد نامے
ایسے کاغذ ہیں جن کی قیمت خون سے ادا ہوتی ہے
کمزوری طاقت سے مسلح ہو جاتی ہے
خوف کے آخری مایوس کن لمحوں میں

(ایسی طاقت خوف کی کوکھ سے جنم لیتی ہے، خوف کے انتہائی اور آخری لمحات میں کمزور بھی مضبوط ہو جاتا ہے اور جوابی حملہ کر دیتا ہے)

یہی محبت اور جنگ میں ہوتا ہے
تمام وعدے صرف دھوکا اور فریب ہیں
کوئی بھی انسانوں کے الفاظ پر یقین نہیں کر سکتا
تم نے مصافحہ کیا، اس سے کیا فائدہ ہوا
اس بیوہ کو جو اپنے خاوند کی قبر پر کھڑی ہو؟
ارضِ مقدس کے سامنے ایک انسان کی کوئی وقعت نہیں
دشمنوں سے خوف؟ ہاں، مگر ان سے زیادہ
ان بڑی طاقتوں سے خوف جو خود کو ہمارا دوست کہتی ہیں
اس کا اطلاق ہر جنگ پر ہوتا ہے
تمام وعدے صرف فریب ہیں
اور کوئی بھی حکومتوں کے وعدے پر اعتبار نہیں کر سکتا

جو بھی ہوگا ہم دیکھ لیں گے
اور کسی کو خبر نہیں کہ کل کو کیا ہوگا
بغیر شکوہ کئے تقدیر کے لکھے کو قبول کر لیں گے
جو بھی قسمت ساتھ لائے گی

ہر دوستی پر شادماں رہنا
لیکن اس یقین کے بغیر کہ یہ دیرپا ہوگی
بس اسی بات میں امن ڈھونڈو کہ ہم جانتے ہیں
کہ ہم امن کا تقاضا نہیں کرتے

ہمارے ہونٹوں پر مہریں لگائی جا سکتی ہیں اور ہاتھ باندھے جا سکتے ہیں
لیکن روح کو زنجیر بپا نہیں کیا جا سکتا
کوئی بھی اسیر نہیں ہو سکتا
جب افکار آزاد ہوتے ہیں

ہمارے اندر ایک حد بندی ہوتی ہے
جس کی توقیر میں اضافہ ہونا چاہئے
جب ہم اپنی دل پسند چیز کے لئے جدوجہد کرتے ہیں

جو اپنی روح کو مستحکم رکھتا ہے کبھی غلام نہیں بنایا جا سکتا
جو فیصلہ ہم خود کرتے ہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا
ہم اپنے ہاتھوں اور ہونٹوں سے وعدہ کرتے ہیں
صبحِ صادق سے پہلے کی تاریکی میں
کہ آزادی کا خواب کبھی ختم نہیں ہوگا

Dansk design, by Thomas Dickson, Gyldendal A/S, 2009, p 70

Læs og giv videre: illegale flyveblade fra besættelsen 1940-45 -Steen Bille Larsen, Mogens Weitemeyer -

Læs og giv videre: illegale flyveblade fra besættelsen 1940-45, -Steen Bille Larsen, ?Mogen

s Weitemeyer -Museum Tusculanum Press 1995,p 301995,p 30

Det vidste du ikke om Danmark

Af Mai-Britt Schultz,Rasmus Dahlberg, 2013, Gyldendal A/S

1920-1945: Bind 4 - Side 299

Litteratur, 1920-1945: Bind 4 - Peter Buddtz Jørgense, Per Juul Larsen, Ole Ravn

Gyldendal, 1983, p 299

ڈیٹ ایکسپائرڈ شخص۔۔۔۔۔۔

تخلیق: منور سراج

ترجمہ: شاہد حنائی (کویت)

"زندگی ابتدا سے یوں ہی ہے جیسی دکھائی دیتی آ رہی ہے۔" اس نے آوازوں اور خاموشی سمیت بے انت خالی پن کا حصہ بننے سے پہلے سوچا "زندگی میں رہ جانے والی خلا، واوین، اور استفہامیہ کی علامتیں زندگی کو مکمل کرتی ہیں۔" مگر وہ مطمئن نہ ہوا۔ "شاید ایسا ہو یا شاید ایسا نہ ہو۔" سگریٹ کے ہر کش کے ساتھ مٹیالے اور سرمئی دائرے بننے بگڑنے لگے۔ وہ دائروں میں بھٹکتا رہا اور دائرے اس میں گھم گھیریاں کھاتے رہے۔ پھر سب دائرے باہم ہو کر فضا میں Delete ہو گئے۔ "دراصل سارا لطف Limits عبور کر جانے میں ہے۔" گلاس میز پر رکھتے ہوئے ہاتھ کپکپایا تو وہ بڑبڑایا "جو لوگ Limits پھلانگ نہیں پاتے وہ زندگی کے حقیقی ذائقے سے محروم رہ جاتے ہیں۔" اس نے دوسرا پیگ بنانے کا ارادہ کیا تو وہ مسکرا دی۔ اُس کی مسکراہٹ نے اسے پیگ بنانا بھلا کر پنچھی کا گیت یاد دلایا جو بہت پہلے اُڑتا ہوا آسمان کی حدیں پرواز کر گیا تھا۔ خالی گلاس کی طرف نگاہ گئی تو گیت کے بول ذہن سے اُتر گئے۔

وہ اسے بدستور دیکھے جا رہی تھی۔

"بہت ہی کوئی ذلیل ہو۔" اس کی انکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو نشہ دو چند ہو گیا۔

"کیوں! میں کیوں ذلیل ہوں؟ تمھارے ساتھ ایسا کیا کیا ہے؟" وہ شوخ نظروں کے ساتھ دیکھتی ہوئی چھوٹے چھوٹے قہقہے لگاتی ہوئی بولی تو لگا جیسے دو جام آپس میں ٹکرا کر پیچھے ہٹ گئے ہوں اور ماحول میں جل ترنگ کی دُھن بجتی چھوڑ گئے ہوں۔ اس نے جانا کہ رات نے موسیقی کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔

"پہلے تو اعتبار نہ تھا لیکن اب یقین ہو گیا ہے کہ تم نے میری پسلی سے جنم لیا ہے اور تجھ بِن میرے لیے وقت اپاہج ہوتا ہے۔" اس نے وہ جملہ کہہ دیا جو دراصل اس سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے کہنے کے لیے سوچا تھا مگر اُس نے مسکرا کر اس کے ہونٹوں سے سارے الفاظ چن لیے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے لفظ لفظ پر پہلا حق اسی کا ہے۔ اس نے فخریہ انداز میں دوبارہ مسکراتے ہوئے اپنے چہرے پہ پڑنے والے گیسو ہٹائے تو چاندنی رات نے جنم لیا۔

پارک میں املتاس کے پیڑ کے قریب رکھی دو کرسیاں، ایک میز، چار دیواری پر پھیلی سبز بیل اور دل میں کچھ خالی خالی سا احساس۔ چوطرف پھیلے بے انت خالی پن اور ہر لمحے بڑھتے خالی پن کا احساس۔۔۔ کچھ پکھیرو اپنی بولی بولتے ہوئے اُوپر سے گزرے تو دونوں نے گردنیں اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا مگر تب تک پرندے ان کی حدِ نگاہ سے دور نکل چکے تھے۔ خلا میں ان کے عکس اور آوازوں کا احساس موجود تھا۔ دھیرے دھیرے یہ احساس بھی معدوم ہو گیا۔

"سب کچھ فضا میں گم ہو جاتا ہے پرندے، آوازیں، تارے، روشنی اور لوگ۔ برمودا ٹرائینگل صرف سمندر میں نہیں ہے، یہ خلا میں بھی ہے اور دھرتی پر بھی ہے۔ ہر بندے کے اندر بھی ایک برمودا ٹرائینگل ہوتا ہے جس میں سب

کچھ گم ہو جاتا ہے۔ باقی صرف عکس رہ جاتے ہیں۔'' اسے لگا کہ وہ خود بھی عکس ہے اور وہ بھی جس کے گالوں پہ اکثر چاندنی پھیلی رہتی ہے عکس ہی ہے۔ الفاظ زبان سے ادا ہونے سے قبل زندہ ہوتے ہیں حلق سے خارج ہونے کے بعد فنا ہو جاتے ہیں۔ صرف خاموشی ہی الفاظ کو موت سے محفوظ رکھتی ہے۔

''تمھاری یہ ندی جیسی باتیں اور تم۔۔۔ اور اِدھر مَیں اور میری بادلوں سے محروم زندگی اور چوراہے پر کھڑے آدمی کی کیفیت۔۔۔ اس کا سفر اکثر کتنا مشکل ہو جاتا ہے، کبھی سوچا ہے!'' وہ شیشے کے مخروطی گلاس میں بیئر انڈیلتے ہوئے شیشے جیسے شفاف لہجے میں مخاطب ہوئی۔ بیئر مخصوص آواز کے ساتھ کے ساتھ گلاس میں منتقل ہو کر سفید جھاگ میں بدل گئی۔

''تھوڑی وِسکی ملا لو۔ ٹھنڈ سے بچنے کے لیے ضروری ہے۔''

''نہیں میرے لیے میری اُداسی، رات کا پہلا پہر اور سات فی صد الکوحل کافی ہے۔''

پہلا گھونٹ لیتے ہی گلابی گال مزید گلابی ہو گئے۔ املتاس کے پھولوں پر نکھار آ گیا۔ اس نے دل میں سوچا کہ پوچھے: ''آخر ایسا کب تک چلے گا؟'' مگر پوچھ نہ پائی۔ یہی بات دوسرے انداز میں کہنے سے پہلے دوسرا گھونٹ لیا۔

''آخر میں کب تک زیبرا کراسنگ پر کھڑی رہوں؟'' وہ گھونٹ گھونٹ بیئر پیتی ہوئی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس اُمید کے ساتھ کہ وہ کوئی ایسا جواب دے گا جو اس کے سفر کے لیے سنگِ میل ثابت ہو گا۔ جہاں سے وہ زندگی کو نئی ترتیب دے گی اور پھر راستے اس پر طنز نہیں کریں گے مگر وہ چپ کی ندی سے باہر نہ نکلا۔

گلاس خالی ہو گیا۔

''ایک اور بنا کر دوں؟'' اس نے دُکھ کی لہر بن کر رہی جملہ کہا۔

''اس طرح نہیں چلے گا، بہنیں سوال کرتی ہیں۔ وہ بڑی ہو رہی ہیں سب سمجھتی ہیں۔ اب آنا جانا مصیبت لگتا ہے، راستے کاٹنے کو آتے ہیں۔ بندہ زیبرا کراسنگ پر زیادہ دیر نہیں رُک سکتا۔ قدم اُٹھانا ہی پڑتا ہے، آگے کو نہیں تو پیچھے کو ہی سہی۔ دائیں طرف نہیں تو بائیں سمت۔''

چہار سو سکوت چھا گیا۔ کسی بحث کی گنجائش تھی نہ کسی دلیل کی۔ جو کچھ تھا سامنے تھا۔۔۔ اور پوری سچائی کے ساتھ عیاں تھا۔

وہ پرس کے اندر سے وہ کچھ تلاشنے لگی جو پرس میں تھا ہی نہیں اور یہ بات وہ جانتی بھی تھی۔

اُدھر وہ دُھوئیں کے دائرے بنا متا رہا تھا۔

خود کو مصروف رکھنے کے نام پر شکست سے بچنے کی محض ایک کوشش۔

''تمھاری ٹیچنگ کیسی جا رہی ہے؟ بچے تنگ تو کرتے ہوں گے؟''

محض ایک سوال جس کا موقع محل سے کوئی تعلق نہ تھا یا شاید کوئی تعلق تھا۔ اس کے سوال کے ردِعمل میں وہ آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔ جس میں اَن گنت ستارے تھے، بے اَنت خلا تھا اور لامحدود خاموشی تھی۔ آس پاس املتاس کے پھولوں کی خوش بو تھی تاہم اس کی باس میں اُداسی رچی بسی تھی۔

''مَیں نے سوچا تھا کہ شاید عرش سے تارے توڑ لانا اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ کسی کھوکھے سے سگریٹ خریدتے وقت ملنے والی ریزگاری وہاں بیٹھے بھکاری کو دے دینا مگر فیصلے کی گھڑی نے آسمان پرے کر دیا ہے اور شام کی رنگت ہمیشہ

ایک سی نہیں رہتی۔'' بولتے بولتے کش لینا خیال ہی نہ رہا۔ سگریٹ بجھ چکا تھا۔

''تمھاری یہ باتیں اور مَیں اور زندگی اور مٹھی کی ریت کی طرح بہتا وقت۔ درحقیقت تم خود غرض ہو۔ سورج ہمیشہ مشرق سے طلوع اور مغرب میں غروب ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ یوں ہی ہوتا رہے گا جس طرح سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔''

وہ اپنی ہی آواز کے دریا میں ڈوب گئی۔

اس نے چوتھا پیگ بنانا چاہا مگر اگلے ہی پل یہ بات اسے بھول گئی۔ وہ چار دیواری پر پھیلی بیل کے پتوں کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اپنے ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ لمحہ بھر پہلے کیا کرنا چاہ رہا تھا؟ یادداشت اور نسیان بھی مخصوص فاصلے پر نصب پٹڑیاں، درمیان میں تختے، پتھر، نٹ بلٹ، تیل کے دھبے، کالا انجن، سیاہ دُھواں، کالی کُوک اور کُوک کے ساتھ اُڑتے پنچھی اور ٹیلی فون کی تار پر رہ جانے والے پرندوں کے عکس۔ نشے کے رنگین تاگے تار تار ہوتے محسوس ہوئے۔ دفعتاً اسے یاد آ گیا وہ گھڑی بھر پہلے چوتھا پیگ بنانا چاہ رہا تھا، مگر چوتھا پیگ بنا نہیں پایا تھا۔

دراصل یہی اس کی Limit تھی۔ وہ جب بھی Limit سے گزرتا تو پریشانی مقدر ہوتی تھی۔

''ہاں مَیں Selfish ہوں۔ یہ سلسلہ Survival Fittest سے بھی قدیم ہے۔ جس روز مَیں فرم سے استعفیٰ دینے کے قابل ہوا اسی دن تجھے جوائن کرلوں گا۔ میرے جوتے پالش ہوں تو موزے پھٹے ہوتے ہیں۔ خودغرضی زندگی کا سچ ہے۔'' ہوا کے جھونکے نے املتاس کو ہلکورا دیا تو ٹہنیوں سے کچھ پتے جھڑ گئے۔ اس نے خواہش کی کہ کرسی سے اُٹھ کر زمین پر گرے پتے شمار کرے اور اندازہ کرے کہ ہوا کے اک جھونکے سے بہ یک وقت کتنے پتے گرتے ہیں۔ اسے اپنی خواہش پر ہنسی آ گئی۔ اسے وہ ڈائری یاد آ گئی جس میں اس نے ان دوستوں کے نام لکھنا شروع کیے تھے جو مرحوم ہو گئے تھے۔ مہینا بھر پہلے ڈائری کے سارے صفحات پُر ہو چکے تو اس نے ڈائری کے سارے اوراق پھاڑ کر ہوا میں اُچھال دیے تھے۔ اسے اپنی اس عجیب و غریب خواہش پر تب بھی ہنسی آ ئی تھی۔ کوئی بھی سچی مسکراہٹ اشکوں سے خالی نہیں ہوا کرتی۔

اس کی آنکھوں میں متوقع بارش دیکھ کر وہ کرسی کھینچ کر اس کے پہلو میں آ بیٹھی تو جیسے آسمان قریب ہو گیا۔

''باتوں کے صحرا میں مَیں نے جو کچھ کھویا اور پایا اس کا دُکھ رہے گا تو خوشی بھی۔ بھلا دینے کی کوشش میں باتیں شدت کے ساتھ یاد آتی ہیں۔ بندہ جیسا راستہ اختیار کرے گا ویسا ہی درد پائے گا۔ میری ڈائری کا ایک بھی ورق کورا نہیں ہے جس میں نیا دُکھ لکھا جا سکے۔''

چوتھا پیگ بنانا چاہا تو وہ اس کے ہاتھ اور گلاس کے درمیان رکاوٹ بن گئی۔

اسی دن ڈاکٹر اس کی ای سی جی دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا: ''الکوحل اور سگریٹ آپ کی زندگی کے لیے موزوں نہیں۔ احتیاط کریں۔''

وہ ڈاکٹر کے الفاظ اپنے آنچل کے پلو میں باندھ کر چلی آئی۔

اسی شام سے اس کے لئے چوتھا پیگ ممنوع ہو گیا تھا۔

وہ مسکرا دیا ''ڈیٹ ایکسپائرڈ شخص کا دل اور احتیاط!''

اس کی مسکراہٹ میں املتاس کے بے رنگ پھولوں کی خوشبو تھی۔ اس رات اس کے ہاتھ اور گلاس کے درمیان کوئی رکاوٹ حائل نہ تھی۔

اور وہ چوتھا پیگ بنا کر Limit سے گزر گیا۔

اب دو عالم سے صدائے ساز آتی ہے مجھے

(موسیقی)

غزل گائیک غلام علی

ڈاکٹر امجد پرویز

سب سے پہلے یہ عرض کرتا چلوں کہ غزل گائیک' مشہورِ زمانہ کلاسیکل گائیک بڑے غلام علی خاں اور کلاسیکل گائیک چھوٹے غلام علی خاں سے علیحدہ 'ایک منفرد شخصیت کے حامل ہیں۔ اس مضمون میں جہاں ہم غزل گائیک غلام علی کی شخصیت اور اُن کے کام کا احاطہ کریں گے وہاں اس سے پیشتر عظیم کلاسیکل گائیک بڑے غلام علی خاں کا بھی مختصراً ذکر کریں گے' جن کے ناموں میں مُماثلت ہے اور ان کے ناموں سے پہلے بڑے اور چھوٹے لکھ کر ان کی شناخت کی گئی ہے۔ اِک عُمر گزری ہے جب سے مَیں ذاتی طور پر غلام علی کو جانتا ہوں' ہم دونوں بھائیوں کی طرح ہیں۔ مارچ 9 اور 10 , 2014ء کی درمیانی شب وہ پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن کے پروگرام 'نصف صدی کا قصہ' میں مہمانِ خصوصی تھے۔ اس پروگرام کا انعقاد پاکستان ٹیلی کارپوریشن نے اپنے چنیدہ فنکاروں' کی پی ٹی وی کیلئے خدمات کو یاد کرنے کے لئے' کیا کرتا تھا۔ غلام علی کے پروگرام میں مہمانوں میں مجھے بھی اپنے تاثرات پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ دیگر مہمانوں میں پی ٹی وی کے سابقہ ڈائریکٹر پروگرامز فرخ بشیر' موسیقار مجاہد حسین' بھارتی گلوکار ہنس راج ہنس اور گلوکارہ ترنم ناز شامل تھے۔ تمام مہمانوں نے یہ باور کروایا کہ غلام علی نہ صرف ایک مشاق گلوکار ہیں' بلکہ ہارمونیم اور طبلہ پلیئر بھی ہیں۔ اُن کی گلوکاری کا' سُروں کا اُتار چڑھاؤ' اُنکے ہارمونیم بجانے کے ساتھ مطابقت رکھنا' ہُنر مندی کی ایک اَچھوتی مثال ہے۔

گلوکار غلام علی کی ابتدائی زندگی کے متعلق جو معلومات حاصل ہوئیں' اُس سے یہ پتہ چلا کہ اُن کی پیدائش 1940ء میں ضلع سیالکوٹ میں ڈسکہ کے قریب " کالے کی " نامی گاؤں میں ہوئی تھی۔ عمار مسعود کی تحقیق کے مطابق غلام علی کی پیدائش 1941ء میں ہوئی تھی۔ غلام علی کا تعلق ایک موسیقی کے خاندان سے ہے۔ اُن کے والد بھی گلوکاری کا شوق رکھتے تھے۔ گلوکاری کے علاوہ وہ سارنگی نواز بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ موسیقی کی ابتدائی تربیت' غلام علی نے اپنے والد سے ہی حاصل کی۔ اپنی دی ہوئی تعلیم سے غلام علی کے والد مطمئن نہ تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ان کا فرزند کسی بڑے گائیک' یعنی کہ بڑے غلام علی خاں کا شاگرد بنے۔ لہٰذا' غلام علی کو بڑے غلام علی خاں کی خدمت میں حاضری دینے کے لئے پیش کیا گیا تا کہ بڑے غلام علی خاں کی شاگردی کی سعادت نصیب ہو سکے۔ چونکہ بڑے غلام علی خاں کابل کے دورے پر تھے اور اپنے مصروف وقت کی وجہ سے ایسا کرنے کیلئے ہچکچاہٹ کا شکار تھے اس لئے کچھ دیر ہوگئی۔ لیکن جب انہوں نے غلام علی سے ٹھمری 'سیاں بولو تنک موہ سے رہیو نہ جائے' سُنی تو انہوں نے گلے لگا کر انہیں اپنی چھاؤں تلے جگہ دے دی۔ غلام علی ابھی کم عمر تھے' بقول اُن کے' شاید وہ پندرہ برس کے تھے۔ استاد بڑے غلام علی خاں پٹیالہ گھرانے کی گائیکی کے علمبردار تھے۔ شروعات میں وہ خواتین گلوکاراؤں کے ساتھ' اسٹیج پر بحیثیت سارنگی نواز کام کرتے تھے اور اس کردار کے نبھانے میں کوئی عار نہ سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے مرحوم انکل کالے خاں کی بنائی ہوئی دُھنیں بھی گایا کرتے تھے۔

وہ پٹیالہ گھرانے کے دو نامور اساتذہ اختر حسین خاں اور عاشق حسین خاں کے شاگرد تھے۔ دریں اثناء بڑے غلام علی خاں کی کلکتہ میں پرفارمنس کی دُھوم مچ گئی تھی۔ استاد بڑے غلام علی خاں کی مشہوری اور عزت کی وجہ یہ بھی تھی کہ

انہوں نے چار بڑی گائیکی کی تکنیک' یعنی پٹیالہ، قصور انداز، برام خانی، اندازِ دُھرپد گائیکی' جے پور کی گائیکی اور گوالیار گائیکی کے بہلاوے' اپنے اندر سمیٹ کر منفرد گائیکی کا ایک مرکب تیار کر لیا تھا۔ اور وہ باجے کی تینوں سپتک اپنی آواز سے بآسانی چھو لیا کرتے تھے۔ آواز بغیر کسی ظاہری کوشش کے تمام سُروں پر خوبصورتی سے ٹھہرتی تھی۔ اور تمام تالوں پر اُن کو دسترس حاصل تھی۔ اِس تمام ہُنر مندی (craftsmanship) کے باوجود' استاد بڑے غلام علی خاں کی آواز میٹھی تھی اور کسی بھی تناؤ کا شکار نہ تھی۔ وہ راگ کی ادائیگی' غیر ضروری طور پر لمبا کرنے سے اجتناب کرتے۔ ان کے تجربے کے مطابق غیر ضروری طور پر آلاپ اور ولمپت والے حصوں کو کھینچنے سے سامعین اُکتاہٹ کا شکار بھی ہو سکتے ہیں اور چونکہ ان کی گائیکی عوام کیلئے ہوتی تھی تو وہ کم وقت میں زیادہ سے زیادہ لطف کے پہلو بھی نمایاں کرتے۔ اور اس کوشش میں اگر انہیں اپنی موسیقی میں راگ داری کے اندر رہتے ہوئے بھی کچھ تبدیلی لانا پڑتی تو وہ ایسا کرنے سے پرہیز نہ کرتے۔ ریڈیو پاکستان' لاہور میں تمام عمر گزارنے کی وجہ ایک کہانی میرے کانوں سے گزری' ایک مرتبہ انہوں نے اپنی چھتری سے جناب زیڈ۔اے۔ بُخاری کے دروازے کو کھولا تو جناب افسر نے ناراضگی کا اظہار کیا تو خاں صاحب ناراض ہو گئے کہ افسر تو آتے اور جاتے رہیں گے لیکن بڑے غلام علی خاں ایک ہی مرتبہ دنیا میں آئیں گے۔ اس کہانی میں کتنی صداقت ہے' معلوم نہیں! خانصاحب ریڈیو پاکستان کے باغ میں بیٹھ گئے کہ اگر کسی نے ریکارڈنگ کرنی ہے تو وہ وہاں آ جائے اور اپنے مائیکروفون بھی ساتھ لے آئے!

غزل گائیک غلام علی نے کہا کہ استاد غلام علی خاں نے اُنہیں ریاضت کیلئے اپنے چھوٹے بھائیوں استاد برکت علی خاں' استاد مبارک علی خاں اور استاد امانت علی خاں کے سپرد کر دیا۔ اِن بھائیوں نے محنت سے غلام علی کو کلاسیکل موسیقی کی اصناف' جیسا کہ ٹھمری اور خیال ادا کرنے کے اسرار و رموز سکھائے اور ان میں گائیکی کی ایک مضبوط بنیاد ڈلی۔ استاد بڑے غلام علی خاں سے "استاد۔ شاگرد" کے تعلق کے باعث غلام علی کے والد نے اُن کا نام بھی غلام علی رکھا تھا۔ غزل گائیک غلام علی اپنے نام کے ساتھ استاد کا لقب لگانے سے پرہیز فرماتے ہیں۔ یہ اطلاع غلام علی نے پی ٹی وی کے متذکرہ پروگرام میں میزبان عمار مسعود کو بتلائی۔ یہ امر صریحاً غلام علی کی انکساری کو واضح کرتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ غلام علی سادہ طبیعت شخص ہیں۔ اُن کی خوراک میں گوشت یا نان نوش کرنے سے پرہیز ہے۔ وہ سادہ روٹی اور شوربہ کھانا پسند کرتے ہیں۔ اِس امر کا مشاہدہ' میں نے اُس وقت کیا جب غلام علی نے میری پروڈکشن آڈیو البم' خوشبو' (اور عظل ستار انجینئر' برمنگھم' یو کے سی ای او' محمد ایوب کیلئے) غزلیں ای ایم آئی' شاہ دین بلڈنگ' دی مال' لاہور میں ریکارڈ کروائیں۔ اور لنچ اور ڈِنر میں ان کو سادہ خوراک نوش فرماتے دیکھا۔ اِسی البم کیلئے غلام علی کی گائی ہوئی غزلیں' مَیں نے بھی گائیں۔ اس البم میں ہم نے جدید غزل گو شعراء' حسن رضوی' صفی حسن' حسن کاظمی' ناصر کاظمی' باصر کاظمی' زاہد فخری' نصرت مرزا' آغا ذوالفقار خاں' جمشید مسرور' نصیر احمد ناصر کی غزلیں پیش کیں۔ یہ قصہ موجودہ صدی کے احوال کا ہے۔ غلام علی حقیقت پسند شخص ہیں۔ سادہ لباس تن زیب کرتے ہیں۔

حالانکہ اب اُن کی عمر سات دہائیوں سے تجاوز کر چکی ہے لیکن وہ اپنے فن کے مظاہرہ کے لیے پوری دنیا میں سفر کرتے ہیں۔ اپنے ساتھیوں سے متضاد' غلام علی نے اپنی آمدنی کو ضائع نہیں کیا اور اسکی معقول investment کی ہے۔ اگرچہ غلام علی نے برِصغیر کے نامور موسیقاروں کی دُھنیں گائی ہیں لیکن وہ خود بھی اپنی کئی غزلیں کمپوز کر کے گا چکے ہیں۔ ناصر کاظمی چونکہ ان کے پسندیدہ شاعر ہیں' اس لئے ان کے کلام کو ادا کرنے میں انہوں نے خاص توجہ دی ہے۔ غلام

علی نے یہ بتایا کہ ناصر کاظمی کی ایک غزل "دل میں اِک لہر سی اُٹھی ہے ابھی" جسکی دُھن موسیقار الطاف حسین نے بنائی تھی' کو انہوں نے اور گلوکارہ تصور خانم نے پی ٹی وی کے ایک پروگرام میں گائی جس میں ایک ہی غزل ایک گلوکار اور ایک گلوکارہ پیش کیا کرتے تھے۔ یہ غزل فوری طور پر مشہور ہوگئی۔ اور غلام علی اس غزل کو اپنی ہر کنسرٹ میں پیش کرتے ہیں۔
اس غزل کے مطلع میں لفظ 'لہر' پر غلام علی مختلف سُروں کے ملاپ سے خاموشی اور شور کا امتزاج پیش کرتے کہ لہروں کا تصور اسکی ہر شکل میں واضح ہو جاتا ہے۔ یہ ہُنر مندی سامعین کو مسحور کر دیتی ہے جس سے اُن کی سِکہ بند مہارت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اسی غزل کی ریکارڈنگ 'خواجہ نجم الحسن کے 1980ء کے پی ٹی وی کے پروگرام 'میری پسند' میں بہت مقبول ہے۔
اگر چہ غلام علی نے زیادہ تر غزلیں اپنے نائب رفیق حسین کی دھنوں میں گائی ہیں لیکن یہ دُھنیں ایک راگ یا مختلف راگوں کے امتزاج سے بنی ہوئی ہوتی ہیں۔
شائقینِ موسیقی کو تو یہ علم ہوگا کہ ایک راگ کی بُنیا دلطیف انداز' میں سائنسی طریقے سے سُروں کی بانٹ ہے' جمالیاتی پہلوؤں کو مدِ نظر رکھ کر ڈالی جاتی ہے۔ راگ کی آروہی (جاتی مرتبہ کے سُر) اور آمروہی (واپسی کے سُر) کو اساتذہ نے سات' چھ یا پانچ سروں میں آروہی یا امروہی میں تجویز کر کے مختلف میل اور ایک خاص ترتیب سے باندھ کر اپنے تاثر کے اعتبار سے صبح' سورج چڑھے' سہ پہر یا رات کے وقت ادا کرنے کی تجویز دی ہے۔ غلام علی کا اندازِ گائیکی' ٹھمری گائیکی سے قریب تر ہے۔ وہ گاتے وقت ردم' یعنی لَے سے بھی کھیلتے ہیں' چونکہ خود طبلہ ماسٹر بھی رہے ہیں۔ یہ بھی مشاہدہ کیا گیا ہے کہ وہ گیت یا غزل کی میلوڈی میں ایک 'بیڈار' (odd) سُر لگا کر آسانی سے اصل میلوڈی کی طرف واپسی کر لیتے ہیں۔ یہ مہارت' شائقین کے لئے ایک دلچسپ سماں باندھ دیتی ہے۔ یہ کیفیت ہمارے نامور لوک فنکار طفیل نیازی بھی پیش کرتے تھے۔ مندرجہ ذیل چند غزلیں اور گیت' غلام علی کی نمائندگی کرتے ہیں:

. اے حسنِ لالہ فام ذرا آنکھ تو ملا	. اپنی دُھن میں رہتا ہوں' میں بھی تیرے جیسا ہوں
. اپنی تصویر کو آنکھوں سے	. عرضِ غم سے بھی فائدہ تو نہیں (رئیس وارثی)
. یہ دل یہ پاگل دل میرا کیوں بُجھ گیا آوارگی (محسن نقوی)	. بہاروں کو چمن
. دل جلا کے میرا مُسکراتے ہیں وہ	. دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا (ناصر کاظمی)
. دل میں اِک لہر سے اُٹھی ہے ابھی (ناصر کاظمی)	. برسن لاگی بُوندنیا راجہ تورے بناں لاگے نہ مورا جیا (ٹھمری)
. چمکتے چاند کو ٹوٹا ہوا تارا بنا ڈالا	. چُھپ چُھپ کے پیو
. چُپکے چُپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے (حسرت موہانی)	. حادثے ایسے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا
. ہدفِ غم نہ کیا سنگِ ملامت نے مجھے (رئیس وارثی)	. ہیر وارث (فلم: ہیر رانجھا' موسیقی: خواجہ خورشید انور)
. ہم تیرے شہر میں آئے ہیں مسافر کیطرح	. ہم تو کتنوں کو مہ جبیں کہتے ہیں
. ہم کو کِس کے غم نے مارا' یہ کہانی پھر سہی (مُسرور انور)	. ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے (اکبر الہ آبادی)
. اتنی مدت بعد ملے ہو	
. جن کے ہونٹوں پہ ہنسی پاؤں میں چھالے ہوں گے (کمپوزر اور پروڈیوسر: خالد اصغر)	
. کبھی نیکی میں مجھے	. کچی دیوار ہوں ٹھوکر نہ لگانا
. کیسی چلی ہے اب کے ہوا	. کل چودھویں کی رات تھی' شب بھر رہا چرچا ترا (ابنِ انشا)

. کل رات بزم میں جو ملا
. کہتے ہیں مجھے عشق کا افسانہ چاہیے (قمر جلال آبادی)
. کھلی جو آنکھ
. خوشبو غنچے تلاش کرتی ہے
. خوشبو جیسے لوگ ملے
. کیا ہے پیار جسے
. کوئی ہم نفس نہیں ہے
. میں نظر سے پی رہا ہوں (قمر جلال آبادی)
. محفل میں بار بار (آغا بسمل)
. میرا کیا تھا تیرے حساب میں
. نی چنبے دیئے بند کلیئے (پنجابی فلمی گانے)
. سوہنیا اوئے مکھ تیرا اجری سویرا ے (پنجابی فلمی گانے)
. اُسے اپنے فردا کی فکر تھی وہ جو میرا واقف حال تھا (زاہد فخری)
. پابندِ رہ و رسم وفا میں بھی نہیں ہوں (صفی حسن)
. سچی باتیں کڑوی باتیں ہوتی ہیں (حسن کاظمی)
. تیر جب بھی کمان میں آیا (نصیر احمد ناصر)
. بے کراں تنہائیوں کا سلسلہ رہ جائے گا (نصیر احمد ناصر)

آگے بڑھنے سے پہلے' میں غلام علی کے فلموں میں گائے ہوئے گانوں کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔ موسیقار صفدر حسین نے ان کی آواز میں خوبصورت دُھنیں پیش کیں۔ دلجیت مرزا نے 1972ء میں فلم 'شاہ' بنائی۔ اس فلم میں وارث لدھیانوی کا ادکار شاہد (اور روزینہ) پہ فلمایا ہوا غلام علی کا گیت 'سوہنیا اوئے مکھ تیرا اجری سویرا ے' آج بھی اتنا ہی مقبول ہے جتنا کہ اس فلم کے ریلیز ہونے کے وقت تھا۔ دلجیت مرزا نے ایک اور نغمہ 'نی چنبے دیئے بند کلیئے' اداکار شاہد پر فلمایا لیکن اس مرتبہ ان کے ساتھ ہیروئن نغمہ تھیں۔ ڈاکٹر بخاری' ایک نامور موسیقیت دان لکھتے ہیں کہ غلام علی اور نور جہاں نے تین عدد سرائیکی نغمے بھی ریکارڈ کیے تھے۔ اگر سرائیکی فلمی موسیقی پہ نظر دوڑائیں تو سب سے پہلے گلوکارہ ناہید نیازی نے سُپوت پنجاب بابا جی اے چشتی کی موسیقی میں فلم 'آبرو' (1961ء) کے لئے گانا گایا تھا۔ اس فلم کے ستاروں میں بہار' اکمل' زینت اور اے۔ شاہ۔ شکار پوری شامل تھے۔ بنیادی طور پر یہ ایک پنجابی فلم تھی جو فلمساز شیخ عطا الرحمن نے کشمیر تھیٹرز لمیٹڈ کے جھنڈے تلے بنائی تھی۔ اور یہ سینما گھروں میں 27, جنوری 1961ء کو پیش کی گئی تھی۔ لیکن پہلی مکمل سرائیکی فلم ' دھیاں نمانیاں' کا سہرا مشہور اداکار' گلوکار' فلمساز اور ہدایتکار عنایت حسین بھٹی کے سر جاتا ہے۔ 27, دسمبر 1973ء کو ریلیز ہونے والی اس فلم کے ستاروں میں عنایت حسین بھٹی' خانم' صاعقہ' اسد بخاری' افضال اور آغا حسین شامل تھے۔ موسیقی عاشق حسین کی تھی اور گانے عنایت حسین بھٹی' نور جہاں' افشاں اور سلطانہ ناز نے گائے تھے۔

اس فلم نے سرائیکی' سندھ پنجاب اور پوٹھوہار علاقوں میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اس فلم کو ندیم پکچرز (بھٹی صاحب کے فرزند ندیم عباس) کے جھنڈے تلے بنایا گیا اور بطور ہدایتکار بھی بیٹے کا نام استعمال ہوا تھا۔ اس فلم کی کامیابی سے دیگر سرائیکی فلمیں بنانے کے لیے فلمسازوں کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ ہمارا اگلا پڑاؤ سرائیکی فلم 'سانجھ ساڈے پیار دی' ہے۔ ہدایتکار سرور چوہدری اور فلمساز ساجد خاں کی یہ فلم 21, اپریل 1974ء کو نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ ستاروں میں راج ملتانی' صاعقہ' خالد محمود اور سیما شامل تھے۔ موسیقار غلام حسین شبیر موسیقار تھے۔ یہ جوڑی ریڈیو پاکستان کے موسیقار کالے خاں اور ماسٹر صادق پیانو نواز کے شاگرد شبیر حسین پر مشتمل تھی۔ انہوں نے غلام علی اور نور جہاں کی آوازوں کو بہت خوبصورتی سے اس فلم کے لیے استعمال کیا۔ غلام علی کی آواز ایک اور سرائیکی فلم 'ہاٹو جٹ' کے لیے استعمال کی گئی۔ دیگر گلوکاروں میں مسعود رانا' مالا' تصور خانم' افشاں اور بلقیس خانم کی آوازیں شامل تھیں۔ ندیم پکچرز کی ایک اور فلم 'رب دا رُوپ' تھی۔ فلمساز ندیم عباس اور ہدایتکار کیفی تھے۔ ستاروں میں عنایت حسین بھٹی' خانم' ننھا' شاہدہ' راجہ ریاض اور بہار

شامل تھے۔ موسیقار 'صفدر حسین تھے۔ 6۔ جون 1975ء کو نمائش کیلئے پیش کی جانے والی اس فلم کے گلوکاروں میں عنایت حسین بھٹی کے علاوہ افشاں 'اور مالا شامل تھے۔ مندرجہ بالا گزارشات میں غلام علی کے حوالے سے ہم نے سرائیکی فلموں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی ہے۔

اس کے علاوہ غلام علی کے گائے ہوئے کئی اور پنجابی نغمے ہیں جو بنتے ہی مشہور ہو گئے۔ مثلاً ایک نغمہ ہے "پتہ ہوندا مینوں ہوندی کی جُدائی جدوں دا میرا ماہی رُسیا" یہ ایک چنچل نغمہ ہے جس میں سُر اور تال آپس میں بہت خوبصورت ملاپ پیش کرتے ہیں اور مَیں نے اسکو غلام علی سے Live سُنا تھا۔ ایک اور پنجابی گیت افشاں کے ساتھ 'غلام علی نے گایا ہے' وہ ہے "تیرے پیار دی سوہنہ مینوں 'رب مینوں بھل جاوے 'بھل جاواں جے مَیں تینوں"۔ افشاں کے ساتھ غلام علی کا دوگانہ ایک ماہیے کی صورت میں ہے "پتناں تے مل ماہیا 'مدتاں گزر گئیاں" غلام علی کا سب سے مقبول نغمہ "میرے شوق دانہیں اعتبار تینوں' آجاویکھ میرا انتظار آجا' ایویں لڑن بہانے لبھناں ایں۔۔۔۔" ہے۔ یہ صوفی تبسم کا غالب کے کلام کا پنجابی ترجمہ ہے۔ اس نغمہ کو غلام علی نے بہت مرتبہ پیش کیا ہے لیکن سب سے اعلیٰ ریکارڈنگ ان کے پی ٹی وی پر وڈیوسر خواجہ نجم الحسن کے پروگرام "میری پسند" میں ہے۔ ایک اور پنجابی گانا بہت مقبول ہے' جس کے بول ہیں "تانگاں والے نین کدوں سُکھ نال سون گے"! ایک اور نغمہ ذرا دکھ بھرا گیت ہے "ہت دے وچھوڑے ساڈا سُکھ چین کھولیا" لیکن بہت سُریلا ہے! غلام علی کا قدرے تیز تال میں چنچل نغمہ 'بہہ جا میرے کول تینوں تکدا رہواں" ہے۔ جب غلام علی اس نغمے کو کسی محفل میں گاتے ہیں تو لفظ 'رہواں' پر مختلف سُروں کے ملاپ سے اپنی ہُنر مندی کا مظاہرہ فرما کر سامعین کا دل جیت لیتے ہیں۔

دیگر پنجابی نغموں میں سرحد کے پاران کا گیت "اکھاں سوہنیاں وچوں ڈُلدا خُمار مُکھڑا چن ورگا" بڑے شوق سے سُنا جاتا ہے۔ پنجابی نغمہ "جے غم سجناں دا ہوندا نہ 'درد وچھوڑے دا دیندا' دل ٹِک ٹِک اتھرو ڈھوندا کیوں' بھی ایک مقبول گیت ہے۔ ایک فلمی گیت "سوہنیا او ئے مکھ تیرا اجری سویرا اے" کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں ہوا ہے' اتنا مقبول ہوا کہ میڈم صبیحہ خانم نے اس کو پی ٹی وی کے ایک پروگرام میں گایا بھی تھا۔ غلام علی کی گائی ہوئی کافی 'ربا میرے حال دا محرم توں' اور ایک اور پنجابی گیت 'کہیہ پچھ دے او حال' کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ پی ٹی وی کی ایک ڈرامہ سیریل 'آپے رانجھا ہوئی' کا تھیم سانگ 'ماہی ماہی کُوکدی نی میں آپے رانجھا ہوئی' جب ریلیز ہوا تو فوراً ہی مقبول ہو گیا۔ اسکی دُھن میاں شہر یار نے بنائی تھی۔ اُسی دور کا ایک اور پنجابی گیت 'تک پتری والیکھ میرے' بھی بہت مقبول ہوا تھا۔ اگر چہ غلام علی کے گائے ہوئے کئی اور پنجابی نغموں کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے لیکن مندرجہ ذیل اردو نغموں کا ذکر لازمی ہے۔ 'پتہ پتہ بُوٹا بُوٹا حال ہمارا جانے ہے (میر تقی میر)۔ اس غزل کو میاں شہر یار کی دُھن میں میری آڈیو البم 'Amjad Parvez sings Mir' میں بھی شامل کیا گیا تھا' جسکی خصوصیت استاد ناظم علی کی سارنگی اور استاد تاری خاں کا طبلے پر سنگت کرنا تھا۔ اسی غزل کو جب مہدی حسن نے استاد نیاز حسین شامی کی دُھن میں گایا تو لتا منگیشکر نے کہا کہ مہدی حسن کے گلے میں بھگوان بولتا ہے۔

. سیّد رضی ترمذی (مرحوم) ایک نامور شاعر تھے اور ریڈیو پاکستان کے ادارے سنٹرل پروڈکشن یونٹ' لاہور میں کنٹرولر کے عہدے پر فائز رہے ہیں۔ ان کی ایک غزل 'پارہ پارہ ہُوا پیرہن جاں' کو بھی غلام علی نے گایا ہے۔
. رویا کریں گے آپ بھی

. رویا کریں گے آپ بھی
. تمہارے خط میں نیا اِک سلام کس کا تھا (داغ دہلوی)
. (یہ دُھن اپنی لَے اور سُروں کی وجہ سے دِلوں کو موہ لیتی ہے۔ یہ غزل غلام علی کے پروگرام 'نصف صدی کا قِصّہ' میں موضوعِ بحث بھی بنی رہی)
. وہ کبھی مل جائیں تو
. وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا (مومن خاں مومنؔ)
. یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں' یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں (ابن انشا)
. زخمِ تنہائی میں خوشبوئے حنا کس کی تھی
غلام علی کی گائی ہوئی چند غزلیں ہندوستانی فلموں میں بھی استعمال کی گئیں۔
. چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
. کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا ترا
. ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے
. کیا ہے پیار جسے
. مَیں نظر سے پی رہا ہوں
. مستانہ پئے
. یہ دل یہ پاگل دل میرا کیوں بُجھ گیا آوارگی
. اپنی دُھن میں رہتا ہوں
متذکرہ پی ٹی وی کے انٹرویو کے دوران' میرا یہ مُشاہدہ رہا کہ غلام علی اپنی ٹُھمری کی گائیکی کا انداز غزلیں گانے میں منتقل کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے بڑی محنت سے اور بقول ان کے شاعر ناصر کاظمی سے الفاظ کا صحیح تلفظ سیکھا ہے۔ ان کو مختلف الفاظ کو سُروں کے مختلف انداز سے نئے نئے اتصالی جوڑ کے ساتھ پیش کرنے کا محاورہ ہے۔ جیسا کہ ناصر کاظمی کی غزل میں لفظ 'لہر' (پہلے ذکر ہو چکا ہے)' لفظ 'بہانہ' (غزل: چپکے چُپکے) وغیرہ۔ دراصل مہدی حسن اور غلام علی کے گائیکی کا انداز' بھارتی گائیکوں کی نفسیات میں اتنا سرایت کر گیا تھا کہ انہوں نے ان دونوں گلوکاروں کا شعوری یا لاشعوری طور پر انداز اپنانا شروع کر دیا تھا' جیسا کہ طلعت عزیز' انوپ جلوٹا' ہری ہرن وغیرہ نے۔ پھر میں نے یہ بھی مشاہدہ کیا کہ غلام علی نے اُردو اور پنجابی زبانوں کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی گانے گائے۔ وہ دنیا کی سیر کو تو ہر وقت نکلے ہی ہوتے ہیں۔ انہوں نے نیپالی زبان میں بھی غزلیں گائی ہیں۔ یہ خوبصورت غزلیں ہیں:
. کِتنا کِتنا تمر و تصویر
. گجالوتی تُھلا تُھلا آنکھاں
. لایکاتی تُھلا
. کی چھارا دُھن
غلام علی نے مندرجہ بالا نغمے نامور نیپالی گلوکار نارائن گوپال کے ہمراہ گائے ہیں۔ موسیقار دیپک جنگام تھے۔

شاعری نیپال کے بادشاہ مہندرا کی تھی۔ان گانوں کی آڈیوالبم کا نام ہے 'نارائن گوپال' غلام علی رارا'۔ یہ غزلیں آج بھی نیپالی شائقین موسیقی محبت سے سُنتے ہیں۔ غلام علی' اگرچہ پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں مگر وہ بھارت' بنگلہ دیش' امریکہ' انگلینڈ اور مشرقِ وسطیٰ میں ایشین نژاد لوگوں میں یکساں مقبول ہیں۔ میڈیا پہ موجود چند سوالات' جوابات کے مطابق جب پاکستانی Pop Groups کے متعلق اُن سے استفسار کیا گیا تو انہوں نے فرمایا' میں ان گروپس کے اندازِ گائیکی پر حیران ہوں۔ آپ اسٹیج پر ادھر اُدھر بھاگ کے گانا کیسے گا سکتے ہیں؟ اسٹیج پرفارمنس کیلئے ہوتا ہے' نہ کہ کرتب دکھانے کے لئے!

غلام علی کی چند یادگار آڈیو البمز کے نام:

. سوراگ اِن کنسرٹ

.وِدلو(with Love)

.مست نظریں(Ecstatic Glances-Live in London-1984)

.غزلیں(Live at Islamabad)

.Passion

.ہنگامہ(Live in concert Volume 1)

.Poems of Love

. تیرے شہر میں

.سادگی

. حسین لمحے

.غزلز

.انجمن۔ بہترین غزلیں

.Soulful

.once more

.The Golden moments-پتہ پتہ بُوٹا بُوٹا

.Live in USA Vol.1-Private Mehfils series

.سُنو

.سوغات

.خواہش

.At his very best

.The finest recording of Ghulam Ali

.آوارگی

.Great ghazals

.The Golden Collection

. گیت اور غزلیں
. دل لگی
. کلامِ محبت
.چُپکے چُپکے (Live in Concert - England)
.رنگ ترنگ (Vol. 1&2)
. جانے والے
. ہیر
. خوشبو (یہ البم اورینٹل سٹار انجینئرز - برمنگھم - یُو کے کیلئے مَیں نے ریکارڈ کروائی تھی)
Ghulam Ali - The Very Best-Swar Ustav 2001.
.Songs of the wandering soul
. غالب - غزلیں - مہدی حسن اور غلام علی
.The latest - The best
. معراجِ غزل - غلام علی اور آشا بھونسلے

مندرجہ بالا گزارشات سے تو یہ اندازہ لگانا آسان ہی ہوگا کہ غلام علی ہندوستان میں بہت مقبول ہیں۔ اُن پر لکھی گئی بھویش سیٹھ اور سادھنا۔ جے۔ کی لکھی گئی کتاب کی رونمائی پر ان سے کیے گئے سوالات اور جوابات ذیل رقم ہیں۔ انہوں نے غزل گائیکی کے مستقبل اور اپنے دیرینہ دوست جگجیت سنگھ کے متعلق گفتگو کی۔

سوال: آپ نے غزل گائیک بننا کیوں پسند کیا؟

جواب: یہ میرے والد استاد دولت علی جعفری کا خواب تھا جو میں نے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے میرا نام بھی استاد بڑے غلام علی کی نسبت سے رکھا' جن کی شاگردی کا مجھے شغف رہا ہے۔

سوال: آپ کی گائیکی کا سفر اب تک کیسا رہا ہے؟

جواب: تھکاوٹ میں تو رہا ہوں پر سفر خوشمار رہا ہے۔ جہاں بھی گیا' مجھ پہ پھولوں کی بارش کی گئی۔ حتیٰ کہ جس جگہ مَیں پہلی مرتبہ بھی گیا' وہاں بھی محبت ملی۔

سوال: کیا غزل گائیکی روایت میں تبدیلی آئی ہے؟ آپ کے کیا احساسات ہیں؟

جواب: غزل گائیکی تو نہیں بدلی۔ لوگ اسے زبردستی تبدیل کرنے کے درپے ہیں۔ غزل کی صنف میں الفاظ کے تقدس کو موسیقی کے ذریعے بحال کرنا ایک گائیک کا فرض ہے۔

آج کل موسیقی کی سمت کسی اور ڈگر پہ جارہی ہے۔ لیکن صرف گائیک ہی ذمہ دار نہیں ٹھہرائے جاسکتے۔ سامعین بھی بے صبرے ہیں۔ ان کے پاس اچھی موسیقی' خاص طور سے غزلوں کو سُننے کیلئے وقت نہیں ہے۔ لیکن غزل گائیکی بحیثیت آرٹ کے بہترین نمونے کے ہمیشہ زندہ رہے گی۔ غزل سننے کے شائقین اور غزل سے عشق کرنے والے لوگ ہمیشہ موجود رہیں گے۔

سوال: کیا آپ کو پاکستان اور ہندوستان کے سامعین میں کوئی فرق نظر آیا ہے؟ ان دونوں ممالک میں کون سی

جگہیں آپکی پرفارمنس کیلئے بہترین ثابت ہوئیں؟
جواب: مجھے تو کوئی خاص فرق نظر نہیں آیا۔ مجھے لاہور میں پرفارم کرنے کا بہت لطف آتا ہے۔ وہاں پہ مجھے ذہین شائقین میسّر ہیں۔ وہ موسیقی کے اسرار و رُموز سے واقف ہیں۔ مجھے کلکتہ میں بھی گانے کا لطف آتا ہے۔ اگرچہ وہ زبان سے ناواقف ہیں لیکن موسیقی سے بہت قریب تر ہیں۔
سوال: بحثییت فنکار ' کبھی آپ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان وقتاً فوقتاً کشیدگی کا شکار رہے ہیں؟
جواب: نہیں! مجھے دونوں ممالک میں محبت دستیاب رہی ہے۔ کہیں کہیں مسائل بھی پیش آئے۔ مجھے تو کوئی فرق نہیں پڑا لیکن شائقینِ موسیقی کی مایوسی پہ ناخوش ہوتا! مجھے
ہندوستان آتے ہوئے پینتیس برس سے زیادہ عرصہ ہوگیا ہے اور ہر دورہ یادگار دورہ رہا ہے!
سوال: آپکو آپ کی کونسی دُھنیں زیادہ پسند ہیں؟
جواب: سب سے زیادہ 'مَیں اُن دھنوں کے قریب ہوں ' جنہیں شائقینِ موسیقی نے پسند کیا ہے جیسا کہ
. گئے دنوں کا سُراغ لے کر
. دائم پڑا ہوا تیرے در پر نہیں ہوں میں اور
. شام کو صبح چمن یاد آئی
بھارتی میڈیا میں یہ رپورٹ ہوا کہ 30، ستمبر 2011ء کو غلام علی اور جگجیت سنگھ نے اکٹھے اسٹیج پر پرفارمنس کیلئے آنا تھا لیکن غلام علی اکیلے ہی نمودار ہوئے۔ جگجیت سنگھ کے دماغ کی شریانیں پھٹنے کی وجہ سے (brain hamorrhage) وہ لیلی وتی ہسپتال میں داخل تھے۔ غلام علی نے کہا 'میں انتہائی ذہنی پریشانی اور دباؤ کا شکار ہوں۔ ہم دونوں 'اس امر سے قطع تعلق کہ ہم مختلف ممالک سے تعلق رکھتے تھے 'ایک creative work یعنی کہ تخلیق کاری کے بندھن میں جُڑے ہوئے تھے۔ میں ہر دو گھنٹے کے بعد ڈاکٹروں سے ٹیلیفون پر ان کی طبیعت کے متعلق معلومات حاصل کرتا رہا۔ بالآخر مجھے بتلایا گیا کہ ان کی طبیعت بحال ہوگئی۔ میں اپنی ہر نماز کے بعد انکی صحت کیلئے دعا گو رہتا ہوں۔ ان شاء اللہ وہ جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ پاکستان میں ہم غلام علی کی صحت کیلئے ہر وقت دعا گو رہتے ہیں کہ انہوں نے ہمیں سنہری لمحات فراہم کئے ہیں!

غزل گائیکی میں زندہ لہجہ، تابندہ آواز۔ اقبال بانو

خرم سہیل

زندگی کے دشت میں سراب کا تعاقب کرنا مقصود ہو، تو بھٹکنا بھی لازم ہو جاتا ہے۔ اس گمشدگی میں ہم خود کو کھو بیٹھے ہیں، تو کبھی کوئی خزینہ ہمارے ہاتھ لگ جاتا ہے، اب یہ کھیل قسمت کا ہے کہ نصیب میں کیا آتا ہے، لیکن خود سے بچھڑنے کے بعد واپسی کے لیے جن چیزوں کی معاونت درکار ہوتی ہے، اس میں سے پہلی بنیادی اور نادر شے وہ احساس ہے، جس کے زور پر ہم کچھ بھی محسوس کرتے ہیں، لکھے ہوئے الفاظ، گائے گئے حروف، سُریلی آوازیں، فن کی عکاس متحرک تصویریں، لب و لہجے کی پیش کاری اور جمالیات کے قیمتی نمونے اور نہ جانے کیا کیا کچھ، سب کا بیان ممکن نہیں ہے۔

کوئی خود سے بچھڑا ہوا ہے، تو ان احساسات کی انگلی تھام کر اپنی تلاش میں نکل جائے، بہت ممکن ہے، کچھ بازیافت ہو جائے۔ خود کو تلاش کرنے کا کٹھن کام اس وقت بہت سہل ہو جاتا ہے، جب مندرجہ بالا عناصر میں سے کوئی ایک بھی عنصر ہمارے قلب میں اتر جائے، روح میں سرایت کر جائے، ہم اس کے اسیر ہو جائیں، اب یہ کوئی صوت ہو یا صورت، حرفِ دل کی سچی حکایت بن جاتی ہے۔ دنیائے موسیقی میں ''اقبال بانو'' کی گائیکی اسی درجے پر فائز ہے، جس کی معاونت اگر انتہائے شوق کو دستیاب ہو، تو خود سے ملاقات مشکل امر نہیں رہتی، اپنی تلاش کا کام نہایت آسان ہو جاتا ہے۔ ان کی آواز حروف کو زندہ لہجہ عطا کرتی ہے، ہم خوش نصیب ہیں، اس آواز کی چاشنی سے ہماری سماعتیں زرخیز ہوتی ہیں۔

انجم شیرازی نے اپنی کتاب ''غزل گائیکی'' میں اس فن کے تین ادوار بیان کیے ہیں، جن کے مطابق ''قبل از تقسیم اور قیامِ پاکستان کے بعد سے لے کر عہد حاضر تک تین عہد ہیں، جن میں اس فن کی ترقی و ترویج ہوئی اور نایاب آوازوں نے سماعتوں میں رس گھولا۔ پہلے دور کو دو شاخوں میں تقسیم کیا گیا، پہلی شاخ متقدمین کی ہے، جس میں انہوں نے جن فنکاروں کو شامل کیا، ان میں گوہر جان، عنایتی بائی ڈھیرو والی، کے ایل سہگل، ماسٹر مدن، کملا جھریا، جوتیکا رائے، مختار بیگم، ملکہ پکھراج اور اختری بائی فیض آبادی ہیں، دوسری شاخ متاخرین کی ہے، جس میں مجدد نیازی، سی ایچ آتما، شمشاد بائی دلی والی، نیلم بائی حجرے والی، کانن دیوی، سریندر، شانتا آپٹے، جہاں آرا کجن، پنکج ملک، امیر بائی کرناٹکی، خورشید بانو، ودیا ناتھ سیٹھ، سریندر کور، راج کماری، طلعت محمود، نور جہاں، زاہدہ پروین، محمد رفیع، ثریا، لتا منگیشکر، آشا بھوسلے، کشور کمار، مبارک بیگم، منور سلطانہ، سلیم رضا، منیر حسین، نسیم بیگم شامل ہیں۔ دوسرا دور تقسیم پاکستان کے بعد کا ہے، جس میں مہدی حسن، فریدہ خانم، اقبال بانو، غلام علی پرویز مہدی، امانت علی خاں، اعجاز حسین حضروی، حسین بخش گلو، شوکت علی، رونا لیلیٰ، شوکت علی، حبیب ولی محمد، ناہید اختر، نیرہ نور، اعجاز قیصر، بلقیس خانم، تصور خانم، طاہرہ سید، استاد ظفر علی خاں، منی بیگم، عابدہ پروین، شاہدہ پروین، سلامت علی، عذرا سلامت، غلام عباس، فدا حسین، مسعود ملک، حامد علی خاں، اسد امانت علی خاں، امتیاز علی خاں، ریاض علی خاں، استاد رئیس خاں اور ٹینا ثانی شامل ہیں۔ تیسرا دور موجودہ عہد کے غزل گائیکوں کے متعلق ہے۔''

قیام پاکستان کے بعد موسیقی کے شعبے میں سب سے زیادہ جس انداز گائیکی کو مقبولیت حاصل ہوئی، وہ غزل گائیکی ہے۔غزل گائیکی کا سب سے روشن پہلو اس کی لسانی باریکیاں اور صوتیات ہیں، جس غزل گلوکار نے بھی اس کا خیال رکھا، اس کو مقبولیت حاصل ہوئی۔اقبال بانو کے ہاں بھی یہ خوبی بدرجہ اتم موجود تھی۔ان کی پیدائش کا سن 1935 ہے۔بی بی سی اردو سروس کے مطابق ''اقبال بانو نے روہتک میں زہرہ بائی نام کی ایک گلوکارہ کے گھر میں جنم لیا۔سُر سنگیت ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا اور روہتک کا مخصوص اندازان کی تربیت میں در آیا تھا، البتہ سن بلوغت کو پہنچنے پر جب انہوں نے آل انڈیا ریڈیو کے دہلی مرکز سے گانا شروع کیا، تو اردو کے معیاری تلفظ اور ادائیگی کے دہلوی انداز سے ان کی شناسائی ہوئی۔''

اقبال بانو نے کلاسیکی موسیقی کی ابتدائی تعلیم دہلی میں قیام کے دنوں میں کسی گمنام ہندو استاد سے حاصل کی، جہاں سے ان کا فن مہمیز ہوا۔انڈیا میں کلاسیکی موسیقی کے معروف ''دلی گھرانے'' کے استاد چاند خان کی شاگردی اختیار کر کے یہ فن باقاعدہ سیکھنا شروع کیا۔تقسیم ہند کے بعد ہجرت کر کے لاہور آ گئیں، یہاں ریڈیو پاکستان سے وابستگی ہوئی، مقامی موسیقاروں سے مزید تربیت حاصل کرنے کے بعد، ریڈیو کے لیے گائیکی کی ابتدا کی، پھر فلموں کے لیے بھی گایا۔وائس آف امریکا کی مضمون نگار، صفیہ کاظم کے مطابق ''فلم کے لیے ان کا سب سے پہلا گانا'' پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے'' تھا۔شاہ نور اسٹوڈیو میں ''گمنام'' فلم کی مہورت اسی گانے سے ہوئی اور پہلا گانا ایک ہی ٹیک میں اوکے ہو گیا۔اس کے بعد نور جہاں ان کے لیے مٹھائی لے کر آئیں اور کہنے لگیں کہ تم بہت نام پیدا کرو گی۔''

1952 میں شادی کے بعد جب ملتان میں قیام پذیر ہوئیں، تو کافی گانے میں بھی دسترس حاصل کی۔70 کی دہائی میں ٹیلی وژن سے نشر ہونے والی غزلوں کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔آل انڈیا ریڈیو سے ریڈیو پاکستان تک کے سفر میں ان کو بے حد پذیرائی ملی۔پاکستان ٹیلی وژن کے اس بلیک اینڈ وائٹ دور میں نشر ہونے والی ان غزلوں نے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔انور کمال پاشا نے ان کو فلمی دنیا میں متعارف کروایا۔انہوں نے پس پردہ گیتوں میں اپنی آواز کا جادو جگایا، مگر پھر بہت جلد انہوں نے خود کو غزل گائیکی تک محدود کر لیا۔زندگی کے آخری دور میں گائیکی سے بھی ناطہ ختم کر لیا تھا اور گوشہ نشین ہو گئی تھیں۔

جرمن ویب سائٹ ''ڈوئچے ویلے اردو سروس'' کے مضمون نگار ''شامل شمس'' کے مطابق ''21 اپریل، 2009 کو اقبال بانو ایک نئی منزل کی جانب کوچ کر گئیں اور موسیقی کی دنیا کو ہمیشہ کے لیے سوگوار چھوڑ گئیں۔آل انڈیا ریڈیو دہلی سے گائیکی کے سفر کا آغاز کرنے والی اقبال بانو کافی عرصے سے ہی گانا ترک کر چکی تھیں۔کس کو یاد تھا کہ وہ کہاں ہیں، کس جگہ رہتی ہیں، اب کیوں نہیں گاتیں۔''

اقبال بانو کی طرز گائیکی کے لیے یہ کہا جاتا تھا، انڈیا میں جس طرح بیگم اختر کے نام سے مشہور اختری بائی فیض آبادی نے غزل گائیکی کو عروج دیا، پاکستان میں اسی انداز میں اقبال بانو نے غزل گائیکی کی روایت مضبوط کی۔وہ چونکہ اسی خطے سے تعلق رکھتی تھیں، اس لیے ان کے ہاں ماحول کا اثر تھا، پھر اساتذہ کی تربیت اور گائیکی کی فضا نے مل جل کر ان کی آواز کو ایک طلسماتی انداز عطا کیا، جس کی تاثیر سماعتوں میں رس گھولتی تھی۔اقبال بانو کو علم موسیقی کے ساتھ ساتھ درسی تعلیم سے بھی دلچسپی تھی، اسی بنیاد پر انہوں نے نصابی تعلیم بھی حاصل کی۔انہیں اردو کے علاوہ فارسی پر بھی قدرت تھی۔انہوں نے کئی ممالک کے بادشاہوں اور سربراہوں کے سامنے بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا، بالخصوص افغانستان میں

جب جشن کابل منایا جاتا، توان کو ضرور مدعو کیا جاتا۔ انہوں نے کثیر تعداد میں فارسی غزلیں بھی تیار کر رکھی تھیں، جن کو یہ غیر ملکی دوروں اور خاص طور پر افغانستان میں فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیش کرتیں۔ افغانستان میں ان کی شہرت عوامی سطح تک اثر رکھتی تھی۔ اردو زبان کی لسانی باریکیوں اور درست تلفظ کی وجہ سے ان کی گائیکی کا لہجہ پاکستان میں بھی سامعین کے لیے بہت پرکشش تھا۔

غزل گانے کے لیے گلوکاروں کو ردیف قافیے کی آسانی میسر ہوتی ہے، استھائی اور انترے کی مدد سے یہ کام اور آسان ہو جاتا ہے، مگر کسی نظم کو مربوط انداز میں گانا جان جوکھوں کا کام ہے۔ اقبال بانو کا یہ بھی کمال ہنر تھا، انہوں نے فیض صاحب کی فرمائش پر ان کی نظم ''دشت تنہائی میں'' کو اس طرز سے گایا کہ وہ حروف زندہ و جاوید ہو گئے۔ فیض صاحب نے ان کو یہ نظم تحفے میں دی تھی، انہوں نے اس تحفے کی ایسی قدر کی، جس کو بیان کرنے کے لیے الفاظ کم پڑ جائیں۔ ایک ایک حرف کو پوری طرح جی کر گایا۔ حروف کی ادائی تو گلوکار سازوں کی مدد سے دلکش بنا لیتے ہیں، لیکن حروف کی معنویت کا بیان ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ اقبال بانو نے اس نظم کو اپنی آواز سے سماعتوں کے لیے پینٹ کیا، ہر سامع کے تصور میں ان کی آواز نے ایک منفرد تصویر بنائی، اس پر مربوط ادائی نے ان کو فن کی معراج تک پہنچا دیا۔

پروفیسر اسرار کا کلام ''ہم دیکھیں گے'' اقبال بانو نے گایا، تو ایسا لگا، جیسے موسیقی کی صورت میں انقلاب جیسے لفظ کا ترانہ ایجاد ہو گیا ہو، اقبال بانو کے لہجے سے جب یہ حروف ادا ہوئے، تو گویا آمریت کے غرور کا سر خاک میں مل گیا۔ عوام اس کلام اور انداز گائیکی پر مر مٹے، ان کو ایسا محسوس ہوا، یہ ان کے دل کی پکار ہے، جس کا لہجہ ایجاد ہو گیا ہے۔ ایک زمانے کی جدوجہد کا احوال سناتا یہ کلام اقبال بانو کے لیے شہرت کے مزید دروازے کھول گیا۔ اقبال بانو نے اس کلام میں ایسی تاثیر انڈیلی، گویا حرف نہ ہوئے، تصویریں ہو گئیں، جن کو ایک ایک کر کے دیکھ لیا جائے، یہ اقبال بانو کی گائیکی کی حد آخر تھی، جس سے آگے جانا شاید کسی بھی گلوکار کے لیے، بہت دشوار ہو گا۔

یہ بات بھی واضح رہے ''ہم دیکھیں گے'' کی شہرت یہ ہے کہ یہ فیض صاحب کا کلام ہے، جو کہ درست نہیں، اس کے شاعر پروفیسر اسرار ہیں، مگر بدقسمتی سے کسی محقق نے اس حقیقت کو کھوجنے اور بیان کرنے کی سعی نہیں کی۔ موسیقار ارشد محمود نے راقم کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ ''جب اقبال بانو نے 'ہم دیکھیں گے' گائی، تو ضیا الحق کے زمانے میں ہی یہ مقبول ہو گئی۔ انہوں نے جب لاہور آرٹس کونسل میں آٹھ سو حاضرین کے سامنے یہ غزل گائی، تو لوگ سن کر پاگل ہو گئے۔ یہ پروفیسر اسرار کی بہترین کاوش تھی، جس کو اقبال بانو نے نہایت احسن طریقے سے نبھایا۔''

پاکستان فلم میگزین کی ویب سائٹ پر مظہر اقبال کے مطابق ''وہ پاکستانی فلمیں، جن میں اقبال بانو نے اپنی آواز کا جادو جگایا، ان کی تعداد 22 ہے، جبکہ کل 41 گیت گائے ہیں، جن میں چھتیس اردو اور پانچ پنجابی کے گیت شامل ہیں۔'' انہوں نے جن فلموں میں بطور پس پردہ گلوکارہ کے گایا، ان کے نام بالترتیب درج ذیل ہیں۔

۔مندری (1949)	۔غلط فہمی (1950)	۔غیرت (1951)
۔گمنام (1954)	۔قاتل (1955)	۔سوہنی (1955)
۔سرفروش (1956)	۔حمیدہ (1956)	۔نوراں (1957)
۔عشق لیلیٰ (1957)	۔واہ رے زمانے (1958)	۔حسرت (1958)
۔نغمہ دل (1959)	۔شیرا (1959)	۔تیرے بغیر (1959)

۔ناگن (1959) ۔بہروپیا (1960) ۔ایاز (1960)
۔گل بکاؤلی (1961) ۔اک منزل دوراہیں (1962) ۔چراغ جلتا رہا (1962)
۔جگنی (1964) ۔عشرت (1964)

ساٹھ کی دہائی کے وسط تک اقبال بانو نے پاکستانی فلموں کے لیے گایا، اس کے بعد خود کو نیم کلاسیکی محفلوں اور خالصتاً غزل گائیکی تک محدود کرلیا، وقت نے ان کا یہ فیصلہ درست ثابت کیا، انہیں ٹیلی وژن کے لیے گائی جانے والی غزلوں پر بے حد شہرت ملی۔اس دور کی کئی مشہور غزلیں ہیں، جن کی گونج آج بھی تازہ ہے، ابھی حال ہی میں ان کی گائی ہوئی غزل ''دشت تنہائی میں'' کو نئی نسل کی گلوکارہ ''میشا شفیع'' نے کوک اسٹوڈیو کے سیزن 8 میں گایا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے، عہد حاضر میں بھی ان کے فن شناس موجود ہیں۔نئی نسل بھی ان کی فنی اہمیت سے واقف ہے۔ان کی چند ایک مشہور غزلوں کے عنوانات یہاں درج ذیل ہیں، جن سے ان کی گائیکی، کلام کے انتخاب اور شہرت کے حوالوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۔دشت تنہائی میں (فیض احمد فیض)
۔ہم دیکھیں گے (پروفیسر اسرار)
۔الفت کی نئی منزل کو چلا (قتیل شفائی)
۔مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے (مرزا غالب)
۔تولاکھ چلے ری گوری تھم تھم کے (سیف الدین سیف)
۔محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے (حفیظ ہوشیار پوری)
۔داغ دل ہم کو یاد آنے لگے (باقی صدیقی)
۔رنجش ہی سہی (احمد فراز)
۔ہم آپ قیامت سے گزر کیوں نہیں جاتے (محبوب خزاں)
۔اب کے ساون تو سجن گھر آجا (حسرت موہانی)
۔تیرے وعدے کو بت حیلہ جو (داغ دہلوی)
۔میں نظر سے پی رہا ہوں (انور مرزا پوری)
۔کچھ تو احساس زیاں (ناصر کاظمی)

اقبال بانو کو قتیل شفائی سے ایک تعلق خاص تھا۔اپنی آپ بیتی ''گھنگرو ٹوٹ گئے'' میں قتیل شفائی بیان کرتے ہیں کہ ''سیف الدین سیف کے گیت (تو لاکھ چلے ری گوری تھم تھم کے) کی دھوم جب دور دور تک پھیل گئی، تو دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ 'کاش میں بھی کوئی نایاب گیت لکھوں'۔'' فلم 'گمنام' کے بعد انور کمال پاشا (فلم ساز، ہدایت کار) نے فلم 'قاتل' بنانے کا اعلان کیا، جس میں ایک خاص سچویشن کے لیے بہت عمدہ گیت درکار تھا۔اس موقع پر قتیل شفائی اور سیف الدین سیف دونوں نے ایک گیت لکھا، مگر جب سیف الدین سیف نے قتیل شفائی کا لکھا ہوا گیت دیکھا، تو اپنا گیت واپس لے لیا اور یہ اعتراف کیا 'مجھ سے بہتر گیت قتیل شفائی کا ہے'۔کئی تنازعات کے بعد وہ گیت فلم کے لیے حتمی طور پر طے ہوا، قتیل شفائی سے پوچھا گیا کہ کس گلوکارہ سے گوایا جائے، تو انہوں نے اقبال بانو کا نام لیا، بلکہ انہیں

ملتان سے لینے بھی خود گئے اور یوں اس گیت کی تخلیق ممکن ہوئی۔ یہ الگ بات ہے، یہ تعلق خاص آگے چل کر ٹوٹ گیا، مگر اقبال بانو کی گائیکی کے فلمی دور میں قتیل شفائی کی معاونت کا عملی کردار رہا۔

اقبال بانو نے غزل گائیکی کے انداز میں بھی کلاسیکی روایات کی پاسداری کی، ٹھمری، دادرا، گیت اور کافی کے رنگ گھول دیے، استاد چاند خاں کی اس شاگرد نے موسیقی کو اس طرح اپنی روح میں اتار کر گایا کہ چار چاند لگ گئے، زمانہ جس کو سانس تھامے سنتا رہا۔ شعرا جس کے لیے خواہش کرتے رہے، کبھی وہ ہمارا کلام گائے، کئی ایک تو اس کے حسن اور فن دونوں کے قتیل ہوئے۔ ان کی گائی ہوئی ٹھمری ''کاہے ستائے موہے'' راگ کھماج میں کمپوز ہے، جبکہ ''سوتن گھر نہ جا'' کا راگ ''تلک کموذ'' ہے، اسی طرح ''نہیں پڑے موہے چین'' راگ دیس'' اور ''گوری تورے نینا کجر بن کارے'' راگ پیلو میں سمویا گیا ہے، یہ سب کلاسیکی شاہکار دھنیں ہیں، جن کو اقبال بانو نے اپنی فنی ریاضت سے امر کر دیا۔

برصغیر کی غزل گائیکی کی تاریخ اقبال بانو کے بغیر ادھوری رہے گی اور دلی گھرانے کا تذکرہ بھی، جس کی ہونہار شاگرد نے دنیا بھر میں اس گھرانے کو متعارف کروایا۔ پاکستان کی موسیقی کا بیان بھی ان کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ وہ تہذیب جس میں فن قیمتی میراث ہوا کرتی تھی، ہم اس سے اب دور ہوتے جا رہے ہیں، یعنی اپنے آپ سے بچھڑتے جا رہے ہیں، مگر مجھے یقین ہے، ایک وقت ضرور آئے گا، جب تہذیبی آوارگی کا اختتام ہوگا، ہم واپس تہذیب وتمدن کی طرف لوٹیں گے، اس واپسی اور بازیابی کے سفر میں سب سے زیادہ جو چیزیں معاونت کریں گی، وہ فنون لطیفہ ہوں گے، اس میں بھی سرفہرست موسیقی، جس کا کام ہماری تہذیب میں عمل تنفس کا ہے۔ اس روشن دور کو یاد کرتے ہوئے جن آوازوں کی یادشدت سے آئے گی، ان میں اقبال بانو بھی ہوں گی، جن کے بغیر ہماری موسیقی کا پورا منظر نامہ ادھورا ہے۔ تکمیل کی علامت ہو جانا ہی کسی فن کار کے فن کی معراج ہے اور اقبال بانو نے دلی سے جو ریاضت شروع کی تھی، ملتان پہنچنے تک اس کا ثمر پالیا، یہی کسی فنکار کا سب سے بڑا محنتانہ اور خراج ہوتا ہے۔

حوالہ جات:

انجم شیرازی۔ غزل گائیکی۔ سانجھ پبلی کیشنز۔ لاہور۔ پاکستان

مضمون۔ بی بی سی اردو سروس۔ برطانیہ

صفیہ کاظم، وائس آف امریکا

شامل شمس۔ ڈوئچے ویلے اردو سروس۔ جرمنی

خرم سہیل۔ سُر مایا۔ الحمد پبلی کیشنز۔ لاہور۔ پاکستان

مظہر اقبال۔ پاکستان فلم میگزین۔ پاکستان

قتیل شفائی۔ گھنگرو ٹوٹ گئے۔ سنگ میل پبلی کیشنز۔ لاہور۔ پاکستان

قتیل شفائی۔ گھنگرو ٹوٹ گئے۔ آن لائن ایڈیشن۔ ریختہ ویب سائٹ، دہلی۔ انڈیا

سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

(رپورتاژ)

ترکی میں اُردو

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

بریگیڈیر صدیق سالک نے اپنے کسی سفرنامے میں لکھا تھا کہ ایک مرتبہ وہ پاکستان سے ترکی جانے والے ایک فوجی وفد میں شامل تھے۔ وہاں قیام کے دوران ایک روز میزبانوں نے مطلع کیا کہ کل آپ لوگوں کو اردو اکیڈمی کا دورہ کرایا جائے گا۔ وفد کے دوسرے ارکان کے دل تو یہ سن کر بجھ گئے (بھلا اردو اکیڈمی میں فوجیوں کی کیا دلچسپی؟) لیکن سالک صاحب اپنے ادبی پس منظر کے باعث خوشی کے مارے رات بھر سو نہ سکے اور اُن سوالات کی تیاری کرتے رہے جو وہ اکیڈمی کے ذمہ داران سے ترکی میں اردو کے موضوع پر پوچھتے۔

دوسرے دن وفد کو گاڑی میں بٹھا کر اکیڈمی لے جایا گیا۔ ساتھ جانے والے ترک گائیڈ نے جب دُور سے ''اردو اکیڈمی'' کی نشان دہی کی تو بریگیڈیر صاحب اُس وسیع و عریض اور پرشکوہ عمارت کو دیکھ کر دنگ رہ گئے کیونکہ ہمارے یہاں صوبائی دارالحکومتوں میں اکادمی ادبیات، رائٹرز گلڈ، مقتدرہ قومی زبان (''اب ادارہ فروغ اردو'') اور انجمن ترقی اردو وغیرہ کے علاقائی دفاتر پر ناصر کاظمی کا یہ مصرع صادق آتا ہے کہ ع اداسی بال کھولے سو رہی ہے۔ آخر کار پاکستانی وفد جب ''اردو اکیڈمی'' کے صدر دروازے پر پہنچا تو دو باوردی افسران نے اسے سیلوٹ کیا اور فصیلوں پر بگل بجنے لگے۔ اُس وقت یہ عقدہ کھلا کہ وہ دراصل ترکی کی ملٹری اکیڈمی تھی۔

اہل علم جانتے ہیں کہ اردو، ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی فوج کے ہیں۔ شاید اسی لیے ہم نے اپنے پہلے دورۂ ترکی میں بعض افراد کو اردو (زبان) کو ''اُردی'' کہتے سنا تو گمان ہوا کہ یہ ''زبان'' کو ''فوج'' سے ممتاز کرنے کی غرض سے اس طرح کہتے ہیں۔ بہرحال ہمارے سامنے جس کسی نے بھی ہماری قومی زبان کی یوں بے دریغ دہری تصغیر کی، ہم نے جھٹ اپنا قومی فریضہ ادا کرتے ہوئے اسے ٹوکا ''بھائی صاحب، اردو کہیے، اردو!''

یہ بات کوچہ و بازار کی تھی۔ جب ہم استنبول یونیورسٹی کے شعبہ ادبیات کے پروفیسر (ڈاکٹر) دُرمُش بلگُر (DURMUS BULGUR) سے ملے تو ان کی زبان سے اپنی زبان کی قدر و منزلت سن کر ہمارا سیروں خون بڑھ گیا۔ پروفیسر صاحب نے بتایا کہ ان کے شعبے میں عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ اردو کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ بی اے (آنرز) کی سطح کا چار سالہ کورس ہوتا ہے اور فی الحال ایک سو طالب علم اردو پڑھ رہے ہیں۔ بی اے (آنرز) کے بعد ایم اے اور پھر پی ایچ ڈی کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ اس وقت ایک طالب علم اور ایک طالبہ ان کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی تیاری کر رہے تھے۔ طالب علم کے مقالے کا موضوع تھا ''اردو نثر میں ترک اور ترکی'' جب کہ طالبہ ''اردو شاعری میں ترک اور ترکی'' کے موضوع پر مقالہ لکھ رہی تھی۔ ہم نے پروفیسر صاحب سے دریافت کیا کہ اردو کی تعلیم حاصل کرنے والوں کے لیے روزگار کے کیا مواقع ہیں؟ تو ان کا جواب تھا ''لسانیات میں دلچسپی رکھنے والے اردو کو اپنے علم میں اضافے اور اس کے وقیع ادب تک رسائی کی غرض سے پڑھتے ہیں۔ جہاں تک روزگار کا تعلق ہے، ہمیں اپنے شعبے کے لیے اساتذہ مل جاتے ہیں۔'' اس پر ہمیں یوسفی صاحب یاد آ گئے۔ ''زرگزشت'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں ''فلسفہ پڑھ کے آدمی صرف ایک کام کر سکتا

ہے: دوسروں کو فلسفہ پڑھا سکتا ہے۔''

پروفیسر دُرمُش ہم سے نہایت شستہ لہجے میں گفتگو کر رہے تھے اور آدھے گھنٹے کی ملاقات میں کہیں بھی یہ اندازہ نہیں ہوا کہ اردو اُن کی مادری زبان نہیں۔ انہوں نے بتایا کہ انقرہ یونیورسٹی میں بھی اردو پڑھائی جاتی ہے۔ افسوس، ہم وہا ل نہ جا سکے کیوں کہ اسی اثنا میں تعلیمی اداروں میں گرمی کی تعطیلات شروع ہو چکی تھیں۔ پروفیسر صاحب کے مطابق اردو زبان میں ترکی کے متعدد الفاظ اپنے اصل معانی کے ساتھ شامل ہیں۔ چند الفاظ ہم نے نوٹ کیے یعنی: خود یعنی، تنہا، شکایت، بازار، دادا، آزاد، ہوا، نان، کوفتے، عصمت، گل، انسان، شاعر، باران (بارش)، خبر، نظر، شال، حمام، مشہور، بابا، شلوار، رحل، دنیا، سیاحت، شان، مرکز، قوت، ہلال، ترجمان، ماضی اور استقبال وغیرہ۔ ہمارے قومی ترانے میں موخر الذکر سات الفاظ (شان، مرکز، قوت، ہلال، ترجمان، ماضی اور استقبال) ترکی کے ہیں۔ (''مقتدرہ قومی زبان'' کے تحت شائع کردہ کتاب ''اردو اور ترکی کے مشترکہ الفاظ'' کے مطابق اردو اور ترکی کے مشترکہ الفاظ کی تعداد 2608 ہے لیکن ان میں عربی / فارسی وغیرہ سے تشکیل پائے جانے والے الفاظ بھی شامل ہیں۔) بعض الفاظ جو اردو میں رائج ہیں ان کا تلفظ وہاں مختلف ہے۔ مثلاً ترکی زبان میں چونکہ ب، داور ق کی آوازیں نہیں ہیں اس لیے وہ لوگ ایوب کو ''ایوپ''، مراد کو ''مرات اور قربان، قبر، قورمہ، قانون، صدقہ، شفق وغیرہ کو بالترتیب کربان، کبر، کورما، کانون صدکا اور شفک بولتے ہیں۔ ترکی زبان میں ''خ'' نہیں ہے اس لیے اس کا تلفظ ''ح'' جیسا ہوتا ہے۔ ماضی کی ایک نامور ترکی مصنفہ جنہیں ہم خالدہ ادیب خانم کے نام سے جانتے ہیں وہاں حالدہ ادیب حانم کہلاتی ہیں۔ ہمارے خلیل الرحمٰن ترکی جا کر حلیل الرحمٰن ہو جائیں گے۔ ''ک'' کا تلفظ مضافات کے لوگ ''چ'' سے مشابہ ادا کرتے ہیں۔ اس بات کی تصدیق کے لیے ہم نے اپنے گائیڈ سے کہا کہ وہ ذرا ''سورہ کوثر'' تو سنائے۔ اُس نے شروع کیا ''انا اعطینک چل چوثر...'' ہم نے کہا بس بس، شکریہ۔ البتہ قاری اور دیگر پڑھے لکھے حضرات ''ک'' کو صحیح طور پر ادا کرتے ہیں۔

بعض الفاظ کے وہاں معانی مختلف ہیں مثلاً پہلے تو ''اردو'' ہی کو لیجیے جو وہاں فوج ہے۔ اسی طرح ''مولا'' مختصر آرام، ''شیریں'' میٹھے کے علاوہ حسین، ''صاحب'' (صرف) مالک اور ''سبزہ'' ترکاری کے معنی مستعمل ہیں۔ لفظ ''ڈاکٹر'' ہمارے یہاں معالج یا پھر ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے حامل شخص کے لیے بولا جاتا ہے۔ جبکہ وہاں اس کے معنی ہیں ''ماہر''۔ چنانچہ ہم نے ایک سائن بورڈ پر Kofte Doktor لکھا ہوا دیکھا۔ گائڈ سے پوچھا تو اس نے بتایا ''یہ شخص کوفتے پکانے میں ماہر ہے۔'' گویا باورچی بھی ترکی میں ''ڈاکٹر صاحب'' قرار پائے جبکہ ہمارے یہاں ماضی کے ایک (پی ایچ ڈی) وزیر قانون کو بھی ڈاکٹر تسلیم نہیں کیا گیا۔

ترکی کے ایک اور شہر قونیہ میں (جو عظیم صوفی شاعر مولانا رومیؒ کی آخری آرام گاہ کے باعث چار دانگِ عالم میں مشہور ہے) ہماری ملاقات وہاں کے گورنر اور ان کی بیگم سے ہوئی۔ گورنر صاحب کا نام آئی دِن نزیہہ دوعان (AYDIN NEZIH DOGAN) تھا۔ ترکی کے لوگ پاکستان اور اس کے عوام سے کتنی محبت کرتے ہیں اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ معزز جوڑے نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ہم اور ہماری بیگم سے کچھ دیر بات چیت کی اور بعد ازاں تصویریں بھی کھنچوائیں۔ گورنر صاحب نے بتایا کہ وہ ایک بار کراچی آچکے ہیں۔ اہل پاکستان کے لیے انہوں نے خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کیا جبکہ ایسے ہی جذبات کا اظہار ہم نے اہل ترکی کے لیے کیا۔ جب ہم نے گورنر صاحب کے سیکریٹری سے بیگم صاحبہ کا نام پوچھا تو انہوں نے لکھوایا ''HATICE DOGAN'' ہم نے اپنی انگریزی

جھاڑی'' ہیپٹس؟'' انہوں نے تصحیح کی ''نہیں، حتی جے۔'' ہم نے حیرت ظاہر کی ''یہ کیا نام ہوا؟'' انہوں نے قدرے تعجب سے انگریزی میں سوال کیا ''آپ پیغمبر اسلام ﷺ کی پہلی شریکِ حیات کا نام نہیں جانتے؟'' ہم نے جواب دیا ''کیوں نہیں جانتے؟ خدیجہ۔'' بولے ''وہی، حتی جے۔''

کسی عورت کی تکریم مقصود ہو تو ترک لوگ اس کے نام کے بعد ''حاتون'' یا ''حانم'' کا اضافہ کرتے ہیں اور اگر کسی مرد کی تعظیم کرنی ہو تو اُس کے نام کے ساتھ ''بے'' کا لاحقہ لگاتے ہیں۔ چنانچہ ایک ٹی وی ڈرامے میں ہم نے دیکھا کہ گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے ہوئے افراد کرسی عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہے تھے ''حاکم بے!'' یعنی ''جج صاحب!'' اب ذرا معانی کی تبدیلی پر غور فرمایئے۔ ہمارے خطے میں کسی کی ہمت ہے کہ عدالت میں کہے ''جج بے!'' گویا جو لفظ وہاں کلمہ توقیر ہے، یہاں وہی لفظ کلمہ تحقیر ہے کہ کسی کی زبان سے ادا ہو جائے تو فوراً ''اندر'' ہو جائے۔

آخر میں چند باتیں پروفیسر دُرمُش بُلگُر کے حوالے سے۔ انہوں نے قونیہ اور انقرہ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد استنبول یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ بعد ازاں بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی (ملتان) کے پروفیسر (ڈاکٹر) اے۔ بی اشرف کی زیرِ نگرانی اردو میں پی ایچ ڈی کے مقالے کی تکمیل کی جس کا موضوع تھا ''برصغیر میں انیسویں صدی کی فکری تحریکیں'' اور اس مقصد کے لیے انہوں نے لاہور، ملتان، پشاور، دیوبند، علی گڑھ اور اعظم گڑھ کا سفر بھی کیا۔ آج کل پروفیسر صاحب اورینٹل کالج علامہ اقبال (اولڈ) کیمپس یونی ورسٹی (پنجاب) میں ''رومی چیئر برائے ترکی زبان وثقافت'' کے چیئر مین ہیں۔

ایک ایسے معاشرے میں جہاں قرآن حکیم کی تلاوت بھی (عموماً) لاطینی زبان میں چھپے ہوئے الفاظ کی مدد سے کی جاتی ہے پروفیسر دُرمُش سے اردو میں تفصیلی گفتگو کرنے کے بعد باہر نکلتے وقت ہم داغ کا یہ مصرع (تھوڑے سے تصرف کے ساتھ) زیرِ لب گنگنا رہے تھے ع ''سارے جہاں'' میں دھوم ہماری زباں کی ہے۔

یہی تو ٹوٹے دلوں کا علاج ہے

(مزاح)

جس کی سوکن اچھی...

ڈاکٹر۔ایس۔ایم۔معین قریشی

جب ہمارا کوئی دوست اپنے نومولود بچے کے نام میں بہت تردّد کرتا ہے تو ہم اسے مشورہ دیتے ہیں کہ بھائی، اس مرتبہ کچھ بھی رکھ لو۔ آئندہ کوالٹی پر توجہ دینا، نام میں کیا رکھا ہے۔ یوں بھی دیکھیے، بعض لوگ مُراد، نام ہونے کے باوجود تمام عمر نامُراد رہتے ہیں اور بعض نام کے مسکین ہوتے ہیں لیکن مقدر میں تسکین لکھوا کر لاتے ہیں جیسے مرحوم پروفیسر (ڈاکٹر) مسکین حجازی تھے یا جیسے لاہور کی فقیر فیملی ہے۔ جس میں نامی گرامی رئیس پیدا ہوئے اور ماشاءاللہ ہوتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ ایک تیسری قسم کے لوگ اسم بامسمّٰی ہوتے ہیں یعنی جو نام وہی پہچان جیسے زرداری، بےنظیر، مشرف وغیرہ۔ ان ہی میں ہمارے ایک دوست خوش بخت فراست بھی ہیں کہ تقدیر اُن پر مہربان رہتی ہے اور تدبیر کی لگام پر اُن کی گرفت مضبوط ہے۔ کبھی گھاٹے کا کوئی سودا تو انہوں نے کیا ہی نہیں۔ پوری زندگی اس اصول پر کاربند رہے کہ آپ ہمارے یہاں آئے تو کیا لے کر آئیں گے؟ اور ہم آپ کے وہاں گئے تو آپ ہمیں کیا دیں گے؟ تاہم گزشتہ ماہ جب وہ ہمارے غریب خانے پر تشریف لائے تو اپنی چھوٹی بیگم اور بڑی بیٹی کو ساتھ لے کر آئے۔ ہم یہ بتاتے چلیں کہ فراست صاحب اپنی دوعدد راضی بہ رضا اور خوش وخرم بیویوں کے ساتھ گلشن اقبال کے چار کمروں والے ایک دو منزلہ بنگلے میں قیام پذیر ہیں۔ ہماری اطلاع کے مطابق اُنہیں آگ اور بارود کو ایک ساتھ رکھنے میں کبھی کسی مسئلے کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اکثر محفلوں میں اُن کی دونوں بیگمات کو ''پُرامن بقائے باہمی'' کا عملی نمونہ بنے دیکھا گیا ہے۔ ایسی مثالی سوکن خدا ہر سوکن کو دے جو خانہ جنگی کو ''خانہ سنگی'' میں بدل دے۔

باتوں باتوں میں رات کے کھانے کا وقت ہوگیا۔ ہم سب ساتھ ہی بیٹھ رہے تھے کہ فراست نے اپنے بیگ میں سے ایک دعوت نامہ برآمد کیا۔ لفافے پر ڈھولک اور شہنائی کی تصویر دیکھ کر ہم سمجھے کہ یہ اُن کے کسی قریبی عزیز کی شادی کا کارڈ ہے اس لیے کہ اُن کی اپنی اولاد میں تو کوئی بھی شادی کی عمر کا نہیں... یا پھر یہ کارڈ اُن کے اپنے نکاح ثالث کا ہے کیوں کہ اُنھیں ''قبول ہے'' کہے خاصا عرصہ گزر چکا ہے... یعنی تقریباً چھ ماہ! اُن کے پاس جو دو خالی کمرے اور دو خالی اسامیاں موجود ہیں وہ بھلا انھیں چین سے کیوں بیٹھنے دیں گی؟ فراست صاحب تو بچارے غالبؔ پر تہمت دھرتے ہیں کہ وہ چار شادیوں پر بھی قانع نہ تھے۔ اس ضمن میں وہ غالبؔ کے ایک اچھے خاصے شعر کا حلیہ بگاڑتے ہوئے دعویٰ کرتے ہیں کہ مرزا نے یہ شعر دراصل اپنے نکاح خواں کے لیے کہا تھا:

''چاروں نکاح پڑھ کے وہ سمجھا میں خوش رہا''
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

کھانا شروع ہوتے ہی انہوں نے گفتگو کا آغاز کردیا۔ فرمایا ''میں نے ایک ڈرامائی فیصلہ کیا ہے۔''

''یہ تو کوئی نئی بات نہیں'' ہم نے ایک لقمہ حلق میں اُتارتے ہوئے لقمہ دیا'' میرے بھائی، ڈراما جب بار بار دہرایا جاتا ہے تو اس کا نجامہ بن جاتا ہے۔''

جس وقت ہمارا ان سے یہ غیر سنجیدہ ٹاکرا ہو رہا تھا، کھانے کی میز پر اُن کی بیگمِ ثانی اور ہماری 'تا اطلاع ثانی' کے درمیان شوہروں کو قابو میں رکھنے کے معاملے پر سنجیدہ مذاکرہ ہو رہا تھا۔ دونوں کا اس پر اتفاق تھا کہ مرد تو تا چشم ہوتے ہیں بلکہ تو توں کے ڈھیلوں میں مردوں کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ اِدھر فراست صاحب ہمیں چونکانا چاہتے تھے اور ہم چونک کر نہیں دے رہے تھے۔ بالآخر موصوف نے اپنے ترکش کا آخری تیر چھوڑتے ہوئے کہا'' میں اپنے سگے بیٹے کی شادی اپنی ہی بیٹی سے کر رہا ہوں اور ہم اس بابرکت تقریب میں آپ لوگوں کو مدعو کرنے آئے ہیں۔'' یہ عجیب وغریب، احمقانہ بلکہ سوقیانہ بیان سُن کر ہمارا دل اچانک دھک دھک کرنے لگا اور نوالہ حلق میں اٹک گیا۔ دوسری طرف ہماری بیگم کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹتے چھوٹتے بچا اور وہ روہانسی آواز میں بولیں'' خدا کا خوف کیجیے بھائی صاحب، کیسی باتیں کر رہے ہیں!'' اس احتجاج پر اُن کی بیگم بے ساختہ ہنس پڑیں اگر چہ یہ ہنسنے والی کوئی سچو ایشن نہ تھی۔ بقول مصحفیؔ

رونے پہ مرے جو تم ہنسو ہو
یہ کون سی بات ہے ہنسی کی؟

اس دوران خوش بخت فراست نے جو اَب پوری طرح آغا حشر کاشمیری بن چکے تھے مزید یہ حشر ڈھایا کہ'' میری یہ بیگم انشاءاللہ عنقریب میری سمدھن بن جائیں گی۔'' اُن کی باتیں ہماری سمجھ سے باہر تو پہلے ہی تھیں اب برداشت سے باہر بھی ہوتی جا رہی تھیں۔ لیکن کچھ میزبانی کے تقاضوں اور کچھ ان کی بیگم کی موجودگی نے ہم دونوں میاں بیوی کو ضبط کے دائرے میں رکھا ورنہ جی تو چاہ رہا تھا کہ اُن سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کر لینے کا'' مشترکہ اعلامیہ'' جاری کر دیں اور ساتھ ہی کینیڈا والے شیخ الاسلام سے کہیں کہ ایک دھرنے کی مار انھیں بھی ماریں۔

اس معاملے میں ہماری مسلسل بے رُخی کے پیشِ نظر اُن دونوں کی شگفتگی، سنجیدگی سے گزرتی ہوئی رنجیدگی کی سرحد میں داخل ہونے لگی تو ہم بھی سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ذہن میں پہلا خیال یہ آیا کہ ہمارے خطے کی تاریخ میں خونی رشتوں کے درمیان شادی کی صرف ایک مثال ملتی ہے جب راجہ داہر نے اپنا راج پاٹ بچانے کی خاطر سگی بہن سے شادی کر لی تھی اگر چہ کہا جاتا ہے کہ یہ محض رسمی کارروائی تھی۔ فراست کی کوئی ریاست نہ تھی، نہ اُن کے یہاں شادی کے بنیادی کردار (دولھا، دلھن) دستیاب تھے۔ اس سب کے علاوہ، ہم ایک اچھے خاصے پڑھے لکھے اور صاحب ایمان شخص کے بارے میں Incest (تزویجِ محرّمات) کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ پھر آخر یہ لوگ ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کر کے اپنا دھلا دھلایا امیج کیوں ملیامیٹ کر رہے ہیں؟ کیا یہ بھی اس خرافات پر یقین رکھتے ہیں کہ داغ تو اچھے ہوتے ہیں؟ ہماری ذہنی کش مکش کو محسوس کرتے ہوئے فراست نے چوٹ کی

سمجھ میں کچھ نہیں آتا کسی کی
اگر چہ گفتگو مبہم نہیں ہے

ہم اتنا تو جانتے تھے کہ دوسری مرتبہ فراست نے ایک بیوہ سے شادی کی تھی (جو اُس وقت ہماری مہمان تھیں)۔

اُن کی اپنے مرحوم شوہر سے ایک دس سالہ بیٹی ہے جب کہ فراست سے ابھی کوئی اولاد نہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ پہلی بیگم سے فراست کی دو لڑکیاں ہیں۔ بڑی کی عمر صرف سات سال ہے اور وہ اُس وقت ہمارے یہاں موجود تھی۔ پھر یہ حقیقی بیٹا اور شادی کی عمر کی بیٹی کیا ان کے ہاں آسمان سے Pre-fabricated (بنی بنائی) حالت میں ٹپک پڑے تھے؟ آخر کار ہم نے ہتھیار ڈالتے ہوئے اُن دونوں سے التجا کی کہ جلد از جلد اس معمے کو حل کر دیں کیوں کہ ہمارے دماغ میں ہتھوڑے چلنے لگے تھے اور وہ ہتھوڑے باہر آنے کے لیے کلبلا رہے تھے۔ ہماری بیگم کا غصہ بھی اب حیرت اور اس سے بڑھ کر نفرت میں بدلتا جا رہا تھا۔ انہوں نے بعد میں بتایا کہ ہمارے دوست اور ان کی بیگم اس وقت انہیں نریندر مودی اور نیتن یاہو لگ رہے تھے۔ ایک طرف ہم مرغِ نیم بسمل کی طرح تڑپ رہے تھے تو دوسری طرف فراست نے یہ کہہ کر ہمیں مزید "علامہ حیرت بدایونی" بنا دیا کہ "اس خاکسار کی تین بیویاں ہیں۔"

"تین؟" ہمارے منہ سے چیخ نکل گئی۔

اس پر انہوں نے کمال بے نیازی سے اپنی بات دہرائی "صرف تین۔ آپ تو یوں چلا رہے ہیں جیسے میں نے تیس بتا دی ہیں۔ بھائی ابھی تو چوتھی کی گنجائش موجود ہے۔ میں علامہ اقبال کی اس نصیحت پر عمل پیرا ہوں کہ پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ۔"

ہم نے سوال کیا "آپ کی تیسری اور سب سے چھوٹی بیگم کہاں رہتی ہیں؟ کیا آپ کے گھر میں کوئی تہ خانہ (Basement) بھی ہے؟"

کھانا اب خلال کے مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔ انہوں نے ایک تیلی دانت میں پھنساتے ہوئے بتایا کہ وہ سب سے چھوٹی نہیں بلکہ سب سے بڑی ہیں اور "پنڈ" میں رہتی ہیں۔ اُن سے فراست کا ایک بیٹا ہے جو اُن کی سب سے بڑی اولاد ہے۔ اُس کی شادی وہ اپنی سب سے چھوٹی بیگم کی اُس دس سالہ بیٹی سے کر رہے ہیں جو پہلے شوہر سے ہے اور "جہیز" میں ساتھ آئی تھی۔ یہ سب معلومات بہم پہنچا کر فراست نے ہماری ذہانت پر چوٹ کی "آپ یوں تو تحریر و تقریر میں بڑی دُور کی کوڑیاں لاتے ہیں۔ لیکن سامنے کی بات آپ کو سمجھ نہیں آ رہی ع تو کہ ناواقفِ "آدابِ ساجی" ہے ابھی!"

ہم نے نیم تذبذب کے عالم میں اُن سے پوچھا "چلیے مان لیتے ہیں۔ لیکن آپ کی سوتیلی بیٹی کی عمر دس سال ہے۔ خیر سے سگا بیٹا کتنا بڑا ہے؟"

"ماشاءاللہ بارہ سال کا ہے" انہوں نے تیلی توڑتے ہوئے جواب دیا۔

"تو یہ کیا شادی ہوئی؟" ہم ابھی تک شک کے سمندر میں غوطہ زن تھے۔

"کیوں نہیں ہوئی؟" انہوں نے اپنی آواز میں سختی پیدا کرتے ہوئے کہا "میں دونوں کا وکیل ہوں اور دونوں کی رضامندی سے یہ رشتہ کر رہا ہوں۔"

"دونوں کی رضامندی حاصل کرنا آپ کے لیے کچھ مشکل نہیں" اس بار ہماری بیگم نے نکتہ اُٹھایا "لیکن کیا شرع میں اس کی اجازت ہے؟"

اس پر اُن کی بیگم نے اطمینان دلایا "ہم نے فتویٰ حاصل کر لیا ہے۔ ان شاءاللہ یہ شادی بالکل جائز ہوگی۔"

''چلو یہ بھی ٹھیک ہوا'' ہم نے شک کے تابوت میں سے آخری کیل نکالنے کی غرض سے پوچھا'' لیکن میرے عزیز، اس شادی کی ضرورت کیا تھی اور اس میں اتنی عجلت کیوں برتی جا رہی ہے؟''

اس پر خوش بخت فراست نے چہرے پر سقراطی رنگ طاری کر لیا۔ جون ایلیا (مرحوم) کے انداز میں ویران آنکھوں سے فضا میں گھورتے ہوئے بولے'' بھائی، زندگی اور موت کا کیا بھروسا۔ ہم لوگوں نے سوچا کہ اپنے وسیع و عریض خاندان کو ہمیشہ کے لیے محبت کے بندھن میں جکڑنے کا اس سے بہتر اور فول پروف طریقہ اس کے علاوہ کوئی اور نہیں۔ جہاں تک عجلت کا تعلق ہے تو ابھی صرف نکاح ہوگا۔ رخصتی دس بارہ سال بعد ہوگی۔''

ساری باتیں آئینے کی طرح صاف ہوگئیں تو ہم نے گرہ لگائی'' ایک آخری وجہ آپ نے نہیں بتائی۔'' بولے'' وہ آپ بتا دیجیے۔'' ہم نے کہا'' گھر کی بیٹی گھر میں رہے گی اور شہر کا جہیز پنڈ میں۔ اسے کہتے ہیں ہم خرما و ہم ثواب۔''

نکاح کی رسم ایک پانچ ستارہ ہوٹل میں دھوم دھام سے انجام پائی۔ اسٹیج پر بیٹھے ہوئے دولھا دلھن گڈے گڑیا لگ رہے تھے۔ فرق اتنا تھا کہ گڈے میاں اپنے انجام سے بے خبر، ہم عمر دوستوں سے چہلیں کر رہے تھے جب کہ گڑیا پر مکمل عروسیت طاری تھی۔ تقریب کا سب سے حیران کن پہلو یہ تھا کہ ان کی تینوں بیگمات نے اس میں پورے جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا۔ وہ باہم تیر و نشتر نہ تھیں بلکہ شیر و شکر تھیں۔ ایسی سوکنیں عام ہو جائیں تو شہر میں ہر طرف چار منزلہ گھر نظر آنے لگیں۔ باسی کڑھیوں میں بھی اُبال آ جائے۔ ہوٹل کے ہال سے جب فراست مہمانوں کو رخصت کر رہے تھے تو اچانک کہیں سے ان کی بیگمات کا جلوس بھی وہاں آ نکلا۔ ہم نے فراست کو ایک کونے میں لے جا کر تنبیہ کی'' خبردار، چوتھی مت کرنا ورنہ سب کو ایک ساتھ لے کر نہیں نکل سکو گے۔'' بولے'' کیوں؟'' ہم نے کہا'' شہر میں دفعہ ۱۴۴ لگی ہوئی ہے۔'' تاہم انہوں نے پر عزم لہجے میں غالب کا یہ شعر اپنی درست حالت میں پڑھا

کوئی دن گر زندگانی اور ہے

اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

ہم نے جاتے جاتے کہا'' ایک ٹوٹا پھوٹا شعر ہمارا بھی سن لیجیے۔''

بولے'' عرض کیجیے۔''

ہم نے واقعی'' عرض'' کیا

ہم ایک بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں ہلکان

وہ چار بھی کرتے ہیں تو نزلہ نہیں ہوتا

☆......☆......☆

بدقسمت

مظفر بخاری

خان صاحب ہمارے عزیز دوستوں میں سے ہیں۔ آپ اُن کی داستانِ غم سنیں گے تو کلیجہ مُنہ کو آئے گا۔ دُنیا میں یوں تو بڑے بڑے بدقسمت لوگ پیدا ہوئے ہیں لیکن خان صاحب جیسا بدقسمت انسان آپ کو خوش قسمتی ہی سے ملے گا۔ اُن کی پہلی اور بنیادی بدقسمتی تو یہ ہے کہ اس برصغیر میں پیدا ہو گئے جہاں جہالت ہے، بھوک ہے، بیماری ہے اور جہاں کے رہنے والے ہر لحاظ سے جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔ اور پھر ایسے گھر میں پیدا ہوئے جہاں دولت کی ریل پیل تک نہ تھی۔ اُن کے والد جنہیں وہ "باپ سالا" کہہ کر یاد کیا کرتے ہیں، معمولی حیثیت کے آدمی تھے جن کی کُل کائنات مزنگ روڈ پر دو کوٹھیاں اور چند ایک دُکانیں تھیں، جن کی دیکھ بھال اور کرایہ وُصولی میں خان صاحب کو اَن گنت پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بقول اُن کے "باپ سالا میرے لیے پریشانی کا سامان چھوڑ گیا ہے" آپ ہی انصاف سے فرمایئے کہ خان صاحب اگر برلا یا ٹاٹا جیسے کسی خاندان میں پیدا ہو جاتے تو کیا قیامت ٹوٹ پڑتی۔ لیکن جب انسان ازلی بدقسمت ہو تو کیا کیا جا سکتا ہے۔ مقدرًا اچھے ہوتے تو انڈیا میں کیوں پیدا ہوتے۔ آخر انگلینڈ، فرانس، امریکہ وغیرہ بھی تو اسی روئے زمین پر واقع ہیں۔ بچے وہاں بھی پیدا ہوتے ہیں لیکن وہ کم بخت خوش نصیب ہوتے ہیں۔ خان صاحب کی طرح بدقسمت نہیں۔

خان صاحب بی۔ اے کرنے کے بعد سی۔ ایس۔ پی افسر بننا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مقابلے کا امتحان دیا۔ لیکن اِس ملک میں بدقسمتی سے ہر کام رشوت سے ہوتا ہے اور یا پھر سفارش سے۔ چنانچہ خان صاحب کو تحریری امتحان میں فیل کر دیا گیا۔ خان صاحب نے ہمت نہ ہاری اور اگلے سال پھر امتحان دے ڈالا۔ اس بار پرچے اتنے اعلیٰ حل کیے کہ ممتحن انہیں، باوجود کوشش کے، فیل نہ کر سکے۔ لیکن بدقسمتی نے انٹرویو کے وقت آ لیا۔ انٹرویو لینے والے اُن کی شخصیت اور علم سے متاثر ہونے کے بجائے، حسد میں مبتلا ہو گئے اور بربنائے کینہ وحسد انہیں فیل کر دیا اور اُن کے مقابلے میں نالائق لیکن سفارشی امیدواروں کو پاس قرار دے دیا۔ اس کُھلی دھاندلی پر خان صاحب اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ معلّمی کا پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ بی۔ ایڈ کی ڈگری لے کر ایک ہائی سکول میں ٹیچر لگ گئے۔ لیکن بدقسمتی نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ تنخواہ کم تھی۔ چالیس چالیس منٹ کے پانچ پیریڈ روزانہ پڑھانا کیا کسی انسان کے بس کی بات ہے؟ دوسرے اساتذہ تو گپیں ہانک کر وقت گزار لیتے تھے لیکن خان صاحب بدقسمتی سے اپنا فرض پہچانتے تھے۔ نیز اُس سکول کے لڑکے بقول خان صاحب بہت "حرامی" تھے بالخصوص خان صاحب کی کلاسز میں، ہیڈ ماسٹر نے، جو اُن کے علم وفضل سے جلتا تھا، چُن چُن کر شرارتی اور نالائق لڑکے جمع کر دیئے تھے تا کہ خان صاحب تنگ آ کر خود ہی سکول چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ چالیس میں سے اڑتیس منٹ تو انہیں خاموش کرانے میں لگ جاتے جونہی لڑکے خاموش ہوتے، پیریڈ ختم ہونے کی گھنٹی بج

جاتی۔ (بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ گھنٹی پہلے بجتی پھرلڑکے خاموش ہوتے (واللہ اعلم بالصواب)۔سکول کی انتظامیہ سے یہ بھی نہ ہوا کہ انہیں فارغ اوقات میں بیٹھنے کے لیے الگ کمرہ ہی دے دیتی جس میں ایک آدھ قالین اور دو چار صوفے ہوتے۔ آخر ایک روز ہیڈ ماسٹر کی سازش کامیاب ہوگئی اور اس کے اُکسانے پر لڑکوں نے خان صاحب کی کلاسوں کا بائیکاٹ کر دیا۔خان صاحب نے طیش میں آ کر استعفیٰ دے دیا لیکن آتے وقت ہیڈ ماسٹر کو وہ بے نقط سُنائیں کہ اُس کی طبیعت صاف ہوگئی۔اب خان صاحب نے ایم۔اے کی تیاری کر کے امتحان دے ڈالا۔

بدقسمتی سے یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن تو حاصل نہ کر سکے تاہم پاس ہوگئے اور چند ماہ بعد ایک مقامی کالج میں لیکچرار لگ گئے۔لیکن مقدرّ کی سیاہی پھر بھی کم نہ ہوئی۔تنخواہ اگرچہ پہلے سے زیادہ تھی۔اُٹھنے بیٹھنے کو الگ کمرہ بھی مل گیا لیکن چپڑاسی ایک بھی نہ ملا۔حکومت سے یہ تک نہ ہوا کہ جی۔او۔آر میں کوئی ڈھنگ کی کوٹھی ہی رہائش کے لئے دے دیتی (خان صاحب کی اپنی کوٹھیاں کرائے پر اٹھی ہوئی تھیں جن کے مکین بدقسمتی سے خالی کرنے پر رضامند نہ تھے)۔کالج آنے جانے کا مسئلہ بھی خاصا سنگین تھا۔کالج کی اپنی کوئی بس نہیں تھی۔اے۔جی۔آفس والے کار خریدنے کے لیے پیشگی رقم نہیں دیتے تھے۔مجبوراً خان صاحب کو اپنے ذاتی سکوٹر پر کالج آنا پڑتا۔لیکچر شپ میں ایک خرابی یہ تھی کہ اُوپر کی آمدنی کے مواقع نہ ہونے کے برابر تھے۔لے دے کر کبھی کبھار ایف۔اے،بی۔اے کے پرچے مل جاتے جن کا معاوضہ برائے نام تھا۔چنانچہ خان صاحب پرچوں پر محض سرسری نظر ڈال کر نمبر لگا دیتے۔جلد ہی خان صاحب اس پیشے سے بھی بددل ہوگئے۔بھلا یہ بھی کوئی پیشوں میں پیشہ تھا۔نہ کوٹھی،نہ کار،نہ چپڑاسی،نہ ٹیلی فون،نہ رُعب،نہ دبدبہ،حالانکہ مجسٹریٹوں کو یہ سب کچھ میسر تھا۔

تنگ آ کر خان صاحب نے پی۔سی۔ایس کا امتحان دے ڈالا۔پاس بھی ہوگئے اور مجسٹریٹ بھی لگ گئے۔ لیکن واہ ری بدقسمتی! تُو نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔آئے دن ٹرانسفر ہو جاتی۔ایک جگہ جم کر بیٹھ نہ پاتے کہ دوسری جگہ جانے کا حکم مل جاتا۔چھوٹی چھوٹی باتوں پر جواب طلبی کرنے والے ایک نہیں کئی،ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر،ڈپٹی کمشنر،سیکرٹری، ہائی کورٹ،زندگی عذاب بن کر رہ گئی۔ایک بار ہائیکورٹ نے توہین عدالت کے سلسلے میں طلب کر لیا۔ہاتھ جوڑ کر،معافی مانگ کر جان چھُٹی۔عدالت میں بے چارے خان صاحب کو اتنا کام کرنا پڑتا کہ بمشکل پیسے جیب میں ڈالنے کی فُرصت ملتی۔سارا دن اوٹ پٹانگ قسم کے مقدمے سُننا پڑتے۔وکیلوں کی باتیں اپنی جگہ پریشان کُن ہوتیں۔گھر جا کر،ایک سینئر وکیل سے،مقدمات کے فیصلے لکھوانا پڑتے۔وہ وکیل لوگوں سے پیسے لے کر اپنی مرضی کے فیصلے لکھ لیتا اور لاکھوں کماتا لیکن بددیانت اس حد تک تھا کہ اکثر خان صاحب کے حصے کے پیسے بھی خود ہی ہضم کر لیتا۔مسائل کی فہرست یہیں ختم نہیں ہوتی۔وقتاً فوقتاً شہر میں ہنگامی ڈیوٹی لگ جاتی۔عید کے روز لوگ تو نمازِ عید پڑھ رہے ہوتے اور خان صاحب مسجد کے باہر ڈیوٹی دے رہے ہوتے۔زندگی ایک مشین بن کر رہ گئی۔خان صاحب لیکچر شپ کے زمانے کی فراغت یاد کرتے اور آہیں بھرتے۔

رومان اور شادی کے سلسلے میں بھی خان صاحب خاصے بدقسمت ثابت ہوئے۔ایک عرصے تک تو وہ کسی مناسب محبوبہ کی تلاش میں سرگرداں رہے۔لیکن جب کسی حسینہ نے خان صاحب سے عشق جتانے کی جرأت نہ کی (خان

صاحب کا دبدبہ بہت ہے)، تو انھوں نے محبوبہ کی تلاش کو بیوی کی تلاش میں بدل لیا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ رشتے تو بہت آ رہے ہیں لیکن خان صاحب کو فائنل سلیکشن کے لئے چند ماہ درکار ہوتے ہیں۔ آخر زندگی بھر کے فیصلے آناً فاناً تو نہیں کئے جاسکتے۔ چنانچہ پہلے تو خان صاحب لڑکی کا خاندانی پس منظر جاننے کے لئے جاسوسی کا مشن چند قریبی دوستوں اور بے تکلف طلباء کے سپرد کرتے ہیں۔ اگر یہ رپورٹ مل جائے کہ لڑکی کا پس منظر اطمینان بخش ہے، تو وہ لڑکی کے پیش منظر کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ لڑکی کے نوجوان رشتہ داروں، ہمسایوں اور کالج فیلوز کا بغور مشاہدہ اور مطالعہ کرتے ہیں۔ اگر پیش منظر اطمینان بخش نکلے تو رشتے کے لئے "ہاں" کرنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں، لیکن اس سارے عمل میں دقت یہ پیش آتی ہے کہ متعلقہ لڑکی اپنے اطمینان بخش پس منظر اور پیش منظر کے ساتھ پیا گھر منتقل ہو چکی ہوتی ہے۔ چند ایک تو یہ کہہ کر انکار کر چکی ہیں کہ خان صاحب (میرے منہ میں خاک) پاگل اور خبطی ہیں اور وہ خان صاحب سے شادی کر کے اپنی زندگی برباد نہیں کر سکتیں۔ بہر حال رشتوں کی کمی اب بھی نہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ ڈھنگ کی لڑکی کا ملنا انتہائی مشکل ہے، مثلاً لڑکی اگر ایم۔ اے ہے تو خوبصورت نہیں، خوبصورت ہے تو لمبی نہیں، لمبی ہے تو پتلی نہیں، پتلی ہے تو امیر زادی نہیں، امیر زادی ہے تو گوری نہیں، گوری ہے تو سانولی نہیں وغیرہ وغیرہ۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ لڑکی ہر لحاظ سے مناسب ہے مگر پٹھان نہیں۔ ایک بار تمام خوبیوں والی ایک پٹھان لڑکی مل بھی گئی لیکن اُس کے والد کا اندازِ گفتگو خان صاحب کو پسند نہ آیا اور یوں وہ لڑکی خان صاحب کی بیوی بنتے بنتے رہ گئی۔ غالباً اب تو آپ کو یقین آ گیا ہوگا کہ خان صاحب اِس صدی کے بدقسمت ترین انسان ہیں۔ اللہ ان کی حالت پر رحم کرے اور اُن کے دن بدلے۔

☆......☆......☆

زندگی کی آسانیوں میں مشکلات کے اضافی ٹانکے

عزیز فیصل

قارئین کرام! زندگی ایک مشکل تجربے کا نام ہے جسے اپنی اپنی ہمت سے آسان بنایا جا سکتا ہے۔ اکتاہٹ سے آسودگی اور تلملاہٹ سے شوخی برآمد کرنا ہی زندگی بسر کرنے کے مترادف ہے۔ ویسے پیچیدہ زندگی کو پیچیدہ تر کرنا بھی ایک آرٹ ہے جو خبطی شوہر، سڑیل مزاج باس اور غصیلے مولوی کی "بائیں سوچ" کا کام ہے۔ معاملات کی جھیل میں کنکر کی بجائے بڑا سا پہاڑی تودہ پھینکنا اور معمولات کی ہلکی آنچ کو آتش فشانیوں کی نذر کرنا بعض لوگوں کی عادات ثانیہ کا حصہ ہوتا ہے، سو وہ ایسا کرنے پر مجبور ہیں کہ ان کی دماغی وائرنگ ہی اسی "شارٹ سرکٹ" سے تلذذ کا ایزی لوڈ لیتی ہے۔ لیکن ایسے افراد بھی اس معاشرے میں موجود ہیں کہ جو تلخیوں کے جون اور جولائی کو بھی شیرینی کے دسمبر اور جنوری کے سرمائی پہناووں کے ہمراہ لطف اندوزی کے ریمپ پر کیٹ واک کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ جنھیں نارمل انداز میں ہنسنا اور رونا آتا ہے۔ اگر ہنسنے اور رونے میں توازن برپا ہو جائے تو سانسوں اور ساسوں کی دشواریاں میرا اور آپ کا تو کیا، گنجے افراد کا بھی بال بیکا نہیں کر سکتیں۔

ناہمواریاں اور مشکلات مقدر کے گملے میں اپنے مخصوص رنگ بکھیرتی ہیں تو ہستی کی گزران نمو پاتی ہے کیونکہ اس بے ثبات نظام کا سارا حسن ہی تضادات کا مرہون منت ہے۔ دن اس لیے بھی دلکش محسوس ہوتا ہے کہ انسان رات کا کشت کاٹ کراس کا قرب پاتا ہے۔ بہار اور خزاں، سرد اور گرم، زندگی اور موت، بچپن اور بڑھاپا--- الغرض فطرت ایسے ہی تضادات کو پروان چڑھا کر جادوگری کرتی محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح لوازمات کے قدرتی ملزومات بہتیرے ہیں اور انھی پر ہی اکتفا کرنا چاہیے۔ دقت کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب ہم شب و روز کے آہنی وجود پر اپنے خود ساختہ ملزومات سے ویلڈنگ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنے نازک کندھے کی ڈائسن پر ٹرالر بھر بوجھ لادنے کے درپے ہو کر ہلکان ہونے لگتے ہیں۔ ایسی غیر صحتمندانہ حرکت، بعد از خرابی بسیار، ڈاکٹروں اور حکیموں کی مراد بر لاتی ہے اور وہ علاج معالجے کے نام پر بندے کو بیمار ہونے کا سبق سکھا کر دم لیتے ہیں۔

ذوق وشوق کو اعتدال کے مدار سے کچھ سنٹی میٹر باہر تک بڑھا دیا جائے تو یہ خبط کہلاتا ہے۔ اگر خبط سے معاشقہ کرنا شروع کر دیا جائے تو یہ عمل معاشقے سے بھی زیادہ چول پن کی ذیل میں آتا ہے۔ حکمران اسی چول پن کی توسیعی کاوش میں اپنا عرصہ اقتدار کھینچتے چلے جاتے ہیں اور خوشامدیوں اور چرب زبانوں کی بے سُری کھڑ کھڑاہٹ کو بھی راگ یا ٹھاٹھ سمجھنے لگتے ہیں۔ بادشاہت کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ یہ کان رکھتے ہوئے بھی بہری، آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھی اور عقل رکھتے ہوئے بھی بے شعور رہنے پر مجبور ہی نہیں، نازاں وفرحاں بھی ہوتی ہے۔ مفادات کی شاہانہ "ہٹ" رعایا کے لیے نوگو ایریا بن جاتی ہے اور شہ مزاجی کا یہ شارع خاص، واقعی شارع عام نہیں ہوتا۔ الغرض انسان چاہے بادشاہ بھی ہو، وہ

ناآسودگی کی چاکلیٹ چبائے رہ نہیں پاتا، چاہے اسے دانتوں میں کیڑوں کی رہائشی کالونی ہی کیوں نہ بنانی پڑ جائے۔

مشکلات سازی حریص دماغوں کی فیکٹری کی مصنوعات ہیں جہاں من پسند کلفتیں اور حسب طلب اذیتیں خام سے کندن بنائی جاتی ہیں، انسان شارٹ کٹ کے چکر میں انسانیت سے اتنا کٹ کر رہ جاتا ہے کہ اس کی فوری واپسی کا امکان زیرو ہو کر رہ جاتا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ وہ یہ ضروری یوٹرن لینے میں سبکی محسوس کرنے لگتا ہے۔ دس روپے کے تنازعہ پر میاں بیوی میں ناراضی کا دس دس سال تک جاری رہنا اسی ضدی مزاج کی عکاسی کرتا ہے۔ سماجی معاملات میں ضروری یوٹرن لینے اور اپنی ناروا ضد پر اڑنے سے گریز کرنے کا اہتمام موجود نہیں بلکہ اسے بزدلی اور بیوقوفی قرار دینے والوں کی کمی نہیں۔ ویسے شادی شدہ افراد کو ان معاملات میں زائد از وافر ہدایات "قبول ہے" والی سرکار فراہم کرتی رہتی ہے اور یہ انتہائی خوش آئند بات ہے بلکہ طبقہ نسواں کا مرد حضرات پر ایک غیر اعلانیہ احسان کے مترادف ہے۔ غلط فیصلے، نامناسب ضد اور تاخیراتی عہد و پیمان کے گھوڑوں پر سوار لوگ منزل مراد سے ہر پل دور ہی ہوتے چلے جاتے ہیں اور غیر آسانیوں کے چنگل میں اسی طرح پھنس کر رہ جاتے ہیں جیسے عقد مزید کے بعد دولہا بھائی محصور و مقید ہو کر رہ جاتے ہیں۔ نو پارکنگ کے مقام پر گاڑی پارک کرنا تو تقریباً شریفانہ خلاف ورزی تصور کیا جاتا ہے۔ کم و بیش یہی حال اسی قبیل کی دیگر ممنوعہ ہدایات کا بھی ہے جہاں من مانیوں کی لاٹھی کے ہاتھوں اصول وضوابط کی بھینس کو ہانکا جاتا ہے۔ خصوصاً ٹریفک کی جتنی منظم خلاف ورزی ہماری سڑکوں پر ہوتی ہے، اس پر ٹریفک پولیس کو سڑکوں سے معذرت کرنی چاہیے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اشارہ توڑنے اور الٹے سیدھے کٹ لگانے میں ہم ایک آدھ دقیقہ بھی فروگزاشت نہیں کرتے۔ دائیں بائیں، ادھر ادھر بے ہنگم گاڑیوں کو چلتا دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ ان گاڑیوں کے ڈرائیوروں نے لال بیگوں سے ڈرائیونگ سیکھی ہوئی ہے۔ دوسروں کی جانوں کا تو کیا مذکور، خود اپنی زندگی داو پر لگا دی جاتی ہے۔ پبلک ٹرانسپورٹ کے ڈرائیوروں نے تو یہ بے ہنگم ڈرائیونگ باقاعدہ طور پر سیکھی ہوتی ہے اور سواریوں کے سامنے وہ اسی مہارت کا مظاہرہ پیش کرتے ہیں۔ مجھے کئی دفعہ پبلک ویگن میں سفر کرتے ایسے لگا جیسا کہ موت کے کنویں میں چنگ چی پر بیٹھا ہوا سفر کر رہا ہوں۔ مجھے ان لوگوں سے مکمل طور پر اختلاف ہے جو عمر بھر پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر گردی کے باوجود یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ ہم نے تو آج تک ہوائی جہاز میں سفر نہیں کیا۔

سرکاری ملازمین میں سے کچھ لوگ دیر سے دفتر پہنچنے کو مردانگی کا تقاضا سمجھنے لگ جاتے ہیں اور مناسب باز پرس نہ ہونے پر اپنے کولیگ کے سامنے ڈینگیں مارتے رہتے ہیں۔ بائیومیٹرک سسٹم نے ایسے دیرینہ دیر پسندوں کا ناک میں دم کر رکھا ہے اور اب وہ اپنی جبلت کا جنازہ بروقت انگوٹھا لگا کر نکالتے ہیں۔ افسر لوگ اپنی پھوں پھاں بنانے کو بہت سے خصوصی ڈھونگ رچاتے ہیں جیسے دفتر داخل ہوتے ہی منہ پر بارہ بجانا، اونچے والیم سیکسی مسکین ملازم پر چڑھائی کرنا، آگ بگولہ ہونے کی ہومیو پیتھک اداکاری کرنا وغیرہ۔ اپنی افسری چمکانے کو کئی ایسی گالیاں بھی "رطب اللسانی" کا مرتبہ پا جاتی ہیں کہ جنھیں سن کر بڑی بوڑھیاں انگشت بدنداں ہو سکتی ہیں۔ ماتحت لوگوں کی ملزومات سازی کے اپنے اسلوب ہیں۔ شریر ماتحت، افسر آزاری کی ساری ترکیبیں ایک ایک کر کے استعمال کرتے ہیں اور ان کی شدت کا اندازہ لگاتے ہیں۔ سائنٹفک فسادی اہل کار مکاری، چالاکی، خوشامد، تمسخر اور تضحیک کی آمیزش سے اپنی نوکری کے گلشن کا کاروبار چلاتے ہیں

اور مفاد پرستی کے روپے کماتے ہیں۔ سیدھے سبھاؤ اپنی ڈیوٹی ادا کرنے سے ایسے لوگوں کی نیت کو تشنج کی بیماری لاحق ہو جاتی ہے اور ناک کی سیدھ میں چلنے پر ان کے شیطانی مزاج کو لقوہ پڑ جاتا ہے۔ مزاج درست رکھنے کو ایسے لوگ اوٹ پٹانگ حرکتوں کے ساتھ ساتھ سرکاری تادیب کی سہولت سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔

الغرض ہم رونیوں، آنسوؤں اور دکھ درد کے ایسے واک تھرو گیٹ بنانے میں اتنے خود کفیل ہو چکے ہیں کہ دنیا بھر میں ہونے والے بہت سے ناخوشگوار سروے میں ہم ٹاپ میں جگہ پانے میں کامیاب رہتے ہیں۔ افسوس کی ہم رنج و مصائب کے زرمبادلہ کے ذخائر بہت تیزی سے بڑھاتے جا رہے ہیں لیکن ہماری قہقہوں اور مسکراہٹوں کی سٹاک ایکسچینج میں شدید مندی کے رجحانات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ناآسودگیوں کے طوفان بادو باراں نے ہماری باہم ملاقاتوں کے موسمیات کو ابوالہول بنا ڈالا ہے اور مسکراہٹوں کی پھوار اور تبسم کی بوندا باندی کے سلسلے بندش نما تعطل کا شکار ہیں۔ اگر خرابی اور خرابے بھی اپنے اندر خیر و خوبی کا سامان رکھتے ہیں تو عین ممکن ہے کہ ہماری سماجی دنیا کے تاریک پہلوؤں سے ہی محبت اور رواداری کی کرنیں پھوٹنے لگ جائیں۔

گفتنی ناگفتنی

(خطوط)